زیرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیتُ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی مدظلہ

ناشر

مِصباحُ القُرآن ٹرسٹ

آثر نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد ۷

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مِصباحُ القرآن ٹرسٹ

نام کتاب ______ تفسیر نمونہ
جلد ______ ۷
زیر نظر ______ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم ______ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
ناشر ______ مصباح القرآن

مطبع ______ شوکت پریس، لاہور
تاریخ اشاعت ______ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
ہدیہ ______ -/500 روپے

اس کتاب کی اشاعت کے لیے سید تسلیم حیدر زیدی
نے بطور قرض تعاون فرمایا ہے
خداتعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائیں
اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائیں

ملنے کا پتہ: قرآن سنٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور
0321-4481214, 042-37314311

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ــــ کلامِ حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشرواشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کُتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیامِ قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآن پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہلِ علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیبِ نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سُورتوں کا کچھ حصّہ ایک جلد میں اور بقایا حصّہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سُورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سُورت دو حصّوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سُورت کی کامل تفسیر پر ختم ہوگئی۔ اس طرح پُوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۷ اس وقت آپ کے پیشِ نظر ہے جس میں سابقہ جلد ۱۲ میں سے صفحہ ۲۹۹ تا ۴۹۷ ۔ جلد ۱۳ مکمل اور جلد ۱۴ میں سے صفحہ ۲۷ تا ۱۶۷ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سُورہ کہف، سُورہ مریم، سُورہ طٰہٰ، سُورہ انبیاء اور سُورۂ حج کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

ہم نے زیرِ نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیّر مردِ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعاگو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

اراکین
مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھداء

"مرکزِ مطالعاتِ اِسلامی ونجاتِ نسلِ جوان"

جو تمام طبقات میں عموماً ــــ اور

نوجوانوں میں خصوصاً

اِسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا

گیا ہے۔

اِس نفیس تالیف کو

ان اہلِ مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو قرآن مجید کے متعلق

بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزۂ علمیہ۔ قم



یہ تفسیر

حسبِ ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان	از	مشہور مفسّر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان	از	دانشمند فقیہ بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان	از	علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی	از	علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین	از	مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر برہان	از	مرحوم سید ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی	از	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار	از	محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن	از	سید قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی	از	محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول	از	واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی	از	احمد مصطفی مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب	از	فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان	از	ابو الفتوح رازی



گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان بھی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

با الفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمہ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصلِ فکر سے استفادہ کرکے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوتے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققینِ اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیہم)

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریات زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دَور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کرسکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہوسکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی سترہ جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی اٹھارہویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا میں ازحد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[۱]۔

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرضِ خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلا وطنی[۲] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[۱] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

[۲] سابق شاہ ایران معدوم کے دَور میں مؤلف کو جلا وطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورت حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے مَیں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہوسکیں۔

(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوندا!

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کرسکیں۔

خداوندا!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کردے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگالیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بار الٰہا!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کرسکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کرسکیں۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی

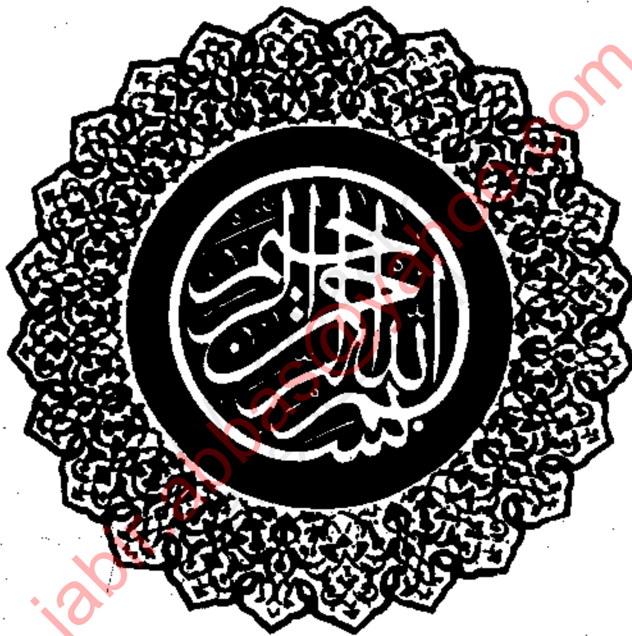
حوزہ علمیہ قم۔ ایران

تفسیر نمونہ جلد ۷

فہرست

سورہ کہف

سورہ طٰہٰ


بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

تفسیر نمونہ جلد ۷

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں۔

۱۔ سورہ کہف ۲۔ سورہ مریم ۳۔ سورہ طٰہٰ ۴۔ سورہ انبیاء ۵۔ سورہ حج

سورۂ کہف ، مکی سورت ہے اور اس کی ۱۱۰ آیات ہیں۔

پارہ ۱۵ ــــ ۱ تا ۷۴ پارہ ۱۶ ــــ ۷۵ تا ۱۱۰

سورۂ مریم ؛ مکی سورت ہے اور اس کی ۹۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۶

سورۂ طٰہٰ ؛ مکی سورت ہے اور اس کی ۱۳۵ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۶

سورۂ انبیاء ؛ مکی سورت ہے اور اس کی ۱۱۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۷

سورۂ حج ، مدنی سورت ہے اور اس کی ۷۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۷



سورۂ کہف

اس سورہ کی
۱۱۰ آیتیں ہیں
آیت ۲۸ کے سوا سب مکی ہیں



سورۂ کہف کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں بہت سی روایات مروی ہیں۔ان روایات سے اس سورہ کے مضامین کی بہت زیادہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔چند ایک روایات ذیل میں درج کی جارہی ہیں :

۱۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

کیا تمہیں ایسی سورہ کا تعارف کراؤں کہ جو نازل ہوئی تو ستر ہزار فرشتے اس کی نگرانی کر رہے تھے اور اس کی عظمت سے زمین و آسمان معمور تھے۔

صحابہ نے عرض کی :

جی ہاں۔

آپؐ نے فرمایا :

وہ سورہ کہف ہے۔جو شخص جمعہ کے روز اس کی تلاوت کرے گا آئندہ جمعہ تک اللہ اسے بخش دے گا (ایک اور روایت کے مطابق آئندہ جمعہ تک اللہ اسے گناہ سے محفوظ رکھے گا) .... اور اسے ایسا نور عطا کرے گا کہ جو آسمان تک ضوفشاں ہوگا اور وہ شخص دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا [1]

۲۔ ایک اور روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے منقول ہے۔آپؐ نے فرمایا :

جو شخص سورہ کہف کی دس آیات حفظ کرے گا اسے دجال نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور جو شخص اس سورہ کی آخری آیات حفظ کرے گا روزِ قیامت یہ اس کیلئے روشنی بن جائیں گی [2]

۳۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

جو شخص ہر شب جمعہ سورہ کہف کی تلاوت کرے گا دنیا سے وہ شہید جائے گا اور شہداء کے ساتھ مبعوث ہوگا اور روزِ قیامت شہداء کی صف میں شمار ہوگا [3]

ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآنی سورتوں کی عظمت ، ان کے روحانی اثرات اور اخلاقی برکات ان کے مضامین و مفاہیم کے لحاظ سے ہیں یعنی ان اثرات و برکات کے حصول کے لیے ان مفاہیم پر ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا ہوگا۔

---

[1] [2] [3] مجمع البیان۔

اس سورہ کے مضامین کا ایک نہایت اہم حصہ چند باعظمت نوجوانوں کی داستان پر مشتمل ہے۔ ان نوجوانوں نے اپنے زمانے کے طاغوت اور دجال کے خلاف قیام کیا۔ نتیجتاً ان کی جان خطرے میں پڑ گئی اور وہ گویا موت کی سرحد تک آپہنچے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کی۔ اس سچی داستان کی طرف توجہ کی جائے تو ہوسکتا ہے وہ دل جو آمادہ ہو ان میں نورِ ایمان چمک اٹھے اور انہیں گناہوں، دجالوں اور فاسد ماحول کی برائیوں سے بچا لے۔

اس سورہ میں عذاب دوزخ کا ایسا تذکرہ ہے کہ انسان لرز کے رہ جاتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کیسا بُرا انجام متکبرین کے انتظار میں ہے۔

اسی طرح اس سورہ میں ایک نہایت عمدہ مثال کے ذریعے علم الٰہی کی وسعت بیان کی گئی ہے۔

اگر انسان ان تمام امور کی طرف توجہ کرے تو ہوسکتا ہے شیاطین کے فتنوں سے محفوظ رہے۔ اس کے دل میں ایک روشنی چمک اٹھے اور وہ عصیاں و گناہ سے بچ جائے جس کے نتیجے میں آخر کار شہداء کے ساتھ محشور ہو۔

سورہ کہف کے مضامین

یہ سورہ اللہ کی حمد و ستائش سے شروع ہوتی ہے اور توحید، ایمان اور عملِ صالح کے ذکر پر تمام ہوتی ہے۔

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورہ کے مضامین بھی زیادہ تر مبداء و معاد اور بشارت و انذار پر مشتمل ہیں۔ نیز اس میں ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی ان سخت دنوں میں مسلمانوں کو ضرورت تھی۔ مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ حق پرست اگرچہ کتنے کم کیوں نہ ہوں انہیں اکثریت کے سامنے نہیں جھکنا چاہیئے۔ اگرچہ اکثریت ظاہراً کتنی ہی قوی اور طاقتور کیوں نہ ہو اور حق پرستوں کو ماحول کی خرابی میں منحل نہیں ہوجانا چاہیئے بلکہ اصحاب کہف کے چھوٹے سے گروہ کی طرح اپنا الگ راستہ انتخاب کرنا چاہیئے اور اس بُرے ماحول کے خلاف قیام کرنا چاہیئے۔ ان تھوڑے افراد میں جب تک طاقت ہو مقابلہ کریں اور طاقت نہ ہونے کی صورت میں انہیں چاہیئے کہ ہجرت کر جائیں۔

اس میں دو افراد کی ایک اور داستان بھی ہے۔ ان میں سے ایک بہت زیادہ خوشحال اور دولت مند تھا لیکن ایمان کی دولت سے محروم تھا جبکہ دوسرا تہی دست تھا مگر مومن تھا۔ یہ تہی دست اپنی عزت و وقار کو برقرار رکھتے ہوئے ہمیشہ اس امیر شخص کو نصیحت و ارشاد کیا کرتا تھا لیکن جب اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس سے بیزاری کا اعلان کر دیا اور کامیابی کا راستہ بھی یہی ہے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمان جو رسول اللہؐ کے ساتھ ابتدائی حالات کی مشکلات سے

دوچار ہیں یا آئندہ کبھی جن مسلمانوں کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے وہ جان لیں کہ سرمایہ داروں کا جوش وخروش وقتی ہوتا ہے، جیسے ایک باایمان شخص کی تنگدستی۔

اس سورہ میں اگرچہ حضرت خضرؑ کا نام نہیں آیا تاہم اس میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ اس واقعے کے مطابق بعض کام ایسے تھے جو ظاہراً تو ٹھیک نہ معلوم ہوتے تھے مگر باطناً مصلحت پر مبنی تھے، حضرت موسیٰؑ ان پر صبر نہ کرسکے لیکن حضرت خضرؑ نے وضاحت کی تو انہیں ان کی گہرائی کا پورا علم ہوا اور پھر اپنی بے تابی پر پشیمان ہوئے۔

اس واقعے میں بھی سب کے لیے یہ درس ہے کہ واقعات کو صرف ظاہری نظر سے نہ دیکھا کریں بلکہ ان کی گہرائی پر نظر کریں۔

اس سورہ میں حضرت ذوالقرنین کی داستان بھی مذکور ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے کیسے دنیا کے مشرق و مغرب کی سیر کی۔ دنیا کی مختلف قوموں سے ملے کہ جن کے رسم و رواج مختلف تھے۔ آخرکار وہ کچھ لوگوں کی مدد سے یاجوج و ماجوج کی سازش کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے راستے میں آہنی دیوار کھڑی کرکے ان کے نفوذ کو ختم کردیا۔ (اس واقعے کی پوری تفصیل انشاء اللہ سورت کے ذیل میں آئے گی)۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان دنیا کے مشرق و مغرب میں نفوذ کے لیے پوری بصیرت کے ساتھ اپنے آپ کو تیار کریں اور ہر طرح کے یاجوج و ماجوج کا مقابلہ کرنے کے لیے آپس میں متحد ہو جائیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اصحاب کہف، موسیٰؑ و خضرؑ کا واقعہ اور حضرت ذوالقرنین کی داستان کہ جس کا اس سورہ میں ذکر ہے دیگر قرآنی واقعات کے برخلاف ان کا قرآن میں کسی اور جگہ کوئی ذکر نہیں آیا۔ صرف سورہ انبیاء کی آیہ ۹۶ میں یاجوج و ماجوج کے مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے تاہم حضرت ذوالقرنین کا نام اس میں نہیں آیا۔ بہرحال یہ بات اس سورہ کی خصوصیات میں سے ہے۔

بہرکیف اس سورہ کے مضامین ہر لحاظ سے ثمر بخش اور تربیت کنندہ ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ

(۲) قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ

(۳) مَّاکِثِیۡنَ فِیۡہِ اَبَدًا ۙ

(۴) وَّ یُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ٭

(۵) مَا لَہُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِہِمۡ ؕ کَبُرَتۡ کَلِمَۃً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاہِہِمۡ ؕ اِنۡ یَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا کَذِبًا ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

(۱) حمد مخصوص ہے اللہ کے لیے جس نے اپنے (برگزیدہ) بندے پر یہ (آسمانی) کتاب نازل کی اور اس میں کسی قسم کی کوئی کجی نہ رکھی۔

(۲) وہ کتاب کہ جو ثابت، مستقیم اور دوسری کتب کی نگہبان ہے تاکہ (بُرے کام انجام دینے والوں کو) اس کے شدید عذاب سے ڈرائے اور نیک عمل انجام دینے والے مومنین کو بشارت دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے۔

(۳) (وہی بہشت بریں کہ) جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

(۴) اور (نیز) انہیں ڈرائے کہ جو کہتے ہیں کہ خدا نے (اپنے یلے) بیٹا انتخاب کیا ہے۔

(۵) نہ انہیں (ہرگز) اس بات پر یقین ہے نہ ان کے آباؤ اجداد کو، یہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ یقیناً وہ جھوٹ کہتے ہیں۔

تفسیر

اللہ اور قرآن کے ذکر سے آغاز

سورہ کہف قرآن کی بعض دیگر سورتوں کی مانند اللہ کی حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے اور حمد چونکہ کسی اہم اور لائق تعریف کام پر ہوتی ہے لہٰذا ساتھ ہی نزولِ قرآن کا ذکر کیا گیا ہے، وہ قرآن کہ جو ہر قسم کی کجی سے پاک ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تعریف ہے اُس خدا کی جس نے اپنے بندے پر یہ آسمانی کتاب نازل کی کہ جس میں کسی قسم کا ٹیڑھ پن نہیں ہے (الحمد لله الذی انزل علی عبده الکتاب ولم یجعل له عوجًا)۔ ایسی کتاب ہے کہ جو ثابت و مستحکم ہے، جو معتدل و مستقیم ہے، جو حقیقی انسانی معاشرے کے قیام کے یلے ہے اور جو تمام آسمانی کتب کی پاسدار ہے (قیمًا)۔ تاکہ بُرے کام انجام دینے والوں اور دل کے اندھوں کو اللہ کے عذابِ شدید سے ڈرائے (لینذر بأسًا شدیدًا من لدنه)۔ اور سچے مومنین کہ جو ہمیشہ عملِ صالح انجام دیتے ہیں انہیں بشارت دے کہ عظیم اور عمدہ جزا ان کے انتظار میں ہے (ویبشر المؤمنین الذین یعملون الصالحات ان لهم اجرًا حسنًا)۔ ایسی جزاء کہ جو جاودانی ہے اور جس میں وہ تا ابد رہیں گے (ماکثین فیه ابدًا)۔

اس کے بعد یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا مشرکین ہر قسم کے مخالفین کے ایک عمومی انحراف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس آسمانی کتاب کا ایک ہدف یہ ہے کہ پیغمبر اُن لوگوں کو ڈرائے کہ جو خدا کے یلے بیٹے کے قائل ہیں (وینذر الذین قالوا اتخذ الله ولدًا)۔

یعنی — عیسائیوں کو ڈراتے چونکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ عیسٰی خدا کے بیٹے ہیں اور یہودیوں کو ڈرائے چونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور مشرکین کو ڈرائے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔

اس کے بعد اس قسم کے بے بنیاد عقائد کی اساس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: انہیں اپنے اس عقیدے کے بارے میں کوئی علم و یقین نہیں ہے اور اگر یہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کرتے ہیں تو ان کے آباؤ اجداد کا بھی یہی عالم تھا (مالهم به من علم ولا لاٰبائهم)۔ تاہم یہ منہ سے بہت بڑی اور وحشتناک

بات نکالتے ہیں (کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم)۔

خدا کا جسم ہونا، خدا کی اولاد ہونا، خدا کو مادی احتیاجات ہونا ــ مختصر یہ کہ خدا کا محدود ہونا ــ یہ کیسی وحشت ناک باتیں ہیں۔

جی ہاں ــ یہ صرف جھوٹ بولتے ہیں (ان یقولون الا کذبًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ حمدِ الٰہی سے سورہ کی ابتداء: قرآن مجید کی پانچ سورتیں "الحمد للہ" سے شروع ہوتی ہیں۔ ان پانچ سورتوں میں حمدِ الٰہی کے بعد زمین و آسمان کی خلقت (یا مالکیت) یا عالمین کی پرورش کا ذکر آیا ہے سوائے زیرِ بحث سورت کے۔ یہاں حمدِ الٰہی کے بعد رسول اللہؐ پر قرآن نازل ہونے کا ذکر آیا ہے۔

درحقیقت سورہ انعام، سبا، فاطر اور فاتحہ میں "کتابِ تکوین" کی بات کی گئی ہے لیکن سورہ کہف میں "کتابِ تدوین" کا ذکر کیا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ دو کتابوں یعنی عالمِ خلقت اور قرآن میں سے ہر ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور یہ بات اس امر کو واضح کرتی ہے کہ قرآن سارے عالمِ خلقت جتنا وزن رکھتا ہے اور یہ بھی جہانِ ہستی کی سی نعمت ہے اور اصولی طور پر عالمین کی پرورش و تربیت کا مسئلہ کہ جو "الحمد للہ رب العالمین" کے جملے میں آیا ہے، اس عظیم آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھائے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۲۔ مستحکم مستقیم اور نگہبان ــ کتاب: "قیّم" (بروزن "سیّد") "قیام" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہاں یہ لفظ مستحکم، ثابت اور استوار کے معنی میں ہے۔ علاوہ ازیں یہاں اس سے مراد ایسی کتاب ہے جو دوسری کتب کی محافظ و پاسدار ہو نیز ایسی کتاب کہ جو اعتدال و استقامت کی حامل ہو اور ہر قسم کی کجی اور ٹیڑھ پن سے پاک ہو۔

پہلے قرآن کو ہر قسم کی کجی سے پاک کہنے کے بعد اس لفظ سے قرآن کی توصیف کی گئی۔ گویا یہ قرآن کی استقامت، اس کے اعتدال ــــــــ اور ہر قسم کے تضاد سے پاک ہونے پر تاکید بھی ہے۔ اس عظیم کتاب کے جاودانی ہونے پر دلالت بھی ہے اور اصالتوں کی محافظ ہونے کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ نیز یہ ہر قسم کی کج روی سے اصلاح کرنے والی کتاب کا معنی بھی دیتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ کتاب احکام الٰہی اور انسانی عدالت و فضیلت کی نگہبانی کے لیے نمونہ بھی ہے۔

یہ صفت "قیّم" دراصل اللہ کی صفت "قیومیت" سے مشتق ہے جس کے مطابق خدا تمام موجودات اور اشیاءِ عالم کا محافظ و نگہبان ہے۔

؎ ما بہ تو قائم چو تو قائم بذات

ہم تجھ سے قائم ہیں چونکہ تُو قائم بالذات ہے ۔

قرآن چونکہ خدا کا کلام ہے اس کی بھی یہی حالت ہے ۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کی آیات میں لفظ "قیّم" دینِ اسلام کی صفت کے طور پر کئی مرتبہ استعال ہوا ہے ۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے :

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ

اپنے آپ کو قیّم ، پاک اور مستقیم دین کے ساتھ ہم آہنگ کرو ۔ (روم - ۴۳)

سطور بالا میں "قیّم" کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے ، یہ در اصل تمام تفاسیر کا ایک جامع مفہوم ہے جو اس سلسلے میں مفسّرین نے بیان کی ہیں ۔ کیونکہ بعض نے اسے اس کتاب کے معنی میں لیا ہے جو کبھی منسوخ نہیں ہوگی ۔ بعض نے گزشتہ کتب کی محافظ کے معنی میں لیا ہے ۔ بعض نے امورِ دین کو برپا کرنے والی کتاب کے مفہوم میں لیا ہے اور بعض نے ایسی کتاب کے معنی میں لیا ہے جس میں اختلاف و تضاد نہیں ہے ۔ لیکن یہ تمام معانی اس جامع مفہوم میں جمع ہیں جو ہم نے بیان کیا ہے ۔

بعض مفسّرین نے "لم یجعل له عوجا" کو الفاظِ قرآن کی فصاحت کے معنی میں لیا ہے جبکہ "قیّمًا" کو بلاغت اور مفہوم کی استقامت کے معنی میں لیا ہے[1] البتہ اس فرق کے لیے کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور زیادہ تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے تاکید کی مانند ہے ۔ فرق یہ ہے کہ "قیّم" کا مفہوم زیادہ وسیع ہے یعنی ذاتی استقامت کے مفہوم کے علاوہ دوسروں کی پاسداری ، اصلاح اور حفاظت بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے[2]

۳ ۔ خدا کے لیے اولاد کے قائل افراد کو خصوصی تنبیہ : مندرجہ بالا آیات میں وسیع اور مطلق طور پر انذار کے بعد ان لوگوں کو بالخصوص ڈرایا گیا ہے کہ جو خدا کے لیے اولاد کے قائل ہیں ۔ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ یہ انحراف خاص اہمیت رکھتا ہے ۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ اعتقادی انحراف عیسائیوں ہی سے مخصوص نہیں بلکہ یہود و مشرکین بھی اس میں شریک تھے اور جب یہ قرآن نازل ہو رہا تھا تو یہ ایک طرح کا عمومی اعتقاد تھا ۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسا عقیدہ روحِ توحید کو بالکل ختم کر دیتا ہے اور خدا کو مادی و جسمانی موجودات کی صف میں لے آتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کے لیے انسانی جذبات و احساسات کا قائل ہوا جائے ، اس کے لیے شبیہ و شریک مانا جائے اور اسے حاجتمند شمار کیا جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس بات کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے ۔

---

[1] روح المعانی ، ج ۱۵ ، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ۔

[2] "قیّما" ترکیبِ نحوی کے لحاظ سے حال ہے اور اس میں عامل "انزل" ہے ۔

سورہ یونس کی آیہ ۶۸ میں ہے :

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ

انہوں نے کہا کہ خدا کا بیٹا ہے، حالانکہ وہ غنی و بے نیاز ہے۔

سورہ مریم کی آیہ ۸۸ تا ۹۱ میں ہے :

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝

انہوں نے کہا کہ رحمٰن کا بیٹا ہے۔ تمہاری یہ بات بہت ہی ناموزوں اور سنگین ہے قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر پڑیں کیونکہ تم خدا کے لیے بیٹے کے قائل ہو۔

یہ انتہائی سخت اندازِ کلام اس بات کی دلیل ہے کہ غلط اعتقاد کا نتیجہ اور انجام بہت ہی بُرا ہے۔ اس کے منحوس اثرات بہت وسیع ہیں اور درحقیقت ہے بھی ایسا ہی کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کو اوجِ عظمت سے نیچے لے آیا جائے اور اسے پست مادی موجودات کی صف میں لاکھڑا کیا جائے[1]

۴۔ **دعویٰ، بلا دلیل :** انحرافی عقائد کا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر دعویٰ بلا دلیل کے مترادف ہیں۔ بعض اوقات یہ جھوٹے نعروں کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ کوئی نعرہ بلند کرتا ہے اور دوسرے اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ یا بڑے بوڑھوں کے رسم و رواج کی صورت میں کوئی عقیدہ ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

ضمنی طور پر قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ہر صورت میں ہم بے دلیل دعووں سے پرہیز کریں چاہے وہ کسی طرف سے اور کسی شخص کی جانب سے ہوں۔

مندرجہ بالا آیات میں اس قسم کے کام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بہت بڑی اور وحشتناک بات ہے اور ایسی بات کو جھوٹ کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔

یہ ایک ایسی بنیادی بات ہے کہ اگر مسلمان اپنی ساری زندگی میں اس کی پیروی کریں یعنی بلا دلیل نہ کچھ کہیں اور نہ کوئی بات قبول کریں اور پراپیگنڈا و دلیل سے عاری دعووں کی پرواہ نہ کریں تو ان کی بہت سی پریشانیاں اور مشکلات دور ہو جائیں۔

۵۔ **عملِ صالح ـ ایک مسلسل طرزِ عمل :** مندرجہ بالا آیات میں مومنین کے بارے میں

---

[1] تثلیث اور خدا کی اولاد ہونے کے مسئلہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۶۵۳ پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ (اردو ترجمہ)

گفتگو کرتے ہوئے "عمل صالح" کو اس کا مسلسل اور دائمی طرزِ عمل قرار دیا گیا ہے کیونکہ "یعملون الصالحات" فعل مضارع ہے اور ہم جانتے ہیں کہ فعل مضارع تسلسل اور دوام پر دلالت کرتا ہے۔

حقیقت میں ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ چند ایک نیک کام تو ہو سکتا ہے اتفاقاً یا بعض وجوہ کی بناء پر انجام پا جائیں لہٰذا وہ ہرگز حقیقی ایمان کے لیے دلیل نہیں ہو سکتے۔ حقیقی ایمان کی دلیل تو ایسا عمل صالح ہے جس میں تسلسل اور دوام ہو۔

۴۔ جس نے اپنے "بندہ" پر کتاب نازل کی: زیرِ نظر آیات میں آسمانی کتاب کے نازل ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

شکر ہے اس خدا کا جس نے اپنے "بندہ" پر کتاب نازل فرمائی ہے۔

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ "بندہ" کی تعبیر انتہائی فخریہ اور باعظمت ہے۔ یہ وصف اسی انسان کا ہو سکتا ہے جو واقعاً اللہ کا بندہ ہو۔ جو اپنی ہر چیز کو اُس سے وابستہ سمجھے۔ جس کی آنکھ اور کان اُس کے حکم پر لگے ہوں۔ جو اس کے غیر کا تصور بھی نہ کرے۔ جو اس کی راہ کے علاوہ کسی راہ پر نہ چلے۔ ایسے شخص ہی کو یہ افتخار اور اعزاز حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا پاکباز بندہ ہو۔

(۶) فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ○

(۷) اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ○

(۸) وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ○

ترجمہ

(۶) اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم غم کے مارے اپنی جان دے بیٹھو گے۔

(۷) جو کچھ رُوئے زمین پر ہے اسے ہم نے اس کی زینت قرار دیا ہے تاکہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ بہتر عمل ان میں کون کرتا ہے۔

(۸) (لیکن یہ زیب و زینت پائیدار نہیں ہے) اور آخر کار ہم رُوئے زمین کو چٹیل میدان بنا دیں گے۔

تفسیر

غم نہ کرو۔ یہ دنیا آزمائش گاہ ہے

گزشتہ آیات میں رسولِ اکرمؐ کی رسالت اور رہبری کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ نظر پہلی آیت میں رہبری کی ایک نہایت اہم شرط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے ہمدردی اور غمخواری۔ ارشاد ہوتا ہے: گویا تُو اس شدتِ غم میں اپنی جان دے بیٹھے گا کہ یہ لوگ آسمانی کتاب پر ایمان نہیں لاتے

(فلعلك باخع نفسك علیٰ اٰثارھم ان لم یؤمنوا بھٰذا الحدیث اسفًا)۔

چند توجہ طلب نکات

۱۔ "باخع" کا مفہوم: "باخع" "بخع" (بروزن "نخل") کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے اپنے آپ کو شدتِ غم سے مار ڈالنا۔

۲۔ "اسفًا" کا مطلب: "اسفًا" غم و اندوہ کی شدت ظاہر کرتا ہے۔ یہ لفظ یہاں اس امر کی تاکید کے لیے ہے۔

۳۔ "اٰثار" کا معنی: "اٰثار" "اثر" کی جمع ہے۔ یہ دراصل نشان پا کے معنی میں ہے لیکن کسی چیز کی جو علامت باقی رہ جائے اسے بھی "اثر" کہتے ہیں۔ یہاں اس لفظ کا استعمال ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ یہ کہ کبھی انسان ایک جگہ سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر تو اس کے آثار باقی رہتے ہیں لیکن زیادہ وقت گزر جائے تو آثار بھی محو ہو جاتے ہیں یعنی تُو ان کے ایمان نہ لانے سے اس قدر پریشان ہے کہ تُو چاہتا ہے کہ ان کے آثار محو ہونے سے پہلے تُو اپنے آپ کو غم و اندوہ سے مار ڈالے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "آثار" سے مراد ان کے آثار و کردار ہوں۔

۴۔ قرآن کے لیے لفظ "حدیث": قرآن کو "حدیث" کہنا اس کتاب کے تازہ نزول کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ اتنی زحمت بھی نہیں کرتے کہ اس کتاب کا مطالعہ کریں کہ جو تازہ نازل شدہ ہے اور جس کے مضامین نئے ہیں۔ یہ انتہائی بے خبری کی دلیل ہے کہ انسان کسی نئی چیز کے پاس سے لاپرواہی سے گزر جائے۔

۵۔ غمخوار ہادی: آیاتِ قرآن اور تاریخ سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی رہبر لوگوں کی گمراہی پر کسی کے تصور سے زیادہ دکھی ہوتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ لوگ ایمان لے آئیں چونکہ وہ دیکھ رہے ہوتے تھے کہ لوگ پیاسے ہیں، صاف و شفاف چشمے کے پاس بیٹھے ہیں اور پھر بھی پیاس کی شدت سے فریاد کناں ہیں۔ ہادیانِ برحق اس حالت پر پریشان ہوتے، آنسو بہاتے، دعا کرتے اور رات دن کوشش کرتے تھے۔ چھپ چھپا کر بھی تبلیغ کرتے۔ کھلے بندوں بھی پیغامِ حق پہنچاتے۔ خلوت و جلوت میں فرد اور اجتماع کو دعوت دیتے۔ اس بات پر بہت ملول ہوتے کہ لوگوں نے سیدھی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ان کے اندوہ کا یہ عالم ہوتا کہ کبھی ایسا لگتا کہ وہ اس غم میں جان دے بیٹھیں گے۔

واقعاً رہبر جب تک ایسا غمخوار نہ ہو رہبری کا عمیق مفہوم عملی جامہ نہیں پہن سکتا۔

بعض اوقات غم کی یہ حالت اس قدر شدید ہو جاتی کہ خود رسول اللہؐ کی جان خطرے میں پڑ جاتی اور ایسے میں اللہ تعالیٰ ان کی دلجوئی کرتا ہے اور انہیں تسلی دیتا۔

سورہ شعراء کی آیہ ۳ اور ۴ میں ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۝ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ۝

تُو تو گویا اپنی جان دے ڈالے گا کہ وہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ غم نہ کر، ہم نے انہیں فاعل مختار بنایا ہے اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ان کو ایسی آیت بھیجیں کہ ان کی گردن بلا اختیار اس کے سامنے جھک جاتی۔

اگلی آیت میں اس عالم کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا انسانوں کے لیے میدانِ آزمائش ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ روئے زمین پر ہے اسے ہم نے اس کی زینت قرار دیا ہے (انا جعلنا ما علی الارض زینة لها)۔ ہم نے دنیا کو حسین بنایا ہے۔ اس کا ہر گوشہ دل کو کھینچتا ہے، نگاہوں کو دعوتِ دیدار دیتا ہے اور انسان میں مختلف احساسات کو ابھارتا ہے۔ جذبات کی یہ کشاکش، خوبصورت چیزوں کی یہ چمک دمک اور دلربا چہروں کی یہ جاذبیت انسان کے لیے آزمائش ہے۔ انسان کا ایمان، ارادے کی قوت اور معنویت و فضیلت ہر چیز کا امتحان ہو جاتا ہے۔

لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: تاکہ انہیں آزمائیں کہ ان میں سے بہتر عمل کون انجام دیتا ہے (لنبلوهم ایهم احسن عملاً)۔

بعض مفسرین نے "ما علی الارض" کا مفہوم علماء میں محدود کرنا چاہا ہے۔ بعض نے اس سے صرف مرد مراد لیے ہیں اور کہا ہے کہ زمین کی زینت یہی ہیں لیکن اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں روئے زمین کی تمام موجودات شامل ہیں۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ یہاں "احسن عملاً" کی تعبیر استعمال ہوئی ہے نہ کہ "اکثر عملاً" کی۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں حسنِ عمل اور عمل کی اعلیٰ کیفیت کی قدر و قیمت ہے نہ کہ کثرت و کمیت کی۔

بہرحال یہ تمام انسانوں بالخصوص تمام مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ اور صدائے بیدار باش ہے اور انہیں متوجہ کیا جا رہا ہے کہ دنیا کی دلربائیوں سے ضرب نہ کھائیں کیونکہ یہ دنیا تو میدانِ آزمائش ہے۔ ان دلفریب مظاہر سے دل لگانے کی بجائے حُسنِ عمل کے بارے میں سوچیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ پائدار نہیں ہے اور آخر کار نابود ہو جائے گی اور ہم روئے زمین کی تمام چیزوں کو ختم کر دیں گے۔ اور صفحۂ ارض کو چٹیل میدان میں بدل کے رکھ دیں گے (وانا لجاعلون

ماعلیھا صعیدًا جرزًا)۔

"صعید" "صعود" کے مادہ سے ہے۔ یہاں سطح زمین کے معنی میں ہے۔ وہ سطح کہ جس میں مٹی پوری طرح نمایاں ہو۔ "جرز" اس زمین کو کہتے ہیں جس میں گھاس نہ اُگتی ہو، گویا وہ اپنی گھاس کو کھا جاتی ہو۔ دوسرے لفظوں میں "جرز" اس زمین کو کہتے ہیں کہ خشک سالی کی وجہ سے جس کے پودے ختم ہوگئے ہوں۔

جی ہاں! یہ حسین اور دل انگیز مناظر کہ جو فصلِ بہار میں صحراؤں اور کوہساروں کے دامن میں دکھائی دیتے ہیں، پھولوں کی مسکراہٹیں، جھومتے ہوئے شجر، سرگوشیاں کرتے ہوئے پتے، ندی نالوں کے نغمے۔ سب فصلِ خزاں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ درختوں کی شاخیں قربان ہو جاتی ہیں۔ ندی نالے خاموش ہو جاتے ہیں۔ غنچے خشک ہو جاتے ہیں، پتے مرجھا جاتے ہیں اور زندگی کی آواز چُپ ہو جاتی ہے۔

انسانوں کی رنگین زندگی کا بھی یہی عالم ہے۔ یہ محل اور یہ فلک بوس عمارتیں، یہ رنگارنگ لباس یہ گوناں گوں نعمتیں، یہ خدام اور یہ مقام و منصب سب ختم ہو جانے والی چیزیں ہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ خشک و خاموش قبرستان کے سوا کچھ باقی نہیں ہوگا، اور یہ ایک بہت بڑا درسِ عبرت ہے۔

(۹) اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝

(۱۰) اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝

(۱۱) فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝

(۱۲) ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝

ترجمہ

(۹) کیا تم خیال کرتے ہو کہ اصحابِ کہف و رقیم ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے۔

(۱۰) وہ وقت یاد کرو جب جوانوں کے اس گروہ نے غار میں جا پناہ لی اور کہا: پروردگارا! ہمیں اپنی رحمت سے نواز اور ہمیں راہ نجات فراہم کر۔

(۱۱) ان کے کانوں پر ہم نے (نیند کا) پردہ ڈال دیا اور وہ سالہا سال تک غار میں سوئے رہے۔

(۱۲) پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ واضح ہو جائے کہ ان دو گروہوں میں سے کسے اپنی نیند کی مدت خوب یاد ہے۔

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیات کی مفسرین نے ایک شانِ نزول نقل کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش کے سرداروں نے اپنے دو ساتھی پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کی تحقیق کے لیے علماء یہود کے پاس مدینہ بھیجے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا گزشتہ کتب میں اس سلسلے میں کوئی چیز ملتی ہے۔

انہوں نے مدینہ پہنچ کر علماء یہود سے رابطہ کیا۔ اُن سے ملے اور قریش کی بات بیان کی، تو یہودی علماء نے کہا: تم محمد (ص) سے تین مسائل کے بارے میں سوال کرو۔ اگر اس نے سب کا کافی و وافی جواب دے دیا تو وہ خدا کی طرف سے رسول ہے۔

(بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر محمد (ص) نے دو سوالوں کا جواب کافی و وافی اور ایک سوال کا جواب اجمالی دیا تو پھر وہ رسول ہے)۔

انہوں نے بات جاری رکھی: سب سے پہلے پوچھنا کہ بہت مدت پہلے جو چند جوان اپنی قوم سے جُدا ہو گئے تھے، وہ کون تھے؟ کیونکہ ان کی داستان اور جو اُن کے ساتھ گزری بہت عجیب و غریب ہے۔

علماء یہود کہنے لگے: پھر سوال کرنا کہ وہ کون ہے جس نے پوری زمین کا چکر لگایا اور زمین کے مشرق و مغرب تک جا پہنچا۔ اس کا واقعہ کس طرح ہے۔

انہوں نے کہا: نیز یہ بھی پوچھنا کہ روح کی حقیقت کیا ہے؟

قریش کے نمائندے واپس مکہ سرداران قریش کے پاس پہنچ گئے اور کہا: ہم نے محمد (ص) کے سچ اور جھوٹ کی پہچان کا معیار پا لیا ہے۔

پھر انہوں نے اپنا سارا واقعہ سنایا۔

اس کے بعد وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچے اور اپنے سوالات آپؐ کی خدمت میں پیش کیے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: مَیں تمہیں کل جواب دوں گا۔

لیکن آپؐ نے انشاء اللہ نہ کہا۔ پندرہ دن گزر گئے لیکن اللہ کی طرف سے رسول اللہؐ پر کوئی وحی نازل نہ ہوئی اور جبرائیلؑ آپؐ کے پاس نہ آئے۔ اس پر اہل مکہ پراپیگنڈا کرنے لگے اور طرح طرح کی غلط باتیں بنانے لگے۔

رسول اللہؐ پر یہ بات بہت گراں گزری۔ آخرکار جبرائیل آئے اور خدا کی طرف سے سورہ کہف لائے۔ اس میں ان جوانوں کی داستان بھی تھی اُس سیاحِ عالم کا واقعہ بھی تھا۔ علاوہ ازیں آپؐ پر آیہ "ویسئلونک عن الروح ..." بھی نازل ہوئی۔

آنحضرتؐ نے جبرائیلؑ سے پوچھا: اتنی تاخیر کیوں کی؟

انہوں نے کہا: مَیں آپؐ کے رب کے حکم کے علاوہ نازل نہیں ہو سکتا۔ مجھے اجازت نہیں دی گئی۔

یاد دہانی ضروری ہے کہ مذکورہ تین سوالوں میں سے دو کے جواب اسی سورہ میں آئے ہیں لیکن رُوح سے متعلقہ آیت سورہ بنی اسرائیل میں گزر چکی ہے۔ اور ایسی مثالیں قرآن میں اور بھی ہیں کہ ایک آیت

ایک خاص مطلب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور رسول اللہؐ کے حکم پر اسے کسی خاص سورت میں خاص مقام پر جگہ دی گئی۔

تفسیر

اصحاب کہف کا واقعہ شروع ہوتا ہے

گزشتہ آیات میں اس دنیا کی زندگی کے بارے میں بتایا گیا تھا اور یہ واضح کیا گیا تھا کہ یہ دُنیا انسان کے لیے آزمائش ہے۔ قرآن چونکہ عمومی حساس مسائل کے لیے کئی ایک مثالیں پیش کرتا ہے یا گزشتہ تاریخ سے نمونے پیش کرتا ہے لہٰذا یہاں بھی پہلے اصحابِ کہف کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور ان کا ذکر ایک نمونۂ عمل کے طور پر کیا گیا ہے۔

چند بیدار فکر اور با ایمان نوجوان تھے۔ وہ ناز و نعمت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے عقیدے کی حفاظت اور اپنے زمانے کے طاغوت سے مقابلے کے لیے ان سب نعمتوں کو ٹھوکر مار دی پہاڑ کے ایک غار میں جا پناہ لی۔ وہ غار کہ جس میں کچھ بھی نہ تھا۔ یہ اقدام کر کے انہوں نے راہِ ایمان میں اپنی استقامت اور پامردی ثابت کر دی۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس مقام پر قرآن فنِ فصاحت و بلاغت کے ایک اصول سے کام لیتے ہوئے پہلے ان افراد کی سرگزشت کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے تاکہ سننے والوں کا ذہن مائل ہو جائے۔ اس سلسلے میں چار آیات میں واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد چودہ آیات میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحابِ کہف و رقیم ہماری عجیب آیات میں سے تھے (ام حسبت ان اصحاب الکهف والرقیم کانوا من اٰیاتنا عجبًا)۔

زمین و آسمان میں ہماری بہت سی عجیب آیات ہیں کہ جن میں سے ہر ایک عظمتِ تخلیق کا ایک نمونہ ہے۔ خود تمہاری زندگی میں عجیب اسرار موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک تمہاری دعوت کی حقانیت کی نشانی ہے اور اصحابِ کہف کی داستان مسلّماً ان سے عجیب تر نہیں ہے۔

"اصحابِ کہف" (اصحابِ غار) کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی جان بچانے کیلئے غار میں پناہ لی تھی جس کی تفصیل ان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے آئے گی۔

لیکن "رقیم" دراصل "رقم" کے مادہ سے لکھنے کے معنی میں ہے[1] زیادہ تر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ

---

[1] مفردات میں راغب کہتا ہے کہ "رقم" (بروزن "زخم") سخت اور رنگ آلود راستے کو کہتے ہیں اور بعض اسے خط پر نقطے لگنے کے معنی میں سمجھتے ہیں۔

(بہر حال "رقیم" کتاب، تختی یا نامہ کو کہتے ہیں کہ جس پر کچھ لکھا گیا ہو)۔

اصحاب کہف کا دوسرا نام ہے کیونکہ آخرکار اُس کا نام ایک تختی پر لکھا گیا اور اسے غار کے دروازے پر نصب کیا گیا۔

بعض اسے اس پہاڑ کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں یہ غار تھی اور بعض اس زمین کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں وہ پہاڑ تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اُس شہر کا نام ہے جس سے اصحاب کہف نکلے تھے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

رہا بعض کا یہ احتمال کہ اصحاب کہف اور تھے اور اصحاب رقیم اور تھے بعض روایات میں ان کے بارے میں ایک داستان بھی نقل کی گئی ہے، یہ ظاہر آیت سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ زیرنظر آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اصحاب کہف و رقیم ایک ہی گروہ کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ ان دو الفاظ کے استعمال کے بعد صرف "اصحاب کہف" کہہ کر داستان شروع کی گئی ہے اور ان کے علاوہ ہرگز کسی دوسرے گروہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ صورت حال خود ایک ہی گروہ ہونے کی دلیل ہے۔

جو افراد غار میں بند ہو گئے تھے ان میں سے تین کے بارے میں تفسیر نور الثقلین میں مشہور روایات ذکر ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے خدا کو اپنے ایک خالص عمل کا واسطہ دیا جس کی وجہ سے انہیں اس تنگ و تاریک مقام سے رہائی ملی۔ ان روایات میں "اصحاب رقیم" کے نام کی کوئی بات نہیں ہے اگرچہ بعض کتب تفسیر میں اس عنوان کے تحت بات کی گئی ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کرنا چاہیئے کہ "اصحاب کہف و رقیم" ایک ہی گروہ کی طرف اشارہ ہے اور آیات کی شانِ نزول بھی اسی حقیقت کی تائید کرتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس وقت کا سوچ جب چند جوانوں نے ایک غار میں جا پناہ لی (اذ اوی الفتیۃ الی الکھف)۔

جب وہ ہر طرف سے مایوس تھے، انہوں نے بارگاہِ خدا کا رُخ کیا۔ اور عرض کی: پروردگارا! ہمیں اپنی رحمت سے بہرہ ور کر" (فقالوا ربنا اٰتنا من لدنک رحمۃ) اور ہمارے لیے راہِ نجات پیدا کر دے (وھیء لنا من امرنا رشدًا)۔

ایسی راہ کہ جس سے ہمیں اس تاریک مقام سے چھٹکارا مل جائے اور تیری رضا کے قریب کر دے۔

ایسی راہ کہ جس میں خیر و سعادت ہو اور ذمہ داری ادا ہو جائے۔

ہم نے ان کی دُعا قبول کی۔ ان کے کانوں پر خواب کے پردے ڈال دیئے اور وہ سالہا سال تک غار میں سوئے رہے (فضربنا علٰی اٰذانھم فی الکھف سنین عددًا)۔

پھر ہم نے انہیں اٹھایا اور بیدار کیا تاکہ ہم دیکھیں کہ ان میں سے کون لوگ اپنی نیند کی مدت کا بہتر حساب لگاتے ہیں (ثم بعثنٰھم لنعلم ای الحزبین احصٰی لما لبثوا امدًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ "اوی الفتیۃ" کا مفہوم: "اوی" "مأوی" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ اس کا معنی ہے "امن وامان کی جگہ"۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ فاسد اور بُرے ماحول سے بھاگ کر یہ جوان جب غار میں پہنچے تو انہیں سکون و آرام محسوس ہوا۔

۲۔ "فتیۃ" "فتی" کی جمع ہے۔ دراصل یہ نوخیز و سرشار جوان کے معنی میں ہے البتہ کبھی کبھار بڑی عمر والے ان افراد کے لیے بھی بولا جاتا ہے کہ جن کے جذبے جوان اور سرشار ہوں۔ اس لفظ میں عام طور پر جوانمردی حق کے لیے ڈٹ جانے اور حق کے حضور تسلیم خم کرنے کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔

اس امر کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی۔

امامؑ نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا: "فتی" کس شخص کو کہتے ہیں؟

اُس نے جواباً عرض کیا: "فتیٰ" نوجوان کو کہتے ہیں۔

امامؑ نے فرمایا:

اما علمت ان اصحاب الکھف کانوا کلھم کھولا، فسماھم اللہ فتیۃ بایمانھم

کیا تجھے نہیں پتہ کہ اصحاب کہف پکی عمر کے آدمی تھے لیکن اللہ نے انہیں "فتیہ" کہا ہے اس لیے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا:

من اٰمن باللہ واتقی فھو الفتیٰ

جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور تقویٰ اختیار کیے ہو وہ "فتیٰ" (جوانمرد) ہے[1]

روضۃ الکافی میں امام صادقؑ سے ایسی ہی ایک اور حدیث بھی منقول ہے[2]

۳۔ "من لدنک رحمۃ" کا مفہوم: اس کا معنی ہے: "تیری طرف سے رحمت" یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ جب انہوں نے غار میں پناہ لی تو دیکھا کہ کچھ ان کے بس میں نہیں رہا اور تمام ظاہری اسباب بے کار ہو گئے ہیں۔ ایسے میں انہیں صرف رحمتِ الٰہی کی امید تھی۔

۴۔ "ضربنا علیٰ اٰذانھم" کا مطلب: "ہم نے ان کے کانوں پر پردہ ڈال دیا" عربی میں یہ سُلانے کے لیے ایک لطیف کنایہ ہے کسی شخص کے کان پر پردہ ڈالنا ــ گویا وہ کسی کی بات نہ

---

[1] و [2] نورالثقلین، ج ۳ ص ۲۴۴ و ص ۲۴۵۔

سُننے اور اس پردے سے مراد نیند ہی کا پردہ ہے۔

اسی بنا پر حقیقی نیند وہی ہے جو انسان کے کانوں کو گویا بے کار کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ سوئے ہوئے کسی انسان کو بیدار کرنا ہو تو اسے آواز دیتے ہیں تاکہ اس کی قوتِ شنوائی پر اثر ہو اور وہ بیدار ہو جائے۔

۵۔ "سنین عددا" کا مطلب: اس کا معنی ہے "متعدد سال"۔ یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ سالہا سال سوئے رہے جیسا کہ اس واقعے کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ آیات کی تفسیر میں آئے گی۔

۶۔ "بعثناھم" کا مفہوم: یہ تعبیر ان کے بیدار ہونے کے بارے میں آئی ہے۔ شاید یہ لفظ اس لیے آیا ہے کہ ان کی نیند اتنی لمبی ہوگئی تھی کہ گویا موت کی طرح تھی اور ان کی بیداری قیامت اور بعد از موت اٹھنے کی مانند تھی۔

۷۔ "لنعلم" کا مطلب: اس کا معنی ہے: "تاکہ ہم جان لیں"۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ خدا کوئی نیا علم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایسی تعبیریں قرآن میں بہت آئی ہیں۔ ان کا مطلب ہے کہ خدا کو جو کچھ معلوم ہے وہ عملاً رونما ہو جائے یعنی ہم نے انہیں نیند سے بیدار کیا تاکہ یہ معنی عملی صورت اختیار کرلے کہ وہ اپنی نیند کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔

۸۔ "ای الحزبین" کا مفہوم: اس سلسلے کی وضاحت آئندہ آیات سے ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ جب وہ جاگے تو انہوں نے اپنے سونے کی مقدار کے بارے میں اختلاف کیا۔ بعض سمجھتے تھے کہ وہ ایک دن سوئے ہیں۔ بعض کا خیال تھا کہ وہ آدھا دن سوئے ہیں حالانکہ وہ سالہا سال تک سوئے رہے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ "اصحاب رقیم" اور تھے اور "اصحاب کہف" اور تھے۔ یہ خیال بہت بعید ہے۔ اس کے بارے میں زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں[1]

---

[1] یہ نظریہ "اعلام القرآن" کے صفحہ ۱۷۹ پر ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۳) نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝

(۱۴) وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝

(۱۵) هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۚ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝

(۱۶) وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝

ترجمہ

(۱۳) ہم تجھ سے ان کا صحیح واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ ایسے جوانمرد تھے کہ جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے انہیں مزید ہدایت فرمائی۔

(۱۴) ہم نے ان کے دل مضبوط کیے جبکہ انہوں نے قیام کیا اور کہا: ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اس کے علاوہ ہرگز کسی کی پرستش نہیں کریں گے۔ اگر ہم ایسی بات کریں تو ہم نے بیہودہ بات کی۔

(۱۵) ہماری اس قوم نے اس کی بجائے اوروں کو معبود بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ ان معبودوں کے لیے کوئی واضح دلیل کیوں پیش نہیں کرتے۔ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے۔

(۱۶) اور جس وقت ان لوگوں سے اور ان سے کہ اللہ کی بجائے جن کی یہ پرستش کرتے ہیں، تم کنارہ کشی اختیار کر لو تو غار میں جا پناہ لو کہ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت (کا سایہ) کرے گا اور تمہارے لیے آسائش و نجات کی راہ کھول دے گا۔

تفسیر

داستانِ اصحابِ کہف کی تفصیل

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اجمالی طور پر واقعہ بیان کرنے کے بعد چودہ آیتوں میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ گفتگو کا آغاز یوں کیا گیا ہے: ان کی داستان، جیسا کہ ہے، ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں (نحن نقص علیك نبأھم بالحق)۔ ہم اس طرح سے واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کی فضول بات بے بنیاد چیزوں اور غلط باتوں سے پاک ہو گا۔

وہ چند جوانمرد تھے کہ جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت اور بڑھا دی تھی (انھم فتیة اٰمنوا بربھم وزدناھم ھدی)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "فتیہ"، "فتیٰ" کی جمع ہے کہ جو نوخیز و سرشار جوان کے معنی میں ہے لیکن چونکہ جوانی میں انسان کا بدن قوی ہوتا ہے اس کے جذبات میں جوش و خروش ہوتا ہے۔ روحانی اعتبار سے دل نورِ حق قبول کرنے اور محبت، سخاوت اور عفو و درگزر کے جذبوں کے لیے زیادہ آمادہ ہوتا ہے لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ "فتیٰ" اور "فتوت" اگر بڑی عمر والوں کے لیے بولا جائے تو مجموعی طور پر ان صفات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے لفظ "جوانمردی" اور "فتوت" فارسی زبان میں بھی انہیں معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

آیاتِ قرآن سے اجمالی طور پر اور تاریخ سے تفصیلی طور پر یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب کہف جس دَور اور ماحول میں رہتے تھے اس میں کفر و بت پرستی کا دَور دورہ تھا۔ ایک ظالم حکومت کہ جو عام طور پر شرک، کفر، جہالت، غارت گری اور ظلم کی محافظ تھی لوگوں کے سروں پر مسلط تھی۔ لیکن یہ جوانمرد کہ جو ہوش و

صداقت کے حامل تھے آخر کار اس دین کی خرابی کو جان گئے۔ انہوں نے اس کے خلاف قیام کا مصمم ارادہ کر لیا اور فیصلہ کیا کہ اگر اس دین کے خاتمے کی طاقت نہ ہوئی تو ہجرت کر جائیں گے۔ اسی لیے گزشتہ بحث کے بعد قرآن کہتا ہے: جب انہوں نے قیام کیا اور کہا کہ ہمارا رب آسمان وزمین کا پروردگار ہے، ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا (وربطنا علیٰ قلوبھم اذ قاموا فقالوا ربنا رب السمٰوات والارض)۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس کے علاوہ کسی معبود کی ہرگز پرستش نہیں کریں گے (لن ندعوا من دونہ الٰھًا)۔ اگر ہم ایسی بات کریں اور اس کے علاوہ کسی کو معبود سمجھیں تو ہم نے بے ہودہ اور حق سے دُور بات کہی (لقد قلنا اذًا شططًا)۔

"ربطنا علیٰ قلوبھم" سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کے دل میں توحید کی فکر پیدا ہوئی لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ خدا نے ان کے دلوں کو ڈھارس دی اور انہیں یہ طاقت بخشی کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور علی الاعلان صدائے توحید بلند کریں۔

کیا انہوں نے یہ اعلان سب سے پہلے اس دَور کے ظالم بادشاہ دقیانوس کے سامنے کیا یا عام لوگوں کے سامنے یا دونوں کے سامنے یا آپس میں ایک دوسرے کے سامنے؟ یہ بات صحیح طور پر واضح نہیں ہے لیکن "قاموا" کی تعبیر کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے یہ اعلان ظالم بادشاہ کے سامنے کیا۔

"شطط" (بروزن "وسط") حد سے نکل جانے اور بہت دور چلے جانے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا وہ باتیں کہ جو حق سے بہت دور ہوں انہیں "شطط" کہا جاتا ہے اور یہ جو بڑے دریاؤں کے ساحل کو "شط" کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پانی سے دُور اور بلند ہوتا ہے۔

ان باایمان جوانمردوں نے واقعاً توحید کے اثبات اور "الٰھہ" کی نفی کے لیے واضح دلیل کا سہارا لیا اور وہ یہ کہ ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ آسمان وزمین کا کوئی مالک اور پروردگار ہے کہ وجود نظام خلقت جس کے وجود کی دلیل ہے اور ہم بھی اس عالم ہستی کا ایک حصہ ہیں لہٰذا ہمارا پروردگار بھی وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔

اس کے بعد وہ ایک اور دلیل سے متوسل ہوئے اور وہ یہ کہ "ہماری اس قوم نے خدا کے علاوہ معبود بنا رکھے ہیں" (ھٰؤلاء قومنا اتخذوا من دونہ اٰلھۃ)۔ تو کیا دلیل و برہان کے بغیر بھی اعتقاد رکھا جا سکتا ہے۔ "وہ ان کی الوہیت کے بارے میں کوئی واضح دلیل پیش کیوں نہیں کرتے (لولا یأتون علیھم بسلطان بیّن)۔ کیا تصور، خیال یا اندھی تقلید کی بناء پر یہ ایسا عقیدہ اختیار کیا جا سکتا ہے؟ یہ کیسا کھلا ظلم اور عظیم انحراف ہے؟ "اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے (فمن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبًا)۔

یہ افتراء اپنے اوپر بھی ظلم ہے اور معاشرے پر بھی۔ اپنے اوپر اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح

بدبختی اور تباہی کے سپرد کر دیتا ہے اور معاشرے پر اس طرح کہ یہی عقیدہ وہ اس میں پیش کرتا ہے اور اسے بھی انحراف کی طرف کھینچتا ہے اور یہ ساحتِ قدس پروردگار میں بھی ظلم ہے اور اس کے مقام بزرگی کی اہانت ہے ۔

ان توحید پرست جواں مردوں نے بہت کوشش کی کہ لوگوں کے دلوں سے شرک کا زنگ اتر جائے اور ان کے دلوں میں توحید کی کونپل پھوٹ پڑے لیکن وہاں تو بتوں اور بُت پرستی کا ایسا شور تھا اور ظالم بادشاہ کے ظلم و بے داد کا ایسا خوف تھا کہ گویا سانس مخلوقِ خدا کے سینے میں گھٹ کے رہ گئی تھی اور نغمۂ توحید ان کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا ۔

لہٰذا انہوں نے مجبوراً اپنی نجات کے لیے اور بہتر ماحول کی تلاش کے لیے ہجرت کا عزم کیا ۔ لہٰذا باہمی مشورے ہونے لگے کہ کہاں جائیں ، کس طرف کو کوچ کریں ۔ آپس میں کہنے لگے : "جب اس بت پرست قوم سے کنارہ کشی اختیار کرلو اور خدا کو چھوڑ کر جنہیں یہ پُوجتے ہیں ان سے الگ ہو جاؤ اور اپنا حساب کتاب ان سے جدا کرلو تو غار میں جا پناہ لو" (واذ اعتزلتموھم وما یعبدون الا اللہ فأوٗا الی الکھف) تاکہ تمہارا پروردگار تم پر اپنی رحمت کا سایہ کر دے اور اس مشکل سے نکال کر تمہیں نجات کی راہ پر ڈال دے (ینشر لکم ربکم من رحمتہ ویھیئ لکم من امرکم مرفقا) ۔

"یھیئ" "تھیہ" کے مادہ سے تیار کرنے کے معنی میں ہے ۔

اور "مرفق" اس چیز کو کہتے ہیں جو آرام و راحت اور مہربانی کا ذریعہ بنے ۔ لہٰذا "یھیئ لکم من امرکم مرفقا" کا معنی ہے "خدا تمہارے لیے راحت و آرام کا ذریعہ فراہم کر دے" ۔

بعید نہیں کہ "نشر رحمۃ" گزشتہ جملے میں اللہ کے الطافِ معنوی کی طرف اشارہ ہو جبکہ دوسرا جملہ جسمانی و مادی نجات و آرام کی طرف اشارہ ہو ۔

چند اہم نکات

۱۔ ایمان اور جوانمردی کا رشتہ : توحید پرستی اور اعلیٰ انسانی صفات ہمیشہ ساتھ ساتھ ہوتی ہیں ۔ توحید پرستی ، اعلیٰ انسانی صفات کے لیے سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ایک دوسرے کے لیے باہمی تاثیر رکھتی ہیں ۔ اسی بناء پر اصحاب کہف کی داستان میں ہے :

وہ ایسے جوانمرد تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ۔

یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے کہا ہے :

رأس الفتوۃ الایمان

جوانمردی کا سرچشمہ ایمان ہے ۔

بعض دیگر نے کہا ہے :

الفتوة بذل الندی وکف الاذی و ترک الشکوی

جوانمردی ــ عطا و سخاوت، دوسروں کو اذیت پہنچانے سے احتراز اور مشکلات میں شکایت نہ کرنے کا نام ہے۔

بعض دیگر نے "فتوت" کی تفسیر یوں کی ہے :

ھی اجتناب المحارم و استعمال المکارم

جوانمردی نام ہے گناہوں سے پرہیز کا اور انسانی فضائل و مکارم کو بروئے کار لانے کا۔

۲۔ ایمان اور امدادِ الٰہی : مندرجہ بالا آیات میں متعدد مواقع پر یہ حقیقت بڑی صراحت سے ظاہر ہوتی ہے کہ اگر انسان پہلا قدم راہِ خدا میں اٹھا لے اور اس کے لیے قیام کرے تو خدا کی کمک اور امدادِ الٰہی اس کی طرف لپکتی ہے۔

ایک مقام پر ہے کہ "وہ ایسے جوانمرد تھے کہ جو ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کردیا"۔

ایک اور مقام پر ہے : "ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا اور انہیں توانائی بخشی"۔

اور آیات کے آخر میں بھی ہے کہ وہ رحمتِ الٰہی کے سایہ فگن ہونے اور راہِ نجات پانے کے انتظار میں تھے۔

قرآن کی دیگر آیات سے بھی اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً :

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو لوگ ہماری راہ میں کوشاں ہوں ہم انہیں اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کرتے ہیں

(عنکبوت ۔ آخری آیت)

نیز سورہ محمد کی آیت ۱۷ میں ہے :

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى

جو راہِ ہدایت پر گامزن ہوئے اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کردیا۔

ہم جانتے ہیں کہ راہِ حق میں بہت دشواریاں اور رکاوٹیں ہیں اور لطفِ خداوندی شاملِ حال نہ ہو تو مقصد تک پہنچنا بہت ہی مشکل کام ہے۔

ہم یہ بات بھی جانتے ہیں کہ لطفِ خداوندی اپنے حق طلب اور حق جو بندے کو اس راہ میں ہرگز تنہا نہیں چھوڑتا۔

۳۔ "غار" کے نام کی ایک پناہ گاہ : "الکھف" میں الف اور لام شاید اس طرف اشارہ ہو کہ

انہوں نے کسی دُور علاقے میں پہلے سے ایک غار کے بارے میں طے کر رکھا تھا کہ اگر ان کی تبلیغاتِ توحید کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو پھر وہ اس آلودہ اور تاریک ماحول سے نجات کیلئے اس میں پناہ لیں گے۔

"کہف" ایک معنی خیز لفظ ہے۔ اس سے انسان کی بالکل ابتدائی طرزِ زندگی کی طرف ذہن چلا جاتا ہے۔ وہ ماحول کہ جب راتیں تاریک اور سرد تھیں۔ روشنی سے محروم انسان جانکاہ دَرّوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ زندگی جس میں مادی آسائشوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جب نرم بستر تھے نہ خوشحالی۔

اب جب اس طرف توجہ کریں کہ جیسا تاریخ میں منقول ہے اصحابِ کہف اس دَور میں بادشاہ کے وزیر اور بہت بڑے اہلِ منصب تھے۔ انہوں نے بادشاہ اور اس کے مذہب کے خلاف قیام کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ناز و نعمت سے بھری اس زندگی کو چھوڑنا اور اس پر غار نشینی کو ترجیح دینا کس قدر عزم، حوصلے، دلیری اور جانثاری کا غماز ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رُوح کتنی عظیم تھی۔

یہ غار تاریک، سرد اور خاموش ضرور تھی اور اس میں موذی جانوروں کا خطرہ بھی تھا لیکن یہاں نور و صفا اور توحید و معنویت کی ایک دنیا آباد تھی۔

رحمتِ الٰہی کے نور کی لکیروں نے اس غار کی دیواروں پر گویا نقش و نگار کر دیا تھا اور لطفِ الٰہی کے آثار اس میں موجزن تھے۔ اس میں طرح طرح کے معنی خیز بُت نہیں تھے اور ظالم بادشاہ کا ہاتھ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کی فضا نے جہل و جرم کے دم گھٹنے والے ماحول سے نجات عطا کر دی تھی اور یہاں انسانی فکر پر کوئی پابندی نہ تھی بلکہ آزادی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجود تھی۔

جی ہاں! ان خدا پرست جوانمردوں نے اس دنیا کو ترک کر دیا کہ جو اپنی وسعت کے باوجود ایک تکلیف دہ زندان کی مانند تھی اور اُس غار کو انتخاب کر لیا کہ جو اپنی تنگی و تاریکی کے باوجود وسیع تھی۔ بالکل پاکباز یوسفؑ کی طرح کہ جنہوں نے عزیزِ مصر کی خوبصورت بیوی کے شدید اصرار کے باوجود اس کی سرکش ہوس کے سامنے سر نہ جھکایا اور تاریک وحشتناک قید خانے میں جانا قبول کر لیا۔ اللہ نے ان کی استقامت میں اضافہ کر دیا اور آخرکار انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں یہ حیران کن جملہ کہا:

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ

پروردگارا! زندان اپنی جانکاہ تنگی و تاریکی کے باوجود مجھے اس گناہ سے زیادہ محبوب ہے کہ جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں اور اگر تُو ان کے وسوسوں کو مجھ سے دفع نہ کرے تو میں ان کے دام میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ (یوسف - ۳۳)

(۱۷) وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۚ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۗ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝

(۱۸) وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝

ترجمہ

(۱۷) جب سورج نکلتا ہے تو تُو دیکھے گا کہ ان کی (غار کے) دائیں طرف جھک کے نکلتا ہے اور وقتِ غروب بائیں جانب کو اور وہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ پر موجود ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ جس شخص کی ہدایت اللہ کرے درحقیقت وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ بھٹکا دے تو پھر تجھے اس کا کوئی سرپرست راہنما نہیں ملے گا۔

(۱۸) (اور اگر تو انہیں دیکھتا تو) سمجھتا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ نیند میں مستغرق تھے اور ہم انہیں دائیں بائیں کروٹ بدلواتے تھے (تاکہ ان کا جسم صحیح و سالم رہے) اور اُن کے کُتّے نے غار کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلا رکھے تھے (اور نگہبانی کر رہا تھا) اور تُو اگر انہیں دیکھتا تو بھاگ کھڑا ہوتا اور سر تا پا وحشت زدہ ہو جاتا۔

تفسیر

اصحاب کہف کا اہم مقام

ان دو آیات میں قرآن غار میں اصحاب کہف کی عجیب و غریب زندگی کی کچھ تفصیلات بیان کر رہا ہے ۔ان کی زندگی کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ گویا کوئی شخص غار کے سامنے بیٹھا ہے اور غار میں سوئے ہوئے افراد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے ۔

چھ نشانیاں اور خصوصیات

ان دو آیتوں میں غار اور اصحاب کہف کی چھ نشانیاں اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں :

۱۔ غار کا دہانہ شمال کی طرف ہے اور غار چونکہ زمین کے شمالی نصف کرہ میں واقع تھی لہٰذا سورج کی روشنی مستقیم اس میں نہیں پڑتی تھی ۔جیسا کہ قرآن کہتا ہے : اگر تُو وقتِ طلوع سورج کو دیکھتا تو وہ غار کی دائیں جانب جُھک کے گزرتا ہے اور غروب کے وقت بائیں جانب (و تری الشمس اذا طلعت تزاور عن کہفھم ذات الیمین و اذا غربت تقرضھم ذات الشمال)۔

اس طرح سے ان پر سورج کی براہِ راست روشنی نہیں پڑتی تھی ۔اگر پڑتی رہتی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے جسم بوسیدہ ہو جاتے ۔

" تزاور" کی تعبیر کہ جو جھکنے کے معنی میں ہے ، اس میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ گویا سورج اس بات پر مامور تھا کہ غار کی دائیں سمت سے گزرے ۔اسی طرح " تقرض" کی تعبیر کاٹنے کے معنی میں ہے ، اس میں بھی ماموریت کا مفہوم موجود ہے ۔اس سے قطع نظر " تزاور" " زیارت" کے مادہ سے ہے ۔ اس میں آغاز کی طرف اشارہ بھی موجود ہے کہ جو طلوع آفتاب کا مفہوم دیتا ہے اور " تقرض" قطع کرنے اور ختم کرنے کے معنی میں ہونے کے باعث غروب کا مفہوم بھی دیتا ہے ۔

غار کا دہانہ شمال کی طرف ہونے کی وجہ سے اس میں اچھی اور لطیف ہَوائیں آتی تھیں کیونکہ یہ ہَوائیں عموماً شمال کی جانب سے چلتی ہیں ۔ لہٰذا تازہ ہَوا آسانی سے غار میں داخل ہو جاتی اور ایک تازگی قائم رکھتی ۔

۲۔ وہ غار کی ایک وسیع جگہ میں تھے (و ھم فی فجوۃ منہ)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ غار کے دہانے پر موجود نہ تھے کیونکہ وہ تو عموماً تنگ ہوتا ہے ۔ وہ غار کے وسطی حصے میں تھے تاکہ دیکھنے والوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہیں اور سورج کی براہِ راست چمک سے بھی ۔

یہاں قرآن سلسلہ گفتگو کو گویا روکتے ہوئے ایک معنوی نتیجہ بیان کرتا ہے کیونکہ اس ساری داستان کا ذکر اسی مقصد کے لیے کیا جارہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ جس شخص کو اللہ ہدایت دے وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ بھٹکا دے اس کے لیے تجھے کوئی سرپرست و راہنما نہیں ملے گا (ذٰلك من اٰيات الله من يهد الله فهو المهتد و من يضلل فلن تجد له وليا مرشدًا) ۔

جی ہاں ! جو لوگ راہ خدا میں قدم اٹھاتے ہیں اور اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکل پڑتے ہیں ہر قدم پر انہیں اللہ کا لطف و کرم حاصل ہوتا ہے۔ یہ لطف و کرم کام کی بنیاد ہی میں میسر نہیں آتا بلکہ اس کی جزئیات میں بھی شاملِ حال رہتا ہے۔

۳۔ ان کی نیند عام نیند کی سی نہ تھی ۔ اگر تُو انہیں دیکھتا تو خیال کرتا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے (و تحسبهم ايقاظًا و هم رقود) ۔

یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ ان کی آنکھیں بالکل ایک بیدار شخص کی طرح پوری طرح کھلی تھیں۔ یہ استثنائی حالت شاید اس بناء پر تھی کہ موذی جانور قریب نہ آئیں کیونکہ وہ بیدار آدمی سے ڈرتے ہیں۔ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ماحول رعب انگیز رہے تاکہ کوئی انسان ان کے پاس جانے کی جرأت نہ کرے اور یہ صورتِ حال ان کے لیے ایک سپر کا کام دے۔

۴۔ اس بناء پر کہ سالہا سال سوئے رہنے کی وجہ سے ان کے جسم بوسیدہ نہ ہو جائیں " ہم انہیں دائیں بائیں کروٹیں بدلواتے رہتے تھے (و نقلبهم ذات اليمين و ذات الشمال) ۔ تاکہ ان کے بدن کا خون ایک ہی جگہ نہ ٹھہر جائے اور طویل عرصہ ایک طرف مرتکز ہونے کی وجہ سے ان کے اعصاب خراب نہ ہو جائیں ۔

۵۔ اس دوران میں " کتا کہ جو اُن کے ہمراہ تھا غار کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلائے ہوئے تھا اور پہرہ دے رہا تھا (و كلبهم باسط ذراعيه بالوصيد) ۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے " وصید " ایسے کمرے اور سٹور کے معنی میں ہے کہ جو پہاڑی علاقوں میں اموال و اسباب ذخیرہ کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ غار کے دہانے کے معنی میں ہے ۔

اس سے پہلے ابھی تک قرآنی آیات میں اصحابِ کہف کے کتے کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن قرآن واقعات کے دوران بعض اوقات ایسی باتیں کرجاتا ہے کہ جن سے دوسرے مسائل بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں اصحابِ کہف کے کتے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں سے ظاہر ہوا کہ ان کے ہمراہ ایک کتا بھی تھا جو ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور ان کی حفاظت کرتا تھا۔

یہ کہ یہ کتا اُن کے ساتھ کہاں سے شامل ہوا تھا، کیا ان کا شکاری کتا تھا یا اُس چرواہے کا کتا تھا کہ جس سے ان کی راستے میں ملاقات ہوئی تھی اور جب چرواہے نے انہیں پہچان لیا تھا تو اس نے اپنے جانور آبادی کی طرف روانہ کر دیئے تھے اور خود ان پاکباز لوگوں کے ساتھ ہو لیا تھا کیونکہ وہ ایک حق جُو اور دیدارِ الٰہی کا طالب انسان تھا۔ اس وقت کتا ان سے جدا نہ ہوا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

کیا اس بات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ تمام عاشقانِ حق اس تک رسائی کے لیے اس کے راستے میں قدم رکھ سکتے ہیں اور کوئے یار کے دروازے کسی کے لیے بند نہیں ہیں۔ ظالم بادشاہ کے نائب ہونے والے وزیروں سے لے کر چرواہے تک بلکہ اس کے کتے تک کے لیے بارگاہِ الٰہی کے دروازے کھلے ہیں۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ:

زمین و آسمان کے تمام ذرے، سارے درخت اور سب چلنے پھرنے والے ذکرِ الٰہی میں مگن ہیں، سب کے سر میں اُس کے عشق کا سودا سمایا ہے اور سب دلوں میں اس کی محبت جلوہ گر ہے۔ (بنی اسرائیل۔ ۴۴)

۶۔ غار میں اصحابِ کہف کا منظر ایسا رعب انگیز تھا کہ اگر تو انہیں جھانک کے دیکھ لیتا تو بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرا وجود سر تا پا خوفزدہ ہو جاتا (لو اطلعت علیهم لولیت منهم فرارًا ولملئت منهم رعبًا)۔

یہ ایک ہی موقع نہیں کہ خدا تعالیٰ نے رعب اور خوف کو اپنے با ایمان بندوں کے لیے ڈھال بنا دیا۔ سورہ آلِ عمران کی آیہ ۱۵۱ میں بھی ہے:

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ

ہم جلد ہی کافروں کے دلوں پر رعب ڈال دیں گے[1]

دعائے ندبہ میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

ثم نصرته بالرعب

خداوندا! پھر تُو نے اپنے پیغمبر کی مدد اس طرح سے کی کہ اُس کے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

لیکن یہ رعب کہ جو اصحابِ کہف کو دیکھنے والے کو سر تا پا لرزا دیتا، ان کی جسمانی حالت کے باعث تھا یا یہ کہ پُر اسرار روحانی طاقت تھی کہ جو اس سلسلے میں کام کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں آیاتِ قرآنی

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۲۷۳ اور جلد ۳ صفحہ ۳۰۱ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

یں کوئی وضاحت نہیں ہے اگرچہ مفسرین نے کئی قسم کی بحثیں کی ہیں لیکن وہ کسی دلیل کی بنیاد پر نہیں ہیں اس لیے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔

ضمناً۔ ولملئت منھم رعبا۔ (تیرے وجود پر سرتاپا خوف چھا جاتا) درحقیقت ۔لولیت منھم فراراً" (اگر تو انہیں دیکھتا تو بھاگ کھڑا ہوتا) کی علت ہے یعنی تو اس لیے بھاگ اٹھتا کہ تو وحشت زدہ ہو جاتا۔

بہرحال جب کسی چیز میں اللہ کا ارادہ شامل ہو جائے تو بڑی معمولی سی چیزوں سے بڑے بڑے نتیجے پیدا ہو جاتے ہیں۔

(۱۹) وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَاۗىِٕلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ○

(۲۰) اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ○

ترجمہ

(۱۹) اسی طرح ہم نے انہیں (نیند سے) اٹھا بٹھایا تاکہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا: کتنی مدت سوئے ہو۔ انہوں نے کہا: ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصّہ (اور چونکہ انہیں اپنے سونے کی مدت ٹھیک طرح سے معلوم نہ تھی لہٰذا) کہنے لگے: تمہارا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ تم کتنی مدت سوئے ہو۔ تمہارے پاس جو سکہ ہے اب وہ دے کر کسی کو شہر کی طرف بھیجو تاکہ وہ دیکھے کہ سب سے پاکیزہ کھانا جہاں سے ملتا ہو وہاں سے وہ کھانے کے لیے کچھ لے آئے لیکن اُسے چاہیئے کہ بڑی احتیاط سے کام لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتا بیٹھے۔

(۲۰) کیونکہ اگر انہیں تمہارے بارے میں پتہ چل گیا تو وہ تمہیں سنگسار کر دیں گے

یا اپنے دین کی طرف پھیر لے جائیں گے اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر تم کبھی فلاح کا منہ نہیں دیکھ پاؤ گے ۔

تفسیر

ایک طویل نیند کے بعد بیداری

خدا نے چاہا تو آئندہ آیات کے ذیل میں ہم پڑھیں گے کہ اصحاب کہف کی نیند اتنی لمبی ہو گئی کہ وہ تین سو نو سال تک سوتے رہے اور اُن کی نیند موت سے بالکل ملتی جلتی تھی اور ان کی بیداری بھی قیامت کی مانند تھی ۔ لہٰذا زیر بحث آیات میں قرآن کہتا ہے : اور ہم نے انہیں اسی طرح اٹھا کھڑا کیا (وکذٰلک بعثناھم) ۔

یعنی اسی طرح کہ جیسے ہم اس پر قادر تھے کہ انہیں لمبی مدت تک سُلائے رکھتے انہیں پھر سے بیدار کرنے پر بھی قادر تھے ۔

ہم نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا ۔ تاکہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں ۔ ان میں سے ایک نے پوچھا، تمہارا کیا خیال ہے کتنی مدت سوئے ہو؟ (لیتساء لوا بینھم قال قائل منھم کم لبثتم)[1]

انہوں نے کہا : ایک دن یا دن کا کچھ حصہ (قالوا لبثنا یوماً او بعض یوم) ۔

اس میں تردد شاید انہیں اس لیے ہوا کہ جیسے مفسرین نے کہا ہے کہ وہ جب غار میں آئے تھے تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور آکر وہ سو گئے تھے اور جب اٹھے تو دن کا آخری حصہ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے انہوں نے سوچا کہ شاید ایک دن سو گئے ہیں اور جب انہوں نے سورج کی طرف دیکھا تو انہیں خیال آیا کہ شاید دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں ۔

لیکن آخرکار چونکہ انہیں صحیح طرح سے معلوم نہ ہو سکا کہ کتنی دیر سوئے ہیں لہٰذا ۔ کہنے لگے ، تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر سوئے تھے (قالوا ربکم اعلم بما لبثتم) ۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ بات ان میں سے بڑے نے کہی جس کا نام تملیخا تھا اور یہاں پر ۔ قالوا ۔ کہ جو جمع کا صیغہ ہے اس کا استعمال ایک معمول کی بات ہے ۔

یہ بات انہوں نے شاید اس لیے کہی کہ ان کے چہرے مہرے سے ، ناخنوں سے ، بالوں سے اور

---

[1] "لیتساء لوا" میں جو لام ہے وہ اصطلاح میں لام عاقبت ہے نہ کہ لام علت ۔ یعنی ان کے جاگنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی نیند کی مدت کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے ۔

لباس سے بالکل شک نہیں پڑتا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی طور پر نیند میں رہے ہیں۔

بہر حال انہیں بھوک اور پیاس کا احساس ہوا کیونکہ ان کے بدن میں جو غذا تھی وہ تو تمام ہو چکی تھی۔

لہٰذا پہلے پہلے انہوں نے یہی تجویز کیا کہ "تمہارے پاس چاندی کا جو سکہ ہے اپنے میں سے ایک کو دو تاکہ وہ جائے اور دیکھے کہ کس کے پاس اچھی پاکیزہ غذا ہے اور جتنی تمہیں چاہیئے تمہارے لیے لے آئے (فابعثوا احدکم بورقکم ھٰذہ الی المدینۃ فلینظر ایھا ازکی طعاماً فلیأتکم برزق منہ)۔

"لیکن بہت احتیاط سے جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتا بیٹھے" (ولیتلطف ولا یشعرن بکم احداً)۔

"کیونکہ اگر انہیں تمہارے بارے میں پتہ چل گیا اور انہوں نے تمہیں آلیا تو سنگسار کر دیں گے یا پھر تمہیں اپنے دین (بُت پرستی) کی طرف موڑ لے جائیں گے" (انھم ان یظھروا علیکم یرجموکم او یعیدوکم فی ملتھم)۔

"اور اگر ایسا ہو گیا تو تم نجات اور فلاح کا منہ نہ دیکھ پاؤ گے" (ولن تفلحوا اذاً ابداً)۔

چند اہم نکات

۱۔ **پاکیزہ ترین غذا:** یہ بات بہت جاذبِ نظر ہے کہ اس داستان میں ہم نے پڑھا ہے کہ اصحابِ کہف جب بیدار ہوئے تو ظاہر ہے انہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس طویل مدت کے دوران ان کے جسم میں جو غذا تھی صرف ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے جسے کھانا لانے کے لیے بھیجا اسے نصیحت کی کہ ہر غذا نہ خرید لے بلکہ دیکھ بھال کر کھانا بیچنے والوں کے پاس سے جو سب سے زیادہ پاکیزہ ہو اسے لے کر آئے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے ذبح شدہ جانور کی طرف اشارہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس شہر میں ایسے لوگ رہتے ہیں کہ جو نجس و ناپاک اور کبھی مردہ کا گوشت بیچتے ہیں یا بعض لوگوں کا کام ہی حرام کا تھا لہٰذا انہوں نے نصیحت کی ایسے لوگوں سے کھانا نہ خریدنا۔

لیکن ظاہراً اس جملے کا وسیع مفہوم ہے کہ جس میں ہر قسم کی ظاہری اور باطنی پاکیزگی شامل ہے اور یہ دراصل راہِ حق کے تمام راہیوں کے لیے نصیحت ہے کہ وہ نہ صرف روحانی غذا کے بارے میں فکر کریں بلکہ اپنی جسمانی غذا کی پاکیزگی کا بھی خیال رکھیں کہ وہ ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو یہاں تک کہ زندگی کے مشکل ترین لمحات میں بھی اس بات کو فراموش نہ کریں۔

دورِ حاضر میں دنیا کے بہت سے لوگ اس حکم کی اہمیت سے کسی حد تک آگاہ ہو گئے ہیں اور کوشش

کرتے ہیں کہ اُن کی غذا ہر قسم کی ظاہری آلودگی سے پاک ہو۔ وہ کھانے کی چیزوں کو ڈھک کر گندے ہاتھوں کی پہنچ سے دُور اور گرد و غبار سے بچا کر رکھتے ہیں۔ یہ کام بہت اچھا ہے لیکن اس پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ غذا حرام نہ ہو، سود، ملاوٹ، دھوکا بازی اور ہر قسم کی باطنی آلودگی سے بھی پاک ہو۔

اسلامی روایات میں قبولیت دعا اور پاکیزگیٔ دل کے لیے حلال غذا کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور عرض کرنے لگا:

احب ان یستجاب دعائی

مَیں چاہتا ہوں میری دعا قبول ہو جائے۔

فرمایا: طھر ماکلک ولا تدخل بطنک الحرام

اپنی غذا کو پاک رکھو اور دھیان رکھو کہ تمہارے بطن میں حرام غذا داخل نہ ہونے پائے [1]

۲۔ **اصلاح کنندہ تقیہ:** مندرجہ بالا آیات کے الفاظ سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف اس بات پر زور دیتے تھے کہ اس ماحول میں کسی کو ان کی پناہ گاہ کا پتہ نہ چلے کہ مبادا وہ لوگ انہیں بُت پرستی کا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کریں یا پھر انہیں بُری طرح قتل کریں اور سنگسار کر دیں۔

وہ چاہتے تھے کہ ان کی کسی کو خبر نہ ہو تاکہ آئندہ کی جدوجہد کے لیے یا کم از کم اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے اپنی طاقت بچا کر رکھیں۔ یہ ایک قسم کا اصلاحی تقیہ ہے کیونکہ تقیہ کا مطلب ہے اپنی قوتوں کو فضول صرف ہونے سے بچانا اور اس کے لیے اپنے آپ کو چھپانا یا اپنے عقیدے کو چھپا کر اپنے آپ کو بچانا تاکہ ضرورت کے وقت مؤثر طریقے سے جدوجہد کی جا سکے۔

واضح ہے کہ جس مقام پر عقیدہ چھپانے سے ہدف اور پروگرام کو نقصان پہنچتا ہو وہاں تقیہ ممنوع ہے وہاں سب کچھ ظاہر کرنا چاہیئے۔

ولو بلغ ما بلغ

پھر جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو۔

۳۔ **قرآن کا مرکز "لطف" ہے:** مشہور ہے کہ الفاظ کی گنتی کے لحاظ سے لفظ "ولیتلطف" عین قرآن کا درمیان ہے۔ یہ ایک لطفِ خاص ہے اور بہت لطیف معنیٰ کا حامل ہے کیونکہ

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۴ ابواب دعا، باب ۶۷ حدیث ۱۲۔ مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد اوّل سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۶ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

یہ "لطف" اور "لطافت" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہاں یہ لفظ احتیاط اور باریک بینی سے کام لینے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ یعنی غذا لانے کے لیے جانے والا شخص اس طرح سے جائے کہ کسی شخص کو ان کے بارے میں کوئی خبر نہ ہو۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہاں مراد غذا خریدنے میں لطافت سے کام لینا ہے یعنی معاملہ کرنے میں سخت گیری نہ کرے اور جھگڑا کھڑا نہ کردے نیز بہترین چیز انتخاب کرے اور یہ بھی ایک لطف ہے کہ وسطِ قرآن کے لفظ میں لطف و تلطف کا مفہوم پوشیدہ ہے۔[1]

---

[1] اس وقت ہم پروردگار کی عظیم توفیق سے پورے دس سال کے بعد قرآن مجید کی تفسیر کے نصف حصہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ اس دوران اگرچہ ہم اور ہمارے ملک نہایت سخت حالات اور طوفان گزرے لیکن اس علاقے میں نورِ اسلام بجھا نہیں بلکہ اس کا دامن وسیع ہوا ہے نیز اللہ کا شکر ہے کہ اس تفسیر کے لکھنے میں کوئی وقفہ پیش نہیں آیا ہے ۔۔۔ لہٰذا ہمیں امید ہے کہ باقی ماندہ تفسیر (انشاء اللہ) زیادہ سرعت کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کرے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ دس سال تھوڑی مدت نہیں ہوتے لیکن اب تک جو کام ہم نے اس تفسیر کے سلسلے میں انجام دیا ہے وہ بھی الحمد للہ کوئی چھوٹا سا نہیں۔

(۲۱) وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ
اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۗ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۗ
قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۝

(۲۲) سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ
سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ
كَلْبُهُمْ ۗ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۗ
فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۖ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ
مِّنْهُمْ اَحَدًا ۝

(۲۳) وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝

(۲۴) اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۚ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى
اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ۝

ترجمہ

(۲۱) اور ہم نے اس طرح سے لوگوں کو اُن کے حال سے مطلع کیا تاکہ وہ جان
لیں کہ (قیامت کا) اللہ کا وعدہ حق ہے اور دنیا کے ختم ہو جانے اور قیامت
کے برپا ہو جانے میں کوئی شک نہیں۔ اس وقت ان میں اس بارے میں نزاع
پیدا ہو گیا۔ کچھ نے کہا کہ ان پر ایک عمارت بنا دی جائے (تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے

نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور ان کے بارے میں باتیں نہ کرو کہ) ان کا رب ان کی کیفیت سے بہتر آگاہ ہے (لیکن جنہیں اس راز سے آگہی نصیب ہوئی اور جنہوں نے اس واقعے کو قیامت کے لیے ایک دلیل سمجھا) ہم ان کے (مدفن کے) پاس ایک مسجد بنائیں گے (تاکہ انہیں بھلایا نہ جا سکے)۔

(۲۲) بعض کہتے ہیں کہ وہ تین افراد تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ افراد تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بلا دلیل باتیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ سات افراد تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہہ دو کہ میرا رب ان کی تعداد سے بہتر آگاہ ہے۔ چند افراد کے سوا ان کی تعداد کو کوئی نہیں جانتا۔ لہٰذا ان کے بارے میں بغیر دلیل کے بات نہ کر اور ان کے بارے میں کسی سے سوال نہ کر۔

(۲۳) اور ہرگز یہ نہ کہہ کہ میں کل فلاں کام انجام دوں گا۔

(۲۴) مگر یہ کہ خدا چاہے اور اگر تو بھول جائے تو (اس کی تلافی کرتے ہوئے) اپنے رب کو یاد کر اور کہہ: مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے زیادہ واضح راستے کی ہدایت کرے گا۔

تفسیر

اصحابِ کہف کے واقعے کا اختتام

جلد ہی لوگوں میں ان عظیم جوانمردوں کی ہجرت کی داستان پھیل گئی۔ ظالم بادشاہ سیخ پا ہوگیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی ہجرت یا بھاگ نکلنا لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سبب بن جائے۔ اُسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ دُور یا نزدیک کے علاقے میں جا کر لوگوں کو دینِ توحید کی تبلیغ کرنے لگیں اور شرک و بت پرستی کے خلاف جدوجہد شروع کر دیں۔ لہٰذا اس نے خاص افراد کو مامور کیا کہ انہیں ہر جگہ تلاش کیا جائے اور ان کا کچھ اتہ پتہ معلوم

ہو تو گرفتاری کے لیے تعاقب کیا جائے اور انہیں سزا دی جائے۔

لیکن انہوں نے جتنی بھی کوشش کی کچھ نہ پایا اور یہ امر خود علاقے کے لوگوں کے لیے ایک معمہ اور ان کے قلب و فکر کے لیے ایک خاص نقطہ بن گیا۔ نیز یہ امر کہ حکومت کے نہایت اہم چند اراکین نے ہر چیز کو ٹھوکر مار دی اور طرح طرح کے خطرات مول لے لیے شاید بعض لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سرچشمہ بن گیا۔

بہر حال ان افراد کی یہ حیران کن داستان ان کی تاریخ میں ثبت ہوگئی اور ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہونے لگی اور اسی طرح اس مسئلے کو صدیاں گزر گئیں۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اُس پر کیا گزری جو غذا لینے کے لیے آیا۔ وہ شہر میں داخل ہوا تو اُس کا منہ تعجب سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ شہر کی عمارتوں کی شکل و صورت تمام تبدیل ہو چکی تھی، سب چہرے ناشناس تھے، لباس نئے انداز کے تھے یہاں تک کہ لوگوں کی بول چال اور رسم و رواج بھی بدل چکے تھے۔ کل کے ویرانوں پر آج محل تھے اور جہاں پہلے محل تھے وہاں ویرانے ہی ویرانے تھے۔

شاید تھوڑی دیر کے لیے اس نے سوچا ہو کہ ابھی میں نیند میں ہوں اور یہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں سب خواب ہے۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ وہ سب چیزوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کیسی حقیقت ہے کہ جس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

اب وہ سوچنے لگا کہ وہ غار میں ایک یا آدھا دن سوئے ہیں تو پھر یہ اتنی تبدیلیاں اتنی مدت میں کیسے ممکن ہیں؟

دوسری طرف اس کا چہرہ مہرہ اور حالت لوگوں کے لیے بھی عجیب اور غیر مانوس تھی۔ اس کا لباس، اس کی گفتگو اور اس کا چہرہ سب نیا معلوم ہوتا تھا شاید اسی وجہ سے کچھ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے پیچھے چل پڑے۔

اُس وقت لوگوں کا تعجب انتہا کو پہنچ گیا جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ اس کھانے کی قیمت ادا کرے جو اس نے خریدا تھا۔ دکاندار کی نگاہ سکے پر پڑی وہ تین سو سال سے زیادہ پرانے دور کا تھا اور شاید اُس زمانے کے ظالم بادشاہ دقیانوس کا نام بھی اس پر کندہ تھا۔ جب اس نے وضاحت چاہی تو خریدار نے جواب میں کہا: میرے ہاتھ میں تو یہ سکہ ابھی تازہ ہی آیا ہے۔

قرائن اور احوال سے لوگوں کو آہستہ آہستہ یقین ہوگیا کہ یہ شخص تو انہی افراد میں سے ہے جن کا ذکر ہم نے تین سو سال پہلے کی تاریخ میں پڑھا ہے اور بہت سی محفلوں میں ہم نے جن کی پُراسرار داستان سُنی ہے۔

خود اسے بھی احساس ہوا کہ وہ اور اس کے ساتھی کسی گہری اور طولانی نیند میں مستغرق رہے ہیں۔ اس بات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں آن کی آن میں پھیل گئی۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں ایک نیک اور خدا پرست بادشاہ حکومت کرتا تھا لیکن معاد جسمانی

اور موت کے بعد مُردوں کے جی اٹھنے کے مسئلہ پر یقین کرنا وہاں کے لوگوں کے لیے مشکل تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ انسان مرنے کے بعد پھر جی اٹھے گا لیکن اصحاب کہف کی نیند کا واقعہ معادِ جسمانی کے طرفداروں کے لیے ایک دنداں شکن دلیل بن گیا۔

اسی لیے زیرِ نظر پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: جیسے ہم نے انہیں سلا دیا تھا اسی طرح انہیں اس گہری اور طویل نیند سے بیدار کیا اور لوگوں کو اُن کے حال کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ جان لیں کہ قیامت کے بارے میں خدا کا وعدہ حق ہے (وکذٰلک اعثرنا علیھم لیعلموا ان وعد اللّٰہ حق)۔

اور دنیا کے خاتمے اور قیامِ قیامت میں کوئی شک نہیں (وان الساعۃ لاریب فیھا)۔

کیونکہ صدیوں پر محیط یہ لمبی نیند موت سے غیر مشابہ نہیں ہے اور ان کا بیدار ہونا قبروں سے اٹھنے کی مانند ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سونا اور جاگنا کئی حوالوں سے مرنے اور پھر جی اٹھنے سے عجیب تر ہے کیونکہ وہ صدیوں سوئے رہے لیکن ان کا بدن بوسیدہ نہ ہوا جبکہ انہوں نے کچھ کھایا نہ پیا۔ تو پھر وہ اتنی لمبی مدت زندہ کس طرح رہے۔

کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ خدا ہر چیز اور ہر کام پر قادر ہے۔ ایسے منظر کی طرف نظر کی جائے تو موت کے بعد زندگی کا مسئلہ کوئی عجیب معلوم نہیں ہوتا بلکہ یقینی طور پر ممکن دکھائی دیتا ہے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ جو شخص غذا لینے شہر میں آیا تھا اُس نے یہ صورت دیکھی تو جلدی سے غار کی طرف پلٹا اور اپنے دوستوں کو سارا حال سنایا وہ سب کے سب گہرے تعجب میں ڈوب گئے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ ان کے تمام بچے، بھائی اور دوست کوئی بھی باقی نہیں رہا اور ان کے احباب و انصار میں سے کوئی نہیں رہا۔ ایسے میں اُن کو یہ زندگی بہت سخت اور ناگوار لگی۔ لہٰذا انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ اس جہان سے ہماری آنکھیں بند ہو جائیں اور ہم جوارِ رحمتِ حق میں منتقل ہو جائیں۔

ایسا ہی ہوا۔ اس دنیا سے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے جسم غار میں پڑے تھے کہ لوگ ان کی تلاش کو نکلے۔

اس مقام پر معادِ جسمانی کے طرفداروں اور مخالفوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ مخالفین کی کوشش تھی کہ لوگ اصحابِ کہف کے سونے اور جاگنے کے مسئلہ کو جلد بھول جائیں لہٰذا انہوں نے تجویز پیش کی کہ غار کا دروازہ بند کر دیا جائے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں (اذ یتنازعون بینھم امرھم فقالوا ابنوا علیھم بنیانا)۔

وہ لوگوں کو خاموش ہونے کے لیے کہتے تھے کہ ان کے بارے میں زیادہ باتیں نہ کرو، ان کی داستان اسرار آمیز ہے "ان کا پروردگار ان کی کیفیت سے زیادہ آگاہ ہے" (ربھم اعلم بھم)۔ لہٰذا ان کا قصہ ان تک رہنے دو اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

جبکہ حقیقی مومن کہ جنہیں اس واقعے کی خبر ہوئی اور جو اسے قیامت کے حقیقی مفہوم کے اثبات کیلئے ایک زندہ دلیل سمجھتے تھے، ان کی کوشش تھی کہ یہ واقعہ ہرگز فراموش نہ ہونے پائے۔ لہٰذا انہوں نے کہا: ہم ان کے مدفن کے پاس مسجد بناتے ہیں تاکہ لوگ انہیں اپنے دلوں سے ہرگز فراموش نہ کریں علاوہ ازیں ان کی ارواحِ پاک سے لوگ استمداد کریں (قال الذین غلبوا علیٰ امرھم لنتخذن علیھم مسجداً)۔

اس آیت کی تفسیر میں کئی اور احتمال بھی پیش کیے گئے ہیں۔ "چند اہم نکات" کے زیرِ عنوان ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

اگلی آیت میں ان چند اختلافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو اصحابِ کہف کے بارے میں لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک ان کی تعداد کے بارے میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا (سیقولون ثلاثة رابعھم کلبھم)۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا (ویقولون خمسة سادسھم کلبھم)۔

یہ سب بلا دلیل باتیں ہیں اور اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہیں (رجماً بالغیب)۔

اور بعض کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا (ویقولون سبعة وثامنھم کلبھم)۔

کہہ دے: میرا رب ان کی تعداد بہتر جانتا ہے (قل ربی اعلم بعدتھم)۔

صرف تھوڑے سے لوگ ان کی تعداد جانتے ہیں (ما یعلمھم الا قلیل)۔

قرآن نے ان جملوں میں اگرچہ صراحت سے ان کی تعداد بیان نہیں کی لیکن آیت میں موجود بعض اشاروں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ تیسرا قول صحیح اور مطابقِ حقیقت ہے کیونکہ پہلے اور دوسرے قول کے بعد "رجماً بالغیب" (اندھیرے میں تیر مارنا) آیا ہے کہ جو ان اقوال کے بے بنیاد ہونے کی طرف اشارہ ہے لیکن تیسرے قول کے بارے میں نہ صرف ایسی کوئی تعبیر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: "کہہ دے: میرا رب ان کی تعداد سے بہتر طور پر آگاہ ہے" اور یہ بھی فرمایا گیا ہے" ان کی تعداد کو تھوڑے سے لوگ جانتے ہیں: یہ جملے بھی اس تیسرے قول کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔

بہرحال آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: استدلالی اور منطقی گفتگو کے علاوہ ان کے بارے میں بحث نہ کر (فلا تمار فیھم الا مراءً ظاھراً)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "مراء" "مریة الناقة" (میں نے دودھ دوہنے کے لیے اونٹنی کا پستان ہاتھ میں پکڑا) سے لیا گیا ہے۔ بعد ازاں کسی ایسی چیز کے بارے میں بحث کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا کہ جس میں شک ہو اور اکثر یہ لفظ باطل کی حمایت میں ہٹ دھرمی کی گفتگو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ لفظ اس مفہوم کے لیے محدود نہیں ہے لیکن کسی بھی ایسی بات کے بارے میں بحث کے مفہوم میں آتا ہے کہ جس کے بارے میں شک ہو۔

"ظاھرًا" غالب، مسلط اور کامیاب کے معنی میں ہے۔

لہٰذا "فلا تمار فیھم الّا مراءً ظاھرًا" کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے ساتھ اس طرح سے منطقی اور استدلالی گفتگو کر کہ تیری منطق کی برتری واضح ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ہٹ دھرم مخالفین سے علیحدگی میں بحث نہ کر کیونکہ اس طرح تُو ان سے جو کچھ کہے گا وہ اس میں ردّ و بدل کریں گے لہٰذا اُن سے کھلم کھلا لوگوں کی موجودگی میں بات چیت کر تاکہ وہ حقیقت میں تحریف و انکار نہ کرسکیں۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال اس گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وحیٔ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے "تُو ان کے ساتھ بات کر کیونکہ اس سلسلے میں محکم ترین دلیل یہی ہے لہٰذا جو لوگ بغیر دلیل کے اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں بات کرتے ہیں ان سے اس بارے میں سوال نہ کر (ولا تستفت فیھم منھم احدًا)۔

اگلی آیت میں رسول اللہؐ کو ایک عمومی حکم دیا گیا ہے: کبھی نہ کہو کہ مَیں کل یہ کام کروں گا (ولا تقولن لشایءٍ انی فاعل ذٰلک غدًا)۔ "مگر یہ کہ خدا چاہے" (الّا ان یّشاء اللّٰہ)۔

یعنی آئندہ کی خبروں اور کاموں کے ارادے میں "انشاء اللہ" حتمی طور پر کہا کرو کیونکہ:

اولاً۔ ارادہ کرنے میں ہرگز تم مستقل نہیں کیونکہ خدا نہ چاہے تو کوئی شخص بھی کسی کام کی طاقت نہیں رکھتا لہٰذا یہ واضح کیا کرو کہ تمہاری قوت اس کی لایزال قوت سے ہے اور تمہاری طاقت اس کی قدرت سے وابستہ ہے۔ اس لیے لازمی طور پر "انشاء اللہ" (اگر خدا نے چاہا تو) کہا کرو۔

ثانیاً۔ ایسا انسان کہ جس کی طاقت محدود ہو اور راہ میں رکاوٹیں پیدا ہونے کا احتمال بھی ہو اس کیلئے صحیح نہیں ہے کہ وہ آئندہ کی کوئی یقینی اور قطعی خبر دے جبکہ بعض اوقات اچانک غیر متوقع رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ایسی باتوں کے ساتھ "انشاء اللہ" کہنا چاہیئے۔

زیرِ بحث آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں مراد یہ ہے کہ اس بات کی نفی کی جائے کہ انسان کو کاموں کی انجام دہی میں استقلال حاصل ہے۔ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ ہے:

تُو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں کل یہ کام کروں گا۔ مگر یہ کہ خدا چاہے۔

البتہ اس تفسیر کا لازمہ یہ ہے کہ اگر ہم "انشاء اللہ" کا اضافہ کردیں تو گفتگو مکمل ہو جائے گی لیکن یہ جملے کا لازمہ ہے نہ کہ متن اور اصل جملے کا مفہوم ہے جیسا کہ پہلی تفسیر میں کہا گیا ہے [1]

---

[1] توجہ رہے کہ پہلی تفسیر کی بناء پر "ان تقول" مقدر ماننا پڑے گا۔ تقدیر یوں ہوگی:

الّا ان تقول انشاء اللّٰہ

لیکن دوسری تفسیر میں تقدیر کی ضرورت نہیں ہے۔

زیر بحث آیات کے بارے میں ہم نے جو شانِ نزول نقل کی ہے وہ پہلی تفسیر کی تائید کرتی ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے "انشاء اللہ" کہے بغیر اصحاب کہف سے متعلق سوال کرنے والوں کو جواب دیا تھا۔ اسی لیے ایک عرصے تک وحیِ الٰہی میں تاخیر ہوگئی تاکہ اس بارے میں آپؐ کو متوجہ کیا جائے اور آپؐ اس سلسلے میں سب کے لیے نمونہ بن جائیں [1]

اس جملے کے بعد قرآن کہتا ہے: اگر تُو بھول جائے تو پھر اپنے رب کو یاد کر (واذکر ربک اذا نسیت)۔

یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ آئندہ کے امور کے بارے میں بات کرتے ہوئے "انشاء اللہ" کہنا بھول جائے تو جس وقت یاد آئے فوراً تلافی کرو اور "انشاء اللہ" کہو۔ یہ کہنے سے گزشتہ کی تلافی ہو جائے گی۔ اور کہہ: مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے زیادہ واضح راستے کی ہدایت کرے گا (وقل عسیٰ ان یھدین ربی لاقرب من ھذا رشدا)۔

چند اہم نکات

۱۔ "رجماً بالغیب" کا مفہوم: "رجم" دراصل "پتھر" یا "پتھر پھینکنے" کے معنی میں ہے۔ بعدازاں یہ لفظ ہر قسم کی تیر اندازی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کبھی یہ لفظ کنائے کے طور پر الزام لگانا یا تہمت لگانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ نیز گمان کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا۔ لفظ "بالغیب" اس معنی کی تاکید کے لیے ہے یعنی عدم موجودگی میں بغیر کسی ماخذ و دلیل کے کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے فارسی میں کہتے ہیں:

تیر در تاریکی انداختن

اندھیرے میں تیر مارنا۔

اندھیرے میں عموماً تیر صحیح نشانے پر نہیں لگتا اسی طرح اس قسم کا فیصلہ بھی عموماً صحیح نہیں ہوتا۔

۲۔ "وثامنھم کلبھم" میں واؤ: زیر نظر آیات میں "رابعھم کلبھم" اور "سادسھم کلبھم" دونوں جملے بغیر واؤ کے آئے ہیں جبکہ "وثامنھم کلبھم" واؤ کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور قرآن کی ہر تعبیر میں چونکہ کوئی نہ کوئی حکمت اور مقصد پوشیدہ ہے لہٰذا مفسرین نے اس واؤ کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔

---

[1] اس قسم کے خطاب جو ظاہراً پیغمبر اکرمؐ سے کیے گئے ہیں ان میں مراد امت ہے لہٰذا شانِ نزول کا یہ حصہ کہ "آپؐ نے "انشاء اللہ" نہ کہا اس لیے کچھ عرصہ وحی کا سلسلہ رکا رہا" صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ (مترجم)

شاید ان میں سے بہترین تفسیر یہ ہو کہ یہ واؤ آخری بات اور آخری حرف کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے موجودہ زمانے کے ادب میں بھی یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ چیزوں کو شمار کرتے وقت سب کو بغیر واؤ کے ذکر کرتے ہیں لیکن آخری کا ذکر لازمی طور پر واؤ کے ساتھ کرتے ہیں مثلاً:

زید، عمر، حسن و محمد آئے۔

(اُردو میں واؤ کی بجائے "اور" استعمال ہوتا ہے (مترجم))۔

یہاں پر واؤ کلام کے اختتام اور آخری شخص یا چیز کے بیان کی طرف اشارہ ہے۔

یہی بات مشہور مفسر ابن عباس سے منقول ہے۔ بعض دیگر مفسرین نے بھی اس کی تائید کی ہے نیز انہوں نے اسی واؤ سے اس امر کی تائید کے لیے بھی استفادہ کیا ہے کہ اصحاب کہف کی حقیقی تعداد سات تھی کیونکہ اس کے علاوہ اقوال کو بے بنیاد قرار دے کر قرآن نے ان کی حقیقی تعداد کو آخر میں بیان کیا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین مثلاً فخر رازی اور قرطبی نے اس واؤ کی ایک اور تفسیر نقل کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

سات کا عدد عربوں میں ایک مکمل عدد شمار ہوتا ہے۔ اسی لیے سات کے عدد تک بغیر واؤ کے ذکر کرتے ہیں لیکن جب اس عدد سے آگے بڑھتے ہیں تو واؤ استعمال کرتے ہیں کہ جو ابتدائے کلام کی دلیل ہے۔ اسی لیے ادبائے عرب کی زبان میں یہ "واوِ ثمانیہ" مشہور ہو گئی۔

آیاتِ قرآن میں بھی عموماً اسی طرح دیکھا گیا ہے۔ مثلاً سورہ توبہ کی آیت ۱۱۲ میں جہاں راہِ خدا کے مجاہدین کی صفات شمار کی گئی ہیں وہاں سات صفات تو واؤ کے بغیر آئی ہیں لیکن جب قرآن آٹھویں صفت پر پہنچتا ہے تو کہتا ہے:

وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ

اور برائیوں سے روکنے والے اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے۔

اسی طرح سورہ تحریم کی آیت ۵ میں ازواجِ پیغمبر کی صفات بیان کرتے ہوئے ساتویں صفت کے بعد آٹھویں صفت کا ذکر واؤ کے ساتھ کیا گیا ہے:

ثَيِّبَاتٍ وَّاَبْكَارًا

بیوائیں اور کنواریاں:

نیز سورہ زمر کی آیت ۷۱ میں جہنم کے دروازوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا

اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔

لیکن دو آیتوں کے بعد جس وقت جنت کے دروازوں کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو فرمایا گیا ہے:

وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا

اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے ۔

کیا یہ اس بناء پر نہیں ہے کہ جہنم کے دروازے سات ہیں اور جنت کے دروازے آٹھ ہیں ۔

البتہ شاید یہ کوئی کلی قانون نہ ہو لیکن زیادہ تر مواقع پر ایسا ہی ہے ۔ بہر حال یہ بات اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ قرآن میں ایک واؤ تک کا وجود بھی کسی حساب کتاب کے تحت ہے اور کسی حقیقت کے بیان کے لیے ہے ۔

۳۔ آرام گاہ کے پاس مسجد : تعبیر قرآن کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ آخرکار اصحاب کہف نے زندگی کو خیر باد کہا اور سپرد خاک ہوئے اور لفظ "علیھم" (ان پر) اس دعویٰ کی دلیل ہے ۔

اس کے بعد ان کے عقیدت مندوں نے ارادہ کیا کہ ان کی آرام گاہ کے پاس عبادت خانہ بنائیں ۔ قرآن نے زیر بحث آیات میں ان کے اس ارادے کو موافقت کے لہجے میں بیان کیا ہے ۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ بزرگان دین کی قبور کے احترام میں وہابیوں کے خیال کے برعکس مسجد اور عبادت خانہ بنانا نہ صرف حرام نہیں ہے بلکہ اچھا اور پسندیدہ کام ہے ۔

اصولی طور پر ایسی عمارتیں کہ جو اہم اور عظیم شخصیات کی یاد کو زندہ رکھیں ان کی تعمیر کا سلسلہ ہمیشہ سے ساری دنیا کے لوگوں میں رہا ہے اور آج بھی ہے ۔ دراصل اس کام سے ان بزرگوں کے بارے میں ایک طرح سے قدر دانی اور احسان شناسی کا اظہار ہوتا ہے نیز جیسے کام انہوں نے کیے ان سے ان کی طرف رغبت اور شوق دلانے کا مفہوم بھی اس میں پوشیدہ ہوتا ہے ۔ اسلام نہ صرف اس کام سے منع نہیں کیا بلکہ اسے جائز شمار کیا ہے ۔

اس قسم کی عمارتوں کا وجود ایسی شخصیتوں ، ان کے کام اور ان کی تاریخ کے لیے ایک تاریخی سند ہے یہی وجہ ہے کہ جن انبیاء و مرسلین اور دیگر شخصیات کی قبریں نہیں ملتیں ان کی تاریخ بھی مشکوک ہوگئی ہے اور ایک سوال بن کر رہ گئی ہے ۔

یہ بھی واضح ہے کہ اس قسم کی عمارات ہرگز توحید کی نفی نہیں کرتیں اور نہ ہی ان کے وجود سے اس بات کی ذرہ بھر نفی ہوتی ہے کہ عبادت فقط اللہ کے لیے مخصوص ہے کیونکہ احترام کرنا اور ہے اور عبادت کرنا اور ہے ۔

البتہ یہ ایک طویل بحث ہے جس کا یہ موقع نہیں ہے ۔

۴۔ تمام چیزیں مشیت الٰہی کے سہارے پر ہیں : آئندہ سے مربوط ارادے اور کام کے ساتھ ۔ انشاء اللہ ۔ کہنا نہ صرف بارگاہ خداوندی کے لیے ادب و احترام کا اظہار ہے بلکہ اس اہم حقیقت کا بیان بھی ہے کہ ہم اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں رکھتے ، جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے ۔ مستقل بالذات

خدا ہے اور ہم سب اسی کے سہارے پر ہیں۔ اگر ساری دنیا کی تلواریں چل پڑیں لیکن اللہ کا ارادہ نہ ہو تو وہ ایک رگ بھی نہیں کاٹ سکتیں اور اگر اس کا ارادہ ہو تو ہر چیز تیزی سے واقع ہو جائے یہاں تک کہ وہ آئینے کو پتھر کے پہلو میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔

یہ درحقیقت "توحید افعالی" کا مفہوم ہے۔ یعنی اگرچہ انسان ارادہ، اختیار اور آزادی رکھتا ہے لیکن ہر چیز اور ہر کام اللہ کی مشیئت کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہ تعبیر ہمیں کاموں میں خدا کی طرف زیادہ توجہ دلانے کے علاوہ طاقت و ہمت بھی بخشتی ہے اور عمل کی پاکیزگی اور صحت کی دعوت بھی دیتی ہے۔

چند ایک روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص آئندہ کے بارے میں کوئی بات انشاء اللہ کے بغیر کہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی حمایت اس سے اٹھا لیتا ہے[1]

امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے۔ اس میں ہے:

امامؑ نے ایک خط لکھنے کا حکم دیا۔ خط اختتام کو پہنچا تو آپؑ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ امامؑ نے دیکھا کہ اس میں "انشاء اللہ" نہیں تھا، تو فرمایا:

کیف رجوتم ان یتم ھٰذا ولیس فیہ استثناء، انظروا کل موضع لا یکون فیہ استثناء فاستثنوا فیہ

تمہیں اس کے انجام پا جانے کی امید کیسے ہوئی جبکہ اس میں انشاء اللہ نہیں تھا۔ اس میں دیکھو جہاں جہاں پر (ضرورت ہے اور) نہیں ہے وہاں وہاں پر انشاء اللہ لکھو۔

۵۔ ایک سوال کا جواب: زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ جس وقت خدا کو بھول جاؤ اور پھر تمہیں یاد آئے تو اسے یاد کرو۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر انشاء اللہ کہنے کی صورت میں اس کی مشیت پر بھروسہ نہ کرو تو جس وقت تمہیں یاد آئے اس کی تلافی کرو۔

اس آیت کی تفسیر میں اہل بیت علیہم السلام سے جو متعدد روایات منقول ہیں ان سے بھی اس مفہوم پر تاکید ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک سال گزرنے کے بعد بھی تمہیں یاد آئے کہ انشاء اللہ نہیں کہا تھا تو گزشتہ کی تلافی کرو[2]

اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ رسول اللہؐ بھول گئے ہیں حالانکہ اگر ان کی فکر و نظر میں نسیان آجائے تو ان کی گفتار اور اعمال پر کامل اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور انبیاء و آئمہ کے خطا اور نسیان

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۲۵۲

[2] و [3] نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۲۵۴

سے معصوم ہونے کی یہی دلیل ہے یہاں تک کہ موضوعات خارجیہ میں بھی۔
لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بہت سی قرآنی آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ روئے سخن انبیاء کی طرف ہے لیکن مقصود و منظور عام لوگ ہوتے ہیں۔ اس بات سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی گفتگو کے لیے عربوں کی مشہور ضرب المثل ہے:

ایاك اعنی و اسمعی یا جارۃ

میری مراد تُو ہے جو میرے پاس ہے اور اے پڑوسن تُو بھی سُن لے[1]

(بعض بزرگ مفسرین نے اس سوال کا ایک اور جواب دیا ہے جسے ہم سورہ انعام کی آیت ۹۰ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ پانچویں جلد کی طرف رجوع کیجئے)۔

---

[1] فارسی میں اس کے متبادل یہ ضرب المثل ہے،

در بتو می گویم دیوار تو بشنو

اے دروازے تجھے کہتا ہوں اور اے دیوار تُو سُن لے۔

اُردو میں اس کے لیے یہ ضرب المثل ہے:

کہوں دھی کو سنو بہو تُو کان رکھیو

نیز پنجابی زبان میں اس مفہوم کو شاید سب سے عمدہ ادا کیا گیا ہے:

بحنیاں دھی نوں تے سُنانیاں نونہ نوں

(ثاقب)

(۲۵) وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ○

(۲۶) قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۚ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ۘ وَّلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ○

(۲۷) وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○

ترجمہ

(۲۵) وہ اپنی غار میں تین سو سال سے نو سال اوپر ٹھہرے رہے۔

(۲۶) کہہ دے: ان کے قیام کی مدت سے خدا زیادہ آگاہ ہے، آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ امور سے وہی واقف ہے واقعاً وہ کیا خوب دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی ولی و سرپرست نہیں ہے اور کوئی شخص اس کے حکم میں شریک نہیں ہے۔

(۲۷) جو کچھ کتاب میں سے تیرے رب کی طرف سے تجھ پر وحی کیا گیا ہے اس کی تلاوت کر، کوئی اس کے فرمودات بدل نہیں سکتا اور اس کے علاوہ تجھے کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔

تفسیر

اصحابِ کہف کی نیند

گزشتہ آیات میں موجود قرائن سے اجمالاً معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف کی نیند بہت لمبی تھی۔ یہ بات ہر شخص کی حسِ جستجو کو ابھارتی ہے۔ ہر شخص جاننا چاہتا ہے کہ وہ کتنے برس سوئے رہے۔ زیرِ نظر آیات اس داستان کی قرآن حکیم میں آخری آیات ہیں۔ ان آیات میں تردد ختم کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ اپنی غار میں تین سو سے نو برس زیادہ ٹھہرے ہے (ولبثوا فی کہفھم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعًا)[1]

اس لحاظ سے وہ کُل تین سو نو سال غار میں سوئے رہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تین سو نو سال کہنے کی بجائے یہ جو کہا ——— کہ نو سال اس سے زیادہ —— یہ شمسی اور قمری سالوں کے فرق کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ شمسی حساب سے وہ تین سو سال رہے اور کہ جو قمری حساب سے تین سو نو سال ہوئے اور یہ تعبیر کا ایک لطیف پہلو ہے کہ ایک جزوی تعبیر کے ذریعے عبارت میں ایک اور وضاحت طلب حقیقت بیان کر دی جائے۔[2]

اس کے بعد اس بارے میں لوگوں کے اختلافِ آراء کو ختم کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: کہہ دے: خدا ان کے قیام کی مدت کو بہتر جانتا ہے (قل اللّٰہ اعلم بما لبثوا)۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین کے غیب کے احوال اس کے سامنے ہیں اور وہ ہر کسی کی نسبت انہیں زیادہ جانتا ہے (لہ غیب السماوات والارض)۔ اور جو کُل کائنات ہستی سے باخبر ہے کیونکر ممکن ہے کہ وہ اصحابِ کہف کے غار میں قیام کی مدت سے آگاہ نہ ہو۔

واقعاً وہ کیا خوب دیکھنے والا اور سننے والا ہے (ابصر بہ واسمع)[3]

---

[1] قواعد نحو کے مطابق یہاں سنین (جمع) کی بجائے سنۃ (مفرد) آنا چاہیئے لیکن چونکہ یہ بہت طویل نیند تھی اور برسوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے تاکہ اس سے کثرت ظاہر ہو۔

[2] شمسی اور قمری سال کا فرق گیارہ دن کا ہے۔ اگر گیارہ کو تین سو سے ضرب دیں اور پھر جواب کو قمری سال کے دنوں یعنی ۳۵۵ پر تقسیم کریں تو نتیجہ نو ہی ہوگا (البتہ جو کچھ باقی بچے گا وہ چونکہ ایک سال سے کم مدت ہے لہٰذا نظرانداز کرنے کے قابل ہے)۔

[3] ۔ابصر بہ واسمع ۔ یہ تعجب کے صیغے ہیں اور عظمت خدا ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوئے ہیں یعنی وہ اس قدر بینا اور شنوا ہے کہ انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

لہٰذا آسمانوں اور زمین کے باسیوں کا اس کے علاوہ کوئی اور سرپرست نہیں ہے (ما لہم من دونہ من ولی)۔

یہ کہ "مالھم" کی ضمیر کن لوگوں کی طرف لوٹتی ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ آسمان و زمین کے ساکنین کی طرف اشارہ ہے۔

بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہ اصحابِ کہف کی طرف اشارہ ہے یعنی اصحابِ کہف کا اس کے علاوہ کوئی ولی و سرپرست نہیں تھا۔ وہی تھا کہ جو اس ساری صورتِ حال میں ان کے ساتھ تھا اور اُن کی حمایت کرتا تھا۔

البتہ اس سے پہلے جملے کی طرف توجہ کریں تو اس میں آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ احوال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے زیرِبحث جملے کے بارے میں پہلی تفسیر زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اور کوئی شخص حکمِ خدا میں شریک نہیں ہے (ولا یشرك فی حکمہ احدًا)۔

درحقیقت یہ اللہ کی ولایتِ مطلقہ کے بارے میں تاکید ہے کہ نہ کوئی اور عالمین پر ولایت رکھتا ہے اور نہ کوئی ولایت میں شریک ہے۔ یعنی استقلال و اشتراک دونوں لحاظ سے کوئی دوسرا اس عالمِ امکان کی ولایت میں نفوذ نہیں رکھتا۔

زیرِنظر آخری آیت میں رُوئے سخن پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، جو کچھ کتابِ خدا میں سے تجھ پر وحی کیا گیا ہے اُس کی تلاوت کر (واتل ما اوحی الیك من کتاب ربك)۔

اور اِدھر اُدھر کی دروغ آمیز اور بے بنیاد باتوں کی پرواہ نہ کر۔ ان امور میں تجھے صرف وحیِ خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ کوئی چیز اس کی باتوں کو بدل نہیں سکتی اور اس کی بات (اور اس کی معلومات) میں تبدیلی ممکن نہیں ہے (لا مبدل لکلماتہ)۔

اس کا علم اور کلام بندوں کے علم اور کلام کی طرح نہیں ہے کہ جو ہر روز نئے انکشاف اور آگاہی کی وجہ سے تبدیل ہوتا رہے۔ اسی لیے بندوں کے علم اور کلام پر سو فیصد اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اسی وجہ سے تجھے اس کے علاوہ کوئی اور پناہ گاہ نہیں ملے گی (ولن تجد من دونہ ملتحدًا)۔

"ملتحد" "لحد" (بروزن "مہد") اس گڑھے کے معنی میں ہے جو درمیان سے کسی ایک جانب جھکا ہو (اس لحد کی طرح جو قبر کے لیے بنائی جاتی ہے) اسی لیے "ملتحد" اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف انسان مائل ہو۔ بعدازاں یہ لفظ ملجا اور پناہ گاہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ زیرِبحث آخری دو آیات میں کئی لحاظ سے تمام موجوداتِ عالم پر خدا کا احاطۂ علمی بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ امور اس کے سامنے ہیں لہٰذا وہ ان سب سے آگاہ ہے۔
پھر یہ فرمایا گیا ہے: صرف وہی ولی و سرپرست ہے اور وہ سب سے زیادہ آگاہ ہے۔
نیز اضافہ کیا گیا ہے: کوئی بھی اس کے حکم میں شریک نہیں ہے کہ جس کے باعث اس کا علم محدود ہو۔
اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس کے علم اور کلام میں تبدیلی نہیں ہوتی کہ اس کی قدر و قیمت اور ثبات میں کمی واقع ہو۔
آخری جملے میں ہے: "عالم میں واحد پناہ گاہ اسی کی ذات ہے" لہٰذا واضح ہے کہ وہ تمام پناہ لینے والوں سے آگاہ ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ داستانِ اصحابِ کہف احادیث کی روشنی میں: اصحاب کہف کے بارے میں منابع اسلامی میں بہت زیادہ روایات دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے بعض اسناد کے لحاظ سے قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ اسی لیے ان میں سے بعض میں باہم تضاد و اختلاف نظر آیا ہے۔

ایک روایت جو علی بن ابراہیم قمی نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے وہ متن، مضمون اور آیاتِ قرآن سے ہم آہنگی کے اعتبار سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے اصحاب کہف و رقیم کے بارے میں فرمایا:

> وہ ایک جابر اور ظالم بادشاہ کے زمانے میں تھے۔ وہ بادشاہ اپنے ملک کے باسیوں کو بت پرستی کی دعوت دیتا تھا۔ جو شخص اس کی یہ دعوت قبول نہ کرتا اسے قتل کر دیتا تھا۔
>
> اصحابِ کہف با ایمان افراد تھے اور خدائے بزرگ کی عبادت کرتے تھے (البتہ اس ظالم بادشاہ سے اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھے)۔
>
> اس ظالم بادشاہ نے اپنے پایۂ تخت کے دروازے پر کچھ لوگ مامور کر رکھے تھے۔ ان کے ذمہ تھا کہ شہر سے جانے والا ہر شخص وہاں پڑے ہوئے بتوں کو سجدہ کرنے پر مجبور تھا۔
>
> جیسے بھی ہو سکا یہ با ایمان افراد شکار کھیلنے کے بہانے شہر سے باہر آئے (ان کا پکا ارادہ تھا کہ اپنے اس شہر میں واپس نہ جائیں کہ جہاں کا ماحول بہت آلودہ تھا)۔
>
> راستے میں ان کی ملاقات ایک چرواہے سے ہو گئی انہوں نے اسے خدائے واحد کی طرف دعوت دی۔ اس نے قبول نہ کی لیکن تعجب کی بات ہے کہ چرواہے کا کتا ان کے پیچھے ہو لیا اور پھر ان سے بالکل جدا نہ ہوا۔ وہ بت پرستی سے بھاگ کر نکلے تھے۔ دن ڈھل رہا تھا کہ ایک غار کے پاس پہنچے۔ وہ اس میں کچھ دیر استراحت کے لیے ٹھہر گئے۔ اللہ نے ان پر نیند مسلط کر دی

جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: ہم نے انہیں سالہا سال نیند میں مستغرق رکھا۔

وہ ایسے محوِ خواب رہے کہ وہ ظالم بادشاہ مرگیا۔ شہر کے لوگ بھی یکے بعد دیگرے دنیا سے چل بسے۔ دَور بدل گیا اور لوگ بھی بدل گئے۔ اس طویل نیند کے بعد اصحابِ کہف جاگے تو ایک دوسرے سے اپنی نیند کی مدت کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ان کی نظر سورج پر پڑی تو وہ اونچا ہو چکا تھا تو کہنے لگے کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے میں سے ایک سے کہا: یہ چاندی کا سکّہ لے جاؤ اور چپکے سے شہر چلے جاؤ، وہاں سے ہمارے لیے کھانا لے آؤ لیکن خیال رکھنا کوئی تمہیں پہچان نہ لے کیونکہ انہیں ہمارے بارے میں پتہ چل گیا تو ہمیں قتل کر دیں گے یا اپنے دین کی طرف لے جائیں گے۔

وہ شخص شہر میں جا پہنچا لیکن شہر کا منظر تو اس کے خیال سے بالکل مختلف تھا اور لوگ بھی اس کے دیکھے بھالے نہ تھے۔ وہ ان کی زبان بھی اچھی طرح نہ سمجھتا تھا اور وہ بھی اس کی زبان پوری طرح نہ سمجھتے تھے۔ وہ پوچھنے لگے، تُو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟۔

آخر کار اُس نے اپنا بھید بتا دیا۔ (اس زمانے میں اس شہر کا حکمران خدا پرست) بادشاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس شخص کے ہمراہ غار کی طرف آیا۔

یہ لوگ غار کے دہانے پر پہنچے تو اندر دیکھنے لگے۔ بعض کہتے، کہ یہ تین افراد سے زیادہ نہیں ہیں اور چوتھا ان کا کتا ہے۔ بعض کہتے کہ یہ پانچ افراد ہیں اور چھٹا ان کا کتا ہے اور بعض کہتے کہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔

اس وقت ان پر خدا کی طرف سے ایک رعب سا چھا گیا۔ کوئی شخص غار میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا سوائے اس شخص کے کہ جو انہی میں سے تھا۔ جب وہ غار میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ وہ وحشت زدہ ہیں کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ظالم بت پرست بادشاہ دقیانوس کے آدمی غار کے دروازے پر آپہنچے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھی نے انہیں ان کی طویل نیند سے آگاہ کیا اور ان سے کہا کہ خدا نے تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ یہ بات سنی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ خوشی کے مارے ان کے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے اللہ سے درخواست کی کہ ہمیں پہلی حالت کی طرف لوٹا دے۔

اس زمانے کے بادشاہ نے کہا کہ بہتر ہے ہم یہاں ایک مسجد بنائیں کیونکہ وہ باایمان افراد تھے۔

امام علیہ السلام نے یہاں اضافہ فرمایا:

سال میں دو مرتبہ ان کے پہلو بدلتے تھے اور ان کے کتے نے غار کے دہانے پر اپنے اگلے

پاؤں پھیلائے ہوئے تھے (اور ان کی حفاظت کر رہا تھا)[1]

اصحاب کہف کے بارے میں ایک تفصیلی حدیث حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

پہلے وہ چھ افراد تھے۔ دقیانوس نے انہیں اپنا وزیر بنا رکھا تھا۔ وہ ہر سال ان کیلئے ایک دن عید کے طور پر مناتا تھا۔

ایک برس جبکہ عید کا دن تھا۔ اس کے بڑے بڑے فوجی افسر اس کی دائیں طرف اور خاص مشیر بائیں طرف بیٹھے تھے۔

ایک فوجی کمانڈر نے اسے بتایا کہ ایران کا لشکر سرحدوں میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ خبر سُن کر اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ اتنا پریشان ہوا کہ کانپنے لگا اور تاج اس کے سر سے گر پڑا۔

اس کے وزیروں میں سے ایک کہ جس کا نام تملیخا تھا، اس نے دل میں سوچا کہ اس شخص کو گمان تھا کہ یہ خدا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ اس قدر غمزدہ کیوں ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں تمام بشری صفات موجود ہیں۔

اس کے چھ کے چھ وزیر روزانہ ایک وزیر کے گھر جمع ہوا کرتے تھے۔ اس روز تملیخا کی باری تھی۔ اس نے دوستوں کے لیے اچھا کھانا تیار کیا لیکن وہ پریشان دکھائی دیتا تھا۔ (کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا تھا اس کے دوست اُس کی اس حالت کی طرف متوجہ ہوئے تو) اس نے کہا:

میرے دل میں ایک بات ہے کہ جس کے باعث میرا کھانا پینا اور آرام جاتا رہا ہے۔

انہوں نے واقعہ پوچھا تو اُس نے کہا: اس بلند آسمان پر مَیں نے بہت غور کیا ہے کہ یہ بغیر کسی ستون کے قائم ہے۔ جس نے اس میں سورج اور چاند کی صورت میں دو روشن نشانیاں رواں دواں کر رکھی ہیں اور اس کی سطح ستاروں سے سجا رکھی ہے اس کے بارے میں مَیں نے بہت غور و فکر کیا ہے۔ پھر مَیں نے اس زمین کی طرف دیکھا ہے اور اپنے آپ سے پوچھا ہے کہ کس نے اسے پانی سے باہر نکالا اور پھیلایا ہے اور کس نے اس کی بے قراری کو پہاڑوں کے ذریعے قرار بخشا ہے۔ پھر مَیں نے اپنی حالت کے بارے میں سوچا ہے اور اپنے آپ سے پوچھا ہے کہ کس نے مجھے رحمِ مادر سے باہر بھیجا ہے، کس نے مجھے پستانِ مادر سے خوشگوار دودھ بخشا ہے اور غذا دی ہے۔ الغرض کس نے مجھے پروان چڑھایا ہے۔ ان سارے مسائل کے بارے میں مَیں نے تو یہی سمجھا ہے کہ کوئی ہے جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے، یہ سب کچھ

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۴۷ و ص ۲۴۸۔

پیدا کیا ہے اور وہ ان کے نظام چلاتا ہے۔ اور یہ دقیانوس نہیں کوئی اور ہے — وہ کہ جو مالک الملوک بھی ہے، آسمانوں پر حاکم بھی،

اس نے یہ باتیں جب صراحت اور خلوص سے کیں۔ جو کچھ اُس کے دل سے نکلا اُس کے دوستوں کے دل میں اتر گیا۔ اچانک وہ سب اس کے پاؤں پر گر پڑے اور اس کی قدم بوسی کرنے لگے۔

انہوں نے کہا: اللہ نے تیرے ذریعے ہمیں گمراہی سے نکال کر ہدایت کی طرف دعوت دی ہے۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں؟

تیلیخا اٹھا۔ اس نے اپنے باغ کی کھجوریں تین ہزار درہم میں بیچیں۔ وہ رقم اٹھائی اور پھر وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور شہر سے باہر کی طرف چل پڑے۔ جب وہ تین میل کا راستہ طے کر چکے تو تیلیخا نے کہا: بھائیو! بادشاہی اور وزارت تو گئی۔ اب خدا کی راہ کو ان قیمتی گھوڑوں کے ذریعے طے نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے اتر آؤ تاکہ اب اس راستے کو پیدل طے کریں شاید خدا ہماری مشکلیں آسان کر دے۔

انہوں نے گھوڑے چھوڑ دیئے اور پیدل چل پڑے۔ اس روز انہوں نے تیزی سے سات فرسخ راستہ طے کر لیا۔ مگر ان کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ ان کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا کہ ان کی ملاقات ایک چرواہے سے ہوئی۔ انہوں نے کہا: اے چرواہے! تمہارے پاس دودھ یا پانی کا گھونٹ ہے تو کچھ ہماری مہمانی کرو۔

چرواہے نے کہا: جو تمہیں پسند ہو وہ حاضر ہے لیکن تمہارے چہرے مجھے بادشاہوں والے لگتے ہیں۔ تم یہاں کس لیے آئے ہو۔ میرا خیال ہے تم دقیانوس بادشاہ سے بھاگ کر آئے ہو۔

انہوں نے کہا: اے چرواہے! حقیقت یہ ہے کہ ہم جھوٹ نہیں بول سکتے لیکن اگر ہم سچ کہیں تو کیا تُو ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی تو نہیں کر دے گا؟

اس کے بعد انہوں نے چرواہے کو اپنی ساری کہانی کہہ سنائی۔ چرواہا ان کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ اس نے کہا: بھائیو! جو کچھ تمہارے دل میں اتر گیا ہے وہ میرے دل میں بھی سما گیا ہے لیکن اتنی اجازت دو کہ یہ بھیڑ بکریاں ہیں ان کے مالکوں کے سپرد کر آؤں اور تم سے آملوں۔

وہ کچھ دیر رُک گئے۔ چرواہا بھیڑ بکریاں پہنچا آیا۔ اُس کا کتا اس کے ساتھ ہی تھا۔ اُن جوانوں نے کتے کو دیکھا تو بعض نے کہا: ڈر ہے کہ کہیں یہ بھونک کر ہمارا راز فاش نہ کر دے۔ لیکن انہوں نے جتنی بھی کوشش کی کہ اُسے دُور کریں وہ نہ مانا۔ گویا وہ کہتا تھا: مجھے رہنے دو میں دشمنوں سے تمہاری حفاظت کروں گا (میں بھی تمہارے راستے کا مسافر ہوں)۔

یہ ساتوں اپنی راہ پر چلتے رہے۔ کتا اُن کے پیچھے پیچھے تھا یہاں تک کہ ایک پہاڑ پر چڑھ گئے۔ ایک غار کے پاس پہنچ کر وہ رُک گئے۔ غار کے پاس انہوں نے چشمے اور پھلدار درخت دیکھے۔ انہوں نے پھل کھائے، پانی پیا اور سیراب ہوئے۔

رات کی تاریکی چھا گئی تو وہ غار میں جا پناہ گزین ہوئے۔ کتے نے غار کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلا دیئے اور پہرہ دینے لگا۔ یہ حالت تھی کہ خدا نے موت کے فرشتے کو قبضِ ارواح کا حکم دیا (اور ان پر موت کی سی گہری نیند مسلط ہو گئی) [1]

دقیانوس کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ شہنشاہِ روم تھا۔ اس نے ۲۴۹ سے ۲۵۱ عیسوی تک حکومت کی۔ وہ عیسائیوں کا سخت دشمن تھا اور انہیں بہت اذیت پہنچاتا تھا۔ یہ حکومتِ روم کے عیسوی دین قبول کرنے سے پہلے کا زمانہ تھا۔

۲۔ **"غار" کہاں ہے؟** یہ کہ اصحاب کہف کس علاقے میں رہتے تھے اور یہ غار کہاں تھی، اس سلسلے میں علماء اور مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ البتہ اس واقعے کے مقام کو صحیح طور پر جاننے کا اصل داستان، اس کے تربیتی پہلوؤں اور تاریخی اہمیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ یہ کوئی واحد واقعہ نہیں کہ جس کی اصل داستان تو ہمیں معلوم ہے لیکن اس کی زیادہ تفصیلات معلوم نہیں ہیں لیکن مسلّم ہے کہ اس واقعے کا مقام جاننے سے اس کی خصوصیات کو مزید سمجھنے کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔

بہرحال اس سلسلے میں جو احتمالات ذکر کیے گئے اور جو اقوال نظر سے گزرے ہیں ان میں سے دو زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ واقعہ شہر "افسوس" میں ہوا اور یہ غار اس شہر کے قریب واقع تھی۔ ترکی میں اب بھی اس شہر کے کھنڈرات ازمیر کے قریب نظر آتے ہیں۔ وہاں قریب ایک قصبہ ہے جس کا نام "ایاصولوک" ہے اس کے پاس ایک پہاڑ ہے "ینایر داغ"۔ اب بھی اس میں ایک غار نظر آتی ہے جو افسوس شہر سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ یہ ایک وسیع غار ہے۔ کہتے ہیں اس میں سینکڑوں قبروں کے آثار نظر آتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اصحاب کہف کی غار یہی ہے۔

جیسا کہ جاننے والوں نے بیان کیا ہے کہ اس غار کا دہانہ شمال مشرق کی جانب ہے۔ اس وجہ سے بعض بزرگ مفسرین نے اس بارے میں شک کیا ہے کہ یہ وہی غار ہے حالانکہ اس کی یہی کیفیت اس کے اصلی ہونے کی مؤید ہے کیونکہ طلوع کے وقت سورج کا دائیں طرف اور غروب کے وقت بائیں طرف ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ غار کا دہانہ شمال یا کچھ شمال مشرق کی جانب ہو۔

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲ صفحہ ۳۸۲ (مادۂ نکر)۔

اس وقت وہاں کسی مسجد یا عبادت خانہ کا نہ ہونا بھی اس کے وہی غار ہونے کی نفی نہیں کرتا کیونکہ تقریباً سترہ صدیاں گزرنے کے بعد ممکن ہے اس کے آثار مٹ گئے ہوں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہ غار ہے کہ جو اُردن کے دارالحکومت عمان میں واقع ہے۔ یہ غار "رجیب" نامی ایک بستی کے قریب ہے۔ اس غار کے اوپر گرجے کے آثار نظر آتے ہیں۔ بعض قرائن کے مطابق ان کا تعلق پانچویں صدی عیسوی سے ہے۔ جب اس علاقے پر مسلمانوں کو غلبہ ہوا تو اسے مسجد میں تبدیل کر لیا گیا تھا اور وہاں محراب بنائی گئی تھی اور اذان کی جگہ کا اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ دونوں اس وقت موجود ہیں۔

۳۔ اس واقعے کے تربیتی اور تعمیری پہلو: اس عجیب و غریب تاریخی واقعے کو قرآن نے تمام طرح کے خرافات اور بے بنیاد باتوں سے پاک کر کے ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا ہے۔ یہ واقعہ بھی قرآن کے دیگر تمام واقعات کی طرح تربیتی اور تعمیری نکات سے معمور ہے۔ تفسیر بیان کرتے ہوئے ہم نے ان نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک مرتبہ پھر مجموعی طور پر ان نکات کی طرف اشارہ کیا جائے تاکہ ہم قرآن کے اصلی مقصد کے زیادہ قریب ہو جائیں۔

الف۔ اس داستان کا پہلا سبق تقلید کے بند توڑنا ہے۔ اس داستان کا تقاضا ہے کہ فاسد ماحول کے رنگ میں نہیں رنگے جانا چاہیئے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ معاشرے کی اکثریت گمراہ تھی لیکن اس کے مقابلے میں جوانمرد اصحاب کہف نے اپنی آزادیٔ فکر کو گنوایا نہیں اور یہی امر ان کی نجات و فلاح کا سبب بن گیا۔

اصولی طور پر انسان کو معاشرہ ساز ہونا چاہیئے نہ کہ اس کی برائیوں کا شریک کار۔ سست، کمزور اور بے حیثیت لوگ وہ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں:

خواہی نشوی رسوا ہم رنگ جماعت شو

اگر تم ذلیل نہیں ہونا چاہتے تو جیسے لوگ ہیں ویسے ہو جاؤ۔

جبکہ اہل ایمان اور حریتِ فکر رکھنے والے افراد کہتے ہیں:

لوگوں کا ہم رنگ ہونا تیرے لیے باعثِ ننگ و عار ہے۔

ب۔ اس عبرت انگیز واقعے کا دوسرا سبق بُرے ماحول سے ہجرت اختیار کرنا ہے۔ ان کا شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ تھا، خوشحال زندگی تھی، مادی نعمتیں ان کے لیے فراواں تھیں اُن کے گھر بھرے پُرے تھے۔ ایسی زندگی کو انہوں نے ٹھکرا دیا اور اس غار میں جا ڈیرہ کیا کہ جہاں طرح طرح کی محرومیاں تھیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے اس لیے کیا تاکہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکیں اور ظلم و جور اور کفر و شرک کی تقویت کا باعث نہ بنیں [1]

---

[1] اسلام میں ہجرت کی اہمیت اور اس کے فلسفے کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۵۶۲ (اردو ترجمہ) پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

ج ۔ اس داستان کا تیسرا درس تقیہ ہے ۔ وہ تقیہ کہ جو تربیتی، اصلاحی اور تعمیری ہے ۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ شہر والوں کو ان کے بارے میں پتہ نہ چلے اور وہ اسی طرح پردۂ اسرار میں رہ جائیں کہ مبادا ان کی جان بے کار ہی ضائع چلی جاتے یا انہیں جبری طور پر اس بُرے ماحول کی طرف پلٹا دیا جائے ۔

ہم جانتے ہیں کہ تقیہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ انسان اپنے حقیقی مقام یا مؤقف کو ایسے مقام پر مخفی رکھے کہ جہاں ظاہر کرنا بے نتیجہ ہو تاکہ مقابلے کے لیے اور دشمن پر ضرب لگانے کے موقع کے لیے اپنی قوت کو محفوظ رکھا جا سکے [1]

د ۔ اللہ کی راہ میں سب انسان برابر ہیں ۔ وزیر اور چرواہا اکٹھے ہیں ۔ بلکہ ان کی حفاظت کرنے والا کُتا بھی ان کے ساتھ ہے ۔ یہ بھی اس واقعے کا ایک درس ہے ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مادی دنیا کے امتیازات اور مقام و منصب راہِ حق کے مسافروں کو ایک دوسرے سے ہرگز جُدا نہیں کرتے اور راہِ توحید تمام انسانوں میں مساوات کا راستہ ہے ۔

ہ ۔ اس داستان کا ایک درس یہ بھی ہے کہ مشکلات کے مواقع پر اللہ کی طرف سے اس کے بندوں کی تعجب انگیز طور پر امداد کی جاتی ہے ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کیسے جب معاشرے کے حالات ناسازگار تھے تو اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو سالہا سال سُلائے رکھا اور جب حالات سازگار ہوئے تو انہیں بیدار کر دیا ۔ اور لوگوں نے ان کا توحید پرستوں کی حیثیت سے احترام کیا ۔ نیز ہم نے دیکھا کہ کس طرح اس طویل مدت میں ان کے جسموں کو ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رکھا اور ان کے اندر ایک ایسا رعب پیدا کر دیا کہ جس نے حملہ آوروں کے مقابلے میں ڈھال بن کر ان کی حفاظت کی ۔

و ۔ اصحابِ کہف نے ان سخت ترین حالات میں بھی ہمیں پاکیزہ غذا کھانے کا درس دیا کیونکہ جسم انسان کی غذا کا انسانی روح، فکر اور دل پر گہرا اثر ہوتا ہے ۔ انسان جب حرام اور ناپاک غذا سے آلودہ ہوتا ہے تو وہ راہِ خدا سے اور تقویٰ سے دُور ہو جاتا ہے ۔

ز ۔ مشیتِ خدا پر بھروسہ اور اعتماد ضروری ہے ۔ اس کے لطف و کرم سے مدد طلب کرنا اور آئندہ کے امور کے لیے انشاء اللہ کہنا ۔ یہ درس بھی ہم نے اس واقعے کے ضمن میں سیکھا ہے ۔

ح ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن انہیں جوانمرد (فتیۃ) کہہ کر یاد کر رہا ہے حالانکہ بعض روایات کے مطابق عمر کے لحاظ سے وہ جوان نہیں تھے ۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ پہلے وہ اس دَور کے ظالم بادشاہ کے وزیر تھے

---

[1] تقیہ کے بارے میں "تقیہ ایک حفاظتی ڈھال ہے" کے زیرِ عنوان ہم تفسیرِ نمونہ کی جلد ۲ صفحہ ۲۹۵ (اردو ترجمہ) پر گفتگو کر چکے ہیں اور اس کے فقہی مدارک "القواعد الفقہیہ" میں ہم نے بیان کیے ہیں ۔

تو ماننا پڑے گا کہ وہ اچھی خاصی عمر کے تھے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن جوانی کو جوانمردی کے اصول پر دیکھتا ہے یعنی قرآن پاکیزگی، جرأت وایثار کے حوالے سے جوانی کو ماپتا ہے۔

ط۔ اس واقعے سے ایک اور اصلاحی سبق یہ ملتا ہے کہ مخالفین سے سابقہ پڑے تو ضروری ہے کہ بحث منطقی بنیاد پر کی جائے۔ کیونکہ جب اصحاب کہف اس شرک آلود ماحول پر تنقید کرتے تو منطقی دلائل کا سہارا لیتے۔ اس کے کچھ نمونے ہم نے اسی سورہ کی آیات ۱۵ اور ۱۶ میں دیکھے ہیں۔

اصولی طور پر تمام انبیاء اور ہادیانِ الٰہی کا طریق کار یہ تھا کہ وہ مخالفین سے مقابلے اور آمنا سامنا ہونے کی صورت میں آزاد اور منطقی بنیاد پر گفتگو کرتے تھے۔ طاقت وہ صرف اسی صورت میں استعمال کرتے جب فتنہ و فساد کے خاتمے کے لیے منطقی بحث مؤثر نہ رہتی تھی یا یہ کہ جب مخالفین منطقی گفتگو میں رکاوٹ بن جاتے تھے۔

ی۔ دسواں درس اس داستان کا معادِ جسمانی اور قیامت کے دن انسان کی حیاتِ نو کے امکان کا ہے۔ اس کی تشریح آئندہ مباحث میں تفصیل کے ساتھ آئے گی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس داستان کے تربیتی، اصلاحی اور تعمیری نکات انہی میں منحصر ہیں لیکن ان دس درسوں میں سے ایک بھی ہو تو ایسی داستان بیان کرنے کے لیے کافی ہے چہ جائیکہ یہ سب موجود ہوں۔

بہرحال مقصد خواہ مخواہ کی مشغولیت اور داستان گوئی نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو مجاہد، بہادر، باایمان، آگاہ اور شجاع بنانا ہے اور ان کی اصلاح کرنا ہے۔ اس کے لیے دیگر تبلیغی طریقوں کے علاوہ ایک یہ ہے کہ انسان کی گزشتہ تاریخ سے حقیقی نمونے پیش کیے جائیں۔

اصحابِ کہف کا واقعہ علمی اعتبار سے

یہ بات مسلّم ہے کہ اصحابِ کہف کا واقعہ کسی گزشتہ آسمانی کتاب میں نہیں تھا (چاہے وہ اصلی ہو یا موجودہ تحریف شدہ) اور نہ اسے ان کتابوں میں ہونا ہی چاہیئے تھا کیونکہ تاریخ کے مطابق یہ واقعہ ظہورِ حضرت مسیحؑ کے صدیوں بعد کا ہے۔

یہ واقعہ "دکیوس" کے دَور کا ہے، جسے عرب "دقیانوس" کہتے ہیں۔ اس کے زمانے میں عیسائیوں پر سخت ظلم ہوتا تھا۔

یورپی مؤرخین کے مطابق یہ واقعہ ۴۹ تا ۲۵۱ عیسوی کے درمیان کا ہے۔ ان مؤرخین کے خیال میں اصحابِ کہف کی نیند کی مدت ۱۵۷ سال ہے۔ یورپی مؤرخین انہیں "افسوس کے سات سونے والے" کہتے ہیں[1] جبکہ ہمارے ہاں انہیں "اصحابِ کہف" کہا جاتا ہے۔

---

[1] اعلام قرآن صـ ۱۵۳

اب دیکھتے ہیں کہ "افسوس" شہر کہاں ہے؟ سب سے پہلے کن علماء نے ان سونے والوں کے بارے میں کتاب لکھی اور وہ کس صدی کے تھے؟

"افسوس" یا "اُفسُس" ایشیائے کوچک کا ایک شہر تھا (موجودہ ترکی جو قدیم مشرقی روم کا ایک حصہ تھا) یہ دریائے کاستر کے پاس "ازمیر" شہر کے تقریباً چالیس میل جنوب مشرق میں واقع تھا۔ یہ "الونی" بادشاہ کا پایۂ تخت شمار ہوتا تھا۔ افسوس اپنے مشہور بُت خانے ارطامیس کی وجہ سے بھی عالمی شہرت رکھتا تھا۔ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے تھا۔[1]

کہتے ہیں کہ اصحاب کہف کی داستان پہلی مرتبہ پانچویں صدی عیسوی میں ایک عیسائی عالم نے لکھی۔ اس کا نام "ژاک" تھا۔ وہ شام کے ایک گرجے کا متولی تھا۔ اس نے سریانی زبان کے ایک رسالے میں اس کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک اور شخص نے اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کا نام "گوگوریوس" تھا۔ ترجمے کا نام اس نے "جلالِ شہداء" کا ہم معنی رکھا۔[2]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے ایک دو صدیاں پہلے یہ واقعہ عیسائیوں میں مشہور تھا اور گرجوں کی مجالس میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا۔

البتہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے، اسلامی مصادر میں اس کی جو تفصیلات آئی ہیں وہ مذکورہ عیسائیوں کے بیانات سے کچھ مختلف ہیں۔ جیسے اُن کے سونے کی مدت۔ کیونکہ قرآن نے صراحت کے ساتھ یہ مدت ۳۰۹ سال بیان کی ہے۔

یاقوت حموی نے اپنی کتاب "معجم البلدان" ج ۳ صفحہ ۸۰۶ پر، ابن خرداد بہ نے اپنی کتاب "المسالک والممالک" صفحہ ۱۰۶ تا صفحہ ۱۱۰ میں اور ابوریحان بیرونی نے اپنی کتاب "الآثار الباقیہ" صفحہ ۲۹۰ پر نقل کیا ہے کہ قدیم سیاحوں کی ایک جماعت نے شہر "آبس" میں ایک غار دیکھی ہے جس میں چند انسانی ڈھانچے پڑے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے یہ بات اسی داستان سے مربوط ہو۔

سورہ کہف میں قرآن کے لب و لہجہ سے اور اس سلسلے میں اسلامی کتب میں منقول شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان یہودی علماء میں بھی ایک تاریخی واقعے کے طور پر مشہور تھی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ طولانی نیند کا یہ واقعہ مختلف قوموں کے تاریخی ماخذ میں موجود رہا ہے۔[3]

شہر افسوس میں سالہا سال تک سوئے رہنے والے اصحاب کہف کی اس طویل نیند کے بارے میں

---

1. قاموس مقدس صفحہ ۸۰ سے ایک اقتباس۔
2. اعلام قرآن صفحہ ۱۵۴۔
3. معاد و جہان پس از مرگ صفحہ ۱۶۳ تا صفحہ ۱۶۵۔

ہو سکتا ہے کچھ افراد شک کریں کہ یہ بات سائنسی معیار پر پوری نہیں اترتی لہٰذا وہ اسے ایک افسانہ قرار دیں کیونکہ:

اولاً: اس قسم کی طولانی عمر تو جاگتے افراد کے لیے بعید معلوم ہوتی ہے چہ جائیکہ سوئے ہوئے افراد کیلئے۔

ثانیاً: اگر یہ قبول کر لیا جائے کہ بیداری کے عالم میں ایسی عمر ممکن ہے تب بھی سوئے ہوئے تو ممکن معلوم نہیں ہوتی کیونکہ کھائے پیئے بغیر اتنا طویل عرصہ انسان کیونکر زندہ رہ سکتا ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ ایک انسان کو ہر روز کے لیے ایک کلو کھانا اور ایک لٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو اصحاب کہف کی عمر کے لیے سو ٹن غذا اور ایک لاکھ لٹر پانی کی ضرورت ہے اور اتنا ذخیرہ ایک بدن میں ممکن نہیں۔

ثالثاً: اگر ان تمام چیزوں سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو بھی انسانی بدن اتنا طویل عرصہ ایک جیسا کیسے رہ سکتا ہے انسانی آرگانزم Organism کے لیے اتنی طولانی مدت یقیناً نقصان دہ ہے اور جسم کے اعضاء و اجزاء کا بہت سا حصہ اتنے طویل عرصے میں ضرور ضائع ہوتا ہے۔

ہو سکتا ہے پہلی نظر میں ان اشکالات اور موانع کے باعث ایسا ہونا ناقابلِ عمل دکھائی دے — لیکن ایسا نہیں کیونکہ:

اولاً: لمبی عمر کا مسئلہ کوئی غیر سائنسی نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کسی زندہ موجود کی عمر کی طوالت کیلئے سائنسی حوالے سے کوئی ایسا معیار نہیں ہے کہ جس کے باعث موت حتمی اور یقینی ہو۔

دوسرے لفظوں میں یہ صحیح ہے کہ انسان کے جسمانی قویٰ جس قدر بھی ہوں آخر محدود اور اختتام پذیر ہیں لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ ایک انسانی بدن یا کسی اور زندہ شئے کا بدن معمول سے زیادہ زندہ رہنے کی توانائی نہیں رکھتا۔

اس کی مثال پانی کی سی نہیں کہ جب اس کا درجۂ حرارت سو تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اُبلنے لگتا ہے اور صفر تک پہنچ جاتا ہے تو برف بن جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ جب انسان سو یا ڈیڑھ سو سال تک پہنچ جائے تو ضروری ہے کہ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے اور اس پر موت طاری ہو جائے۔ بلکہ زندہ موجودات کی عمر کا تعلق زیادہ تر اس کی کیفیتِ زندگی اور اندازِ بود و باش سے ہے اور حالات کی تبدیلی سے مکمل طور پر قابلِ تغیّر ہے۔ اس بات کا زندہ شاہد یہ امر ہے کہ ایک طرف تو دنیا کے کسی سائنسدان نے انسانی عمر کے لیے کوئی معین معیار مقرر نہیں کیا جبکہ دوسری طرف تجربہ گاہوں میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ بعض زندہ موجودات کی عمر، دوگنا، کئی گنا یہاں تک کہ بارہ گنا اور اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ اب تو امید بھی دلائی جا رہی ہے کہ بعض نئے عملی طریقے پیدا ہونے سے انسان کی عمر موجودہ عمر کی نسبت کئی گنا بڑھ جائے گی۔

یہ تو طولِ عمر کے بارے میں گفتگو تھی۔

ثانیاً: اس طولانی نیند میں آب و غذا کے بارے میں اگر تو معمول کی نیند ہو تو ہو سکتا ہے کہ اعتراض کرنے والے کو حق بجانب سمجھا جائے کہ یہ بات سائنسی اصول سے ہم آہنگ نہیں کیونکہ انسانی بدن میں اجزا کی بیشی

نیند کی حالت میں عام حالت کی نسبت اگرچہ کم ہے پھر بھی اتنی طویل مدت میں تو بہت زیادہ ہوگی لیکن توجہ رہے کہ مادی دنیا میں ایسی نیندیں بھی ہیں کہ جن میں بدن کی غذا کا مصرف بہت کم ہوتا ہے اس کے لیے ان جانوروں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو موسم سرما میں سو جاتے ہیں۔ اس مسئلے کو ہم ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں:

بعض جانوروں کی سردیوں کی نیند: بہت سے جانور ایسے ہیں جو سارے موسم سرما میں سوئے رہتے ہیں۔ اسے سائنسی اصطلاح میں "سردیوں کی نیند" کہتے ہیں۔

ایسی نیند میں علامات حیات تقریباً ختم ہو جاتی ہیں۔ زندگی کا معمولی سا شعلہ روشن رہتا ہے۔ دل کی دھڑکن تقریباً رک جاتی ہے اور اتنی خفیف ہو جاتی ہے کہ بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ ایسے مواقع پر بدن کو ایک ایسے بڑے بھٹے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کہ جسے بجھا کر چھوٹا سا شعلہ بھڑکتا رہے۔ واضح ہے کہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلوں کے لیے بھٹے کو جتنے تیل یا گیس کی خوراک کی ایک دن کے لیے ضرورت ہوتی ہے ایک خفیف سے شعلے کے لیے اتنی برسہا برس یا صدیوں کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ اس میں جلتے ہوئے بھٹے کی مقدار اور خفیف سے شعلے کی مقدار کے لحاظ سے فرق ہو سکتا ہے۔

سائنس دان بعض جانوروں کی سردیوں کی نیند کے بارے میں کہتے ہیں:

> کوئی مینڈک جب سردیوں کی نیند میں ہو تو اسے اگر اس کی جگہ سے باہر نکال لیں تو وہ مُردہ معلوم ہوگا۔ اس کے پھیپھڑوں میں ہوا نہیں ہوتی۔ اس کے دل کی حرکت اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ اس کا پتہ نہیں چلایا جاسکتا۔ خون سرد جانوروں Cool Blooded میں سے بہت سے ایسی سردیوں کی نیند سوتے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی طرح کے کیڑے مکوڑوں، حشرات الارض، گھونگھوں اور رینگنے والے جانوروں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ بعض خون گرم جانوروں Warm Blooded کی بھی سردیوں کی ایسی نیند ہوتی ہے۔ اس نیند کے عالم میں حیاتی فعالیتیں بہت سست پڑ جاتی ہیں اور بدن میں ذخیرہ شدہ چربی آہستہ آہستہ صرف ہوتی رہتی ہے[1]

مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی نیند بھی ہے کہ جس میں غذا کی انتہائی کم ضرورت ہو جاتی ہے اور حیاتی فعالیتیں تقریباً صفر تک پہنچ جاتی ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہی صورت حال اعضا کو فرسودگی سے بچانے اور جانوروں کی طوالت عمر میں مدد کرتی ہے۔

اصولی طور پر جو جاندار احتمالاً سردیوں میں اپنی غذا حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ان کے لیے سردیوں کی نیند بہت غنیمت چیز ہے۔

---

[1] اقتباس از کتاب فرہنگنامہ (دائرۃ المعارف جدید فارسی) مادہ "زمستان خوابی"۔

ایک اور نمونہ -یوگا کے ماہرین : یوگا کے ماہرین کے بارے میں دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے بعض کو یقین نہ کرنے والے حیرت زدہ افراد کی آنکھوں کے سامنے بعض اوقات تابوت میں رکھ کر ہفتہ بھر کی مدت تک کے لیے مٹی کے نیچے دفن کر دیتے ہیں اور مذکورہ مدت ختم ہونے کے بعد انہیں باہر نکال لیتے ہیں۔ ان کی مالش کی جاتی ہے اور مصنوعی سانس دی جاتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ معمول کی حالت میں پلٹ آتے ہیں۔

اتنی مدت کے لیے اگر ضرورتِ غذا کا مسئلہ اہم نہ ہو تو بھی آکسیجن کا مسئلہ تو بہت اہم ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دماغ کے خلیے آکسیجن کے معاملے میں اتنے حساس اور ضرورت مند ہوتے ہیں کہ اگر چند سیکنڈ بھی اس سے محروم رہیں تو تباہ ہو جائیں۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک یوگی پورا ہفتہ کس طرح آکسیجن کی اس کمی کو برداشت کر لیتا ہے۔

ہم جو وضاحت کر چکے ہیں اس کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ بات یہ ہے کہ یوگی کے بدن کی حیاتی فعالیت اس عرصے میں تقریباً رُک جاتی ہے۔ اس دوران میں خلیے کو آکسیجن کی ضرورت اور اس کا مصرف بہت کم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہی ہوا جو تابوت کے اندر والے حصے میں ہوتی ہے بدن کے خلیوں کی ہفتہ بھر کی غذا کے لیے کافی ہوتی ہے۔

زندہ انسان کے بدن کو منجمد کر دینا : جانداروں بلکہ انسانی بدن کو منجمد کر کے ان کی عمر بڑھانے کے بارے میں آج تو بہت سے نظریے اور بحثیں چل پڑی ہیں۔ ان میں بعض تو عملی جامہ بھی پہن چکی ہیں۔

ان نظریوں Theories کے مطابق یہ ممکن ہے کہ ایک انسان یا حیوان کے بدن کو ایک خاص طریقے کے تحت صفر سے کم درجۂ حرارت پر رکھ کر اس کی زندگی کو ٹھہرا دیا جائے، اس طرح سے کہ وہ واقعاً مر نہ جائے۔ پھر ایک ضروری مدت کے بعد اسے مناسب حرارت دی جائے اور وہ حالتِ معمول پر لوٹ آئے۔

ایسے کُرّے جو بہت دُور ہیں ان تک کا فضائی سفر جو کئی سو یا کئی ہزار سال تک کی مدت کا ہو سکتا ہے، کے لیے کئی منصوبے پیش کیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے ایک یہی ہے کہ خلا نورد کے بدن کو ایک خاص تابوت میں رکھ دیا جائے اور اسے منجمد کر دیا جائے اور جب سالہا سال کی مسافت کے بعد وہ مقررہ کُرّات کے قریب پہنچے تو ایک خودکار نظام کے تحت اس تابوت میں حرارت پیدا ہو جائے اور خلا نورد حالتِ معمول پر لوٹ آئے بغیر اس کے کہ اُس کی عمر ضائع ہو۔

ایک سائنسی مجلے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ حال ہی میں انسانی بدن کو لمبی عمر کے لیے منجمد کرنے کے بارے میں رابرٹ نیلسن نے کتاب لکھی ہے۔ سائنسی دنیا میں یہ کتاب بہت اہمیت اختیار کر گئی ہے اور اس کے مندرجات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔

مجلے کے اس مقالے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ حال ہی میں اس عنوان کے تحت ایک خاص سائنسی شعبہ قائم ہو گیا ہے۔ مذکورہ مقالے میں لکھا گیا ہے:

حیاتِ جاوداں پوری تاریخِ انسانی میں ہمیشہ انسان کا سنہرا خواب رہی ہے لیکن اب یہ خواب حقیقت میں بدل گیا ہے۔ یہ امر ایک نئے علم کی خوشگوار اور حیرت انگیز ترقی کا مرہونِ منت ہے۔ اس علم کا نام کریانک ہے۔ (یہ علم انسانی بدن کو منجمد کر کے زندہ رکھنے کے بارے میں ہے۔ اس کے مطابق انسان کے بدن کو منجمد کر کے اسے بچایا جا سکتا ہے یہاں تک کہ سائنسدان اسے پھر سے زندہ کر دیں)۔

کیا یہ بات قابلِ یقین ہے؟

بہت سے اہم اور ممتاز سائنسدان کئی پہلوؤں سے اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ اس کے بارے میں کئی کتابیں مثلاً "لائف" اور "اسکوایر" چھپ چکی ہیں۔ پوری دنیا کے اخبارات پوری شد و مد سے اس مسئلے پر بحث کر رہے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں اب تجربات شروع ہو چکے ہیں۔[1]

کچھ عرصہ ہوا کہ جرائد میں یہ خبر چھپی تھی کہ برفانی قطبی علاقے سے چند ہزار سال پہلے کی ایک منجمد مچھلی ملی ہے جسے خود وہاں کے لوگوں نے دیکھا ہے۔ اس مچھلی کو جب مناسب پانی میں رکھا گیا تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ پھر سے جی اٹھی اور چلنے پھرنے لگی۔

واضح ہے کہ حالتِ انجماد میں علاماتِ حیات موت کی طرح بالکل ختم نہیں ہو جاتیں کیونکہ اس صورت میں تو پھر زندگی نہیں مل سکتی بلکہ اس عالم میں حیاتی فعالیتیں بہت سست رفتار ہو جاتی ہیں۔

ان تمام باتوں سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسانی زندگی کو ٹھہرایا یا بہت ہی سست کیا جا سکنا ممکن ہے اور مختلف سائنسی تحقیقات اس امکان کی کئی حوالوں سے تائید کرتی ہیں۔ اس حالت میں غذا کا مصرف بدن میں تقریباً صفر تک جا پہنچتا ہے اور غذا کا تھوڑا سا ذخیرہ جو بدن میں موجود ہوتا ہے اس کی سست زندگی کیلئے طویل برسوں تک کافی ہو سکتا ہے۔[2]

غلط فہمی نہیں ہونا چاہیئے ہم ان باتوں کے ذریعے اصحابِ کہف کی نیند کے اعجاز کے پہلو کا انکار نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ سائنسی حوالے سے اس واقعے کو ہم ذہن کے قریب کر دیں کیونکہ تسلیم شدہ امر ہے کہ اصحابِ کہف ہماری طرح نہیں سوئے۔ جیسے ہم معمول کے مطابق رات کو سوتے ہیں ان کی نیند ایسی نہ تھی بلکہ وہ استثنائی پہلو رکھتی تھی۔

---

[1] مجلہ ۔ دانشمند، بہمن ماہ، ۴۹ صفحہ ۔

[2] ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان نے قدرت کی بہت سی چیزیں دیکھ کر ویسی ہی ایجادات کی ہیں۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اصحابِ کہف کے واقعے سے انسان کے ذہن میں منجمد کرنے کی ایجاد آئی ہو یا قدرت نے اسے منجمد کرنے کا اشارہ دیا ہو۔

لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ وہ ارادۂ الٰہی کے ماتحت ایک طویل زمانے تک سوئے رہے۔ اس دوران نہ انہیں غذا کی کمی لاحق ہوئی اور نہ ان کے بدن کے اجزاء Organism کو کوئی نقصان پہنچا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ سورہ کہف کی آیات سے ان کی سرگزشت کے بارے میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان کی نیند عام طریقے کی نیند اور معمول کی نیند سے بہت مختلف تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وتحسبهم ایقاظا وهم رقود ... لو اطلعت علیهم لولیت منهم فرارا ولملئت منهم رعبا

وہ ایسے لگتے تھے جیسے جاگ رہے ہوں (ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں) اگر تو انہیں دیکھتا تو گھبرا کے بھاگ اٹھتا اور تیرے پورے وجود پر خوف چھا جاتا۔ (کہف - ۱۸)

یہ آیت اس بات کی گواہ ہے کہ ان کی نیند عام کی سی نہ تھی بلکہ ایسی نیند تھی جو حالتِ موت کے مشابہ تھی۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

علاوہ ازیں قرآن کہتا ہے:

سورج کی روشنی ان کے غار کے اندر نہیں پڑتی تھی۔

نیز اگر اس امر کی طرف توجہ کی جائے کہ ان کی غار احتمالاً ایشیائے کوچک کے کسی بلند اور ٹھنڈے مقام پر واقع تھی تو ان کی نیند کے استثنائی حالات اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف قرآن کہتا ہے:

ونقلبهم ذات الیمین و ذات الشمال

ہم دائیں بائیں ان کے پہلو بدلتے رہتے تھے۔ (کہف - ۱۸)

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بالکل ایک ہی حالت میں نہیں رہتے تھے ایسے عوامل کہ جو ابھی تک ہمارے لیے راز ہیں ان کے تحت شاید سال میں ایک مرتبہ انہیں دائیں بائیں پلٹایا جاتا تھا تاکہ ان کے بدن کے آرگانزم Organism میں کوئی نقص نہ پڑ جائے۔

اب جبکہ اس سلسلے میں کافی واضح علمی بحث ہو چکی ہے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے معاد اور قیامت کے بارے میں زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ ایسی طویل نیند کے بعد بیداری موت کے بعد زندگی کے بغیر مشابہ نہیں ہے۔ اس سے ذہن معاد اور قیامت کے امکان کے قریب ہو جاتا ہے [1]

[1] اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۸ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ○

۲۹ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۗ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ ۚ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ○

۳۰ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۚ○

۳۱ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ ۚ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۚ○

ترجمہ

۲۸ ان لوگوں کے ساتھ رہ کہ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف اُس کی ذات کے خواہاں ہیں۔ حیاتِ دنیا کی آرائش کی وجہ سے ہرگز اپنی نگاہیں

ان سے نہ اٹھا لے اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کر کہ جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے وہ کہ جنہوں نے ہوائے نفس کی پیروی کی ہے اور جن کے کام تجاوز پر مبنی ہیں۔

(۲۹) اور کہہ دے کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے جو چاہے ایمان لے آئے (اور اس حقیقت کو مان لے) اور جو چاہے کافر ہو جائے۔ ظالموں کے لیے ہم نے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے کہ جس کی قناتیں انہیں ہر طرف سے گھیر لیں گی اور اگر وہ پانی مانگیں گے تو انہیں ایسا پانی پیش کیا جائے گا جو پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہو گا اور منہ کو بھون ڈالے گا۔ وہ کیا برا پانی ہے اور وہ کیا برا ٹھکانہ ہے۔

(۳۰) یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے عمل انجام دیئے، تو ہم نیک لوگوں کی جزا ضائع نہیں کریں گے۔

(۳۱) وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کا مسکن بہشت جاوداں ہے، ایسے باغاتِ بہشت کہ جن کے درختوں اور محلوں کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ وہ وہاں سونے کے کنگنوں سے سنوارے جائیں گے اور انہیں سبز رنگ کے نازک اور دبیز ریشم کے (فاخرہ) لباس پہنائے جائیں گے اور وہ تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ کیا ہی اچھی جزا ہے اور کیسی پیاری جگہ ہے۔

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیات میں سے کچھ کی شانِ نزول کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ کچھ سرمایہ دار متکبر، خود غرض اشراف خدمتِ رسولؐ میں حاضر ہوتے۔ وہ سلمان، ابوذر، صہیب اور خباب وغیرہ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: اے محمد (ص)! اگر تو کسی محفل میں صدر نشین ہو اور ایسے افراد کہ جن کی بدبو انسانی مشام

کو اذیت پہنچاتی ہے اور جنہوں نے سخت اُونی لباس پہن رکھے ہیں اپنے سے دُور کر دے (یعنی مجلس میں اشراف اور بڑے لوگ بیٹھے ہوں) تو ہم تیرے پاس آئیں گے، تیری مجلس میں بیٹھیں گے اور تیری باتوں سے فائدہ اٹھائیں گے لیکن کیا کریں ان لوگوں کے ہوتے ہوئے تو ہم یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔

اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں اور پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا کہ ان پُر فریب کھوکھلی باتوں کی طرف ہرگز مائل نہ ہوں اور زندگی کے ہر دَور میں ہمیشہ باایمان، پاک دل افراد کے ساتھ رہیں کہ جو سلمان و ابوذر جیسے ہوں اگرچہ ان کا ہاتھ ثروت دنیا سے خالی ہو اور ان کا لباس کھُردرا ہو۔

ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہؐ ان افراد کی تلاش کے لیے اٹھے۔ (یہ مخلص مومنین ان سرمایہ داروں کی باتیں سُن کر ناراض تھے اور مسجد کے ایک گوشے میں جاکر عبادتِ پروردگار میں مشغول ہو گئے تھے)۔

آخر کار رسول اللہؐ نے انہیں مسجد کے آخری حصے میں پالیا۔ وہ لوگ ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

حمد ہے اس خدا کے لیے جس نے موت سے پہلے یہ حکم دیا کہ تم جیسے لوگوں کے ساتھ رہوں۔

معكم المحيا ومعكم الممات

تمہارے ساتھ جینا اور تمہارے ساتھ مرنا ہی اچھا ہے[1]

تفسیر

پاک دل غریب لوگ

اصحاب کہف کے واقعے نے ہمیں جو بہت سے درس دیئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسانوں کی قدر و قیمت کا معیار منصب، ظاہری مقام اور دولت و ثروت نہیں ہے۔ اللہ کی راہ میں وزیر اور چرواہا ایک ہی صف میں ہیں۔ زیر بحث آیات میں درحقیقت اسی اہم مسئلے کا ذکر ہے۔ ان میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے: ان افراد کے ساتھ رہو کہ جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور صرف اسی کی پاک ذات کے طلبگار ہیں (واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغدٰوة والعشى يريدون وجهه)۔

"واصبر نفسك" (اپنے آپ کو صابر بنا) ـــ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ

---

[1] مجمع البیان اور قرطبی ـــ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

رسول اللہؐ پر متکبر دشمنوں اور بُرے اشراف کی طرف سے دباؤ تھا کہ غریب و فقیر مومنین کو اپنی بارگاہ سے دُور کر دیں لہٰذا اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اس دباؤ کے مقابلے میں صبر و استقامت اختیار کرو اور ہرگز ان کے سامنے سرِتسلیم خم نہ کرو۔

"صبح و شام" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہر حالت میں اور زندگی بھر یادِ خدا میں محو رہتے ہیں۔

"یریدون وجھہ" (وہ اس کی ذات کے طلب گار ہیں) ــ یہ تعبیر ان کے خلوص اور اخلاص کی دلیل ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا سے صرف اسی کو چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہشت کی نعمتیں اگرچہ بہت عظیم ہیں مگر وہ اس کی خاطر اللہ کی بندگی نہیں کرتے اور جہنم کا عذاب اگرچہ بہت درد ناک ہے لیکن وہ اس کے خوف سے عبادتِ الٰہی نہیں کرتے بلکہ صرف اس کی پاک ذات کی خاطر اس کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کے دل کی آواز تو بس یہ ہے:

ما از تو بغیر از تو نداریم تمنا

ہم تجھ سے تیرے علاوہ کوئی تمنا نہیں رکھتے۔

اور یہ اللہ کی اطاعت، اس کی بندگی، اس کے عشق اور اس پر ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے [1]

اس کے بعد تاکید کے طور پر گفتگو جاری ہے: یہ با ایمان کہ جو ظاہراً فقیر سے ہیں ان سے ہرگز اپنی آنکھیں نہ پھیرو اور دنیا کی زینتوں کی خاطر خدا سے بے خبر ان متکبرین کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو (ولا تعد عیناک عنھم ترید زینۃ الحیٰوۃ الدنیا) [2]

مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: اور جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے ان کی اطاعت نہ کرو (ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا)۔ ان کی کہ جنہوں نے ہوائے نفس کی پیروی کی ہے (واتبع ھوٰنہ)۔ وہی کہ جن کے سارے کام افراط پر مبنی ہیں۔ جو سوچ بچار اور غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور جن کے کام حد سے بڑھے ہوئے ہیں (وکان امرہ فرطًا) [3]

---

[1] "وجہ" کبھی "ذات" کے معنی میں آتا ہے اور کبھی "چہرے" کے معنی میں۔ اس قسم کے مواقع پر اس لفظ کے انتخاب کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۲ صـ۲۰۵ (اردو ترجمہ) پر تفصیل بحث کر چکے ہیں۔

[2] "لا تعد" "عدا یعدوا" کے مادہ سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے لہٰذا جملے کا مفہوم یہ ہوگا "ان سے آنکھیں ہی نہ ہٹا کہ دوسرے پر نگاہ پڑے"۔

[3] "فرط" حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے اور ہر وہ چیز جو اپنی حد سے نکل کر اسراف ہو جائے اسے "فرط" کہتے ہیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں کی صفات کو ایک دوسرے کے مدمقابل رکھ دیا ہے۔

حقیقی مومنین ۔ کہ جو تہی دست ہیں ۔ ان کے دل عشق خدا سے سرشار ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کی یاد میں محو رہتے ہیں اور اُس سے فقط اس کے طلب گار ہیں۔

لیکن دولت مند مستکبر یادِ خدا سے بالکل غافل ہیں۔ ہوائے نفس کے علاوہ ان کی کوئی طلب نہیں۔ ان کے سارے کام اعتدال کی حد سے بڑھے ہوئے ہیں اور وہ افراط و تجاوز سے کام لیتے ہیں۔

مذکورہ موضوع کی اس قدر اہمیت ہے کہ اگلی آیت میں قرآن صراحت کے ساتھ رسول اللہؐ سے کہتا ہے: کہہ دو کہ میرا تو یہ طریق کار ہے اور یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک حقیقت ہے جو چاہے ایمان لے آئے اور اس حقیقت کو قبول کرلے اور جو چاہے کافر ہوجائے (وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر)۔

لیکن یہ جان لو کہ یہ دنیا پرست ظالم کہ جو اپنی دنیاوی زندگی اور اس کی زیب و زینت پر اتراتے ہوئے سلمان و ابوذر جیسے لوگوں کے کھردرے لباس کا مذاق اڑاتے ہیں ان کا انجام بہت بُرا اور تاریک ہے کیونکہ "ہم نے ان ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے کہ جس کے بلند خیموں نے چاروں طرف سے انہیں گھیر رکھا ہے (انا اعتدنا للظٰلمین نارًا احاط بھم سرادقھا)۔

جی ہاں! وہ جب اس دنیاوی زندگی میں پیاسے ہوتے تو آواز دیتے اور خدام طرح طرح کے مشروبات ان کے سامنے لا حاضر کرتے لیکن جہنم میں جب وہ پانی مانگیں گے انہیں ایسا پانی پیش کیا جائے گا جو ایسی پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہوگا کہ اگر چہرے کے قریب ہو تو اسے بھون دے (وان یستغیثوا یغاثوا بماء کالمھل یشوی الوجوہ)[1] یہ پینے کی کیا بُری چیز ہے (بئس الشراب)۔ اور دوزخ کتنا بُرا ٹھکانا ہے (وساءت مرتفقًا)[2]

غور کیجئے ۔ وہ پانی کہ جو چہرے کے قریب ہو تو اسے بھون دے، کیا پینے کے قابل ہے؟ یہ اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ دنیا میں اچھے اچھے مشروبات پیا کرتے تھے جبکہ محروم اور مستضعف لوگوں کے دلوں کو جلایا کرتے تھے۔ اب یہ وہی آگ ہے جس نے یہ جسمانی شکل اختیار کرلی ہے۔

---

[1] "مُھل" (بروزن "قفل") ۔ جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے تہ نشین تیل کو کہتے ہیں کہ جو عام طور پر گندا، کثیف، گاڑھا اور بدذائقہ ہوتا ہے لیکن بعض مفسروں نے اس لفظ سے ہر قسم کی پگھلی ہوئی دھات مراد لیا ہے اور "یشوی الوجوہ" (چہروں کو بھون دیتا ہے) یہ تعبیر دوسرے معنی کی تائید کرتی ہے۔

[2] "مرتفق"، "رفق" اور "رفیق" کے مادہ سے ہے۔ اس سے دوستوں کے جمع ہونے کی جگہ مراد ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ قرآن نے یہاں دولت مندوں اور ظالم و بے ایمان مفاد پرستوں کے لیے جہنم میں بھی اس جہان کے تکلفات کا ذکر کیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ دنیا میں دولت مندوں کے جو " سرادق" یعنی بلند خیمے (یہ لفظ فارسی کے لفظ "سراپردہ" سے لیا گیا ہے) ہوتے ہیں ان میں غریبوں کا کوئی گزر نہیں۔ یہاں یہ امیروں کے عیش و نوش اور بادہ گساری کے لیے ہوتے ہیں لیکن وہاں ان کے بلند خیمے "دوزخ کے بلند بھڑکتے ہوئے شعلے" ہیں۔ یہاں ان کے عیش کدوں میں طرح طرح کے مشروبات ہیں اور جب وہ ساقی کو آواز دیتے ہیں تو وہ شراب کے رنگا رنگ جام ان کے سامنے لا حاضر کرتے ہیں۔ دوزخ میں بھی ان کیلئے ساقی اور مشروبات موجود ہیں۔ لیکن وہاں کا مشروب پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہوگا یتیموں کے اشکِ سوزاں اور محتاجوں کی آہِ آتشیں سے اُبلتا ہوا پانی ۔

جی ہاں وہاں جو کچھ ہے وہ یہاں کی کیفیتوں کا تجسّم ہے (پناہ بخدا)۔

قرآن حکیم کی روش چونکہ تطبیقی اور تربیتی ہے لہٰذا خود غرض دنیا پرستوں کے اوصاف اور ان کا کیفرِ کردار بیان کرنے کے بعد حقیقی مومنین کی حالت اور ان کا انتہائی زیادہ اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے۔ پہلے مختصر طور پر اور پھر ذرا تفصیل سے ۔۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ہم ان نیکوکاروں کا اجر و ثواب ضائع نہیں کریں گے (ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات انا لا نضیع اجر من احسن عملاً)۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنّاتِ جاوداں ان کے لیے ہیں (اولٰئك لهم جنّات عدن)۔ وہ باغاتِ بہشت کہ جن کے درختوں تلے نہریں رواں ہیں (تجری من تحتهم الانهار)۔ وہ سونے کے کنگنوں سے آراستہ ہوں گے (یحلون فیها من اساور من ذهب)[1] اور وہ سبز رنگ کے نازک و بیز ریشم کے فاخرہ لباس زیبِ تن کیے ہوں گے (و یلبسون ثیاباً خضراً من سندس و استبرق)۔ جبکہ وہ تختوں اور کرسیوں پر تکیہ لگائے ہوں گے (متکئین فیها علی الارائك)[2]

واہ کیا کہنا! کیا اچھی چیز ہے (نعم الثواب)۔

اور دوستوں کا کیسا اچھا اکٹھ ہے (و حسنت مرتفقاً)۔

---

[1] "اساور"، "اسورہ" (بروزن "مشورہ") کی جمع ہے اور خود "اسورہ" بھی "سوار" (بروزن "غبار" اور "کتاب") کی جمع ہے۔ اصل میں یہ فارسی لفظ "دستوار" (کنگن) سے لیا گیا ہے۔ اسے عربی میں ڈھالنے کے بعد اس سے عربی کے فعل بھی مشتق ہوئے ہیں۔

[2] "ارائک" "اریکة" کی جمع ہے۔ یہ اس تخت کو کہتے ہیں جو چاروں طرف سے سائبان کی طرح ڈھانپا گیا ہو۔ راغب کے بقول یہ اصل میں "اراک" سے ہے جو ایک مشہور درخت (پیلو) کا نام ہے۔ سے لیا گیا ہے کیونکہ عرب بعض اوقات اس درخت سے ایک خاص طرح کا سائبان بناتے تھے۔ یا یہ لفظ "ارک" سے لیا گیا ہے کہ جو اقامت اور توقف کرنے کے معنی میں ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ طبقاتی تفاوت ۔ معاشرے کی عظیم مشکل ہے :

صرف یہی آیات نہیں کہ جو معاشرے کی امیر اور غریب کی تقسیم کے خلاف جنگ کر رہی ہیں بلکہ قرآن کی ایسی بہت سی آیات ہیں۔ ان میں سے بعض کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں اور بعض آئندہ آئیں گی۔

وہ معاشرہ کہ جس میں ایک گروہ (جو ظاہر ہے اقلیت میں ہوگا) بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہو، ناز و نعمت میں غرق ہو، اسراف میں ڈوبا ہو اور ساتھ ہی طرح طرح کے مفاسد اور برائیوں میں آلودہ ہو جبکہ دوسرا گروہ جو کہ اکثریت میں ہے زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم ہو۔ یہ وہ معاشرہ ہے کہ جسے نہ اسلام پسند کرتا ہے اور نہ وہ حقیقی انسانی معاشرے کا رنگ رکھتا ہے۔

ایسے معاشرے میں کبھی سکون و اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اس پر ہمیشہ ظلم و ستم، لوٹ کھسوٹ اور استعمار و استبداد کی حکمرانی ہوگی۔ ایسے معاشرے میں آزادیاں سلب ہوں گی۔ خونین جنگیں عموماً ایسے ہی معاشروں سے اٹھی ہیں اور ایسے معاشرے سے پریشانیاں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔

اصولی طور پر یہ سب نعمات الٰہی آخر کیوں چند لوگوں کے ہاتھ میں ہوں اور معاشرے کی اکثریت طرح طرح کی محرومیوں، درد و رنج، بھوک اور بیماریوں میں ایڑیاں رگڑ رہی ہو۔ یقیناً ایسا معاشرہ کینہ، بغض، دشمنی، حسد، غرور، ظلم، خود پرستی، استکبار اور تباہی کے ایسے ہی عوامل سے پُر ہوگا۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ تمام عظیم انبیاء خصوصاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایسے نظام کے خلاف شدت سے اور مسلسل جہاد کیا تو اس کی بھی یہی وجہ ہے۔

ایسے معاشرے میں دولت مندوں کی محفلیں ہمیشہ تہی دستوں کی محفلوں سے الگ ہوتی ہیں۔ ان کے محلے الگ ہوتے ہیں، سیر و تفریح کے مراکز جُدا ہوتے ہیں اور مل بیٹھنے کی جگہیں جدا ہوتی ہیں۔ (اگر غریبوں کے لیے بھی کوئی تفریح کی جگہ ہو تو وہاں کے طور طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں)۔ یہاں تک کہ ان کے قبرستان بھی جُدا جُدا ہیں۔

یہ تفاوت اور تفریق کہ جو انسانی تقاضوں کے خلاف ہے اور تمام انسانی قوانین کی روح کے خلاف ہے کسی مردِ خدا کے لیے قابل برداشت نہ تھی اور نہ ہے۔ زمانہ جاہلیت میں شدت سے یہ تفریق موجود تھی یہاں تک کہ وہ لوگ رسولِ اسلامؐ کا سب سے بڑا عیب یہی سمجھتے تھے کہ سلمان و ابوذر جیسے پا برہنہ اور تہی دست لوگوں نے آپؐ کو گھیر رکھا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں بھی بت پرست اشراف اور "بڑے لوگ" آپ پر یہی اعتراض کرتے تھے کہ: "پست لوگوں" (اراذل) نے کیوں تیری پیروی کی ہے؟

کیونکہ دل کے یہ اندھے بڑائی اور پستی کا معیار درہم و دینار کو سمجھتے تھے۔ قرآنی الفاظ میں:

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا۔ (ہود - ۲۷)

ہم نے دیکھا ہے کہ ان خود پرست بے ایمان لوگوں کو با ایمان غریبوں کے ساتھ چند لمحے بھی بیٹھنا گوارا نہیں۔

اور تاریخ اسلام شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسے ان خود پرستوں کو ایک طرف کر کے محروم لوگوں کو مواقع فراہم کیے اور ان کے ذریعے ایک حقیقی توحیدی معاشرہ تشکیل دیا۔ وہ معاشرہ کہ جس میں مخفی صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور معاشرے میں انسانی وقار کا معیار انسانی کمالات، انسانی قدریں ۔ تقویٰ، علم، ایمان، جہاد اور عملِ صالح قرار دیا۔

آج بھی ایسے معاشروں کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے طرزِ عمل کو نمونہ بنایا جائے۔ تعلیم و تربیت اور صحیح قوانین کی بنیاد پر طبقاتی فکر و نظر کا خاتمہ کر دیا جائے اور ان صحیح قوانین کو پوری طرح سے رائج کیا جائے چاہے عالمی استکبار کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے اور وہ اس کی مخالفت کے لیے ہی کیوں نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ ہمیں جدوجہد کرنا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر ایک صحیح و سالم حقیقی انسانی معاشرہ ہرگز تشکیل نہیں پا سکتا۔

۲۔ دونوں جہانوں کی زندگی کا موازنہ: ہم نے بارہا کہا ہے کہ تجسیم اعمال قیامت سے مربوط ایک نہایت اہم مسئلہ ہے یعنی اس جہان میں جو کچھ ہو گا وہ اس جہان کی ایک بڑی کی ہوئی تصویر (ENLARGED PICTURE) ہے وہ اسی دنیا کا تکامل وارتقاء ہے۔ ہمارے اعمال و افکار، معاشرتی طور طریقے، مختلف اخلاقی عادات و خصائل اس جہان میں مجسم ہوں گے اور ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔

زیرِ بحث آیات اس حقیقت کی زندہ تصویر ہیں۔

خود پرست اور ظالم دولت مند کہ جو اس جہان میں محلوں میں تکیہ لگاتے ہوئے مے نوشی میں سرمست تھے اور جن کی کوشش تھی کہ ان کی ہر چیز غریب مومنین سے الگ ہو۔ وہ وہاں بھی بلند خیموں کے حامل ہوں گے لیکن وہ خیمے جلا ڈالنے والی آگ کے ہوں گے۔ کیونکہ ظلم درحقیقت آتش سوزاں ہے کہ جو مستضعفین کے خرمنِ حیات اور سرمایۂ امید کو جلا دیتی ہے۔ وہاں بھی انہیں مشروبات ملیں گے۔ وہاں شراب دنیا کا باطن جسمانی روپ اختیار کرے گا۔ وہاں کے مشروبات محروم انسانوں کے خونِ دل کا نتیجہ ہوں گے۔ اس دنیا میں ان کو ملنے مشروب نہ فقط ان کی انتڑیوں کو جلا دے گا بلکہ پگھلی ہوئی دھات کی مانند جب وہ پینے کے لیے اپنا چہرہ اس کے قریب کریں گے تو وہ چہروں کو بھون دے گا۔

لیکن اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنی پاکدامنی کی حفاظت کی اصولِ عدالت کا احترام کیا، ان چیزوں کو

ٹھکرا دیا، سادہ زندگی پر قناعت کی اور اس دنیا کی محرومیوں کو اس لیے قبول کر لیا کہ عدل قائم ہو۔ وہاں ان کے لیے بہشت بریں کے باغات ہوں گے جن کے درختوں تلے نہریں رواں ہوں گی۔ وہ فاخرہ لباس پہنے ہوں گے، زینت و رنگ اور شوق انگیز محفلیں ان کے انتظار میں ہوں گی۔ یہ تجسم ہے ان کی پاک نیت کا کہ وہ یہ نعمات دنیا تمام بندگان خدا کے لیے چاہتے ہیں۔

۳۔ ہوا پرستی اور خدا سے غفلت : انسان کی روح میں خدا سمایا ہوتا ہے یا ہوائے نفس۔ یہ دونوں چیزیں اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ نفس پرستی درحقیقت خدا اور خلق خدا سے غفلت کا سرچشمہ ہے۔ ہوا پرستی تمام اخلاقی اصولوں سے دُوری کا سبب ہے۔

مختصر یہ کہ ہوا پرستی انسان کو خود محور بنا دیتی ہے اور دنیا کے تمام حقائق سے دُور کر دیتی ہے۔ ایک نفس پرست انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔ علم، آگاہی، ایثار، قربانی اور روحانیت کا اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں ہوا پرستی اور خدا سے غفلت کے درمیان رابطہ اچھی طرح سے واضح ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے :

ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه وكان امره فرطا

پہلے خدا سے غفلت کا ذکر ہے اور پھر خواہشات کی پیروی کا۔ یہ بات لائق توجہ ہے کہ ان کا نتیجہ تجاوز اور افراط بیان کیا گیا ہے جو کہ مطلق کی صورت میں ہے۔ نفس پرست انسان ہمیشہ افراط میں گرفتار رہتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ جب وہ مادی لذتوں میں پڑتا ہے تو پھر زیادہ اور زیادہ کی طلب ہوتی ہے۔ کل ایک شخص نشہ آور چیز کی جس مقدار سے مست ہوتا تھا آج اتنی مقدار سے اسے نشہ نہیں ہوتا بلکہ وہ تدریجاً اس کی مقدار میں اضافہ کرتا ہے۔ کل ایک شخص کو اپنے ساز و سامان کے ساتھ اگر نسبتاً ایک چھوٹی کوٹھی کافی معلوم ہوتی تھی تو آج وہ اسے کم سمجھتا ہے۔ انسان کی تمام خواہشات کا یہی عالم ہے یہاں تک کہ وہ اسی چکر میں اپنے آپ کو تباہ کر لیتا ہے۔

۴۔ دوسرے جہان میں لباس زینت : ممکن ہے بہت سے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دنیا کی زیب و زینت کی مذمت کی ہے لیکن مومنین کے لیے ایسی ہی زیب و زینت کا آخرت میں وعدہ کیا ہے۔ طلائی زیورات، باریک و دبیز ریشمی لباس اور خوبصورت تخت وغیرہ۔

اس سوال کے جواب میں پہلے ہم اس نکتے کی طرف توجہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم توجیہیں نکالنے والوں کی طرح، ان تمام الفاظ کو معنوی مفاہیم کے لیے ہرگز کنایہ قرار نہیں دیں گے کیونکہ ہم نے خود قرآن سے سیکھا ہے کہ معاد و قیامت کا ایک پہلو روحانی ہے اور ایک پہلو جسمانی بھی ہے۔ لہٰذا اس جہان کی لذتیں بھی دونوں طرح کی ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ وہاں کی روحانی لذتوں کا مقابلہ جسمانی لذتوں سے نہیں کیا جا سکتا

اس کے باوجود اس حقیقت کو نہیں چھپایا جا سکتا کہ اُس جہان کی نعمتیں ہمارے لیے ایک ہیولے کی طرح ہیں کہ جسے ہم دور سے دیکھ رہے ہوں ۔ وہاں کی باتیں ہمارے لیے ایک اشارے کی مانند ہیں کیونکہ وہ جہان ہمارے لیے ایسے ہی ہے جیسے شکمِ مادر میں موجود بچے کے لیے ہمارا یہ جہان ۔

ماں اپنے شکم کے بچے سے اس دنیا کے بارے میں کچھ کہہ سکے تو اس دنیا کی خوبصورتی، خورشیدِ درخشاں، ماہ تاباں، رواں چشموں، باغات، رنگ برنگے پھولوں اور ایسی دوسری چیزوں کے بارے میں کچھ اشارے ہی کیے جا سکیں گے ۔ چونکہ عالمِ جنین میں بچے کو سمجھانے کے لیے کافی و وافی الفاظ نہیں ہیں ۔ اسی طرح رحمِ دنیا میں ہماری نظر محدود ہے ۔ یہاں واضح طور پر قیامت کی مادی و معنوی نعمات کا پورا ادراک ممکن نہیں ہے ۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد اب ہم اس سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ اس دنیا کی زیب و زینت کی مذمت اس لیے کرتا ہے کہ یہ دنیا محدود ہے اور اگر کوئی یہاں پر زیب و زینت میں پڑے گا تو ایسی زندگی کی فراہمی کے لیے وہ طرح طرح کے ظلم اور زیادتی کا مرتکب ہوگا اور ایسی زندگی پانے کے بعد وہ غفلت میں جا پڑے گا ۔ اس راستے میں تفریقات اور طبقے پیدا ہو جاتے ہیں جن کے باعث کینے، حسد، عداوتیں اور بالآخر خون ریزیاں جنم لیتی ہیں ۔ لیکن اس جہان کی ہر چیز فراواں ہے ۔ وہاں ایسی زینتوں کے حصول سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا اور نہ وہاں ان چیزوں کا حصول تفریق اور محرومیت کا سبب بنتا ہے، نہ وہاں اس سے کینہ اور نفرت ابھرتی ہے اور نہ معنویت و روحانیت سے معمور اس ماحول میں انسان خدا سے غافل ہوتا ہے ۔ نہ وہاں چیزوں کی حفاظت کا مسئلہ ہے اور نہ ہی رقیبوں کے حسد کا ۔ یہ چیز وہاں غرور و تکبر کا باعث بنتی ہے اور نہ خدا اور خلقِ خدا کی دوری کا ۔

لہٰذا اہلِ بہشت عظیم روحانی نعمتوں کے ساتھ ساتھ اس جسمانی لذت سے کیوں محروم رہیں جبکہ اس کا کوئی ناپسندیدہ نتیجہ نہیں ہے ۔

۵۔ سرمائے کی وجہ سے سرمایہ داروں کی قربت : زیرِ بحث آیات ہمیں جو ایک اور نکتہ سکھاتی ہیں یہ ہے کہ ہم کسی گروہ کو ہدایت و ارشاد اس لیے ترک نہ کریں کہ وہ دولت مند ہے اور خوشحال زندگی گزارتا ہے ۔ ایسے لوگوں کے گرد سرخ لکیر نہیں کھینچ دینا چاہیئے بلکہ قابلِ مذمت یہ ہے کہ ہم اُن کی مادی زندگی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے قریب ہوں اور قرآن کے بقول "ترید زینة الحیوٰة الدنیا" (تم دنیاوی زندگی کے طلبگار ہو) کے مصداق نہ بنیں لیکن اگر مقصد ان کی ہدایت اور ارشاد ہو ۔ یہاں تک کہ مقصد ان کے وسائل سے مثبت اور تعمیری معاشرتی و اجتماعی ضروریات کے لیے فائدہ اٹھانا ہو تو ان سے رابطہ قائم رکھنا نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں ہے بلکہ ضروری ہے ۔

(۳۲) وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَيۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّحَفَفۡنٰهُمَا بِنَخۡلٍ وَّجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمَا زَرۡعًا ؕ

(۳۳) كِلۡتَا الۡجَنَّتَيۡنِ اٰتَتۡ اُكُلَهَا وَلَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡهُ شَيۡـًٔـا ۙ وَّفَجَّرۡنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ

(۳۴) وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكۡثَرُ مِنۡكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا

(۳۵) وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنۡ تَبِيۡدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ

(۳۶) وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰى رَبِّىۡ لَاَجِدَنَّ خَيۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا

ترجمہ

(۳۲) ان سے مثال بیان کرو کہ دو شخص تھے۔ ایک کو ہم نے قسم قسم کے انگوروں کے دو باغ دے رکھے تھے ان کے گرداگرد کھجور کے درخت تھے اور ان دونوں کے درمیان اچھی بابرکت کھیتی تھی۔

(۳۳) دونوں باغ پھلتے پھولتے تھے اور ان کے بارآور ہونے میں کوئی کمی نہ تھی۔ ان دونوں کے بیچوں بیچ ایک نہر گزرتی تھی۔

(۳۴) اس باغ کے مالک کو خوب پیداوار ملتی تھی لہٰذا جب وہ اپنے دوست سے

بات کرنے لگا تو اُس نے کہا: مَیں دولت کے لحاظ سے تجھ سے برتر ہوں اور میرے پاس زیادہ طاقتور افراد ہیں۔

(۳۵) حالانکہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا تھا۔ پھر وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور کہنے لگا کہ میرا نہیں خیال کہ یہ باغ کبھی اجڑ جائے گا۔

(۳۶) اور مجھے نہیں توقع کہ قیامت برپا ہوگی اور اگر میں اپنے رب کی طرف پلٹ بھی گیا (اور قیامت آبھی گئی) تو مجھے اس سے بہتر جگہ ملے گی۔

تفسیر

مستضعفین کے مقابلے میں مستکبرین کا مؤقف

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ دنیا پرست کس طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ وہ تہی دست اور غریب مردانِ حق سے دُور دُور رہیں۔ ہم نے یہ بھی پڑھا ہے کہ دوسرے جہان میں ان کا انجام کیا ہوگا۔

زیربحث آیتوں میں دو دوستوں یا دو بھائیوں کی داستان مثال کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ ان میں سے ہرایک مستکبرین اور مستضعفین کا ایک نمونہ تھا۔ ان کی طرزِ فکر اور ان کی گفتار و کردار ان دونوں گروہوں کے مؤقف کا ترجمان تھا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے رسول! ان سے دو شخصوں کی مثال بیان کرو کہ جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دیئے تھے۔ ان میں طرح طرح کے انگور تھے۔ ان کے گرداگرد کھجور کے درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ان دونوں باغوں کے درمیان ہری بھری کھیتی تھی (واضرب لهم مثلا رجلين جعلنا لاحدهما جنتين من اعناب وحففناهما بنخل وجعلنا بينهما زرعًا)۔ ایسے باغ اور کھیتیاں جن میں ہرچیز خوب تھی۔ انگور بھی تھے، کھجوریں بھی تھیں، گندم اور دوسرا اناج بھی تھا۔ خود کفیل کھیتیاں تھیں۔ یہ دونوں باغ پیداوار کے لحاظ سے بھرے پُرے تھے۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے اور کھیتیوں کے پودے خوب خوشہ دار تھے۔ ان دونوں باغوں میں کسی چیز کی کمی نہ تھی (كلتا الجنتين أتت اكلها ولم تظلم منه شيئًا)۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ پانی جو ہرچیز کے لیے مایۂ حیات ہے، خصوصاً باغات و زراعت کیلئے، انہیں فراہم تھا، کیونکہ دونوں باغوں کے درمیان ہم نے ایک نہر جاری کی تھی (وفجرنا خلالهما نهرًا)۔

اس طرح سے ان باغات اور کھیتیوں کے مالک کو خوب پیداوار ملتی تھی (وکان لہ ثمر)۔

دنیا کا مقصد پورا ہو رہا ہوا اور تُو کم ظرف اور بے وقعت انسان اپنی دنیاوی مراد پا کر غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ پہلے پہلے وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ باغات کے اس مالک نے بھی اپنے دوست سے بات کرتے ہوئے کہا: میں دولت اور سرمائے کے لحاظ سے تجھ سے برتر ہوں، میری آبرو، عزت اور حیثیت تجھ سے زیادہ ہے (فقال لصاحبه وهو يحاوره انا اكثر منك مالاً و اعز نفرًا) ۔اور افرادی قوت بھی میرے پاس بہت زیادہ ہے۔ مال و دولت اور اثر و رسوخ میرا زیادہ ہے، معاشرے میں میری حیثیت زیادہ ہے۔ تُو میرے مقابلے میں کیا ہے اور تُو کس کھاتے میں ہے؟

آہستہ آہستہ اس کے خیالات بڑھتے چلے گئے اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ دنیا کو جاوداں مال و دولت کو ابدی اور مقام و حشمت کو دائمی خیال کرنے لگا۔ وہ مغرور تھا حالانکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔ ایسے میں اپنے باغ میں داخل ہوا اس نے ایک نگاہ سرسبز درختوں پر ڈالی جن کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے خم ہو گئی تھیں۔ اس نے اناج کی ڈالیوں کو دیکھا، نہر کے آبِ رواں کی لہروں پر نظر کی کہ جو چلتے چلتے درختوں کو سیراب کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ سب کچھ بھول گیا اور کہنے لگا "میرا خیال نہیں کہ میرا باغ بھی کبھی اجڑے گا" (ودخل جنته وهو ظالم لنفسه قال ما اظن ان تبيد هذه ابدًا)۔

پھر اُس نے اس سے بھی آگے کی بات کی۔ اس جہان کا دائمی ہونا چونکہ عقیدۂ قیامت کے منافی ہے لہٰذا وہ انکارِ قیامت کا سوچنے لگا۔ اُس نے کہا:

میرا ہرگز نہیں خیال کہ کوئی قیامت بھی ہے (وما اظن الساعة قائمة) یہ تو وہ باتیں ہیں جو بعض لوگوں نے جی بہلانے کے لیے بنا رکھی ہیں۔

پھر مزید کہنے لگا: فرض کیا قیامت ہو بھی اور میں اپنی اس حیثیت اور مقام کے ساتھ اپنے رب کے پاس جاؤں بھی تو یقیناً اُس سے بہتر جگہ پاؤں گا (ولئن رددت الى ربى لاجدن خيرًا منها منقلبًا)۔

وہ ان خام خیالوں میں غرق تھا اور ایک کے بعد دوسری فضول بات کرتا جاتا تھا کہ اس کا باایمان ساتھی بول اٹھا (اس نے جو باتیں کیں اُن کا ذکر آئندہ آیات میں آ رہا ہے)۔

(۳۷) قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ؕ

(۳۸) لٰـكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّىْۤ اَحَدًا

(۳۹) وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۚ

(۴۰) فَعَسٰى رَبِّىْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۙ

(۴۱) اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا

ترجمہ

(۳۷) جب وہ یہ باتیں کر رہا تھا تو اس کے (باایمان) دوست نے کہا: کیا تو اُس خدا سے کافر ہوگیا ہے کہ جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے پورا شخص بنایا۔

(۳۸) لیکن میرا تو ایمان ہے کہ اللہ میرا رب ہے اور میں کسی کو اپنے رب کا شریک قرار نہیں دیتا۔

(۳۹) جب تُو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تُو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ نعمت اللہ کی منشا سے ہے اور اس کے علاوہ کوئی قوت نہیں ہے، اگر تُو مجھے مال و اولاد کے لحاظ سے کم پاتا ہے (تو یہ کوئی اہم بات نہیں ہے)۔

(۴۰) بعید نہیں کہ میرا پروردگار مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا کر دے اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی ایسا عذاب نازل کر دے کہ جو اسے چٹیل میدان میں بدل دے کہ جس پر پاؤں پھسل پھسل جائیں۔

(۴۱) یا اس کا پانی زمین کی تہوں میں ایسا اتر جائے کہ تُو اسے پا بھی نہ سکے۔

تفسیر

مستضعفین کا جواب

ان آیات میں اُس مغرور، بے ایمان، خود غرض دولت مند کی بے بنیاد باتوں کا جواب اس کے مومن دوست کی زبانی دیا گیا ہے۔ پہلے وہ خاموشی سے اس کوتاہ فکر انسان کی باتیں سنتا رہا تاکہ جو کچھ اس کے اندر ہے باہر آجائے اور پھر ایک ہی بار اسے جواب دیا جائے۔ اُس نے کہا: کیا تُو اس خدا سے کافر ہو گیا ہے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے پورا شخص بنایا (قال له صاحبه وهو يحاوره اكفرت بالذی خلقك من تراب ثم من نطفة ثم سوّٰىك رجلًا)۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ گزشتہ آیتوں میں مغرور شخص کی جو باتیں ہم نے پڑھی ہیں ان میں وجودِ خدا کا صریح انکار تو موجود نہیں ہے جبکہ ایک توحید پرست شخص اسے جو جواب دے رہا ہے ظاہراً تو سب سے پہلے اُسے انکارِ خدا پر سرزنش کر رہا ہے اور اسے تخلیقِ انسان کے حوالے سے خدائے عالم و قادر کی طرف متوجہ کر رہا ہے کیونکہ تخلیقِ انسان دلائلِ توحید میں سے بہت واضح دلیل ہے۔

وہ خدا کہ جس نے ابتداء میں انسان کو خاک سے پیدا کیا۔ درختوں اور نباتات کی جڑوں نے زمین سے غذا حاصل کی۔ پھر نباتات حیوانات کی غذا بنے۔ انسان نے نباتات اور حیوانات سے غذا حاصل کی اور اس غذا کی قوت سے انسان کا نطفہ بنا۔ جس نے رحمِ مادر میں تکمیل کے مراحل طے کیے۔ وہ دنیا میں آیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک پورے انسان میں تبدیل ہو گیا۔ وہ انسان کہ جو موجوداتِ زمین میں تمام سے برتر ہے۔ جو سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے، ارادہ کرتا ہے اور سب چیزوں کو اپنا مطیع بنا لیتا ہے۔

جی ہاں — ظاہراً ایک بے حیثیت مٹی کا ایسے عجیب و غریب موجود میں تبدیل ہونا جس کی مشینری جسم و روح کے پیچیدہ آلات پر مشتمل ہے — توحید کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

مفسرین نے مذکورہ سوال کے جواب میں مختلف تفسیریں پیش کی ہیں، مثلاً:

ا۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس مغرور شخص نے صراحت کے ساتھ معاد اور قیامت کا انکار کیا ہے یا پھر اسے

شک کی نظر سے دیکھا ہے جس کا لازمی نتیجہ انکارِ خدا ہے کیونکہ معادِ جسمانی کے منکر درحقیقت قدرت خدا کے منکر ہیں۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں کہ منتشر ہو جانے کے بعد مٹی پھر سے لباسِ حیات پہن سکے گی۔ لہٰذا اس باایمان شخص نے خاک سے انسان کی پہلی خلقت، پھر نطفے سے اس کی تخلیق اور پھر دوسرے مراحل کے حوالے سے اسے پروردگار کی بے پایاں قدرت کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ جان لے کہ معاد کے کئی مناظر تو ہم ہمیشہ اپنی اسی زندگی میں دیکھتے رہتے ہیں۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے شرک اور کفر کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ مالکیت خود اس کی اپنی طرف سے ہے۔ یعنی وہ اپنے لیے مالکیت میں اس کا قائل تھا اور اپنی مالکیت کو جاودانی خیال کرتا تھا۔

۳۔ تیسرا احتمال بھی بعید نظر نہیں آتا، وہ یہ کہ اُس نے اپنی کچھ باتوں میں خدا کا انکار کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی ساری باتیں بیان نہیں کیں۔ اس کا اندازہ اس باایمان شخص کی باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اگلی آیت میں وہ صاحب ایمان کہتا ہے کہ اگر تُو اللہ کا انکار کرتا ہے اور راہِ شرک اختیار کرتا ہے تو مَیں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔

بہرحال مذکورہ تینوں احتمالات آپس میں غیر مربوط نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے اس توحید پرست شخص کا اشارہ ان سب کی طرف ہو۔

اس کے بعد اس باایمان شخص نے اس کے کفر اور غرور کو توڑنے کے لیے کہا: لیکن میرا تو ایمان ہے کہ اللہ میرا پروردگار ہے اور مجھے اس عقیدے پر فخر ہے (لکنا ھو اللہ ربی)[1]

تُو اس بات پر نازاں ہے کہ تیرے پاس باغات، کھیتیاں، پھل اور پانی فراواں ہیں لیکن مجھے اس پر فخر ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے، میرا خالق و رازق وہ ہے۔ تجھے اپنی دنیا پر فخر ہے اور مجھے اپنے عقیدہ توحید و ایمان پر" اور مَیں کسی کو اپنے رب کا شریک قرار نہیں دیتا" (ولا اشرک بربی احدا)۔

توحید اور شرک کا مسئلہ انسان کی سرنوشت میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو جاری ہے: "جب تُو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تُو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ نعمت اللہ کی منشا سے ہے" تُو نے اسے اللہ کی جانب سے کیوں نہیں جانا اور اس کا شکر کیوں نہیں بجا لایا (ولولا اذ دخلت جنتک قلت ما شاء اللہ)[2]

---

[1] لفظ "لکنا" دراصل "لکن انا" تھا۔ پھر یہ دونوں الفاظ آپس میں مدغم ہو گئے تو یہ صورت ہو گئی۔

[2] "ماشاء اللہ" میں محذوف ہے۔ اس کی تقدیر یوں ہے:

ھذا ما شاء اللہ

یہ وہ چیز ہے کہ جو اللہ نے چاہی ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

تُو نے کیوں نہیں کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی کچھ طاقت نہیں (لاقوة الّا باللّٰه)۔

اگر تُو نے زمین میں ہل چلایا ہے، بیج بویا ہے، درخت لگائے ہیں، قلمیں لگائی ہیں اور تجھے ہر موقع پر سب کچھ میسر آیا ہے یہاں تک کہ تو اس مقام پر پہنچا ہے تو سب اللہ کی قدرت سے استفادہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہ تمام وسائل اور صلاحیتیں تجھے اللہ نے بخشی ہیں۔ اپنی طرف سے تو کچھ بھی تیرے پاس نہیں ہے اور اس کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہے۔

اِس کے بعد اُس نے مزید کہا: یہ جو تجھے نظر آتا ہے کہ مَیں مال و اولاد کے لحاظ سے تجھ سے کم ہوں (تو یہ کوئی اہم بات نہیں ہے) (ان ترن انا اقل منك مالا و ولدًا)۔

اللہ تیرے باغ کی نسبت مجھے بہتر عطا کر سکتا ہے (فعسٰی ربی ان یؤتین خیرًا من جنتك)۔

بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا آسمان سے تیرے باغ پر بجلی گرائے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سرسبز و شاداب زمین ایسے چٹیل میدان میں بدل جائے کہ جہاں پاؤں پھسلتے ہوں (و یرسل علیها حسبانًا من السماء فتصبح صعیدًا زلقًا)۔

یا زمین کو حکم دے کہ وہ ہل جائے اور یہ چشمے اور نہریں اس کی تہ میں ایسی چلی جائیں کہ پھر تُو انہیں پا نہ سکے (او یصبح ماؤها غورًا فلن تستطیع له طلبًا)۔

"حُسبان" (بروزن "لُقمان") دراصل "حساب" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ ایسے تیروں کے معنی میں استعمال ہونے لگا کہ جنہیں چلاتے ہوئے شمار کیا جاتا ہے۔ نیز یہ ایسی سزا کے معنی میں بھی ہے کہ جو کسی حساب کتاب کے تحت ہو مندرجہ بالا آیت میں اس کا یہی مفہوم ہے۔

"صعید" اصل میں "صعود" سے لیا گیا ہے، اس سے مراد زمین کے اوپر کی تہ ہے۔

"زلق" چٹیل میدان کو کہتے ہیں، جس پر کوئی گھاس پھونس نہ ہو اور جس پر انسان کا پاؤں پھسل پھسل جائے۔

(یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ریت کو بہہ جانے سے روکنے کے لیے اور آبادیوں کو ریت کے طوفانوں میں دب جانے سے بچانے کے لیے کوشش کرتے ہیں کہ ایسے علاقوں میں نباتات اور درخت اگائے جائیں۔ یعنی ایسے علاقوں میں "زلق" اور پھسلنے کی کیفیت کو اس طرح سے کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے)۔

درحقیقت اس باایمان اور توحید پرست شخص نے اپنے مغرور ساتھی کو خبردار کیا کہ وہ ان نعمتوں سے دل

بقیہ گزشتہ حاشیہ: یا پھر یوں ہے:

ماشاء اللّٰه کائن

جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

نہ باندھ لے کیونکہ ان میں کوئی چیز بھی بھروسے کے قابل نہیں ہے۔

دراصل وہ کہتا ہے کہ تُو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا کم از کم سُنا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آسمانی بجلی لحہ بھر میں باغوں، گھروں اور کھیتوں کو مٹی کے ٹیلوں یا بے آب و گیاہ زمین میں بدل کے رکھ دیتی ہے۔ نیز تُو نے سُنا ہے یا دیکھا ہے کبھی زمین پر ایسا زلزلہ آتا ہے کہ چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور نہریں نیچے چلی جاتی ہیں اس طرح سے کہ وہ قابلِ اصلاح بھی نہیں رہتیں۔

جب تُو ان چیزوں کو جانتا ہے تو پھر یہ غرور و غفلت کس بنا پر؟ تُو نے یہ منظر دیکھے ہیں تو پھر یہ دلبستگی آخر کیوں؟ تُو یہ کہتا ہے کہ مَیں نہیں سمجھتا کہ یہ نعمتیں کبھی فنا ہوں گی اور تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ ہمیشہ رہیں گی۔ یہ کیسی نادانی اور حماقت ہے؟

(۴۲) وَاُحِيطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ○

(۴۳) وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ○

(۴۴) هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۗ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ○

ترجمہ

(۴۲) (بہر حال عذابِ الٰہی آپہنچا) اور اس کا سارا ثمرہ تباہ ہو گیا۔ اس کی جو لاگت آئی تھی اس پر وہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ باغ کی حالت یہ تھی کہ اپنی ٹہنیوں پر اوندھا گرا پڑا تھا۔ اب وہ کہتا تھا اے کاش میں نے کسی کو اپنے رب کا شریک قرار نہ دیا ہوتا۔

(۴۳) اور کوئی جتھا نہ تھا جو خدا کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ وہ آپ اپنی کچھ مدد کر سکتا تھا۔

(۴۴) اس وقت ثابت ہوا کہ ولایت (اور قدرت) خداوند حق کے لیے ہے کہ جس کے ہاں (اطاعت گزاروں کے لیے) بہترین ثواب اور بہترین انجام ہے۔

تفسیر

اور ان کا انجام کار...

ان کی آپس کی گفتگو ختم ہوگئی۔ اس خدا پرست شخص کی باتوں کا اس مغرور و بے ایمان دولت مند کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے اُنہی جذبات اور طرزِ فکر کے ساتھ اپنے گھر لوٹ گیا۔ اسے اس بات کی خبر نہ تھی کہ اس کے باغوں اور سرسبز کھیتوں کی تباہی کے لیے اللہ کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ اپنے تکبر اور شرک کی سزا اسی جہان میں پالے گا اور اس کا انجام دوسروں کے لیے باعثِ عبرت بن جائے گا۔

شاید اسی وقت کہ جب رات کی تاریکی ہر چیز پر چھائی ہوئی تھی، عذابِ الٰہی نازل ہوا۔ بنا کن بجلی کی صورت میں یا وحشتناک طوفان کی شکل میں یا ہولناک زلزلے کی صورت میں اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا اُس نے چند لمحوں میں تروتازہ باغات، سربفلک درخت اور خوشوں سے لدی کھیتیاں درہم برہم اور تباہ کر دیں۔ اور عذابِ الٰہی حکمِ خدا سے ہر طرف سے اس کے ثمرہ پر محیط ہوگیا اور اسے نابود کر دیا (واحیط بثمرہ)۔

"احیط" "احاطہ" کے مادہ سے ہے اور ایسے مواقع پر یہ گھیر لینے والے ایسے عذاب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مکمل نابودی ہے۔

دن چڑھا۔ باغ کا مالک باغ کی طرف چلا۔ سرکشی اس کے ذہن میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ اپنے باغات کی پیداوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا۔ جب وہ باغ کے قریب پہنچا تو اچانک اُس نے وحشتناک منظر دیکھا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہ وہاں بے حس و حرکت کھڑا ہوگیا۔

اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ یہ خواب دیکھ رہا ہے یا حقیقت۔ سب درخت اوندھے پڑے تھے۔ کھیتیاں زیر و زبر ہو چکی تھیں۔ زندگی کے کوئی آثار وہاں دکھائی نہ دیتے تھے۔ گویا وہاں کبھی کچھ شاداب و سرسبز باغ اور کھیتیاں نہ تھیں۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ حلق خشک ہوگیا۔ اس کے دل و دماغ سے سب غرور و نخوت جاتی رہی۔ اُسے ایسے لگا جیسے وہ ایک طویل اور گہری نیند سے بیدار ہوا ہے۔ وہ مسلسل اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ اسے ان اخراجات کا خیال آرہا تھا جو اس نے پوری زندگی میں ان پر صرف کیے تھے۔ اب وہ سب برباد ہو چکے تھے اور درخت اوندھے گرے پڑے تھے (فاصبح یقلب کفیہ علی ما انفق فیھا وھی خاویۃ علی عروشھا)۔

اس وقت وہ اپنی فضول باتوں اور بیہودہ سوچوں پر پشیمان ہوا۔ وہ کہتا تھا: کاش میں نے کسی کو

اپنے پروردگار کا شریک قرار نہ دیا ہوتا۔ اے کاش میں نے شرک کی راہ پر قدم نہ رکھا ہوتا (ویقول یالیتنی لم اشرك بربی احدًا)۔

زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ ان تمام مصائب و آلام کے سامنے وہ تن تنہا کھڑا تھا، خدا کے علاوہ کوئی نہ تھا کہ جو اس مصیبتِ عظیم اور اتنے بڑے نقصان پر اس کی مدد کرتا (ولم تکن له فئة ینصرونه من دون الله)۔ اور چونکہ اُس کا سارا سرمایہ تو یہی تھا جو برباد ہو گیا تھا۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ لہٰذا، وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا (وما کان منتصرًا)۔

درحقیقت اس واقعے نے اس کے تمام غرور آمیز تصورات و خیالات کو زمین بوس اور باطل کر دیا۔ کبھی تو وہ کہتا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ عظیم دولت و سرمایہ کبھی فنا ہوگا لیکن آج وہ اپنی آنکھوں سے اس کی تباہی دیکھ رہا تھا۔

دوسری طرف وہ اپنے خدا پرست اور باایمان دوست کے سامنے غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں تجھ سے زیادہ قوی ہوں۔ میرے یار و مددگار زیادہ ہیں لیکن اس واقعے کے بعد اس نے دیکھا کہ کوئی بھی اس کا مددگار نہیں ہے۔

اُسے کبھی اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی بہت قوت ہے لیکن جب یہ واقعہ رونما ہوا اور اس نے دیکھا کہ کچھ بھی اُس کے بس میں نہیں تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کے بس میں اتنا بھی نہیں کہ وہ اس نقصان کے کچھ حصے کی بھی تلافی کر سکے۔

اصولی طور پر مال و دولت کے گرد جمع ہو جانے والے لوگ تو شہد پر مکھیوں کے جمع ہونے کی مانند ہوتے ہیں۔ بعض اوقات انسان سمجھتا ہے کہ بُرے دنوں میں یہ لوگ اس کا سہارا بنیں گے لیکن جب مال و دولت ختم ہو جائے تو وہ بھی نظر نہیں آتے۔ کیونکہ ان کی دوستی کوئی قلبی اور روحانی بنیاد پر تو ہوتی نہیں وہ تو مادی ہوتی ہے اور جب مادی نعمت ختم ہو جاتی ہے تو وہ بھی دکھائی نہیں دیتے۔

لیکن جو بھی ہوا اب تو وقت گزر چکا تھا اور کسی سنگین مصیبت کو دیکھ کر جو بیداری پیدا ہوتی ہے وہ تو اضطراری حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی بیداری تو فرعون اور نمرود جیسے افراد میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے بھی اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس وقت اُس نے کہا:

لم اشرك بربی احدًا

کاش! میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہ گردانتا۔

یہی بات تو اُس کے دوست نے کہی تھی۔ لیکن اُس کا یہ ایمان سلامتی کے ماحول میں تھا اور اس کا یہ اظہار مصیبت کے موقع پر تھا۔

یہ وہ وقت تھا کہ یہ حقیقت پھر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ ولایت و قدرت خدا کے لیے ہے وہ خدا

کہ جو عین حق ہے" (ھنالک الولایۃ للّٰہ الحق)۔

جی ہاں ! اس موقع پر یہ پوری طرح واضح ہوگیا کہ تمام نعمتیں اس کی طرف سے ہیں اور جو کچھ اس کا ارادہ ہو وہی کچھ ہوتا ہے اور اس کے لطف و کرم پر بھروسہ کیے بغیر کچھ نہیں بنتا۔

جی ہاں وہی ہے کہ جس کے ہاں اطاعت گزاروں کے لیے بہترین جزاء و ثواب ہے اور بہترین عاقبت و آخرت ہے (ھو خیر ثوابًا وخیر عقبًا)۔

پس اگر انسان کسی سے دل لگانا چاہتا ہے اور کسی پر بھروسہ کرنا چاہتا ہے اور کسی سے جزاء کی امید باندھنا چاہتا ہے تو کیا ہی بہتر ہے کہ وہ خدا سے لو لگائے، اس پر بھروسہ کرے اور اس کے لطف و احسان کی امید رکھے۔

چند اہم نکات

۱۔ دولت کا غرور : اس داستان میں ہم نے دولت کے غرور کی زندہ تصویر دیکھی ہے اس میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غرور کا انجام کیا ہے، وہ غرور کہ جس کی انتہا شرک اور کفر ہے۔

کم ظرف لوگ جب کسی مقام پر جا پہنچتے ہیں اور مقام و دولت کے لحاظ سے دوسروں پر کچھ برتری حاصل کر لیتے ہیں تو اکثر اوقات غرور کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان وسائل کے بل بوتے پر وہ دوسروں کے سامنے بڑے بنتے پھرتے ہیں مکھیوں کی طرح بھنبھنانے والے لوگ جب ان کے گرد جمع ہو جائیں تو وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں پر ان کا اثر و رسوخ قائم ہوگیا ہے۔ اسی کو قرآن — "انا اکثر منک مالًا واعز نفرًا" میں بیان کر رہا ہے۔

دنیا کا عشق رفتہ رفتہ ان میں یہ خیال پیدا کرنے لگتا ہے کہ یہ دنیا جاوداں ہے اور پھر وہ یہ کہنے لگتے ہیں :

ما اظن ان تبید ھٰذہ ابدًا

مَیں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی ختم ہوگا۔

اگر انسان مادی دنیا کی جاودانی کا قائل ہو جاتے تو اس سے قیامت پر ایمان کی نفی ہوتی ہے لہٰذا ایسے لوگ کہنے لگتے ہیں :

وما اظن الساعۃ قائمۃ

میرا نہیں خیال کہ کبھی قیامت بھی آئے گی۔

ان کی خود پسندی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مقرب بارگاہِ الٰہی سمجھنے لگتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بہت زیادہ مقام و مرتبہ ہے اور کہنے لگتے ہیں کہ اگر ہمیں اللہ کی طرف واپس

جانا بھی پڑا اور معاد و قیامت کا کوئی وجود ہوا تو پھر بھی وہاں ہمارا مقام یہاں سے بہتر ہوگا "ولئن رددت الی ربی لاجدن خیرًا منھا منقلبًا"

یہ چار مراحل کم و بیش تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تمام دنیا پرست اہلِ اقتدار اور طاقتوروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے انحراف کا آغاز دنیا پرستی سے ہوتا ہے اور شرک، بت پرستی اور انکارِ قیامت پر جاختم ہوتا ہے کیونکہ وہ مادی طاقت کو بُت کی طرح پوجتے ہیں اور اس کے علاوہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

۲۔ **اس داستان کے چند سبق :** یہ عبرت انگیز داستان مختصر سی ہے لیکن اس میں مذکورہ بہت بڑے درس کے علاوہ بھی بہت سے درس موجود ہیں۔ مثلاً :

الف۔ مادی دنیا کی نعمتیں جتنی بھی زیادہ ہوں ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور وہ ناپائیدار ہوتی ہیں، کڑکتی ہوئی بجلی چند لمحوں میں سالہا سال میں تیار کیے گئے باغوں اور کھیتوں کو خاکستر بنا دیتی ہے۔ ان کی جگہ مٹی کے ٹیلوں اور پھسلنے والی زمین کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ تھوڑا سا زلزلہ زمین کے ان پانیوں اور چشموں کو نگل لیتا ہے جن پر زندگی اور اس کی برکتوں کا دارو مدار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پھر اصلاح کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔

ب۔ مادی مفادات کے لیے جو دوست انسان کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں وہ اس قدر بے اعتبار اور بے وفا ہوتے ہیں کہ اسی لمحے جب دنیاوی نعمتیں انسان سے جدا ہو رہی ہوتی ہیں وہ اس سے ایسے رخصت ہوتے ہیں جیسے پہلے ہی جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ "ولم تکن لہ فئۃ ینصرونہ من دون اللہ"۔

ایسے واقعات ہم نے بارہا سُنے یا دیکھے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی سے دل نہیں باندھنا چاہیئے۔ انسان کے باوفا اور سچے دوست وہی ہیں جن سے معنوی اور روحانی رشتہ ہو۔ ایسے ہی دوست ثروت و تنگدستی، بڑھاپے اور جوانی، تندرستی اور بیماری اور عزت و ذلت کے ہر عالم میں دوست ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی محبت و مودت کا رشتہ موت کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

ج۔ بلاو مصیبت کے بعد کی بیداری عام طور پر فضول ہوتی ہے۔ ہم نے بارہا کہا ہے کہ اضطراری بیداری انسان کے اندرونی انقلاب اور اس کے طرزِ عمل کی تبدیلی کے لیے دلیل نہیں ہوتی اور نہ گزشتہ اعمال پر ندامت کی علامت ہوتی ہے بلکہ جب تختہ دار پر یا موجِ طوفان پر انسان کی نگاہ پڑتی ہے تو اس پر وقتی طور پر اثر ہوتا ہے۔ ایسے میں چند لمحوں کے لیے جبکہ اسے اپنی زندگی بھی چند لمحے دکھائی دیتی ہے وہ اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی کا ارادہ کرتا ہے لیکن چونکہ یہ ارادہ اس کی روح سے نہیں اٹھا ہوتا لہٰذا اس طوفان کے گزرتے ہی اس کا یہ ارادہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے پہلے راستے کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

یہ جو سورہ نساء کی آیہ ۱۸ میں ہے کہ انسان جب موت کی نشانیاں دیکھتا ہے تو توبہ کے دروازے اُس پر بند ہو جاتے ہیں، اس کی یہی وجہ ہے۔ اسی طرح قرآن سورہ یونس کی آیت ۹۰ اور ۹۱ میں فرعون کے بارے میں کہتا ہے کہ جب وہ غرق ہونے لگا اور جب وہ دریا کی لہروں میں غوطے کھانے لگا تو اس نے

پکارا کہ میں بنی اسرائیل کے خدا، خدائے یکتا پر ایمان لایا ہوں لیکن اُس کی یہ توبہ ہرگز قبول نہ ہوئی۔ فرعون کی اس توبہ کی عدمِ قبولیت کی بھی یہی وجہ ہے۔

د۔ نہ فقر ذلت کی دلیل ہے اور نہ ثروت عزت کی دلیل ہے۔ یہ بھی ایک درس ہے کہ جو ہم زیرِ بحث آیات سے حاصل کرتے ہیں جبکہ مادی معاشروں اور مادی مکتبِ فکر کے نزدیک تو فقر و ثروت ذلت و عزت کی دلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے مشرکین پیغمبرِ اسلامؐ کے یتیم اور تہی دست ہونے پر تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی دولت مند پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ ان کے الفاظ میں:

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف - ۳۱)

ھ۔ جب مال و مقام کی وجہ سے ایک آزاد انسان غرور کی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے تو اگر وہ اپنی پیدائش کی تاریخ پر نظر کرے تو یہ زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ تو بے وقعت خاک تھا، ایک ناتواں نطفہ تھا پھر وہ اپنی ماں کے بطن سے اس حالت میں پیدا ہوا کہ بہت کمزور تھا۔ جیسا کہ قرآن زیرِ نظر آیات میں اس بے ایمان دولت مند کا غرور ختم کرنے کے لیے گزرے ہوئے زمانے کی اسے یاد دلاتا ہے۔ اس کا باایمان دوست کہتا ہے:

اکفرت بالذی خلقك من تراب ثم من نطفة ثم سواك رجلاً

و۔ ان آیات میں عالمِ طبیعت کے ایک درس کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہرے بھرے باغوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

ولم تظلم منه شيئاً

یعنی ۔ پھل دینے میں ان باغوں نے جہانِ انسانیت پر کوئی ظلم نہیں کیا۔

لیکن اس صاحبِ باغ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

ودخل جنته وهو ظالم لنفسه

وہ اپنے باغ میں داخل ہوا جبکہ وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔

قرآن کہنا یہ چاہتا ہے کہ اے انسان! جہانِ خلقت پر نگاہ ڈال، پھلوں سے لدے ان درختوں اور ان ہری بھری کھیتیوں کے پاس جو کچھ ہے خلوص کے طبق میں رکھ کر تجھے پیش کر دیتی ہیں۔ ان میں خود غرضی ہے اور نہ بخل و حسد۔ جہانِ آفرینش ایثار اور بخشش کا منظر پیش کرتا ہے۔ جو کچھ زمین کے پاس ہے وہ بڑے ایثار کے ساتھ نباتات اور حیوانات کو پیش کر رہی ہے۔ نباتات اپنی ساری نعمتیں انسان اور دوسرے جانداروں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ سورج کی ٹکیہ روز بروز کمزور پڑ رہی ہے مگر نور افشانی کیے جا رہی ہے۔ بادل برستے ہیں اور بادِ نسیم کی موجیں چلتی ہیں اور ہر طرف زندگی کی لہریں بکھیر دیتی ہیں۔ یہ نظامِ آفرینش ہے۔

لیکن — اے انسان! تُو چاہتا ہے کہ تُو اس عالم کا کُل سرسبد بھی ہو اور اس کے واضح قوانین کو بھی پامال کردے۔ تیری آرزو ہے کہ تُو ساری نعمتیں خود لے لے اور دوسروں کا حق بھی چھین لے۔

۴۵ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ○

۴۶ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ○

ترجمہ

۴۵ انہیں حیاتِ دنیا کے لیے یہ مثال دو کہ ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں اس سے زمین کی پود خوب پھلی پھولی پھر کچھ عرصے بعد وہ خشک ہوگئی اور ہَوا نے اسے اِدھر اُدھر بکھیر دیا اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

۴۶ مال و اولاد تو دنیاوی زندگی کی زینت ہیں اور باقیاتِ صالحات (پائیدار اور اچھے اعمال اور یہ نیکیوں) کا ثواب تیرے رب کے ہاں بہتر اور زیادہ اُمید بخش ہے۔

تفسیر

زندگی کی ابتدا و انتہا کیلئے ایک مثال

گزشتہ آیات میں مادی دنیا کی ناپائیدار نعمتوں کے بارے میں گفتگو تھی اور اس حقیقت کا ادراک کہ ۶۰ یا ۸۰ سال کی عمر میں عام افراد کے لیے آسان نہیں ہے لہٰذا قرآن نے زیرِ نظر آیت میں اس کے لیے

ایک بڑی زندہ اور منہ بولتی مثال پیش کی ہے ۔ یہ وہ مثال ہے جو لوگ اپنی زندگی میں عموماً دیکھتے رہتے ہیں یہ مثال مغرور و غافل افراد کو بیدار کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے ۔

ارشاد ہوتا ہے : حیاتِ دنیا کے لیے ان سے آسمان سے برسنے والے بارش کے قطروں کی مثال بیان کر (واضرب لھم مثل الحیٰوۃ الدنیا کماءٍ انزلناہ من السماء) ۔

بارش کے یہ حیات بخش قطرے پہاڑوں، صحراؤں اور میدانوں میں گرتے ہیں ۔ زمین کے اندر موجود وہ دانے جن میں صلاحیت ہوتی ہے ان میں ان قطروں سے جان پڑ جاتی ہے اور وہ اپنی زندگی کا ارتقائی سفر شروع کر دیتے ہیں ۔

دانے اگرچہ سخت ہوتے ہیں اور ان کی جلد مضبوط ہوتی ہے لیکن وہ بارش کی نرمی کے ساتھ نرم ہو جاتے ہیں ۔ ان میں سے پودے پھوٹتے ہیں اور آخر کار شاخیں مٹی سے سر نکالتی ہیں ۔ سورج چمکتا ہے، بادِ نسیم چلتی ہے، زمین میں موجود غذائی مواد بھی مدد کرتا ہے اور یہ نورس شاخیں ان تمام عوامل حیات سے قوت پا کر رشد و نمو کا سفر جاری رکھتی ہیں ۔ اس طرح سے ۔ کچھ مدت بعد پودے ایک دوسرے سے مل جل جاتے ہیں ایسے کہ جیسے گلے مل رہے ہوں ۔ (فاختلط بہ نبات الارض) ۔

کوہ و صحرا میں زندگی لہلہانے لگتی ہے ۔ پھول اور پھل شاخوں کو زینت بخشتے ہیں تو ہر طرف خوشیاں اور مسرتیں بکھر جاتی ہیں ۔ لیکن یہ دلربا منظر زیادہ دیر نہیں رہتا ۔ پھر بادِ خزاں چلنے لگتی ہے ۔ موت کی گرد اُن کے سروں پر آ پڑتی ہے ۔ ہوا خنک ہو جاتی ہے اور پانی کم ہو جاتا ہے ۔ زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ وہ مسکراتے ہوئے سرسبز و شاداب پودے پژمردہ اور بے فروغ شاخوں اور پتوں میں بدل جاتے ہیں" (فاصبح ھشیما) [1]

وہ پتے کہ جنہیں فصلِ بہار کی تیز ہوائیں بھی جدا نہیں کر سکتی تھیں آج اس قدر بے جان ہو گئے ہیں کہ "ہوا کے جھونکے انہیں جدا کر کے اِدھر اُدھر لیے پھرتے ہیں" (تذروہ الریاح) ۔ [2]

جی ہاں ! خدا ہر چیز پر قادر تھا اور قادر ہے (وکان اللہ علیٰ کل شیءٍ مقتدرًا) ۔

مال و ثروت اور افرادی قوت کہ جو دنیاوی زندگی کے دو اصلی رکن ہیں، ان کے بعد اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے : مال و اولاد حیاتِ دنیا کی زینت ہیں (المال والبنون زینۃ الحیٰوۃ الدنیا) ۔

یہ حیاتِ دنیا کے شجر کی شاخوں کے پھول ہیں جن کی عمر بہت کم ہے ۔ راہِ خدا میں رنگِ جاوداں

---

[1] "ھشیم" "ھشم" کے مادہ سے توڑنے کے معنی میں لیا گیا ہے اور یہاں ایسی خشک گھاس پھونس کے لیے استعمال ہوا ہے کہ جسے توڑ دیا گیا ہو ۔

[2] "تذروہ" مادہ "ذرو" سے منتشر کرنے اور بکھیرنے کے معنی میں ہے ۔

نہ پالیں تو یہ بہت بے اعتبار ہیں۔

درحقیقت اس آیت میں دنیاوی زندگی کے سرمائے کے دو اہم ترین حصوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دنیاوی زندگی کی باقی چیزیں انہی دو سے وابستہ ہیں۔ ایک اقتصادی قوت ہے اور دوسری افرادی قوت۔ ہر مادی مقصد تک پہنچنے کے لیے حتماً ان دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ اقتدار یا طاقت حاصل کرنے کے خواہشمند ان دو قوتوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خصوصاً گزشتہ زمانے میں جس شخص کے زیادہ بیٹے ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو زیادہ قوی محسوس کرتا تھا۔ گزشتہ آیات میں بھی جس بے ایمان دولت مند کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنے مال اور افرادی قوت کا ذکر دوسروں کے سامنے بڑے غرور سے کرتا تھا اور کہتا تھا:

انا اکثر منک مالاً و اعز نفراً

میرے پاس تجھ سے زیادہ مال اور زیادہ آدمی ہیں۔

پہلے "بنون" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو "ابن" کی جمع ہے جس کا معنی ہے بیٹا۔ کیونکہ وہ بیٹوں کو انسانی سرمایہ اور فعال قوت سمجھتے تھے نہ کہ بیٹیوں کو۔

بہرحال جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے باغات، کھیتیاں اور پانی کے چشمے چند لمحوں میں نابود ہو گئے جو ظاہراً بہت مستحکم دولت تھی۔ اولاد کی زندگی اور سلامتی بھی ہمیشہ خطرے میں ہونے کے علاوہ بعض اوقات وہ دشمن ہو جاتی ہے اور مددگار ہونے کی بجائے تکلیف رساں ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: باقیات صالحات (پائیدار اور شائستہ کاموں اور نیکیوں کا ثواب تیرے پروردگار کے ہاں بہتر اور زیادہ امید بخش ہے (والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثواباً وخیر املاً)۔

بعض مفسرین نے "باقیات الصالحات" کا بالکل محدود مفہوم بیان کیا ہے۔ مثلاً بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد نمازِ پنجگانہ ہے۔ کچھ نے کہا ہے کہ اس سے یہ ذکر مراد ہے:

سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر

اسی طرح بعض لوگوں نے دیگر محدود مفاہیم بیان کیے ہیں لیکن واضح ہے کہ اس تعبیر کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ ہر صالح اور اچھا عقیدہ، نظریہ، گفتار اور کردار شامل ہے کہ جو باقی رہ جاتا ہے اور جس کے اثرات و برکات لوگوں پر اور معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں اس سے نمازِ تہجد یا مودتِ اہلِ بیت مراد لی گئی ہے یہ بلاشبہ واضح مصادیق کا بیان ہے اور ان روایات سے یہ مراد نہیں کہ باقیات الصالحات کا مفہوم ان امور میں منحصر ہے خصوصاً ان روایات میں لفظ "من" استعمال ہوا ہے جو ان کے ایک مفہوم کے

ایک پہلو پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

لا تستصغر مودتنا فانها من الباقیات الصالحات

ہماری محبت و مودت کو کم تر نہ سمجھو کہ یہ بھی باقیات الصالحات میں سے ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

تسبیحات اربعہ پڑھنے میں تنگدلی نہ دکھاؤ کیونکہ یہ باقیات الصالحات میں سے ہے۔

یہاں تک کہ وہ ناپائیدار اموال اور اولاد کہ جو کبھی فتنے اور آزمائش کا باعث ہوتے ہیں اللہ کی راہ میں ہوں تو وہ بھی باقیات الصالحات کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں کیونکہ خدا کی پاک ذات جاوداں ہے اور جو چیز اس کے لیے اور اس کی راہ میں ہو وہ جاوداں ہو جاتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **دنیا کی ناپائیدار خوشنمائیاں :** زیرِ نظر آیات میں ایک مرتبہ پھر معانی کو مثال کے پیرائے میں مجسم کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ عقلی حقائق جن کا ادراک شاید بہت سے لوگوں کے لیے اتنا آسان نہیں ہے، قرآن مجید انہیں ایک زندہ اور واضح مثال کے ذریعے محسوسات کے قریب لے آتا ہے۔

قرآن انسانوں سے کہتا ہے : اپنی زندگی کا آغاز و انجام کا منظر ہر سال تم دیکھتے ہو۔ اگر تمہاری عمر ساٹھ سال ہے تو یہ منظر تم نے ساٹھ مرتبہ دیکھا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ ہر موسم بہار میں ویرانے دل انگیز اور خوبصورت مناظر میں بدل جاتے ہیں اور ان کے ہر گوشے سے زندگی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں لیکن فصلِ خزاں میں سرسبز وادیاں ویرانوں اور صحراؤں میں بدل جاتی ہیں اور ان کے ہر گوشے سے موت کے آثار نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔

جی ہاں! تم بھی ایک دن بچے تھے، نوشگفتہ غنچے کی طرح۔ پھر تم جوان ہو جاتے ہو ترو تازہ اور کھلے ہوتے پھول کی مانند۔ پھر تم بوڑھے اور ناتواں ہو جاتے ہو، پژمردہ اور خشک پھولوں کی طرح اور زرد افسردہ پتوں کی طرح۔ پھر طوفانِ اجل تمہیں کاٹ دیتا ہے۔ پھر چند دنوں کے بعد تمہاری بوسیدہ مٹی طوفانوں کے دوش پر اِدھر اُدھر بکھر جاتی ہے۔

لیکن یہ واقعہ کبھی غیر طبیعی صورت میں بھی پیش آجاتا ہے۔ بیچ راہ ہی میں بجلی یا طوفان اس زندگی کو ختم کر دیتا ہے، اس طرح سے جیسے سورہ یونس کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے :

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ ۖ حَتّٰىٓ إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ

زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَنْ لَمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ

دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا جس سے طرح طرح کے نباتات اُگتے ہیں جنہیں انسان اور چوپائے کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمین اپنا حُسن و زیبائی ان سے لے لیتی ہے۔ ان کے مالک مطمئن ہوتے ہیں کہ اچانک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آپہنچتا ہے (ہم ان پر سردی یا بجلی کو مسلط کر دیتے ہیں) اور انہیں یوں کاٹ کے رکھ دیتے ہیں گویا وہ تھے ہی نہیں۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیچ راہ میں پیش آنے والے حوادث ان نباتات کو تباہ نہیں کرتے اور وہ اپنا طبیعی سفر پورا کر لیتے ہیں البتہ ان کا انجام بہرحال پژمردگی، پراگندگی اور فنا ہے، جیسا کہ زیرِ بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ لہٰذا دنیاوی زندگی اپنا طبیعی سفر پورا کرے یا نہ کرے جلد یا بدیر دستِ فنا اُس کا دامن آپکڑے گا۔

۲۔ **غرور شکن عوامل:** ہم کہہ چکے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب انہیں مادی نعمتیں میسر آتی ہیں تو وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور یہ غرور انسانی سعادت کا بہت بڑا دشمن ہے۔ گزشتہ آیات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح غرور، شرک و کفر کا باعث بنتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جو ایک اعلیٰ تربیتی کتاب ہے اس غرور کی کر توڑنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتی ہے۔ کبھی وہ بتاتی ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ کبھی وہ مثالوں کے ذریعے مادی چیزوں کی ناپائیداری کو واضح کرتی ہے (جیسا کہ زیرِ بحث آیات میں کہا گیا ہے)۔ کبھی یہ خبردار کرتی ہے کہ ہو سکتا ہے تمہاری دنیا کے وسائل اور سرمائے ہی تمہارے لیے دشمنِ جاں ہو جائیں (جیسا کہ سورہ توبہ کی آیت ۵۵ میں ہے)۔ کبھی یہ تاریخ کے مغرور لوگوں کا انجام بیان کرتی ہے جیسا کہ قارون اور فرعون کا انجام بیان کر کے ان جیسے افراد کو خبردار کیا گیا ہے اور کبھی یہ انسان کو اس کے اس دور کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ جب وہ ایک بے حیثیت نطفہ یا معمولی سی خاک تھا۔ کبھی وہ اس کے ایسے ہی مستقبل کو اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم کرتی ہے تاکہ وہ جان لے کہ ایسے کمزور و ناتواں آغاز و انجام کے درمیانی عرصے میں غرور و تکبر احمقانہ قدم ہے (جیسا کہ سورہ طارق کی آیت ۶، سورہ سجدہ کی آیت ۸ اور سورہ قیامت کی آیت ۳۸ میں ہے)۔

شیطان پوری تاریخ میں بڑے بڑے جرائم کا باعث رہا ہے۔ قرآن شیطانی حربوں کی ناکامی کے لیے یہ تمام ذرائع استعمال کرتا ہے۔

مسلّم ہے کہ باایمان، باظرف اور حقیقت شناس انسان مقام و ثروت پا کر غرور جیسی قبیح عادت

میں مبتلا نہیں ہوتے ۔ نہ صرف یہ کہ وہ مغرور نہیں ہوتے بلکہ ان کے طرز عمل میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں آتی۔ وہ ثروت و حیثیت کو عاریتاً ملنے والی ایسی چیز سمجھتے ہیں جو ہوا کے ایک جھونکے سے گر پڑے۔

(۴۷) وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۝

(۴۸) وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ۝

(۴۹) وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝

ترجمہ

(۴۷) اس دن کا سوچو جب ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تو دیکھے گا کہ زمین کھلے میدان کی مانند ہوگی اور ہم ان سب (انسانوں) کو محشور کریں گے اور کسی کو نظر انداز نہیں کریں گے۔

(۴۸) وہ سب صف بستہ تیرے رب کے حضور پیش ہوں گے (اور انہیں کہا جائے گا) تم سب کو اسی طرح ہمارے پاس آنا پڑا جس طرح ابتدا میں ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا جبکہ تمہارا یہ گمان تھا کہ ہم تمہارے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے۔

(۴۹) اور (سب انسانوں کے نامۂ اعمال کی) کتاب وہاں رکھ دی جائے گی تو تُو گنہگاروں کو دیکھے گا کہ وہ اس میں جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھ دیکھ کر ڈریں گے اور کہیں گے ہائے ہماری شامت، یہ کیسی کتاب ہے کہ جو کسی چھوٹے بڑے عمل کو شمار کیے بغیر نہیں چھوڑتی اور وہ اپنے تمام اعمال کو موجود پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔

تفسیر

ہائے ہماری شامت! یہ کیسی کتاب ہے

گزشتہ آیات میں ایک خود پرست اور مغرور انسان کے بارے میں گفتگو تھی کہ جس نے اپنے تکبر کی وجہ سے قیامت کا انکار کر دیا تھا۔ زیر نظر آیات میں قیامت کی کیفیت کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں تین مراحل کا ذکر ہے:

پہلا مرحلہ انسانوں کے قبروں سے اٹھنے سے پہلے کا ہے۔

دوسرا مرحلہ قیامت کا ہے اور

تیسرا مرحلہ اس کے بعد کا ہے

ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کا سوچو جب (جہانِ ہستی کا یہ نظام نئے نظام کے مقدمے کے طور پر درہم برہم ہو جائے گا اور) پہاڑ چلنے لگیں گے اور سطحِ زمین کی ساری اونچ نیچ ختم ہو جائے گی۔ زمین کھلے میدان کی طرح ہو گی اور ہر چیز اس میں تم نمایاں دیکھو گے (ویوم نسیر الجبال وتری الارض بارزۃ)۔

ان آیات میں اُن حوادث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو آغازِ قیامت میں رونما ہوں گے۔ یہ حوادث بہت زیادہ ہیں۔ قرآن حکیم کی آخری مختصر سورتوں میں ان کا خاص طور پر بہت ذکر ہے۔ انہیں "اشراط الساعۃ" (قیامت کی نشانیاں) کہا جاتا ہے۔

یہ سب نشانیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ آج کی دنیا اور یہ موجود عالم بالکل دگرگوں ہو جائے گا۔ پہاڑ چلنے لگیں گے اور پھر دکھائی نہ دیں گے۔ درخت اور عمارتیں گر پڑیں گی۔ زمین صاف اور ہموار ہو جائے گی۔ پھر زلزلے اسے درہم برہم کر دیں گے۔ سورج کی روشنی ختم ہو جائے گی اور چاند بے نور

ہو جائے گا۔ ستاروں کے چراغ بجھ جائیں گے۔ پھر ان ویرانوں میں نئے جہان اور نئے زمین و آسمان تعمیر ہوں گے۔ انسان نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

مزید فرمایا گیا ہے: اس وقت ہم محشور کریں گے اور ان میں سے ہم کسی کو نظرانداز نہیں کریں گے (وحشرناھم فلم نغادر منھم احدًا)۔

"نغادر" "غدر" کے مادہ سے کسی چیز کو ترک کرنے کے معنی میں ہے اسی لیے اپنے عہد و پیمان کو توڑنے والے شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُس نے "غدر" کیا ہے اور یہ جو پانی کے گڑھے کو "غدیر" کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بارش کے پانی کی کچھ مقدار وہاں چھوڑ دی گئی اور ترک کر دی گئی ہوتی ہے۔

بہر حال مذکورہ جملہ اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ معاد کا حکم سب کے لیے ہے اور اس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہے۔

اگلی آیت میں قبروں سے انسانوں کے اٹھنے اور محشور ہونے کی کیفیت کے بارے میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ سب ایک ہی صف میں تیرے رب کی بارگاہ میں پیش ہوں گے (وعرضوا علیٰ ربک صفًا)۔

ہو سکتا ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ لوگوں کا ہر گروہ جو ایک عقیدے کا حامل ہے یا جن کے عمل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں وہ ایک صف میں ہوں گے یا یہ کہ سب کے سب کسی فرق اور امتیاز کے بغیر ایک صف میں ہوں گے۔

اور انہیں کہا جائے گا: تم سب کو ہمارے پاس اس طرح آنا پڑا جیسے ہم نے آغاز میں تمہیں پیدا کیا (لقد جئتمونا کما خلقناکم اوّل مرة)۔

نہ مال و ثروت کا کوئی پتہ ہے، نہ زر و زیور کی کوئی خبر ہے، نہ مادی امتیازات ہیں نہ رنگا رنگ لباس ہیں اور نہ یاور و مددگار۔ بالکل اسی طرح جیسے ابتدائے آفرینش میں تھے، آج بھی اسی پہلی حالت میں ہو۔

لیکن تمہیں یہ گمان تھا کہ ہم تمہارے لیے کوئی وعدہ گاہ قرار نہیں دیں گے (بل زعمتم الن نجعل لکم موعدًا)۔ اور یہ اس وقت ہوتا تھا جب مادی وسائل اور نعمتوں کا غرور تم پر چھا جاتا تھا۔ تمہیں دنیا جاوداں لگنے لگتی تھی اور آخرت کی فطری فکر اس میں چھپ جاتی تھی۔

اس کے بعد اس قیامتِ کبریٰ کے دوسرے مراحل بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کتاب وہاں رکھ دی جائے گی جو سب انسانوں کا نامۂ اعمال ہے (ووضع الکتاب)۔

گنہگار جب اس کے مندرجات سے آگاہ ہوں گے تو خوفزدہ ہو جائیں گے اور وحشت کے آثار

تُو ان کے چہرے پر دیکھے گا (فتری المجرمین مشفقین ممّا فیہ)۔

تو اس وقت فریاد کریں گے اور کہیں گے: ہائے افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ جو کوئی چھوٹا بڑا عمل شمار کیے بغیر نہیں چھوڑتی (ویقولون یا ویلتنا مال ھٰذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا)۔

اس نے تو چھوٹی سے چھوٹی چیز کا حساب رکھا ہے اور کسی چیز کو نظر انداز نہیں کیا۔ واقعاً یہ بھی کتنی وحشتناک ہے جن کاموں کو ہم نے بھلا دیا تھا اور ہم تو سوچتے تھے کہ ہم نے کوئی غلط کام کیا ہی نہیں لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری جوابدہی کا وزن کتنا بھاری ہے اور ہمارا انجام تاریک ہے۔

اس تحریری سند کے علاوہ "تم اپنے سب اعمال کو حاضر پاؤ گے" (ووجدوا ما عملوا حاضرًا)۔

نیکیاں، برائیاں، مظالم، عدل کے کام، فضول باتیں اور خیانتیں سب ان کے سامنے مجسم ہوں گی۔

درحقیقت وہ اپنے کیے میں گرفتار ہوں گے "اور تیرا رب تو کسی پر ظلم نہیں کرتا" (ولا یظلم ربک احدًا)۔

یہ تو وہی کام ہوں گے جو انہوں نے اس جہان میں انجام دیئے ہیں لہٰذا وہ شکوہ بھی اپنے آپ ہی سے کر سکتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ پہاڑ کیوں منہدم ہوں گے؟ ہم کہہ چکے ہیں کہ قیامت کے آغاز میں مادی دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ البتہ اس سلسلے میں قرآن میں مختلف تعبیریں دکھائی دیتی ہیں۔

زیر بحث آیات میں ہے:

نسیر الجبال

یعنی۔ ہم پہاڑوں کو حرکت میں لائیں گے اور انہیں چلائیں گے۔

یہی تعبیر سورہ نبا کی آیت ۲۰ اور سورہ تکویر کی آیت ۳ میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن سورہ مرسلات کی آیت ۱۰ میں ہے:

وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝

شدید طوفانوں کے باعث پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور الگ ہو جائیں گے۔

جبکہ سورہ حاقہ کی آیت ۱۴ میں ہے:

وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ٥

زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھ جائیں گے اور ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے۔

سورہ مزمل کی آیت ۱۴ میں ہے:

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ٥

وہ دن کہ جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ پیدا ہوگا اور پہاڑ ریت کے سلے ہوئے ٹیلوں کی طرح ہو جائیں گے۔

سورہ واقعہ کی آیت ۵،۶ میں ہے:

وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ٥

پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور پھر گرد و غبار کی طرح بکھر جائیں گے۔

بالآخر سورہ قارعہ کی آیت ۵ میں ہے:

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ٥

اور پہاڑ رنگی ہوئی دھنی ہوئی اُون کی مانند ہوں گے (کہ جو اِدھر اُدھر بکھر جاتی ہے)۔

واضح ہے کہ ان آیات میں آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ پہاڑوں کے درہم برہم ہونے کے مختلف مراحل کی طرف مختلف اشارے ہیں۔

پہاڑ اس زمین کا محکم ترین اور مضبوط ترین حصہ ہے۔ معاملہ ان کی حرکت اور چلنے سے شروع ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ گرد و غبار بن کر یوں اُڑیں گے کہ فضا میں ان کا صرف رنگ نظر آئے گا۔

یہ اتنی بڑی حرکت کیسے پیدا ہوگی، یقیناً اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ زمین کی کششِ ثقل وقتی طور پر اٹھا لی جائے اور زمین کی دَوری حرکت کے سبب پہاڑ درہم برہم ہو جائیں اور فضاؤں میں بکھر جائیں۔ یا ہو سکتا ہے بڑے بڑے ایٹمی دھماکوں کے باعث زمین کے مرکز میں ایسی عظیم اور وحشت ناک حرکت پیدا ہو جائے۔

بہرحال یہ سب امور اس بات کی دلیل ہیں کہ قیامت ایک بہت بڑے انقلاب کی حامل ہے۔ عالم کے بے جان مادہ میں بھی انقلاب پیدا ہوگا اور انسانوں کی زندگی میں بھی۔ سب انسان جہانِ نو میں بلند تر زندگی شروع کریں گے۔ روح اور جسم تو اس دنیا میں بھی ہوگی لیکن وہاں اس کی بناوٹ ہر لحاظ سے وسیع تر اور کامل تر ہوگی۔

قرآن کی یہ تعبیر ضمنی طور پر انسان کو اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے کہ باغ اور پانی تو معمولی چیزیں ہیں، بڑے بڑے پہاڑ تک ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے۔ اس طرح دنیا کی تمام موجودات یہاں تک کہ جو بہت بڑی بڑی چیزیں ہیں سب کے لیے فنا ہے۔

۴۔ نامۂ اعمال : زیرِ بحث آیات کے ذیل میں تفسیر المیزان میں ہے کہ تمام آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ قیامت میں انسانوں کے لیے تین قسم کے اعمال نامے ہوں گے۔

پہلی قسم : تو وہ ایک ہی کتاب ہے جو سب کے اعمال کے لیے رکھی گئی ہے۔ درحقیقت اس میں سب اولین و آخرین کے اعمال ثبت ہیں جیسا کہ زیرِ بحث آیات میں ہے :

ووضع الکتاب

اس کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ سب انسانوں کے حساب کتاب کے لیے ایک ہی کتاب ہوگی۔

دوسری قسم : وہ کتاب ہے جو ہر امت کے لیے ہوگی۔ ہر امت کے لیے ایک کتاب ہوگی کہ جس میں اس کے اعمال درج ہوں گے۔ جیسا کہ سورہ جاثیہ کی آیت ۲۸ میں ہے :

كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا

ہر امت اپنی کتاب اور نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی۔

تیسری قسم : وہ کتاب ہے کہ جو ہر انسان کے لیے الگ الگ ہے۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۳ میں ہے :

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا ...

ہر انسان کے نامۂ اعمال کی جوابدہی ہم نے اسی کی گردن میں ڈالی ہے اور روزِ قیامت ہم اس کے لیے کتاب اور نامۂ اعمال باہر نکالیں گے[1]

واضح ہے کہ یہ آیات ایک دوسری کے منافی نہیں ہیں کیونکہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ آدمی کے اعمال مختلف کتب میں درج ہوں۔ موجودہ زمانے میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ملک کے اداروں اور محکموں میں تفصیلات کے لیے ہر شخص کی الگ فائل ہوتی ہے اور پھر محکمے اور شعبے کے مجموعی ریکارڈ میں

---

[1] المیزان۔ ج ۱۳ ص ۳۴۸۔

مفسرِ قرآنِ مجید، فیلسوف عالی قدر، عالمِ بزرگ اخلاق آیۃ اللہ علامہ طباطبائی انہی دنوں ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ ان کی یہ جدائی ہمارے لیے ایک بہت بڑا صدمہ اور نقصان ہے۔ وہ ایک ایسی عظیم ہستی تھے کہ جنہوں نے اپنی بابرکت زندگی میں بہت ہی اہم اور قیمتی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ہر قسم کی خود نمائی سے دور اسلامی معاشرے کی خدمت میں مصروف رہے۔ انہوں نے حوزہ علمیہ قم اور دورِ حاضر کے علماء کے افکار میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور بہت ہی بلند پایہ شاگردوں کی تربیت کی۔ انہوں نے بہت قیمتی آثار بطور یادگار چھوڑے ہیں خصوصاً ان کی گرانقدر تفسیر المیزان نے قرآن کریم کے نئے باب کھولے ہیں۔ یہ تفسیر تفسیر کے اہم اسلامی علم کی طرف نئی لگن کا سبب بنی ہے۔ اللہ کرے ان کی رُوح غریقِ رحمت ہو اور ان کی یاد ہمیشہ احترام و تکریم کے ساتھ دلوں میں باقی رہے۔ (آپ کی تاریخ رحلت ۲۴ آبان ماہ ۱۳۶۰ ہجری شمسی، بمطابق ۱۸ محرم الحرام ۱۴۰۲ ہجری قمری)۔

بھی اس کے بارے میں کوائف ہوتے ہیں اور اسی طرح سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔

لیکن اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ قیامت میں انسانوں کے نامۂ اعمال اس جہان کی عام فائلوں اور کتابوں کی طرح نہیں ہیں۔ وہ تو ایک منہ بولتا اور ناقابلِ انکار مجموعہ ہوگا۔ شاید وہ خود انسان کے اعمال کا فطری نتیجہ ہو۔

بہر حال زیر بحث آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ خاص کتابوں میں درج ہونے کے علاوہ خود اعمال بھی وہاں مجسم ہونگے اور حاضر ہوں گے (ووجدوا ما عملوا حاضرًا)۔

وہ اعمال جو بکھر جانے والی توانائیوں کی طرح اِس جہان میں نظروں سے محو ہو چکے ہیں حقیقت میں ختم نہیں ہوتے۔

(دورِ حاضر کے علم نے بھی ثابت کیا ہے کہ مادہ، توانائی اور کوئی کوشش ختم نہیں ہوتی بلکہ ان کی شکل بدل جاتی ہے)۔ نیک اعمال جاذب اور خوبصورت شکل میں ظاہر ہوں گے اور بُرے اعمال بُرے اور بدصورت چہروں میں ظاہر ہوں گے۔ یہ اعمال ہمارے ساتھ ساتھ ہوں گے یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیات کے آخری جملے میں فرمایا گیا ہے:

ولا یظلم ربک احدًا

تیرا رب اپنے بندوں میں سے کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔

کیونکہ جزا اور سزا ان کے عمل کا ماحصل ہی ہے۔

البتہ بعض مفسرین نے " ووجدوا ما عملوا حاضرًا " کو نامۂ اعمال کے مسئلہ پر تاکید سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ اپنے نامۂ اعمال کی کتاب میں اپنے تمام کاموں کو موجود اور لکھا ہوا پائیں گے [1]

بعض دوسرے مفسرین اس آیت میں لفظ " جزا " کو مقدر سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے:

اس دن لوگ اپنے اعمال کی جزا کو حاضر اور موجود پائیں گے [2]

لیکن پہلی تفسیر آیات کے ظاہری مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

تجسم اعمال کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں سورہ آل عمران کی آیت ۳۰ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی متعلقہ آیات کے ذیل میں بحث کریں گے۔

۳۔ معاد پر ایمان کا تربیتی نتیجہ: قرآن واقعاً ایک عجیب تربیتی کتاب ہے۔ جب اس میں انسانوں

---

[1] و [2] فخر الدین رازی۔ تفسیر کبیر میں اور قرطبی۔ تفسیر الجامع میں۔

کے سامنے قیامت کا منظر پیش کیا جاتا ہے تو فرمایا جاتا ہے کہ "وہ دن جب سب لوگ اللہ کی بارگاہِ عدل میں منظم طور پر صفیں باندھے پیش کیے جائیں گے":

ان کی مختلف صفیں ان کے عقائد و اعمال میں ہم آہنگی کی بناء پر ترتیب پائیں گی۔ ان کے ہاتھ تہی ہوں گے اور تمام دنیاوی تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ وہاں اجتماع کے باوجود وہ تنہا ہوں گے اور تنہائی کے باوجود اکٹھے ہوں گے اور اعمال نامے کھلے ہوں گے۔ سب چیزیں بولیں گی اور انسانوں کے چھوٹے بڑے اعمال بتائیں گی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود اعمال و افکار میں جان پڑ جائے گی اور جسمانی شکل میں ظاہر ہوں گے ہر شخص کے گرد اس کے اعمال جسمانی صورت میں موجود ہوں گے۔ لوگ اپنے آپ میں اس طرح سے کھوئے ہوں گے کہ ماں کو بیٹے کا اور بیٹے کو ماں کا ہوش نہیں ہوگا۔

عدلِ الٰہی کی عدالت لگی ہوگی۔ عذابِ عظیم بدکاروں کے انتظار میں ہوگا۔ لوگ اس سے سخت وحشت زدہ ہوں گے۔ سانس سینوں میں اٹکے ہوں گے اور آنکھیں پتھرائی ہوں گی۔

ایسی عدالت میں ایمان واقعاً انسانی تربیت کے لیے کس قدر مؤثر ہے۔ ہوا و ہوس پر کنٹرول کیلئے یہ ایمان کس قدر مفید ہے۔ یہ ایمان انسان کو کس قدر آگاہی اور بیداری عطا کرتا ہے اور اس کے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا کرتا ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اذا کان یوم القیامة دفع للانسان کتابه ثم قیل له اقرء — قلت فیعرف مافیه۔ فقال انه یذکره فما من لحظة ولا کلمة ولا نقل قدم ولا شیء فعله الا ذکره، کأنه فعله تلك الساعة، ولذلك قالوا یا ویلتنا مالهٰذا الکتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها۔

روزِ قیامت انسان کے ہاتھ میں اس کا نامۂ اعمال تھمایا جائے گا پھر اس سے کہا جائے گا: پڑھو۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے امامؑ سے پوچھا: جو کچھ اس نامۂ اعمال میں ہوگا کیا وہ شخص اسے پہچان لے گا اور اسے یاد آجائے گا۔

امامؑ نے فرمایا:

اسے سب کچھ یاد آجائے گا۔ پلکوں کا جھپکنا، ہر لفظ کا ادا کرنا اور ہر قدم کا اٹھانا مختصر یہ کہ اس نے جو کام بھی انجام دیا اسے ایسے یاد آجائے گا گویا اس نے ابھی انجام دیا ہے۔ لہٰذا لوگ فریاد کریں گے اور کہیں گے: ہائے افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ جس نے کسی چھوٹے

بڑے کام کو شمار کیے بغیر نہیں چھوڑا۔[1]

اس حقیقت پر ایمان کا تربیتی اثر کسی بغیر واضح ہے۔ واقعاً کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان ایسے عالم پر ایمان قاطع رکھتا ہو اور پھر بھی گناہ کرے۔

(۵۰) وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ○

(۵۱) مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ○

(۵۲) وَ يَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ○

(۵۳) وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَ لَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ○

ترجمہ

(۵۰) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنّوں میں سے تھا اس لیے وہ اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا (اس کے باوجود تم) میری بجائے اسے اور

---

[1] نورالثقلین، ج ۳ ص ۲۷۶

اس کی اولاد کو اولیا۔ بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ظالم لوگ بہت بُرا بدل اپناتے ہیں۔

(۵۱) مَیں نے آسمانوں اور زمین کی خلقت کے وقت انہیں نہیں بلایا تھا اور نہ خود انہیں پیدا کرتے وقت انہیں شریک کیا تھا اور مَیں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا۔

(۵۲) اُس دن کا سوچ کر جب اللہ کہے گا کہ اب انہیں آواز دو جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے (تاکہ وہ تمہاری مدد کو آئیں) لیکن انہیں جتنا بھی پکاریں وہ ان کی کچھ نہ سنیں گے اور ہم ان دونوں کے درمیان مرکزِ ہلاکت بنا دیں گے۔

(۵۳) اور سارے مجرم (جہنم کی) آگ دیکھیں گے اور یقین کرلیں گے کہ انہیں آگ میں ڈالا جائے گا اور آگ ان پر ڈالی جائے گی اور انہیں اس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہ دے گی۔

تفسیر

شیطانوں کو اپنا سرپرست نہ بناؤ

قرآن میں کئی مقامات پر خلقتِ آدمؑ کی داستان بیان ہوئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ فرشتوں نے انہیں سجدہ کیا مگر ابلیس نے حکمِ خدا کی مخالفت کی۔ جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں یہ تکرار ہمیشہ کسی مقصد کے پیشِ نظر ہے اور ہر موقع پر کوئی خاص نکتہ پنہاں ہوتا ہے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایک اہم واقعے کے مختلف پہلو ہوں اور جب بھی اس واقعے کا ذکر ہو تو کوئی ایک پہلو ملحوظِ نظر ہو۔

گزشتہ مباحث میں متکبر و مغرور دولت مندوں کے بارے میں ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ اس مثال میں تہی دست مستضعفین کے بارے میں ان کے خیالات بیان کیے گئے ہیں اور پھر ان کے انجام کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

دراصل روزِ اوّل سے غرور و تکبر ہی انحراف، کفر اور سرکشی کی بنیاد رہا ہے لہٰذا زیرِ بحث آیات میں ابلیس کا ذکر ہے کہ اُس نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس امر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ہم جان لیں کہ شروع ہی سے غرور و تکبر کفر و سرکشی کا سرچشمہ رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس داستان سے واضح ہوتا ہے کہ انحرافات کا باعث شیطانی وسوسے ہیں اور اس کے وسوسوں کے سامنے سر جھکا دینا کس قدر احمقانہ حرکت ہے کہ جس نے پہلے دن ہی سے ہماری دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ دن یاد کرو کہ جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نافرمانی کی (واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لاٰدم فسجدوا الا ابلیس)۔

اس استثناء سے ہو سکتا ہے یہ وہم پیدا ہو کہ ابلیس فرشتوں میں سے ہے حالانکہ فرشتے معصوم ہیں لہٰذا اُس نے کیونکر سرکشی کی۔ اس لیے ساتھ فرمایا گیا ہے: وہ جنّوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کی اطاعت سے نکل گیا (کان من الجن ففسق عن امر ربہ)۔

وہ فرشتوں میں سے نہیں تھا لیکن اللہ کی بندگی، اطاعت اور قرب کی وجہ سے اس نے فرشتوں کی صف میں جگہ پالی تھی۔ یہاں تک کہ شاید ان کا اُستاد ہوگیا تھا لیکن لحہ بھر کے غرور و تکبر نے اسے ایسا گرایا کہ اُس کا تمام تر روحانی مقام جاتا رہا اور وہ بارگاہِ خدا سے ٹھکرا دیا گیا اور وہ خدا کے نزدیک سب سے بڑھ کر قابلِ نفرت ہوگیا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: کیا اس کے باوجود تم میری بجائے اسے اور اس کی اولاد کو اپنا سرپرست بناتے ہو (افتتخذونہ و ذریتہ اولیاء من دونی)۔ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں (وھم لکم عدو)۔

اُس نے تمہاری گمراہی اور تباہی کے لیے قسم کھا رکھی ہے اور تمہارے باپ کے بارے میں اس کی دشمنی پہلے روز ہی آشکار ہوگئی تھی۔

خدا کے بدلے شیطان اور اس کی اولاد کو اپنانا کتنا بُرا ہے (بئس للظالمین بدلاً)[1]

واقعاً کس قدر بُری بات ہے کہ انسان عالم و آگاہ، رحیم و مہربان اور فیض رساں خدا کو چھوڑ کر شیطان اور اُس کے حواریوں کو اپنا لے۔ یہ بدترین انتخاب ہے، کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک عقلمند انسان ایسے کو اپنا ولی، راہنما اور سہارا سمجھ لے کہ جس نے روزِ اول سے اس کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے۔

اگلی آیت میں اس غلط خیال کے ابطال کے لیے ایک اور دلیل پیش کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آسمانوں اور زمین کی خلقت کے وقت ہم نے ابلیس اور اولادِ ابلیس کو نہیں بلایا یہاں تک کہ ان کی اپنی

---

[1] "بدلاً" ترکیب نحوی کے لحاظ سے تمیز ہے اور "بئس" کا فاعل شیطان اور اس کا لاؤلشکر ہے یا شیطان اور اس کے لاؤلشکر کی عبادت فاعل ہے۔

تخلیق کے وقت بھی انہیں شریک نہیں کیا (ما اشهدتهم خلق السماوات والارض ولا خلق انفسهم)۔ کیونکہ اس عالم کی خلقت میں ان کی مدد درکار تھی اور نہ انہیں آگاہ کیا جانا ضروری تھا۔ لہٰذا جس کا اس عالم کی آفرینش سے کوئی تعلق ہے اور نہ اپنی تخلیق میں کوئی دخل ہے اور نہ رموزِ خلقت کی جسے کچھ خبر ہے وہ ولایت و پرستش کے لائق کیسے ہو سکتا ہے اور اصولی طور پر اس کے بس میں ہے ہی کیا؟ وہ تو ایک ناتواں موجود ہے یہاں تک کہ خود اپنے مسائل سے ناآگاہ ہے تو پھر وہ دوسروں کی کیا رہبری کر سکتا ہے اور دوسروں کو مشکلات سے کیا نجات دلا سکتا ہے؟

آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: میں ہرگز گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا (وما کنت متخذ المضلين عضدًا)۔ یعنی خلقت تو دوستی اور ہدایت کی بنیاد پر ہے لہٰذا جس کا کام ہی گمراہ کرنا ہو اس نظامِ خلقت کو چلانے میں اس کا دخل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو آفرینش و ہستی کے اس نظام کی بالکل مخالف سمت میں گامزن ہے وہ تو خرابیاں پیدا کرتا ہے اور ویرانیاں لاتا ہے نہ کہ اصلاح، تکامل اور ارتقاء کے لیے کچھ کرتا ہے۔

زیرِ بحث آخری آیت ایک مرتبہ پھر خبردار کرتی ہے: اس وقت کا سوچو جب اللہ فرمائے گا کہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے انہیں اب اپنی مدد کے لیے آواز دو (ویوم یقول نادوا شرکاءی الذین زعمتم)۔ ایک عمر تم ان کا دم بھرتے رہے اور ان کے آستانے پر سجدہ کرتے رہے، اب جب کہ تمہیں عذاب کی موجوں نے گھیر لیا ہے تو انہیں آواز دو کہ ایک لمحے کے لیے تو تمہاری مدد کو آجائیں۔

وہ لوگ گویا انہی دنیاوی افکار کے مطابق "انہیں پکاریں گے لیکن یہ خیالی اور جعلی معبود انہیں جواب تک نہیں دیں گے" چہ جائیکہ مدد کو آئیں (فدعوهم فلم یستجیبوا لهم)۔ اور ان کے درمیان ہم مرکزِ ہلاکت بنائیں گے (وجعلنا بینهم موبقًا)[1]

زیرِ بحث آخری آیت میں شیطان کے پیروکاروں اور مشرکین کا انجام واضح کیا گیا ہے: اس دن گنہگار جہنم کی آگ دیکھیں گے (ورآ المجرمون النار)۔ وہ آگ کہ جس کے بارے میں انہیں کبھی یقین نہ آتا تھا ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگی۔ اس موقع پر انہیں اپنی گزشتہ غلطیوں کا اندازہ ہوگا "اور اب انہیں یقین آئے گا کہ وہ آگ میں ڈالے جائیں گے اور آگ ان پر ڈالی جائے گی (فظنوا انهم مواقعوها)۔ پھر انہیں یقین آجائے گا کہ اب اس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے (ولم یجدوا عنها مصرفًا)۔

---

[1] "موبق" "وبوق" (بروزن "نبوغ") کے مادہ سے ہے کہ جو ہلاکت کے معنی میں ہے اور "موبق" جائے ہلاکت کو کہتے ہیں۔

نہ ان کے خود ساختہ معبود ان کی فریاد کو پہنچیں گے نہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کے بارے میں مؤثر ہوگی اور نہ جھوٹ، زر یا زور سے وہ جہنم کی آگ سے بچ سکیں گے، وہ آگ کہ جو ان کے اعمال وکردار نے دہکائی ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ "ظنوا" اگرچہ "ظن" کے مادہ سے ہے لیکن یہاں اور بہت سے دیگر مواقع پر یہ لفظ یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے اسی لیے سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۹ میں حضرت طالوت کے ساتھی حقیقی مومنین اور ثابت قدم مجاہدین کہ جو جابر و ظالم جالوت کے خلاف جنگ کے لیے نکلے ان کے بارے میں ہے:

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ

جو اللہ سے ملاقات پر ایمان رکھتے تھے انہوں نے کہا کہ ایسا بہت مرتبہ ہوا ہے کہ چھوٹے سے (باایمان) گروہ نے بڑے گروہ پر کامیابی حاصل کی ہے۔

ضمناً لفظ "مواقعوھا" کہ جو "مواقعہ" کے مادہ سے ہے ایک دوسرے پر واقع ہونے کے معنی میں ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی آگ میں گریں گے اور آگ بھی اُن پر گرے گی، وہ بھی آگ میں داخل ہوں گے اور آگ بھی ان میں داخل ہوگی۔ کیونکہ قرآن کی دوسری آیات میں ہے کہ:

گنہگار خود آگ کا ایندھن ہیں۔ (بقرہ - ۲۴)

چند اہم نکات

۱۔ کیا شیطان فرشتہ تھا؟ ہم جانتے ہیں کہ فرشتے معصوم ہیں۔ قرآن نے ان کی پاکیزگی اور عصمت کا ذکر کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝

وہ خدا کے محترم ومکرم بندے ہیں۔ کسی بات میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ (انبیاء - ۲۶، ۲۷)

اصولی طور پر اُن کے جوہر میں عقل ہے اور شہوت نہیں ہے لہٰذا تکبر، خود پرستی اور گناہ پر اکسانے والی کوئی چیز اُن میں نہیں ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں کہا گیا ہے کہ ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔ اسی طرح کا ذکر دوسری آیات میں بھی ہے۔ اس استثناء سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا جبکہ اس کی نافرمانی اور سرکشی پر نظر کی جاتے تو یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی فرشتہ

گناہانِ کبیرہ کا مرتکب ہو۔

خصوصاً جبکہ نہج البلاغہ کے بعض خطبات میں بھی ہے کہ:

ماکان اللّٰہ سبحانہ لید خل الجنۃ بشرا بامر اخرج بہ منہاملکا

ہرگز ممکن نہیں کہ اللہ انسان کو ایسا کام کرنے پر بہشت میں بھیج دے جیسا کام کرنے پر اس نے ایک فرشتے کو بہشت سے نکال دیا تھا۔[1]

یہ ابلیس کے غرور کی طرف اشارہ ہے۔

زیرِ نظر آیات نے اس سوال کو حل کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

کان من الجن

ابلیس جنوں کے گروہ میں سے تھا۔

جنّ ایسے موجودات ہیں جو ہماری نظروں سے پنہاں ہیں۔ وہ عقل و شعور بھی رکھتے ہیں اور شہوت و غضب بھی۔ ہم جانتے ہیں کہ لفظ "جن" قرآن میں جہاں کہیں بھی آیا ہے اسی مخلوق کی طرف اشارہ ہے۔ بعض مفسرین کہ جن کا نظریہ ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا وہ زیرِ بحث آیت میں آنے والے لفظ "جن" کا لغوی معنی لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "کان من الجن" سے مراد یہ ہے کہ ابلیس دیگر فرشتوں کی طرح نظروں سے پنہاں تھا۔ حالانکہ یہ معنی بالکل خلافِ ظاہرِ قرآن ہے۔

ہمارے دعویٰ کے ثبوت میں سے ایک واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن ایک طرف سے کہتا ہے:

وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝

جنّ کو ہم نے آگ کے مخلوط شعلے سے پیدا کیا (رحمٰن۔ ۱۵)

دوسری طرف سے جس وقت ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اس سرکشی کے لیے یہ منطق پیش کی:

خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ۝

میری تخلیق تُو نے آگ سے کی ہے اور اسے تُو نے مٹی سے بنایا ہے۔ (اعراف۔ ۱۲)

اس سے قطعِ نظر زیرِ بحث آیات میں ابلیس کی "ذریہ" (اولاد) کا ذکر ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ فرشتوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔

جو کچھ کہا گیا ہے اسے ملحوظِ نظر رکھا جائے اور فرشتوں کے جوہرِ ساخت کو بھی پیشِ نگاہ رکھا جائے تو مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابلیس ہرگز فرشتہ نہیں تھا لیکن چونکہ ان کی صف میں شامل ہو گیا تھا اور اس

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)۔

نے اللہ کی اتنی عبادت کی تھی کہ مقرب خدا فرشتوں کے مقام تک جا پہنچا تھا لہٰذا جب آدم کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو وہ بھی شامل تھا۔ اسی لیے آیاتِ قرآن میں اس کی نافرمانی کا ذکر استثناء کی صورت میں آیا ہے نیز خطبہ قاصعہ میں اسے "ملک" مجازی طور پر کہا گیا ہے (غور کیجئے گا)۔

"عیون الاخبار" میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے:

سب فرشتے معصوم ہیں اور لطف پروردگار سے کفر اور برائیوں سے محفوظ ہیں۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا:

تو کیا ابلیس فرشتہ نہیں تھا؟

امامؑ نے فرمایا:

نہیں وہ جنوں میں سے تھا۔ کیا تُو نے اللہ کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ وہ فرماتا ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ

جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا اور وہ جنوں میں سے تھا[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ امام صادق علیہ السلام کے ایک خاص صحابی کہتے ہیں:

میں نے امامؑ سے ابلیس کے بارے میں استفسار کیا کہ کیا وہ فرشتوں میں سے تھا؟

آپؑ نے فرمایا:

نہیں وہ تو جنوں میں سے تھا لیکن فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا اور اس طرح سے ان کے ساتھ تھا کہ وہ (اس کی عبادت اور قرب الٰہی کے سبب) سمجھتے تھے کہ وہ انہی کی نوع میں سے ہے لیکن خدا جانتا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ جس وقت سجدے کا حکم ہوا تو یہ بات ظاہر ہوئی (پردے ہٹ گئے اور ابلیس کی ماہیت و حقیقت آشکار ہوگئی)[2]

ابلیس اور شیطان کے بارے میں ہم نے سورہ اعراف کی آیت ۱۱ تا ۱۸ ـــــ (تفسیر نمونہ ج ۴ ص ۴۸ اُردو ترجمہ) اور سورہ انعام کی آیت ۱۱۲ (تفسیر نمونہ ج ۳ ص ۴۶۸ اردو ترجمہ) اور سورہ بقرہ کی آیت ۳۴ (تفسیر نمونہ جلد اوّل ص ۱۶۲ اُردو ترجمہ) کے ذیل میں ـــــ تفصیلی بحث کی ہے۔

۲۔ گمراہوں کو تعاون کی دعوت نہیں دینا چاہیئے: زیرِ نظر آیات میں اللہ کے بارے میں گفتگو ہے اور گمراہوں میں سے اس کے لیے یاور و مددگار کی نفی کی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اصولی طور پر اللہ کسی معین و مددگار کا محتاج نہیں چاہے کوئی گمراہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ سب کے لیے ایک عظیم درس ہے کہ اجتماعی

---

[1] و [2] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۶۷۔

کاموں میں ہمیشہ ایسے لوگوں کی مدد حاصل کی جائے کہ جو خود بھی حق و عدالت کے راستے پر ہوں اور طلب اعانت کرنے والا بھی صحیح راستے کے لیے مدد چاہے۔ ہم نے بہت دیکھا ہے کہ نیک افراد نے معاونین کے انتخاب کے وقت صحیح توجہ نہیں دی جس کے نتیجے میں بہت سی مشکلات، ناکامیوں اور انحراف سے دوچار ہوئے ہیں۔ انہیں گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں نے گھیر لیا ہے اور یہ لوگ ان کے کام کو تباہی کی طرف لے گئے ہیں۔ آخرکار ایسے لوگوں نے ان کا سب کچھ برباد کر دیا ہے۔

واقعہ کربلا میں ہے کہ دورانِ راہ سرورِ شہیداں حضرت امام حسین علیہ السلام کی ملاقات عبیداللہ بن حر بن یزید سے ہوگئی۔ امامؑ، عبیداللہ سے ملنے کے لیے گئے تو اس نے آپؑ کا بہت احترام کیا لیکن جب امامؑ نے اسے مدد کی دعوت دی تو اُس نے قسم کھا کر کہا کہ مَیں تو کوفے سے اسی لیے نکلا ہوں کہ اس جنگ سے کنارہ کش ہو جاؤں۔

اُس نے مزید کہا: مَیں جانتا ہوں کہ اگر ان لوگوں سے آپؑ نے جنگ کی تو سب سے پہلے آپؑ ہی مارے جائیں گے۔ البتہ مَیں یہ تلوار اور گھوڑا آپؑ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

امامؑ نے اس سے منہ پھیر لیا اور فرمایا:

جب تُو اپنی جان بچاتا ہے تو ہمیں تیرے مال کی ضرورت نہیں۔

پھر آپؑ نے اس آیت کی تلاوت کی:

وما کنت متخذ المضلین عضدًا

یہ اس طرف اشارہ تھا کہ تُو گمراہ اور گمراہ کنندہ ہے لہٰذا تُو اس قابل نہیں کہ تیرا یہ تعاون قبول کیا جائے۔[1] بہرحال دوست اور مددگار کا نہ ہونا بُرے لوگوں سے مدد لینے اور انہیں اپنے گرد جمع کر لینے سے بہتر ہے۔

---

[1] نورالثقلین جلد ۳ صفحہ ۲۶۸

(۵۴) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ○

(۵۵) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ○

(۵۶) وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ○

ترجمہ

(۵۴) اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثال بیان کی ہے لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

(۵۵) ہدایت آجانے کے بعد انسانوں کے ایمان لانے اور اپنے رب سے طلب مغفرت میں اس کے سوا کیا امر مانع ہے کہ وہ بھی گزشتہ لوگوں کے سے انجام کے منتظر ہیں یا یہ کہ عذاب الٰہی کو دیکھنے کے منتظر ہیں۔

(۵۶) اور ہم نے رسولوں کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کفار حق کو نیچا دکھانے اور ہماری ان آیتوں اور سزاؤں کا مذاق اڑانے کیلئے جھگڑتے رہتے ہیں۔

تفسیر

گویا وہ عذاب کے منتظر ہیں

ان آیات میں گویا گزشتہ اور آئندہ کی بحثوں کا نتیجہ پیش کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثال بیان کی ہے۔ (ولقد صرفنا فی ھٰذا القراٰن للناس من کل مثل)۔

گزشتہ لوگوں کی ہلا کر رکھ دینے والی تاریخ کے مختلف نمونے ہم نے پیش کیے ہیں۔ ہم نے ان کی زندگی کے دردناک واقعات اور تلخ و شیریں باتیں لوگوں کو بتائی ہیں اور مسائل کو ایسی نچلی سطح پر بیان کیا گیا ہے کہ آمادہ دل حق کو قبول کرلیں اور باقی لوگوں کے لیے اتمام حجت ہوجاتے اور کسی ابہام کی گنجائش باقی نہ رہے۔

لیکن اس کے باوجود سرکش لوگ بالکل ایمان نہ لاتے کیونکہ "انسان سب سے بڑھ کر جھگڑالو ہے" (وکان الانسان اکثر شیء جدلا)۔

"صرفنا" "تصریف" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے تبدیل کرنا، دگرگوں کرنا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا۔ زیر بحث آیت میں اس لفظ کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے مختلف انداز میں اور ہر اس پیرائے جس میں تاثیر کا امکان تھا لوگوں سے گفتگو کی ہے۔

"جدل" اس گفتگو کو کہتے ہیں کہ جو جھگڑے اور دوسرے پر تسلط حاصل کرنے کے لیے ہو۔ لہٰذا "مجادلہ" دو آدمیوں کی آپس میں تو تکرار اور کھینچا تانی کو کہتے ہیں جیسا کہ راغب نے کہا ہے: یہ لفظ "جدلت الحبل" (رسی کو مضبوطی سے بٹ دیا) سے لیا گیا ہے۔ گویا جو شخص اس انداز سے بات کرتا ہے وہ مد مقابل کے افکار کو زبردستی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "جدال" دراصل کشتی لڑنے اور دوسرے کو زمین پر پٹخنے کے معنی میں ہے اور یہ لفظ لفظی اور زبانی جھگڑوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال یہاں انسانوں سے مراد غیر تربیت یافتہ انسان ہیں۔ اس کی نظیر قرآن میں بہت ہے اس سلسلے میں تفصیلی بحث ہم سورہ یونس کی آیت ۱۲ کے ذیل میں کر آئے ہیں (نمونہ، جلد ۵ ص ۱۴۵ اردو ترجمہ)۔

اگلی آیت میں ہے: ایسی طرح طرح کی مثالیں پیش کی گئیں، ہلا دینے والے واقعات بیان کیے گئے اور منطق و دلیل سے بات کی گئی۔ جس انسان کا دل صاف ہے اس پر ان چیزوں کو ضرور اثر کرنا چاہیئے پھر بھی بہت سے ایسے گروہ ہیں کہ جو ایمان نہیں لاتے۔ "ہدایت الٰہی آجانے کے بعد ایمان اور طلب مغفرت میں لوگوں کو سوائے اس کے کونسا امر مانع تھا کہ وہ گزشتہ لوگوں کے سے انجام کے منتظر تھے" (وما منع

الناس ان یؤمنوا اذ جاءھم الھدٰی ویستغفروا ربھم الا ان تأتیھم سنۃ الاولین)۔

اور یا پھر وہ اس بات کے منتظر تھے کہ عذابِ الٰہی کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں (او یأتیھم العذاب قبلًا) [1]

یہ آیت درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم اور مغرور لوگ ہرگز اپنے ارادے اور رغبت سے ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ صرف دو صورتوں میں ایمان لائیں گے۔ پہلی یہ کہ جیسے گزشتہ قوموں کو عذاب نے آگھیرا تھا اسی طرح انہیں بھی آگھیرے اور دوسری یہ کہ کم ازکم یہ عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اور ایسے اضطراری ایمان کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ ایسی قوموں کو ہرگز ایسا کوئی انتظار نہ تھا بلکہ ان کی کیفیت ایسی تھی کہ گویا وہ اس انتظار میں ہوں اور یہ ایک قسم کا خوبصورت کنایہ ہے۔ جیسے ہم کسی سرکش آدمی سے کہیں کہ تُو تو بس یہ چاہتا ہے کہ تجھے سزا ملے یعنی تجھے بہرحال سزا ملے گی اور تُو گویا سزا کے انتظار میں ہے۔

بہرحال سرکش اور مغرور انسان کبھی اس حالت کو جا پہنچتا ہے کہ وحیِ آسمانی، انبیاء کی مسلسل تبلیغ معاشرتی زندگی کے عبرت ناک درس اور گزشتہ لوگوں کی تاریخ ــــ کوئی چیز بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ صرف خدا کی لاٹھی ہی سے اس کی عقل ٹھکانے آسکتی ہے لیکن نزولِ عذاب کے وقت تو توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور پھر لوٹ آنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

اس کے بعد مخالفین کی ہٹ دھرمی کے مقابلے میں پیغمبر اکرمؐ کی تسلی اور دلجوئی کے لیے فرمایا گیا ہے:

تیری ذمہ داری تو صرف بشارت اور انذار ہے۔ ہم نے انبیاء و مرسلین کو بشارت و انذار کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے نہیں بھیجا (وما نرسل المرسلین الا مبشرین ومنذرین)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ایسے لوگ مخالفت کرنے لگیں اور مذاق اڑائیں۔ کافر اور ہٹ دھرم لوگ ہمیشہ غلط طور پر جھگڑتے رہے ہیں، اس زعم میں کہ حق کو ختم کر دیں اور قیامت و عذاب کے بارے میں ہماری آیتوں کا مذاق اڑائیں (ویجادل الذین کفروا بالباطل لیدحضوا بہ الحق واتخذوا اٰیاتی وما انذروا ھزوًا) [2]

---

[1] "قبیل" مقابلہ اور سامنے کے معنی میں ہے یعنی عذابِ الٰہی کو وہ اپنے مقابلے اور سامنے دیکھیں۔ طبرسی نے مجمع البیان میں، ابوالفتوح نے روح الجنان میں اور آلوسی نے روح المعانی میں یہی احتمال ذکر کیا ہے کہ "قبیل" کی جمع "قبل" عذاب کی مختلف نوعیتوں کی طرف اشارہ ہے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[2] "یدحضوا" "ادحاض" کے مادہ سے ابطال اور زائل کرنے کے معنی میں ہے اور اصل میں یہ "دحض" سے لیا گیا ہے کہ جو لغزش کے معنی میں ہے۔

یہ آیت درحقیقت سورہ حج کی آیات ۴۲ تا ۴۵ کے مشابہ ہے۔ان میں ہے :

وَاِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کَذَّبَتْ قَبْلَھُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۔۔۔۔

اگر انہوں نے تیری تکذیب کی ہے تو تجھ سے پہلے قوم نوح ، عاد اور ثمود نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی ہے ۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انبیاء جبر و اکراہ سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کی ذمہ داری بشارت و انذار ہے ۔آخری ارادہ خود لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے تاکہ وہ کفر و ایمان کے انجام کے بارے میں سوچ سمجھ لیں اور اپنے آزادانہ ارادے سے ایمان لائیں نہ یہ کہ عذاب الٰہی کو سامنے پاکر اضطراری طور پر اظہارِ ایمان کریں ۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آزادی و اختیار کہ جو وسیلۂ تکامل ہے اس سے زیادہ تر غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے اور طرفدارانِ باطل نے ہمیشہ حق سے جھگڑا کیا ہے ۔کبھی مغالطے پیدا کر کے اور کبھی مذاق اڑا کر انہوں نے چاہا ہے کہ دینِ حق کو ختم کر دیں لیکن جن کے دلوں کے دریچے حق کے لیے کھلے تھے انہوں نے حمایتِ حق میں قیام کیا اور حق و باطل کی یہ جنگ پوری تاریخ میں جاری رہی ہے ۔

۵۷ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ○

۵۸ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ○

۵۹ وَتِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ○

ترجمہ

۵۷ ان سے بڑھ کر کون ظالم ہے کہ جنہیں پروردگار کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے اپنے ہاتھ سے کیا ہوتا ہے اسے بھول جاتے ہیں۔ ان کے دلوں پر ہم نے پردہ ڈال دیا ہے تاکہ وہ کچھ نہ سمجھیں اور ان کے کان ہم نے بھاری کر دیے ہیں (تاکہ انہیں آوازِ حق سنائی نہ دے) یہی وجہ ہے کہ اگر تم انہیں ہدایت کی طرف پکارو گے تو وہ ہرگز ہدایت حاصل نہیں کریں گے۔

۵۸ اور تیرا رب بخشنے والا اور صاحبِ رحمت ہے اگر وہ انہیں ان کے

اعمال کی سزا دینا چاہتا تو ان کے لیے فوراً عذاب بھیج دیتا لیکن ان کے لیے ایک وعدہ گاہ ہے جہاں پہنچنے سے وہ رہ نہیں سکتے۔

(۵۹) یہ قریے اور آبادیاں (جنہیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو) وہ ہیں کہ جب انھوں نے ظلم کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا (اور پھر بھی) ان کی ہلاکت کے لیے ہم نے میعاد مقرر کر دی۔

تفسیر

عذابِ الٰہی میں جلدی نہیں ہوسکتی

گزشتہ آیات میں تاریک دل متعصب کافروں کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ نظر آیات میں بھی وہی سلسلۂ گفتگو جاری ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ان سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے کہ جنہیں ان کے رب کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں (ومن اظلم ممن ذکر بآیات ربه فاعرض عنها ونسی ما قدمت یداه)۔

لفظ "تذکر" (یاد دلانی) گویا اس طرف اشارہ ہے کہ انبیاء کی تعلیمات حقائق کی یاد آوری کی طرح ہیں۔ گویا یہ تعلیمات روحِ انسانی کی گہرائیوں میں موجود ہوتی ہیں اور انبیاء کا کام ان کے چہرے سے پردہ ہٹانا ہے۔ یہی مفہوم نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں بھی ہے:

لیستادوهم میثاق فطرته ویذکروهم منسی نعمته ویحتجوا الیهم بالتبلیغ ویثیروالهم دفائن العقول

انبیاء کی بعثت کا ہدف یہ تھا کہ وہ انسانوں کو عہدِ فطرت پورا کرنے پر ابھاریں، انہیں خدا کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں، تبلیغ کے ذریعے ان پر اتمامِ حجت کریں اور عقل کے پنہاں خزانے آشکار کریں۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ ان دل کے اندھوں کو تین طرح سے بیداری کا درس دیا گیا ہے۔

اوّل: یہ کہ یہ حقائق تمہاری فطرت، وجدان اور روح سے مکمل آشنائی رکھتے ہیں۔

دوم: یہ کہ تمہارے رب کی طرف سے ہیں۔

سوم: یہ کہ یہ نہ بھول جاؤ کہ تم نے بہت سی غلطیاں کی ہیں اور انبیاء کی تعلیم کا مقصد ان کے اثرات کو دُور کرنا ہے۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے "کیونکہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے گرا دیئے ہیں تاکہ وہ سمجھ نہ پائیں اور ان کے کان بوجھل کر دیئے ہیں تاکہ وہ آوازِ حق سن نہ سکیں" (انا جعلنا علٰی قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ و فی اٰذانھم وقرا)[1]

یہی وجہ ہے کہ "اگر تم انہیں حق کی طرف پکارو تو وہ ہرگز ہدایت قبول نہیں کریں گے" (وان تدعھم الی الھدٰی فلن یھتدوا اذًا ابدًا)۔

شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ اگر اللہ نے قوتِ ادراک اور قوتِ سماعت چھین لی ہے تو اس کی وجہ ہے "ما قدمت یداہ" (ان کے وہی اعمال جو انہوں نے خود کیے ہیں) اور یہ سزا خود انہی کے اعمال کا سیدھا نتیجہ ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں ان کے وہی بُرے اور شرمناک اعمال ہی ان کے دلوں پر پردے اور اُن کے کانوں کے لیے بوجھل پن میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا ذکر قرآن کی بہت سی آیات میں ہے۔

مثلاً سورہ نساء کی آیت ۱۵۵ میں ہے:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے لہٰذا بہت کم لوگ ایمان لانے والے ہیں۔

لیکن کچھ لوگ اسلام کو مکتبِ جبر و اکراہ ثابت کرنے کے لیے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے زیرِ بحث آیت کے دوسرے جملوں کو نظر میں نہیں رکھا اور اس کی تفسیر کرنے والی دیگر آیتوں کو بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے اس کے ایک حصّے کے ظاہری لفظی معنی کا سہارا لے کر اپنا نقطۂ نظر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ جیسے ہم نے بیان کیا ہے اس اشکال کا جواب پوری طرح واضح ہے۔

خدا کا تربیتی پروگرام ایسا ہے کہ وہ بغیر مہلت اور موقع دیئے ظالم بادشاہوں کی طرح فوراً سزا نہیں دیتا۔ اس کی وسیع رحمت کا تقاضا ہے کہ گنہ گاروں کو زیادہ سے زیادہ مہلت دی جائے اور اصلاح کا موقع دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: تیرا رب بخشنے والا اور صاحبِ رحمت ہے (و ربك الغفور ذوالرحمۃ)۔

---

[1] جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں "اکنۃ" "کنان" (بروزن "کتاب") کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے پردہ یا وہ چیز جو چھپا دینے والی ہو اور "وقر" کان کے بوجھل پن اور کم سننے کے معنی میں ہے۔

اگر وہ انہیں سزا دینا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا (لو یؤاخذھم بما کسبوا لعجل لھم العذاب)۔
لیکن ان کے لیے ایک میعاد مقرر ہے کہ جب وہ پوری ہوگئی تو پھر وہ بچ کر نہیں جائیں گے (بل لھم موعد لن یجدوا من دونہ موئلاً) [1]

اس کی بخشش کا تقاضا ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں کو بخش دے اور اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ دوسروں کے عذاب میں بھی جلدی نہ کرے، شاید وہ توبہ کرنے والوں میں شامل ہو جائیں لیکن اس کی عدالت کا بھی تقاضا ہے کہ جب سرکشی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر ان کا حساب بے باق کر دے۔ وہ فاسد و مفسد افراد کو جن کی اصلاح کی امید تک باقی نہ رہے اصولی طور پر ایسے لوگوں کی بقا، حکمتِ خلقت کی نظر سے کوئی معنی نہیں رکھتی لہٰذا ان کا خاتمہ ضروری ہے تاکہ زمین ان کے وجودِ ناپاک سے پاک ہو جائے۔

آخر میں ایک اور یاد دہانی ہے۔ آیات کے اس سلسلے کے آخر میں گزشتہ ظالموں کا دردناک انجام یاد دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور یہ آبادیاں کہ جو ویرانوں میں بدل چکی ہیں، جب یہ لوگ ظلم و ستم کے مرتکب ہوتے تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا لیکن اس کے باوجود ہم نے انہیں عذاب کرنے میں جلدی نہیں کی بلکہ ان کی ہلاکت کے لیے ایک میعاد مقرر کی ہے (وتلک القریٰ اھلکنا ھم لما ظلموا و جعلنا لمھلکھم موعداً)۔

---

[1] "موئل" "وئل" (بروزن "سرد") کے مادہ سے لیا، پناہ گاہ اور ذریعۂ نجات کے معنی میں ہے۔

(۶۰) وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ○

(۶۱) فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ○

(۶۲) فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ز لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ○

(۶۳) قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَاۤ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ز وَمَاۤ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ج وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ○

(۶۴) قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ○

ترجمہ

(۶۰) وہ وقت یاد کرو کہ جب موسٰی نے اپنے دوست سے کہا کہ میں تلاش جاری رکھوں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں۔ اگرچہ اس کے لیے مجھے طویل عرصے تک سفر جاری رکھنا پڑے۔

(۶۱) جس وقت وہ ان دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچے تو انہیں اپنی مچھلی کا خیال نہ رہا (کہ جو انہوں نے پکا کر کھانے کیلئے پکڑ رکھی تھی) اور وہ نکل بھاگی۔

(۶۲) آگے جاکر موسیٰ نے اپنے ہمسفر دوست سے کہا: لاؤ ہمارا کھانا لے آؤ، ہم اس سفر سے بہت تھک گئے ہیں۔

(۶۳) اُس نے کہا آپ کو یاد ہے کہ جب ہم نے اس پتھر کے پاس پناہ لی (اور آرام کیا) تو میں مچھلی کے بارے میں بتانا بھول گیا تھا اور یہ بات شیطان نے میرے ذہن سے نکال دی تھی اور مچھلی عجیب طریقے سے دریا کی طرف چلتی بنی۔

(۶۴) (موسیٰ نے) کہا: اسی کو تو ہم ڈھونڈھ رہے تھے۔ پھر وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اسی راستے سے واپس آئے۔

تفسیر

خضرؑ اور موسیٰؑ کی حیرت انگیز داستان

مفسرین نے ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ کچھ اہلِ قریش رسول اللہؐ کی خدمت میں آئے۔ انہوں نے آپؐ سے اس عالم کے بارے میں سوال کیا کہ حضرت موسیٰؑ کو جس کی پیروی کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ آیات اسی ضمن میں نازل ہوئی ہیں۔

اصولی طور پر اس سورت کہف میں تین واقعات بیان ہوئے ہیں۔ یہ تینوں ایک لحاظ سے ہم آہنگ ہیں۔ پہلا واقعہ اصحابِ کہف کا ہے، جو گزر چکا ہے دوسرا زیرِ نظر ہے یعنی حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کی داستان ہے۔ تیسرا واقعہ ذوالقرنین کے بارے میں ہے جو بعد میں آئے گا۔

یہ تینوں واقعات ہمیں ہماری اس محدود زندگی سے باہر نکال لیتے ہیں جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ یہ واقعات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ جہان اسی میں محدود نہیں کہ جو کچھ ہمیں لگتا ہے اور نہ ہی واقعات کی حقیقت بس وہی ہے جو ہمیں معلوم ہوتی ہے یا جو ہم سمجھتے ہیں۔

بہر حال اصحابِ کہف کا واقعہ ایسے جوانمردوں کی کہانی ہے کہ جنہوں نے اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے ہر چیز کو ٹھوکر مار دی۔

حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کہ جو اس زمانے کے بڑے عالم تھے ان کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ یہ واقعہ نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کہ جو اپنے ماحول کے آگاہ ترین اور عالم ترین فرد تھے، بعض

پہلوؤں سے ان کا علم بھی محدود تھا لہٰذا وہ استاد کی تلاش میں نکلے تا کہ اس سے درس لیں ۔ استاد نے بھی ایسے درس دیئے کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے سے عجیب تر ہے ۔ اس داستان میں بہت سے اہم نکات پوشیدہ ہیں ۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے : وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے دوست اور ساتھی جوان سے کہا کہ میں تو کوشش جاری رکھوں گا جب تک "مجمع البحرین" تک نہ پہنچ جاؤں ، اگرچہ مجھے یہ سفر لمبی مدت تک جاری رکھنا پڑے (واذ قال موسیٰ لفتٰہ لا ابرح حتیٰ ابلغ مجمع البحرین او امضی حقبًا) ۔

اس آیت میں "موسیٰ" سے مراد بلا شبہ وہی مشہور اولوالعزم پیغمبر حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں بعض مفسرین نے اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ یہاں کوئی اور موسیٰ مراد ہے ۔ ہم بعد میں اس سلسلے میں وضاحت کریں گے کہ اس احتمال کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ مفسرین اس واقعے سے ابھرنے والے چند سوالات کا جواب تلاش نہیں کر پائے لہٰذا وہ مجبور ہوئے ہیں کہ کوئی اور موسیٰ فرض کریں حالانکہ قرآن نے جہاں کہیں "موسیٰ" کی بات کی ہے وہاں موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہی مراد ہیں ۔

بہت سے مفسرین اور بہت سی روایات کے مطابق آیت میں "فتاہ" سے مراد "یوشع بن نون" ہیں ۔ وہ بنی اسرائیل کے رشید ، شجاع اور باایمان جوانمرد تھے ہو سکتا ہے اُن کے لیے لفظ "فتیٰ" (جوان) انہی برجستہ صفات کی بنا پر ہو یا اس لیے کہ وہ حضرت موسیٰ کی خدمت کرتے تھے ، ان کے ہمراہی اور ہم قدم تھے ۔

"مجمع البحرین" کا مطلب ہے دو دریاؤں کا سنگم ۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ "بحرین" سے یہاں کون سے دو دریا ہیں ۔ اس سلسلے میں تین مشہور نظریے ہیں :

۱ ۔ خلیج عقبہ اور خلیج سویز کے ملنے کی جگہ ــــ ہم جانتے ہیں کہ بحیرہ احمر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ۔ ایک حصہ شمال مشرق کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور دوسرا شمال مغرب کی طرف ، پہلے حصے کو خلیج عقبہ کہتے ہیں اور دوسرے کو خلیج سویز اور یہ دونوں خلیجیں جنوب میں پہنچ کر آپس میں مل جاتی ہیں اور پھر بحیرہ احمر اپنا سفر جاری رکھتا ہے ۔

۲ ۔ اس سے بحرِ ہند اور بحیرہ احمر کے ملنے کی طرف اشارہ ہے کہ جو باب المندب پر جا ملتے ہیں ۔

۳ ۔ یہ بحیرہ روم اور بحرِ اطلس کے سنگم کی طرف اشارہ ہے کہ جو شہر طنجہ کے پاس جبل الطارق کا تنگ دہانہ ہے ۔

تیسری تفسیر تو بہت ہی بعید نظر آتی ہے کیونکہ حضرت موسیٰ جہاں رہتے تھے وہاں سے جبل الطارق کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ اُس زمانے میں حضرت موسیٰ اگر عام راستے سے وہاں جاتے تو کئی ماہ لگ جاتے ۔

دوسری تفسیر میں جس مقام کی نشاندہی کی گئی ہے اس کا فاصلہ اگرچہ نسبتاً کم بنتا ہے لیکن اپنی حد تک وہ بھی زیادہ ہے کیونکہ شام سے جنوبی یمن کا فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے۔

پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت موسٰی علیہ السلام جہاں رہتے تھے وہاں سے یعنی شام سے خلیج عقبہ تک کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ویسے بھی زیر نظر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ نے کوئی زیادہ سفر طے نہیں کیا تھا اگرچہ وہ مقصد تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ سفر کے لیے بھی تیار تھے (غور کیجئے گا)۔

بعض روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ نظر آتا ہے۔

لفظ "حقب" "عرصہ دراز" کے معنی میں ہے۔ بعض نے اس کی ۸۰ سال سے تفسیر کی ہے۔ اس لفظ سے حضرت موسٰیؑ کا مقصد یہ تھا کہ مجھے جس کی تلاش ہے میں اسے ڈھونڈھ کے رہوں گا چاہے اس مقصد کے لیے مجھے سالہا سال تک سفر جاری رکھنا پڑے۔

جو کچھ سطور بالا میں کہا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ کو کسی نہایت اہم چیز کی تلاش تھی۔ وہ اس کی جستجو میں در بدر پھر رہے تھے۔ وہ عزم بالجزم اور پختہ ارادے سے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ جب تک اپنا مقصود نہ پالیں چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

حضرت موسٰیؑ جس کی تلاش پر مامور تھے اس کا آپ کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہوا اور اس نے آپ کی زندگی کا نیا باب کھول دیا — جی ہاں! وہ ایک مرد عالم و دانشمند کی جستجو میں تھے — ایسا عالم کہ جو حضرت موسٰیؑ کی آنکھوں کے سامنے سے بھی حجاب ہٹا سکتا تھا اور انہیں نئے حقائق سے روشناس کروا سکتا تھا اور ان کے لیے علوم و دانش کے تازہ باب کھول سکتا تھا۔

ہم اس سلسلے میں جلد پڑھیں گے کہ اس عالم بزرگ کی جگہ معلوم کرنے کے لیے حضرت موسٰیؑ کے پاس ایک نشانی تھی اور وہ اس نشانی کے مطابق ہی چل رہے تھے۔

بہرحال جس وقت وہ ان دو دریاؤں کے سنگم پر جا پہنچے تو ایک مچھلی کہ جو ان کے پاس تھی اسے بھول گئے (فلما بلغا مجمع بینھما نسیا حوتھما)۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی اور چلتی بنی (فاتخذ سبیلہ فی البحر سربًا)[1]

یہ مچھلی جو ظاہراً ان کے پاس غذا کے طور پر تھی — کیا بھُونی ہوئی تھی اور اسے نمک لگا ہوا تھا یا یہ تازہ مچھلی تھی کہ جو معجزانہ طور پر زندہ ہو کر اچھل کر پانی میں جا کر تیرنے لگی — اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

---

[1] جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "سرب" (بروزن "جرب") نشیب کی طرف جانے کے معنی میں ہے اور "سرب" (بروزن "حرب") نشیبی راستے کے معنی میں ہے۔

بعض کتب تفاسیر میں یہ بھی ہے کہ اس علاقے میں آب حیات کا چشمہ تھا۔ اس کے کچھ قطرات مچھلی پر پڑ گئے جس سے مچھلی زندہ ہوگئی۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ مچھلی ابھی پوری طرح مری نہ تھی کیونکہ بعض مچھلیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پانی سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک نیم جاں صورت میں رہتی ہیں اور اس مدت میں پانی میں گر جائیں تو ان کی معمول کی زندگی پھر شروع ہو جاتی ہے۔

آخر کار موسیٰ اور ان کے ہمراہی دو دریاؤں کے سنگم سے آگے نکل گئے تو لمبے سفر کے باعث انہیں خستگی کا احساس ہوا اور بھوک بھی ستانے لگی۔ اس وقت موسیٰ کو یاد آیا کہ غذا تو ہم ہمراہ لائے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے ہمسفر دوست سے کہا ہمارا کھانا لائیے۔ اس سفر نے تو بہت تھکا دیا ہے (فلما جاوزا قال لفتٰه اٰتنا غدائنا لقد لقینا من سفرنا هٰذا نصبًا)۔

"غداء" ناشتے کو یا دوپہر کے کھانے کو کہتے ہیں لیکن کتب لغت میں جو تعبیرات آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں "غداء" صرف اس کھانے کو کہتے تھے جو دن کی ابتداء میں کھایا جاتا تھا کیونکہ یہ لفظ "غدوة" سے لیا گیا جو دن کے آغاز کے معنی میں ہے جبکہ موجودہ عربی زبان میں "غداء" اور "تغدی" دن یا دن کے کھانے کو کہتے ہیں۔

بہرحال یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع نے اتنا راستہ طے کر لیا تھا کہ جس پر سفر کا اطلاق ہوتا تھا لیکن یہی تعبیرات نشاندہی کرتی ہیں کہ سفر کچھ زیادہ طولانی نہ تھا۔

اس وقت ان کے ہمسفر نے انہیں خبر دی کہ آپ کو یاد ہے کہ جب ہم نے اس پتھر کے پاس پناہ لی تھی (اور آرام کیا تھا) تو مجھے مچھلی کے بارے میں بتانا یاد نہ تھا اور شیطان ہی تھا جس نے یہ بات مجھے بھلا دی تھی۔ ہوا یہ کہ مچھلی نے بڑے حیران کن طریقے سے دریا کی راہ لی اور پانی میں چلتی بنی (قال اَرءیت اذ اوینا الی الصخرة فانی نسیت الحوت وما انسانیه الا الشیطان ان اذکره واتخذ سبیله فی البحر عجباً)[1]

یہ معاملہ چونکہ موسیٰ کے لیے اس عالم بزرگ کو تلاش کرنے کے لیے نشانی کی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا موسیٰ نے کہا: یہی تو ہمیں چاہیئے تھا اور یہی چیز تو ہم ڈھونڈتے پھرتے تھے (قال ذٰلك ما کنا نبغ)۔

اور اُس وقت وہ تلاش کرتے ہوئے اسی راہ کی طرف پلٹے (فارتدا علیٰ اٰثارهما قصصًا)۔

---

[1] "وما انسانیه الا الشیطان ان اذکره" یہ جملہ معترضہ ہے کہ جو بات کے بیچ میں آگیا ہے۔ یہ جملہ درحقیقت بھول جانے کی علت بیان کر رہا ہے اس لیے درمیان میں آگیا ہے۔ خصوصاً ایسے اشخاص کہ جنہیں کسی بزرگ تر شخصیت کی طرف سے عتاب وخطاب ہو رہا ہو معمولاً وہ علت اصل کو اپنی گفتگو کے بیچ میں جملہ معترضہ کی صورت میں ذکر کر دیتے ہیں تاکہ اعتراض کم ہو جائے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے پیغمبر نسیان کا شکار ہو جائیں کیونکہ قرآن کہتا ہے:

نسیا حوتھما

وہ دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے۔

علاوہ ازیں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ کے ہمسفر نے اپنی بھول کی نسبت شیطان کی طرف کیوں دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ جن مسائل کا تعلق احکام الٰہی اور امور تبلیغی سے نہ ہو یعنی روزمرہ کے عام مسائل ہوں ان میں نسیان ہو جائے (خصوصاً ایسے موقع پر جہاں معاملے کا تعلق آزمائش سے ہو جیسا کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ کے لیے کہا جاتا ہے۔ اس کی تشریح بعد میں آئے گی)[1]

باقی رہا آپ کے ہمسفر کا نسیان کی نسبت شیطان کی طرف دینا۔ تو ممکن ہے یہ اس بناء پر ہو کہ مچھلی کا معاملہ اس عالم بزرگ کو پانے اور اس کی ملاقات سے مربوط تھا اور چونکہ شیطان ہر نیکی میں حائل ہونے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا اس نے چاہا کہ اس ملاقات میں انہیں دیر ہو جائے اور شاید اس کی بنیاد خود یوشع کی طرف سے پڑی ہو کہ اس کام میں جس قدر اہتمام اور احتیاط ضروری تھی وہ انہوں نے نہ کی ہو۔

---

[1] یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہے خصوصاً شیعہ مسلک کے حوالے سے (مترجم)۔

(۶۵) فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ○

(۶۶) قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ○

(۶۷) قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ○

(۶۸) وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ○

(۶۹) قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ○

(۷۰) قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ○

ترجمہ

(۶۵) (وہاں) انہیں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ملا ۔ وہ بندہ کہ جس پر ہم نے اپنی رحمت کی تھی اور جسے ہم نے اپنی طرف سے بہت سا علم دیا تھا۔

(۶۶) موسٰی نے اس سے کہا: مجھے اجازت ہے کہ مَیں آپ کی پیروی کروں تاکہ جو علم آپ کو عطا کیا گیا ہے اور جو باعثِ رشد و صلاح ہے آپ وہ مجھے سکھا دیں۔

(۶۷) اُس نے کہا: تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔

۶۸۔ اور جس چیز کے رموز سے تم آگاہ ہی نہیں ہو تم اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہو؟

۶۹۔ (موسٰی نے) کہا: انشاء اللہ مجھے صابر پاؤ گے اور مَیں کسی امر میں آپ کے حکم کی مخالفت نہیں کروں گا۔

۷۰۔ (خضر نے) کہا: اچھا اگر تم چاہتے ہو تو میرے پیچھے پیچھے آجاؤ اور دیکھو! کسی مسئلے کے بارے میں سوال نہ کرنا یہاں تک کہ مَیں خود (موقع پر) تجھ سے بیان کر دوں۔

تفسیر

عظیم اُستاد کی زیارت

جس وقت موسٰیؑ اور ان کے ہمسفر دوست مجمع البحرین اور پتھر کے پاس پلٹ کر آئے تو اچانک ہمارے بندوں میں سے ایک بندے سے ان کی ملاقات ہوگئی ۔ وہ بندہ کہ جس پر ہم نے اپنی رحمت کی تھی اور جسے ہم نے بہت سے علم و دانش سے نوازا تھا (فوجدا عبدًا من عبادنا اٰتیناہ رحمة من عندنا وعلمناہ من لدنا علمًا)۔

"وجدا" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اسی عالم کی تلاش میں تھے اور آخر کار انہوں نے اسے "پالیا"۔

"عبدًا من عبادنا" (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) ۔ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ انسان کیلئے بہترین اعزاز و اعتماد یہ ہے کہ وہ خدا کا سچا بندہ ہو اور یہ مقام عبودیت ہی ہے کہ جہاں انسان پر رحمتِ الٰہی نازل ہوتی ہے اور علوم کے دریچے اس کے دل کے سامنے کھل جاتے ہیں۔

"من لدنا" کی تعبیر بھی بتاتی ہے کہ اس عالم کا علم معمولی اور عام سا نہیں تھا بلکہ اس جہان کے ایسے اسرار و حوادث کی آگاہی کا ایک حصہ تھا کہ جنہیں صرف خدا جانتا ہے۔

"علمًا" کی تعبیر نکرہ ہے اور نکرہ ایسے مواقع پر عموماً تعظیم کے لیے ہوتا ہے۔ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اس مردِ عالم نے اس علم سے اچھا خاصا حصّہ پایا تھا۔

یہ کہ زیرِ بحث آیت میں "رحمة من عندنا" سے کیا مراد ہے ۔ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں ذکر کی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مقام نبوت کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عمر طولانی

کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد شایان شان استعداد، عظمت روح اور شرح صدر ہو اور یہ خدا کی طرف سے اس جوانمرد کے لیے اس لیے ہو کہ وہ علم الٰہی کے حصول کا اہل ہو سکے۔

یہ کہ اس عالم کا نام "خضر" تھا۔ وہ پیغمبر تھا یا نہیں ___ اس سلسلے میں ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے۔

اس وقت حضرت موسیٰ نے بڑے ادب سے اس عالم بزرگ کی خدمت میں "عرض کیا: کیا مجھے اجازت ہے کہ میں آپ کی پیروی کروں تاکہ جو علم آپ کو عطا کیا گیا ہے اور جو باعث رشد و صلاح ہے، مجھے بھی تعلیم دیں" (قال له موسٰی هل اتبعك علٰی ان تعلمن مما علمت رشدا)۔

"رشدا" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ علم ہدف و مقصد نہیں ہے بلکہ علم تو حصولِ مقصد کا ذریعہ اور خیر و صلاح کے حصول کا وسیلہ ہے ___ ایسا ہی علم قدر و قیمت کا حامل ہے اور استاد سے ایسا ہی علم حاصل کرنا چاہیئے اور یہی علم مایۂ افتخار ہے۔

لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس عالم نے موسیٰ سے کہا: تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکو گے (قال انك لن تستطيع معي صبرًا)۔

ساتھ ہی اس کی وجہ اور دلیل بھی بیان کر دی اور کہا: "تم اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہو جس کے اسرار سے تم آگاہ ہی نہیں" (وكيف تصبر علٰی ما لم تحط به خبرًا)۔

جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے یہ عالم اسرار و حوادث کے باطنی علوم پر دسترس رکھتا تھا جبکہ حضرت موسیٰ نہ باطن پر مامور تھے اور نہ ان کے بارے میں زیادہ آگاہی رکھتے تھے۔

ایسے مواقع پر ایسا بہت ہوتا ہے کہ حوادث کے ظاہر سے ان کا باطن مختلف ہوتا ہے بعض اوقات کسی واقعے کا ظاہر احمقانہ اور ناپسندیدہ ہوتا ہے جبکہ باطن میں بہت مقدس منطقی اور سوچا سمجھا ہوتا ہے۔

ایسے مواقع پر جو شخص ظاہر کو دیکھتا ہے وہ اس پر صبر نہیں کر پاتا اور اس پر اعتراض کرتا ہے یا مخالفت کرنے لگتا ہے لیکن وہ استاد کہ جو اسرارِ دروں سے آگاہ ہے اور معاملے کے باطن پر نظر رکھتا ہے وہ بڑے اطمینان اور ٹھنڈے دل سے کام جاری رکھتا ہے اور اعتراض اور واویلے پر کان نہیں دھرتا بلکہ مناسب موقع کے انتظار میں رہتا ہے تاکہ حقیقتِ امر بیان کرے جبکہ شاگرد بے تاب رہتا ہے لیکن جب اسرار اس پر کھل جاتے ہیں تو اُسے پوری طرح سکون و قرار آجاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ بات سن کر پریشان ہوئے انہیں خوف تھا کہ اس عالم بزرگ کا فیض ان سے منقطع نہ ہو لہٰذا انہوں نے وعدہ کیا کہ تمام امور پر صبر کریں گے اور "کہا انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا" (قال ستجدني ان شاء الله صابرًا ولا اعصي لك امرًا)۔

یہ کہہ کر حضرت موسیٰ نے پھر انتہائی ادب و احترام اور خدا کی حیثیت پر اپنے بھروسے کا اظہار کیا۔

آپ نے اس عالم سے یہ نہیں کہا کہ میں صابر ہوں بلکہ کہتے ہیں: انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔
لیکن چونکہ ایسے واقعات پر صبر کرنا کہ جو ظاہراً ناپسندیدہ ہوں اور انسان جن کے اسرار سے آگاہ نہ ہو کوئی آسان کام نہیں اس لیے اس عالم نے حضرت موسیٰ کو خبردار کرتے ہوئے پھر عہد لیا اور۔ کہا اچھا اگر تم میرے پیچھے پیچھے آنا چاہتے ہو تو دیکھو خاموش رہنا اور کسی معاملے پر سوال نہ کرنا جب تک کہ مناسب موقع پر میں خود تم سے بیان نہ کر دوں (قال فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شیءٍ حتّٰی احدث لك منه ذكرًا)[1]

(۷۱) فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔـا اِمْرًا ○

(۷۲) قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ○

(۷۳) قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِىْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِىْ مِنْ اَمْرِىْ عُسْرًا ○

(۷۴) فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔـا نُّكْرًا ○

(۷۵) قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ○

(۷۶) قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَىْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِىْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّىْ عُذْرًا ○

(۷۷) فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ۨاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ

---

[1] "احدث لك منه ذكرًا" میں لفظ "احدث" کا مفہوم ہے کہ میں خود بات شروع کروں گا اور پہلے خود اس سے پردہ اٹھاؤں گا، تم بات نہ کرنا۔

قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ○

۷۸ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ج سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ○

ترجمہ

۷۱ وہ چل پڑے یہاں تک کہ ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ اس نے کشتی میں سوراخ کر دیا (تو موسیٰ نے) کہا: کیا آپ نے اس میں سوار لوگوں کو غرق کرنے کے لیے اس میں سوراخ کر دیا ہے، واقعاً آپ نے کیسا بُرا کام انجام دیا ہے۔

۷۲ اُس نے کہا: مَیں نے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔

۷۳ (موسیٰ نے) کہا: اس بھول پر میرا مؤاخذہ نہ کریں اور اس امر پر مجھ پر سخت گیری نہ کریں۔

۷۴ پھر وہ چل پڑے یہاں تک کہ ایک بچے کو دیکھا۔ اُس نے اس بچے کو قتل کر دیا۔ (موسیٰ نے) کہا: کیا آپ نے ایک پاک انسان کو قتل کر دیا ہے جبکہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ آپ نے سچ مچ بُرا کام کیا ہے۔

۷۵ اُس (عالم) نے (پھر) کہا: مَیں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہیں کر پاؤ گے۔

۷۶ (موسیٰ نے) کہا: اس کے بعد اگر مَیں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو مجھے ساتھ نہ رکھیے گا کیونکہ پھر میری طرف سے آپ معذور ہوں گے۔

۷۷ وہ پھر چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک بستی کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ان

سے کھانا مانگا لیکن انہوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ (اس کے باوجود) انہوں نے وہاں ایک دیوار دیکھی کہ جو گر رہی تھی (اُس عالم نے) اُس (دیوار) کو کھڑا کر دیا۔ (موسٰی نے) کہا (کم از کم) اس کام کی اجرت ہی لے لیتے۔

(۷۸) اس نے کہا: اب تمہارے اور میرے درمیان جدائی کا وقت آگیا ہے لیکن مَیں جلد تمہیں اس چیز کے راز سے آگاہ کروں گا جس پر تم صبر نہیں کر سکے۔

تفسیر

خدائی معلم اور یہ ناپسندیدہ کام؟

موسٰی اس عالم ربانی کے ساتھ چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک کشتی تک پہنچے اور اس میں سوار ہو گئے (فانطلقا حتّٰی اذا رکبا فی السفینۃ)۔

یہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ اب قرآن تثنیہ کی ضمیر استعمال کرنے لگا ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت موسٰیؑ اور اس عالم بزرگوار کی طرف۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ کے ہمسفر یوشع کی ماموریت اس مقام پر ختم ہو گئی تھی اور وہ یہاں سے پلٹ گئے تھے یا پھر یہ ہے کہ وہ موجود تو تھے لیکن اس معاملے سے ان کا تعلق نہیں تھا لہٰذا انہیں یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال وہ دونوں کشتی پر سوار ہو گئے تو اس عالم نے کشتی میں سوراخ کر دیا (خرقھا)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "خرق" کسی چیز کو بے سوچے سمجھے تباہ کرنے کی نیت سے چیرنے پھاڑنے کے معنی میں ہے اور اس عالم کا کام ظاہری طور پر یوں ہی لگتا تھا۔

حضرت موسٰی علیہ السلام چونکہ ایک طرف تو اللہ کے عظیم نبی بھی تھے لہٰذا انہیں لوگوں کی جان و مال کا محافظ بھی ہونا چاہیئے تھا اور انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی کرنا چاہیئے تھا اور دوسری طرف ان کا انسانی ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس قسم کے غلط کام پر خاموشی اختیار کریں لہٰذا حضرت خضرؑ کے ساتھ ان کا جو معاہدہ ہوا تھا اسے ایک طرف رکھا اور اس کام پر اعتراض کر دیا اور" کہا: کیا آپ نے اہل کشتی کو غرق کرنے کے لیے اس میں سوراخ کر دیا ہے۔ واقعاً آپ نے کس قدر بُرا کام انجام دیا ہے (قال اخرقتھا لتغرق اھلھا لقد جئت شیئًا امرًا)۔

اس میں شک نہیں کہ اس عالم کا مقصد کشتی والوں کو غرق کرنا نہ تھا لیکن اس عمل کا نتیجہ غرق ہونے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا لہٰذا حضرت موسیٰ نے لام غایت کے ساتھ اسی طرف اشارہ کر دیا کیونکہ لام غایت مقصد بیان کرنے کے لیے آتی ہے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ایک شخص بہت کھانا کھاتا جائے تو اُسے کہا جائے کہ کیوں اپنے آپ کو مارنا چاہتے ہو۔ یقیناً اُس کا یہ مقصد تو نہیں کہ اپنے آپ کو مار ڈالے لیکن ہو سکتا ہے اُس کے عمل کا یہی نتیجہ نکلے۔

"اِمْر" (بروزن "شمر") حیرت انگیز اہم کام یا بہت بُرے کام کو کہا جاتا ہے اور یہ کام واقعاً ظاہری طور پر تعجب انگیز اور بہت بُرا ہے۔ واقعاً یہ کام کتنا حیرت انگیز ہے کہ کسی کشتی میں بہت سے مسافر سوار ہوں اور اس میں سوراخ کر دیا جائے۔

بعض روایات میں ہے کہ اہل کشتی جلد ہی متوجہ ہو گئے اور انہوں نے اس سوراخ کو کسی ذریعے سے پُر کر دیا لیکن اب وہ کشتی صحیح نہیں رہ گئی تھی۔

اس وقت اس عالم نے بڑی متانت کے ساتھ موسیٰ پر نگاہ ڈالی اور کہا: مَیں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکو گے (قال الم اقل انك لن تستطيع معي صبرًا)۔

اس واقعے کی اہمیت کے پیشِ نظر حضرت موسیٰ کی عجلت اگرچہ فطری تھی تاہم وہ پشیمان ہوئے۔ انہیں اپنا معاہدہ یاد آیا لہٰذا معذرت آمیز لہجے میں استاد سے کہا: اس بھول پر مجھ سے مؤاخذہ نہ کیجئے اور اس کام پر مجھ پر سخت گیری نہ کیجئے (قال لا تؤاخذني بما نسيت ولا ترهقني من امري عسرًا)۔ یعنی اشتباہ ہو گیا۔ اب وہ وقت گزر گیا ہے آپ اپنی بزرگی کی وجہ سے صرفِ نظر کریں۔

"لا ترهقني" "ارهاق" کے مادہ سے قہر و غلبہ سے کسی چیز کو ڈھانپنے کے معنی میں ہے کبھی یہ تکلیف دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ زیرِ بحث جملے میں مراد یہ ہے کہ مجھ پر سختی نہ کیجئے اور مجھے تکلیف میں نہ ڈالیں اور اس کام کی وجہ سے اپنا فیضِ علم مجھ سے منقطع نہ کریں۔

ان کا دریائی سفر ختم ہو گیا۔ وہ کشتی سے اتر آئے۔ سفر جاری تھا۔ اثنائے راہ میں انہیں ایک بچہ ملا لیکن اس عالم نے کسی تمہید کے بغیر ہی اس بچے کو قتل کر دیا (فانطلقا حتّٰى اذا لقيا غلامًا فقتله)۔

حضرت موسیٰ سے پھر نہ رہا گیا۔ یہ نہایت وحشتناک منظر تھا۔ بلا جواز اور بے وجہ ایک بے گناہ بچے کا قتل، ایسی چیز نہ تھی کہ حضرت موسیٰ خاموش رہ سکتے۔ آپ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے۔ غم و اندوہ اور غصے کا یہ عالم تھا کہ آپ نے پھر اپنے معاہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے اب کے شدید تر اور واضح تر اعتراض کیا۔ یہ واقعہ بھی پہلے واقعے کی نسبت زیادہ وحشتناک تھا۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ نے ایک بے گناہ اور پاک انسان کو قتل کر دیا ہے جبکہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا (قال اقتلت نفسًا زكية بغير نفس)۔

واقعاً آپ نے کیسا بُرا کام انجام دیا ہے (لقد جئت شیئاً نکرًا)۔
لفظ "غلام" جوان نورس کے معنی میں ہے۔ وہ حدِ بلوغ کو پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔
جس نوجوان کو اس عالم نے قتل کیا تھا وہ حدِ بلوغ کو پہنچا ہوا تھا یا نہیں ۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔
بعض نے "نفساً زکیۃ" (پاک اور بے گناہ انسان) کو اس بات کی دلیل قرار دیا ہے کہ وہ بالغ نہیں تھا۔
بعض دیگر نے "بغیر نفس" کی تعبیر کو اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ وہ بالغ تھا کیونکہ قصاص صرف بالغ سے لیا جا سکتا ہے۔
البتہ آیت کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔
"نکر" قبیح اور منکر کے معنی میں ہے ایسے کام کا نتیجہ بھی "امر" سے زیادہ ہے جو کشتی میں سوراخ کرنے کے واقعے کے لیے آیا ہے۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ ان کے پہلے کام نے چند لوگوں کو خطرے میں ڈال دیا تھا اور وہ لوگ جلد ہی متوجہ ہو گئے اور انہوں نے خطرے کو اپنے آپ سے دور کر دیا لیکن دوسرے کام میں ظاہراً وہ ایک جرم کے مرتکب ہوتے تھے۔
اس عالم بزرگوار نے پھر اپنے خاص اطمینان اور نرم لہجے میں وہی جملہ دہرایا: "کہا: مَیں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے" (قال الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبرًا)۔
پہلے اور اس جملے میں فرق یہ ہے کہ اس میں لفظ "لک" کا اضافہ ہے کہ جو مزید تاکید کے لیے ہے یعنی مَیں نے یہ بات خود تم سے کہی تھی۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا عہد یاد آگیا۔ انہیں بہت احساسِ شرمندگی ہو رہا تھا کیونکہ دو مرتبہ یہ پیمان ٹوٹ چکا تھا چاہے بھول کر ہی ایسا ہوا ہو۔ انہیں خیال آ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے استاد کی بات صحیح ہو کہ انہوں نے تو پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ ابتداء میں ان کے کام موسیٰ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوں گے۔
موسیٰ نے پھر عذر خواہی کے لہجے میں کہا کہ اس دفعہ بھی مجھ سے صَرفِ نظر کیجئے اور میری بھول چوک کو نظرانداز کر دیجئے اور "اگر اس کے بعد مَیں آپ کے کاموں کے بارے میں وضاحت کا تقاضا کروں (اور آپ پر اعتراض کروں) تو پھر بے شک مجھے ساتھ نہ رکھیں اور اس صورت میں آپ میری طرف سے معذور ہوں گے"
(قال ان سألتک عن شیءٍ بعدھا فلا تصاحبنی قد بلغت من لدنی عذرًا)۔
یہ جملہ حضرت موسیٰؑ کی انصاف پسندی، بلند نظری اور عالی ظرفی کی حکایت کرتا ہے اور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ایک حقیقت کے سامنے سر جھکا دینے والے تھے اگرچہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔
دوسرے لفظوں میں ـــ تین بار کی آزمائش سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان دونوں کی ماموریت الگ الگ

ہے اور اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔

اس گفتگو اور نئے معاہدے کے بعد "موسیٰؑ اپنے استاد کے ساتھ چل پڑے۔ چلتے چلتے وہ ایک بستی میں پہنچے۔ انہوں نے اس بستی والوں سے کھانا مانگا لیکن بستی والوں نے انہیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا (فانطلقا حتیٰ اذا اتیا اهل قریة استطعما اهلها فابوا ان یضیفوهما)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کوئی ایسے افراد نہ تھے کہ اس بستی کے لوگوں پر بوجھ بننا چاہتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا زاد و توشہ راستے میں کہیں دے بیٹھے تھے یا پھر ختم ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ بستی والوں کے مہمان ہو جائیں (یہ احتمال بھی ہے کہ اس عالم نے جان بوجھ کر لوگوں سے ایسا کہا ہو تاکہ حضرت موسیٰؑ کو ایک اور درس دیا جا سکے)۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ "قریة" قرآن کی زبان میں ایک عام مفہوم رکھتا ہے اور ہر قسم کے شہر اور آبادی کے معنی میں آیا ہے لیکن یہاں خصوصیت سے شہر مراد ہے کیونکہ چند آیات کے بعد اس کے لیے لفظ "المدینہ" آیا ہے۔

بہر حال مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہ شہر کونسا تھا اور کہاں واقع تھا۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ شہر "انطاکیہ" تھا[1]

بعض نے کہا ہے کہ یہاں "ایلہ" شہر مراد ہے کہ جو آج کل "ایلات" نام کی مشہور بندرگاہ ہے اور بحیرہ احمر کے کنارے خلیج عقبہ کے نزدیک واقع ہے۔

بعض دوسروں کا نظریہ ہے کہ اس سے "ناصرہ" شہر مراد ہے کہ جو فلسطین کے شمال میں واقع ہے اور حضرت عیسیٰؑ کی جائے پیدائش ہے۔ مرحوم طبرسی نے اس مقام پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ جو آخری احتمال کی تائید کرتی ہے۔

مجمع البحرین کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سے مراد خلیج عقبہ اور خلیج سویز کا سنگم ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شہر ناصرہ اور بندرگاہ ایلہ اس جگہ سے انطاکیہ کی نسبت زیادہ قریب ہیں۔

بہر صورت جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے استاد کے ساتھ اس شہر میں پیش آیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کے رہنے والے بہت بخیل اور کم ظرف لوگ تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس شہر والوں کے بارے میں ایک حدیث منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] "انطاکیہ" شام کے قدیم شہروں میں سے ہے۔ اس کا فاصلہ حلب سے ۹۶ کلو میٹر ہے اور اسکندرون سے ۵۹ کلو میٹر ہے۔ یہ علاقہ اناج کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ سویدیہ بندرگاہ اسی علاقے میں ہے اور انطاکیہ سے ۲۷ کلو میٹر دور ہے (دائرۃ المعارف فرید وجدی جلد ۱ صفحہ ۵۲۳)۔

کانوا اھل قریۃ لئام

وہ کمینے اور کم ظرف لوگ تھے [1]

قرآن کہتا ہے: اس کے باوجود انہوں نے اس شہر میں ایک گرتی ہوئی دیوار دیکھی تو اس عالم نے اس کی مرمت شروع کر دی اور اسے کھڑا کر دیا (فوجدا فیھا جدارًا یرید ان ینقض فاقامہ) [2]

حضرت موسیٰ اس وقت تھکے ہوئے تھے۔ انہیں بھوک بھی ستا رہی تھی، کوفت الگ تھی۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اس آبادی کے ناسمجھ لوگوں نے ان کی اور ان کے استاد کی ہتک کی ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ اس بے احترامی کے باوجود حضرت خضرؑ اس گرتی ہوئی دیوار کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے جیسے ان کے سلوک کی مزدوری دے رہے ہوں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کم از کم استاد یہ کام اجرت لے کر ہی کرتے تاکہ کھانا تو فراہم ہو جاتا۔

لہٰذا وہ اپنے معاہدے کو پھر بھول گئے۔ انہوں نے پھر اعتراض کیا لیکن اب لہجہ پہلے کی نسبت ملائم اور نرم تھا۔ کہنے لگے: اس کام کی کچھ اجرت ہی لے لیتے: (قال لو شئت لاتخذت علیہ اجرًا)۔

درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سوچ رہے تھے کہ یہ عدل تو نہیں کہ انسان ان لوگوں سے ایثار کا سلوک کرے کہ جو اس قدر فرومایہ اور کم ظرف ہوں۔ دوسرے لفظوں میں نیکی اچھی چیز ہے مگر جب برمحل ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ برائی کے جواب میں نیکی کرنا مردان خدا کا طریقہ ہے لیکن وہاں کہ جہاں بُروں کے لیے بُرائی کی تشویق کا باعث نہ ہو۔ (یعنی وہ "شرافت خور" نہ ہو)۔

اس موقع پر اس عالم بزرگوار نے حضرت موسیٰ سے آخری بات کہی کیونکہ گزشتہ تمام واقعات کی بناء پر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ موسیٰ ان کے کاموں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا فرمایا: "لو اب تمہارے اور میرے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ جلد میں تمہیں ان امور کے اسرار سے آگاہ کروں گا کہ جن پر تم صبر نہ کر سکے" (قال ھٰذا فراق بینی و بینک سأنبئک بتأویل ما لم تستطع علیہ صبرًا)۔

حضرت موسیٰ نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ گزشتہ واقعے میں یہی بات وہ خود تجویز کر چکے تھے یعنی خود حضرت موسیٰ پر یہ حقیقت ثابت ہو چکی تھی کہ ان کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی جدائی کی خبر موسیٰ کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگی۔ ایسے استاد سے جدائی کہ جس کا سینہ مخزن اسرار

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] دیوار کی طرف ارادہ کی نسبت یقینی طور پر مجازی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایسی کمزور اور خستہ ہو چکی تھی کہ گویا اس نے گرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

ہو، جس کی ہمراہی باعثِ برکت ہو اور جس کی ہر بات ایک درس ہو، جس کا طرزِ عمل الہام بخش ہو، جس کی پیشانی سے نورِ خدا ضوفشاں ہو اور جس کا دل علمِ الٰہی کا گنجینہ ہو۔ ایسے رہبر سے جدائی باعث رنج و غم تھی۔ لیکن یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جو موسیٰؑ کو بہرحال قبول کرنا تھی۔

مشہور مفسر ابو الفتوح رازی کہتے ہیں کہ ایک روایت ہے:

لوگوں نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا: آپ کی زندگی میں سب سے بڑی مشکل کونسی تھی؟

حضرت موسیٰؑ نے کہا: مَیں نے بہت سختیاں جھیلی ہیں (فرعون کے دَور کی سختیاں اور پھر بنی اسرائیل کے دَور کی مشکلات کی طرف اشارہ ہے) لیکن کسی مشکل اور رنج نے میرے دل کو اتنا رنجور نہیں کیا جتنا حضرت خضرؑ سے جدائی کی خبر نے [1]

"تأویل" "اَوْل" (بروزن "قول") کے مادہ سے کسی چیز کو لوٹانے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا ہر کام یا بات کو اُس کے اصلی ہدف کی طرف لوٹا دیئے جانے کو تاویل کہتے ہیں اور خواب کی تعبیر کو بھی اسی لیے تاویل کہتے ہیں (جیسا کہ سورہ یوسف کی آیہ ۱۰۰ میں آیا ہے):

هٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ [2]

---

[1] تفسیر ابو الفتوح رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] مزید توضیح کے لیے جلد ۲ تفسیر نمونہ میں سورہ آلِ عمران کی آیہ ۷ کے ذیل میں رجوع کریں۔

(۷۹) اَمَّا السَّفِيۡنَةُ فَكَانَتۡ لِمَسٰكِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ فِى الۡبَحۡرِ فَاَرَدْتُّ اَنۡ اَعِيۡبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمۡ مَّلِكٌ يَّاۡخُذُ كُلَّ سَفِيۡنَةٍ غَصۡبًا ۝

(۸۰) وَاَمَّا الۡغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤۡمِنَيۡنِ فَخَشِيۡنَاۤ اَنۡ يُّرۡهِقَهُمَا طُغۡيَانًا وَّكُفۡرًا ۝

(۸۱) فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيۡرًا مِّنۡهُ زَكٰوةً وَّاَقۡرَبَ رُحۡمًا ۝

(۸۲) وَاَمَّا الۡجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيۡنِ يَتِيۡمَيۡنِ فِى الۡمَدِيۡنَةِ وَكَانَ تَحۡتَهٗ كَنۡزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوۡهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنۡ يَّبۡلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَيَسۡتَخۡرِجَا كَنۡزَهُمَا ۖ رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلۡتُهٗ عَنۡ اَمۡرِىۡ ؕ ذٰ لِكَ تَاۡوِيۡلُ مَا لَمۡ تَسۡطِعْ عَّلَيۡهِ صَبۡرًا ۝

ترجمہ

(۷۹) ہاں وہ کشتی کی بات ۔ تو وہ کچھ مسکین وغریب افراد کی تھی۔ وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اس میں کوئی نقص ڈال دوں (کیونکہ) ایک ظالم بادشاہ ان کے پیچھے تھا کہ جو ہر کشتی کو زبردستی ہتھیا رہا تھا۔

(۸۰) رہا وہ لڑکا ۔ تو اس کے ماں باپ صاحب ایمان تھے۔ ہم نے پسند نہیں کیا

کہ وہ انہیں سرکشی اور کفر پر اکسائے۔

(۸۱) ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے انہیں زیادہ پاک اور زیادہ پُرمحبت اولاد عطا کر دے۔

(۸۲) رہی اُس دیوار کی بات، تو وہ اس شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اس کے نیچے ان کا خزانہ تھا۔ اُن کا باپ نیک اور صالح شخص تھا۔ تیرا رب چاہتا تھا کہ وہ بالغ ہو کر اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تیرے پروردگار کی رحمت تھی۔ مَیں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا اور یہ تھا ان کاموں کا راز کہ جن پر تُو صبر کی تاب نہ رکھتا تھا۔

تفسیر

ان واقعات کا راز

جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا جُدا ہونا طے پا گیا تو ضروری تھا کہ یہ الٰہی استاد اپنے ان کاموں کے اسرار ظاہر کرے کہ حضرت موسیٰؑ جنہیں گوارا نہیں کر پاتے تھے۔ درحقیقت ان سے ہمراہی کا فائدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہی تھا کہ وہ ان تین عجیب واقعات کا راز سمجھ لیں اور یہی راز بہت سے مسائل کی تفہیم کے لیے کلید بن سکتا تھا اور مختلف سوالوں کا جواب اس میں پنہاں تھا۔

حضرت خضرؑ نے کشتی والے واقعے سے بات شروع کی اور کہنے لگے: ہاں، تو وہ کشتی والی بات یہ تھی کہ وہ چند غریب و مسکین افراد کی ملکیت تھی۔ وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے۔ مَیں نے سوچا کہ اس میں کوئی نقص ڈال دوں کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ ایک ظالم بادشاہ ان کے پیچھے ہے اور وہ ہر صحیح سالم کشتی کو زبردستی ہتھیا لیتا ہے (اما السفینة فکانت لمساکین یعملون فی البحر فاردت ان اعیبها و کان وراءهم ملك یأخذ کل سفینة غصباً)۔

گویا کشتی میں سوراخ کرنا ظاہراً تو بُرا لگتا تھا لیکن اس کام میں ایک اہم مقصد پوشیدہ تھا اور وہ تھا کشتی کے غریب مالکوں کو ایک غاصب بادشاہ کے ظلم سے بچانا کیونکہ اس کے نزدیک عیب دار کشتیاں اس کے کام کی نہ تھیں اور ایسی کشتیوں پر وہ قبضہ نہیں جماتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ یہ کام چند مسکینوں کے مفاد کی

حفاظت کے لیے تھا، اور اسے انجام پانا ہی چاہیئے تھا۔

لفظ "وراء" (پیچھے) ۔ یقیناً یہاں مکانی پہلو نہیں رکھتا۔ یہ تعبیر یہاں کنائے کے طور پر آئی ہے اور اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ متوجہ ہوئے بغیر اس ظالم کے چنگل میں پھنس جاتے، اور انسان چونکہ اپنے پس پشت ہونے والے واقعات سے بے خبر ہوتا ہے لہٰذا یہاں یہ تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ میرے قرض خواہ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور مجھے چھوڑتے نہیں۔ سورہ ابراہیم کی آیہ ۱۶ میں ہے:

مِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ٥

اور جہنم اُن کے پیچھے ہے ....

گویا جہنم ان کا تعاقب کر رہی ہے۔ یہاں بھی وہی "وراء" کی تعبیر آئی ہے [1]

ضمناً لفظ "مساکین" سے یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکین وہ شخص نہیں ہے کہ جس کے پاس بالکل کوئی چیز نہ ہو بلکہ ایسے شخص کو بھی مسکین کہا جاتا ہے جس کے پاس اتنا مال ہو کہ جو اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ انہیں مالی حوالے سے "مساکین" نہ کہا گیا ہو بلکہ طاقت کے حوالے سے وہ مسکین اور فقیر ہوں اور عربی زبان میں یہ تعبیر موجود ہے اور یہ مفہوم مسکین کے اصل معنی سے بھی مطابقت رکھتا ہے جس کے مطابق ساکن، کمزور اور ناتواں کو مسکین کہا جاتا ہے۔

نہج البلاغہ میں ہے:

مسکین ابن اٰدم .... تؤلمه البقة و تقتله الشرقة وتنتنه العرقة

بے چارہ فرزند آدم .... مچھر اسے تکلیف پہنچا دیتا ہے۔ تھوڑا سا پانی اس کے گلو میں اٹک جاتا ہے اور پسینہ آجائے تو اس سے بدبو آنے لگتی ہے [2]

اس کے بعد حضرت خضرؑ لڑکے کے قتل کے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ کہتے ہیں: "رہا وہ لڑکا، تو اس کے ماں باپ صاحبِ ایمان تھے۔ ہمیں یہ بات اچھی نہ لگی کہ وہ اپنے ماں باپ کو راہِ ایمان سے بھٹکا دے اور سرکشی و کفر پر ابھارے (واما الغلام فکان ابواه مؤمنين فخشينا ان يرهقهما طغيانا و كفرا)۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں یہ مراد نہیں کہ کافر و سرکش لڑکا اپنے مومن ماں باپ کو منحرف نہ کر دے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشی اور کفر کی وجہ سے اپنے ماں باپ

---

[1] "وراء" کے معنی کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۶ سورہ ابراہیم آیہ ۱۶ کے ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

[2] نہج البلاغہ ۔ کلمات قصار جملہ ۴۱۹۔

کو زیادہ اذیت نہ دے[1] البتہ پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال اس عالم نے اس لڑکے کو قتل کر دیا اور اس لڑکے کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کے ماں باپ کو آئندہ جو ناگوار واقعات پیش آنے والے تھے انہیں اس قتل کی دلیل قرار دیا۔

انشاء اللہ ہم جلد اس داستان کے مختلف نکات پر تفصیلی بحث کریں گے اور حضرت خضرؑ کے تمام کاموں کو احکام الٰہی اور منطقی حوالوں سے دیکھیں گے اور "جرم سے قبل قصاص" والے اعتراض کا جواب دیں گے۔

"خشینا" (ہمیں ڈر تھا کہ ایسا ہوگا) ـــ یہ بہت معنی خیز تعبیر ہے۔ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ وہ عالم اپنے آپ کو لوگوں کے مستقبل کا ذمہ دار سمجھتا تھا اور وہ اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ صاحبِ ایمان ماں باپ اپنی جوان اولاد کے انحراف کی وجہ سے مصیبت سے دوچار ہوں۔

ضمناً یہ بات بھی ہو جائے کہ لفظ "خشینا" (ہمیں خوف ہوا) یہاں "ہمیں اچھا نہ لگا" کے معنی میں آیا ہے کیونکہ علم و قدرت میں، اس مقام کے حامل شخص کے لیے ایسے امور میں خوف و خطر نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں مقصد ناپسندیدہ کام سے بچنا ہے اور انسان اپنی فطرت کی بناء پر ناگوار امور سے بچنا چاہتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ لفظ یہاں "علمنا" (ہم نے جانا) کے معنی میں ہو۔ ابنِ عباس سے بھی اس کا یہی مفہوم منقول ہے ـــ یعنی:

> ہم نے جانا اور ہمیں معلوم ہوا کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہ گیا تو اس کے ماں باپ کو ناگوار واقعہ دیکھنا پڑے گا۔

رہا یہ سوال کہ ایک شخص کے لیے جمع متکلم کی ضمیر کیوں استعمال ہوتی ہے ـــ تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ ـــ

یہ پہلا موقع نہیں کہ ہم قرآن میں ایسی ضمیر دیکھ رہے ہیں۔ قرآن حکیم میں، اس کے علاوہ عربی زبان اور دوسری زبانوں کے محاورات میں بھی بڑے لوگ کبھی گفتگو کرتے وقت جمع کی ضمیر استعمال کرتے ہیں اور یہ عام طور پر اپنے ماتحت افراد کو مختلف کاموں کی انجام دہی کے لیے مامور کرنے اور ایسے ہی دیگر مواقع پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے اور انسان اپنے ماتحت افراد کو۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس کے بدلے زیادہ پاک اور

---

[1] پہلی تفسیر کے مطابق "یرھقہ" کے دو مفعول ہیں۔ پہلا "ھما" اور دوسرا "طغیاناً" اور دوسری تفسیر کی بناء پر "طغیاناً" اور "کفراً" مفعول لاجلہ (مفعول لہ) ہیں۔

زیادہ پُرمحبت اولاد عطا فرمائے (فاردنا ان یبدلهما ربهما خیرًا منه زکوٰة واقرب رحمًا)۔

"اردنا" (ہم نے ارادہ کیا) اور "ربهما" (ان دونوں کا رب) ۔ یہ دونوں یہاں معنی خیز تعبیریں ہیں اور ہم جلد ان کے مقصد سے آگاہ ہو جائیں گے ۔

لفظ "زکوٰة" پاکیزگی اور طہارت کے معنی میں ہے اور اس کا یہاں وسیع مفہوم ہے اور اس میں ایمان اور عملِ صالح بھی شامل ہے ۔ اس میں دینی امور بھی شامل ہیں اور دنیاوی بھی اور شاید یہ تعبیر حضرت موسیٰؑ کا جواب ہو کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ نے "نفس زکیہ" کو قتل کر دیا ہے ۔ حضرت خضرؑ نے جواب میں کہا کہ نہیں وہ پاکیزہ نہ تھا بلکہ ہم چاہتے تھے کہ اللہ اس کی بجائے انہیں پاکیزہ اولاد عطا کرے ۔

مختلف اسلامی کتب میں آنے والی احادیث میں یہ عبارت آئی ہے :

ابدلهما الله به جارية ولدت سبعين نبيًا

اللہ نے اس بیٹے کی جگہ انہیں ایک ایسی بیٹی عطا فرمائی کہ جس کی نسل سے ستّر نبی پیدا ہوئے ۔[1]

آخری زیر بحث آیت میں تیسرے کام یعنی دیوار بنانے کے واقعے کا جواب ہے ۔ اس عالم نے اس واقعے کے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا : رہی دیوار کی بات ۔ تو وہ اس شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی ۔ اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ چھپا ہوا تھا اور ان کا باپ ایک نیک اور صالح شخص تھا (واما الجدار فکان لغلامین یتیمین فی المدینة وکان تحته کنز لهما وکان ابوهما صالحًا)۔

تیرا پروردگار چاہتا تھا کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں (فاراد ربك ان یبلغا اشدهما ویستخرجا کنزهما) ۔ یہ تو تیرے رب کی طرف سے رحمت تھی (رحمة من ربك) اور ان کے نیک ماں باپ کی وجہ سے میں مامور تھا کہ اس دیوار کو تعمیر کروں کہ کہیں وہ گر نہ جائے اور خزانہ ظاہر ہو کر خطرے سے دوچار نہ ہو جائے ۔

آخر میں انہوں نے چاہا کہ حضرت موسیٰؑ کا ہر قسم کا شک دُور ہو جائے اور وہ یقین کر لیں کہ یہ سب کام ایک خاص منصوبے اور ذمہ داری کے تحت تھے ۔ لہٰذا انہوں نے کہا : اور میں نے یہ کام خود سے نہیں کیے بلکہ اللہ کے حکم کے تحت انجام دیئے (وما فعلته عن امری)۔

جی ہاں ! یہ تھے ان کاموں کے راز کہ جن پر صبر کی تم میں تاب نہیں تھی (ذٰلك تاویل ما لم تسطع علیه صبرًا)۔

---

[1] نورالثقلین ج ۳ ص ۲۸۶ و ص ۲۸۷ ۔

چند اہم نکات

۱۔ خضرؑ کی ماموریت تشریعی تھی یا تکوینی؟ یہ وہ اہم ترین مسئلہ ہے جس نے بزرگ علماء کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ تین واقعات کہ جو اس عالم کے ہاتھوں انجام پائے ان پر حضرت موسیٰ نے اعتراض کیا کیونکہ وہ باطنِ امر سے آگاہ نہ تھے لیکن بعد میں استاد نے وضاحت کی تو مطمئن ہو گئے۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعاً کسی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر نقص پیدا کیا جا سکتا ہے، اس بنا پر کہ غاصب اسے لے نہ جائے۔

اور کیا کسی لڑکے کو اس کام پر سزا دی جا سکتی ہے کہ جو وہ آئندہ انجام دے گا۔

اور کیا ضروری ہے کہ کسی کے مال کی حفاظت کے لیے ہم مفت زحمت برداشت کریں۔

ان سوالات کے جواب میں ہمارے سامنے دو راستے ہیں:

پہلا یہ کہ ان امور کو ہم فقہی احکام اور شرعی قوانین کی روشنی میں دیکھیں ـــ بعض مفسرین نے یہی راستہ اختیار کیا ہے۔

انہوں نے پہلے واقعے کو اہم اور اہم تر قوانین پر منطبق سمجھا ہے اور کہا ہے کہ مسلّم ہے کہ ساری کشتی اور پوری کشتی کی حفاظت اہم کام تھا جبکہ جزوی نقص سے حفاظت زیادہ اہم نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں حضرت خضرؑ نے کم نقصان کے ذریعے زیادہ نقصان کو روکا فقہی زبان میں "افسد کو فاسد سے دفع کیا"۔ خصوصاً جبکہ یہ بات ان کے پیشِ نظر تھی کہ کشتی والوں کی باطنی رضامندی انہیں حاصل ہے کیونکہ اگر وہ اصل صورتِ حال سے آگاہ ہو جاتے تو اس کام پر راضی ہو جاتے۔ (فقہی تعبیر کے مطابق حضرت خضرؑ کو اس مسئلے میں "اذنِ فحوی" حاصل تھا)۔

اس لڑکے کے بارے میں مفسرین کا اصرار ہے کہ یقیناً وہ بالغ تھا اور وہ مرتد یا فاسد تھا لہٰذا وہ اپنے موجودہ اعمال کی وجہ سے جائز القتل تھا اور یہ جو حضرت خضرؑ اپنے اقدام کے لیے اس کے آئندہ جرائم کو دلیل بناتے ہیں تو وہ اس بنا پر ہے کہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مجرم نہ صرف یہ کہ اس وقت اس کام میں مبتلا ہے بلکہ آئندہ بھی اس سے بڑھ کر جرائم کا مرتکب ہوگا لہٰذا اس کا قتل قوانینِ شریعت کے مطابق تھا اور وہ اپنے افعال اور خود کردہ گناہوں کی وجہ سے جائز القتل تھا۔

رہا تیسرا واقعہ تو کوئی شخص کسی پر یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ تم دوسرے کے لیے کیوں ایثار کرتے ہو اور اس کے اموال کو بچانے کے لیے کیوں بیگار اٹھاتے ہو۔ ہو سکتا ہے یہ ایثار واجب نہ ہو لیکن مسلّم ہے کہ یہ اچھا کام ہے اور لائقِ تحسین ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ بعض مواقع پر سرحدِ وجوب تک پہنچ جائے۔ مثلاً کسی یتیم بچے کا بہت سا مال ضائع ہو رہا ہو اور تھوڑی سی زحمت کر کے اسے بچایا جا سکے تو بعید نہیں ہے کہ ایسے

موقع پر کام واجب ہو۔

دوسرا راستہ اس بنیاد پر ہے کہ مذکورہ بالا توضیحات اگرچہ خزانے اور دیوار کے بارے میں لائق اطمینان ہوں لیکن جو جوان مارا گیا اس کے بارے میں مذکورہ وضاحتیں ظاہر آیت سے مناسبت نہیں رکھتیں کیونکہ اس کے قتل کا جواز ظاہراً اس کے آئندہ کا عمل قرار دیا گیا ہے نہ کہ موجودہ عمل۔

کشتی کے بارے میں بھی مذکورہ وضاحت کسی حد تک قابلِ بحث ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی اور راہ اختیار کی جائے اور وہ یہ ہے:

اسی جہان میں ہمیں دو نظاموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ایک نظامِ تکوین ہے اور دوسرا نظامِ تشریع۔ یہ دونوں نظام اگرچہ کلی اصول میں تو ہم آہنگ ہیں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جزئیات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش خوف، اموال و ثمرات کے نقصان، اپنی اور عزیزوں کی موت اور قتل کے ذریعے کرتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون شخص ان حوادث و مصائب پر صبر و شکیبائی اختیار کرتا ہے۔

تو کیا کوئی فقیہ بلکہ کوئی پیغمبر ایسا کر سکتا ہے ۔ یعنی اموال و نفوس، ثمرات اور امن کو ختم کر کے لوگوں کو آزمائے؟

یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نبیوں اور صالح بندوں کو خبردار کرنے اور انہیں تنبیہ کرنے کے لیے کسی ترکِ اولیٰ پر بڑی مصیبتوں میں گرفتار کرتا ہے جیسا کہ حضرت یعقوبؑ مصیبت میں گرفتار ہوئے اس بات پر کہ انہوں نے بعض مساکین کی طرف کم توجہ دی یا حضرت یونسؑ کو ایک معمولی ترکِ اولیٰ پر مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا۔ تو کیا کوئی حق رکھتا ہے کہ کسی کو سزا کے طور پر ایسا کرے۔

یا یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کبھی اللہ تعالیٰ کسی انسان کی ناشکری کی وجہ سے اس سے کوئی نعمت چھین لیتا ہے مثلاً کوئی شخص مال ملنے پر شکر ادا نہیں کرتا تو اس کا مال دریا میں غرق ہو جاتا ہے یا صحت پر شکر ادا نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس سے صحت لے لیتا ہے تو کیا فقہی اور شرعی قوانین کی رُو سے کوئی ایسا کر سکتا ہے کہ ناشکری کی وجہ سے کسی کا مال ضائع کر دے اور اس کی سلامتی کو بیماری میں بدل دے۔

ایسی مثالیں بہت زیادہ ہیں ۔ یہ سب مثالیں مجموعی طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ جہانِ آفرینش خصوصاً خلقتِ انسان اس احسن نظام پر استوار ہے کہ اللہ نے انسان کو کمال تک پہنچانے کے لیے کچھ تکوینی قوانین بنائے ہیں کہ جن کی خلاف ورزی سے مختلف نتائج مرتب ہوتے ہیں حالانکہ قانونِ شریعت کے لحاظ سے ہم ان قوانین پر عمل نہیں کر سکتے۔

مثلاً کسی انسان کی انگلی ڈاکٹر اس لیے کاٹ سکتا ہے کہ زہر اُس کے دل کی طرف سرایت نہ کر جائے

لیکن کیا کوئی شخص کسی انسان میں صبر پیدا کرنے کے لیے یا کفرانِ نعمت کی وجہ سے اس کی انگلی کاٹ سکتا ہے؟ (جبکہ یہ بات مسلّم ہے کہ خدا ایسا کر سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنا نظام احسن کے مطابق ہے)۔

اب جبکہ ثابت ہو گیا کہ ہم دو نظام رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دونوں نظاموں پر حاکم ہے تو کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ اللہ ایک گروہ کو نظامِ تشریعی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مامور کرے اور فرشتوں کے ایک گروہ یا بعض انسانوں کو (مثلاً حضرت خضرؑ کو) نظامِ تکوین کو عملی شکل دینے پر مامور کرے (غور کیجئے گا)۔

اللہ تعالیٰ کے نظامِ تکوین کے لحاظ سے کوئی مانع نہیں کہ وہ کسی نابالغ بچے کو بھی کسی حادثے میں مبتلا کر دے اور اس میں اس کی جان چلی جائے کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا وجود مستقبل کے لیے بہت بڑے خطرات کا حامل ہو جیسا کہ بعض اوقات ایسے اشخاص کا باقی رہ جانا آزمائش وغیرہ کے حوالے سے مصلحت کا حامل ہوتا ہے۔ نیز کوئی مانع نہیں کہ اللہ مجھے آج کسی سخت بیماری میں مبتلا کر دے، اس طرح سے کہ میں گھر سے باہر نہ نکل سکوں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں گھر سے باہر نکلا تو خطرناک حادثہ پیش آجائے گا اور وہ مجھے اس حادثے سے بچانا چاہتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس عالم میں مامورین کا ایک گروہ باطن پر مامور ہے اور ایک گروہ ظاہر پر مامور ہے۔ جو باطن پر مامور ہیں ان کے لیے اپنے اصول و ضوابط اور پروگرام ہیں اور جو ظاہر پر مامور ہیں ان کیلئے اپنے خاص اصول و ضوابط ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان دونوں پروگراموں کا اصلی اور کلّی مقصد انسان کو کمال کی طرف لے جانا ہے اس لحاظ سے دونوں ہم آہنگ ہیں لیکن بعض اوقات جزئیات میں فرق ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی میں بھی کوئی خودسری سے کوئی اقدام نہیں کر سکتا بلکہ ضروری ہے کہ وہ حقیقی مالک و حاکم کی طرف سے مجاز ہو لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام نے صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا اور کہا:

ما فعلته عن امری

میں نے یہ کام خود سے ہرگز نہیں کیے۔

یعنی — میں نے یہ کام حکمِ الٰہی کے مطابق اور اسی کے ضابطے اور طریقے کے مطابق انجام دیئے ہیں۔

اس طرح ان اقدامات میں جو ظاہری تضاد نظر آتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔

اور یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ حضرت خضرؑ کے کاموں کو برداشت نہیں کر پاتے تھے تو یہ اسی بنا پر تھا کہ ان کی ماموریت اور ذمہ داری کا طریقہ جناب خضرؑ کی ذمہ داری کے راستے سے الگ تھا لہٰذا جب انہوں نے حضرت خضرؑ کا کام ظاہراً شرعی قوانین کے خلاف دیکھا تو اس پر اعتراض کیا لیکن حضرت خضرؑ نے ٹھنڈے دل سے اپنا کام جاری رکھا اور چونکہ یہ دو عظیم خدائی رہبر مختلف ذمہ داریوں کی بنا پر ہمیشہ کے لیے

اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا حضرت خضرؑ نے کہا :

هٰذا فراق بینی و بینك

یہ اب میرے اور تمہارے جدا ہونے کا مرحلہ آگیا ہے ۔

۲۔ خضرؑ۔ کون تھے : جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت خضرؑ کا نام صراحت کے ساتھ قرآن میں نہیں لیا گیا اور حضرت موسیٰؑ کے دوست اور استاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

عبداً من عبادنا اٰتیناه رحمة من عندنا وعلمناه من لدنا علماً

ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ جسے ہم نے اپنی رحمت عطا کی اور جسے ہم نے اپنے علم سے نوازا۔

اس تعارف میں ان کے مقام عبودیت کا تذکرہ ہے اور ان کے خاص علم کو واضح کیا گیا ہے لہٰذا ہم نے بھی عالم کے طور پر ان کا زیادہ ذکر کیا ہے ۔لیکن متعدد روایات میں اس عالم کا نام "خضر" بتایا گیا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصلی نام "بلیا ابن ملکان" تھا اور "خضر" ان کا لقب ہے کیونکہ وہ جہاں کہیں قدم رکھتے ان کے قدموں کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی تھی ۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس عالم کا نام "الیاس" ہے ۔یہیں سے یہ تصور پیدا ہوا کہ ہو سکتا ہے "الیاس" اور "خضر" ایک ہی شخص کے دو نام ہوں لیکن مشہور و معروف مفسرین اور راویوں نے پہلی بات ہی بیان کی ہے ۔

واضح ہے کہ یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی کہ اس شخص کا نام کیا ہے ۔اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک عالم ربانی تھے اور پروردگار کی خاص رحمت ان کے شامل حال تھی ۔ وہ باطن اور نظام تکوینی پر مامور تھے اور کچھ اسرار سے آگاہ تھے اور ایک لحاظ سے موسیٰؑ بن عمران کے معلم تھے اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کئی لحاظ سے ان پر مقدم تھے ۔

یہ کہ وہ پیغمبر تھے یا نہیں ۔۔ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں ۔اصول کافی جلد اوّل میں متعدد روایات ہیں کہ جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ "ذوالقرنین" اور "آصف ابن برخیا" کی طرح ایک عالم تھے[1]

جبکہ کچھ اور روایات ایسی بھی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقام نبوت کے حامل تھے اور زیر نظر روایات میں بھی بعض تعبیرات کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے ۔کیونکہ ایک موقع پر وہ کہتے ہیں :

میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیا ۔

---

[1] اصول کافی، ج ۱، باب "ان الائمة بمن یشبهون فیمن مضی" صفحہ ۲۱۰ ۔

ایک اور مقام پر کہتے ہیں :

ہم چاہتے تھے کہ ایسا ہو ۔

نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک لمبی عمر کے حامل تھے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے ۔ وہ یہ کہ کیا اس عالم بزرگوار کا واقعہ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں بھی ہے ؟

سوال کا جواب یہ ہے :

اگر کتب سے مراد کتب عہدین (تورات و انجیل) ہیں، تو ان میں تو نہیں ہے لیکن بعض یہودی علماء کی کتابیں کہ جو گیارہویں صدی عیسوی میں مدون ہوئی ہیں ان میں ایک داستان نقل ہوئی ہے کہ جو حضرت موسٰیؑ کی مذکورہ داستان سے کچھ مشابہت رکھتی ہے ۔ اگرچہ اس داستان کے ہیرو ۔ الیاس" اور "یوشع بن لادی" ہیں کہ جو تیسری صدی عیسوی کے "تلمود" کے مفسرین میں سے تھے ۔ یہ داستان اور کئی پہلوؤں سے بھی موسٰی و خضر کی داستان سے مختلف ہے ۔

بہرحال مذکورہ داستان کچھ یوں ہے :

یوشع نے خدا سے چاہا کہ اُس کی الیاس سے ملاقات ہو ۔ اس کی دعا پوری ہوگئی اور اسے الیاس سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہوگیا ۔ اس کی آرزو تھی کہ الیاس سے کچھ اسرار حاصل کرے ۔ الیاس نے اُس سے کہا : تجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ انہیں برداشت کر پائے ۔

لیکن یوشع نے اصرار کیا تو الیاس نے اس کی درخواست اس شرط پر قبول کرلی کہ وہ جو کچھ بھی دیکھے گا ہرگز سوال نہیں کرے گا اور اگر اس نے خلاف ورزی کی تو اسے الگ ہونا پڑے گا ۔

بہرحال اس معاہدے کے بعد یوشع اور الیاس اکٹھے چل پڑے ۔

دورانِ سفر وہ ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں ۔ صاحب خانہ بڑی گرم جوشی سے ان کی پذیرائی کرتا ہے ۔ اس گھر والوں کے پاس دنیا کی چیزوں میں سے صرف ایک گائے تھی کوئی اور چیز ان کی ملکیت نہ تھی ۔ وہ گائے کا دودھ بیچ کر گزر اوقات کرتے تھے ۔

الیاس نے صاحب خانہ کو حکم دیا کہ گائے کو ذبح کردے ۔ یوشع کو اس کردار پر سخت تعجب ہوتا ہے ۔ وہ اس کا سبب پوچھتا ہے ۔ الیاس اسے معاہدہ یاد دلاتا ہے اور جدا ہونے کی دھمکی دیتا ہے ۔ یوشع مجبوراً خاموش ہو جاتا ہے ۔

وہاں سے وہ دونوں ایک اور بستی کی طرف چل پڑتے ہیں ۔ اس بستی میں پہنچ کر ایک مالدار آدمی کے گھر داخل ہوتے ہیں ۔ اس گھر کی ایک دیوار گرنے کے قریب ہوتی ہے ۔ الیاس خود مٹی کے کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اس دیوار کی مرمت کر دیتا ہے ۔

وہاں سے وہ ایک اور بستی میں پہنچتے ہیں۔ اس گاؤں کے "چند لوگ" ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ وہ ان دونوں کی اچھی پذیرائی نہیں کرتے۔ الیاس نے ان کے لیے دعا کی کہ ان سب کو ریاست و امارات نصیب ہو۔

وہ چوتھی بستی میں پہنچتے ہیں تو ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا جاتا ہے۔ الیاس ان کے لیے دعا کرتا ہے کہ ان میں سے صرف ایک کو ریاست نصیب ہو۔

آخر کار یوشع بن لاوی کی قوتِ برداشت جواب دے دیتی ہے وہ ان چار واقعات کے بارے میں سوال کرتا ہے تو الیاس کہتا ہے:

پہلے گھر میں صاحب خانہ کی بیوی بیمار تھی۔ اگر وہ گائے صدقہ کے طور پر قربان نہ کی جاتی تو وہ عورت مر جاتی۔

دوسرے گھر میں دیوار کے نیچے ایک خزانہ تھا کہ جو ایک یتیم بچے کیلئے محفوظ رہنا چاہیئے تھا
تیسری بستی کے سب لوگوں کے لیے ریاست کی دعا اس لیے کی کہ وہ پریشانی سے دوچار ہوں جبکہ اس کے برعکس چوتھی بستی کے ایک شخص کے لیے دعا کی تاکہ ان کے امور منظم اور بہتر طور پر انجام پائیں[1]

غلط فہمی نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ یہ دونوں داستانیں ایک ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ یہودیوں نے جو داستان نقل کی ہے وہ قرآن کی موسیٰ و خضر کی داستان کے مشابہ ہے یا پھر موسیٰ و خضر کی داستان میں تحریف ہو کر یہ اس صورت میں باقی رہ گئی ہے۔

۳۔ خود ساختہ افسانے: حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کی داستان کی بنیاد وہی ہے کہ جو کچھ قرآن میں آیا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سے منسلک کرکے بہت سے افسانے گھڑ لیے گئے ہیں۔ ان افسانوں کو اس داستان کے ساتھ خلط ملط کرنے سے اصل داستان کی صورت بھی بگڑ جاتی ہے۔ جاننا چاہیئے کہ یہ کوئی پہلی داستان نہیں ہے کہ جس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہے اور بہت سی سچی داستانوں کے ساتھ یہی ہاتھ کیا گیا ہے۔

لہٰذا حقیقت تک رسائی کے لیے قرآن کی ان تئیس آیتوں کو بنیاد قرار دیا جانا چاہیئے جن میں یہ داستان بیان ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ احادیث کو بھی اسی صورت میں قبول کیا جا سکتا ہے جب وہ قرآن کے موافق ہوں۔ اگر کوئی حدیث اس کے برخلاف ہو تو یقیناً وہ قابلِ قبول نہیں ہے اور خوش قسمتی سے معتبر احادیث میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے۔

---

[1] یہ تمام ترعبارت کتاب اعلام قرآن صفحہ ۲۱۳ سے نقل کی گئی ہے۔

۴۔ **کیا انبیاء کے لیے بھول چوک ممکن ہے؟** مندرجہ بالا واقعے میں ہم نے بار ہا دیکھا ہے کہ حضرت موسٰی علیہ السلام بھول گئے۔ پہلے تو اس مچھلی کو جو انہوں نے کھانے کے لیے رکھی تھی۔ دوسری اور تیسری مرتبہ آپ اپنے عالم دوست سے کیے گئے معاہدہ کو بھول گئے۔ ان امور کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انبیاء کے لیے نسیان ممکن ہے؟

بعض کا نظریہ ہے کہ انبیاء سے ایسے نسیان کا صدور بعید نہیں ہے کیونکہ یہ دعوتِ نبوت کی بنیاد اور اصول سے مربوط ہے اور نہ اس کے فروع سے اور نہ ہی اس کا تعلق تبلیغ نبوت کے ساتھ ہے بلکہ اس کا تعلق صرف روزمرہ کی معمول کی زندگی سے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو کچھ مسلّم ہے یہ ہے کہ کوئی نبی نبوت کی دعوت اور اس سے متعلقہ امور میں ہرگز خطا و اشتباہ کا شکار نہیں ہوتا اور ان کا مقام عصمت انہیں اس قسم کی چیزوں سے محفوظ رکھتا ہے لیکن اس میں کیا مانع ہے کہ موسٰیؑ کو جو بڑے اشتیاق سے اس عالم کی تلاش میں جا رہے تھے اپنے کھانے بھول گئے اور یہ ایک معمول کا مسئلہ ہے نیز اس میں کیا مانع ہے کہ کشتی میں سوراخ، نوجوان لڑکے کے قتل اور بخیلوں کے شہر کی دیوار کی بے وجہ تعمیر جیسے بڑے واقعات نے ایسا ہیجان زدہ کیا کہ انہوں نے اپنے عالم دوست سے جو ذاتی عہد کیا تھا اُسے بھول گئے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ نہ ایک پیغمبر سے بعید ہے اور نہ مقام عصمت کے منافی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ نسیان یہاں مجازی معنی میں یعنی ترک کرنے کے معنی میں آیا ہے کیونکہ انسان جب کسی چیز کو ترک کرتا ہے تو وہ ایسے ہی ہے جیسے اسے بھول گیا ہو اور اس کے بارے میں اس نے نسیان کیا ہو۔ حضرت موسٰیؑ نے اپنی غذا کو اس لیے ترک کیا کیونکہ وہ اس کے بارے میں بے اعتنا تھے اور اپنے عالم دوست سے کیے ہوئے معاہدے کو انہوں نے اس لیے ترک کیا کیونکہ حوادث کو ظاہری حوالے سے دیکھنے کی وجہ سے اصلاً یہ بات ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھی کہ کوئی شخص بلا وجہ لوگوں کے جان و مال کو نقصان پہنچائے لہٰذا انہوں نے اعتراض کرنا اپنی ذمہ داری سمجھا اور ان کے نزدیک یہ معاہدے کا مقام نہ تھا۔

لیکن واضح ہے کہ ایسی تفاسیر ظاہر آیات سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتیں [1]

---

[1] یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ کسی نقلی دلیل کا ظہور مسلّم عقلی دلیل کے ساتھ ٹکرائے تو اس نقلی دلیل کی تاویل کی جائے گی مثلاً خدا کے بارے میں قرآن کی بہت سی آیات کا ظہور یہ ہے کہ وہ ہاتھ، آنکھیں، پہلو اور نفس رکھتا ہے یا معاذ اللہ وہ جسم رکھتا ہے لیکن چونکہ یہ امور اصول مسلمہ اور دلائل عقلیہ قطعیہ کے خلاف ہیں لہٰذا ان آیات کی تاویل کی جاتی ہے یعنی خلاف ظاہر معنی کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ معنی مجازی ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیاء اور آئمہ کا مطلقاً معصوم ہونا عقلاً ضروری ہے لہٰذا اس کے خلاف ظہورات کی تاویل کی جانا چاہیئے (مترجم)۔

۵۔ موسیٰ خضرؑ کی ملاقات کو کیوں گئے؟ ابی بن کعب نے ابن عباس کی وساطت سے پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث اس طرح نقل کی ہے:

ایک دن موسیٰؑ بنی اسرائیل سے خطاب کر رہے تھے۔ کسی نے آپ سے پوچھا روئے زمین پر سب سے زیادہ علم کون رکھتا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا مجھے اپنے آپ سے بڑھ کر کسی کے عالم ہونے کا علم نہیں۔ اس وقت موسیٰؑ کو وحی ہوئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے کہ جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ اس وقت موسیٰؑ نے درخواست کی کہ میں اس عالم کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر اللہ نے انہیں ان سے ملاقات کی راہ بتائی[1]

ایسی ہی ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے[2]

یہ درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنبیہ تھی کہ اپنے تمام تر علم و فضل کے باوجود اپنے آپ کو افضل ترین نہ سمجھیں۔ لیکن یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ایک اولوالعزم صاحبِ رسالت و شریعت شخص کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم نہیں ہونا چاہیئے؟

اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اپنی ماموریت کی قلمرو میں نظامِ تشریع میں اسے سب سے بڑا عالم ہونا چاہیئے اور حضرت موسیٰؑ اسی طرح تھے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے نکتے میں بیان کیا ہے کہ ان کی ماموریت کی قلمرو ان کے عالم دوست کی قلمرو سے الگ تھی۔ ان کے عالم دوست کی ماموریت کا تعلق عالمِ تشریع سے نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ عالم ایسے اسرار سے آگاہ تھے کہ جو دعوتِ نبوت کی بنیاد نہ تھے۔

اتفاقاً ایک حدیث کہ جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے اس میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ حضرت خضرؑ سے زیادہ عالم تھے یعنی علمِ شریعت میں[3]

شاید اس سوال کا جواب نہ پانے کی وجہ سے اور نسیان سے مربوط سوال کا جواب نہ پانے کے سبب بعض نے ان آیات میں جس موسیٰؑ کا ذکر ہے اسے موسیٰ بن عمران تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

ایک حدیث کہ جو حضرت علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس سے بھی یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا دائرہ کار اور قلمرو ایک دوسرے سے مختلف تھی اور ہر ایک دوسرے سے اپنے کام میں زیادہ عالم تھا[4]

---

[1] مجمع البیان، ج ۶ صفحہ ۴۸۱ (ہم نے روایت اختصار سے درج کی ہے)۔

[2] نورالثقلین، ج ۳ صفحہ ۲۷۵۔

[3] المیزان، ج ۱۳ صفحہ ۳۵۳۔

[4] مجمع البیان، ج ۶ صفحہ ۴۸۰۔

اس نکتے کا ذکر بھی مناسب ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

جس وقت موسیٰؑ خضرؑ سے ملے تو ایک پرندہ ان کے سامنے ظاہر ہوا۔ اس نے پانی کا ایک قطرہ اپنی چونچ میں لیا تو حضرت موسیٰؑ سے خضرؑ نے کہا: جانتے ہو کہ پرندہ کیا کہتا ہے:

موسیٰؑ نے کہا: کیا کہتا ہے؟

خضرؑ کہنے لگے: کہتا ہے:

ماعلمك وعلم موسٰی فی علم الله الا کما اخذ منقاری من الماء

تیرا علم اور موسیٰ کا علم خدا کے علم کے مقابلے میں اس قطرے کی طرح ہے جو میں نے پانی سے چونچ میں لیا ہے[1]

۶۔ **وہ خزانہ کیا تھا؟** اس داستان کے بارے میں ایک سوال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ خزانہ آخر کیا تھا جسے موسیٰؑ کے عالم دوست پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اور آخر اس باایمان شخص یعنی یتیموں کے باپ نے یہ خزانہ کیوں چھپا دیا تھا؟

بعض نے کہا ہے کہ وہ خزانہ مادی پہلو کی بجائے زیادہ معنوی پہلو رکھتا تھا۔ بہت سی شیعہ سنی روایات کے مطابق وہ ایک تختی تھی جس پر حکمت آمیز کلمات نقش تھے۔ اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ حکمت آمیز کلمات کیا تھے۔

کتاب کافی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

یہ سونے چاندی کا خزانہ نہیں تھا۔ یہ تو صرف ایک تختی تھی جس پر یہ چار جملے ثبت تھے:

لا الٰه الا الله،

من ایقن بالموت لم یضحك،

ومن ایقن بالحساب لم یفرح قلبه،

ومن ایقن بالقدر لم یخش الا الله،

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

جو موت پر یقین رکھتا ہے وہ (بے ہودہ) نہیں ہنستا۔

اور جسے اللہ کی طرف سے حساب کا یقین ہے (اور اسے جوابدہی کی فکر ہے) وہ خوش نہیں رہتا۔

اور جسے تقدیر الٰہی کا یقین ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا[2]

---

[1] تفسیر المیزان میں درالمنثور اور دیگر کتب کے حوالے سے یہ روایت درج کی گئی ہے۔

[2] نورالثقلین، ج ۳ صفحہ ۲۸۴۔

لیکن کچھ اور روایات میں آیا ہے کہ وہ سونے کی تختی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ روایات ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ پہلی روایت کا مقصد یہ ہے کہ وہ درہم و دینار کا ڈھیر نہ تھا کیونکہ "خزانہ" سے یہی مفہوم ذہن میں آتا ہے۔

بالفرض اگر ہم لفظ "کنز" کا ظاہری مفہوم یعنی زر و سیم کا ذخیرہ مراد لیں پھر بھی اس میں کوئی اشکال نہیں۔ کیونکہ ایسا خزانہ اور ذخیرہ ممنوع ہے کہ جو ایسے بہت زیادہ گراں قیمت مال پر مشتمل ہو جو طویل مدت کے لیے جمع رکھا جائے جبکہ معاشرے کو اس کی بہت ضرورت ہو لیکن اگر مال کی حفاظت کے لیے، وہ مال جو معاملہ کی گردش میں ہے، ایک دن یا چند دن زیرِ زمین دفن کر دیا جائے (گزشتہ زمانے میں بے امنی کی وجہ سے اس کا معمول تھا یہاں تک کہ لوگ ایک رات کے لیے بھی اپنے اموال دفن کر دیتے تھے) اور بعدازاں اس کا مالک کسی حادثے کی بنا پر دنیا سے چل بسے تو ایسا خزانہ ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

۷۔ اس داستان سے حاصل ہونے والے درس: اس داستان سے ہمیں بہت سے سبق حاصل ہوتے ہیں مثلاً:

(الف) عالم رہبر کی تلاش اور اس کے علم سے استفادہ کرنا اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر نے اس کی تلاش میں اتنا سفر کیا اور یہ سب انسانوں کے لیے ایک نمونہ ہے، وہ جس مرتبہ کے بھی ہوں اور جس سن و سال کے اور انہیں جیسے بھی حالات درپیش ہوں۔

(ب) جوہرِ علمِ الٰہی کا سرچشمہ عبودیت اور اللہ کی بندگی ہے۔ جیسا کہ زیرِ نظر آیات میں ہم نے پڑھا ہے:

عبدًا من عبادنا اٰتیناہ رحمة من عندنا وعلمناہ من لدنا علمًا

وہ ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ تھا اسے ہم نے اپنے خاص علم سے نوازا تھا۔

(ج) علم ہمیشہ عمل کے لیے حاصل کرنا چاہیئے جیسا کہ حضرت موسیٰ اپنے عالم دوست سے کہتے ہیں:

مما علمت رشدًا

مجھے ایسا علم سکھایئے جو راہِ مقصد میں میرے لیے مفید ہو۔

یعنی مَیں علم برائے علم نہیں چاہتا بلکہ حصولِ مقصد کے لیے علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

(د) کاموں میں جلد بازی نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ بہت سے امور کے لیے مناسب موقع کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے:

الامور مرہونة باوقاتھا

امور اپنے وقت کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔

خصوصاً زیادہ اہم مسائل میں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اسی بنا پر اس عالم نے اپنے کاموں کے اسرار حضرت موسیٰ سے مناسب وقت پر بیان کیے۔

(۵) چیزوں اور واقعات کا ظاہری چہرہ بھی ہوتا ہے اور باطنی بھی۔ یہ ایک اہم سبق ہے کہ جو ہم اس داستان سے سیکھتے ہیں اس سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے ناگوار واقعات کے بارے میں ہمیں جلد بازی سے فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کتنے ہی ایسے واقعات ہیں کہ جو ہمیں ناپسند ہوتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے لیے اللہ کا لطف خفی تھے۔ اسی بات کے بارے میں قرآن حکیم ایک اور جگہ کہتا ہے:

عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـٴًـا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـٴًـا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۠

ہوسکتا ہے ایک چیز تمہیں ناپسند ہو حالانکہ وہ تمہارے فائدے میں ہو اور ممکن ہے ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لیے مضر ہو اور خدا جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ (بقرہ۔ ۲۱۶)

اس حقیقت کی طرف توجہ کے سبب انسان ناگوار واقعات و حوادث پر فوراً مایوس نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ایک جاذب نظر حدیث امام صادق علیہ السلام سے منقول نظر سے گزرتی ہے۔ امامؑ نے فرزند زرارہؓ[1] سے فرمایا:

اپنے باپ سے میرا سلام کہو کر یہ کہنا: بعض محفلوں میں جو تیری بُرائی بیان کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دشمن اس بات کی نگرانی کرتے ہیں کہ ہم کس شخص سے اظہار محبت کرتے ہیں تاکہ اسے اس محبت کی وجہ سے تکلیف پہنچائیں کہ جو ہم اس سے رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم کسی کی مذمت کرتے ہیں تو وہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ بعض اوقات اگر میں تیری عدم موجودگی میں تیری بُرائی کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تو لوگوں میں ہماری ولایت و محبت کے حوالے سے مشہور ہو چکا ہے۔ اسی بنا پر ہمارے مخالفین تیری مذمت کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تجھ پر عیب لگاؤں تاکہ تجھ سے ان کا شر دُور ہو۔ جیسا کہ اللہ موسیٰؑ کے دوست عالم کی زبانی فرماتا ہے:

اما السفینة فکانت لمساکین یعملون فی البحر فاردت ان اعیبها وکان وراءهم ملك یأخذ كل سفینة غصبًا....

کشتی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ چند مسکینوں کی ملکیت تھی وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے۔ میں نے اُس میں اس لیے عیب اور نقص ڈال دیا کہ ایک بادشاہ ان کے پیچھے تھا اور وہ سب کشتیوں کو زبردستی ہتھیا رہا تھا۔

---

[1] زرارہ اپنے زمانے کے بزرگ فقہاء اور محدثین میں شمار ہوتے تھے انہیں امامؑ سے بہت محبت تھی اور امامؑ کو ان سے بہت لگاؤ تھا۔

اس مثال کو اچھی طرح سمجھ لے لیکن خدا کی قسم تو لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے چاہے وہ زندہ ہیں یا فوت ہو گئے ہیں۔ تو اس موجزن دریا میں بہترین کشتی ہے اور ظالم غاصب بادشاہ تیرے پیچھے ہے جس کی بڑی گہری نظر ہے کہ بحرِ ہدایت میں سے کونسی صحیح وسالم کشتیاں گزرتی ہیں تاکہ انہیں غصب کرلے۔ تم پر اللہ کی رحمت ہو زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔[1]

(و) اعتراض کے ساتھ ساتھ حقیقتوں کا اعتراف — اس داستان کا ایک اور سبق ہے۔ حضرت موسیٰ نے تین بار نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے عالم دوست سے کیے گئے عہد کو نظر انداز کر دیا اور باوجود اس کے اس استاد کی جدائی انہیں سخت ناگوار تھی تاہم اس تلخ حقیقت کے سامنے انہوں نے ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیا، اور ان کے اقدام کو حق تسلیم کیا۔ ان سے بڑی محبت اور خلوص کے عالم میں جدا ہوئے اور اپنے کام میں لگ گئے جبکہ اس دوستی اور رفاقت کے مختصر سے عرصے میں انہوں نے حقیقت کے عظیم خزانے جمع کر لیے تھے۔

انسان کو نہیں چاہیئے کہ آخر عمر تک اپنی آزمائش میں لگا رہے اور ایسے مستقبل کے لیے اپنی زندگی کو تجربہ گاہ نہ بنالے کہ جو ہرگز نہیں آئے گا۔ جب انسان کسی ایک چیز کو چند مرتبہ آزمالے تو پھر اس کے نتیجے کے سامنے سر جھکا دے۔

(ز) ماں باپ کے ایمان کا اولاد کے لیے اثر بھی اس داستان کا ایک اہم سبق ہے۔ حضرت خضرؑ نے ایک نیک اور صالح باپ کی وجہ سے اس کی اولاد کی اس قدر حمایت اپنے ذمہ لے لی کہ جس قدر ہو سکتی۔ یعنی اولاد اپنے باپ کے ایمان اور امانت کی وجہ سے سعادت مند ہو سکتی ہے اور اس کی نیکی کا فائدہ اس کی اولاد کو پہنچ سکتا ہے۔ چند ایک روایات میں ہے کہ وہ مردِ صالح ان یتیموں کا باپ نہیں تھا بلکہ ان کے دُور کے اجداد میں شمار ہوتا تھا (جی ہاں! عملِ صالح کی تاثیر اس قدر ہے)۔[2]

اس کے صالح ہونے کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اپنی اولاد کے لیے معنویت کے خزانے اور حکیمانہ پند و نصائح بطور یادگار چھوڑے۔

(ح) اس داستان کا ایک سبق یہ ہے کہ ماں باپ کو تکلیف پہنچانے سے عمر کم ہو جاتی ہے۔ جب ایسی اولاد موت کی مستحق ہے کہ جس نے آئندہ ماں باپ کو تکلیف پہنچانا ہے ان کے مقابلے میں سرکشی اور کفران اختیار کرنا ہے یا انہیں راہِ خدا سے منحرف کرنا ہے — تو پھر اس اولاد کی کیفیت بارگاہِ الٰہی میں کیا ہوگی

---

[1] معجم رجال الحدیث، ج ۷، صفحہ ۲۲۷۔

[2] نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۲۸۹۔

کہ جو اس وقت مشغول گناہ ہے ۔

اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے کہ عمر کی کمی اور ترک صلہ رحمی (خصوصاً ماں باپ کو تکلیف پہنچانے) کے درمیان قریبی رشتہ ہے ۔ ان میں کچھ روایات کا ذکر ہم اسی جلد میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ کے ذیل میں کر آئے ہیں ۔

(ط) اس داستان کا ایک درس یہ ہے کہ لوگ اس چیز کے دشمن ہوتے ہیں جسے نہیں جانتے ۔ بسا ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہمارے بارے میں نیکی کرتا ہے لیکن چونکہ ہم باطن کار سے آگاہ نہیں ہوتے اس لیے اُسے دشمن خیال کرتے ہیں اور اس پر برہم ہوتے ہیں ۔ خصوصاً ہم ان چیزوں کے بارے میں کم صبر اور بے حوصلہ ہوتے ہیں جنہیں نہیں جانتے ۔ البتہ یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان ایسے امور کے بارے میں بے صبر ہوتا ہے کہ جن کا صرف ایک رُخ اور ایک زاویہ اُس کے سامنے ہوتا ہے ۔ بہرحال یہ داستان ہمیں بتاتی ہے کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے بلکہ تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد فیصلہ کرنا چاہیئے ۔

امیرالمؤمنین علی علیہ السلام سے بھی ایک حدیث مروی ہے ، آپؑ نے فرمایا :

الناس اعداء ما جهلوا

انسان جس چیز کو نہیں جانتے اس کے دشمن ہوتے ہیں [1]

اسی بناء پر لوگوں کی سطح علم و آگہی جس قدر بلند ہوگی مسائل سے ان کا برتاؤ اتنا ہی منطقی ہوتا چلا جائے گا ۔ دوسرے لفظوں میں صبر کی بنیاد علم و آگہی ہے ۔

البتہ حضرت موسیٰؑ ایک لحاظ سے مضطرب اور ناراحت ہونے کا حق رکھتے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان تینوں واقعات میں شریعت کے احکام کا بہت سا حصہ خطرے میں پڑ گیا ہے ۔ پہلے واقعے میں لوگوں کا مال محفوظ نہیں رہا دوسرے میں جان محفوظ نہیں رہی اور تیسرے میں مسائل حقوق خطرے سے دوچار ہو گئے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے دیکھا کہ ظاہراً لوگوں کے حقوق کے ساتھ منطقی برتاؤ نہیں ہوا لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس قدر پریشان ہو جائیں کہ اس عالم بزرگ سے باندھا ہوا عہد بھلا دیں لیکن جب وہ باطن امر سے آگاہ ہوئے تو انہیں چین آگیا اور پھر کوئی اعتراض نہ کیا اور یہ بات خود اس امر کو واضح کرتی ہے کہ معاملات کے باطن سے مطلع نہ ہونا کس قدر پریشان کن ہے ۔

(ی) اس داستان سے ہم استاد اور شاگرد کے آداب بھی سیکھ سکتے ہیں ۔ اس عالم ربانی اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے استاد اور شاگرد کے درمیان آداب کے سلسلے میں بہت سے نکات سامنے آتے ہیں ۔ مثلاً :

---

[1] نہج البلاغہ ، حکم ۱۷۲ ۔

(۱) حضرت موسیٰؑ اپنے آپ کو حضرت خضرؑ کے تابع قرار دیتے ہیں :

اتبعك

(۲) اور اس پیروی اور اتباع کے لیے حضرت موسیٰؑ اپنے استاد سے اجازت طلب کرتے ہیں :

هل اتبعك

"کیا میں آپ کی اتباع کر سکتا ہوں؟"

(۳) حضرت موسیٰؑ اپنی احتیاج علم اور استاد کے صاحب علم ہونے کا اقرار کرتے ہیں :

علیٰ ان تعلمن

تاکہ میں آپ سے علم حاصل کرسکوں ۔

(۴) انکساری کا اظہار کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ اپنے استاد کا علم بہت زیادہ قرار دیتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ میں تو اس علم کا کچھ حصہ حاصل کرنے حاضر ہوا ہوں ۔ لفظ "مما" اس کی دلیل ہے ۔

(۵) علمِ اُستاد کو علمِ الٰہی کے عنوان سے یاد کرتے ہیں (علمت) ۔

(۶) ان سے ارشاد و ہدایت کی خواہش کرتے ہیں (رشدًا) ۔

(۷) حضرت موسیٰؑ در پردہ اپنے استاد سے کہتے ہیں کہ جس طرح اللہ نے آپ پر لطف و کرم کیا ہے اور آپ کو تعلیم دی ہے آپ بھی مجھ پر یہ لطف کیجئے :

تعلمن مما علمت

(۸) "هل اتبعك" سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ شاگرد کو استاد کے پیچھے جانا چاہیئے نہ کہ اُستاد کو شاگرد کے پیچھے (سوائے خاص مواقع کے) ۔

(۹) حضرت موسیٰؑ بہت بلند مقام اور عظیم مقام کے حامل تھے ۔ اولوالعزم نبی تھے اور صاحبِ رسالت و کتاب تھے اس کے باوجود انہوں نے اس انکساری کا مظاہرہ کیا ہے ۔

ان کا کردار ہر کسی سے کہہ رہا ہے کہ تُو جو بھی ہے اور جو مقام بھی رکھتا ہے کسب علم و دانش کے موقع پر فروتنی اور انکساری سے کام لینا چاہیئے ۔

(۱۰) حضرت موسیٰؑ نے استاد سے عہد کرتے وقت قطعی اور یقینی لفظ استعمال نہیں کیے بلکہ کہا :

ستجدنی ان شاء اللہ صابرًا

انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے ۔

یہ اللہ کے حضور بھی ادب ہے اور استاد کے حضور بھی ۔ کہ خلاف ورزی ہو جائے تو اُستاد کی ہتکِ احترام نہ ہو ۔

(۱۱) اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس عالم ربانی نے تعلیم و تربیت کے وقت انتہائی حلم و بردباری

کا مظاہرہ کیا۔ موسیٰ جب ہیجان و اضطراب کے عالم میں اپنا عہد بھول جاتے تھے اور اعتراض کرنے لگتے تھے تو وہ بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوالیہ انداز میں صرف اتنا کہتے تھے:

میں نہ کہتا تھا کہ میرے کاموں پر تم صبر نہ کر سکو گے۔

(۸۳) وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ○

(۸۴) إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ○

(۸۵) فَأَتْبَعَ سَبَبًا ○

(۸۶) حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ○

(۸۷) قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُكْرًا ○

(۸۸) وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ○

(۸۹) ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ○

(۹۰) حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا ○

(۹۱) كَذَٰلِكَ ۖ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ○

ترجمہ

۸۳۔ اور تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ عنقریب اس کی کچھ سرگزشت تم سے بیان کروں گا۔

۸۴۔ ہم نے اسے روئے زمین پر قدرت و حکومت عطا کی اور ہر طرح کے اسباب اس کے اختیار میں دیئے۔

۸۵۔ اس نے ان اسباب سے استفادہ کیا۔

۸۶۔ یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام غروب تک پہنچا۔ اسے آفتاب ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ کالے کیچڑ کے چشمے میں ڈوب رہا ہو۔ وہاں اس نے ایک قوم کو آباد پایا۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین کیا تم انہیں سزا دینا چاہو گے یا اچھی جزاء۔

۸۷۔ کہنے لگا: جن لوگوں نے ظلم کیا ہے انہیں تو ہم سزا دیں گے اور وہ اپنے رب کی طرف پلٹ جائیں گے ۔ اور اللہ انہیں سخت سزا دے گا۔

۸۸۔ رہا وہ شخص جو ایمان لے آئے گا اور نیک کام کرے گا وہ اچھی جزا پائے گا اور ہم اسے آسان کام کہیں گے۔

۸۹۔ اس نے پھر ان اسباب سے کام لیا۔

۹۰۔ یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام طلوع تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے جن کے لیے سورج کے سوا ہم نے کوئی ستر (اور لباس) قرار نہیں دیا۔

(۹۱) جی ہاں (ذوالقرنین کا معاملہ) ایسا ہی تھا اور اس کے پاس جو وسائل تھے ہم ان سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

تفسیر

ذوالقرنین کی عجیب کہانی

اصحاب کہف کے بارے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ چند قریشیوں نے رسول اللہؐ کو آزمانا چاہا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مدینے کے یہودیوں کے مشورے سے تین مسئلے پیش کیے۔ ایک اصحاب کہف کے بارے میں تھا، دوسرا مسئلہ روح کا تھا اور تیسرا ذوالقرنین کے بارے میں۔ ان میں سے روح کے مسئلہ کا جواب سورہ بنی اسرائیل میں آیا ہے دوسرے دو سوالوں کا جواب زیرِ نظر سورہ کہف میں ہے۔

اب ذوالقرنین کی داستان کی باری ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں خود سورہ کہف میں تین واقعات کا ذکر ہے۔ یہ واقعات اگرچہ ظاہراً ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان میں ایک قدر مشترک ہے۔ اصحاب کہف کا واقعہ، موسیٰ وخضر کی داستان اور ذوالقرنین کی کہانی۔ یہ سب ایسے مسائل پر مشتمل ہیں جو ہمیں عام محدود زندگی سے باہر لے جاتے ہیں اور نشاندہی کرتے ہیں کہ عالم اور اس کے حقائق بس یہی نہیں کہ جو ہم دیکھتے ہیں اور جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

ذوالقرنین کی داستان ایسی ہے کہ جس پر طویل عرصے سے فلاسفہ اور محققین غور و خوض کرتے چلے آتے ہیں اور ذوالقرنین کی معرفت کے لیے انہوں نے بہت کوشش کی ہے۔

اس سلسلے میں پہلے ہم ذوالقرنین سے مربوط آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ یہ کل سولہ آیتیں ہیں کیونکہ تاریخی تحقیق سے قطع نظر ذوالقرنین کی ذات خود سے ایک بہت ہی تربیتی درس کی حامل ہے اور اس کے بہت سے قابلِ غور پہلو ہیں۔ ان آیات کی تفسیر کے بعد ذوالقرنین کی شخصیت کو جاننے کے لیے ہم آیات، روایات اور مؤرخین کے اقوال کا جائزہ لیں گے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے ہم اس کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کریں گے اور پہلا موضوع وہی ہے جو قرآن کی نظر میں اہم ہے۔

اس سلسلے کی پہلی آیت کہتی ہے: تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں: (و یسئلونک عن ذی القرنین)۔ کہہ دو عنقریب اس کی سرگزشت کا کچھ حصہ تم سے بیان کروں گا (قل سأتلوا علیکم منہ ذکرًا)۔

"سأتلوا" میں جو "سین" ہے وہ مستقبل قریب کے لیے آئی ہے حالانکہ اس بارے میں رسول اللہؐ

نے ساتھ ہی گفتگو شروع کر دی ہے ۔ ہو سکتا ہے یہ ادب کے پیش نظر ہو ۔ ایسا ادب کہ جس میں ترکِ عجلت کا مفہوم پایا جاتا ہے اور ایسا ادب کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا سے بات معلوم کر کے لوگوں کو بتائی جا رہی ہے ۔

۲۔ اس آیت کی ابتداء یہ بتاتی ہے کہ لوگ پہلے بھی ذوالقرنین کے بارے میں بات کیا کرتے تھے ۔ البتہ اس سلسلے میں ان میں اختلاف اور ابہام پایا جاتا تھا ۔ اسی لیے انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے ضروری وضاحتیں چاہیں ۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : ہم نے اسے زمین پر تمکنت عطا کی (قدرت، ثبات قوت اور حکومت بخشی) (انا مکنا له فی الارض) ۔

اور ہر طرح کے وسائل و اسباب اس کے اختیار میں دیئے (و اٰتیناه من کل شیءٍ سببًا) ۔

"سبب" دراصل اس رسی کو کہتے ہیں کہ جس کے ذریعے کھجور کے درختوں پر چڑھتے ہیں ۔ بعد ازاں یہ لفظ ہر قسم کے وسیلے اور ذریعے کے معنی میں بولا جانے لگا ۔ بعض مفسرین نے اس لفظ کو کسی خاص مفہوم میں محدود کرنا چاہا ہے لیکن ظاہر ہے کہ آیت پوری طرح مطلق ہے اور وسیع مفہوم رکھتی ہے اور نشاندہی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو ہر چیز تک پہنچنے کے اسباب عنایت فرمائے تھے ۔ "سبب" کے اس مفہوم میں عقل و درایت، انتظامی صلاحیت، طاقت و قوت، لشکر و افرادی قوت، مادی وسائل غرض ہر قسم کے ایسے مادی وسائل شامل ہیں جو مقاصد کے حصول کے لیے ضروری تھے ۔

اس نے بھی ان سے استفادہ کیا (فاتبع سببًا) ۔ یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام غروب تک پہنچ گیا (حتّٰی اذا بلغ مغرب الشمس) ۔ وہاں اس نے محسوس کیا کہ سورج تاریک اور کیچڑ آلود چشمے یا دریا میں ڈوب جاتا ہے (وجدها تغرب فی عین حمئة) [1]

وہاں اس نے ایک قوم کو دیکھا (کہ جس میں اچھے بُرے ہر طرح کے لوگ تھے) (و وجد عندها قومًا) ۔ تو ہم نے ذوالقرنین سے کہا : کہ تم انہیں سزا دینا چاہو گے یا اچھی جزا (قلنا یا ذا القرنین اما ان تعذب و اما ان تتخذ فیهم حسنًا) [2]

---

[1] "حمئة" دراصل سیاہ بدبودار کیچڑ کے معنی میں ہے دوسرے لفظوں میں یہ "لجن" کے معنی میں ہے (جس کا معنی ہے سیاہ مٹی جو کسی حوض یا نہر کی تہ میں ہوتی ہے) یہ لفظ نشاندہی کرتا ہے کہ ذوالقرنین جس علاقے میں پہنچے تھے وہاں بدبودار کیچڑ بہت زیادہ تھا ۔ یہاں تک کہ غروب آفتاب کے وقت ذوالقرنین کو ایسا لگتا تھا جیسے سورج کالے اس کیچڑ میں ڈوب رہا ہو ۔ جیسے دریا کے پاس سے گزرنے والے مسافروں اور وہاں رہنے والوں کو وقت غروب ایسا لگتا ہے جیسے سورج دریا میں غروب ہو رہا ہے اور طلوع کے وقت ایسا لگتا ہے جیسے دریا سے نکل رہا ہو ۔

[2] جملہ "اما ان تعذب ..." ایسا لگتا ہے جیسے استفہامیہ ہو اگرچہ اس کا ظاہر خبریہ ہے ۔

بعض مفسرین نے لفظ "قلنا" (ہم نے ذوالقرنین سے کہا) سے ان کی نبوت پر دلیل قرار دیا ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس جملے سے قلبی الہام مراد ہو کہ جو غیر انبیاء میں بھی ہوتا ہے لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تفسیر زیادہ تر نبوت کو ظاہر کرتی ہے۔

ذوالقرنین نے "کہا: وہ لوگ کہ جنہوں نے ظلم کیے ہیں، انہیں تو ہم سزا دیں گے" (قال اما من ظلم فسوف نعذبہ)۔ "اور پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے اور اللہ انہیں شدید عذاب کرے گا۔ (ثم یرد الی ربہ فیعذبہ عذابا نکرًا)[1] یہ ظالم و ستمگر دنیا کا عذاب بھی چکھیں گے اور آخرت کا بھی۔

اور رہا وہ شخص کہ جو باایمان ہے اور عمل صالح کرتا ہے اسے اچھی جزا ملے گی (واما من اٰمن و عمل صالحًا فلہ جزاء الحسنیٰ) اور اسے ہم آسان کام سونپیں گے (وسنقول لہ من امرنا یسرًا)۔ اس سے بات بھی محبت سے کریں گے اور اس کے کندھے پر سخت ذمہ داریاں بھی نہیں رکھیں گے اور اس سے زیادہ خراج بھی وصول نہیں کریں گے۔

ذوالقرنین کی اس بیان سے گویا یہ مراد تھی کہ توحید پر ایمان اور ظلم و شرک اور برائی کے خلاف جدوجہد کے بارے میں میری دعوت پر لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہوگا جو اس الٰہی تعمیری پروگرام کو مطمئن ہو کر تسلیم کر لیں گے انہیں اچھی جزا ملے گی اور وہ آرام و سکون سے زندگی گزاریں گے جبکہ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو اس دعوت سے دشمنی پر اتر آئیں گے اور شرک و ظلم اور برائی کے راستے پر ہی قائم رہیں گے انہیں سزا دی جائے گی۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ "من ظلم" کہ جو "من اٰمن و عمل صالحًا" کے مقابلے میں آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ظلم" اس جگہ شرک اور غیر صالح عمل کے معنی میں آیا ہے اور غیر صالح عمل دراصل شرک کے ناپاک درخت کا ایک کڑوا پھل ہے۔

ذوالقرنین نے اپنا مغرب کا سفر تمام کیا اور مشرق کی طرف جانے کا عزم کیا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جو وسائل اس کے اختیار میں تھے اس نے ان سے پھر استفادہ کیا (ثم اتبع سببًا)۔

اور اپنا سفر اسی طرح جاری رکھا یہاں تک کہ سورج کے مرکزِ طلوع تک جا پہنچا (حتّٰی اذا بلغ مطلع الشمس)۔

وہاں اس نے دیکھا سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس سورج کی کرنوں کے علاوہ تن ڈھانپنے کی کوئی چیز نہیں ہے (وجدھا تطلع علٰی قوم لم نجعل لھم من دونھا سترًا)۔

یہ لوگ بہت ہی پست درجے کی زندگی گزارتے تھے یہاں تک کہ برہنہ رہتے تھے یا بہت ہی کم مقدار

---

[1] "نکر" "منکر" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے "نامعلوم" یعنی نامعلوم عذاب کہ جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

لباس پہنتے تھے کہ جس سے ان کا بدن سورج سے نہیں چھپتا تھا۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کو بھی بعید قرار نہیں دیا کہ ان کے پاس رہنے کو کوئی گھر بھی نہ تھے کہ وہ سورج کی تپش سے بچ سکتے۔[1]

اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ لوگ ایسے بیابان میں رہتے تھے کہ جس میں کوئی پہاڑ، درخت، پناہ گاہ اور کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ وہ سورج کی تپش سے بچ سکتے گویا اس بیابان میں ان کے لیے کوئی سایہ نہ تھا۔[2]

بہرحال یہ تمام تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

جی ہاں! ذوالقرنین کا معاملہ ایسا ہی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے اختیار میں (اپنے اہداف کے حصول کے لیے) کیا وسائل تھے (کذلک وقد احطنا بما لدیہ خبرًا)۔

بعض مفسرین نے آیت کی تفسیر میں یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ ذوالقرنین کے کاموں اور پروگراموں میں اللہ کی ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔[3]

---

1. بعض روایات اہل بیت میں پہلی تفسیر بیان ہوئی ہے اور بعض میں دوسری تفسیر آئی ہے اور یہ دونوں ایک دوسری کے منافی نہیں ہیں (نور الثقلین ج ۳ صفحہ [illegible] ملاحظہ فرمائیے)۔
2. تفسیر فی ظلال القرآن۔ اور تفسیر فخرالدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔
3. المیزان، ج ۱۳ ص [illegible]

(۹۲) ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝

(۹۳) حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝

(۹۴) قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤی اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَبَیْنَهُمْ سَدًّا ۝

(۹۵) قَالَ مَا مَكَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ رَدْمًا ۝

(۹۶) اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ۝

(۹۷) فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝

(۹۸) قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ۝

ترجمہ

(۹۲) اس نے پھر ان وسائل سے استفادہ کیا (کہ جو اس کے اختیار میں تھے)۔

(۹۳) (اور اسی طرح اپنا سفر جاری رکھا) یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان

پہنچا اور وہاں ان دوگروہوں سے مختلف ایک ایسا گروہ پایا جس کے لوگ کوئی بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔

(۹۴) (وہ لوگ) کہنے لگے : اے ذوالقرنین ! یاجوج و ماجوج اس سرزمین پر فساد برپا کرتے ہیں کیا ممکن ہے کہ اخراجات تجھے ہم فراہم کریں اور تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دے۔

(۹۵) (ذوالقرنین نے) کہا : اللہ نے جو میرے اختیار میں دیا ہے وہ (اس سے) بہتر ہے (کہ جس کی تم پیشکش کرتے ہو) قوت و طاقت سے میری مدد کرو تاکہ تمہارے اور ان کے درمیان دیوار بنا دوں۔

(۹۶) لوہے کی بڑی بڑی سلیں میرے پاس لے آؤ (اور انہیں ایک دوسرے پر چُن دو) تاکہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کی جگہ پوری طرح چھپ جائے۔ اس کے بعد اس نے کہا (اس کے اطراف میں آگ روشن کرو اور) آگ کو دھونکو یہاں تک کہ (دھونکتے دھونکتے انہوں نے لوہے کی سلوں کو سُرخ انگارہ بنا کر پگھلا دیا اس نے کہا (اب) پگھلا ہوا تانبا میرے پاس لے آؤ تاکہ اسے اس کے اوپر ڈال دوں۔

(۹۷) (آخرکار اُس نے ایسی مضبوط دیوار بنا دی کہ) اب وہ اس کے اوپر نہیں جا سکتے تھے اور نہ ہی اس میں نقب لگا سکتے تھے۔

(۹۸) اُس نے کہا : یہ میرے رب کی رحمت ہے لیکن جب میرے رب کا وعدہ آ پہنچا تو اسے درہم برہم کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ حق ہے۔

تفسیر

ذوالقرنین نے دیوار کیسے بنائی؟

زیرِ نظر آیات میں حضرت ذوالقرنین کے ایک اور سفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے'

اس کے بعد اُس نے حاصل وسائل سے پھر استفادہ کیا (ثم اتبع سببًا) اور اس طرح اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا وہاں ان دو گروہوں سے مختلف ایک اور گروہ کو دیکھا۔ یہ لوگ کوئی بات نہیں سمجھتے تھے۔ (حتّٰی اذا بلغ بین السدین وجد من دونھما قومًا لا یکادون یفقھون قولًا)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کوہستانی علاقے میں جا پہنچے۔ مشرق اور مغرب کے علاقے میں وہ جیسے لوگوں سے ملے تھے یہاں ان سے مختلف لوگ تھے۔ یہ لوگ انسانی تمدن کے اعتبار سے بہت ہی پسماند تھے کیونکہ انسانی تمدن کی سب سے واضح مظہر انسان کی گفتگو ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "لا یکادون یفقھون قولًا" سے یہ مراد نہیں کہ وہ مشہور زبانوں میں سے کسی کو جانتے نہیں تھے بلکہ وہ بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے یعنی فکری لحاظ سے وہ بہت پسماندہ تھے۔

رہا یہ کہ وہ دو پہاڑ کہاں تھے اس سلسلے میں ہم اس واقعے کے دیگر تاریخی اور جغرافیائی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے تفسیری بحث کے آخر میں گفتگو کریں گے۔

اس وقت یہ لوگ یاجوج ماجوج نامی خونخوار اور سخت دشمن سے بہت تنگ اور مصیبت میں تھے۔ ذوالقرنین کہ جو عظیم قدرتی وسائل کے حامل تھے'ان کے پاس پہنچے تو انہیں بڑی تسلی ہوئی۔ انہوں نے ان کا دامن پکڑ لیا اور کہنے لگے: اے ذوالقرنین! یاجوج و ماجوج اس سرزمین پر فساد کرتے ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ خرچ آپ کو ہم دے دیں اور آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں (قالوا یا ذاالقرنین ان یأجوج و مأجوج مفسدون فی الارض فھل نجعل لك خرجًا علیٰ ان تجعل بیننا و بینھم سدًا)۔

وہ ذوالقرنین کی زبان تو نہیں سمجھتے تھے اس لیے ہو سکتا ہے یہ بات انہوں نے اشارے سے کی ہو یا پھر ٹوٹی پھوٹی زبان میں اظہارِ مدعا کیا ہو۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے درمیان مترجمین کے ذریعے بات چیت ہوئی ہو یا پھر خدائی الہام کے ذریعے حضرت ذوالقرنین نے ان کی بات سمجھی ہو جیسے حضرت ذوالقرنین بعض پرندوں سے بات کر لیا کرتے تھے۔

بہرحال اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی اقتصادی حالت اچھی تھی لیکن سوچ بچار، منصوبہ بندی اور صنعت کے لحاظ سے وہ کمزور تھے ۔ لہٰذا وہ اس بات پر تیار تھے کہ اس اہم دیوار کے اخراجات اپنے ذمہ لے لیں اس شرط کے ساتھ کہ ذوالقرنین اس کی منصوبہ بندی اور تعمیر کی ذمہ داری قبول کرلیں ۔

یاجوج ماجوج کے بارے میں انشاء اللہ اس بحث کے آخر میں گفتگو کی جائے گی ۔

اس پر ذوالقرنین نے انہیں جواب دیا : یہ تم نے کیا کہا ؟ اللہ نے مجھے جو کچھ دے رکھا ہے، وہ اس سے بہتر ہے کہ جو تم مجھے دینا چاہتے ہو اور میں تمہاری مالی امداد کا محتاج نہیں ہوں (قال ما مکنی فیہ ربی خیر) ۔

تم قوت و طاقت کے ذریعے میری مدد کرو تاکہ میں تمہارے اور ان دو مفسد قوموں کے درمیان مضبوط اور مستحکم دیوار بنادوں (فاعینونی بقوة اجعل بینکم و بینھم ردمًا) ۔

" ردم " (بروزن " مرد ") بنیادی طور پر پتھر کے ذریعے سوراخ بھرنے کے معنی میں ہے لیکن بعد ازاں یہ لفظ وسیع معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اب ہر قسم کی رکاوٹ اور دیوار کو " ردم " کہتے ہیں یہاں تک کہ اب کپڑے میں پیوند کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ " ردم " مضبوط اور مستحکم " سد " کو کہتے ہیں[1] اس تفسیر کے مطابق ذوالقرنین نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی توقع سے زیادہ مضبوط دیوار بنا دیں گے ۔

ضمناً توجہ رہے کہ " سَدّ " (بروزن " قد " اور " سُدّ " (بروزن " خود ") کا ایک ہی معنی ہے اور وہ ہے " دو چیزوں کے درمیان کوئی رکاوٹ " لیکن مفردات میں راغب نے لکھا ہے کہ ان دونوں لفظوں کے درمیان فرق ہے ۔ " سَدّ " کو وہ انسان کی بنائی ہوئی رکاوٹ یا دیوار سمجھتے ہیں اور " سُدّ " کو فطری اور طبعی رکاوٹ خیال کرتے ہیں ۔

پھر ذوالقرنین نے حکم دیا : لوہے کی بڑی بڑی سلیں میرے پاس لے آو (اٰتونی زبر الحدید) ۔

" زبر " " زبرة " (بروزن " غرفة ") کی جمع ہے ۔ یہ لوہے کے بڑے اور ضخیم ٹکڑے کے معنی میں ہے ۔

جب لوہے کی سلیں آگئیں تو انہیں ایک دوسرے پر چُننے کا حکم دیا " یہاں تک کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کی جگہ پوری طرح چھپ گئی (حتّٰی اذا ساوٰی بین الصدفین) ۔

" صدف " یہاں پہاڑ کے کنارے کے معنی میں ہے ۔ اس لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ پہاڑوں کے دو کناروں کے درمیان ایک کھلی جگہ تھی اور یہیں سے یاجوج و ماجوج داخل ہوتے تھے ۔ ذوالقرنین نے پروگرام بنایا کہ اس خالی جگہ کو بھر دیا جائے ۔

---

[1] یہ بات آلوسی نے روح المعانی میں، فیض کاشانی نے صافی میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں کہی ہے ۔

بہرحال تیسرا حکم ذوالقرنین نے یہ دیا کہ آگ لگانے کا مواد (ایندھن وغیرہ) لے آؤ اور اسے اس دیوار کے دونوں طرف رکھ دو اور اپنے پاس موجود وسائل سے آگ بھڑکاؤ اور اس میں دھونکو یہاں تک کہ لوہے کی سلیں انگاروں کی طرح سرخ ہوکر آخر پگھل جائیں (قال انفخوا حتّٰی اذا جعلہ نارًا)۔

درحقیقت وہ اس طرح لوہے کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دینا چاہتے تھے یہی کام آج کل خاص مشینوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ لوہے کی سلوں کو اتنی حرارت دی گئی کہ وہ نرم ہوکر ایک دوسرے سے مل گئیں۔

پھر ذوالقرنین نے آخری حکم دیا: کہا کہ پگھلا ہوا تانبا لے آؤ تاکہ اسے اس دیوار کے اوپر ڈال دوں (قال اٰتونی افرغ علیہ قطرًا)۔

اس طرح اس لوہے کی دیوار پر تانبے کا لیپ کر کے اسے ہوا کے اثر سے اور خراب ہونے سے محفوظ کر دیا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ سائنس کے مطابق اگر تانبے کی کچھ مقدار لوہے میں ملا دی جائے تو اس کی مضبوطی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ذوالقرنین چونکہ اس حقیقت سے آگاہ تھے اس لیے انہوں نے یہ کام کیا۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ "قطر" کا مشہور معنی "پگھلا ہوا تانبا" ہی ہے لیکن بعض مفسرین نے اس کا معنی "پگھلا ہوا جست" کیا ہے جبکہ یہ خلاف مشہور ہے۔

آخرکار یہ دیوار اتنی مضبوط ہو گئی کہ اب وہ مفسد لوگ نہ اس کے اوپر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب لگا سکتے تھے (فما اسطاعوا ان یظھروہ وما استطاعوا لہ نقبًا)۔

ذوالقرنین نے بہت اہم کام انجام دیا تھا۔ متکبرین کی روش تو یہ ہے کہ ایسا کام کر کے وہ بہت فخر و ناز کرتے ہیں یا احسان جتلاتے ہیں لیکن ذوالقرنین چونکہ مرد خدا تھے لہٰذا انتہائی ادب کے ساتھ کہنے لگے: "یہ میرے رب کی رحمت ہے" (قال ھٰذا رحمۃ من ربی)۔

اگر میرے پاس ایسا اہم کام کرنے کے لیے علم و آگاہی ہے تو یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر مجھ میں کوئی طاقت ہے اور میں بات کر سکتا ہوں تو وہ بھی اس کی طرف سے ہے اور اگر یہ چیزیں اور ان کا ڈھالنا میرے اختیار میں ہے تو یہ بھی پروردگار کی وسیع رحمت کی برکت ہے میرے پاس کچھ بھی میری اپنی طرف سے نہیں ہے کہ جس پر میں فخر و ناز کروں اور میں نے کوئی خاص کام بھی نہیں کیا کہ اللہ کے بندوں پر احسان جتاتا پھروں۔

اس کے بعد مزید کہنے لگے: یہ نہ سمجھنا کہ یہ کوئی دائمی دیوار ہے "جب میرے پروردگار کا حکم آیا تو یہ درہم برہم ہو جائے گی اور زمین بالکل ہموار ہو جائے گی" (فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکاء)۔

اور میرے رب کا، وعدہ حق ہے (وکان وعد ربی حقاً)۔

یہ کہہ کر ذوالقرنین نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اختتام دنیا اور قیامت کے موقع پر یہ سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا۔ البتہ بعض مفسرین نے وعدۂ الٰہی کو انسانی علم کی ترقی کی طرف اشارہ سمجھا ہے یعنی علمی ترقی کے بعد پھر ناقابل عبور دیوار کا کوئی مفہوم نہیں رہے گا مثلاً ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر کے ذریعہ ایسی رکاوٹوں کو ختم کر دیں گے لیکن یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ اس داستان کے تاریخی اور تربیتی نکات: ذوالقرنین کون تھے، مشرق و مغرب کی طرف انہوں نے کس طرح سفر کیا اور ان کی بنائی ہوئی دیوار کہاں ہے؟ اس سلسلے میں ہم انشاء اللہ بعد میں بحث کریں گے۔ قطع نظر اس کی تاریخی مطابقت کے، خود یہ داستان بہت سے تربیتی اور تعمیری نکات کی حامل ہے۔ سب سے زیادہ ان نکات پر غور کیا جانا چاہیئے اور یہی درحقیقت قرآن کا اصل مقصد ہے۔

(۱) اسباب کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں: پہلا درس کہ جو ہمیں یہ داستان سکھاتی ہے یہ ہے کہ اسباب و وسائل سے کام لیے بغیر عالم میں کچھ نہیں ہو سکتا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حضرت ذوالقرنین کو کام کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے اسباب و وسائل عطا کیے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وآتیناہ من کل شیءٍ سبباً

ہم نے اسے ہر طرح کے اسباب عطا کیے۔

نیز فرمایا:

فأتبع سببا

اُس نے بھی ان اسباب سے استفادہ کیا۔

لہٰذا جو لوگ توقع رکھیں کہ درکار اسباب و وسائل مہیا کیے بغیر کامیابی تک پہنچ جائیں وہ کہیں نہیں پہنچ سکتے، چاہے وہ ذوالقرنین ہی کیوں نہ ہوں۔

(۲) کبھی بڑی شخصیت بھی غروب ہو جاتی ہے: سورج کا کیچڑ آلود چشمے میں غروب ہو جانا اگرچہ فریب نظر کا پہلو رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے ہو سکتا ہے سورج اتنا بڑا ہونے کے باوجود کیچڑ بھرے چشمے میں چھپ سکتا ہے جیسے ایک باعظمت انسان اور ایک بلند مقام شخصیت بعض اوقات کسی ایک بڑی لغزش کی وجہ سے اپنے مقام سے گر جاتی ہے اور اس کی شخصیت نگاہوں سے غروب ہو جاتی ہے۔

(۳) تحسین اور سزا دونوں کی ضرورت ہے: کوئی حکومت اپنے اچھے لوگوں کی تحسین و تشویق

کے بغیر اور خطا کاروں کو سزا دیئے اور باز پرس کیے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ اصول ہے جس سے حضرت ذوالقرنین نے استفادہ کیا اور کہا:

جنھوں نے زیادتی اور ظلم کیا ہے انہیں ہم سزا دیں گے اور جو ایمان لائے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں انہیں ہم اچھی جزا دیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام ایک فرمان جاری کیا۔ یہ فرمان نظام مملکت کا ایک جامع دستور العمل ہے۔ اس مشہور حکم میں آپؑ فرماتے ہیں:

ولا یکونن المحسن والمسیئ عندك بمنزلة سواء، فان فی ذٰلك تزهیداً لاهل الاحسان فی الاحسان، وتدریبا لاهل الاساءة علی الاساءة [1]

تیری نگاہ میں نیک اور بد کبھی ایک نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ اس طرح تو نیک لوگ اپنے کام سے بددل ہو جائیں گے اور بُرے بے پرواہ۔

(۴) اتنا بوجھ ڈالنا جو قابل برداشت ہو: عدلِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی پر اتنا بوجھ اور ذمہ داری ڈالی جائے کہ جو اس کے لیے تکلیف دہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ذوالقرنین نے تصریح کی کہ میں ظالموں کو سزا دوں گا اور نیک لوگوں کو اچھی جزا دوں گا اور پھر فرمایا:

مَیں ان کے سامنے آسان پروگرام رکھوں گا۔

یعنی ان کے ذمہ آسان کام لگاؤں گا تاکہ وہ شوق اور رغبت سے یہ کام سرانجام دے سکیں۔

(۵) مختلف علاقے، مختلف حالات اور مختلف تقاضے: ایک وسیع اور ہمہ گیر مملکت مختلف علاقوں میں لوگوں کے مختلف حالات سے بے اعتنا نہیں رہ سکتی۔ ذوالقرنین کہ جو ایک حکومتِ الٰہی کے سربراہ تھے۔ ان کی مملکت کے مختلف خطوں میں مختلف قومیں بستی تھیں۔ ہر قوم کا اپنا رہن سہن اور تمدن تھا۔ ذوالقرنین ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے حسبِ حال سلوک کرتے اور ان سب کو گویا اپنے پَروں کے نیچے رکھتے۔

(۶) ہر قوم کے مسائل حل کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے: ایک قوم کہ جو قرآن کے بقول:

لا یکادون یفقهون قولاً

یعنی۔ بات تک نہ سمجھتی تھی۔ حضرت ذوالقرنین نے اسے بھی اپنی نگاہِ کرم سے دور نہیں رکھا اور جیسے بھی ممکن ہوا ان کا درد دل سنا اور ان کی احتیاج کو پورا کیا۔ آپ نے ان کے اور ان کے دشمن کے درمیان مضبوط دیوار بنا دی۔ ظاہراً نظر نہیں آتا کہ حکومت کے لیے ایسی قوم کوئی فائدہ مند تھی اس کے باوجود

---

[1] نہج البلاغہ، خط ۵۳۔

حضرت ذوالقرنین نے ان کے ساتھ یہ حُسن سلوک روا رکھا اور ان کے مسائل حل کیے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اسماع الاصم من غیر تصخر صدقة هنیئة

اتنی بلند آواز سے بات کرنا کہ بہرہ شخص بھی سُن لے، اچھے صدقے کی مانند ہے بشرطیکہ یہ بلند آواز غصے کے طور پر نہ ہو۔[1]

(۷) امن صحیح معاشرے کیلئے بنیادی شرط ہے: ایک صحیح معاشرے کی زندگی کے لیے امن اولین اور اہم ترین شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیام امن اور مفسدین کو روکنے کے لیے حضرت ذوالقرنین نے بہت باعثِ زحمت کام اپنے ذمے لیا اور نہایت مضبوط دیوار کھڑی کر دی — ایسی دیوار جو تاریخ میں ضرب المثل ہوگئی۔ جیسے کہتے ہیں "دیوارِ سکندری کی طرح" (اگرچہ ذوالقرنین سکندر نہ تھے)۔

اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے وقت اس سرزمین کیلئے جو چیز سب سے پہلے اللہ سے مانگی وہ نعمتِ امن وامان ہی تھی۔ آپؑ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا

بار الٰہا! اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا دے۔ (ابراہیم - ۳۵)

اسی لیے فقہِ اسلام میں ان لوگوں کے لیے سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے جو معاشرے کے امن وامان کو خطرے میں ڈال دیں (سورہ مائدہ - آیہ ۳۳ کی طرف رجوع کریں)۔

(۸) صاحبِ مسئلہ کو خود بھی شریکِ کار ہونا چاہیئے: اس تاریخی واقعے سے ایک اور سبق یہ لیا جاسکتا ہے کہ جن کا کوئی مسئلہ ہے اور جو کسی درد میں مبتلا ہیں انہیں بھی اپنے مسئلے کے حل اور درد کے علاج میں شریک ہونا چاہیئے کیونکہ: ؎

آہِ صاحبِ درد را باشد اثر

جو خود درد میں مبتلا ہو اس کی آہ اثر رکھتی ہے۔

اسی لیے جنہوں نے وحشی قوموں کے حملے کی شکایت کی تھی سب سے پہلے حضرت ذوالقرنین نے انہیں حکم دیا کہ وہ لوہے کی سلیں لے آئیں۔ اس کے بعد آپ نے انہیں لوہے کی دیوار کے گرد آگ روشن کرنے کا حکم دیا۔ پھر پگھلا ہوا تانبا لانے کے لیے کہا تاکہ اسے لوہے پر لیپ دیا جائے۔

اصولی طور پر جنہیں کوئی مسئلہ درپیش ہو، جب کام ان کی شراکت سے انجام پاتا ہے تو ان کی صلاحیتیں بھی ابھرتی ہیں، کام کی کوئی قدر وقیمت بھی ہوتی ہے اور پھر وہ اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں کیونکہ اس میں

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲، لفظ صم۔

ان کی زحمتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

ضمنی طور پر اس سے یہ بھی اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ ایک پسماندہ قوم کو بھی جب کوئی صحیح سرپرست اور منصوبہ بندی میسر آجائے تو وہ بھی بڑے اہم اور محیر العقول کام کرسکتی ہے۔

(۹) خدائی رہبر کی مادیات سے بے اعتنائی: ایک سبق اس داستان سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ ایک خدائی رہبر کو مالِ دنیا اور مادیات سے بے پرواہ اور بے اعتناء ہونا چاہیئے اور جو کچھ اللہ نے اسے عطا کیا ہے اسی پر قناعت کرنا چاہیئے۔ بادشاہ ہر طرف سے اور ہر کسی سے عجیب عجیب ہتھکنڈے استعمال کرکے مال جمع کرنے کی لالچ کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ذوالقرنین کو جب مال کی پیشکش کی گئی تو آپ نے یہ کہہ کر قبول نہ کی کہ:

ما مکنی فیہ ربی خیر

جو کچھ میرے رب نے مجھے دیا ہے وہ بہتر ہے۔

قرآن مجید میں واقعاتِ انبیاء میں ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ ان کی یہ بات بہت بنیادی ہوتی تھی کہ ہماری دعوت تم سے کسی اجر و صلہ کے لیے نہیں اور ہم تم سے کسی اجر کی خواہش نہیں کرتے۔ یہ بات قرآن مجید میں پیغمبر اسلامؐ اور دیگر انبیاء کے بارے میں گیارہ مرتبہ دکھائی دیتی ہے۔ کبھی اس جملے کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ:

ہماری جزا تو خدا کے ذمہ ہے۔

اور کبھی فرمایا گیا ہے:

قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الا المودۃ فی القربٰی (الشوریٰ - ۲۳)

مَیں تم سے اپنے اقرباء سے محبت و مودت کے علاوہ کسی چیز کا تقاضا نہیں کرتا۔

اہلِ بیتؑ سے مودت و محبت کا یہ تقاضا بھی دراصل آئندہ رہبری کی بنیاد کے طور پر ہے۔

(۱۰) کام ہر لحاظ سے ٹھوس اور مضبوط ہونا چاہیئے: کام کو ہر لحاظ سے ٹھوس اور پائیدار کرنا اس داستان کا ایک اور سبق ہے۔ ذوالقرنین نے دیوار تعمیر کرنے کے لیے لوہے کی بڑی بڑی سلیں استعمال کیں اور انہیں آپس میں ملانے اور جوڑنے کے لیے آگ میں پگھلایا۔ نیز دیوار کو ہوا، رطوبت، بارش وغیرہ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر تانبے کا لیپ کر دیا تاکہ لوہا بوسیدہ اور زنگ زدہ نہ ہو۔

(۱۱) تکبر — انسان کو زیبا نہیں: انسان کتنا بھی طاقتور اور صاحبِ قدرت ہو اور بڑے بڑے کام کر گزرے پھر بھی اسے ہرگز اپنے اوپر غرور اور ناز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ وہ درس ہے جو حضرت ذوالقرنین نے سب کو دیا ہے۔ وہ ہر مقام پر قدرت پر بھروسہ کرتے تھے۔ جب دیوار مکمل ہوگئی تو انہوں نے کہا:

ھٰذا رحمۃ من ربی

یہ میرے رب کی رحمت ہے۔

جب انہیں مالی کمک کی پیش کش ہوئی تو کہا :

ما مکنی فیہ ربی خیر

جو کچھ اللہ نے مجھے بخشا ہے وہ اس سے بہتر ہے۔

اور جب آپ نے اس مضبوط دیوار کے درہم برہم ہو جانے کی بات کی تو بھی پروردگار کے وعدۂ حق کا سہارا لیا۔

(۱۲) **اس جہان کی ہر چیز فنا پذیر ہے :** آخرکار تمام چیزیں زائل ہو جائیں گی۔ اس جہان کی مضبوط ترین عمارتیں بھی آخرکار تباہ ہو جائیں گی، اگرچہ وہ لوہے اور فولاد کی بنی ہوں۔ یہ اس داستان کا آخری درس ہے۔ یہ ان تمام لوگوں کے لیے درس ہے جو عملی طور پر دنیا کو جاودانی سمجھتے ہیں اور مال جمع کرنے، منصب و مقام حاصل کرنے کے لیے کسی قانون اور قاعدے کی پرواہ نہیں کرتے اور دنیا کے لیے ایسی حریصانہ کوشش کرتے ہیں کہ گویا موت اور فنا ہے ہی نہیں۔ جبکہ دیوارِ ذوالقرنین تو معمولی چیز ہے، سورج اتنا بڑا ہونے کے باوجود خاموش اور فنا ہو جائے گا، پہاڑ اپنی اتنی مضبوطی کے باوجود دُھنی ہوئی روئی کی مانند اڑ جائیں گے ان سب چیزوں میں انسان تو بہت ہی کمزور سی مخلوق ہے۔ کیا اس حقیقت کے بارے میں غور و خوض انسان کو خود غرضیوں اور خود پرستیوں سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے۔

۲۔ ذوالقرنین کون تھا؟

جس ذوالقرنین کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تاریخی طور پر وہ کون شخص ہے، تاریخ کی مشہور شخصیتوں میں سے یہ داستان کس پر منطبق ہوتی ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے مابین اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں جو بہت سے نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے یہ تین زیادہ اہم ہیں :

پہلا : بعض کا خیال ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے لہٰذا وہ اسے سکندر ذوالقرنین کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس نے اپنے باپ کی موت کے بعد روم، مغرب اور مصر پر تسلط حاصل کیا۔ اس نے اسکندریہ شہر بنایا۔ پھر شام اور بیت المقدس پر اقتدار قائم کیا۔ وہاں سے ارمنستان گیا۔ عراق و ایران کو فتح کیا۔ پھر ہندوستان اور چین کا قصد کیا۔ وہاں سے خراسان پلٹ آیا۔ اس نے بہت سے نئے شہروں کی بنیاد رکھی۔ پھر وہ عراق آگیا۔ اس کے بعد وہ شہر زور میں بیمار پڑا اور مر گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی عمر چھتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کا جسدِ خاکی اسکندریہ لے جا کر دفن کر دیا گیا[1]

دوسرا : مورخین میں سے بعض کا نظریہ ہے کہ ذوالقرنین یمن کا ایک بادشاہ تھا۔ (یمن کے بادشاہ کو "تبع" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کی جمع "تبابعہ" ہے)۔ اصمعی نے اپنی تاریخ عرب قبل از اسلام میں،

---

[1] تفسیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں اور کامل، ابن اثیر، ج ۱، صفحہ ۲۸۷۔ بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے بوعلی سینا نے اپنی کتاب الشفاء میں اس نظریے کا اظہار کیا۔

ابن ہشام نے اپنی مشہور تاریخ "سیرۃ" میں اور ابوریحان بیرونی نے "الآثار الباقیہ" میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔
یہاں تک کہ یمن کی ایک قوم "حمیری" کے شعراء اور زمانۂ جاہلیت کے بعض شعراء کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ذوالقرنین کے اپنے میں سے ہونے پر فخر کیا ہے۔[1]

اس نظریے کی بناء پر ذوالقرنین نے جو دیوار بنائی وہ دیوار مآرب ہے۔

تیسرا: یہ جدید ترین نظریہ ہے جو ہندوستان کے مشہور عالم ابوالکلام آزاد نے پیش کیا ہے۔ ابوالکلام آزاد کسی دَور میں ہندوستان کے وزیرِ تعلیم تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔[2] اس نظریے کے مطابق ذوالقرنین، کورش کبیر بادشاہ ہخامنشی ہے۔

پہلے اور دوسرے نظریے کے لیے کوئی خاص تاریخی مدرک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے ذوالقرنین کی جو صفات بیان کی ہیں ان کا حامل اسکندر مقدونی ہے نہ کوئی بادشاہ یمن۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسکندر مقدونی نے کوئی معروف دیوار بھی نہیں بنائی۔

رہی وہ یمن کی دیوارِ مآرب، تو اس میں ان صفات میں سے ایک بھی نہیں جو قرآن کی ذکر کردہ دیوار میں ہیں۔ کیونکہ قرآن کے مطابق دیوارِ ذوالقرنین لوہے اور تانبے سے بنائی گئی ہے اور یہ دیوار وحشی اقوام کو روکنے کے لیے بنائی گئی تھی جبکہ دیوارِ مآرب عام مسالے سے بنائی گئی ہے اور اس کی تعمیر کا مقصد پانی کا ذخیرہ کرنا اور سیلابوں سے بچنا تھا۔ اس کی وضاحت خود قرآن نے سورہ سبا میں کی ہے۔

لہٰذا ہم اپنی بحث کو زیادہ تر تیسرے نظریے پر مرتکز کرتے ہیں۔ یہاں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ چند امور کی طرف خوب توجہ دی جائے:

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ "ذوالقرنین" کا معنی ہے "دو سینگوں والا"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا۔

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ نام اس لیے پڑا کہ وہ دنیا کے مشرق و مغرب تک پہنچے کہ جسے عرب "قرنی الشمس" (سورج کے دو سینگ) سے تعبیر کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ نام اس لیے ہوا کہ انہوں نے دو قرن زندگی گزاری یا حکومت کی۔

پھر یہ کہ قرن کی مقدار کتنی ہے، اس میں بھی مختلف نظریات ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ان کے سر کے دونوں طرف ایک خاص قسم کا ابھار تھا اس وجہ سے ذوالقرنین

---

[1] المیزان، ج ۱۳ صفحہ ۴۱۳۔

[2] فارسی میں اس کتاب کے ترجمے کا نام "ذوالقرنین یا کورش کبیر" رکھا گیا ہے۔ بہت سے معاصر مفسرین اور مؤرخین نے اپنی کتب میں اس نظریے کی موافقت کی ہے اور اس پر اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کیا ہے۔

مشہور ہو گئے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ان کا خاص تاج دو شاخوں والا تھا۔

اس کے علاوہ بھی نظریات ہیں، جن کا ذکر بات کو طویل کرے گا۔ بہرحال ہم دیکھیں گے کہ ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں تیسرا نظریہ پیش کرنے والے یعنی ابوالکلام آزاد نے اپنے نظریے کے اثبات کے لیے اس لقب "ذوالقرنین" سے بہت استفادہ کیا ہے۔

(ب) قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ممتاز صفات کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اسباب ان کے اختیار میں دیئے تھے۔ انہوں نے تین اہم لشکر کشیاں کیں۔ پہلے مغرب کی طرف، پھر مشرق کی طرف اور آخر میں ایک ایسے علاقے کی طرف کہ جہاں ایک کہستانی درّہ موجود تھا۔ ان مسافرت میں وہ مختلف اقوام سے ملے۔ ان کی تفصیل آیات کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وہ ایک مردِ مومن، موحّد اور مہربان شخص تھے۔ وہ عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ اسی بنا پر اللہ کا لطفِ خاص ان کے شاملِ حال تھا۔ وہ نیکوں کے دوست اور ظالموں کے دشمن تھے۔ انہیں دنیا کے مال و دولت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ اللہ پر بھی ایمان رکھتے تھے اور روزِ جزاء پر بھی۔ انہوں نے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی۔ یہ دیوار انہوں نے اینٹ اور پتھر کی بجائے لوہے اور تانبے سے بنائی (اور اگر دوسرے مصالحے بھی استعمال ہوئے ہوں تو ان کی بنیادی حیثیت نہ تھی)۔ اس دیوار بنانے سے ان کا مقصد مستضعف اور ستم رسیدہ لوگوں کی یاجوج و ماجوج کے ظلم و ستم کے مقابلے میں مدد کرنا تھا۔

وہ ایسے شخص تھے کہ نزولِ قرآن سے قبل ان کا نام لوگوں میں مشہور تھا۔ لہٰذا قریش اور یہودیوں نے ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سوال کیا تھا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

یسئلونک عن ذی القرنین

تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

البتہ قرآن سے کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو صراحت سے ان کے نبی ہونے پر دلالت کرے اگرچہ ایسی تعبیرات قرآن میں موجود ہیں کہ جو اس مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں، جیسا کہ آیات کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے بہت سی ایسی روایات منقول ہیں جن میں ہے کہ:

وہ نبی نہ تھے بلکہ اللہ کے ایک صالح بندے تھے[1]

(ج) یہ نظریہ کہ ذوالقرنین — کورش کبیر — کو کہتے ہیں، اس کی دو بنیادیں ہیں:

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۲۹۴ و صفحہ ۲۹۵ کی طرف رجوع کریں۔

پہلو، یہ کہ اُس کے بارے میں رسولِ اسلامؐ سے سوال کرنے والے یہودی تھے یا یہودیوں کی تحریک پر قریش تھے۔ جیسا کہ ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں منقول روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کتبِ یہود کو دیکھا جانا چاہیئے۔

یہودیوں کی مشہور کتابوں میں سے کتاب دانیال کی آٹھویں فصل میں ہے:

"بل شفرہ" کی سلطنت کے سال مجھ دانیال کو خواب دکھایا گیا۔ جو خواب مجھے دکھایا گیا اس کے بعد اور خواب میں، مَیں نے دیکھا کہ مَیں ملک "عیلام" کے "قصرِ شوشان" میں ہوں۔ مَیں نے خواب میں دیکھا کہ مَیں "دریائے ولادی" کے پاس ہوں۔ مَیں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا کہ ایک مینڈھا دریا کے کنارے کھڑا ہوگیا ہے۔ اس کے دو سینگ تھے۔ اور یہ بلند سینگ تھے۔ اور اس مینڈھے کو مَیں نے مغرب، مشرق اور جنوب کی سمت سینگ مارتے ہوئے دیکھا۔ کوئی جانور اس کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا تھا اور کوئی اس کے ہاتھ سے بچانے والا نہ تھا۔ وہ اپنی رائے پر ہی عمل کرتا تھا اور وہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔۔۔[1]

اس کے بعد اسی کتاب میں دانیال کے بارے میں ہے:

جبریل اس پر ظاہر ہوا اور اس کے خواب کی یوں تعبیر کی:

دو شاخوں والا مینڈھا جو تُو نے دیکھا ہے وہ مدائن اور فارس (یا ماد اور فارس) کے بادشاہ ہیں۔

یہودیوں نے دانیال کے خواب کو بشارت قرار دیا۔ وہ سمجھے کہ ماد و فارس کے کسی بادشاہ کے قیام اور بابل کے حکمرانوں پر ان کی کامیابی سے یہودیوں کی غلامی اور قید کا دَور ختم ہوگا اور وہ اہلِ بابل کے چنگل سے آزاد ہوں گے۔

زیادہ دیر نہ گزری کہ "کورش" نے ایران کی حکومت پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ اس نے ماد اور فارس کو ایک ملک کرکے دونوں کو ایک عظیم سلطنت بنا دیا۔ جیسے دانیال کے خواب میں بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے سینگ مغرب، مشرق اور جنوب کی طرف مارے گا، کورش نے تینوں سمتوں میں عظیم فتوحات حاصل کیں۔

اس نے یہودیوں کو آزاد کیا اور فلسطین جانے کی اجازت دی۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ تورات کی کتاب اشعیا، فصل ۴۴، شمارہ ۲۸ میں ہے:

اس وقت خصوصیت سے کورش کے بارے میں فرماتا ہے کہ میرا چرواہا وہی ہے میری مشیت کو اس نے پورا کیا ہے۔ اور شلیم سے کہے گا کہ تو تعمیر ہوگا۔

---

[1] کتاب دانیال، فصل ششم، پہلے سے چوتھے جملے تک۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ تورات کی بعض تعبیرات میں کورش کے بارے میں ہے کہ :

عقابِ مشرق اور مردِ تدبیر کہ جو بڑی دُور سے بلایا جائے گا۔[1]

دوسری بنیاد یہ ہے کہ انیسویں عیسوی صدی میں استخر کے قریب دریائے مرغاب کے کنارے کورش کا مجسمہ دریافت ہوا ہے ۔ یہ ایک انسان کے قدو قامت کے برابر ہے ۔ اس میں کورش کے عقاب کی طرح کے دو پَر بنائے گئے ہیں اور اس کے سر پر ایک تاج ہے ۔ اس میں مینڈھے کے سینگوں کی طرح کے دو سینگ نظر آتے ہیں ۔

یہ مجسمہ بہت قیمتی ہے اور قدیم فنِ سنگ سازی کا نمونہ ہے ۔ اس نے ماہرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ہے ۔ جرمنی کے ماہرین کی ایک جماعت نے صرف اسے دیکھنے کے لیے ایران کا سفر کیا ۔

تورات کے مندرجات کو جب اس مجسمے کی تفصیلات کے ساتھ ملا کر دیکھا تو ابوالکلام آزاد کو مزید یقین ہوا کہ کورش کو ذوالقرنین (دو سینگوں والا) کہنے کی وجہ کیا ہے ۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہو گیا کہ کورش کے مجسمے میں عقاب کے دو پَر کیوں لگائے گئے ہیں ۔ اس سے علماء کے ایک گروہ کے لیے ذوالقرنین کی تاریخی شخصیت پوری طرح واضح ہو گئی ۔

ایک چیز کہ جو اس نظریے کی تائید کرتی ہے وہ کورش کے تاریخ میں لکھے گئے اخلاقی اوصاف ہیں ۔

یونانی مؤرخ ہرودوت لکھتا ہے :

کورش نے حکم جاری کیا کہ اس کے سپاہی سوائے جنگ کرنے والوں کے کسی کے سامنے تلوار نہ نکالیں اور دشمن کا جو سپاہی اپنا نیزہ خم کر دے اسے قتل نہ کریں ۔ کورش کے لشکر نے اس کے حکم کی اطاعت کی ۔ اس طرح سے کہ ملت کے عام لوگوں کو مصائبِ جنگ کا احساس تک نہ ہوا ۔

ہرودوت اس کے بارے میں مزید لکھتا ہے :

کورش کریم ، سخی ، بہت نرم دل اور مہربان بادشاہ تھا ۔ اسے دوسرے بادشاہوں کی طرح مال جمع کرنے کی حرص نہ تھی بلکہ اسے یہ لالچ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کرم و عطا کرے ۔ وہ ستم رسیدہ لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کرتا تھا اور جس چیز سے زیادہ خیر اور بھلائی ہوتی اسے پسند کرتا تھا ۔

ایک اور مؤرخ ذی نوفن لکھتا ہے :

کورش عاقل اور مہربان بادشاہ تھا ۔ اس میں بادشاہوں کی عظمت ، حکماء کے فضائل

---

[1] کتاب اشعیاء ، فصل ۴۶ ، شمارہ ۱۱ ۔

کے ساتھ ساتھ تھی۔ اُس کی ہمت بلند تھی اور اُس کا جود و کرم زیادہ تھا۔ اس کا شعار انسانیت کی خدمت تھا اور عدالت اس کی عادت تھی۔ وہ تکبر کی بجائے انکساری کا مرقع تھا۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ کورش کی اس قدر تعریف و توصیف کرنے والے مؤرخین غیر ہیں، کورش کی قوم اور وطن سے ان کا تعلق نہیں ہے بلکہ اہلِ یونان ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ یونان کے لوگ کورش کی طرف دوستی اور محبت کی نظر سے نہ دیکھتے تھے کیونکہ کورش نے لیدیا کو فتح کر کے اہلِ یونان کو بہت بڑی شکست دی تھی۔

اس نظریے کے حامی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ذوالقرنین کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ کورش کے اوصاف سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر، کورش نے مشرق، مغرب اور شمال کی طرف سفر بھی کیے ہیں۔ ان سفروں کا حال اس کی تاریخ میں تفصیل طور پر مذکور ہے۔ یہ سفر قرآن میں ذکر کیے گئے ذوالقرنین کے سفروں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ کورش نے پہلی لشکرکشی لیدیا پر کی۔ یہ ایشیائے کوچک کا شمالی حصہ ہے۔ یہ ملک کورش کے مرکزِ حکومت سے مغرب کی طرف تھا۔

ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کا نقشہ سامنے رکھیں تو ہم دیکھیں گے کہ ساحل کے زیادہ تر حصے چھوٹی چھوٹی خلیجوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً ازمیر کے قریب کہ جہاں خلیج ایک چشمے کی صورت دھار لیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے اپنے مغرب کے سفر میں محسوس کیا کہ جیسے سورج کیچڑ آلود چشمے میں ڈوب رہا ہے۔ یہ وہی منظر ہے جو کورش نے غروبِ آفتاب کے وقت ساحلی خلیجوں میں دیکھا تھا۔

کورش کی دوسری لشکرکشی مشرق کی طرف تھی۔ جیسا کہ ہرودوت نے کہا ہے کہ کورش کا یہ مشرقی حملہ لیدیا کی فتح کے بعد ہوا خصوصاً بعض بیابانی وحشی قبائل کی سرکشی نے کورش کو اس حملے پر اکسایا۔

قرآن کے الفاظ میں:

حتّٰی اذا بلغ مطلع الشمس وجدھا تطلع علٰی قوم لم نجعل لھم من دونھا سترًا

پھر وہ سورج کے مرکزِ طلوع تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس سورج کی کرنوں سے بچنے کیلئے کوئی سایہ نہ تھا۔

یہ الفاظ کورش کے سفرِ مشرق کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ جہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسی قوم پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس اس کی تپش سے بچنے کیلئے کوئی سایہ نہ تھا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ قوم صحرا نورد تھی اور بیابانوں میں رہتی تھی۔

کورش نے تیسری چڑھائی شمال کی طرف قفقاز کے پہاڑوں کی جانب کی۔ یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں

کے درمیان ایک درّے میں پہنچا، یہاں کے رہنے والوں نے وحشی اقوام کے حملوں اور غارتگری کو روکنے کی درخواست کی۔ اس پر کورش نے اس تنگ درّے میں ایک مضبوط دیوار تعمیر کر دی۔

اس درّے کو آج کل درّہ داریال کہتے ہیں۔ موجودہ نقشوں میں یہ "ولادی کیوکز" اور "تفلیس" کے درمیان دکھایا جاتا ہے۔ وہاں اب تک ایک آہنی دیوار موجود ہے۔ یہ وہی دیوار ہے جو کورش نے تعمیر کی تھی۔ قرآن نے ذوالقرنین کی دیوار کے جو اوصاف بتائے ہیں وہ پوری طرح اس دیوار پر منطبق ہوتے ہیں۔

تیسرے نظریے کی تقویت کے لیے ہم نے خلاصے کے طور پر یہ کچھ بیان کیا ہے [1]

یہ ٹھیک ہے کہ اس نظریے میں بھی ابہام کے ابھی بہت سے پہلو موجود ہیں لیکن عملاً ذوالقرنین کی تاریخ کے بارے میں ابھی تک جتنے نظریے پیش کیے گئے ہیں اسے ان میں سے بہترین کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ دیوارِ ذوالقرنین کہاں ہے؟ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ اسے مشہور دیوارِ چین پر منطبق کریں کہ جو اس وقت موجود ہے اور کئی سو کلو میٹر لمبی ہے لیکن واضح ہے کہ دیوارِ چین لوہے اور تانبے سے نہیں بنی ہوئی اور نہ وہ کسی چھوٹے کوہستانی درّے میں ہے۔ وہ تو ایک عام مصالحے سے بنی ہوئی دیوار ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے کئی سو کلو میٹر لمبی ہے اور اب بھی موجود ہے۔

بعض کا اصرار ہے کہ یہ وہی دیوارِ مآرب ہے کہ جو یمن میں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دیوارِ مآرب ایک کوہستانی درّے میں بنائی گئی ہے لیکن وہ سیلاب کو روکنے کے لیے اور پانی ذخیرہ کرنے کے مقصد سے بنائی گئی ہے اور ویسے بھی وہ لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے۔

جبکہ علماء و محققین کی گواہی کے مطابق سرزمین قفقاز میں دریائے خزر اور دریائے سیاہ کے درمیان پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے کہ جو ایک دیوار کی طرح شمال اور جنوب کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے اس میں ایک ہی دیوار کی طرح کا درّہ موجود ہے جو مشہور درّہ داریال ہے۔ یہاں اب تک ایک قدیم تاریخی لوہے کی دیوار نظر آتی ہے۔ اسی بناء پر بہت سے لوگوں کا نظریہ ہے کہ دیوارِ ذوالقرنین یہی ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ وہیں قریب ہی "سائرس" نامی ایک نہر موجود ہے اور "سائرس" کا معنی "کورش" ہی ہے (کیونکہ یونانی "کورش" کو "سائرس" کہتے تھے)۔

ارمنی کے قدیم آثار میں اس دیوار کو "بھاگ گورائی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس لفظ کا معنی ہے "درہ کورش" یا "معبر کورش" (کورش کے عبور کرنے کی جگہ)۔ یہ سند نشاندہی کرتی ہے کہ اس دیوار کا بانی کورش ہی تھا [2]

۴۔ یاجوج ماجوج کون ہیں؟ قرآن مجید کی دو سورتوں میں یاجوج ماجوج کا ذکر آیا ہے ایک

---

[1] و [2] مزید وضاحت کے لیے کتاب "ذوالقرنین یا کورش کبیر" اور "فرہنگ قصص قرآن" کی طرف رجوع فرمائیں۔

زیر بحث آیات میں اور دوسرا سورہ انبیاء کی آیت ۹۶ میں۔

آیات قرآن واضح طور پر گواہی دیتی ہیں کہ یہ دو وحشی خونخوار قبیلوں کے نام تھے۔ وہ لوگ اپنے اردگرد رہنے والے پر بہت زیادتیاں اور ظلم کرتے تھے۔

تورات کی کتاب حزقیل فصل ۳۸ اور ۳۹ میں نیز کتاب "رؤیائے یوحنا" کی بیسویں فصل میں انہیں "گوگ" اور "ماگوگ" کہا گیا ہے کہ عربی میں جنہیں "یاجوج ماجوج" ہی کہا جائے گا۔

عظیم مفسر علامہ طباطبائی نے المیزان میں لکھا ہے کہ تورات کی ساری باتوں سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج یا یاجوج و ماجوج ایک یا کئی ایک بڑے بڑے قبیلے تھے۔ یہ شمالی ایشیا کے دور دراز علاقے میں رہتے تھے۔ یہ جنگجو، غارت گر اور ڈاکو قسم کے لوگ تھے۔[1]

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ عبرانی زبان کے الفاظ ہیں لیکن دراصل یونانی زبان سے عبرانی میں منتقل ہوئے ہیں۔ یونانی میں ان کا تلفظ "گاگ" اور "ماگاگ" تھا۔ دیگر یورپی زبانوں میں بھی یہ الفاظ اسی شکل میں منتقل ہوئے ہیں۔

تاریخ کے بہت سے دلائل کے مطابق زمین کے شمال مشرق مغولستان کے اطراف میں گزشتہ زمانوں میں انسانوں کا گویا جوش مارتا ہوا چشمہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کی آبادی بڑی تیزی سے پھلتی اور پھولتی تھی۔ آبادی زیادہ ہونے پر یہ لوگ مشرق کی سمت یا نیچے جنوب کی طرف چلے جاتے تھے اور سیل رواں کی طرح ان علاقوں میں پھیل جاتے تھے اور پھر تدریجاً وہاں سکونت اختیار کر لیتے تھے۔ تاریخ کے مطابق سیلاب کی مانند ان قوموں کے اٹھنے کے مختلف دور گزرے ہیں۔ ان میں ایک حملہ ان وحشی قبائل نے چوتھی صدی عیسوی میں آتیلا کی کمان میں کیا۔ اس حملے میں روم کا شاہی تمدن خاک میں مل گیا۔

ایک اور دور کہ جو ان کے حملوں کا تقریباً آخری دور شمار ہوتا ہے، وہ بارہویں صدی ہجری میں چنگیز خاں کی سرپرستی میں ہوا۔ انہوں نے مسلمان اور عرب ممالک پر حملہ کیا۔ اس حملے میں بغداد جیسے بہت سے شہر تباہ و برباد ہو گئے۔

کورش کے زمانے میں بھی ان کی طرف سے ایک حملہ ہوا۔ یہ تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح کی بات ہے لیکن اس زمانے میں ماد اور فارس کی متحدہ حکومت معرض وجود میں آچکی تھی لہٰذا حالات بدل گئے اور مغربی ایشیا ان قبائل کے حملوں سے آسودہ خاطر ہو گیا۔

لہٰذا یہ زیادہ صحیح لگتا ہے کہ یاجوج اور ماجوج انہی وحشی قبائل میں سے تھے۔ جب کورش ان علاقوں کی طرف گئے تو قفقاز کے لوگوں نے درخواست کی کہ انہیں ان قبائل کے حملوں سے بچایا جائے۔ لہٰذا اس نے وہ مشہور دیوار تعمیر کی ہے جسے "دیوار ذوالقرنین" کہتے ہیں۔[2]

---

[1] المیزان، ج ۱۳ صفحہ ۴۱۱۔

[2] تفصیل کے لیے مذکورہ کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

(۹۹) وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ۝

(۱۰۰) وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا ۝

(۱۰۱) الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَنْ ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ۝

(۱۰۲) أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ۝

ترجمہ

(۹۹) اس دن (کہ جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی) ہم انہیں اس طرح سے چھوڑ دیں گے کہ وہ باہم موجزن ہوں گے۔ اس روز صور پھونکا جائے گا اور ہم انہیں نئی زندگی عطا کر کے سب کو جمع کریں گے۔

(۱۰۰) اس روز ہم جہنم کو کافروں کے سامنے پیش کریں گے۔

(۱۰۱) وہی کہ جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا، جو مجھے یاد نہیں کرتے تھے اور جو کچھ نہ سن سکتے تھے۔

(۱۰۲) کیا کافروں کو یہ گمان ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا سرپرست بنا سکتے ہیں اور ہم نے جہنم کو کافروں کی منزل قرار دے رکھا ہے۔

تفسیر

بے ایمانوں کا ٹھکانا

گزشتہ آیات میں بتایا گیا تھا کہ یاجوج و ماجوج کو روکنے کے لیے ایک دیوار بنائی گئی تھی اور یہ دیوار قیامت کے موقع پر درہم برہم ہو جائے گی۔ اسی مناسبت سے زیر بحث آیات میں قیامت کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس روز کہ جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی تو ہم انہیں چھوڑ دیں گے اور وہ باہم موجزن ہوں گے (وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض)۔

"یموج" اس موقع پر لوگوں کی کثرت کی وجہ سے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ فلاں موقع پر لوگوں کا دریا موجزن تھا یا پھر یہ لفظ اضطراب اور لرزنے کی طرف اشارہ ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اس دن لوگوں کے بدن پر کپکپی طاری ہوگی گویا اُن کے جسم پانی کی لہروں کی طرح لرز رہے ہوں گے۔

البتہ ان دونوں تفسیروں میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس تعبیر سے یہ دونوں پہلو مراد ہوں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس دن صور پھونکا جائے گا۔ ہم انہیں نئی زندگی بخشیں گے اور ان سب کو جمع کریں گے (ونفخ فی الصور فجمعناھم جمعًا)۔

اس میں شک نہیں کہ تمام انسان اس میدان میں جمع ہوں گے اور کوئی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔

"جمعناھم جمعًا" کی تعبیر بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

آیاتِ قرآن سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے اختتام اور دوسرے جہان کے آغاز میں دو بڑی عظیم تبدیلیاں عالم میں رونما ہوں گی۔

پہلی عظیم تبدیلی یہ ہوگی کہ تمام موجودات اور انسان فنا ہو جائیں گے۔ یہ ایک ضرب کا پروگرام ہے۔

دوسری عظیم تبدیلی معلوم نہیں کہ پہلے تحوّل و تغیر سے کتنی دیر بعد ہوگی اور وہ ہے مُردوں کا قبروں سے اٹھنا۔ یہ بھی ایک ضرب کا پروگرام ہے۔

قرآن نے "نفخ فی الصور" کہہ کر ان پروگراموں کی طرف اشارہ کیا ہے ——— انشاء اللہ ہم سورہ زمر کی آیت ۶۸ کے ذیل میں اس کی تفصیل بیان کریں گے۔

اس مقام پر ایک روایت ہے کہ جو اصبغ بن نباتہ نے حضرت علی علیہ السلام سے نقل کی ہے۔ امامؑ نے "ترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض" کی تفسیر میں فرمایا:

اس سے مراد قیامت ہے۔[1]

ہوسکتا ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے یہ روایت اس کے منافی ہو کیونکہ ہم نے اسے فناءِ دنیا کا ایک مرحلہ قرار دیا ہے (جیسا کہ قبل اور بعد کی آیات کا ظاہری مفہوم نکلتا ہے)۔ لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ سے یہ اشکال ختم ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات "یوم قیامت" وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ جس میں قیامت کے مقدمات بھی شامل ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اس کے مقدمات میں فناءِ دنیا کے مرحلے بھی شامل ہیں۔

اس کے بعد کفار کے حالات کے بارے میں بات شروع ہوتی ہے۔ ان کی صفات جو ان کے انجام کی موجب ہیں، وہ بھی بیان کی گئی ہیں اور ان کے اعمال کا انجام بھی۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم اس روز جہنم ان کے سامنے پیش کر دیں گے (وعرضنا جھنم یومئذ للکافرین عرضا)۔

جہنم اپنے طرح طرح کے عذاب اور مختلف دردناک سزاؤں کے ساتھ ان کے سامنے پوری طرح آشکار ہوگی۔ اسے دیکھنا بھی ان کے لیے ایک دردناک اور جانکاہ عذاب ہے چہ جائیکہ گرفتارِ عذابِ جہنم ہونا۔

یہ کون سے کافروں کا ذکر ہے اور وہ اس انجام کو کیوں پہنچیں گے، اس سلسلے میں قرآن ان کا یوں تعارف کرواتا ہے: وہی کہ جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا اور جو حق کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ انہیں میری یاد آتی (الذین کانت اعینھم فی غطاءٍ عن ذکری)۔

وہی کہ جن کے کان تو تھے لیکن تابِ سماعت نہ تھی (وکانوا لا یستطیعون سمعًا)۔

دراصل وہ لوگ تلاشِ حق اور ادراکِ حقائق کا نہایت اہم وسیلہ کہ جو خوش بختی و بدبختی کا عامل ہے، بے کار کر چکے ہیں۔ یعنی ان کی دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان بیکار ہو چکے ہیں۔ غلط افکار، تعصب، کینہ پروری اور بُری صفات کی وجہ سے ان کی بصارت اور سماعت گویا بے کار ہو چکی ہے۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ آنکھ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا لہٰذا انہیں میری یاد سجھائی نہیں دیتی تھی۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ وہ غفلت کے پردے میں تھے اس لیے انہوں نے آثارِ الٰہی نہیں دیکھے اس لیے حقیقت کو افسانہ سمجھ کر اللہ کو بھول چکے ہیں۔

جی ہاں! حق کا چہرہ آشکار ہے اور اس جہان کی ہر چیز انسان کے ساتھ بات کرتی ہے۔ صرف چشمِ بینا اور گوشِ شنوا کی ضرورت ہے۔

دوسرے لفظوں میں یادِ خدا کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو آنکھ سے دیکھی جائے۔ جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ

---

[1] تفسیر المیزان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ تفسیر عیاشی۔

اس کے آثار ہیں اور یہی آثار اس کی یاد کا سبب ہیں۔

اگلی آیت میں ان کے انحراف کی بنیادی وجہ بتائی گئی ہے۔ یہی وہ انحراف ہے جو دیگر انحرافات کا باعث ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا کافروں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ میری بجائے میرے بندوں کو اپنا ولی و سرپرست بنا سکتے ہیں (افحسب الذین کفروا ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء)۔

یہ بندے کہ جنہیں معبود بنایا گیا ہے مثلاً حضرت عیسیٰؑ اور فرشتے، ان کا مقام جس قدر بھی بلند ہو، کیا ان کے پاس کوئی چیز خود اپنی طرف سے بھی ہے کہ وہ کسی کی خدا کی بجائے سرپرستی کر سکیں یا اس کے برعکس جو کچھ بھی ان کے پاس ہے وہ بھی خدا کی طرف سے ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی اس کی ہدایت کے محتاج ہیں۔

یہ ایسی حقیقت ہے جو کافروں نے بھلا رکھی ہے اور شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: جہنم کو ہم نے کافروں کی منزل کے طور پر تیار کیا ہے اور اسی منزل پر ان کا استقبال ہوگا (انا اعتدنا جھنم للکافرین نزلاً)۔

"نزل" (بروزن "رُسُل") منزل کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس چیز کے لیے بھی جو مہمان کی پذیرائی کے لیے تیار کی جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلی چیز ہے کہ جو مہمان کو پیش کی جاتی ہے مثلاً شربت یا پھل وغیرہ کہ جو مہمان کو آنے سے پہلے پیش کرتے ہیں۔

(۱۰۳) قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝

(۱۰۴) الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝

(۱۰۵) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝

(۱۰۶) ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ۝

(۱۰۷) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝

(۱۰۸) خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ۝

ترجمہ

(۱۰۳) کہہ دو: کیا ہم تمہیں خبر دیں کہ زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟

(۱۰۴) وہ کہ جن کی ساری کوششیں دنیاوی زندگی میں بھٹک کے رہ گئی ہیں اور اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں۔

(۱۰۵) وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہوں نے آیاتِ ربانی اور اللہ کی ملاقات کا انکار کیا ہے۔ اسی بناء پر اُن کے سارے اعمال اکارت ہو گئے ہیں لہٰذا قیامت کے دن ان کے لیے ہم میزانِ حساب قائم نہیں کریں گے۔

(۱۰۶) ان کی سزا جہنم ہے کیونکہ انہوں نے کفر اختیار کیا اور یہ لوگ میری آیتوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

(۱۰۷) رہے وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے تو باغاتِ فردوس ان کی منزل ہے۔

(۱۰۸) اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور کبھی یہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش نہیں کریں گے۔

تفسیر

سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟

ان آیات میں اور ان کے بعد سورہ کے آخر تک بے ایمان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں ان آیات میں بلکہ اس پوری سورت میں مختلف جگہوں پر جو بحثیں آئی ہیں انہیں جمع کر دیا گیا ہے۔ خصوصاً اصحاب کہف، موسیٰ و خضرؑ اور ذوالقرنین کی جدوجہد اور مخالفین کے مقابلے میں ان کے طرزِ عمل سے مربوط مباحث کا ان آیات میں ایک طرح سے نچوڑ آگیا ہے۔

سب سے پہلے تو ان لوگوں کا ذکر ہے کہ جو زیادہ خسارے میں ہیں اور انسانوں میں سب سے زیادہ بدبخت ہیں۔ لیکن سننے والوں کے احساسِ جستجو کو تحریک دینے کے لیے اس اہم مسئلے پر گفتگو سوالیہ انداز میں کی گئی ہے۔ رسول اللہ کو حکم دیا گیا ہے کہ کہہ دو: کیا تمہیں ان لوگوں کے بارے میں خبر نہ دوں کہ جو لوگوں میں سب سے زیادہ خسارے میں ہیں (قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً)۔

فوراً ہی خود جواب دیا گیا ہے تاکہ سننے والا زیادہ دیر تک متحیر نہ رہے۔ زیادہ خسارے میں وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوششیں حیاتِ دنیا میں بھٹک کے رہ گئی ہیں مگر پھر بھی ان کا خیال ہے کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں (الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعاً)۔

یقیناً نقصان صرف یہ نہیں ہے کہ انسان مادی مفادات گنوا بیٹھے بلکہ حقیقی نقصان تو یہ ہے کہ انسان اصل سرمایہ ہی کھو دے — عقل و ہوش، خداداد صلاحیتیں، عمر، جوانی اور صحت و سلامتی سے بڑھ کر کون سا سرمایہ ہو سکتا ہے۔ یہی چیزیں ہیں کہ جن کا ماحصل انسانی اعمال ہیں اور ہمارے عمل ہماری استعداد اور طاقت کی ایک مجسم شکل کے ہوتے ہیں۔

جب یہ قوتیں اور صلاحیتیں بے ہودہ اعمال کی شکل اختیار کرلیں تو گویا یہ سب ضائع ہوگئیں اور راہ گم کردہ ہوگئیں ۔ یہ بالکل ایسے ہے کہ انسان بہت زیادہ دولت لے کر بازار کو نکلے لیکن اسے راستے میں گنوا دے اور خالی ہاتھ لوٹ آئے ۔ البتہ جب انسان سمجھ جاتے کہ میں اپنا سرمایہ گنوا بیٹھا ہوں تو نقصان زیادہ خطرناک نہیں کیونکہ یہ نقصان اس کے لیے آئندہ سبق بن جائے گا۔ یہ درس بعض اوقات اس کھو جانے والے سرمائے کے برابر ہوتا ہے اور کبھی اس سے بھی زیادہ قیمتی ۔ایسا کہ گویا اس نے کچھ نہیں گنوایا۔

لیکن حقیقی اور کئی گنا نقصان اس صورت میں ہے کہ انسان اپنا مادی اور روحانی سرمایہ کسی غلط اور کج راستے پر گنوا دے اور خیال کرے کہ اس نے اچھا کام کیا ہے ، وہ اپنے کاموں سے کوئی نتیجہ حاصل کرے، نہ اس نقصان سے کوئی سبق اور نہ ایسے کاموں کے تکرار سے بچے ۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ یہاں " اخسرین اعمالاً " کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں حالانکہ "اخسرین عملاً" ہونا چاہیئے تھا (کیونکہ تمیز عام طور پر مفرد ہوتی ہے) ۔

ہوسکتا ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ وہ ایک ہی بازار عمل میں نقصان کا شکار ہوئے بلکہ اُن کا جہل مرکب زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام اعمال میں نقصان کا سبب بنا ہے ۔

دوسرے لفظوں میں انسان کسی ایک تجارت میں نقصان کر بیٹھتا ہے اور دوسرے کاروبار میں فائدہ حاصل کرلیتا ہے ۔سال کے آخر میں حساب کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا لیکن بدبختی یہ ہے کہ انسان جہاں بھی سرمایہ کاری کرتا ہے تمام شعبوں میں نقصان اٹھاتا ہے ۔

ضمناً "ضل"۔ یعنی گم کر بیٹھنا اور بھٹک جانا کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کے اعمال بالکل ختم اور نابود نہیں ہوجاتے ۔ جیسے مادہ اور توانائی ہمیشہ شکل بدلتے رہتے ہیں ختم نہیں ہوتے لیکن کبھی گم ہوجاتے ہیں ۔ان اعمال کے آثار چونکہ دکھائی نہیں دیتے اور ان سے کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا تو یہ گویا گمشدہ سرمایہ ہیں جو ہماری دسترس میں نہیں ہے اور نہ ہمارے کسی کام کا ہے ۔

اس سلسلے میں کہ انسان کی نفسیاتی طور پر یہ کیفیت کیوں ہوتی ہے ہم "چند اہم نکات" کے ذیل میں بات کریں گے۔

اگلی آیات میں اس نقصان اٹھانے والے گروہ کی صفات اور عقائد و نظریات بیان کیے گئے ہیں اور چند ایسی صفات بیان کی گئی ہیں جو تمام بدبختیوں کی جڑ ہیں ۔ ارشاد ہوتا ہے ، وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی آیات کو للکارتے ہیں (اولئك الذین کفروا بأیات ربھم) ۔

وہ ان آیات سے کفر کرتے ہیں کہ جو آنکھ کو بصارت اور کان کو شنوائی عطا کرتی ہیں ، وہ آیات کہ جو غرور کے پردوں کو چاک کرکے حقیقت کا چہرہ انسان کے سامنے نمایاں کردیتی ہیں ۔ مختصر یہ کہ وہ آیات جو نور اور روشنی ہیں اور جو انسان کو اوہام کے ظلمات سے باہر نکال دیتی ہیں اور سرزمین حقائق کی طرف ہدایت کرتی ہیں آیاتِ الٰہی سے کفر اختیار کرنے اور خدا کو فراموش کرنے کے بعد وہ لقائے الٰہی کے بھی منکر ہوگئے

ہیں (ولقائه)۔

جی ہاں ! جب تک معاد پر ایمان مبداء پر ایمان کے ساتھ نہ ہو اور انسان یہ احساس نہ کرے کہ کوئی طاقت اس کے اعمال کی نگران ہے اور سب اس کی عظیم، دقیق اور سخت عدالت میں پیش ہوں گے، وہ اپنے اعمال کی صحیح جانچ پرکھ نہیں کرے گا اور اس کی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: مبداء و معاد اسی انکار اور کفر کی وجہ سے ان کے اعمال اکارت ہو گئے ہیں (فحبطت اعمالهم)۔ جیسے ایک تیز رفتار آندھی تھوڑی سی خاکستر کو نابود کر دیتی ہے۔

اور چونکہ ان کا کوئی ایسا عمل نہیں کہ جو ناپ تول کے لائق ہو یا جس کی کوئی اہمیت ہو لہٰذا ان کیلئے روزِ قیامت کوئی میزان قائم نہیں کی جاتے گی (فلا نقيم لهم يوم القيامة وزنًا)۔

کیونکہ وزن اور ناپ تول تو وہاں ہوتا ہے جہاں بساط میں کچھ ہو۔ جن کی بساط میں کچھ بھی نہیں ان کیلئے میزان اور ناپ تول کی کیا ضرورت ہے۔

اس کے بعد ان کے انحراف، بدبختی اور نقصان کا تیسرا عامل بیان کیا گیا ہے نیز ان کا کیفرِ کردار بھی بتایا گیا ہے: ارشاد ہوتا ہے، ان کی سزا جہنم ہے، اس لیے کہ وہ کافر ہو گئے ہیں اور میری آیتوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑاتے ہیں (ذٰلك جزاؤهم جهنم بما كفروا واتخذوا اٰياتي ورسلي هزوًا)[1]

اس طرح انہوں نے نہ صرف عقائد کے تین بنیادی اصولوں، توحید، نبوت اور قیامت سے کفر اختیار کیا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کا مذاق اڑایا ہے۔

ان آیات سے کفار اور ان لوگوں کا کردار و انجام واضح ہو گیا کہ جو زیادہ خسارے میں ہیں۔ اب مومنین اور ان کے انجام کی باری ہے تاکہ دونوں کا موازنہ ہو جائے اور اس طرح صورتِ حال بالکل واضح ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے: وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے باغاتِ فردوس ان کی منزل ہے (ان الذين اٰمنوا وعملوا الصالحات كانت لهم جنّات الفردوس نزلاً)۔

---

[1] "ذٰلك جزاءهم جهنم" کی ترکیب اور جمع بندی کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض "ذٰلك" کو مبتدا اور "جزاؤهم" کو خبر اور "جهنم" کو "ذٰلك" کا بدل سمجھتے ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے علماء مبتدا کو محذوف اور "ذٰلك" کو اس کی خبر جانتے ہیں اور "جزاؤهم جهنم" کو بھی وہ دوسرا مبتدا، خبر سمجھتے ہیں۔ ان کے لحاظ سے تقدیر یوں ہوگا۔

الامر ذٰلك جزاؤهم جهنم

معاملہ کچھ یوں ہے کہ ان کی جزا جہنم ہے۔

لیکن واضح ہے کہ پہلا بیان زیادہ مناسب ہے۔

جیسا کہ بعض بزرگ مفسرین نے کہا ہے "فردوس" ایک ایسا باغ ہے جس میں تمام ضروری نعمتیں جمع ہیں اور اس طرح سے "فردوس" جنت کے بہترین باغوں میں سے ہے، اور کسی نعمت کا کمال تبھی ہوگا جب اسے زوال نہ ہو لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: وہ ان باغاتِ بہشت میں سدا رہیں گے (خالدین فیھا)۔

انسان کی طبیعت اگرچہ جدت پسند اور وہ ہمیشہ تنوع، تغیر اور تبدل چاہتا ہے لیکن فردوس کے باسی کبھی بھی نقل مکانی اور تبدیلی کی خواہش نہیں کریں گے۔ (لا یبغون عنھا حولاً)۔

اس بنا پر کہ وہ جو کچھ چاہیں گے وہاں موجود ہے یہاں تک کہ تنوع اور تکامل بھی ۔ جیسا کہ "چند اہم نکات" کے ذیل میں ہم وضاحت کریں گے۔

چند اہم نکات

۱۔ "اخسرین اعمالاً" کون لوگ ہیں؟ ہم نے اپنی اور دوسروں کی زندگی میں بہت دیکھا ہے کہ کبھی انسان غلط کام انجام دیتا ہے جبکہ وہ سمجھتا رہتا ہے کہ اس نے اچھا اور اہم کام انجام دیا ہے۔ ایسا جہل مرکب لحظہ بھر کے لیے بھی ہو سکتا ہے، سال بھر کے لیے بھی اور عمر بھر کے لیے بھی، اور واقعاً اس سے بڑی بدبختی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ نقصان میں ہیں تو اس کی وجہ واضح ہے۔ جو لوگ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن یہ جانتے ہیں کہ ہم غلط کام کر رہے ہیں اکثر وہ اپنے غلط کام کی ایک حد مقرر کر لیتے ہیں اور بسا یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ حق کی طرف پلٹ آتے ہیں اور اس کی تلافی کے لیے توبہ کرتے ہیں اور نیک اعمال انجام دیتے ہیں۔

لیکن وہ گنہگار کہ جو اپنے گناہ کو عبادت اور بُرے اعمال کو صالحات اور کجی کو درستی خیال کرتے ہیں وہ نہ صرف تلافی کے لیے کوشش نہیں کرتے بلکہ شدت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھنے کی سعی کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنا تمام تر سرمایۂ وجود اس راستے پر صرف کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ قرآن نے ان لوگوں کے بارے میں کیا عمدہ الفاظ کہے ہیں:

اخسرین اعمالاً

جو اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں۔

اسلامی روایات میں "اخسرین اعمالاً" کی مختلف تفسیریں آئی ہیں ان میں سے ہر ایک اس وسیع مفہوم کے کسی واضح مصداق کی طرف اشارہ ہے اور یہ تفسیریں اس کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کر دیتیں۔

اصبغ بن نباتہ نے ایک حدیث امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے روایت کی ہے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو امامؑ نے فرمایا:

اس سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں۔ پہلے یہ لوگ حق پر تھے بعد میں انہوں نے اپنے دین میں بدعتیں ایجاد کرلیں۔ یہ بدعتیں انہیں انحرافی راستے کی طرف لے جاتی ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام انجام دے رہے ہیں [1]

ایک اور حدیث امام امیرالمومنینؑ ہی سے منقول ہے کہ مذکورہ بالا گفتگو کے بعد فرمایا:

خوارج نہروان بھی ان سے کوئی زیادہ دور نہیں ہیں [2]

ایک اور حدیث میں خاص طور پر رہبانوں (تارک الدنیا مَردوں اور عورتوں) اور مسلمانوں میں سے بدعتی گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے [3]

بعض روایات میں بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے مراد امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے منکر ہیں [4]

راہب ایک عمر گرجے میں طرح طرح کی محرومیوں کے ساتھ گزار دیتے ہیں، شادی نہیں کرتے، اچھا لباس اور اچھی غذا ترک کر دیتے ہیں، گرجے میں بیٹھے رہنے کو ہر کام پر ترجیح دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کی یہ محرومیاں قربِ خدا کا باعث ہیں ــ کیا یہ لوگ ـ اخسرین اعمالاً" کا مصداق نہیں ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ کوئی الٰہی دین عقل و فطرت کے قانون کے برخلاف انسان کو معاشرتی زندگی سے نکال کر گوشہ نشینی کی دعوت دے اور اس کام کو قربِ الٰہی کا سرچشمہ قرار دے۔

اسی طرح وہ لوگ کہ جنہوں نے اللہ کے دین میں کسی بدعت کی بنیاد رکھی ہے۔ توحید کی جگہ تثلیث کے عقیدے کو دے دی ہے اور اللہ کے بندے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا ہے اور اللہ کے پاک دین میں اسی طرح کی اور بدعتیں داخل کر دیں، اس گمان سے کہ وہ ایک خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کیا ایسے لوگ دنیا کے سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے نہیں ہیں۔

نہروان کے تہی مغز اور عقل دشمن جو سب سے بڑے گناہ (مثلاً حضرت علیؑ اور مسلمانوں کے نیک افراد کو شہید کرنے کو) موجبِ تقربِ خدا سمجھتے تھے، یہاں تک کہ جنت کو صرف اپنے لیے مختص سمجھتے تھے، کیا یہ سب سے زیادہ خسارے والے لوگ نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ آیت ایسا وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ بہت سی گزشتہ، موجودہ اور آئندہ اقوام اس میں شامل ہیں۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس خطرناک حالت کا سرچشمہ کیا ہے؟

---

[1] تا [3] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۳۱۲۔

[4] تفسیر نور الثقلین، ج ۳، صفحہ ۳۱۱۔

یقیناً ان غلط خیالات کے اہم ترین عوامل میں شدید تعصب، غرور، ہٹ دھرمی، خود پرستی اور حبِ ذات شامل ہے۔

کبھی دوسروں کی چاپلوسی، گوشہ نشینی اور اکیلے ہی خود سے فیصلہ کرنا بھی اس منزلت کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔ اس حالت میں انسان کو اپنے تمام انحرافی اور بُرے اعمال و افکار اچھے لگتے ہیں، وہ ان پر احساسِ ندامت کی بجائے احساسِ تفخر کرنے لگتا ہے جیسا کہ ایک اور جگہ قرآن فرماتا ہے:

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا

کیا وہ شخص کہ جسے اپنے بُرے عمل بھلے لگتے ہیں اور وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے (فاطر۔ ۸)۔

قرآن حکیم کی بعض دیگر آیتوں میں ان برائیوں کی تزئین کا عامل شیطان کو قرار دیا گیا ہے اور مسلّم ہے کہ انسانی وجود میں شیطان کا ظہور بُرے اخلاق اور غلط عادات ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ

وہ وقت یاد کرو جب شیطان نے مشرکین کے اعمال کو ان کی نظر میں زینت دی اور (جنگِ بدر کے) میدان میں ان سے کہا کہ کوئی شخص تم پر فتح حاصل نہیں کر سکتا اور میں خود اس میدان میں تمہارے ساتھ شریک ہوں۔ (انفال۔ ۴۸)

قرآن مجید فرعون کے مشہور برج کا واقعہ بیان کر کے کہتا ہے:

وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ

اس طرح فرعون کو اس کا بُرا عمل اچھا لگا (کہ وہ ایسے احمقانہ اور مضحکہ خیز کاموں کے ذریعہ اللہ کا مقابلہ کرتا اور گمان کرتا کہ وہ کوئی اہم کام انجام دے رہا ہے)۔ (مومن۔ ۳۷)

۲۔ **لقاء اللہ کیا ہے؟** بعض عالم نما بیہودہ افراد نے اس قسم کی آیات سے یہ مطلب نکالا ہے کہ اللہ کو دوسرے جہان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں نے یہاں لقائے الٰہی سے حسّی ملاقات مراد لی ہے۔

لیکن واضح ہے کہ حسّی ملاقات کے لیے جسم ضروری ہے اور جسم کے لیے محدود ہونا، محتاج ہونا اور فنا پذیر ہونا ضروری ہے اور ہر عقلمند جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صفات کا حامل نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا اس میں شک نہیں کہ قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں "ملاقات" اور "رؤیت" کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے وہاں ملاقات حسّی مراد نہیں ہے بلکہ شہودِ باطنی مراد ہے یعنی قیامت میں انسان آثارِ خداوندی کو ہر زمانے سے زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکے گا، اسے دل کی آنکھ سے دیکھ سکے گا اور وہاں اللہ پر اس کا ایمان شہودی ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ آیاتِ قرآن کے مطابق ہٹ دھرم ترین منکرینِ خدا قیامت میں اعتراف کریں گے

کیونکہ انہیں انکار کی کوئی راہ سجھائی نہ دے گی۔[1]

بعض مفسرین نے اس تعبیر کا یہ مفہوم سمجھا ہے کہ وہاں انسان نعمتیں اور جزاء و ثواب دیکھے گا اور اسی طرح اللہ کے عذاب و سزا کا مشاہدہ کرے گا۔ انہوں نے درحقیقت نعمت و ثواب وجزا کو مقدر سمجھا ہے۔[2] یہ دو تفاسیر اگرچہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں تاہم پہلی زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے۔

۴۔ **اعمال کا وزن:** اس امر کی ضرورت نہیں کہ اعمال کے وزن کے مسئلے کی قیامت میں تجسّم اعمال کے حوالے سے تفسیر کی جائے اور یہ کہیں کہ قیامت میں انسانی اعمال وزن والے جسم کی صورت اختیار کرلیں گے کیونکہ "وزن کرنا" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کا اندازہ لگانا اور وزن کرنا شامل ہے مثلاً جن افراد کی کوئی حیثیت نہ ہو انہیں بے وزن یا ہلکے لوگ کہتے ہیں حالانکہ مراد ان کی حیثیت کی نفی ہے نہ کہ ان کے وزن کی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں "اخسرین اعمالاً" کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

روزِ قیامت ان کے لیے میزان و ترازو قائم نہیں کیا جائے گا۔

جبکہ ایسی آیات بھی ہیں جو کہتی ہیں:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ

اس روز وزن حق ہے۔ (اعراف-۸)

کیا یہ آیات ایک دوسرے کے منافی ہیں؟ یقیناً نہیں کیونکہ وزن تو ان کے اعمال کا ہوگا جنہوں نے ایسے اعمال کیے ہیں جو وزن کرنے کے قابل ہیں لیکن وہ شخص کہ جس کا سارا وجود اور جس کے افکار و اعمال ایک مکھی کے پر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ اس کے لیے وزن کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

اسی لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک مشہور روایت ہے:

انه ليأتي الرجل العظيم السمين يوم القيامة لا يزن جناح بعوضة

روزِ قیامت کچھ موٹے تازے افراد لائے جائیں گے جن کا وزن عدالت میں مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا۔[3]

کیونکہ اس جہان میں ان کی شخصیت، اعمال اور افکار سب کھوکھلے ہوں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں مختلف قسم کے لوگ ہوں گے:

(۱) وہ افراد کہ جن کی نیکیاں اتنی وزنی ہوں گی کہ ان کے وزن اور حساب کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ

---

[1] سورہ مومنون کی آیت ۱۰۶ کی طرف رجوع کریں۔

[2] تفسیر مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

لوگ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔

(ii) وہ افراد کہ جن کے اعمال بالکل حبط اور باطل ہو جائیں گے یا پھر جن کے لیے کوئی نیکی ہوگی ہی نہیں کہ جس کے لیے میزان کی ضرورت پڑے۔ یہ لوگ بھی بغیر حساب کے جہنم میں داخل ہو جائیں گے۔

(iii) تیسرا گروہ ان افراد کا ہوگا جن کی کچھ نیکیاں ہوں گی اور کچھ بدیاں۔ میزان اور ترازو کی ضرورت ان کے لیے ہوگی اور شاید بیشتر لوگ اسی تیسری قسم میں شامل ہوں گے۔

۴۔ "لا یبغون عنها حولاً" کی تفسیر : "حول" (بروزن "ملل") مصدری معنی رکھتا ہے اس کا معنی ہے "تحول" اور نقل مکانی۔ جیسا کہ ہم نے آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ "فردوس" جنت کا ایسا باغ ہے جس میں سب نعماتِ الٰہی موجود ہیں اسی بنار پر فردوس اس جہان کی بہترین جگہ ہوگی۔ لہٰذا اس کے ساکنین وہاں سے نقل مکانی کی ہرگز تمنا نہ کریں گے۔

ہوسکتا ہے سوال کیا جائے کہ پھر تو وہاں کی زندگی یکسانیت اور جمود کا شکار ہوگی اور یہ خود ایک بہت بڑا عیب ہے۔

ہم جواب میں کہیں گے کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ تحول و تکامل کا عمل اسی مقام دائمی پر جاری ہے۔ یعنی تکامل وارتقار کے اسباب وہاں موجود ہوں گے اور انسان نے اس جہان میں جو اعمال انجام دیے ہیں اور اللہ نے اسے جو اس جہان میں نعمتیں عطا کی ہیں سب ہمیشہ تکامل پذیر رہیں گی۔

متعلقہ آیات کے ذیل میں انشاء اللہ تکاملِ انسان کے بارے میں ہم تفصیل سے بحث کریں گے نیز بہشت میں تکامل کا یہ عمل جاری رہنے سے متعلق گفتگو کریں گے۔

۵۔ فردوس کن کا مقام ہے؟ جیسا کہ کہا گیا ہے فردوس[1] جنت میں بہترین اور افضل ترین مقام ہے۔ زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ فردوس باایمان اور اعمالِ صالح انجام دینے والے لوگوں کا ٹھکانا ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ کیا جنت کے دوسرے علاقوں میں رہنے والا کوئی نہیں ہوگا کیونکہ غیر مومن تو جنت میں جا ہی نہیں سکتا۔

اس سوال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ زیر نظر آیات ہر اس شخص کی طرف اشارہ نہیں کر رہیں کہ جو باایمان ہے اور نیک کام کرتا ہے بلکہ ایمان اور عمل صالح کے لحاظ سے جو افراد بلند درجے پر فائز ہوں گے وہی فردوس میں داخل ہوسکیں گے۔ ظاہر آیت اگرچہ مطلق ہے لیکن فردوس کے مفہوم کی طرف توجہ کی جائے تو آیت کا مفہوم مقید و محدود ہو جاتا ہے۔

---

[1] بعض کہتے ہیں کہ اصل میں یہ لفظ رومی زبان سے لیا گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ حبشہ کی زبان سے عربی میں منتقل ہوا ہے (تفسیر فخر رازی اور تفسیر مجمع البیان)۔

اسی لیے سورۂ مومنین میں جہاں فردوس کے وارثوں کی صفات بیان کی گئی ہیں وہاں مومنین کی نہایت اعلیٰ صفات کا ذکر ہے اور یہ صفات سب میں نہیں ہوتیں۔ یہ امر خود اس بات کے لیے قرینہ ہے کہ فردوس میں رہنے والے افراد ایمان اور عمل صالح کے علاوہ ممتاز صفات کے حامل ہوں گے۔

اسی بناء پر ایک حدیث کہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، اُس میں ہم نے پڑھا ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں:

جب اللہ سے جنت کا تقاضا کرو تو خصوصیت سے فردوس کا تقاضا کرو کہ جو جنت کی جامع ترین اور اکمل ترین منزلوں میں سے ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ باایمان افراد کی ہمت ہر چیز کے بارے میں اور ہر حالت میں عالی ہونا چاہیئے یہاں تک کہ بہشت کی تمنا میں بھی نچلے مراحل پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے اگرچہ نچلے مرحلے بھی نعمات الٰہی سے معمور ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس قسم کا تقاضا کرتا ہے تو ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ایسے مقام تک پہنچانے کے لیے تیار بھی کرے، بہترین انسانی صفات اپنائے اور صالح ترین اعمال سرانجام دے۔

لہٰذا جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کرے ہمیں جنت میں ٹھکانا مل جائے چاہے نچلے درجے میں ہی ہو وہ سچے مومنین کی اعلیٰ ہمت سے پوری طرح بہرہ ور نہیں ہیں۔

۱۰۹ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝

۱۱۰ قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ۝

ترجمہ

۱۰۹۔ کہہ دو: سمندر میرے پروردگار کے کلمات (لکھنے کے لیے) سیاہی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے میرے پروردگار کے کلمات ختم نہیں ہوں گے اگرچہ ایسے ہی (سمندر) ان کے ساتھ اور بڑھا دیے جائیں۔

۱۱۰۔ کہہ دو: میں تو تم جیسا بشر ہوں (البتہ میری خصوصیت یہ ہے کہ) مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ پس جو شخص اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ عمل صالح انجام دے اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے۔

شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس سے منقول ہے:

یہودیوں نے جب پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ آیت سنی:

وما اوتيتم من العلم الا قليلاً

تمہیں تو تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

توانہوں نے کہا یہ بات کیونکر صحیح ہوسکتی ہے جبکہ ہمیں تورات دی گئی ہے اور جسے تورات دی گئی ہے اس کے پاس خیرکثیر ہے اس وقت یہ (مندرجہ بالا پہلی) آیت نازل ہوئی (اور بتایا کہ ہمارے پاس جو علم ہے وہ اللہ کے لامتناہی علم کے مقابلے میں ناچیز ہے)۔

بعض کہتے ہیں کہ یہودیوں نے پیغمبر اسلامؐ سے کہا:

خدا نے تجھے حکمت دی ہے۔ ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً (اور جسے حکمت دی گئی ہے اُسے تو خیرکثیر مل گیا) لیکن جب ہم تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں تو تُو مبہم سا جواب دیتا ہے۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی (اور اس نے نشاندہی کی ہے کہ انسان کے پاس جتنا بھی علم ہو اللہ کے ناپیدا کنار علم کے مقابلے میں ناچیز ہے)۔[1]

تفسیر

جو لقائے الٰہی کی امید رکھتے ہیں

یہ آیات مستقل اور جاری بحث کا حصّہ ہیں اور ان کا تعلق اس سورت کے تمام مباحث سے ہے۔ کیونکہ اس سورہ میں مذکورہ تینوں اہم واقعات نئے اور عجیب وغریب مطالب سے پردہ ہٹاتے ہیں۔ گویا قرآن ان آیات میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ خدا کے علم کے مقابلے میں اصحاب کہف، موسیٰ و خضر اور ذوالقرنین کے واقعات سے آگاہی کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ تمام کائنات اور عالم ہستی کا ماضی، حال اور مستقبل اس کے علم کا حصّہ ہیں۔

بہرحال قرآن زیر بحث پہلی آیت میں رسولِ اکرمؐ سے کہتا ہے: کہہ دو: اگر سمندر میرے رب کے کلمات لکھنے کے لیے سیاہی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے، میرے رب کے کلمات ختم نہیں ہوں گے اگرچہ ہم ان جیسے سمندروں کا اضافہ بھی کر دیں (قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولوجئنا بمثلہ مدداً)۔

«مداد» سیاہی کے معنی میں ہے یا پھر اس کا معنی ہے وہ رنگین مادہ جس کے ساتھ لکھا جائے۔ دراصل یہ لفظ «مد» بمعنی «کشش» سے لیا گیا ہے کیونکہ اس کی کشش سے خطوط آشکار اور واضح ہوتے ہیں۔[2]

---

[1] تفسیر قرطبی، ج ۶، صفحہ ۴۱۰ اور صفحہ ۴۱۱۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں اور تفسیر صافی سورہ بنی اسرائیل آیہ ۸۵ کے ذیل میں۔

[2] فخرالدین رازی نے «مداد» کے مفہوم کے بارے میں ایک اور معنی بھی نقل کیا ہے اور وہ ہے «ایسا تیل جو چراغ میں ڈالتے ہیں اور جو روشنی کا سبب بنتا ہے» غور سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں معانی کی بنیاد ایک ہی ہے۔

"کلمات" (کلمہ کی جمع) ان الفاظ کے معنی میں ہے کہ جن کے ذریعے بات کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ لفظ ہے جو معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس جہان کی ہر چیز کیونکہ پروردگار کے علم و قدرت پر دلالت کرتی ہے لہٰذا بعض اوقات ہر موجود پر "کلمۃ اللہ" کا اطلاق ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ تعبیر اہم اور باعظمت موجودات کے لیے استعمال ہوئی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے:

اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ اَلْقَاھَآ اِلٰی مَرْیَمَ

عیسیٰ اللہ کا کلمہ تھا کہ جو مریم کی طرف القاء کیا گیا۔ (نساء ۔ ۱۷۱)

زیرِ بحث آیت میں بھی "کلمہ" اسی معنی میں ہے یعنی جہانِ ہستی کے موجودات کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے ہر ایک پروردگار کی گوناگوں صفات کی حکایت کرتا ہے۔

دراصل اس آیت میں قرآن اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ یہ گمان نہ کرو کہ عالم ہستی یہی کچھ ہے جو تم دیکھ رہے ہو یا جانتے ہو یا محسوس کرتے ہو بلکہ یہ کائنات اس قدر وسیع و عظیم ہے کہ اگر تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور اس سے ان موجودات کے نام، صفات اور خصوصیات لکھیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے لیکن جہانِ ہستی کے موجودات کا احصاء و شمار نہیں ہو پائے گا۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ "البحر" یہاں جنس کا مفہوم رکھتا ہے۔ اسی طرح "ولو جئنا بمثلہ مددا" میں لفظ "مثل" بھی جنس کا معنی دیتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر سمندروں کی مثل و مانند کا اضافہ بھی کر دیا جائے تو بھی کلماتِ الٰہی ختم نہیں ہوں گے۔ اسی بناء پر زیرِ بحث آیت سورہ لقمان کی اس سے ملتی جلتی آیت سے کوئی تضاد نہیں رکھتی۔ سورہ لقمان کی وہ آیت یہ ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْۢ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ

روئے زمین کے سب درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر اور ان کے علاوہ سات سمندر اور سیاہی بن جائیں (تاکہ کلماتِ الٰہی کو لکھ سکیں) تو اس کے کلمات ہرگز ختم نہیں ہوں گے (لقمان ۔ ۲۷)۔

یعنی یہ قلمیں گھس جائیں گی اور ان سیاہیوں کا آخری قطرہ تک ختم ہو جائے گا لیکن جہانِ ہستی کے اسرار و حقائق ابھی باقی ہوں گے۔

ایک اہم بات کہ جس کی طرف اس مقام پر توجہ ضروری ہے یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت ماضی و حال اور مستقبل کے لحاظ سے جہانِ ہستی کی وسعت کی غماز ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم کی بھی ترجمان ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ تمام چیزیں جو عالم ہستی کی وسعت میں تھیں، یا اس وقت

یعنی اللہ تعالیٰ ان کا علمی احاطہ رکھتا ہے بلکہ اس کا علم چونکہ حضوری علم ہے اس لیے ان موجودات سے جدا نہیں ہوسکتا (غور کیجئے گا)۔

دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ اگر زمین کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام درخت قلمیں بن جائیں تو ہرگز اس پر قادر نہیں کہ جو کچھ اللہ کے علم میں ہے اسے رقم کرسکیں۔

لامتناھی کی تصویر کشی

اس مقام پر قرآن مجید نے لامتناہی تعداد کا تصور، اللہ کے علم بے پایاں کا مفہوم اور جہانِ ہستی کی وسعت کو ہمارے افکار و اذہان سے قریب کرنے کے لیے بہت ہی فصیح و بلیغ انداز اختیار کیا ہے اور زندہ و جاندار اعداد سے استفادہ کیا ہے۔

لیکن کیا اعداد بھی زندہ اور مُردہ ہوتے ہیں؟

جی ہاں! وہ اعداد جو ریاضیات میں استعمال ہوتے ہیں۔ صحیح اعداد کی دائیں طرف بہت سارے صفر لگاکر جو اعداد بنتے ہیں درحقیقت مردہ اعداد ہیں۔ وہ ہرگز کسی چیز کی عظمت مجسم نہیں کرتے۔

جن لوگوں کا ریاضیات سے تعلق ہے وہ جانتے ہیں اگر ایک کے دائیں طرف ایک کلومیٹر تک صفر لگا دیئے جائیں تو یہ بہت بڑا اور پریشان کن عدد بن جائے گا اور واقعاً اس کی بڑائی کا تصور مشکل ہے لیکن کن اشخاص کے لیے؟ — ریاضی دانوں کے لیے۔ جبکہ عام لوگوں کے لیے اس سے کوئی عظمت مجسم نہیں ہوتی۔

زندہ عدد وہ ہے جو جہاں تک خود آگے بڑھے ہماری فکر کو بھی اپنے ساتھ لے جائے اور جس طرح کی حقیقت ہے اسے اسی طرح نظروں کے سامنے مجسم کردے۔ ایسا عدد زندہ ہے جو روح رکھتا ہو، عظمت رکھتا ہو اور زبان رکھتا ہو۔

قرآن یہ نہیں کہتا کہ عالم ہستی کی وسعت میں خدا کی مخلوقات اس عدد سے بھی زیادہ ہیں کہ جس کی دائیں طرف ایک سو کلومیٹر تک صفر لگے ہوں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر سیاہی بن جائیں تو قلمیں ختم ہو جائیں گی اور سیاہی تمام ہو جائے گی لیکن عالم ہستی کے حقائق و اسرار، موجوداتِ عالم اور معلومات الٰہی ختم نہیں ہوں گی۔

خوب غور کیجئے — ایک قلم لکھنے کی کس قدر طاقت رکھتا ہے۔ پھر غور کیجئے — ایک درخت کی ایک چھوٹی سی شاخ سے کتنے قلم بنتے ہیں۔ پھر ایک تنومند بہت بڑے درخت سے کتنے ہزار یا کتنے لاکھ قلم بنیں گے۔ پھر روئے زمین پر باغوں اور جنگلوں میں موجود سارے درختوں پر ایک نظر ڈالیے اور ان سے جو قلم تیار ہو سکتے ہیں — ان کا اندازہ کیجئے۔

اب سوچیے ۔ سیاہی کے ایک قطرے سے کتنے لفظ لکھے جا سکتے ہیں پھر اس عدد کو ایک تالاب کے قطروں سے ضرب دیجیے ۔ اسی طرح ایک دریا، ایک سمندر کا حساب کیجیے اور آخر کار روئے زمین کے تمام دریاؤں اور سمندروں کے قطروں کا اندازہ کیجیے ۔ اب دیکھیے کیسا عجیب وغریب عدد بنتا ہے ۔

اس بات کی عظمت اور بھی واضح ہوگی جب ہم اس حقیقت کی طرف توجہ دیں کہ "سبع" (سات) کا عدد بیاں تعداد کے لیے نہیں بلکہ تکثیر کے مفہوم میں آیا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے دریا اور سمندر اور بھی آملیں اور سیاہی بن جائیں تو بھی کلمات الٰہی ختم نہیں ہوں گے ۔

غور کیجیے کہ یہ عدد کس قدر زندہ اور جاندار ہے ۔ یہ وہ عدد ہے جو فکرِ انسانی کو اپنے ساتھ ساتھ لیے چلتا ہے اور لامتناہی عدد کی طرف آگے لے جاتا ہے ۔

یہ ایسا عدد ہے کہ ریاضی دان ہو یا کوئی اَن پڑھ ۔ اس کی عظمت کا ادراک کر سکتا ہے اور اس کی وسعت اور بڑائی سے آشنا ہو سکتا ہے ۔

جی ہاں ! علم خدا اس عدد سے بھی بالاتر ہے ۔

اس کا علم ۔ لامحدود اور بے انتہا ہے ۔

ایسا علم کہ جس کی قلمرو ۔ تمام عالمِ ہستی ہے ۔ اس میں تاریخ عالم کا ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی اور اس میں تمام اسرار وحقائق موجود ہیں ۔

زیرِ نظر دوسری آیت سورہ کہف کی آخری آیت ہے ۔ یہ دینی عقائد کے بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہے ۔ اس میں توحید، رسالت پیغمبرؐ اور معاد سب کا ذکر موجود ہے ۔ درحقیقت سورہ کہف کی ابتداء بھی اسی سے ہوئی تھی ۔ ابتداء میں بھی اللہ، وحی، عمل کی جزاء اور قیامت کے بارے میں گفتگو تھی ۔ اس سورت کا اہم حصہ چونکہ انہی تین موضوعات پر مشتمل ہے اس لحاظ سے یہ آخری آیت اس سورت کا خلاصہ ہے ۔

نبوت کے بارے میں پوری تاریخ انسانی میں بہت غلو اور مبالغہ ہوا ہے اس لیے قرآن کہتا ہے : کہہ دو ، میں تو تم جیسا ایک بشر ہوں ۔ میرا امتیاز اور خصوصیت صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے (قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ) ۔

یہ کہہ کر قرآن نے ان تمام مشرکانہ خیالی امتیازات پر خطِ بطلان کھینچ دیا ہے کہ جو انبیاء کو مرحلۂ بشریت سے مرحلۂ الوہیت کی طرف لے جاتے ہیں ۔

اس کے بعد جن مسائل کی انبیاء پر وحی ہوئی ہے ان میں سے مسئلہ توحید کی نشاندہی کی گئی ہے : مجھ پر وحی ہوتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہے (انما الٰھکم اللہ واحد) ۔

صرف اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کیوں کیا گیا ہے ۔ اس لیے کہ توحید تمام عقائد اور انسانوں کے لیے تمام سعادت بخش انفرادی و اجتماعی پروگراموں کا نچوڑ ہے ۔

ہم نے ایک اور جگہ بھی کہا ہے کہ توحید فقط اصولِ دین میں سے ایک اصل ہی نہیں بلکہ اسلام کے تمام اصول و فروع کی روح ہے۔

اگر دینی تعلیمات کو موتیوں کی لڑی کہا جائے تو توحید کو وہ دھاگا کہیں گے جو ان موتیوں کو باہم ملائے رکھتا ہے۔ لہٰذا کہنا چاہیئے کہ توحید وہ روح ہے جو اس پیکرِ اسلام میں پھونکی گئی ہے۔

معاد و نبوت کی بحثوں میں یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ یہ مسائل توحید سے جدا نہیں ہیں یعنی اگر اللہ کو ہم اس کی صفات کے ساتھ پہچان لیں تو پھر ہم جان لیتے ہیں کہ ایسے خدا کو نبی بھیجنے چاہئیں نیز اس کی حکمت و عدالت کا تقاضا ہے کہ کوئی عدالت برپا ہو اور قیامت وجود پذیر ہو۔

اجتماعی مسائل، پورا انسانی معاشرہ اور جو کچھ اس سے مربوط ہے اسے توحید و وحدت کے سائے میں ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے لوازمات سے آراستہ ہو سکے۔

یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ہے کہ:

"لا الٰہ الّا اللّٰہ" پروردگار کا محکم قلعہ ہے جو شخص اس میں داخل ہو گیا وہ عذابِ الٰہی سے مامون ہو گیا۔

نیز ہم سب نے سُن رکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتدائے اسلام میں فرماتے تھے:

قولوا لا الٰہ الّا اللّٰہ تفلحوا

اگر فلاح کے طالب ہو تو پرچمِ توحید کے تلے جمع ہو جاؤ۔

اس آیت کا تیسرا جملہ مسئلہ قیامت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور "فاء تفریع" کے ذریعے اسے مسئلہ توحید سے منسلک کر دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: لہٰذا جو شخص بھی اپنے رب کی لقاء کا امیدوار ہے اسے چاہیئے کہ عملِ صالح انجام دے (فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحًا) ————

لقائے پروردگار دراصل اس کی ذاتِ پاک کا باطنی مشاہدہ ہے۔ یہ دل کی آنکھ اور داخلی بصیرت سے ہوتا ہے۔ اگرچہ اس دنیا میں بھی حقیقی مومنین کے لیے یہ ممکن ہے لیکن یہ معاملہ چونکہ بہت روشن، زیادہ واضح ہو کر عمومیت اختیار کرے گا لہٰذا قرآن میں یہ تعبیر زیادہ تر روزِ قیامت کے بارے میں استعمال ہوئی ہے۔

دوسری طرف یہ امر فطری ہے کہ اگر انسان کسی کے انتظار میں ہے اور اسے اس کی امید ہو تو وہ اس کے استقبال کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے گا۔

جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مَیں فلاں چیز کے انتظار میں ہوں لیکن اس کے عمل میں اس کا اثر نہ ہو تو اس کا دعویٰ غلط ہے۔ اسی لیے "فلیعمل عملاً صالحًا"

یہاں صیغۂ امر آیا ہے — وہ امر کہ جو لقائے الٰہی کی امید اور انتظار کا لازمہ ہے۔

آخری جملے میں عمل صالح کی حقیقت کو مختصر طور پر اس طرح واضح کیا گیا ہے: کسی کو پروردگار کی عبادت

میں شریک نہیں کرنا چاہیئے (ولا یشرك بعبادة ربه احدًا)۔
زیادہ واضح لفظوں میں ــ جب تک عمل میں خلوص پیدا نہ ہو وہ صالح نہیں ہو سکتا اور الٰہی اور خدائی رنگ اختیار نہیں کر سکتا۔ خلوص انسانی عمل کو گہرائی بخشتا ہے، نورانیت عطا کرتا ہے اور صحیح سمت دیتا ہے اور خلوص ختم ہو جائے تو عمل زیادہ تر ظاہری پہلو اختیار کر لیتا ہے اور اس کا جھکاؤ ذاتی مفاد کی طرف ہو جاتا ہے۔ ایسا عمل گہرائی اور صحیح سمت کھو بیٹھتا ہے۔
درحقیقت وہ عمل صالح جس کا سرچشمہ رضائے الٰہی ہو اور جو اخلاص گوندھا ہوا ہو وہ لقائے الٰہی کا پاسپورٹ ہے۔
جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ عمل صالح وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں تمام انفرادی و اجتماعی مفید، اصلاحی اور تعمیری کام شامل ہیں چاہے وہ زندگی کے کسی پہلو سے متعلق ہوں۔

اخلاص یا عملِ صالح کی رُوح

اسلامی روایات میں "نیت" کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اسلام کا یہ بنیادی اصول ہے کہ وہ ہر عمل کو اس کی نیت اور مقصد کے ساتھ قبول کرتا ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے:

لا عمل الّا بالنيّة

نیت کے بغیر کوئی عمل نہیں۔

یہ حدیث اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔
نیت کے بعد اخلاص کی باری آتی ہے۔ اگر وہ ہو تو عمل بہت اہمیت اور قیمت رکھتا ہے ورنہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔
اخلاص یہ ہے کہ محرکِ انسان ہر قسم کے غیر الٰہی شائبہ سے پاک ہو اور اسے "توحیدِ نیت" کہتے ہیں یعنی ہر کام میں صرف رضائے الٰہی کو ملحوظ رکھا جاتے۔
یہ بات لائق توجہ ہے کہ زیر بحث آیت کی شانِ نزول کے بارے میں منقول ہے:
ایک شخص رسول اللہ (ص) کی خدمت میں آیا۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں راہِ خدا میں خرچ کرتا ہوں، صلۂ رحمی کرتا ہوں اور یہ اعمال صرف اللہ کے لیے بجا لاتا ہوں لیکن جب لوگ میرے ان اعمال کے بارے میں بات کرتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے خوشی ہوتی ہے ــ میرے یہ اعمال کیسے ہیں؟
رسول اللہ خاموش رہے اور کچھ نہ کہا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس

شخص کے سوال کا جواب دیا گیا (کہ صرف وہ عمل مقبول بارگاہِ الٰہی ہوگا کہ جو اخلاص کامل کے ساتھ بجالایا جائے گا) [1]

اس میں شک نہیں کہ یہ روایت غیر اختیاری مسرت کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کا تقاضا ہے کہ لوگوں کی طرف سے کسی کام کی تعریف' اس کے کرنے کا سبب نہ ہو۔

اسلام میں اخلاص' عمل خالص اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من اخلص للہ اربعین یومًا فجر اللہ ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ

جو شخص چالیس دن اپنے اعمال خالص اللہ کے لیے انجام دے تو اللہ اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت و دانش کے چشمے جاری کر دے گا [2]

✣ ✣ ✣

پروردگارا! تمام اعمال میں ہماری نیت کو اس طرح سے خالص کر دے کہ ہم تیرے علاوہ کسی کے لیے نہ سوچیں اور تیرے علاوہ کسی کے لیے قدم نہ اٹھائیں۔

اور اگر تیرے علاوہ کسی کو چاہیں تو وہ بھی تیری رضا کے لیے ہو اور اس لیے ہو کہ اس کا تجھ سے تعلق ہے۔

آمین یا رب العالمین

سورہ کہف کی تفسیر

اختتام کو پہنچی

یکم جمادی الثانی ۱۴۰۲ ہجری قمری

بمطابق ۷ فروردین ۱۳۶۱ ہجری شمسی

---

[1] مجمع البیان، مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں' نیز تفسیر قرطبی، اسی آیت کے ذیل میں۔

[2] سفینۃ البحار، ج ۱ ص ۴۰۰۔

سورۂ مریم

① مکہ میں نازل ہوئی
② اس کی ۹۸ آیات ہیں

اِس سُورہ کے مضامین

یہ سُورہ مضامین کے لحاظ سے چند اہم حصوں کی حامل ہے :-

۱۔ اس سورہ کا اہم ترین حصہ جناب زکریاؑ، حضرت مریمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت یحییٰؑ اور توحید کے ہیرو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ، حضرت ادریسؑ اور خداوند تعالیٰ کے بعض دوسرے بزرگ انبیا کے کچھ حالات پر مشتمل ہے کہ جو خاص تربیتی نکات کا حامل ہے۔

۲۔ اس سورہ کا دُوسرا حصہ کہ جو پہلے حصہ کے بعد سب سے اہم ہے وہ قیامت سے مربوط مسائل اور دوبارہ اُٹھائے جانے کی کیفیت، مجرموں کی سزا، پرہیزگاروں کی جزا اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کے ساتھ مربوط ہے۔

۳۔ ایک اور حصہ مواعظ و نصائح کا ہے کہ جو فی الحقیقت گزشتہ حصوں کی تکمیل کرتا ہے۔

۴۔ آخری حصہ قرآن، خداوند تعالیٰ سے اولاد کی نفی اور مسئلہ شفاعت سے مربوط اشارے ہیں کہ جو مجموعی طور پر نفوس انسانی کو ایمان، پاکیزگی اور تقویٰ کی طرف راہنمائی کے لیے ایک مؤثر تربیتی پروگرام پر مشتمل ہے۔

اِس سُورہ کی فضیلت

پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ :-

> جو شخص اس سورہ کو پڑھے اُسے ان اشخاص کی تعداد کے برابر کہ جنہوں نے زکریاؑ کی تصدیق یا تکذیب کی ہے اور اسی طرح سے یحییٰؑ، مریمؑ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور اسمٰعیلؑ (کی تصدیق یا تکذیب کی ہے) ان میں سے ہر ایک کی تعداد سے دس گنا نیکیاں خداوند تعالیٰ اس کے نامۂ اعمال میں درج کردے گا۔ اسی طرح ان اشخاص کی تعداد کہ جو (جھوٹ اور تہمت کے طور پر) خدا کے لیے اولاد کے قائل ہوئے ہیں اور ان اشخاص کی تعداد کہ جو خدا کے لیے اولاد کے قائل نہیں ہوئے سے دس گنا نیکیاں عطا کرے گا[1]

حقیقت میں یہ حدیث دو مختلف خطوط میں تحقیق اور کوشش کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ ان میں سے ایک انبیاء، معصومین اور نیک لوگوں کی حمایت کا خط ہے اور دوسرا مشرکین منحرفین اور گنہگاروں کے خلاف قیام کرنے کا راستہ ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اتنے عظیم ثواب ان لوگوں کو نہیں دیئے جائیں گے

[1] مجمع البیان ذیل آیہ۔

کہ جو صرف الفاظ کو پڑھ لیں اور اس کے مطابق عمل نہ کریں بلکہ یہ مقدس الفاظ تو عمل کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:۔

> جو شخص اس سورہ کو مسلسل پڑھتا رہے وہ اس دنیا سے نہیں جائے گا مگر یہ کہ خداوند تعالیٰ اس سورہ کی برکت سے اُسے جان و مال اور اولاد کے لحاظ سے بے نیاز کر دے گا[1]

یہ غنا اور بے نیازی انسان کے اس سورہ کے مفاہیم کو جان و دل سے اپنانے کا نتیجہ ہے اور یہ در اصل اس کے مفاہیم ہیں جو اس کے اعمال و گفتار کے اندر منعکس ہو رہے ہیں۔

1۔ مجمع البیان ذیل آیہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ كٓهٰيٰعٓصٓ ۝

۲۔ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝

۳۔ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝

۴۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝

۵۔ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝

۶۔ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان ورحیم ہے۔

۱۔ کٓھٰیٰعٓصٓ

۲۔ یہ تیرے پروردگار کی رحمت کی اس کے بندے زکریا کے بارے میں ایک یاد ہے۔

۳۔ اُس وقت جبکہ اُس نے (عبادت کی) خلوت گاہ میں اپنے پروردگار کو پکارا۔

۴۔ اس نے کہا پروردگارا! میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور بڑھاپے کے شعلے نے میرے تمام سر کو گھیر لیا ہے اور میں تجھ سے دُعا کرکے کبھی بھی محروم نہیں رہا ہوں۔

۵۔ اور میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے خوفزدہ ہوں (کہ وہ تیرے دین کی پاسداری کا حق ادا نہیں کریں گے) اور میری بیوی بانجھ ہے پس تو اپنی قدرت سے مجھے جانشین عطا فرما۔

۶۔ کہ جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث بنے اور اس کو تو اپنی رضا و پسندیدگی سے نواز۔

تفسیر

حضرت زکریا کی پُر اثر دُعا :

پھر ایک دفعہ اس سورہ کی ابتداء میں ہمیں حروفِ مقطعہ کا سامنا ہے "کٓھٰیٰعٓصٓ" اور چونکہ ہم سابقاً قرآن کی تین مختلف سورتوں (سورہ بقرہ. آل عمران اور اعراف) کی ابتداء میں ان حروفِ مقطعہ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں لہٰذا ہم یہاں پر تکرار کی ضرورت نہیں سمجھتے [1]

جس بیان کی اس مقام پر ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی منابع و مصادر میں اس سورہ کے حروفِ مقطعہ کے بارے میں دو قسم کی روایات نظر آتی ہیں.

پہلی روایات تو وہ ہیں کہ جو ان حروفِ مقطعہ میں سے ہر ایک کو خداوند تعالیٰ کے عظیم اسماءِ حسنٰی میں سے ایک ایک اسم کی طرف اشارہ قرار دیتی ہیں "کاف" اشارہ ہے "کافی" کی طرف کہ جو خداوند تعالیٰ کا ایک عظیم نام ہے اور "ھ" اشارہ ہے "ہادی" کی طرف اور "یاء" اشارہ ہے "ولی" اور "عین" اشارہ ہے "عالم" کی طرف اور "ص" اشارہ ہے "صادق الوعد" (وہ جو اپنے وعدہ کا سچا ہے) کی طرف [2]

دوسری قسم ان روایات کی ہے کہ جو ان حروفِ مقطعہ کی کربلا میں امام حسینؑ کے قیام کی داستان کے ساتھ تفسیر کرتی ہیں ان کے مطابق "کاف" اشارہ ہے "کربلا" کی طرف "ھاء" اشارہ ہے خاندانِ پیغمبرؐ کے ہلاک اور شہید ہونے کی طرف اور "یا" "یزید" کی طرف اور "عین" "مسئلہ عطش (پیاس) کی طرف اور "ص" امام حسینؑ اور اُن کے جانباز یار و انصار کے "صبر" و استقامت کی طرف۔ [3]

البتہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں قرآن مجید کی آیات مختلف معانی کی حامل ہو سکتی ہیں اور بعض اوقات گزشتہ اور آیندہ کے مفاہیم بیان کرتی ہیں کہ جو متنوع ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اختلاف نہیں رکھتے جبکہ اگر معنی کو ایک تفسیر میں منحصر کر دیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم آیت کی وضع کیفیت نزول اور اس کے زمانے کے لحاظ سے کئی ایک اشکالات میں گرفتار ہو جائیں۔

⁂

حروفِ مقطعہ کے ذکر کے بعد سب سے پہلی بات حضرت زکریاؑ کی داستان سے شروع ہوتی ہے. خدا فرماتا ہے:۔ یہ یاد ہے اُس رحمت کی جو تیرے پروردگار نے اپنے بندے زکریا پر کی (ذکر رحمۃ ربک عبدہ زکریا) [4]

اس وقت جبکہ وہ کوئی فرزند نہ ہونے کی وجہ سے سخت پریشان اور غمناک تھے تو انہوں نے درگاہِ خدا کی طرف رُخ کیا، اس وقت خلوت گاہ میں اور وہاں پر کہ جہاں کوئی اُن کی آواز نہیں سُن رہا تھا اپنے پروردگار کو پکارا اور اُس سے دُعا کی (اذ نادیٰ ربہ نداءً خفیا)۔

"اس نے کہا پروردگارا! میری ہڈیاں جو میرے جسم کا ستون اور میرے بدن کے محکم ترین اعضاء ہیں، کمزور ہو گئی ہیں" (قال رب انی وھن العظم منی)۔ اور بڑھاپے کے شعلوں نے میرے سر کے تمام بالوں کو گھیر لیا ہے (واشتعل الرأس شیبًا)۔ بڑھاپے کے آثار کو ایسے شعلے سے تشبیہ دینا کہ جو

---

[1] تفسیر نمونہ پہلی جلد سورہ بقرہ کی ابتداء اور دوسری جلد سورہ آل عمران کی ابتداء اور جلد ۴ سورہ اعراف کی ابتداء کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2][3] نور الثقلین جلد ۳ ص ۳۲۰۔

[4] درحقیقت لفظ "ذکر" محذوف مبتداء کی خبر ہے اور تقدیر اس کی اس طرح ہے:۔

"ھذا ذکر رحمۃ ربک"۔

تمام سر کو گھیر نے ایک جاذب نظر اور عمدہ تشبیہ ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو آگ کے شعلہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جلدی پھیل جاتا ہے اور جو کچھ اس کے اطراف میں ہو اسے گھیر لیتا ہے اور دوسری طرف آگ کے شعلے ایک خاص قسم کی روشنی اور چمک کے حامل ہوتے ہیں اور دُور سے توجہ مبذول کراتے ہیں اور تیسری طرف جس وقت آگ کسی جگہ کو گھیرتی ہے تو جو چیز اُس سے باقی رہ جاتی ہے وہ وہی خاکستر ہی ہوتی ہے۔

حضرت زکریا نے بڑھاپے کے گھیر لینے اور سر کے تمام بالوں کی سفیدی کو آگ کے شعلہ ور ہونے اور اُس کے چمکنے اور سفید خاکستر کو اُس کی جگہ باقی رہنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ بہت ہی رسا اور زیبا تشبیہ ہے۔

اس کے بعد مزید کہتے ہیں :۔ پروردگارا! میں ہرگز ان دعاؤں میں، جو میں نے تیری بارگاہ میں کبھی کی ہیں، محروم نہیں پلٹا (ولم اكن بدعائك رب شقيا) گزشتہ زمانے میں تو نے مجھے ہمیشہ دعاؤں کی اجابت و قبولیت کا عادی بنایا ہے اور کبھی مجھے محروم نہیں کیا۔ اب جبکہ میں بوڑھا اور ناتواں ہو گیا ہوں تو اب اور بھی زیادہ اس بات کا حقدار ہوں کہ تو میری دعا قبول فرمائے اور مجھے نا اُمید نہ پلٹائے۔

حقیقت میں " شقاوت " یہاں پر تعب اور رنج و تکلیف کے معنی میں ہے۔ یعنی میں کبھی اپنی درخواستوں میں تجھ سے زحمت و مشقت میں نہیں پڑا، کیونکہ وہ بہت جلد تیری بارگاہ میں قبول ہو جایا کرتی تھیں۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اپنی حاجت کی اس طرح تشریح کرتے ہیں: پروردگارا! میں اپنے بعد اپنے عزیز و اقارب سے خوفزدہ ہوں (ہو سکتا ہے وہ فتنہ و فساد سے اپنے ہاتھ آلودہ کریں) اور میری بیوی بانجھ ہے، تو اپنی طرف سے مجھے ولی اور جانشین بخش دے۔

(وانی خفت الموالی من ورائی وكانت امرأتی عاقرا فهب لی من لدنك وليا)۔

ایسا جانشین کہ جو میرا بھی وارث بنے اور اسی طرح آلِ یعقوب کا بھی وارث ہو۔ پروردگارا! میرے اس جانشین کو اپنا پسندیدہ بنا۔

(يرثنی ويرث من آل يعقوب واجعله رب رضيا)۔

چند نکات :

۱۔ **یہاں میراث سے کیا مراد ہے؟** مفسرین اسلام نے اس سوال کے بارے میں بہت بحث کی ہے، ایک گروہ کا یہ نظریہ ہے کہ یہاں ارث سے مراد مال کی میراث ہے، اور ایک گروہ اسے مقام نبوت کی طرف اشارہ سمجھتا ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے، کہ اس سے ایک ایسا جامع معنی مراد ہے جس میں دونوں مفاہیم شامل ہیں۔

بہت سے شیعہ علماء نے پہلے معنی کو انتخاب کیا ہے جبکہ علماء اہلِ سنت کی ایک جماعت نے دوسرے معنی کو، اور بعض نے جیسا کہ سید قطب نے " فی ظلال " میں اور آلوسی نے " روح المعانی " میں تیسرے معنی کو انتخاب کیا ہے۔

جن لوگوں نے اسے ارث مال میں منحصر سمجھا ہے۔ انہوں نے یہ معنی مراد لینے میں لفظ " ارث " کے ظاہر سے استناد کیا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ جب تک دوسرے قرائن سے خالی ہو تو ارث مال ہی کے معنی دیتا ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی چند ایک آیات میں یہ لفظ معنوی امور میں استعمال ہوا ہے، تو یہ ان میں موجود قرائن کی بنا پر ہے ؛ مثلاً سورہ فاطر کی آیہ ۳۲ :-

ثم اورثنا الكتاب الذين اصطفينا من عبادنا

ہم نے آسمانی کتاب کو اپنے برگزیدہ بندوں کی طرف بطور ارث منتقل کیا ہے ؛

علاوہ ازیں چند ایک روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بنی اسرائیل بہت سے ہدایا اور نذریں " احبار " (علماء یہود) کے لیے لاتے تھے اور حضرت زکریاؑ احبار کے سردار تھے [1]

اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے۔ کہ حضرت زکریاؑ کی زوجہ جو کہ حضرت سلیمانؑ بن داؤدؑ کی اولاد میں سے تھیں، حضرت سلیمانؑ اور داؤدؑ کی مالی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، اُنہوں نے بہت سے اموال میراث میں پائے تھے۔

حضرت زکریاؑ اس بات سے خوفزدہ تھے، کہ مبادا یہ مال غیر صالح، مطلب پرست، ذخیرہ اندوز یا فاسق و فاجر افراد کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں اور وہ معاشرے میں بُرائی کی ترویج کریں۔ لہٰذا اپنے پروردگار سے صالح اور نیک بیٹے کی درخواست کی تاکہ وہ اُن اموال کی نگرانی کرے اور انہیں بہترین طریقہ سے خرچ کرے۔

وہ مشہور روایت، کہ جو پیغمبرِ اسلامؐ کی پاک بیٹی جناب فاطمہ زہراؑ سے فدک لینے کے سلسلے میں خلیفۂ اول کے سامنے، اس آیت سے استدلال کے بارے میں نقل ہوئی ہے، خود اس دعوے کی ایک شاہد ہے۔

مرحوم طبرسی کتاب احتجاج میں بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ : جس وقت خلیفۂ اول نے فدک کو جناب فاطمہؑ سے چھین لینے کا مصمم ارادہ کر لیا اور یہ خبر اس بی بی تک پہنچی تو آپ اس کے پاس آئیں اور اس طرح فرمایا: اے ابا بکر!

افی کتاب الله ان ترث اباك ولا ارث ابی لقد جئت شیئا فریا ؛ افعلی عمد ترکتم کتاب الله ونبذتموه وراء ظهورکم ؛ اذ یقول فیما اقتص من خبر یحیی بن زکریا: اذ قال رب هب لی من لدنك ولیا یرثنی و یرث من اٰل یعقوب

"کیا یہ بات کتاب خدا میں لکھی ہوئی ہے کہ تُو تو اپنے باپ کی میراث پائے اور میں اپنے باپ کی میراث نہ لوں یہ تو عجیب وغریب چیز ہے، کیا تم لوگوں نے جان بُوجھ کر کتاب خدا کو چھوڑ دیا ہے اور اسے پس پُشت ڈال دیا ہے؟ جبکہ وہ یحییٰ بن زکریا کے قصہ میں کہتا ہے کہ " زکریا نے کہا کہ خداوندا! تو مجھے اپنی طرف سے جانشین عطا فرما تاکہ وہ میرا اور آلِ یعقوب کا وارث بنے"[2]

لیکن وہ لوگ کہ جن کا یہ نظریہ ہے، کہ یہاں پر وہی معنوی معنی مراد ہے تو اُنہوں نے ایسے قرائن سے، کہ جو خود آیت میں یا اس سے باہر ہیں تمسک کیا ہے۔ مثلاً :-

۱۔ یہ کہ یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ حضرت زکریاؑ جیسے عظیم پیغمبر اس سن و سال میں اپنی ثروت کے وارثوں کے بارے میں اس قدر فکر مند ہوں خصوصاً جبکہ " یرثنی و یرث من اٰل یعقوب " کے جملے کے ذکر کرنے کے بعد اس جملہ کا اضافہ کرتے ہیں (واجعله رب رضیا) " خداوندا اُسے اپنا پسندیدہ بنا " اس میں شک نہیں کہ یہ جملہ اس وارث کی معنوی صفات کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ آئندہ آیات میں جہاں خداوند تعالیٰ انہیں یحییٰ کے پیدا ہونے کی بشارت دیتا ہے وہاں عظیم معنوی مقامات کے منجملہ مقام نبوت کا اس کے لیے

---

[1] نورالثقلین، جلد ۳، ص نمبر ۳۲۳-

[2] نورالثقلین، جلد ۳، صفحہ نمبر ۳۲۴-

ذکر کرتا ہے ۔

۳۔ سورہ آل عمران کی آیہ ۳۹ میں جبکہ خداوند تعالیٰ زکریاؑ کی طرف سے فرزند کے تقاضے کی تشریح میں یہ اشارہ کرتا ہے، کہ وہ اس وقت اس سوچ میں پڑے کہ جب انہوں نے جناب مریمؑ کے مقامات اور مراتب کا مشاہدہ کیا کہ پروردگار کے لطف وکرم سے جنت کے کھانے اور پھل ان کی محراب عبادت پر آجاتے تھے ۔

هنالك دعا زكريا ربه قال رب هب لی من لدنك ذرية طيبة انك سميع الدعاء

۴۔ چند ایک احادیث میں پیغمبر اکرمؐ سے ایک مطلب نقل ہوا ہے جو اس بات کی تائید کرتا ہے کہ میراث یہاں معنوی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ امام صادقؑ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ ایک ایسی قبر کے نزدیک سے گزرے کہ جس میں موجود شخص عذاب میں گرفتار تھا۔

اگلے سال بھی آپ کا گزر وہاں سے ہوا تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ وہ صاحب قبر عذاب میں مبتلا نہیں ہے۔ تو انہوں نے اپنے پروردگار سے اس بارے میں سوال کیا تو ان کی طرف خداوند تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوئی کہ صاحب قبر کا ایک نیک بیٹا تھا اُس نے ایک راستہ درست کیا تھا اور ایک یتیم کو پناہ دی تھی خداوند تعالیٰ نے اسے اس کے بیٹے کے عمل کی وجہ سے بخش دیا ہے۔ اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا :

خداوند تعالیٰ کی اس کے مومن بندے کے لیے میراث یہ ہے کہ اسے ایسا بیٹا دے کہ جو اس کے بعد حکم خدا کا مطیع و فرمبردار ہو۔

اس کے بعد حضرت امام صادقؑ نے اس حدیث کے نقل کرنے کے موقع پر حضرت زکریاؑ سے متعلق آیت کی تلاوت فرمائی :

هب لی من لدنك وليا يرثنی و يرث من ال يعقوب واجعله رب رضيا[1]

اور اگر یہ کہا جائے کہ لفظ ارث کا ظاہری معنی وہی میراث اموال ہے تو وہ جواب میں کہیں گے کہ یہ ظاہری معنی قطعی و یقینی نہیں ہے کیونکہ قرآن میں بارہا معنوی ارث میں استعمال ہوا ہے (مثلاً سورہ فاطر کی آیہ ۳۲ اور سورہ مومن کی آیہ ۵۳)۔

علاوہ ازیں اگر فرض کریں کہ خلاف ظاہر ہو تو قرائن بالا کے ہوتے ہوئے کوئی مشکل باقی نہیں رہتی ۔

لیکن پہلے نظریے والے استدلالات کا جواب دے سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے یہ عظیم پیغمبر اموال کے بارے میں ذاتی غرض سے پریشان نہ تھے بلکہ وہ اسے معاشرے کے لیے بُرائی کا منبع نہیں بننے دینا چاہتے تھے ان کی غرض یہ تھی کہ یہ صلاح و درستی کے راستے میں استعمال ہو کیونکہ جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے، کہ (بنی اسرائیل) احبار و علماء کے لیے بہت زیادہ ہدیے اور نذریں لاتے تھے کہ جو حضرت زکریاؑ کے سپرد ہوتی تھیں اور شاید بہت سے اموال ان کی بیوی کی طرف سے بھی کہ جو حضرت سلیمانؑ کی اولاد میں سے تھی باقی رہ گئے تھے، اب یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ ان (اموال) کے اُوپر ایک غیر صالح شخص کا ہونا عظیم مفاسد کا سبب ہوتا۔ اور یہی چیز تھی کہ جس نے حضرت زکریاؑ کو پریشان کر رکھا تھا۔

باقی رہیں حضرت یحییٰؑ کے لیے معنوی صفات کہ جو اس آیت میں اور دوسری آیات قرآن میں ذکر ہوئی ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ اس بات کے منافی نہیں بلکہ وہ اس سے ہم آہنگ بھی ہیں۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ یہ عظیم ثروت ایک مرد خدا پرست اور برگزیدہ الٰہی کے ہاتھ میں جائے اور وہ اس سے معاشرے کو سعادت کی راہ پر چلانے کے لیے استفادہ کرے۔

---

[1] نورالثقلین، جلد ۳ ص ۳۲۳، ۳۲۴۔

لیکن ہمارے نظریہ کے مطابق اگر ہم اُوپر کی مجموعی بحث سے یہ نتیجہ نکالیں کہ لفظ "ارث" یہاں پر وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں ارثِ اموال بھی شامل ہے اور مقامات معنوی کی میراث بھی تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔ کیونکہ ہر طرف کے لیے قرائن موجود ہیں اور قبل و بعد کی آیات اور تمام تر روایات کی طرف توجہ کرنے سے یہ تفسیر کامل طور پر صحیح مفہوم کے قریب نظر آتی ہے۔

باقی رہا (انی خفت الموالی من ورائی) "مجھے اپنے بعد اپنے رشتہ داروں کا ڈر ہے" کا جملہ تو وہ دونوں معانی کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے کیونکہ اگر فاسد اور بُرے لوگ ان اموال میں صاحبِ اختیار ہو جاتے تو واقعاً یہ پریشان کرنے والی بات تھی۔ اور اگر رہبری و ہدایت غیر صالح افراد کے ہاتھ جا پڑتی تو بہت ہی پریشانی اور مصیبت کا سبب بنتی۔ اس بنا پر حضرت زکریاؑ کا خوف دونوں صورتوں میں قابلِ توجیہ ہے۔

بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ کی مشہور حدیث بھی اس معنی کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

۲۔ اذ نادٰی ربّہ نداءً خفیًّا کا مفہوم: اس جملہ میں مفسرین کے لیے یہ سوال سامنے آیا ہے کہ "نادٰی" بلند آواز سے دعا کرنے کے معنی میں ہے جبکہ "خفی" آہستہ و مخفی کے معنی میں ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لیکن اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے کہ "خفی" آہستہ کے معنی میں نہیں ہے بلکہ پوشیدہ اور مخفی کے معنی میں ہے، اس بنا پر یہ بات ممکن ہے کہ حضرت زکریاؑ نے اپنی خلوت گاہ میں کہ جہاں اُن کے علاوہ کوئی دوسرا موجود نہیں تھا خداوند تعالیٰ کو بلند آواز میں پکارا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کی یہ درخواست رات کی تاریکی اور وسطِ شب میں تھی کہ جس وقت لوگ خوابِ غفلت میں آرام کر رہے تھے[1]۔

نیز بعض نے (فخرج علی قومہ من المحراب) "زکریاؑ اپنی محراب سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے" کے جملہ کو، کہ جو آیندہ کی آیات میں آئے گا اس دعا کے خلوت گاہ میں ہونے کی دلیل قرار دیا ہے[2]۔

۳۔ ویرث من اٰل یعقوب کا مطلب: "مجھے ایسا فرزند عنایت کر جو آل یعقوب کا وارث بنے"، کا جملہ اس بنا پر ہے، کہ زکریاؑ کی بیوی حضرت عیسٰیؑ کی والدہ جناب مریمؑ کی خالہ تھیں اور اس خاتون کا نسب حضرت یعقوبؑ تک پہنچتا تھا، کیونکہ وہ حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد میں سے تھیں جو "یہودا" فرزند یعقوب کی اولاد میں سے تھے[3]۔

۷۔ یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ ٍاسْمُہٗ یَحْیٰی ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ○

۸۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا ○

۹۔ قَالَ کَذٰلِکَ ۚ قَالَ رَبُّکَ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا ○

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۶ ذیل آیہ محل بحث۔

[2] تفسیر المیزان، جلد ۱۴ ذیل آیہ۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۶ ذیل آیہ۔

۱۰۔ قَالَ رَبِّ اجْعَل لِّی اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ○

۱۱۔ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا ○

ترجمہ

۷۔ اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں کہ جس کا نام یحیٰی ہے۔ ہم نے اس سے پہلے کوئی لڑکا اس کا ہم نام قرار نہیں دیا۔

۸۔ اُس نے کہا پروردگارا! میرے لڑکا کیسے ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی بہت زیادہ بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں۔

۹۔ فرمایا: اسی طرح تیرے پروردگار نے کہا ہے (اور ارادہ کیا ہے!) یہ میرے لیے آسان ہے اور میں نے تجھے پہلے خلق کیا تھا جبکہ تُو کوئی چیز نہیں تھا۔

۱۰۔ عرض کیا پروردگارا! میرے لیے کوئی نشانی قرار دے۔ کہا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین شبانہ روز لوگوں سے) بات نہیں کر سکے گا (جبکہ تیری زبان سالم ہے)

۱۱۔ وہ اپنی محراب عبادت سے لوگوں کی طرف نکلا اور اشارہ کے ساتھ اُنہیں کہا (کہ اس نعمت کے شکرانے کے طور پر) صبح شام خدا کی تسبیح کرو۔

تفسیر

زکریاؑ کی آرزو پوری ہوگئی:

یہ آیات حضرت زکریاؑ کی دعا کی بارگاہ پروردگار میں قبولیت کو بیان کر رہی ہیں یہ ایسی استجابت و قبولیت تھی جو اُس کے مخصوص لطف و عنایت سے آمیختہ تھی فرمایا گیا ہے: اے زکریا! ہم تجھے ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں کہ جس کا نام یحیٰی ہے، ایسا لڑکا کہ جس کا پہلے کوئی ہم نام نہیں ہوا۔

(یازکریا انا نبشرك بغلام اسمه یحیٰی لم نجعل له من قبل سمیًّا)۔

کس قدر جاذب اور عمدہ چیز ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے بندہ کی دعا اس طرح قبول کرے، اور بشارت دے کہ اس کی دعا کے نتیجے سے اُسے آگاہ کرے اور فرزند کی درخواست کے جواب میں ایک بیٹا عنایت کرے اور اس کا نام بھی خود ہی رکھ دے۔ اور مزید کہے کہ یہ فرزند کئی جہات سے منفرد ہے اور اس سے پہلے کوئی ایسا نہیں ہوا۔

کیونکہ (لم نجعل له من قبل سمیًّا) کا جملہ اگرچہ ظاہراً اس معنی میں ہے کہ اب تک کوئی اس کا ہم نام نہیں تھا۔ لیکن چونکہ محض نام کسی کی شخصیت کی دلیل نہیں ہے۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسم مسمّٰی کی طرف اشارہ ہے یعنی اس جیسی امتیازی خصوصیات کا حامل اس سے پہلے کوئی نہیں ہوا جیسا کہ راغب نے مفردات میں صراحت کے ساتھ یہ معنی بیان کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت یحییٰ سے پہلے بہت سے بزرگ پیغمبر گزرے ہیں جو اُن سے بالاتر اور افضل تھے۔ لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یحییٰ کچھ ایسی امتیازی خصوصیات رکھتے ہوں کہ جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہوں۔ جیسا کہ بعد میں اس کی طرف اشارہ ہوگا۔

لیکن حضرت زکریاؑ چونکہ ایسے مطلوب تک پہنچنے کے لیے ظاہری اسباب کو کارآمد نہیں سمجھتے تھے لہٰذا انہوں نے بارگاہِ پروردگار میں وضاحت کا تقاضا کیا۔

انہوں نے کہا پروردگارا یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے کوئی بیٹا نصیب ہو۔ جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی سن و سال کے لحاظ سے اس حد کو پہنچ گیا ہوں کہ بالکل بوڑھا اور ناکارہ ہوگیا ہوں (قال ربّ انّی یکون لی غلام وکانت امرأتی عاقراً وقد بلغت من الکبر عتیاً)۔

"عاقر" اصل میں عقر کے مادہ سے جڑ اور بنیاد کے معنی میں، یا حبس یعنی بند ہوجانے کے معنی میں ہے اور یہ جو بانجھ عورتوں کو "عاقر" کہتے ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ اولاد کے قابل نہیں رہی ہوتیں یا یہ کہ ان کے بچہ کی پیدائش بند ہوگئی ہوتی ہے۔

"عتی" اس شخص کو کہتے ہیں کہ زیادہ عمر ہو جانے کے سبب سے جس کا بدن خشک ہوگیا ہو۔ وہی حالت جو بہت زیادہ سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے انسان میں پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن بہت جلدی حضرت زکریاؑ کو اُن کے سوال کے جواب میں بارگاہِ خداوندی سے یہ پیغام مل گیا " فرمایا: معاملہ اسی طرح ہے کہ جیسا تیرے پروردگار نے کہا ہے اور یہ میرے لیے آسان بات ہے (قال کذالك قال ربك هو علیّ هین)[1]

یہ مسئلہ کوئی عجیب و غریب نہیں ہے کہ تجھ جیسے بوڑھے مرد اور ظاہرا بانجھ بیوی سے بچہ پیدا ہو اور میں نے تجھے پہلے پیدا کیا تھا جبکہ تو کچھ بھی نہیں تھا (وقد خلقتك من قبل ولم تك شیئاً)۔

وہ خدا جو یہ قدرت و توانائی رکھتا ہے کہ بغیر کسی چیز کے تمام چیزوں کو پیدا کرے یہ کونسی تعجب کی بات ہے کہ اس سن و سال میں اور ان حالات میں تجھے فرزند عنایت کر دے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ پہلی آیت میں بشارت دینے والا اور کلام کرنے والا خداوند عالم ہے۔ لیکن یہ کہ تیسری زیر بحث آیت (قال کذالك قال ربك) میں گفتگو کرنے والا کون ہے۔ بعض اسے فرشتوں کی گفتگو سمجھتے ہیں کہ جو زکریاؑ کو بشارت دینے کا ذریعہ بنے تھے اور سورہ آل عمران کی آیت ۳۹ کو اس کا گواہ سمجھا جا سکتا ہے:-

فنادته الملائکة وهو قائم یصلی فی المحراب ان الله یبشرك بیحیی

فرشتوں نے زکریاؑ کو ندا دی جبکہ وہ محراب میں کھڑے ہوئے تھے اور مشغولِ نماز تھے کہ خدا تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان تمام جملوں کا کہنے والا خدا ہے اور کوئی دلیل ایسی نہیں ہے کہ ہم اس کے ظاہر کے خلاف معنی کریں۔ اگر فرشتے بشارت دینے کے واسطے تھے تو بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ اصل پیغام کو اپنی طرف نسبت دے، خصوصاً جبکہ ہم اُسی سورہ آلِ عمران کی آیہ ۴۰ میں یہ پڑھتے ہیں:

قال کذالك الله یفعل ما یشآء

خدا اسی طرح سے جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

---

[1] مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "کذالك" کا جملہ تقدیر میں (الامر کذالك) تھا یعنی مطلب اسی طرح ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ کذالك کا تعلق بعد والے جملے کے ساتھ ہو اور اس کا مفہوم یہ ہو کہ اس طرح تیرے پروردگار نے کہا ہے۔

بہر حال حضرت زکریاؑ بہت ہی مسرور ہوئے ، نورِ اُمید نے اُن کے سراپا کو گھیر لیا، لیکن یہ پیغام اُن کی نظر میں بہت ہی اہم اور ان کے مستقبل کو روشن کرنے والا تھا، لہٰذا خداوند تعالیٰ سے اس کام کے لیے کسی نشانی کا تقاضا کیا اور کہا پروردگارا ! میرے لیے کوئی نشانی قرار دے۔ (قال رب اجعل لی اٰیۃ)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت زکریاؑ خدائی وعدہ پر ایمان رکھتے تھے اور وہ بالکل مطمئن تھے۔ لیکن جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے جو معاد پر ایمان کامل رکھتے تھے زیادہ سے زیادہ اطمینانِ قلب کی خاطر اسی زندگی میں معاد کی صورت کا مشاہدہ کرنے کا تقاضا کیا تھا، اسی طرح زکریاؑ نے بھی زیادہ سے زیادہ حصولِ اطمینان کے لیے اس قسم کی نشانی کا تقاضا کیا تھا۔

خداوند تعالیٰ نے فرمایا : تمہاری نشانی یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ تمہاری زبان صحیح و سالم ہے۔ تم مکمل تین دن رات لوگوں سے گفتگو نہیں کر سکو گے اور تمہاری زبان صرف ذکرِ خدا اور اس سے مناجات کر سکے گی (قال اٰیتک ان لا تکلم الناس ثلاث لیال سویا)۔

لیکن یہ کتنی عجیب و غریب نشانی تھی یہ ایک ایسی نشانی تھی کہ جو ایک طرف تو اس کی مناجات و دعا کے ساتھ ہم آہنگ تھی اور دوسری طرف اس کو تمام مخلوق سے منقطع کر رہی تھی اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق قائم کر رہی تھی تاکہ اس حال میں اس عظیم نعمت کا شکر بجا لائے اور اسے زیادہ سے زیادہ خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا پر آمادہ کرے۔

یہ ایک واضح اور آشکار نشانی ہے کہ انسان صحیح و سالم زبان رکھتے ہوئے اور پروردگار کے ساتھ ہر قسم کی مناجات و حمد و ثنا کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود لوگوں سے بات کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

اس بشارت اور اس واضح نشانی کے بعد حضرت زکریاؑ اپنی محرابِ عبادت سے لوگوں کے پاس آئے اور انہیں اشارہ کے ساتھ اس طرح کہا : صبح شام پروردگار کی تسبیح کرو (فخرج علیٰ قومہ من المحراب فاوحی الیھم ان سبحوا بکرۃ وعشیا)۔

کیونکہ وہ عظیم نعمت جو خداوند تعالیٰ نے زکریاؑ کو عطا فرمائی تھی اس کی وسعت پوری قوم کے لیے تھی اور اُن سب کے مستقبل پر اثر انداز ہونے والی تھی۔

اسی بنا پر اس لائق تھی کہ اس نعمت کے شکرانے میں سب کے سب خداوند تعالیٰ کی تسبیح کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور خداوند تعالیٰ کی مدح و ثنا کریں۔

اس سے بھی بڑھ کر بات یہ ہے کہ یہ عطا کہ جو ایک معجزہ تھی افرادِ بشر کے دلوں میں ایمان کی جڑیں راسخ کر سکتی تھی یہ بھی ایک اور نعمت تھی۔

چند نکات :

۱۔ یحییٰؑ ، عشقِ الٰہی میں سرشار پیغمبر : حضرت یحییٰؑ کا نام سورہ آلِ عمران، انعام، مریم اور انبیاء میں مجموعی طور پر پانچ مرتبہ آیا ہے۔ وہ خداوند تعالیٰ کے ایک عظیم پیغمبر تھے اور ان کی خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ بچپن میں مقامِ نبوّت پر فائز ہوئے۔ خداوند تعالیٰ نے انہیں اس سن و سال میں ایسی روشن عقل اور اتنی تابناک فہم و فراست عطا فرمائی کہ وہ اس عظیم منصب کو قبول کرنے کے لائق قرار پائے۔

اس پیغمبر کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک کے بارے میں قرآن نے سورہ آلِ عمران کی آیہ ۳۹ میں اشارہ کیا ہے، اور ان کی "حصور" کے ساتھ توصیف و تعریف ہے۔ جیسا کہ ہم نے اُسی آیت کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ "حصور" "حصر" کے مادہ سے اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جو کسی جہت سے محاصرہ میں قرار پائے ، اور اس مقام پر بعض روایات کے مطابق شادی سے اجتناب کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ کام ان کے لیے اس لحاظ سے امتیاز تھا کہ یہ ان کی انتہائی عفت و پاکیزگی کو بیان کرتا ہے یا وہ زندگی کے مخصوص حالات کی بناء پر دین الٰہی کی تبلیغ کیلیے متعدد سفروں پر جانے پر مجبور تھے اور حضرت عیسٰیؑ مسیح کی طرح مجرد زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

یہ تفسیر بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں "حصور" سے مراد وہ شخص ہے کہ جس نے دنیاوی خواہشات اور ہوا و ہوس کو ترک کر دیا ہو اور درحقیقت یہ زہد کا ایک اعلٰی مرحلہ ہو۔[1]

بہرحال منابع اسلامی اور منابع مسیحی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحیٰیؑ حضرت عیسٰیؑ کی خالہ کے بیٹے تھے۔

منابع مسیحی میں تصریح ہوئی ہے، کہ حضرت یحیٰیؑ نے حضرت عیسٰیؑ کو غسل تعمید دیا اور اسی لیے انہیں "یحیٰی تعمید دہندہ" کے نام سے پکارتے ہیں (غسل تعمید ایک مخصوص غسل ہے کہ جو عیسائی اپنے بیٹوں کو دیتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اُسے گناہ سے پاک کرتا ہے) اور جب حضرت مسیحؑ نے اعلانِ نبوت کیا تو حضرت یحیٰیؑ ان پر ایمان لائے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت یحیٰیؑ کوئی خاص آسمانی کتاب نہیں رکھتے تھے اور یہ جو بعد کی آیات میں ہم پڑھتے ہیں :-

یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ

اے یحیٰی! کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو۔

یہ حضرت موسٰیؑ کی کتاب تورات کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ کچھ لوگ حضرت یحیٰیؑ کے پیرو ہیں وہ ان کی طرف ایک کتاب کی نسبت بھی دیتے ہیں اور شاید "موحد صابئین" حضرت یحیٰیؑ کے پیرو ہیں۔[2]

حضرت یحیٰیؑ اور حضرت عیسٰیؑ میں بعض چیزیں قدرِ مشترک تھیں۔ انتہائی زیادہ زہد و تقویٰ، مذکورہ بالا اسباب کی بناء پر ترک ازدواج، معجزانہ طور پر پیدا ہونا اور اسی طرح بہت ہی زیادہ قریبی نسب۔

اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ اور حضرت یحیٰیؑ میں بھی بعض باتیں مشترک تھیں، لہٰذا امام علی بن الحسین زین العابدینؑ سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

خرجنا مع الحسین بن علی (ع) فما نزل منزلا و لا رحل منه الا ذکر یحییٰ بن زکریا و قتله، وقال ومن هوان الدنیا علی الله ان رأس یحییٰ بن زکریا اهدی الی بغی من بغایا بنی اسرائیل

ہم امام حسینؑ کے ساتھ (کربلا کی طرف جاتے ہوئے) باہر نکلے تو امام جس منزل میں نزول اجلال فرماتے یا اُس سے کوچ کرتے تو یحیٰیؑ اور ان کے شہید ہونے کو یاد کرتے اور فرماتے کہ خداوند تعالٰی کے نزدیک دُنیا کی بے قدری کے لیے یہی کافی ہے کہ یحیٰی بن زکریا کا سر بنی اسرائیل کے بدکاروں میں سے ایک بدکار کے پاس ہدیہ کے طور پر لایا گیا۔[3]

---

[1] اس بارے میں کہ محض ترکِ ازدواج اکیلا باعثِ فضیلت نہیں ہو سکتا اور قانونِ اسلام نے ازدواج کے سلسلے میں تاکید کی ہے۔ تفسیر نمونہ کی دوسری جلد ص۱۰۹ (اُردو ترجمہ) میں ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے۔

[2] اعلام قرآن ص۶۶۲۔

[3] نور الثقلین، ج ۳ ص۳۲۴۔

حضرت امام حسینؑ کی شہادت بھی کئی ایک جہات سے حضرت یحییٰؑ کی شہادت کی مانند تھی ۔ (حضرت یحییٰؑ کے قتل کی کیفیت ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے)۔

امام حسینؑ کا نام بھی حضرت یحییٰؑ کے نام کی طرح بے سابقہ تھا (اور پہلے کسی کا یہ نام نہیں تھا) اور ان کی مدت حمل (جس وقت شکم مادر میں تھے) معمول کی نسبت بہت کم تھی ۔

۲۔ **محراب** : یہ ایک ایسی مخصوص جگہ ہوتی ہے کہ جو عبادتگاہ میں امام یا پیش نماز کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہے اور اس کا نام رکھنے کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں ۔

پہلی یہ ہے کہ یہ مادہ " حرب " سے جو جنگ کے معنی میں ہے لیا گیا ہے ۔ کیونکہ محراب در حقیقت شیطان اور ہوائے نفس کے ساتھ مبارزہ اور جنگ کرنے کی جگہ ہے ۔

دوسرے یہ کہ محراب لغت میں مجلس کے سب سے بلند مقام کے معنی میں ہے اور چونکہ محراب کی جگہ عبادت گاہ کے اوپر والے حصہ میں ہوتی تھی لہٰذا اُسے یہ نام دیا گیا ۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ ، جو کچھ ہمارے ہاں معمول ہے ، اس کے برعکس بنی اسرائیل میں " محراب " سطح زمین سے کچھ اوپر ہوتی تھی اور اس میں کچھ سیڑھیاں ہوتی تھیں اور اس کے چاروں طرف دیوار بھی ہوتی تھی ، اس طرح سے کہ جو لوگ محراب میں ہوتے تھے وہ باہر سے دکھائی نہیں دیتے تھے ، فخرج علی قومه من المحراب " کا جملہ جو ہم نے مذکورہ بالا آیات میں پڑھا ہے لفظ " علی " پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو عام طور پر اوپر کی سمت کے لیے استعمال ہوتا ہے اس معنی کی تائید کرتا ہے ۔

۱۲۔ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۚ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝

۱۳۔ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۚ وَكَانَ تَقِيًّا ۝

۱۴۔ وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝

۱۵۔ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝

ترجمہ

۱۲۔ اے یحییٰ ! (اللہ کی) کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور ہم نے فرمانِ نبوت (اور کافی عقل و شعور) اسے بچپن میں عطا کی ۔

۱۳۔ اور اُسے اپنی بارگاہ سے رحمت و محبت عطا کی اور (رُوح و عمل کی) پاکیزگی بھی اور وہ پرہیزگار تھا ۔

۱۴۔ وہ اپنے ماں باپ کے لیے نیکوکار تھا اور جبار (و متکبر) اور عاصی و نافرمان نہیں تھا ۔

۱۵۔ اور اُس پر سلام ہے ، اُس دن جبکہ وہ پیدا ہوا اور اُس دن جبکہ وہ مرے گا اور اُس دن جبکہ وہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا

تفسیر

حضرت یحییٰؑ کی عُمدہ صفات :

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے کس طرح حضرت زکریاؑ کو بڑھاپے میں حضرت یحییٰؑ کا سا فرزند سعید مرحمت فرمایا۔ اس کے بعد ہم ان آیات میں خداوند تعالیٰ کا اہم فرمان یحییٰؑ سے خطاب کی صورت میں پڑھتے ہیں : اے یحییٰ! کتاب خدا کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو (یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ)۔

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہاں کتاب سے مراد " تورات " ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس سلسلے میں اجماع و اتفاق کا دعویٰ کیا ہے۔[1]
لیکن بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ وہ خود ایک مخصوص کتاب رکھتے تھے۔ (داؤد کی زبور کی طرح) البتہ وہ ایسی کتاب نہیں تھی کہ جو کسی نئے دین یا جدید مذہب کو پیش کرتی ہو۔[2]

بہرحال کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ آسمانی کتاب تورات اور اس کے مطالب و احکام کا اجرا مکمل اور قطعی صورت میں عزم راسخ اور آہنی ارادہ کے ساتھ کریں، اس ساری کتاب پر عمل کریں، اسے عام کرنے کے لیے ہر قسم کی مادی و رُوحانی اور انفرادی و اجتماعی قوت سے فائدہ اُٹھائیں۔ اصولی طور پر کسی کتاب اور کسی مکتب و مسلک کو اس کے پیروکاروں کی قوت، طاقت اور قاطعیت کے بغیر جاری نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام مومنین اور اللہ کی راہ کے تمام راہیوں کے لیے ایک درس ہے۔

اس حکم کے بعد اُن دس نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو خدا نے حضرت یحییٰؑ کو عطا فرمائی تھیں یا انہوں نے توفیقِ الٰہی سے کسب کی تھیں :

۱۔ ہم نے اسے بچپن میں فرمانِ نبوت اور عقل و ہوش و درایت عطا کی (واتینٰہ الحکم صبیًا)۔

۲۔ ہم نے اپنی طرف سے اسے بندوں کے لیے رحمت و محبت بخشی (وحنانًا من لدنا)۔ " حنان " اصل میں رحمت شفقت محبت اور لوگوں کے ساتھ تعلق و میلان کے اظہار کے معنیٰ میں ہے۔

۳۔ ہم نے اسے رُوح و جان اور عمل کی پاکیزگی عطا کی (وزکوۃ)۔

مفسرین نے " زکوٰۃ " کے مختلف معانی کیے ہیں۔ بعض نے اس کی عمل صالح سے بعض نے اطاعت و اخلاص سے، بعض نے ماں باپ سے نیکی کرنے سے، بعض نے حسنِ شہرت سے اور بعض نے پیروکاروں کی پاکیزگی سے تفسیر کی ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ لفظ زکات ایک وسیع معنیٰ رکھتا ہے کہ جس میں یہ تمام پاکیزگیاں شامل ہیں۔

۴۔ وہ پرہیزگار تھے اور جو بات فرمانِ پروردگار کے خلاف ہوتی تھی اس سے دُوری اختیار کرتے تھے۔ (وکان تقیًّا)۔

۵۔ اسے ہم نے اپنے ماں باپ کے ساتھ خوش گفتار، نیکوکار اور محبت کرنے والا پایا۔ (وبرًّا بوالدیہ)۔

۶۔ وہ خلقِ خدا سے خود کو برتر سمجھنے والا اور ظالم و متکبر نہیں تھا (ولم یکن جبارًا)۔

---

[1] تفسیر " آلوسی " اور تفسیر " قرطبی " کی طرف زیر بحث آیہ کے ذیل میں رجوع کریں۔

[2] تفسیر " المیزان " کی طرف زیر بحث آیہ کے ذیل میں رجوع کریں۔

۷۔ وہ معصیت کار اور گناہ سے آلودہ نہیں تھا (عصیاً)۔

۸، ۹، ۱۰۔ اور چونکہ وہ ان عظیم افتخارات اور عمدہ صفات کا مالک تھا، لہٰذا جس دن وہ پیدا ہوا اُس دن بھی اور جس دن اس کو موت آئے اس دن بھی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کرکے قبر سے اُٹھایا جائے گا اس دن بھی، اس پر ہمارا درود و سلام ہو، (وسلام علیه یوم ولد ویوم یموت و یوم یبعث حیا)

چند نکات

۱۔ آسمانی کتاب کو قوت و طاقت کے ساتھ پکڑلو: جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں " یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ " کے جملے میں لفظ "قوۃ" مکمل طور پر ایک وسیع معنی رکھتا ہے جس میں تمام مادی و معنوی اور رُوحانی و جسمانی قوتیں جمع ہیں اور یہ چیز خود اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ دینِ الٰہی اور اسلام و قرآن کی حفاظت کمزوری، سستی و کاہلی، لنگڑے لُولے بن کر پڑے رہنے اور غفلت شعاری کے ساتھ ممکن نہیں ہے، بلکہ یہ قوت و طاقت اور قاطعیت کے طاقتور قلعے کے اندر ہی ہو سکتی ہے۔

اگرچہ یہاں پر مخاطب حضرت یحییٰؑ ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے دوسرے مواقع پر یہ تعبیر دوسرے تمام لوگوں کے لیے بھی صادق آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ سورہ اعراف کی آیہ ۱۴۵ میں حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ وہ تورات کو قوت کے ساتھ پکڑیں

فخذها بقوة

اور سورہ بقرہ کی آیہ ۶۳ اور ۹۳ میں یہی خطاب تمام بنی اسرائیل کے لیے ہے:

خذوا ما اٰتيناكم بقوة

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عام حکم ہے جو سب کے لیے ہے نہ کہ کسی خاص شخص یا اشخاص کے لیے۔

اتفاق کی بات ہے کہ یہی مفہوم دوسرے لفظوں میں سورہ انفال کی آیہ ۶۰ میں تمام مسلمانوں کے لیے بیان ہوا ہے:

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة

جس قدر قوت و طاقت تمہارے بس میں ہو دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لیے فراہم کرو۔

• بہرحال یہ آیہ اُن سب لوگوں کا جواب ہے کہ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ کمزوری اور ضعف کے ساتھ بھی کوئی کام سرانجام دیا جاسکتا ہے یا جو یہ چاہتے ہیں کہ تمام حالات میں حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرتے ہوئے مشکلات کو حل کریں۔

۲۔ انسان کی سرنوشت کے تین مشکل دن: "سلام علیه یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیا" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کی زندگی کی تاریخ میں اور اس کے ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے میں تین دن بہت سخت ہیں:

ا۔ اس دنیا میں قدم رکھنے کا دن (یوم ولد)

ب۔ موت اور عالمِ برزخ کی طرف منتقل ہونے کا دن (یوم یموت)

ج۔ اور دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے جانے کا دن (ویوم یبعث حیا)

اور چونکہ ان تین انتقالی دنوں میں فطرتاً کئی طرح کے بحرانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا خداوند تعالیٰ ان میں اپنے مخصوص بندوں کو سلامتی اور عافیت عطا

فرماتا ہے اور انہیں ان تینوں طوفانی مرحلوں میں اپنی حمایت کے جلو میں لے لیتا ہے۔

اگرچہ قرآن مجید میں یہ تعبیر صرف دو مقام پر آئی ہے۔ ایک حضرت یحییٰؑ کے بارے میں اور دوسرے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں لیکن حضرت یحییٰؑ کے بارے میں قرآن مجید کی یہ تعبیر ایک خاص امتیاز رکھتی ہے، کیونکہ یہاں اس بات کا کہنے والا خدا ہے جبکہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے کہنے والے خود حضرت عیسیٰؑ ہیں۔

یہ بات بغیر کہے واضح و روشن ہے کہ جو لوگ اپنے حالات میں ان دونوں بزرگواروں سے مشابہت رکھتے ہیں وہ بھی اس سلامتی میں شامل سمجھے جائیں گے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہم السلام سے منقول ایک روایت میں ہے کہ:

ان اوحش مایقوم علی هـذا الخلق فی ثلاث مواطن : یوم یلد ویخرج من بطن امه فیری الدنیا ، ویوم یموت فیعاین الأخرة و اهلها ، ویوم یبعث حیًا ، فیری احکامًا لم یرها فی دار الدنیا وقد سلم الله علی یحیٰی فی هـذه المواطن الثلاث وامن روعته فقال وسلام علیه .. .. ..

انسان کے لیے وحشت ناک ترین مرحلے تین ہیں :۔

"اوّل" وہ دن کہ جس دن وہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی نظر دنیا پر پڑتی ہے۔

"دوسرے" وہ دن کہ جس میں وہ مرتا ہے اور آخرت اور اہل آخرت کو دیکھتا ہے۔

"تیسرے" وہ دن کہ جس میں وہ قبر سے زندہ کرکے اٹھایا جائے گا اور وہ ایسے احکام و قوانین دیکھے گا کہ جو اس جہان میں حکم فرما نہیں تھے۔ خداوند تعالیٰ نے ان تینوں مرحلوں میں سلامتی کو حضرت یحییٰؑ کے شامل حال کیا ہے اور انہیں وحشتوں کے مقابلے میں امن و امان اور راحت و آرام دیا اور فرمایا:

وسلام علیه[1] . . . .

بار الٰہا ! ان تینوں حساس اور بحرانی مراحل میں ہمیں بھی سلامتی مرحمت فرما۔

۲۔ **بچپن میں نبوّت** : یہ درست ہے کہ انسان کی عقل کے ارتقاء کا دور عام طور پر ایک خاص حد پر ہوتا ہے۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسانوں میں ہمیشہ ہی بعض مستثنیٰ افراد موجود رہے ہیں۔ تو اس بات میں کونسا امر مانع ہے کہ خداوند تعالیٰ (عقل کے ارتقاء کے) اس دور کو بعض بندوں کے لیے کچھ مصالح کی بنا پر زیادہ مختصر کردے اور کم سے کم عرصہ میں اسے مکمل کر دے۔ جیسا کہ بچوں کے لیے بولنا سیکھنے کے لیے عام طور پر ایک سال کا گزرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے بالکل ابتدائی دنوں میں بات کی، اور وہ ایسی بات تھی جو بہت ہی پُر معنی تھی، اور معمول کے مطابق بڑی عمر کے افراد کے شایان شان تھی جیسا کہ، انشاء اللہ، آیندہ آیات کی تفسیر میں بیان ہوگا۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ وہ اشکال جو کچھ افراد نے شیعوں کے بعض آئمہ کے بارے میں کیا ہے، کہ ان میں سے بعض کم عمری میں مقام امامت پر کیسے پہنچ گئے، درست نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر برہان، ج ۳، ص،

ایک روایت میں امام جواد حضرت محمد بن علی النقی علیہ السلام کے ایک صحابی سے کہ جس کا نام علی بن اسباط تھا منقول ہے کہ :

میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا (جبکہ آپ کا سن بہت چھوٹا تھا) میں ان کے قد و قامت میں گم ہوگیا تاکہ اُسے اپنے ذہن میں بٹھالوں اور جب میں واپس مصر لوٹ کر جاؤں تو اپنے دوستوں سے اس بات کے کم و کیف کو بیان کروں۔ عین اُسی وقت جب کہ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت بیٹھ گئے (گویا آپ نے میری تمام سوچ کا مطالعہ کر لیا تھا) میری طرف رُخ کیا اور فرمایا اے علی بن اسباط! خداوند تعالیٰ نے مسئلہ امامت میں جو کام کیا ہے وہ اُسی کام کی طرح ہے کہ جو نبوت میں کیا ہے وہ فرماتا ہے :-

واتیناہ الحکم صبیًا

"ہم نے یحییٰ کو بچپن میں فرمانِ نبوت وعقل و دانش عطا کی "

اور کبھی انسانوں کے بارے میں فرماتا ہے ،

حتّٰی اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنة ۔ ۔ ۔ ۔

"جس وقت انسان کامل عقل کی حد بلوغ ، چالیس سال کو پہنچ گیا ۔ ۔ ۔ ۔

بنا بریں جس طرح یہ بات ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ کسی انسان کو حکمت و دانائی بچپن میں عطا فرمادے اسی طرح اس کی قدرت میں ہے کہ چالیس سال کی عمر میں دے۔[1]

• ضمنی طور پر یہ آیت اُن اعتراض کرنے والوں کے لیے ایک دندان شکن جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام مردوں میں سے پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانے والے پہلے شخص نہیں تھے کیونکہ وہ تو اُس وقت دس سال کے بچے تھے اور دس سالہ بچے کا ایمان قابلِ قبول نہیں ہے ۔

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی یہاں پر غیر مناسب نہیں ہوگا۔ کہ ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے بارے میں منقول ہے :

آپ کے بچپن کے زمانہ میں کچھ بچے آپ کے پاس آئے اور آپ سے کہا :

اذھب بنا نلعب

ہمارے ساتھ آؤ تاکہ ہم مل کر کھیلیں ۔

تو آپ نے جواب میں فرمایا :

ما للعب خلقنا

ہم کھیلنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے ۔

اسی سلسلے میں اللہ نے فرمایا ہے : واتیناہ الحکم صبیًا

البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں "لعب" سے مراد بیہودہ اور فضول قسم کی سرگرمیاں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بیہودہ مشاغل میں مشغول ہونا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھیل کود کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ایسا مقصد کہ جو منطقی و عقلی ہو تو مسلمہ طور پر ایسے کھیل کود اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ۔

---

[1] نورالثقلین جلد ۳ ، ص ۳۲۵۔

۴۔ **حضرت یحییٰؑ کی شہادت** : نہ صرف حضرت یحییٰؑ کی پیدائش تعجب خیز تھی بلکہ ان کی موت بھی کئی لحاظ سے عجیب تھی۔ اکثر مسلمان مورخین اور اسی طرح مشہور مسیحی منابع اُن کی شہادت کے واقعہ کو اس طرح نقل کرتے ہیں (اگرچہ اس کی خصوصیات میں کچھ تھوڑا بہت تفاوت دکھائی دیتا ہے):

حضرت یحییٰؑ اپنے زمانے کے ایک طاغوت کے اپنی ایک محرم سے غیر شرعی روابط کے خلاف آواز کی بنا پر شہید ہوئے۔ ہوا یہ کہ "ہیرودیس" فلسطین کا ہوس پرست بادشاہ تھا۔ وہ اپنے بھائی کی بیٹی "ہیرودیا" پر عاشق ہوگیا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اُس کے حُسن نے اس کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا دی۔ بادشاہ نے اُس سے شادی کرنے کا پکا ارادہ کرلیا۔

یہ خبر جب خداوند تعالیٰ کے بزرگ پیغمبر حضرت یحییٰؑ کو پہنچی تو انہوں نے صراحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ یہ شادی ناجائز ہے اور تورات کے احکام کے خلاف ہے اور میں ایسے کام کی اپنی پوری طاقت کے ساتھ مخالفت کروں گا۔

اس مسئلہ کی تمام شہر میں شہرت ہوگئی، اور یہ خبر اُس لڑکی "ہیرودیا" کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ وہ حضرت یحییٰؑ کو اپنے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھنے لگی۔ اُس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ کسی مناسب موقع پر اُن سے انتقام لے گی اور اپنی ہوا و ہوس کی راہ سے اس رکاوٹ کو ہٹا دے گی۔ اُس نے اپنے چچا کے ساتھ اپنے راہ و رسم میں اضافہ کردیا اور اپنے حُسن و جمال کو اس کے لیے ایک جال بنا دیا اور اُس پر اس طرح سے اثرانداز ہوئی کہ ایک دن ہیرودیس نے اُس سے کہا کہ تیری جو بھی آرزو ہے مجھ سے مانگ تو جو کچھ چاہے گی وہ تجھے ملے گا۔

ہیرودیا نے کہا: مَیں یحییٰ کے سر کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی، کیونکہ اُس نے مجھے اور تجھے بدنام کرکے رکھ دیا ہے۔ تمام لوگ ہماری عیب جوئی کررہے ہیں۔ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ میرے دل کو سکون حاصل ہو اور میرا دل خوش ہو تو تجھے یہ کام انجام دینا چاہیئے۔

ہیرودیس جو اُس عورت کا دیوانہ تھا انجام پر غور کیے بغیر یہ کام کرنے پر تیار ہوگیا۔ اور ابھی دیر نہ گزری تھی کہ حضرت یحییٰؑ کا سر اُس بدکار عورت کو پیش کردیا۔ لیکن آخرکار اس کے لیے اس کام کے ہولناک نتائج نکلے۔[1]

اسلامی روایات میں ہے کہ سالارِ شہیداں امام حسین علیہ السلام فرماتے تھے:

> دُنیا کی پستیوں میں سے یہ امر ہے کہ یحییٰؑ بن زکریاؑ کا سر بنی اسرائیل کی ایک بدکار عورت کے لیے ہدیہ کے طور پر لے جایا گیا۔

یعنی میرے اور یحییٰؑ کے حالات اس لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں کیونکہ میرے قیام کا ایک ہدف میرے زمانے کے طاغوت یزید کے شرمناک اعمال کے خلاف قیام ہے۔

۱۶۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝

۱۷۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۚ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝

---

[1] بعض اناجیل اور کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیرودیس نے اپنے بھائی کی بیوی کے ساتھ کہ جو تورات کے مطابق ممنوع تھی شادی کرلی تھی اور حضرت یحییٰؑ نے اُسے اس کام پر سخت لعنت ملامت کی۔ اس کے بعد اس عورت نے اپنی بیٹی کے حُسن و جمال کے ذریعے ہیرودیس کو حضرت یحییٰؑ کے قتل کرنے پر اکسایا۔ (انجیل متی باب ۱۴، انجیل مرقس باب ۶ بند ۱۷ اور اس کے بعد تک)۔

۱۸۔ قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ○

۱۹۔ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ○

۲۰۔ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ○

۲۱۔ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ○

ترجمہ

۱۶۔ اس کتاب (قرآن) میں مریم کو یاد کرو، اس وقت جبکہ وہ اپنے گھر والوں سے جُدا ہوئی اور مشرق کی جانب (ایک مقام پر جاکر ٹھہر گئی)

۱۷۔ اور اپنے اور ان کے درمیان پردہ ڈال لیا (تاکہ اس کی خلوتگاہ ہر لحاظ سے عبادت کے لیے ہو) اُس وقت ہم نے اپنی رُوح اس کی طرف بھیجی اور وہ بے عیب و نقص انسانی شکل میں مریم کے سامنے حاضر ہوئی۔

۱۸۔ (وہ بہت ڈری اور) اُس نے کہا: میں خدائے رحمٰن کی طرف تجھ سے پناہ مانگتی ہوں، اگر تو پرہیزگار ہے۔

۱۹۔ اُس نے کہا: میں تیرے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں (میں اس لیے آیا ہوں) تاکہ تجھے ایک پاک وپاکیزہ بیٹا بخشوں۔

۲۰۔ اُس نے کہا: یہ کیسے ممکن ہے کہ میرے ہاں بیٹا ہو حالانکہ اب تک مجھے کسی انسان نے چھُوا تک نہیں اور میں بدکار عورت بھی نہیں ہوں۔

۲۱۔ اُس نے کہا: بات یہی ہے کہ تیرے پروردگار نے کہا ہے کہ یہ کام میرے لیے آسان ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے لوگوں کے لیے نشانی قرار دیں اور وہ ہماری طرف سے رحمت ہو اور یہ فیصلہ شدہ امر ہے (اور اس میں گفتگو کی گنجائش نہیں ہے)

تفسیر

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت:

حضرت یحییٰؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کی داستان اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ کا قصہ شروع کیا گیا ہے کیونکہ ان دونوں قصوں کے درمیان بہت قریبی تعلق ہے۔ اگر حضرت یحییٰؑ کی پیدائش ایک ایسے بوڑھے اور ضعیف باپ سے اور ایک ایسی ماں سے جو بانجھ بھی عجیب تھی تو حضرت عیسیٰؑ کا بغیر باپ کے ماں سے پیدا ہوجانا اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے۔

اگر بچپن میں عقل اور نبوت کے مقام تک پہنچنا حیرت انگیز ہے، تو گہوارے میں گفتگو کرنا اور وہ بھی کتاب و نبوت کے بارے میں اس سے

بھی زیادہ تعجب خیز ہے۔

بہرحال یہ دونوں خداوند تعالٰی کی ایسی نشانیاں ہیں جو ایک دوسرے سے بڑی ہیں اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ایسے اشخاص کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں جو نسب کی حیثیت سے بہت ہی قریبی رشتہ رکھتے تھے۔ کیونکہ حضرت یحیٰیؑ کی والدہ حضرت مریمؑ کی والدہ کی بہن تھی اور یہ دونوں خواتین بانجھ اور عقیم تھیں اور دونوں صالح اور نیک فرزند کی آرزو میں زندگی بسر کر رہی تھیں۔

پہلی زیر بحث آیت کہتی ہے : آسمانی کتاب قرآن مجید میں مریم کی بات کرو کہ جس وقت اُس نے اپنے گھر والوں سے جُدا ہو کر شرقی حصہ میں قیام کیا۔

(واذکر فی الکتاب مریم اذ انتبذت من اھلھا مکانا شرقیا)۔

درحقیقت وہ ایک ایسی خالی اور فارغ جگہ چاہتی تھی جہاں پر کسی قسم کا کوئی شور و غل نہ ہو تاکہ وہ اپنے خدا سے راز و نیاز میں مشغول رہ سکے اور کوئی چیز اُسے یادِ محبوب سے غافل نہ کرے، اسی مقصد کے لیے اس نے عظیم عبادت گاہ بیت المقدس کی مشرقی سمت کو جو شاید زیادہ آرام و سکون کی جگہ تھی یا سورج کی روشنی کے لحاظ سے زیادہ پاک وصاف اور زیادہ مناسب تھی، انتخاب کیا۔

لفظ "انتبذت"، "نبذ" کے مادہ سے ہے۔ راغب کے قول کے مطابق، جو چیزیں ناقابلِ ملاحظہ ہوں انہیں دور پھینکنے کے معنی میں ہے اور مذکورہ بالا آیت میں یہ تعبیر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مریمؑ نے متواضعانہ اور گمنامی کی صورت میں اور ہر قسم کے ایسے کام سے خالی ہو کر، جو توجہ کو اپنی طرف لے جائے، سب سے کنارہ کشی اختیار کی اور خانہ خدا کی اس جگہ کو عبادت کے لیے چُنا۔

❁ ❁

اس وقت مریم نے "اپنے اور دوسروں کے درمیان ایک پردہ ڈال لیا" تاکہ اس کی خلوت گاہ ہر لحاظ سے کامل ہو جائے۔

(فاتخذت من دونھم حجابا)۔

اس جملے میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوئی کہ یہ پردہ کس مقصد کے لیے کیا گیا تھا۔ آیا اس مقصد کے لیے تھا کہ زیادہ شور و غل سے یکسوئی کے ساتھ پروردگار کی عبادت اور اُس سے راز و نیاز کر سکے یا اس لیے تھا کہ نہائیں دھوئیں اور غسل کریں، آیت اس لحاظ سے خاموش ہے۔

بہرحال اس وقت ہم نے اپنی "رُوح" (جو بزرگ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے) اس کی طرف بھیجی اور وہ بے عیب خوبصورت اور کامل انسان کی شکل میں مریم کے سامنے ظاہر ہوئی (فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشرا سویا)۔

ظاہر ہے ایسے موقع پر مریم کی کیا حالت ہوگی۔ وہ مریم کہ جس نے ہمیشہ پاکدامنی کی زندگی گزاری، پاکیزہ افراد کے دامن میں پرورش پائی اور تمام لوگوں کے درمیان عفت و تقویٰ کی ضرب المثل تھی، اس پر اس قسم کے منظر کو دیکھ کر کیا گزری ہوگی۔ ایک خوبصورت اجنبی آدمی اس کی خلوت گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ اس پر بڑی دہشت طاری ہوئی۔ فوراً پکاریں کہ میں خدائے رحمٰن کی پناہ چاہتی ہوں کہ مجھے تجھ سے بچائے۔ اگر تو پرہیزگار ہے۔

(قالت انی اعوذ بالرحمٰن منک ان کنت تقیا)۔

اور یہ خوف ایسا تھا کہ جس نے مریم کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ خدائے رحمان کا نام لینا اور اس کی رحمت عامہ کے ساتھ توصیف کرنا ایک طرف اور اُسے تقویٰ اور پرہیزگاری کی تشویق کرنا دوسری طرف، یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ اگر وہ اجنبی آدمی کوئی بُرا ارادہ رکھتا ہو تو اس پر کنٹرول کرے

اور سب سے بڑھ کر خدا کی طرف پناہ لینا، وہ خدا کہ جو انسان کے لیے سخت ترین حالات میں سہارا اور جائے پناہ ہے اور کوئی قدرت اس کی قدرت کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

❖ ❖ ❖

حضرت مریمؑ یہ بات کہنے کے ساتھ اس اجنبی آدمی کے ردّ عمل کی منتظر تھیں۔ ایسا انتظار جس میں بہت پریشانی اور وحشت کا رنگ تھا لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی، اُس اجنبی نے گفتگو کے لیے زبان کھولی اور اپنی عظیم ذمہ داری اور ماموریت کو اس طرح سے بیان کیا۔ اس نے کہا کہ میں تیرے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں (قال انما انا رسول ربك)۔

اِس جملہ نے اُس پانی کی طرح جو آگ پر چھڑکا جائے حضرت مریمؑ کے پاکیزہ دل کو سکون بخشا۔ لیکن یہ سکون زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ اُس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: میں اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں ایک ایسا لڑکا بخشوں جو جسم و رُوح اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہو (لاهب لك غلامًا زكيًّا)۔

❖ ❖

یہ بات سُنتے ہی مریمؑ کانپ اٹھیں وہ پھر ایک گہری پریشانی میں ڈوب گئیں اور "کہا کہ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ میرے کوئی لڑکا ہو حالانکہ کسی انسان نے اب تک مجھے چھوا تک نہیں اور میں ہرگز کوئی بدکار عورت بھی نہیں ہوں" (قالت انّٰى يكون لى غلام ولم يمسسنى بشر ولم اك بغيًّا)۔

وہ اس حالت میں صرف معمول کے اسباب کے مطابق سوچ رہی تھیں کیونکہ کوئی عورت صاحبِ اولاد ہو، اس کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں یا تو وہ شادی کرے یا بدکاری اور انحراف کا راستہ اختیار کرے میں خود کو کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر طور پر جانتی ہوں، نہ تو ابھی تک میرا کوئی شوہر ہے اور نہ ہی میں کبھی منحرف عورت رہی ہوں۔ اب تک تو یہ بات ہرگز سننے میں نہیں آئی کہ کوئی عورت ان دونوں صُورتوں کے سوا صاحبِ اولاد ہوئی ہو۔

❖ ❖ ❖

لیکن جلدی ہی اس نئی پریشانی کا طوفان بھی پروردگارِ عالم کے قاصد کی ایک دوسری بات سننے سے تھم گیا اس نے مریمؑ سے صراحت کے ساتھ کہا: "مطلب تو یہی ہے کیونکہ تیرے پروردگار نے فرمایا ہے کہ یہ کام میرے لیے سہل اور آسان ہے" (قال كذالك قال ربك هو على هين)۔

تُو تو اچھی طرح میری قدرت سے آگاہ ہے، تُو نے تو بہشت کے وہ پھل جو دنیا میں اس فصل میں ہوتے ہی نہیں اپنے محرابِ عبادت کے پاس دیکھے ہیں، تُو نے تو فرشتوں کی وہ آوازیں سُنی ہیں جو تیری پاکیزگی کی شہادت کے لیے تھیں۔ تجھے تو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرے جدِّ امجد آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے۔ پھر یہ کیسا تعجب ہے کہ جو تجھے اس خبر سے ہو رہا ہے۔

اس کے بعد اُس نے مزید کہا: ہم چاہتے ہیں کہ اُسے لوگوں کے لیے آیت اور ایک معجزہ قرار دیں۔ (ولنجعله اٰية للناس)۔

اور ہم چاہتے ہیں کہ اُسے اپنے بندوں کے لیے اپنی طرف سے رحمت قرار دیں (ورحمة منا)۔ بہر حال یہ فیصلہ شدہ امر ہے اور اس میں گفتگو کی گنجائش نہیں ہے (وكان امرًا مقضيًّا)۔

چند نکات :

۱۔ رُوحِ خُدا سے کیا مُراد ہے ؟ تقریباً تمام مشہور مفسرین نے یہاں پر رُوح کی خداوند تعالیٰ کے بزرگ فرشتے جبرئیل سے تفسیر کی ہے اور اسے رُوح سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ روحانی ہے۔ وہ ایک ایسا وجود ہے جو حیات بخش ہے۔ چونکہ وہ انبیاء و مرسلین کے پاس خداوند تعالیٰ کی رسالت کا پہنچانے والا ہے لہذا تمام لائق انسانوں کے لیے حیات بخش ہے اور یہاں پر رُوح کی خدا کی طرف اضافت اس رُوح کی عظمت و شرافت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اضافت کی ایک قسم اضافتِ تشریفیہ ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل کا نازل ہونا انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، البتہ شریعت اور کُتب آسمانی لانے کے لیے وحی کے عنوان سے صرف اُنہیں کے اُوپر نازل ہوا کرتا تھا لیکن دوسرے پیغامات پہنچانے کے لیے (جیسا کہ مذکورہ بالا پیغام حضرت مریمؑ کو پہنچایا) کوئی مانع نہیں ہے کہ انبیاء کے علاوہ دوسروں کے سامنے بھی ظاہر ہو۔

۲۔ "تمثل" کیا ہے ؟

"تمثل" اصل میں مادہ مثول سے کسی شخص یا چیز کے سامنے کھڑا ہونے کے معنی میں ہے، اور تمثل اس چیز کو کہتے ہیں کہ جو کسی دوسرے کی شکل میں ظاہر ہو۔ اس بنا پر 'فتمثل لها بشرا سويا' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خدائی فرشتہ انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ اس گفتگو کا یہ معنی نہیں ہے کہ جبرئیل صورت اور سیرت کے اعتبار سے بھی ایک انسان میں بدل گیا تھا کیونکہ اس قسم کا انقلاب اور تبدیلی ممکن نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ (بظاہر) انسان کی شکل میں نمودار ہوا، اگرچہ اس کی سیرت وہی فرشتے جیسی تھی، لیکن حضرت مریمؑ کو ابتدائی امر میں چونکہ یہ خبر نہیں تھی لہذا انہوں نے یہی خیال کیا تھا کہ ان کے سامنے ایک ایسا انسان ہے جو باعتبار صورت بھی انسان ہے اور باعتبار سیرت بھی انسان ہے۔

اسلامی روایات اور تواریخ میں "تمثل" اس لفظ کے وسیع معنی میں بہت نظر آتا ہے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ : جس دن مشرکین مکہ دارالندوہ میں جمع ہوئے تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نابود کرنے کے لیے سازش کر رہے تھے تو ابلیس ایک خیر اندیش و خیر خواہ بوڑھے آدمی کے لباس میں ظاہر ہوا اور سرداران قریش کو بہکانے میں مشغول ہو گیا۔

یا دوسری روایت یہ ہے کہ دنیا اور اس کی باطنی حالت حضرت علی علیہ السلام کے سامنے ایک حسین و جمیل دلرُبا عورت کی شکل میں ظاہر ہوئی، لیکن وہ آپ پر کچھ بھی اثر نہ کر سکی۔ یہ واقعہ مفصل اور مشہور ہے۔

تیسرے روایات میں یہ بھی ہے کہ انسان کے مال و اولاد اور عمل موت کے وقت مختلف اور مخصوص چہروں میں اس کے سامنے مجسم ہوتے ہیں۔

چوتھے یہ کہ انسان کے اعمال قبر میں اور قیامت کے دن مجسم ہو کر ظاہر ہوں گے اور ہر عمل ایک خاص شکل میں ظاہر ہوگا۔ ان تمام مواقع پر "تمثل" کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز یا کوئی شخص ظاہری طور پر دوسرے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے نہ یہ کہ اس کا باطن یا اس کی ماہیت ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔[1]

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۴ صفحہ ۳۶۔

۲۲۔ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ○

۲۳۔ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ○

۲۴۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ○

۲۵۔ وَهُزِّىْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ○

۲۶۔ فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِىْۤ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ○

ترجمہ

۲۲۔ آخرکار (مریم) حاملہ ہوگئی اور وہ کسی دُور دراز مقام کی طرف چلی گئی۔

۲۳۔ درد زہ کی تکلیف اسے ایک کھجور کے تنے کی طرف لے گئی (وہ اس قدر پریشان ہوئی کہ) اُس نے کہا کہ اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بالکل فراموش ہوگئی ہوتی۔

۲۴۔ اچانک اس کے پاؤں کے نیچے کی طرف سے (کسی نے) اسے پکار کر کہا کہ غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے پاؤں کے نیچے (خوشگوار) پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے۔

۲۵۔ اور کھجور کے اس درخت کو ہلا تاکہ تر و تازہ کھجوریں تجھ پر گریں۔

۲۶۔ اس (لذیذ غذا) میں سے کھا اور اس (خوشگوار پانی) میں سے پی اور اپنی آنکھوں کو (اس نئے مولود سے) روشن رکھ۔ اور جب تو انسانوں میں سے کسی کو دیکھے تو اشارے سے کہہ دے کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے اور میں آج کسی کے ساتھ بات نہیں کروں گی۔ (یہ نو مولود خود ہی تیرا دفاع کرے گا)۔

تفسیر

مریمؑ سخت طوفانوں کے تھپیڑوں میں:

سرانجام مریم حاملہ ہوگئی" اور اُس موعود بچے نے اس کے رحم میں جگہ پائی (فحملته)۔

اس بارے میں کہ یہ بچہ کس طرح وجود میں آیا، کیا جبرئیل نے مریم کے پیراہن میں پھونکا یا ان کے منہ میں، قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ مفسرین کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

بہرحال اس امر کے سبب وہ بیت المقدس سے کسی دُور دراز مقام پر چلی گئی (فانتبذت به مکاناً قصيّاً)۔

وہ اس حالت میں ایک امید وبیم کے درمیان پریشانی و خوشی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ وقت گزار رہی تھی، کبھی وہ یہ خیال کرتی کہ آخرکار یہ حمل ظاہر ہو جائے گا، مانا کہ چند دن یا چند مہینے اُن لوگوں سے دُور رہ لوں گی اور اس مقام پر ایک اجنبی کی طرح زندگی بسر کر لوں گی مگر آخرکار کیا ہوگا؛ کون میری بات قبول کرے گا کہ ایک عورت بغیر شوہر کے حاملہ ہوگئی۔ سوائے اس کے کہ اس کا دامن آلودہ ہو، میں اس اتہام کے مقابلہ میں کیا کروں گی۔ واقعاً وہ لڑکی کہ جو سالہا سال سے پاکیزگی وعفت اور تقویٰ و پرہیزگاری کی علامت تھی اور خدا کی عبادت و بندگی میں نمونہ تھی جس کے بچپنے میں کفالت کرنے پر بنی اسرائیل کے زاہد و عابد فخر کرتے تھے۔ اور جس نے ایک عظیم پیغمبر کے زیرِ نظر پرورش پائی تھی، خلاصہ یہ ہے کہ جس کے اخلاق کی دھوم اور پاکیزگی کی شہرت ہر جگہ پہنچی ہوئی تھی اُس کے لیے یہ بات بہت ہی دردناک تھی کہ ایک دن وہ یہ محسوس کرے کہ اُس کا یہ سب معنوی سرمایہ خطرے میں پڑ گیا ہے اور وہ ایک ایسی تہمت کے گرداب میں پھنس گئی ہے کہ جو بدترین تہمت شمار ہوتی ہے۔ اور یہ تیسرا لرزہ تھا کہ جو اس کے جسم پر طاری ہوا۔

لیکن دوسری طرف وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ یہ فرزند خداوند تعالیٰ کا موعود پیغمبر ہے۔ یہ ایک عظیم آسمانی تحفہ ہوگا، وہ خدا کہ جس نے مجھے ایسے فرزند کی بشارت دی ہے اور ایسے معجزانہ طریقے سے اسے پیدا کیا ہے مجھے اکیلا کیسے چھوڑے گا؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس قسم کے اتہام کے مقابلہ میں میرا دفاع نہ کرے؟ میں نے تو اس کے لطف وکرم کو ہمیشہ آزمایا ہے اور اس کا دستِ رحمت ہمیشہ اپنے سر پر دیکھا ہے۔

اس بات پر کہ مریم کی مدتِ حمل کس قدر تھی، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اگرچہ قرآن میں سربستہ طور پر بیان ہوا ہے (پھر بھی) بعض نے اُسے ایک گھنٹہ، بعض نے نو گھنٹے، بعض نے چھ ماہ، بعض نے سات ماہ، بعض نے آٹھ ماہ اور بعض نے دوسری عورتوں کی طرح نو مہینے کہا ہے؛ لیکن یہ موضوع اس واقعے کے مقصد پر اثر نہیں رکھتا۔ روایات بھی اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ جگہ "قصی" (دُور دراز) کہاں تھی، بہت سے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ شہر "ناصرہ" تھا اور شاید اس شہر میں بھی وہ مسلسل گھر ہی میں رہتی تھیں اور بہت کم باہر نکلتی تھیں۔

❖ ❖ ❖

جو کچھ بھی تھا مدتِ حمل ختم ہوئی اور مریم کی زندگی کے طوفانی لمحات شروع ہوگئے انہیں سخت دردِ زہ کا آغاز ہوگیا۔ ایسا درد جو انہیں آبادی سے بیابان کی طرف لے گیا۔ ایسا بیابان جو انسانوں سے خالی، خشک اور بے آب تھا۔ جہاں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

اگرچہ اس حالت میں عورتیں اپنے قریبی اعزہ کی پناہ لیتی ہیں تاکہ وہ بچے کی پیدائش کے سلسلے میں ان کی مدد کریں؛ لیکن مریم کی حالت چونکہ ایک استثنائی کیفیت تھی، وہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی ان کے وضع حمل کو دیکھے لہٰذا دردِ زہ کے شروع ہوتے ہی انہوں نے بیابان کی راہ لی۔

قرآن اس سلسلے میں کہتا ہے: وضع حمل کا درد اُسے کھجور کے درخت کے پاس کھینچ لے گیا۔ (فاجاءها المخاض الى جذع النخلة)۔

"جذع النخلة" کی تعبیر: اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ "جذع" درخت کے تنا کے معنی میں ہے، یہ نشاندہی کرتی ہے کہ:

اس درخت کا صرف تنہ باقی رہ گیا تھا یعنی وہ خشک شدہ درخت تھا۔[1]

اس حالت میں غم و اندوہ کا ایک طوفان تھا جو مریمؑ کے پورے وجود پر طاری تھا، انہوں نے محسوس کیا کہ جس لمحے کا خوف تھا وہ آن پہنچا ہے ایسا لمحہ کہ جس میں وہ سب کچھ آشکار ہو جائے گا جو اب تک چھپا ہوا ہے اور بے ایمان لوگوں کی طرف سے ان پر تہمت کے تیروں کی بارش شروع ہو جائیگی یہ طوفان اس قدر سخت تھا اور یہ باران کے دوش پر اتنا سنگین تھا کہ بے اختیار ہو کر بولیں، اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بالکل بھلا دی جاتی۔ (قالت یالیتنی مت قبل ھٰذا وکنت نسیًا منسیًّا)۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ حضرت مریمؑ کو صرف آئندہ کی تہمتوں کا خوف ہی نہیں تھا کہ جو ان کے دل کو بے چین کیے ہوئے تھا، بلکہ انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کا تھا کہ دوسری مشکلات بھی تھیں۔ کسی دایہ اور ہمدم و مددگار کے بغیر وضع حمل، سنسان بیابان میں بالکل تنہائی، آرام کے لیے کوئی جگہ نہ ہونا، پینے کے لیے پانی اور کھانے کے لیے غذا کا فقدان اور نومولود کے لیے نگہداشت کے کسی وسیلے کا نہ ہونا ایسے امور تھے کہ جنہوں نے انہیں سخت پریشان کر رکھا تھا۔

اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت مریمؑ نے ایمان اور توحید کی ایسی معرفت کے ہوتے ہوئے اور خداوند تعالیٰ کے اتنے لطف و کرم اور احسانات دیکھنے کے باوجود ایسا جملہ زبان پر کیسے جاری کیا کہ "اے کاش میں مرگئی ہوتی اور فراموش ہو چکی ہوتی" انہوں نے اس وقت میں جناب مریمؑ کی حالت کا تصور ہی نہیں کیا۔ اور اگر وہ خود ان مشکلات میں سے کسی چھوٹی سی مشکل میں بھی گرفتار ہو جائیں تو ان کے ایسے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے کہ انہیں خود اپنی بھی خبر نہ رہے گی اور وہ خود کو بھی بھول جائیں گے۔

لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی اور اُمید کا وہی روشن نقطہ جو ہمیشہ ان کے دل کی گہرائیوں میں رہتا تھا چمکنے لگا۔ یکایک ایک آواز ان کے کانوں میں آئی جو ان کے پاؤں کے نیچے سے بلند ہو رہی تھی اور واضح طور پر کہہ رہی تھی کہ غمگین نہ ہو۔ ذرا غور سے دیکھ تیرے پروردگار نے تیرے پاؤں کے نیچے ایک خوشگوار پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے۔ (فناداھا من تحتھا ان لا تحزنی قد جعل ربك تحتك سریًّا)۔

٭ ٭ ٭

ایک نظر اپنے سر کے اوپر ڈالو اور غور سے دیکھو کہ کس طرح خشک تنہ بار آور کھجور کے درخت میں تبدیل ہو گیا ہے، کہ پھلوں نے اس کی شاخوں کو زینت بخشی ہے اور اس کھجور کے درخت کو ہلاؤ تاکہ تازہ کھجوریں تم پر گرنے لگیں (وھزی الیك بجذع النخلۃ تساقط علیك رطبًا جنیًّا)۔

اس لذیذ اور قوت بخش غذا میں سے کھاؤ اور اس خوشگوار پانی میں سے پیو (فکلی واشربی)۔

اور اپنی آنکھوں کو اس نومولود سے روشن رکھو (وقری عینًا)۔

اور اگر آئندہ کے حالات سے پریشانی ہے تو مطمئن رہو۔ جب تم کسی بشر کو دیکھو اور وہ تم سے اس بارے میں وضاحت چاہے تو اشارہ کے ساتھ اُس سے کہہ دینا کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے، خاموشی کا روزہ اور اس سبب سے میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی (فاما ترین من البشر احدًا فقولی انی نذرت للرحمٰن صومًا فلن اکلم الیوم انسیًّا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم آپ اپنا دفاع کرو۔ وہ ذات کہ جس نے یہ مولود تمہیں عطا کیا ہے اس نے تیرے دفاع کی ذمہ داری بھی اسی کے سپرد کر دی ہے اس لیے تم ہر طرح سے مطمئن رہو اور غم و اندوہ کو اپنے دل میں جگہ نہ دو۔

---

[1] "جذع" بروزن "فذع" اصل میں "جذع" (بروزن منع) سے ہے جس کا معنی کاٹنا اور قطع کرنا ہے۔

ان پے در پے واقعات نے جو ایک انتہائی تاریک فضا میں روشن شعلوں کی طرح چمکنے لگے تھے ، ان کے دل کو پوری طرح روشن کر دیا تھا اور انہیں ایک سکون بخش دیا تھا۔

چند اہم نکات :

۱۔ **حضرت مریمؑ کی مشکلات میں تربیت :** وہ حادثات جو اس مختصر سی مدت میں حضرت مریمؑ پر گزرے اور لطف خدا کے لیے حیرت انگیز مناظر جو ان کے سامنے آئے ، وہ مسلمہ طور پر انہیں ایک اولوالعزم پیغمبر کی پرورش کے لیے تیار کر رہے تھے۔ تاکہ وہ اس عظیم کام کی انجام دہی کے لیے اپنی مادری ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے ادا کر سکیں۔

حادثات کی رفتار انہیں مشکلات کے آخری مرحلہ تک لے گئی یہاں تک کہ انہیں اپنے اور زندگی کے اختتام کے درمیان ایک قدم سے زیادہ فاصلہ دکھائی نہ دیتا۔

لیکن اچانک ورق اُلٹ جاتا اور تمام چیزیں ان کی مدد کے لیے دوڑ پڑتیں اور وہ ہر لحاظ سے آرام و سکون اور مطمئن ماحول میں قدم رکھ دیتیں۔

" وھزّی الیك بجذع النخلة " کا جملہ کہ جو حضرت مریمؑ کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ کھجور کے درخت کو ہلائیں تاکہ اُس کے پھل سے فائدہ اُٹھائیں، انہیں اور تمام انسانوں کو یہ سبق سکھاتا ہے کہ زندگی کے سخت ترین لمحات میں بھی تلاش اور کوشش سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔

یہ بات اُن لوگوں کا جواب ہے کہ جو یہ سوچتے ہیں کہ اس بات کی کیا ضرورت تھی کہ مریمؑ اس حالت میں کہ انہیں ابھی ابھی وضع حمل ہوا تھا ، اُٹھیں اور کھجور کے درخت کو ہلائیں ؟ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ خدا جس کے حکم سے خشک درخت بھی بار آور ہو گیا تھا ، ہوا کو بھیج دیتا تاکہ وہ درخت کی شاخوں کو ہلاتی اور مریمؑ کے گرد اگرد کھجوریں گراتی ، یہ کیا ہوا کہ جب مریمؑ صحیح و سالم تھیں تو جنت کے پھل ان کی محراب کے پاس آجاتے لیکن اس وقت جبکہ وہ اس شدید مشکل میں گرفتار تھیں تو انہیں خود پھل چننے پڑے ؟

ہاں ! مریمؑ کو خداوند تعالیٰ کا یہ حکم اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب تک ہماری طرف سے حرکت نہیں ہوگی کوئی برکت نہیں ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ہر شخص کو مشکلات کے وقت زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے اور اس کے علاوہ جو باتیں اس کی قدرت و طاقت سے باہر ہیں ان کے لیے خداوند تعالیٰ کے حضور میں دعا کرے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے :

برخیز و فشاں درخت خرما | تا سیر شوی رسی بنازش
کان مریم تا درخت نفشاند | خرما نفتاد در کنارش

۲۔ **مریمؑ نے موت کی تمنا کیوں کی ؟** اس میں شک نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ سے موت کا تقاضا کرنا اچھا کام نہیں ہے لیکن کبھی انسان کی زندگی میں ایسے سخت حادثات بھی پیش آجاتے ہیں کہ جس سے زندگی کا ذائقہ بالکل تلخ اور ناگوار ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے مواقع پر کہ جہاں انسان مقدس مقاصد یا اپنے شرف و حیثیت کو خطرے میں دیکھتا ہے اور دفاع کی طاقت نہیں رکھتا ، ایسے مواقع پر بعض اوقات رُوحانی اذیت سے رہائی کے لیے موت کا تقاضا کرتا ہے۔

لیکن اس قسم کے افکار جو کہ شاید بہت ہی مختصر سی مدت کے لیے صورت پذیر ہوئے تھے زیادہ دیر تک نہ رہے اور خداوند تعالیٰ کے دو معجزات یعنی پانی کا چشمہ پھوٹنے اور کھجور کا خشک درخت بار آور ہوتے دیکھا تو یہ تمام افکار برطرف ہو گئے ، اور اطمینان و سکون کا نور ان کے دل پر

چھا گیا۔

۳۔ **ایک سوال کا جواب** : بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر معجزہ انبیاء اور آئمہؑ کے ساتھ مخصوص ہے تو پھر جناب مریمؑ کے لیے ایسے معجزات کیونکر ظہور پذیر ہوئے۔

بعض مفسرین نے اس سوال کے جواب کے لیے ان کو حضرت عیسیٰؑ کے معجزات میں سے قرار دیا ہے کہ جو تمہید کے طور پر وقوع پذیر ہوئے تھے اور وہ انہیں " ارھاص " سے تعبیر کرتے ہیں۔ (ارھاص مقدمہ کے طور پر ظاہر ہونے والے معجزے کے معنی میں ہے)۔

لیکن اس قسم کے جوابات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ معجزات کا ظہور انبیاء اور آئمہ کے علاوہ کسی کے لیے کوئی مانع نہیں رکھتا، یہ وہی چیز ہے کہ جسے ہم کرامت کہتے ہیں۔

معجزہ وہ ہے کہ جس میں "تحدی" یعنی چیلنج ادّعائے نبوت و امامت کے ساتھ ہو۔

۴۔ **خاموشی کا روزہ** : مذکورہ بالا آیات کا ظاہری مفہوم اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت مریمؑ ایک خاص مصلحت کی خاطر خاموشی پر مامور تھیں اور خداوند تعالیٰ کے حکم سے اس خاص مدت میں بات کرنے سے اجتناب کر رہی تھیں تاکہ ان کا نومولود بچہ عیسیٰؑ، بات کرنے کے لیے لب کشائی کرے اور ان کی پاکیزگی کا دفاع کرے، کیونکہ یہ بات ہر لحاظ سے موثر تر اور بہت سے امور پر محیط تھی۔

لیکن آیت کی تعبیر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نذرِ سکوت (خاموشی کے روزے کی منت ماننا) اُس قوم اور جمعیت کے لیے ایک جانا پہچانا کام تھا، اسی وجہ سے اس کام کے لیے انہوں نے جناب مریمؑ پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

لیکن اس قسم کا روزہ شریعت اسلام میں مشروع اور جائز نہیں ہے۔

حضرت امام علی بن الحسین علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے :

صوم السکوت حرام

خاموشی کا روزہ حرام ہے۔ [1]

یہ بات ظہور اسلام کے زمانے اور اُس زمانے کی شرائط میں اختلاف اور فرق کی وجہ سے ہے۔

ہاں البتہ اسلام میں کامل روزہ کے آداب میں سے ایک بات یہ ہے کہ انسان روزے کی حالت میں اپنی زبان کو گناہ اور مکروہات کی آلودگی سے بچائے اور اسی طرح اپنی آنکھوں کو ہر قسم کی آلودگی سے بند رکھے، جیسا کہ ہم امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں پڑھتے ہیں :

ان الصوم لیس من الطعام والشراب وحدہ، ان مریم قالت انی نذرت للرحمٰن صوماً، ای صمتاً، فاحفظوا السنتکم وغضوا ابصارکم ولا تحاسدوا ولا تنازعوا :

روزہ صرف کھانے اور پینے سے ہی نہیں ہے، حضرت مریمؑ نے کہا : کہ میں نے خدائے رحمٰن

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد ، صفحہ ۳۹۰

کے لیے روزہ کی نذر مانی ہے یعنی خاموش رہنے کی، اس بنا پر (جب تم روزہ کی حالت میں ہو تو) اپنی زبان کی حفاظت کرو، اپنی آنکھوں کو ہر اُس چیز سے کہ جس میں گناہ ہو بند رکھو ــــ ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور جھگڑا نہ کرو[1]

۵۔ ایک قوت بخش غذا : اس بات سے کہ مذکورہ بالا آیات میں صراحت کے ساتھ یہ بیان ہوا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کے لیے نومولود کی پیدائش کے وقت اُن کی غذا رطب (کھجور) کو قرار دیا ہے، مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عورتوں کے لیے وضع حمل کے بعد بہترین غذاؤں میں سے ایک رطب (تازہ کھجور) ہے۔

اسلامی احادیث میں بھی اس مطلب کی طرف صراحت کے ساتھ اشارہ ہوا ہے :

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے پیغمبرِ اسلامؐ سے نقل فرمایا ہے :

لیکن اول ما تاکل النفساء الرطب فان الله عزّ و جل قال لمریم و هزّی الیك بجزع النخلة تساقط علیك رطباً جنیاً۔

پہلی چیز جو وضع حمل کے بعد عورت کو کھانی چاہیئے وہ رطب (تازہ کھجور) ہے کیونکہ خدائے عزّوجل نے مریمؑ سے فرمایا خرمے کے درخت کو ہلا تاکہ تازہ کھجوریں تجھ پر گریں[2]

اسی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس غذا کا کھانا نہ صرف ماں کے لیے مؤثر ہے بلکہ اس کے دودھ کے لیے بھی مفید ہے۔

یہاں تک کہ چند ایک روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حاملہ عورت کے لیے بہترین غذا اور اس کی دوا رطب ہے :

ما تاکل الحامل من شیء و لا تتداوی به افضل من الرطب[3]

لیکن مسلمہ طور پر ہر چیز میں اور اسی طرح اس موضوع میں بھی اعتدال کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیئے۔ جیسا کہ بعض روایات میں بھی بیان ہوا ہے، جو اسی بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

نیز یہ بھی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تازہ کھجوریں نہ مل سکیں تو پھر عام کھجوروں سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

غذاؤں پر تحقیقات کرنے والے ماہرین کا کہنا ہے: کھجور میں جو بکثرت شکر پائی جاتی ہے وہ ہر قسم کی شکر کی نسبت کامل تر ہے یہاں تک کہ بہت سے مواقع پر شوگر کے مریض بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

یہی ماہرین کہتے ہیں کہ اُنہوں نے کھجور میں ۱۳ حیاتی اجزاء، اور پانچ قسم کے وٹامن معلوم کیے ہیں کہ جنہوں نے مجموعی طور پر کھجور کو ایک بھرپور غذائی منبع کی صورت دے دی ہے[4]

نیز یہ بات ہم جانتے ہیں کہ ایسی حالت میں عورتوں کو قوت بخش اور وٹامن سے بھرپور غذاؤں کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

علمِ طب کی ترقی کے ساتھ ساتھ دوا کی حیثیت سے کھجور کی اہمیت بھی ثابت ہو گئی ہے۔ کھجور میں کیلشیم موجود ہے کہ جو ہڈیوں کی مضبوطی کا عامل ہے نیز اس میں فاسفورس بھی پایا جاتا ہے کہ جو مغز کو تشکیل دینے والے اصلی عناصر میں سے ہے اور اعصاب کے ضعف اور خستگی کو دور

---

[1] من لا یحضرہ الفقیہ طبق نقل تفسیر نور الثقلین، جلد ۳، صـ ۳۳۲۔

[2] [3] نور الثقلین، جلد ۳، صـ ۳۳۰۔

[4] ایضاً ــــ اولین دانشگاہ و آخرین پیغمبر، جلد ۷، ص ۶۵۔

کرنے والا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں پوٹاشیم بھی موجود ہے جس کی بدن میں کمی کو زخم معدہ کا حقیقی سبب سمجھا جاتا ہے۔[1]

۲۷۔ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۗ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ○

۲۸۔ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ○

۲۹۔ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۗ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا ○

۳۰۔ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ○

۳۱۔ وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۖ وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ○

۳۲۔ وَّبَرًّا ۢ بِوَالِدَتِىْ ۖ وَلَمْ يَجْعَلْنِىْ جَبَّارًا شَقِيًّا ○

۳۳۔ وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ○

ترجمہ

۲۷۔ مریم اُسے گود میں لیے ہوئے اپنی قوم کی طرف آئیں تو انہوں نے کہا کہ اے مریم تو نے تو بہت عجیب اور بُرا کام انجام دیا ہے۔

۲۸۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ ہی بُرا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں کوئی بدکار عورت تھی۔

۲۹۔ (مریم نے) اُس کی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگے کہ ہم اس بچے کے ساتھ کہ جو ابھی گہوارہ میں ہے کیسے بات کریں؟

۳۰۔ (اچانک عیسیٰ بول اُٹھے اور) کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے آسمانی کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔

۳۱۔ اور میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے برکتوں والا بنایا ہے اور مجھے تاحیات نماز پڑھتے رہنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وصیت کی ہے۔

۳۲۔ اور مجھے میری ماں کے لیے نیکوکار قرار دیا ہے اور جبار و شقی قرار نہیں دیا۔

۳۳۔ اور مجھ پر (خدا کا) سلام ہے اس دن جبکہ میں پیدا ہوا اس دن جبکہ میں مروں گا اور اُس دن جب کہ میں زندہ ہو کر

[1] اوّلین دانشگاہ و آخرین پیغمبر، جلد ۷، صفحہ ۶۵۔

اُٹھایا جاؤں گا۔

تفسیر

حضرت مسیحؑ کی گہوارے میں باتیں :

آخر کار حضرت مریمؑ اپنے بچے کو گود میں لیے ہوئے بیابان سے آبادی کی طرف لوٹیں اور اپنی قوم اور رشتہ داروں کے پاس آئیں۔ (فأتت به قومها تحمله)۔

جونہی انہوں نے ایک نومولود بچہ ان کی گود میں دیکھا تعجب کے مارے اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ لوگ کہ جو مریمؑ کی پاکدامنی سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کے تقویٰ و کرامت کی شہرت کو سُن چکے تھے سخت پریشان ہوئے۔ یہاں تک کہ اُن میں سے کچھ تو شک و شبہ میں پڑ گئے اور بعض ایسے لوگ کہ جو فیصلہ کرنے میں جلد باز تھے انہوں نے اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگے اس بدکاری کے ساتھ تمہارے روشن ماضی پر بہت افسوس ہے اور صد افسوس اس پاک خاندان پر کہ جو اس طرح بدنام ہوا۔ کہنے لگے اے مریمؑ تو نے یقیناً بہت ہی عجیب اور بُرا کام انجام دیا ہے۔ (قالوا یا مریم لقد جئت شیئاً فریّاً)[1]

بعض نے ان کی طرف رُخ کیا اور کہا : "اے ہارون کی بہن تیرا باپ تو کوئی بُرا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بھی بدکار نہیں تھی"۔ (یا اخت هٰرون ما کان ابوك امرأ سوء وما کانت امك بغیاً)۔

ایسے پاک و پاکیزہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے ہم یہ تیری کیا حالت دیکھ رہے ہیں۔ تو نے اپنے باپ کے طریقہ اور ماں کے چلن میں کونسی بُرائی دیکھی تھی کہ تُو نے اُس سے رُوگردانی کر لی !

یہ بات کہ جو انہوں نے مریمؑ سے کہی کہ "اے ہارون کی بہن" مفسرین کے درمیان مختلف تفاسیر کا موجب بنی ہے، لیکن جو بات سب سے زیادہ صحیح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہارون ایک ایسا پاک و صالح آدمی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان ضرب المثل ہو گیا تھا۔ وہ جس شخص کا پاکیزگی کے ساتھ تعارف کروانا چاہتے تھے تو اس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ ہارون کا بھائی ہے یا ہارون کی بہن ہے۔ مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اس معنی کو ایک مختصر حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے[2]

ایک اور حدیث میں کہ جو کتاب "سعد السعود" میں آئی ہے اس میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مغیرہ کو (عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے) نجران بھیجا تو عیسائیوں کی ایک جماعت نے قرآن پر اعتراض کے طور پر کہا : کیا تم اپنی کتاب میں یہ نہیں پڑھتے ہو "یا اخت هارون" حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہارون سے مراد حضرت موسیٰؑ کے بھائی ہیں تو مریم اور ہارون کے درمیان تو بہت فاصلہ تھا۔

مغیرہ چونکہ جواب نہ دے سکا۔ لہٰذا اُس نے اس بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا، تو آپؐ نے فرمایا :

تُو نے اُن کے جواب میں یہ کیوں نہ کہا کہ بنی اسرائیل کے درمیان یہ معمول تھا کہ نیک افراد کو انبیاء اور صالحین

---

[1] فری۔ کتاب مفردات میں راغب کے قول کی بنا پر عظیم یا عجیب کے معنی میں ہے اور اصل میں فری کے مادہ سے چیرنے کی (چادر خراب کرنے کیلئے) پارہ پارہ کرنے کے معنی میں ہے۔

[2] نور الثقلین، ج ۳، ص ۳۳۳۔

کے ساتھ نسبت دیا کرتے تھے [1]

اس وقت جناب مریمؑ نے خداوند تعالیٰ کے حکم سے خاموشی اختیار کی، صرف ایک کام جو انہوں نے انجام دیا یہ تھا کہ اپنے نومولود بچے عیسٰیؑ کی طرف اشارہ کیا (فاشارت الیہ)۔

لیکن اس کام نے اُن کے تعجب کو اور بھی برانگیختہ کر دیا اور شاید ان میں سے بعض نے اس بات کو ان کے ساتھ ٹھٹھہ کرنے پر محمول کیا اور وہ غصے میں آکر بولے: اے مریم! ایسا کام کرکے تو اپنی قوم کا مذاق بھی اُڑا رہی ہے۔

بہرحال اُنہوں نے اُس سے کہا: ہم ایسے بچے کے ساتھ کہ جو ابھی گہوارہ میں ہے کیسے باتیں کریں۔ (قالوا کیف نکلم من کان فی المھد صبیا)۔

مفسرین نے لفظ "کان" کے بارے میں کہ جو ماضی پر دلالت کرتا ہے اس مقام پر بہت بحث کی ہے لیکن ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر یہ لفظ موجود وصف کے ثبوت ولزوم کے لیے ہے اور زیادہ واضح الفاظ میں انہوں نے جناب مریمؑ سے یہ کہا کہ ہم اس بچے سے کہ جو ابھی تک گہوارے میں ہے کیسے بات کریں؟

قرآن مجید کی دوسری آیات اس معنی پر شاہد ہیں مثلاً:

كنتم خير أمة أخرجت للناس

"تم بہترین اُمت ہو کہ جو انسانی معاشرے کے فائدہ کے لیے وجود میں آئے ہو (آل عمران - ۱۱۰)

مسلمہ طور پر لفظ "کنتم" (تم تھے) یہاں پر ماضی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اسلامی معاشرے کے لیے ان صفات کے تسلسل اور ثبوت کا بیان ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے "مھد" (گہوارہ) کے بارے میں بھی بحث کی ہے، کہ ابھی تک حضرت عیسٰیؑ گہوارہ تک نہیں پہنچے تھے، بلکہ آیات کا ظاہر یہ ہے کہ حضرت مریمؑ کے اُس جمیعت کے پاس پہنچتے ہی، جبکہ حضرت عیسٰیؑ اُن کی آغوش میں تھے، اُن کے اور لوگوں کے درمیان باتیں ہوئیں۔

لیکن لغت عربی میں لفظ "مھد" کے معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

لفظ "مھد" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے ایسی جگہ کے معنی میں ہے کہ جو بچے کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ چاہے وہ گہوارہ ہو یا ماں کی گود یا بستر اور مھد اور مھاد دونوں ہی لغت میں (المکان الممھد الموطا) : "(آرام اور سونے کے لیے) تیار کی ہوئی اور بچھی ہوئی جگہ کے معنی میں"۔

بہرحال وہ لوگ اس کی یہ بات سُن کر پریشان ہو گئے، بلکہ شاید غضب ناک ہو گئے۔ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے سے یہ کہا کہ اس کا تمسخر اور استہزا کرنا، جادۂ عفت و پاکدامنی سے اس کے انحراف کی نسبت ہمارے لیے زیادہ سخت اور سنگین ترہے

لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ کیونکہ اس نومولود بچے نے بات کرنے کے لیے زبان کھولی اور کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں (قال انی عبداللہ)۔ اُس نے مجھے آسمانی کتاب مرحمت فرمائی ہے (اتانی الکتاب)۔ اور مجھے پیغمبر قرار دیا ہے۔ (وجعلنی نبیا)۔

اور خدا نے مجھے ایک بابرکت وجود قرار دیا ہے، خواہ میں کہیں بھی ہوں۔ میرا وجود بندوں کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہے۔ (وجعلنی مبارکا اینما کنت)۔

---

[1] نورالثقلین، ج ۳، ص ۳۳۳

اور اس نے مجھے تاحیات نماز پڑھتے رہنے اور زکوٰۃ دینے کی وصیت کی ہے۔ (واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیًّا)۔

❁ ❁ ❁

اور اس کے علاوہ مجھے اپنی والدہ کے بارے میں نیکوکار، قدردانی کرنے والا اور خیر خواہ قرار دیا ہے (و برًّا بوالدتی)[1]

اور اس نے مجھے جبار و شقی قرار نہیں دیا ہے (ولم یجعلنی جبارًا شقیًّا)۔

"جبار" اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے لیے تو لوگوں پر ہر قسم کے حقوق کا قائل ہو۔ لیکن کسی دوسرے کے لیے اپنے اُوپر کسی بھی حق کا قائل نہ ہو۔ اس کے علاوہ "جبار" اُس شخص کو بھی کہتے ہیں کہ جو غیض و غضب کے عالم میں لوگوں کو مارتا اور نابود کرتا ہو۔ اور فرمانِ عقل کی پیروی نہ کرتا ہو زیادہ یہ چاہتا ہو کہ اپنی کمی اور نقص کو تکبر اور بڑائی کے دعوے کے ذریعے پورا کرے۔ یہ ساری کی ساری صفات ایسی ہیں جو ہر زمانے کے طاغوتوں اور متکبرین سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں[2]

"شقی" اُس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو مصیبت و بلا اور سزا کے اسباب اپنے لیے فراہم کرتا ہے اور بعض نے کہا ہے اس سے مراد ایسا شخص ہے جو نصیحت قبول نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں معانی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عیسٰیؑ فرماتے ہیں:

میرا دل نرم ہے اور میں اپنے آپ کو اپنے نزدیک چھوٹا سمجھتا ہوں[3]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں صفات جبار و شقی کا نقطہ مقابل ہیں۔

❁ ❁ ❁

آخر میں یہ نومولود کہتا ہے: "خدا کا مجھ پر سلام و درود ہر اس دن کہ جب میں پیدا ہوا اور اُس دن کہ جب میں مروں گا اور اُس دن کہ جب میں زندہ کرکے اٹھایا جاؤں گا" (والسلام علی یوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیًّا)۔

جیسا کہ ہم نے حضرت یحیٰیؑ سے مربوط آیات کی شرح میں بیان کیا ہے، یہ تین دن انسان کی زندگی میں — زندگی ساز اور خطرناک دن ہیں کہ جن میں سوائے لطفِ خدا کے سلامتی میسر نہیں ہوتی۔ اسی لیے حضرت یحیٰیؑ کے بارے میں بھی یہ جملہ آیا ہے اور حضرت عیسٰی مسیحؑ کے بارے میں بھی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے موقع پر خداوندتعالیٰ نے یہ بات کہی ہے اور دوسرے موقع پر حضرت مسیحؑ نے یہ تقاضا کیا ہے۔

چند اہم نکات:

۱۔ **قرآن کا حُسنِ بیان اور ولادتِ عیسٰیؑ:** قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اس قسم کے اہم مسائل میں خصوصیت کے ساتھ دیکھی

---

[1] "برّ" (باء پر زبر کے ساتھ) نیکوکار شخص کے معنی میں ہے جبکہ "برّ" (باء کی زیر کے ساتھ) نیکوکاری کی صفت کے معنی میں ہے۔ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ یہ لفظ اُوپر والی آیت میں مبارکًا پر عطف ہے نہ کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ پر اور فی الواقع معنی اس طرح ہے "جعلنی برًّا بوالدتی" (مجھے اپنی والدہ کے لیے نیکوکار قرار دیا ہے)۔

[2] جبار کے بارے میں مزید وضاحت اور اس سوال کے جواب کے لیے کہ کس طرح خدا کی ایک صفت جبار ہے۔ تفسیر نمونہ کی جلد ۵ صفحہ ۲۹۴ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

[3] تفسیر فخرالدین رازی ذیل آیہ زیر بحث۔

جا سکتی ہے۔ دیکھیے کس طرح قرآن اس قدر خرافات سے مخلوط اہم مسئلے کو مختصر، گہری، زندہ، پُرمعنی، منہ بولتی اور ناطق عبارتوں کے ساتھ پیش کرتا ہے اس طرح سے کہ ہر قسم کی خرافات اور بیہودہ باتوں کو اس سے علیحدہ اور دُور کر دیتا ہے۔

جاذبِ نظر بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں سات نمایاں صفات، دو اعمال اور ایک دعا کا ذکر ہوا ہے۔

سات صفات کی تفصیل یہ ہے:

پہلی صفت : خدا کا بندہ ہونا کہ جس کا ذکر تمام اوصاف کی ابتداء میں ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کا عظیم ترین مقام مقامِ عبودیت ہی ہے۔

دُوسری صفت : اُس کے بعد کتاب آسمانی کا حامل ہونا ہے۔

تیسری صفت : مقامِ نبوت ہے۔ (البتہ ہم جانتے ہیں کہ مقامِ نبوت کے لیے یہ بات لازم نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ آسمانی کتاب کا حامل ہو)۔

چوتھی صفت : مقامِ عبودیت و رہبری کے بعد مبارک ہونے کا بیان ہے یعنی معاشرے کی حالت کے لیے مفید ہونے کو پیش کیا گیا ہے ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ مبارک کا معنی نفاع ہے (یعنی زیادہ نفع مند ہونا)۔

پانچویں صفت : ماں کے لیے نیکوکاری بیان کی گئی ہے۔

چھٹی اور ساتویں صفت : جبار و شقی نہ ہونا اور ان کے بجائے متواضع، حق شناس اور سعادت مند ہونا ہے۔

تمام کاموں میں سے صرف دو یعنی پروردگارِ عالم کی طرف سے نماز و زکوٰۃ کی وصیت کے بیان پر انحصار کرتے ہیں اور یہ ان دونوں پروگراموں اور کاموں کی انتہائی اہمیت کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ دونوں کام خالق و مخلوق کے ساتھ ارتباط کی رمز ہیں۔ ایک لحاظ سے تمام مذہبی پروگراموں کو انہیں دو میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض انسان کا رشتہ مخلوق سے اور بعض خالق سے جوڑتے ہیں۔

اَب رہ گئی وہ دعا کہ جو وہ اپنے لیے کرتے ہیں اور وہ التجا جو وہ اپنی زندگی کے آغاز میں خدا سے کرتے ہیں یہ ہے: بارِ خدایا! ان تین دنوں کو میرے لیے سلامتی والا قرار دے اوّل ولادت کا دن، دوسرے موت کا دن اور تیسرے وہ دن جبکہ قیامت میں مجھے زندہ ہونا ہے اور مجھے ان تینوں حساس مرحلوں میں امن و امان مرحمت فرما۔

۲۔ ماں کا مقام : اگرچہ حضرت عیسٰیؑ پروردگارِ عالم کے نافذ کردہ فرمان سے ماں سے، بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ لیکن یہ بات کہ مذکورہ بالا آیت میں وہ اپنے افتخارات کو گنتے ہوئے ماں کے لیے نیکوکاری کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بات ماں کے مقام اور رُتبہ کی اہمیت پر ایک روشن دلیل ہے۔ ضمنی طور پر یہ اس بات کی بھی نشاندہی ہے کہ یہ نومولود بچہ ایک معجزہ کے مطابق بول اُٹھا ہے۔ اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ وہ انسانوں کے لیے ایک نمونہ ہے کہ جو صرف ماں سے پیدا ہوا ہے اور اس میں باپ کا دخل نہیں ہے۔

بہرحال اگرچہ آج کی دنیا میں ماں کے مقام و مرتبہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ (سال میں) ایک دن کو روزِ مادر (ماں کا دن) کے نام سے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مشینی تمدن کی وضع کچھ ایسی ہے کہ یہ ماں باپ کا اولاد سے ربط بہت ہی جلدی منقطع کر دیتا ہے۔ اس طرح سے کہ بڑا ہونے کے بعد اولاد میں یہ رابطہ احساس بہت ہی کم باقی رہتا ہے۔

اس سلسلے میں اسلام میں حیرت انگیز روایات ہیں جو مسلمانوں کو ماں کے مقام و مرتبہ کی اہمیت کے بارے میں بہت زیادہ وصیت کرتی ہیں۔

تاکہ صرف زبانی طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی وہ اس سلسلے میں کوشش کریں۔

ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ :

یارسول اللّٰه من ابر؟ قال امك قال ثم من؟ قال امك، قال ثم من قال امك،
قال ثم من قال اباك ۔

اے پیغمبر خداؐ! میں کس کے ساتھ نیکی کروں۔ آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں سے۔ عرض کیا اس کے بعد کس سے؟ پھر فرمایا اپنی ماں سے۔ تیسری مرتبہ اس نے پھر عرض کیا اس کے بعد کس سے؟ فرمایا اپنی ماں سے۔ چوتھی مرتبہ جب اس نے اس سوال کو دہرایا تو آپؐ نے فرمایا : اپنے باپ سے۔[1]

ایک اور حدیث میں یہ منقول ہے کہ ایک نوجوان جہاد میں شرکت کے لیے پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا (چونکہ جہاد واجب عینی نہیں تھا اس لیے) رسول اللّٰہؐ نے فرمایا :

الك والدة قال نعم قال فالزمها فان الجنة تحت قدمها

کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے عرض کیا : جی ہاں۔ فرمایا : ماں کی خدمت میں رہو کیونکہ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔[2]

اس میں شک نہیں کہ اگر ہم اُن بے شمار زحمتوں کو، جو ماں حمل کے زمانے میں، وضع حمل تک، پھر دودھ پلانے کے زمانے میں اور دیکھ بھال کرنے میں اس کے بڑے ہونے تک، برداشت کرتی ہے اور طرح طرح کے رنج اور دکھ میں راتوں کو جاگنے اور اس کی بیماریوں میں فرزند کے لیے کھلی آغوش کے ساتھ لگی رہنے کو، دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ انسان اس راہ میں جس قدر بھی کوشش کرے پھر بھی وہ ماں کے حقوق کے بارے میں قرضدار ہے۔

جاذبِ نظریات یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ جناب اُم سلمہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا :

تمام افتخارات تو مردوں کے حصے میں آگئے، بیچاری عورتوں کا ان اعزازات میں کیا حصہ ہے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

بلى اذا حملت المرئة كانت بمنزلة الصائم القائم المجاهد بنفسه وماله في سبيل الله فاذا وضعت كان لها من الاجر ما لا يدرى احد ما هو لعظمته، فاذا ارضعت كان لها بكل مصة كعدل عتق محرر من ولد اسمعيل۔ فاذا فرغت من رضاعه ضرب ملك كريم على جنبها وقال استأنفي العمل فقد غفر لك :

ہاں (عورتیں بھی بہت سے اعزاز رکھتی ہیں) جس وقت عورت حاملہ ہوتی ہے تو وہ تمام مدت حمل

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۱۵، ص ۲۰۷۔
[2] جامع السعادات، جلد ۲، ص ۲۶۱۔

میں روزہ دار، شب زندہ دار اور جان و مال کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کی منزلت میں ہوتی ہے اور جس وقت اس کا وضع حمل ہوتا ہے، اللہ اسے اس قدر اجر دیتا ہے کہ کوئی شخص عظمت کی بنا پر اس کی حد کو نہیں جانتا اور جس وقت وہ اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے تو خداوند تعالیٰ بچے کی طرف سے ہر چوسنے کے مقابلے میں اولادِ اسمٰعیل میں سے ایک غلام آزاد کرنے کا اجر اُسے عطا کرتا ہے، اور جس وقت بچے کے دودھ پلانے کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے خدا کے مکرم فرشتوں میں سے ایک اس کے پہلو پر ہاتھ مارتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے اعمال کو نئے سر سے شروع کر کیونکہ خداوند تعالیٰ نے تیرے سب گناہ بخش دیئے ہیں۔ (گویا تیرا نامۂ عمل نئے سرے سے شروع ہو رہا ہے)[1]

تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۲۳ کے ذیل میں بھی ہم نے اس سلسلے کی کچھ بحثیں کی ہیں۔

۳۔ **باکرہ سے بچہ پیدا ہونا:** مذکورہ بالا آیات سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علمی لحاظ سے یہ بات ممکن ہے کہ باپ کے بغیر بچہ پیدا ہو۔ کیا حضرت عیسیٰؑ کا صرف اکیلی ماں سے پیدا ہونے کا مسئلہ، اس بارے میں سائنس دانوں کی تحقیقات کے مخالف نہیں ہے؟

اس میں شک نہیں کہ یہ کام معجزانہ طور پر ظہور پذیر ہوا تھا، لیکن موجودہ زمانے کا علم اور تحقیق اس قسم کے امر کے امکان کی نفی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے ممکن ہونے کی تصریح کرتا ہے۔

خاص طور پر نر کے بغیر بچہ پیدا ہونا بہت سے جانوروں میں دیکھا گیا ہے اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ نطفے کے انعقاد کا مسئلہ صرف انسانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اس امر کے امکان کو عمومی حیثیت سے ثابت کرتا ہے۔

"ڈاکٹر الکیسس کارل" مشہور فرانسیسی فزیالوجسٹ اور حیات شناس اپنی کتاب "انسان موجودِ ناشناختہ" میں لکھتا ہے:

جس وقت ہم اس بارے میں غور کرتے ہیں کہ تولید مثل میں ماں اور باپ کا کتنا کتنا حصہ ہے تو ہمیں "لوب" اور "باٹاایون" کے تجربوں کو بھی نظر میں رکھنا چاہیئے کہ قورباغہ کے بارور نہ ہوتے ہوئے چھوٹے سے تخم کو سپرماٹوزا کے دخل کے بغیر ہی خاص تکنیک کے ذریعہ ایک جدید قورباغہ کو وجود میں لایا جا سکتا ہے۔

اس ترتیب سے کہ ممکن ہے کہ کیمسٹری یا فزکس کے ایک عامل کو "نر سیل" کا جانشین بنا دیا جائے لیکن ہر حالت میں ہمیشہ ایک عامل مادہ کا وجود ضروری ہے۔

اس بناء پر وہ چیز کہ جو سائنسی لحاظ سے بچے کے تولد میں قطعیت رکھتی ہے وہ ماں کے نطفہ (اوول) کا وجود ہے۔ ورنہ نر کے نطفہ (اسپرماٹوزا) کی جگہ پر دوسرا عامل اس کا جانشین بنایا جا سکتا ہے۔ اسی بناء پر نر کے بغیر بچے کی پیدائش کا مسئلہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو آج کی دنیا میں ڈاکٹروں کے نزدیک قابل قبول قرار پا چکی ہے، اگرچہ ایسا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ مسئلہ خداوند تعالیٰ کے قوانین آفرینش کے سامنے ایسا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۱۸۵۔

ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون ۔

عیسٰیؑ کی مثال خدا کے نزدیک آدمؑ جیسی ہے کہ اُسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس کو حکم دیا کہ ہو جا تو وہ بھی ایک کامل موجود ہو گیا۔ (آل عمران - ۵۹)

یعنی یہ خارق عادت اُس خارق عادت سے زیادہ اہم نہیں ہے۔

۴۔ **نوزائیدہ بچہ کس طرح بات کر سکتا ہے؟** یہ بات کچھ کہے بغیر ظاہر ہے کہ معمول یہ ہے کہ کوئی نوزائیدہ بچہ تولد کے ابتدائی گھنٹوں یا دنوں میں بات نہیں کرتا۔ کیونکہ بات کرنا دماغ کی کافی نشو و نما اور اس کے بعد زبان و حنجرہ کے عضلات کا بڑھنا اور انسانی بدن کے مختلف اعضا کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کا محتاج ہے۔ اور ان امور کے لیے حسب معمول کئی مہینے گزرنے چاہئیں تاکہ یہ بتدریج اور آہستہ آہستہ بچوں میں فراہم ہوں۔

لیکن پھر بھی کوئی علمی دلیل اس امر کے محال ہونے پر ہمارے پاس نہیں ہے۔ صرف یہ ایک غیر معمولی کام ہے اور تمام معجزات اسی قسم کے ہوتے ہیں یعنی سب ہی غیر معمولی کام ہوتے ہیں نہ کہ محال عقلی، اس امر کی تشریح ہم نے انبیاءؑ کے معجزات کی بحث میں کر دی ہے۔

۳۴۔ ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ۝

۳۵۔ مَا كَانَ لِلّٰهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحَانَهُ إِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝

ترجمہ

۳۴۔ یہ ہے عیسٰی ابن مریم، وہ حق بات کہ جس میں وہ شک کرتے ہیں۔

۳۵۔ خداوند تعالیٰ کے لیے ہرگز یہ بات لائق نہیں ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ وہ منزہ ہے، جس وقت وہ کسی کام (کے کرنے) کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے ہو جا۔ پس وہ ہو جاتا ہے۔

تفسیر

کیا خدا کا بیٹا ممکن ہے؟

قرآن مجید سابقہ آیات میں عیسٰیؑ کی پیدائش کے واقعہ کی بہت ہی عمدہ اور روشن و واضح تصویر کشی کرنے کے بعد اُن شرک آمیز باتوں

اور خرافات کی نفی کرتے ہوئے جو اُن لوگوں نے عیسٰیؑ کے بارے میں کہی ہیں اس طرح کہتا ہے: "یہ عیسٰیؑ ابن مریم" (ذالك عیسی ابن مريم)۔ اس عبارت میں ان کے مریم کا بیٹا ہونے پر خصوصیت کے ساتھ تاکید کرتا ہے۔ تاکہ یہی بات خدا کا بیٹا ہونے کی نفی کی تمہید اور مقدمہ بن جائے۔

اور اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ "یہ وہ قولِ حق ہے کہ جس میں انہوں نے شک و شبہ کا اظہار کیا ہے اور ہر ایک نے انحراف کی راہ اختیار کرلی ہے" (قول الحق الذی فیه یمترون)۔[1]

یہ عبارت درحقیقت حضرت عیسٰیؑ کے بارے میں تمام گزشتہ مطالب کی صحت پر ایک تاکید ہے اور یہ کہ ان مطالب میں تھوڑی سی بھی غلطی نہیں ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ قرآن جو یہ کہتا ہے کہ: وہ اس بارے میں شک و شبہ میں ہیں، یہ حضرت مسیحؑ کے دوستوں اور دشمنوں یا دوسرے الفاظ میں عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک طرف سے ایک گمراہ گروہ نے ان کی والدہ کی پاکیزگی میں شک و شبہ کیا، اور دوسری طرف سے ایک گروہ نے ان کے ایک انسان ہونے میں اظہارِ شک کیا۔ یہاں تک کہ پھر یہی گروہ مختلف شعبوں اور قسموں میں تقسیم ہوگیا۔ بعض نے انہیں صراحت کے ساتھ خدا کا بیٹا سمجھ لیا (روحانی و جسمانی اعتبار سے حقیقی بیٹا، نہ کہ مجازی بیٹا) اور اس کے ساتھ تین خداؤں اور تثلیث کا مسئلہ اُٹھا۔ بعض نے مسئلہ تثلیث کو عقلی طور پر ناقابلِ فہم کہہ کر یہ اعتقاد رکھ لیا کہ اسے تعبداً قبول کر لیا جائے اور بعض نے اس کی منطقی توجیہ کے لیے بے بنیاد باتوں پر ہاتھ مارا۔ خلاصہ یہ کہ جب وہ حقیقت کو نہ پا سکے، یا جب انہوں نے حقیقت کو اختیار کرنا نہ چاہا۔ تو افسانے کی راہ پر چل نکلے۔[2]

⁂

اگلی آیت میں قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے: خدا کے لیے یہ امر ہرگز شائستہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو، وہ ایسی باتوں سے پاک اور منزہ ہے۔ (ما کان لله ان یتخذ من ولد سبحانه)۔

بلکہ وہ تو جس وقت بھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اور اسے حکم دیتا ہے تو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ (اذا قضی امرا فانما یقول له کن فیکون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صاحبِ فرزند ہونا — جیسا کہ عیسائی خدا کے بارے میں خیال کرتے ہیں — پروردگارِ عالم کے مقامِ مقدس سے مطابقت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک طرف تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ اس کا جسم ہو، دوسری طرف سے محدودیت اور تیسری طرف سے احتیاج، خلاصہ یہ ہے کہ ان کے عقیدے کا نتیجہ خداوند تعالیٰ کو اس کے مقامِ مقدس سے کھینچ کر عالمِ مادہ کے قوانین کے ماتحت لانا اور اُسے ایک

---

[1] اس جملے کی ترکیب میں مفسرین نے بہت اختلاف کیا ہے، لیکن ادبی لحاظ سے اور گزشتہ آیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو بات زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ "قول الحق" مفعول ہے فعل محذوف کا اور "الذی فیه یمترون" اس کی صفت ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:
"اقول قول الحق الذی فیه یمترون" — میں حق کی بات کہتا ہوں جس میں وہ شک کرتے ہیں۔

[2] نصاریٰ کی تثلیث اور اس بارے میں جو خرافات انہوں نے گھڑے ہیں ان کی مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۲ سورہ نساء کی آیہ ۱۷۱۔ صفحہ ۶۵۲ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

ـــــ ضعیف و محدود مادّی وجود کے زمرہ میں قرار دینا ہے۔

وہ خدا کو جو اس قدر قدرت و توانائی رکھتا ہے کہ اگر وہ ارادہ کرے تو اس وسیع و عریض عالم کہ جس میں ہم رہ رہے ہیں کی مانند ہزارہا عالم محض اس کے ایک فرمان اور صرف اشارہ سے عالم ظہور میں آجائیں۔ کیا یہ بات شرک نہیں ہے اور اصول توحید و خدا شناسی سے انحراف نہیں ہے کہ ہم اُسے ایک انسان کی طرح صاحب فرزند سمجھ لیں اور وہ بیٹا بھی ایسا بیٹا کہ جو باپ کا ہم مرتبہ اور ہم پلہ ہو۔

"کُن فیکون" کی تعبیر جو قرآن مجید کی آیات میں آٹھ مواقع پر آئی ہے، امر خلقت میں خداوند تعالیٰ کی قدرت کی وسعت اور اس کے تسلّط و حاکمیت کی بہت ہی عمدہ تصویر ہے۔ فرمان "کن" کی تعبیر سے زیادہ مختصر کا تصور نہیں ہوسکتا اور کوئی نتیجہ "فیکون" سے زیادہ جامع نظر نہیں آتا۔ خصوصاً "فاء تفریع" کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو اس مقام پر فوری عمل درآمد کو ظاہر کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس مقام پر فاء تفریع فلاسفہ کی تعبیر کے مطابق تاخر زمانی پر بھی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ اسی تاخر رتبی کو بیان کرتی ہے جو معلول کے علت پر ترتب میں پائی جاتی ہے (غور کیجیے گا)[1]

فرزند کی نفی یعنی خدا سے ہر قسم کے احتیاج کی نفی:

اصولی طور پر زندہ موجودات کو اولاد و فرزند کی احتیاج کس لیے ہوتی ہے؟ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اور وجہ ہوسکتی ہے کہ ان کی عمر محدود ہوتی ہے اور اس غرض سے کہ ان کی نسل منقطع نہ ہو اور ان کی حیات نوعی جاری و ساری رہے لہٰذا ضرورت ہے اس بات کی کہ ان سے اولاد پیدا ہو۔

اجتماعی نقطۂ نظر سے، ایسے کام جن میں انسانی قوت کے اکٹھا مل کر سرانجام دینے کی ضرورت ہوتی ہے، اس بات کا زیادہ سبب بنتی ہے کہ انسان کا تعلق فرزند کے ساتھ قائم رہے۔

اس کے علاوہ جذباتی و نفسیاتی ضرورتیں اور تنہائی کی وحشت کو دُور کرنے کی احتیاج اسے اس کام کی دعوت دیتی ہے۔

لیکن اُس خدا کے بارے میں کہ جو ازلی و ابدی ہے، جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے اور نہ جذباتی و نفسیاتی احتیاج کا مسئلہ اس کی پاک ذات کے لیے کوئی مفہوم رکھتا ہے، کیا یہ امور تصور کیے جاسکتے ہیں؟

اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ لوگ جو خدا کے لیے فرزند کے قائل ہیں، اُنھوں نے اُس کا اپنے اُوپر قیاس کرلیا ہے اور اُنھوں نے اُس میں بھی وہی باتیں سمجھ لی ہیں کہ جن باتوں کو وہ اپنے اندر سمجھتے ہیں حالانکہ ہماری کوئی بھی چیز خدا کی مانند نہیں ہے (لیس کمثلہ شیء)

پہلی ہجرت کے بارے میں ایک اہم تاریخی نکتہ:

پہلی ہجرت جو اسلام میں واقع ہوئی وہ مسلمانوں کے ایک اچھے خاصے گروہ کی حبشہ کی طرف ہجرت تھی۔ یہ گروہ چند مردوں اور چند عورتوں پر مشتمل تھا۔ اُنھوں نے مشرکین قریش کے چنگل سے رہائی پانے اور اسلام کے آئندہ کے پروگراموں پر عمل درآمد اور زیادہ سے زیادہ تیاری کرنے کے لیے

[1] "کُن فیکون" کے معنی کے بارے میں اور خدا سے نفی فرزند کے دلائل سے متعلق ہم جلد اول سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۶ اور ۱۱۷ کے ذیل میں بھی بحث کرچکے ہیں۔

حبشہ کے قصد سے مکہ کو چھوڑ دیا، اور جیسا کہ ان کا اندازہ تھا، وہاں پر انہیں یہ موقع مل گیا کہ امن و سکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں اور اسلامی پروگراموں اور خود سازی کے کاموں میں مشغول ہوسکیں۔

یہ خبر مکہ میں قریش کے سرداروں تک بھی پہنچ گئی۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اپنے لیے خطرے کا الارم سمجھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ حبشہ مسلمانوں کے لیے ایک پناہ گاہ بن جائے گا اور شاید وہ قوت و طاقت حاصل کرنے کے بعد مکہ کی طرف پلٹ آئیں، اور ان کے لیے بڑی مشکلات پیدا کردیں۔

صلاح و مشورہ کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فعال مردوں میں سے دو افراد کو منتخب کرکے نجاشی کے پاس بھیجیں تاکہ وہ وہاں پر مسلمانوں کے وجود کے خطرات کے بارے میں نجاشی کو تفصیل سے آگاہ کریں۔ اور انہیں اس اطمینان و سکون کی سرزمین سے باہر نکال دیں۔

قریش نے **عمرو بن عاص** اور **عبداللہ ابن ابی ربیعہ** کو نجاشی اور اس کے لشکر کے بڑے بڑے افسروں تک کے لیے بہت سے ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ روانہ کیا۔

اُم سلمہ زوجۂ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتی ہیں کہ ہم جب سرزمین حبشہ میں پہنچے تو ہم نے نجاشی کا حسن سلوک دیکھا۔ ہمیں کسی قسم کی مذہبی پابندی نہیں تھی، کوئی ہمیں تکلیف نہیں پہنچاتا تھا، لیکن قریش نے اس مسئلہ سے آگاہ ہونے کے بعد دو آدمیوں کو بہت سے ہدایا و تحائف کے ساتھ بھیج کر انہیں یہ حکم دیا تھا کہ خود نجاشی سے ملاقات کرنے سے پہلے اس کے بڑے بڑے منصب داروں سے ملاقات کرنا اور ان کے ہدیے اور تحائف انہیں پیش کرنا، اس کے بعد نجاشی کے ہدایا اور تحائف کو اُس کی خدمت میں پیش کرنا اور اُس سے یہ تقاضا کرنا کہ مسلمانوں کو اُن سے کوئی بات کیے بغیر ان کے سپرد کردیں۔

انہوں نے اس پروگرام پر پورا پورا عمل کیا۔ پہلے نجاشی کے منصب داروں سے مل کر انہیں یہ بتایا کہ: چند بے وقوف جوانوں کے ایک گروہ نے تمہاری سرزمین میں پناہ لے لی ہے، انہوں نے اپنا دین و آئین ترک کردیا ہے اور تمہارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ انہوں نے ایک نئے دین کو بدعت کے طور پر جاری کیا ہے، جو ہمارے اور تمہارے لیے غیر معروف ہے۔

اشراف قریش نے ہمیں تمہارے پاس بھیجا ہے تاکہ ہم ان کے شر کو اس ملک سے کم کردیں اور انہیں ان کی قوم کی طرف واپس لوٹا دیں۔ انہوں نے منصب داروں سے یہ وعدہ لے لیا کہ جس وقت نجاشی اُن سے مشورہ کرے تو وہ اس نظریے کی تائید کریں گے اور اُس سے یہ کہیں گے کہ ان کی قوم ان کے حالات سے زیادہ بہتر طور پر آگاہ ہے۔

اس کے بعد انہوں نے نجاشی کے دربار میں باریابی حاصل کی اور وہی پُر فریب باتیں اُس سے بھی کہیں۔

ان کا یہ پروگرام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور ان کی یہ پُر فریب باتیں اُن بکثرت ہدایا و تحائف کے ساتھ سبب بنیں کہ نجاشی کے مصاحبین نے بھی ان کی تائید و تصدیق کردی۔

اچانک ورق اُلٹا اور نجاشی سخت غضب ناک ہوا اور کہنے لگا خدا کی قسم میں ایسا کام نہیں کروں گا۔ یہ ایک ایسا گروہ ہے کہ جنہوں نے میری پناہ لی ہے، اور انہوں نے میرے ملک کو اس کے امن و امان کی وجہ سے دوسرے ملکوں پر ترجیح دی ہے۔ جب تک میں انہیں دعوت نہ دے لوں اور تحقیق نہ کرلوں میں تمہاری اس تجویز پر عمل نہیں کروں گا۔

اگر واقعاً معاملہ اسی طرح ہوا کہ جیسے یہ کہتے ہیں تو پھر میں انہیں ان دو افراد کے حوالے کردوں گا اور انہیں اپنے ملک سے نکال دوں گا

ورنہ میری پناہ و محبت میں خیر و خوبی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

جناب اُم سلمہ فرماتی ہیں کہ نجاشی نے کسی کو مسلمانوں کے پاس بھیجا۔ اُنہوں نے باہم مشورہ کیا کہ نجاشی سے کیا کہیں، اُن سب کی رائے یہ ٹھہری کہ وہ صحیح صحیح حقیقت بیان کر دیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام اور اسلام کے پروگرام کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیں، پھر جو کچھ ہوتا ہے ہوتا رہے۔

وہ دن کہ جو اس دعوت کے لیے مقرر کیا گیا تھا، ایک عجیب و غریب دن تھا۔ عیسائی بزرگ اور مسیحی علما بھی جو اپنے ہاتھوں میں مقدس کتابیں لیے ہوئے تھے اس مجلس میں مدعو کیے گئے تھے۔

نجاشی نے مسلمانوں کی طرف رُخ کیا اور اُن سے پوچھا، یہ کونسا دین ہے کہ تم اپنی قوم سے بھی الگ ہو گئے ہو اور ہمارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہو؟

جناب جعفر بن ابی طالب نے سلسلۂ کلام شروع کیا اور کہا: اے بادشاہ! ہم ایک ایسا گروہ تھے جو جہالت اور بے خبری میں زندگی بسر کر رہے تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کا گوشت کھاتے تھے اور بُرے اور سنگین کام انجام دیتے تھے۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بدی کرتے تھے، ہمسایوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے، طاقتور کمزوروں کو کھا جاتے تھے، خلاصہ یہ کہ ہماری بدبختی بہت زیادہ تھی۔ یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ نے ہم ہی میں سے ایک پیغمبر کو مبعوث فرمایا کہ جس کے نسب کو ہم اچھی طرح سے پہچانتے تھے، اور اس کی صداقت، امانت اور پاکیزگی پر ہم ایمان رکھتے تھے، اُس نے ہمیں خدائے یگانہ کی طرف دعوت دی اور ہمیں حکم دیا کہ ہم پتھر اور لکڑی کی پرستش کو جنہیں ہمارے بڑے پُوجا کرتے تھے چھوڑ دیں۔

اُس نے ہمیں سچ بولنے، ادائے امانت، صلۂ رحمی، ہمسایوں سے نیکی کرنے کی ہدایت کی اور محرمات، خونریزی، بُرے اور شرمناک اعمال، جھوٹی گواہی، یتیم کا مال کھانے اور پاکدامن عورتوں کو تہمت لگانے سے منع کیا۔

اس نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ ہم خدائے یگانہ کی پرستش کریں، کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں، نماز اور روزہ بجا لائیں اور زکوٰۃ ادا کریں ... ...

ہم اُس پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم نے اس کے احکام پر ہو بہو عمل کیا ہے، لیکن ہماری قوم نے ہم پر ظلم اور زیادتی شروع کر دی، ہمیں تکلیفیں اور رنج پہنچائے اور اصرار کیا کہ ہم توحید کا عقیدہ چھوڑ کر شرک کی طرف پلٹ جائیں اور اپنی اسی سابقہ گناہ آلود زندگی میں مشغول ہو جائیں۔

جب انہوں نے ہمیں ہر طرح سے تنگ کیا اور ستایا تو ہم آپ کے ملک کی طرف آ گئے اور ہم نے اس بات کو پسند کیا کہ ہم آپ کے ہمسائے بن جائیں، اس اُمید کے ساتھ کہ کوئی شخص یہاں ہم پر ظلم و ستم نہیں کرے گا۔

نجاشی سخت فکر میں پڑ گیا۔ جعفر کی طرف رُخ کیا اور کہا: کیا اس شخص کی آسمانی کتاب کی کوئی چیز تجھے یاد ہے؟

جناب جعفر نے کہا: ہاں!

نجاشی نے کہا: مجھے سناؤ۔

جناب جعفر نے جو عقل و دانش اور دولتِ ایمان سے مالا مال تھے، قرآن مجید کے مناسب ترین حصّہ کو جو کہ سورہ مریم کی ہی ابتدائی آیات تھیں منتخب کیا۔ اور نجاشی اور تمام حاضرین کے لیے، کہ جو سب کے سب دینِ مسیح کے پیرو تھے، تلاوت کیا۔

کھیعص۔ ذکر رحمۃ ربک عبدہ زکریا۔۔ ۔۔ واذکر فی الکتاب
مریم اذ انتبذت من اھلھا مکانا شرقیا۔۔۔ ۔۔ ۔۔

جس وقت جناب جعفرؓ نے ان آیات کی بہترین لحن اور پاک دل کے ساتھ قرات کی تو اس کا نجاشی اور بزرگ مسیحی علماء کی رُوح پر اتنا اثر ہوا کہ ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں اور ان کے رخساروں پر گرنے لگیں۔

نجاشی نے ان کی طرف رُخ کیا اور کہا: خدا کی قسم! جو کچھ عیسٰی مسیحؑ لے کر آئے تھے وہ اور یہ آیات ان سب کا ایک ہی سرچشمہ اور ایک ہی منبع نُور ہے۔ جاؤ اور راحت اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کرو، خدا کی قسم میں ہرگز آپ لوگوں کو ان دو افراد کے حوالے نہ کروں گا۔

اس کے بعد قریش کے قاصدوں نے نجاشی کو مسلمانوں کی طرف سے بدگمان کرنے کے لیے اور تدبیریں بھی کیں لیکن وہ اس کی بیدار رُوح پر اثرانداز نہ ہوسکیں قودہ مایوس اور ناامید ہوکر وہاں سے پلٹ آئے، ان کے ہدیے انہیں واپس کر دیئے اور اُن سے معذرت چاہی[1]۔

۳۶۔ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

۳۷۔ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

۳۸۔ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

۳۹۔ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

۴۰۔ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۶۔ اور اللہ میرا اور تمہارا پروردگار ہے اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔

۳۷۔ لیکن (اس کے بعد) اس کے پیروکاروں میں سے کئی گروہوں نے اختلاف کیا، کافروں پر وائے ہے، ان کے اس حال پر کہ جب وہ (قیامت کے) عظیم دن کا مشاہدہ کریں گے۔

[1] اقتباس از سیرت ابن ہشام، جلد اوّل، ص ۳۵۶ - ۳۶۱۔

۳۸ ۔ اس روز ان کے کیسے سننے والے کان اور کیسی دیکھنے والی آنکھیں ہوں گی جبکہ وہ ہمارے پاس آئیں گے، لیکن آج یہ ستمگر کھلی گمراہی میں ہیں۔

۳۹ ۔ (قیامت کا دن کہ جو سب کے لیے مایۂ تاسف ہے) انہیں اس یوم حسرت سے ڈرا، وہ دن کہ جس میں ہر چیز ختم ہوجائے گی۔ حالانکہ وہ غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے۔

۴۰ ۔ ہم زمین کے بھی اور اس پر موجود تمام لوگوں کے بھی وارث ہو جائیں گے۔ اور سب کے سب ہماری طرف ہی لوٹ کر آئیں گے۔

تفسیر

قیامت، حسرت کا دن :

مذکورہ صفات کے ساتھ اپنا تعارف کرانے کے بعد حضرت عیسٰیؑ نے مسئلہ توحید پر خاص طور پر عبادت کے سلسلے میں تاکید کی اور کہا : خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے، پس تم اسی کی عبادت و پرستش کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔ (وان الله ربی وربکم فاعبدوہ هٰذا صراط مستقیم)[1]

اس طرح حضرت عیسٰیؑ نے اپنی زندگی کی ابتدا سے ہی ہر قسم کے شرک اور دو یا دو سے زیادہ خداؤں کی عبادت و پرستش سے مبارزہ کیا اور ہر جگہ توحید پر تاکید کی۔ اس بناء پر تثلیث کے عنوان سے عیسائیوں کے درمیان آج جو کچھ نظر آتا ہے یہ قطعی طور پر حضرت عیسٰیؑ کے بعد پیدا ہونے والی بدعت ہے۔ ہم اس کی تفصیل سورہ نساء کی آیت ۱۷۱ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں[2]

اگرچہ بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے بیان ہوا ہو اس معنی میں کہ خدا انہیں اس آیت میں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو توحید فی العبادۃ کی دعوت دو اور اس کا صراطِ مستقیم کے عنوان سے تعارف کراؤ۔

لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ جملہ حضرت عیسٰیؑ کی گفتگو اور ان کی گزشتہ باتوں کا آخری حصہ ہے۔ سورہ زخرف کی آیہ ۶۳ تا ۶۴ میں ہم پڑھتے ہیں :

> "ولما جاء عیسٰی بالبینات قال قد جئتکم بالحکمة ولابین لکم بعض الذی تختلفون فیه فاتقوا الله واطیعون ان الله هو ربی وربکم فاعبدوہ هٰذا صراط مستقیم"
>
> "اور جس وقت عیسٰی ان کے لیے واضح اور روشن دلائل لے کر آئے تو کہا کہ میں تمہارے لیے حکمت و دانش لے کر آیا ہوں، مَیں اس لیے آیا ہوں کہ جن باتوں میں تم اختلاف رکھتے ہو اُن میں سے بعض امور کی تمہارے لیے وضاحت کروں، پس تم خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو،

---

[1] جملہ بندی اور ترکیب کے لحاظ سے یہ جملہ حضرت عیسٰیؑ کی گزشتہ باتوں پر عطف ہے جو "قال انی عبد الله" سے شروع ہوتی ہیں اور اس جملہ پر ختم۔

[2] تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۴۵۳ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

خدا ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔

یہاں ہم تقریباً عین وہی جملہ دیکھ رہے ہیں کہ جو حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے نقل ہوا ہے۔ (اسی قسم کا مضمون سورہ آل عمران کی آیہ ۵۰ و ۵۱ میں بھی آیا ہے)۔

❖ ❖ ❖

لیکن اس تمام تاکید کے باوجود کہ جو حضرت عیسیٰؑ توحید اور خدائے یگانہ کی پرستش کے بارے میں کیا کرتے تھے "اُن کے بعد اُن کے پیروکاروں میں سے کئی گروہوں نے مختلف راستے اختیار کر لیے" (اور خاص طور پر عیسیٰؑ کے بارے میں بھی انہوں نے کئی قسم کے عقائد تراش لیے) (فاختلف الاحزاب من بینهم)۔ قیامت کے عظیم دن کے مشاہدے سے ان کی حالت پر کہ جنہوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کی وائے ہے۔ (فویل للذین کفروا من مشهد یوم عظیم)۔

مسیحیت کی تاریخ بھی اس بات کی اچھی طرح گواہی دیتی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے بارے میں اور مسئلہ توحید کے بارے میں کس حد تک اختلاف کیا۔ یہ اختلافات اس قدر بڑھ گئے کہ "قسطنطین" شہنشاہ روم نے "اسقفوں" (مسیحیت کے بڑے بڑے علماء) کا ایک اجتماع بلایا کہ جو ان کے تین مشہور تاریخی اجتماعات میں سے ایک تھا کہ جس کے ارکان کی تعداد دو ہزار ایک سو ستر تک جا پہنچی یہ سب کے سب اُن کے بزرگوں میں سے تھے۔ جب حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بحث شروع ہوئی تو موجود علماء نے اس کے بارے میں بالکل مختلف نظریات کا اظہار کیا اور ہر گروہ کا اپنا ایک الگ ہی عقیدہ تھا۔

اُن میں سے بعض نے کہا کہ وہ خدا ہے کہ جو زمین پر نازل ہوا ہے۔ ایک گروہ کو اُس نے زندہ کیا اور بہت سے لوگوں کو موت دے دی اس کے بعد آسمان کی طرف صعود کر گیا ہے۔

بعض دوسروں نے کہا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔

بعض نے کہا کہ وہ تین اقانیم (تین مقدس ذوات میں سے) ایک تھا، باپ، بیٹا اور روح القدس (باپ خدا۔ بیٹا خدا اور روح القدس)۔

بعض نے یہ کہا کہ وہ ان تین میں کا تیسرا ہے۔ خدا معبود ہے، وہ بھی معبود ہے اور اس کی ماں بھی معبود ہے۔

کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ وہ بندۂ خدا ہے اور اس کا بھیجا ہوا رسول ہے۔

دوسرے فرقوں نے بھی الگ الگ باتیں کیں۔ اس طرح سے کہ ان عقائد میں سے کسی پر بھی اتفاق نظر حاصل نہ ہوا۔ سب سے بڑی تعداد ایک عقیدے کے طرفداروں کی ۳۰۸ تھی کہ جس کو بادشاہ نے نسبتاً اکثریت کے عقیدہ کے عنوان سے قبول کر لیا اور اس کا قانونی و رسمی عقیدے کے عنوان سے دفاع کرنا شروع کر دیا اور باقی عقیدوں کو چھوڑ دیا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ توحید کا عقیدہ جس کے طرفداروں کی تعداد بہت ہی کم تھی اقلیت میں قرار پایا۔[1]

چونکہ اصل توحید سے انحراف، عیسائیوں کا سب سے بڑا انحراف شمار ہوتا ہے، مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں ہم نے دیکھا کہ خداوند تعالیٰ اُنہیں کس طرح سے تہدید کر رہا ہے، کہ وہ قیامت کے عظیم دن میں، سب لوگوں کی موجودگی میں اور پروردگار کی عدالت عادلہ کے سامنے بہت بُرے اور دردناک انجام سے دوچار ہوں گے۔[2]

---

[1] تفسیر فی ظلال، جلد ۵ صفحہ ۴۳۶۔

[2] "مشهد" اوپر والی آیت میں ممکن ہے کہ مصدر میمی "شہود" کے معنی میں ہو یا اسم مکان یا اسم زمان (محل یا زمانہ شہود) کے معنی میں ہو ہر چند ان کے معانی مختلف ہیں لیکن نتیجے کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

بعد والی آیت میدانِ قیامت میں ان کی حالت کو بیان کر رہی ہے۔ اور یہ کہتی ہے کہ "اُس دن جب وہ ہمارے پاس آئیں گے تو ان کے کیسے سننے والے کان اور کیسی دیکھنے والی آنکھیں ہو جائیں گی۔ لیکن یہ ظالم آج جبکہ دنیا میں ہیں تو کھلی گمراہی میں ہیں (اسمع بھم وابصر یوم یأتوننا لکن الظالمون الیوم فی ضلال مبین)۔

یہ بات واضح ہے کہ نشاۃ آخرت میں آنکھوں کے سامنے سے تمام پردے ہٹ جائیں گے، اور کانوں کی سننے کی صلاحیت بہت زیادہ ہو جائے گی کیونکہ وہاں حق کے آثار دنیا کی نسبت کئی گنا زیادہ واضح و آشکار ہوں گے۔ اصولی طور پر اس عدالت اور اعمال کے آثار کا مشاہدہ انسان کی آنکھوں اور کانوں سے غفلت کے پردے دُور کر دے گا۔ یہاں تک کہ دل کے اندھے بھی آگاہ اور دانا ہو جائیں گے، لیکن کیا فائدہ کیونکہ یہ بیداری اور آگاہی ان کی حالت کے لیے مفید نہ ہوگی۔

بعض مفسرین نے "لکن الظالمون الیوم فی ضلال مبین" کے جملہ میں لفظ "الیوم" قیامت کے دن کے معنی میں لیا ہے کہ جس سے آیت کا مفہوم یہ بن جاتا ہے: وہ وہاں بینا و شنوا ہو جائیں گے لیکن یہ بینائی اور شنوائی اس دن ان کی حالت کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگی اور وہ واضح گمراہی میں ہوں گے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔[1]

ایک مرتبہ پھر اس روز بے ایمان اور ستمگر لوگوں کے انجام کو نظر میں رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ان دل کے اندھوں کو، جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے روزِ حسرت (قیامت کے دن) سے کہ جس میں تمام چیزیں اختتام کو پہنچ جائیں گی اور تلافی اور بازگشت کے لیے کوئی راستہ نہیں ہوگا، ڈرا (وانذرھم یوم الحسرۃ اذ قضی الامر وھم فی غفلۃ وھم لا یؤمنون)۔

ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں قیامت کے دن کے کئی نام ہیں۔ ان میں سے ایک "یوم الحسرۃ" ہے کیونکہ اس دن نیکوکار بھی افسوس کریں گے کہ اے کاش ہم زیادہ سے زیادہ نیک اعمال بجا لائے ہوتے اور بدکار بھی افسوس کریں گے۔ کیونکہ نظروں کے سامنے سے تمام پردے ہٹ جائیں گے اور ہر شخص پر اعمال کے حقائق اور ان کے نتائج آشکار ہو جائیں گے۔

بعض مفسرین نے "اذ قضی الامر" کے جملے کو قیامت کے دن حساب و کتاب، جزا و سزا اور تکلیف و ذمہ داری کے پروگراموں کے اختتام پذیر ہونے سے مربوط سمجھا ہے اور بعض اسے دنیا کے فنا ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنی اس طرح ہوگا: انہیں حسرت کے دن سے ڈرا دو وہ وقت جب کہ دنیا ان کی غفلت اور ایمان نہ لانے کی حالت میں اختتام کو پہنچ جائے گی (لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، خاص طور پر جبکہ ایک روایت میں "اذ قضی الامر" کی تفسیر امام صادق علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوئی ہے:

ای قضی علی اھل الجنۃ بالخلود فیھا، وقضی علی اھل النار بالخلود فیھا

یعنی خداوند عالم اہل جنت کے لیے (جنت میں) اور اہل جہنم کے لیے (جہنم میں) ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا حکم صادر فرمائے گا۔[2]

---

[1] "الف و لام" "الیوم" میں "عہد" کا الف لام ہے لیکن پہلی تفسیر کے مطابق عہد حضوری اور دوسری تفسیر کے مطابق عہد ذکری ہے۔

[2] مجمع البیان آیۂ بالا کے ذیل میں۔

آخری زیر بحث آیت تمام ظالموں اور ستمگروں کو خبردار کر رہی ہے کہ یہ اموال جو ان کے قبضے میں ہیں، ہمیشہ ان کے پاس نہیں رہیں گے، جیسا کہ خود ان کی زندگی جاودانی اور ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے بلکہ ان سب کا اصلی مالک خدا ہے لہٰذا فرماتا ہے: ہم زمین کے بھی اور تمام ان لوگوں کے بھی جو اس پر رہتے ہیں وارث ہو جائیں گے۔ اور آخر کار وہ سب کے سب ہماری طرف پلٹ کر آئیں گے۔ (انا نحن نرث الارض ومن علیها والینا یرجعون)[1]

حقیقت میں یہ آیت سورۂ مومن کی آیہ ۱۶ کی ہم وزن ہے کہ جو کہتی ہے:

لمن الملك اليوم لله الواحد القهار

آج (قیامت کے دن) کس کی ملکیت و حکومت ہے، ایک اکیلے غالب و مسلط خدا کی۔

اگر کوئی شخص اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہو اور اس کا معتقد ہو، تو پھر وہ کس لیے اُن اموال اور تمام مادی چیزوں کے لیے کہ جو چند روز کے لیے ہمیں امانت کے طور پر سپرد کی گئی ہیں، اور بہت جلدی ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گی، ظلم و ستم کرے گا اور حقیقت یا دوسرے لوگوں کے حقوق کو پامال کرنے کو جائز سمجھے گا۔

❖ ❖ ❖

۴۱۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ○

۴۲۔ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ○

۴۳۔ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ

---

[1] آیا یہ آیت قیامت کی طرف اشارہ ہے یا دنیا کے فنا ہونے کے وقت کی طرف؛ اگر یہ قیامت کی طرف اشارہ ہو تو یہ "والینا یرجعون" (ہماری طرف پلٹائے جائیں گے) کے جملے سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اور اگر دنیا کے ختم ہونے کے وقت کی طرف اشارہ ہو تو "ومن علیها" (وہ کہ جو زمین کے اُوپر ہیں) کے جملہ کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ دنیا کے ختم ہونے کے وقت تو زمین پر کوئی زندہ نہیں ہوگا کہ جس کے بارے میں "من علیها" کی تعبیر درست ہو۔ شاید اسی وجہ سے بعض مفسرین مثلاً علامہ طباطبائیؒ نے اس جملہ کا یہ معنی کیا ہے۔

"انا نحن نرث عنهم الارض" ہم ان کی طرف سے زمین کے وارث ہوں گے، لیکن یہ تفسیر بھی کچھ خلاف ظاہر ہے کیونکہ "من علیها" کا واؤ کے ساتھ عطف ہوا ہے۔ ایک اور احتمال جو اس مقام پر موجود ہے وہ یہ ہے کہ "نرث" کا مفعول کبھی تو وہ شخص ہوتا ہے جو مال چھوڑ جاتا ہے، مثلاً: "وورث سليمان داؤد" اور کبھی وہ اموال ہوتے ہیں کہ جو میراث کے طور پر باقی رہ جاتے ہیں، مثلاً: "نرث الارض" اور اُوپر والی آیت میں دونوں تعبیریں آئی ہیں۔

صِرَاطًا سَوِيًّا ۝

۴۴۔ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝

۴۵۔ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝

ترجمہ

۴۱۔ اس کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو، وہ خدا کا بہت ہی سچا نبی تھا۔

۴۲۔ جب اُس نے اپنے باپ سے کہا: اے بابا! تُو ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتا ہے کہ جو نہ سنتی ہے اور نہ ہی دیکھتی ہے اور تیری کوئی مشکل بھی حل نہیں کرتی۔

۴۳۔ اے بابا! مجھے ایسا علم و دانش عطا ہوا ہے جو تجھے نصیب نہیں ہوا لہٰذا تُو میری پیروی کر تاکہ میں تجھے سیدھے راستے کی ہدایت کروں۔

۴۴۔ اے بابا! شیطان کی پرستش نہ کر کیونکہ شیطان خدائے رحمٰن کا نافرمان ہے۔

۴۵۔ اے بابا! مجھے اس بات کا خوف ہے کہ خدائے رحمٰن کی طرف سے تجھ پر کوئی عذاب نازل ہو جائے۔ جس کے نتیجے میں تُو شیطان کا دوست ٹھہرے۔

ابراہیم (ع) کی مؤثر منطق:

حضرت عیسٰیؑ کی سرگزشت کے کچھ حصے کا تعلق ان کی والدہ جناب مریمؑ کی زندگی کے ساتھ تھا۔ گزشتہ آیات میں اس کا ذکر تھا۔ اس کے بعد زیر بحث آیات اور آگے آنے والی آیات میں توحید کے ہیرو ابراہیم خلیلؑ کی زندگی کے کچھ حصے کا تذکرہ ہے۔ ان آیات میں تاکید کی گئی ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی دعوت بھی ــ تمام رہبرانِ الٰہی کی دعوت کی طرح ــ نقطۂ توحید ہی سے شروع ہوئی ہے۔

پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: اس کتاب (قرآن) میں ابراہیم کو یاد کرو (واذکر فی الکتاب ابراھیم)۔

کیونکہ وہ بہت ہی سچا مرد تھا، خدا کی تعلیمات و فرامین کی تصدیق کرنے والا تھا اور خدا کا پیغمبر تھا (انہ کان صدیقا نبیًّا)۔

لفظ "صدیق" صدق سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور ایسے شخص کے معنی میں، جو بہت ہی سچا ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسے شخص کے معنی میں ہے جو کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو، یا اس سے بالاتر، جو جھوٹ بول ہی نہ سکتا ہو کیونکہ ــــ اس نے ساری عمر سچ بولنے کی عادت بنالی ہے۔ نیز بعض اسے ایسے شخص کے معنی میں سمجھتے ہیں کہ جس کا عمل اس کے قول اور اعتقاد کی تصدیق

کرتا ہو۔

لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام معانی تقریباً ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں۔

بہر حال یہ صفت اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ اُوپر والی آیت میں صفت نبوّت سے بھی پہلے بیان ہوئی ہے۔ گویا یہ نبوّت کو قبول کرنے کی لیاقت پیدا کی ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبروں اور وحی الٰہی کے حاملین میں جو عمدہ ترین اور بہترین صفت ہونی چاہیئے وہ یہی ہے کہ وہ خداوند تعالٰے کے فرمان کو بے کم و کاست خدا کے بندوں تک پہنچا دیں۔

اس کے بعد ان کی اپنے باپ آزر کے ساتھ گفتگو بیان کی گئی ہے۔ (یہاں باپ سے مراد چچا ہے اور لفظ " ابا " جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ عربی لغت میں کبھی باپ کے معنی میں اور کبھی چچا کے معنی میں آتا ہے)[1]

قرآن کہتا ہے : اس وقت جبکہ اُس نے اپنے باپ سے کہا : اے بابا! تو ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ تو سنتی ہے اور نہ ہی دیکھتی ہے اور نہ ہی تیری کوئی مشکل حل کرتی ہے (اذ قال لابیه یا ابت لم تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنك شیئًا)۔

یہ مختصر اور زوردار بیان شرک اور بُت پرستی کی نفی کرنے والی دلیلوں میں سے ایک بہترین دلیل ہے۔ کیونکہ انسان کو پروردگارِ عالم کی معرفت کے بارے میں اُبھارنے والی چیزوں میں سے ایک نفع و نقصان کا احتمال ہے جسے علمائے عقائد " دفع ضررِ محتمل " سے تعبیر کرتے ہیں۔

ابراہیمؑ کہتے ہیں کہ تو ایسے معبود کی طرف کیوں جاتا ہے کہ جو نہ صرف یہ کہ تیری کسی مشکل کو حل نہیں کر سکتا، بلکہ وہ تو اصلاً سننے اور دیکھنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔

دوسرے لفظوں میں عبادت ایسی ہستی کی کرنی چاہیئے کہ جو مشکلات حل کرنے کی قدرت رکھتی ہو، اپنی عبادت کرنے والے اور اس کی حاجات و ضروریات کو جانتی ہو۔ دیکھ سُن سکتی ہو لیکن ان بتوں میں یہ تمام باتیں مفقود ہیں۔

درحقیقت ابراہیمؑ یہاں اپنی دعوت اپنے چچا سے شروع کرتے ہیں، کیونکہ قریبی رشتہ داروں میں اثر و نفوذ پیدا کرنا زیادہ ضروری ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس بات پر مامور ہوئے تھے کہ پہلے اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دیں جیسا کہ سُورہ شعراء کی آیہ ۲۱۴ میں ہم پڑھتے ہیں :

وانذر عشیرتك الاقربین۔

یعنی اپنے قریبیوں کو خوفِ خدا دلاؤ۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد ابراہیمؑ واضح منطق کے ساتھ اُسے دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس امر میں ان کی پیروی کرے۔ فرماتے ہیں : اے بابا! مجھے وہ علم و دانش ملی ہے جو تجھے نصیب نہیں ہوئی۔ اس بنا پر تو میری پیروی کر اور میری بات سُن (یا ابت انی قد جاءنی من العلم ما لم یأتك فاتبعنی)۔

میری پیروی کر تاکہ میں تجھے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کروں (اھدك صراطًا سویًّا)۔

میں نے وحی الٰہی کے ذریعے سے بہت علم و آگہی حاصل کی ہے اور میں پُورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں خطا کے راستے

---

[1] اس بارے میں تفصیلی بحث جلد ۳ صـ۲۹۳ تفسیر نمونہ (اُردو ترجمہ) سورہ انعام کی آیہ ۷۴ میں ہو چکی ہے۔

پر نہیں چلوں گا۔ تجھے بھی ہرگز غلط راستے کی دعوت نہیں دوں گا۔ میں تیری خوش بختی و سعادت کا خواہاں ہوں تو میری بات مان لے تاکہ فلاح و نجات حاصل کر سکے اور اس صراط مستقیم کو طے کرکے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اس اثباتی پہلو کو منفی پہلو اور ان آثار کے ساتھ ملاتے ہوئے، کہ جو اس دعوت پر مترتب ہوتے ہیں کہتے ہیں: اے بابا! شیطان کی پرستش نہ کر کیونکہ شیطان ہمیشہ خدائے رحمٰن کا نافرمان رہا ہے۔ (یا ابت لاتعبد الشیطان ان الشیطان کان للرحمٰن عصیًّا)۔

البتہ ظاہر ہے کہ یہاں عبادت سے مراد شیطان کے لیے سجدہ کرنے اور نماز روزہ بجا لانے والی عبادت نہیں ہے بلکہ اطاعت اور اس کے حکم کی پیروی کرنے کے معنی میں ہے اور یہ بات خود ایک قسم کی عبادت شمار ہوتی ہے۔

عبادت و پرستش کے معنی اس قدر وسیع ہیں کہ کسی کی باتوں کو عمل کرنے کی نیت سے سُننا تک بھی اس کے معنی میں شامل ہے اور کسی کے قانون کو قابلِ نفاذ سمجھنا بھی اس کی ایک طرح کی عبادت و پرستش شمار ہوتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں اس طرح نقل ہوا ہے:

من اصغی الی ناطق فقد عبدہ فان کان الناطق عن اللہ عزّ وجل فقد عبد اللہ وان کان الناطق عن ابلیس فقد عبد ابلیس:

جو شخص کسی بات کرنے والے کی بات کی طرف کان لگائے (تسلیم و رضا کے ساتھ) تو اس نے اس کی پرستش کی ہے۔ اگر یہ بولنے والا خدا کی طرف سے بول رہا ہے تو اس نے خدا کی عبادت کی ہے اور اگر بولنے والا ابلیس کی طرف سے بول رہا ہے تو (پھر اس سننے والے نے) ابلیس کی عبادت کی ہے۔[1]

بہر حال ابراہیم اپنے چچا کو اس حقیقت کی تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں بغیر کسی قانون یا راستے کے نہیں چل سکتا۔ (اب قانون یا راستے صرف دو ہی ہیں) یا قانون الٰہی اور صراطِ مستقیم ہے اور یا نافرمان و گمراہ شیطان کا قانون اور راستہ ہے۔ چاہیئے کہ انسان اس سلسلے میں ٹھیک طرح سے سوچ بچار کرے اور اپنے لیے بہتری کو اختیار کرے، اور اپنی خیر و صلاح کو تعصبات اور اندھی تقلید سے دور رہتے ہوئے نظر میں لائے۔

❖ ❖ ❖

ایک مرتبہ پھر اُسے شرک اور بُت پرستی کے بُرے نتائج کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: اے بابا! میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تیری اختیار کردہ شرک و بُت پرستی کے سبب خدائے رحمٰن کی طرف سے تجھ پر عذاب آئے اور تو اولیائے شیطان میں سے ہو جائے۔

(یا ابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمٰن فتکون للشیطان ولیًّا)۔

یہاں حضرت ابراہیمؑ کی اپنے چچا آزر کے سامنے یہ تعبیر بہت ہی جاذبِ نظر اور عمدہ ہے کہ ایک طرف اُسے مسلسل "یا ابت" (اے بابا!)

[1] سفینۃ البحار، جلد ۲ صہ ۱۱۵ (مادہ عبد)۔

کے خطاب سے کہ جو ادب و احترام کی نشانی ہے مخاطب کیے جا رہے ہیں اور دوسری طرف "ان یمسك" کا جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ ابراہیمؑ آزر کو معمولی سی تکلیف پہنچنے سے بے چین و پریشان ہیں، تیسری طرف سے "عذاب من الرحمٰن" کی تعبیر اس نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ تیرا معاملہ اس شرک و بُت پرستی کی وجہ سے اس مقام تک پہنچ چکا ہے کہ وہ خدا کہ جس کی رحمتِ عامہ سب چیزوں پر چھائی ہوئی ہے تجھ پر ناراض ہے اور وہ تجھے عذاب دے گا، اب تو ہی دیکھ کر تو کس قسم کا دہشت ناک کام انجام دے رہا ہے۔

چوتھی طرف سے اسے متوجہ کیا کہ تیرا یہ ایک ایسا کام ہے کہ جس کا انجام شیطان کی دوستی کے زیرِ سایہ قرار پانا ہے۔

❖ ❖ ❖

چند نکات:

۱۔ دوسروں پر اثر انداز ہونے کا طریقہ: روایات کے مطابق آزر ایک بُت پرست، بُت تراش اور بُت فروش آدمی تھا اور اس ماحول میں فساد کا ایک عظیم عامل شمار ہوتا تھا ــــ حضرت ابراہیمؑ کی اس سے گفتگو کی کیفیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ منحرف افراد پر اثر انداز ہونے کے لیے خشونت اور سختی اختیار کرنے سے پہلے منطق و دلیل کے طریقے سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ منطق بھی ایسی جو احترام، محبت، شفقت اور ہمدردی کے انداز میں ہو اور ساتھ ساتھ اس میں قاطعیت بھی ہو ــــ کیونکہ اس طریقہ سے بہت سے گروہ حق کے آگے تسلیم خم کر دیں گے، اگرچہ کچھ لوگ اس روش کے اختیار کرنے کے باوجود بھی اپنے موقف پر اڑے رہیں گے۔ یقیناً ان کا معاملہ الگ ہوگا اور اُن کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرنا چاہیئے۔

۲۔ عالم کی پیروی کرنے کی اپیل: ہم نے اُوپر والی آیات میں پڑھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ آزر کو اپنی پیروی کی دعوت دے رہے ہیں حالانکہ ان کا چچا سن و سال کے اعتبار سے قاعدتاً ان سے بہت بڑا تھا اور اُس معاشرے کا نہایت معروف آدمی تھا۔ چچا کی طرف سے اپنی پیروی کے لیے وہ یہ دلیل دیتے ہیں: میں ایسے علوم کا حامل ہوں کہ جو تیرے پاس نہیں ہیں (قد جاءنی من العلم مالم یأتك)۔

یہ تمام لوگوں کے لیے ایک عمومی قانون ہے کہ جن امور سے وہ آگاہ اور باخبر نہیں ہیں، اُن میں وہ ان کی پیروی کریں جو آگاہ و باخبر ہیں۔ یہ بات حقیقتاً ہر فن میں خصوصی مہارت رکھنے والے افراد کی طرف رجوع کرنے کو واضح کر رہی ہے اور ان میں سے ایک فروعِ احکام اسلامی میں مجتہد کی تقلید کا مسئلہ بھی ہے البتہ حضرت ابراہیمؑ کی بحث فروعِ دین کے مسائل سے مربوط نہیں تھی بلکہ وہ اصولِ دین کے سب سے زیادہ بنیادی مسئلہ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ لیکن اس قسم کے مسائل تک میں بھی علماء اور دانشمندوں کی رہنمائی سے ہی استفادہ کرنا چاہیئے تا کہ صراطِ سوی (درست راستے) کی طرف ہدایت حاصل ہو ۔ وہ صراطِ سوی کہ جو صراطِ مستقیم ہی ہے۔

۳۔ رحمت اور یاد آوری کی سُورت: اس سورہ میں حضرت مریمؑ اور بزرگ پیغمبروں کا قصہ شروع کرتے وقت پانچ مرتبہ "اذکر" (یاد کرو) آیا ہے اور اس بنا پر اس سُورہ کو یاد آوری کا سورہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ پیغمبروں اور عظیم مردوں اور عورتوں کی یاد آوری ہے اور توحید کے بارے میں ان کی جدوجہد اور شرک و بُت پرستی اور ظلم و بیدادگری کے خلاف ان کی سعی و کوشش کی یاد آوری ہے۔

چونکہ عام طور پر ذکر، بھُول جانے کے بعد یاد دلانے کے معنی میں ہے اس لیے ممکن ہے کہ اِس واقعیت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ توحید کی بنیادوں اور مردانِ حق کا عشق اور راہِ حق میں ان کی جدوجہد پر ایمان لانا، ہر انسان کی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے اور ان کی باتیں

کرنا داخا ایک طرح کا ذکر اور یاد آوری ہے۔

خداوند تعالیٰ کی "رحمن" کے عنوان سے توصیف اس سورہ میں سولہ مرتبہ آئی ہے، کیونکہ یہ سورہ اپنے آغاز سے ہی رحمت کے ذکر کے ساتھ شروع ہوئی ہے۔ خدا کی زکریا پر رحمت، خدا کی مریمؑ اور مسیحؑ پر رحمت، اور اس سورہ کا اختتام بھی اسی رحمت کے ساتھ ہے کیونکہ اس کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

إن الذين اٰمنوا وعملوا الصّالحات سيجعل لهم الرحمٰن ودًّا

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے خدائے رحمن ان کی محبت کو اپنے بندوں کے دل میں قرار دے دیتا ہے۔

❖ ❖ ❖

۴۶۔ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ○

۴۷۔ قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ○

۴۸۔ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا ○

۴۹۔ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِیًّا ○

۵۰۔ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِیًّا ○

ترجمہ

۴۶۔ اُس نے کہا اے ابراہیم! کیا تو میرے خداؤں سے رُوگرداں ہے، اگر تو (اس کام سے) دستبردار نہ ہوا، تو میں تجھے سنگسار کردوں گا، تو مجھ سے ایک طویل مدّت کے لیے دُور ہو جا۔

۴۷۔ (ابراہیم نے) کہا: تجھ پر سلام ہو، میں عنقریب اپنے پروردگار سے تیرے لیے عفو (بخشش) کی درخواست کروں گا کیونکہ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔

۴۸۔ اور میں تم سے بھی اور جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو ان سے بھی کنارہ کشی کرتا ہوں اور میں تو اپنے پروردگار ہی کو پکارتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میری دعا میرے پروردگار کی بارگاہ میں قبول ہوئے بغیر نہ رہے گی۔

۴۹۔ جس وقت (ابراہیم نے) خود اُن سے اور جن جن چیزوں کی وہ خدا کے علاوہ پرستش کرتے تھے اُن سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی تو ہم نے اُسے اسحٰق (سا بیٹا) اور یعقوب (سا پوتا) عطا فرمایا اور ہم نے (ان میں سے) ہر ایک کو بزرگ پیغمبر قرار دیا۔

۵۰۔ اور ان پر اپنی رحمت کی ارزانی کی اور انہیں ہم نے نیک نام (تمام امتوں کے درمیان) اور مقبول و پسندیدہ مقام عطا کیا۔

تفسیر

شرک اور مشرکین سے دُوری کا نتیجہ :

گزشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی ان کے چچا کی ہدایت کے سلسلے میں منطقی باتیں جو خاص لطف و محبت کی آمیزش رکھتی تھیں گزر چکی ہیں۔ اَب آزر کے جوابات بیان کرنے کی نوبت ہے تاکہ ان دونوں کا آپس میں موازنہ کرنے سے حقیقت اور واقعیت ظاہر ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ نہ صرف ابراہیمؑ کی دل سوزیاں اور ان کا مدلل بیان آزر کے دل پر اثر انداز نہ ہو سکا بلکہ وہ ان باتوں کو سُن کر سخت برہم ہوا، اور اُس نے کہا :

" اے ابراہیم کیا تُو میرے خداؤں سے رُوگردان ہے۔ (قال اراغب انت عن الهتی یا ابراهیم)۔

اگر تُو اِس کام سے باز نہیں آئے گا تو میں ضرور ضرور تجھے سنگسار کروں گا۔ (لئن لم تنته لارجمنك)۔

" اور تو اب مجھ سے دُور ہو جا میں پھر تجھے نہ دیکھوں (واهجرني مليًّا)۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اولاً آزر یہ تک کہنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ بُتوں کے انکار یا مخالفت اور ان کے بارے میں بدگوئی کا ذکر زبان پر لائے، بلکہ بس اتنا کہا : کیا تُو بتوں سے روگردان ہے؟ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کر بتوں کے حق میں جسارت ہو جائے۔ ثانیاً ابراہیمؑ کو تہدید کرتے وقت اسے سنگسار کرنے کی تہدید کی۔ وہ بھی اُس تاکید کے ساتھ کہ جو " لام " اور " نون " تاکید ثقیلہ سے جو " لارجمنک " میں وارد ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ سنگسار کرنا قتل کرنے کی ایک بدترین قسم ہے۔ ثالثاً اِس مشروط تہدید اور دھمکی پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ اِس حالت میں جناب ابراہیمؑ کو ایک ناقابلِ برداشت وجود شمار کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ تُو ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے دُور ہو جا (ملیًّا)۔ مفردات میں راغب کے کہنے کے مطابق " املا " کے مادہ سے طولانی مہلت دینے کے معنی میں ہے اور یہاں اس کا مفہوم یہ ہے کہ طولانی مدت کے لیے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تُو مجھ سے دُور ہو جا۔

یہ تعبیر بہت ہی توہین آمیز ہے، کہ جسے سخت مزاج افراد اپنے مخالفین کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور فارسی زبان میں اس کی جگہ " گورت را گم کن " کہتے ہیں، یعنی نہ صرف اپنے آپ کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھپا لے بلکہ کسی ایسی جگہ چلے جاؤ کہ میں تمہاری قبر تک کو بھی نہ دیکھوں۔

بعض مفسرین نے " لارجمنك " کو سنگسار کرنے کے معنی میں نہیں لیا بلکہ انہوں نے اس کی تفسیر بدگوئی کرنے یا متہم کرنے کے معنی میں کی ہے لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔ قرآن کریم کی تمام آیات کا مطالعہ، کہ جو اسی تعبیر کے ساتھ وارد ہوئی ہیں، اسی بات کی گواہی دیتا ہے کہ جو ہم نے کہی ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت ابراہیمؑ نے تمام پیغمبروں اور آسمانی رہبروں کی مانند اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھا، اور تندی اور تیزی اور شدید خشونت وسختی کے مقابلے میں انتہائی بزرگواری کے ساتھ کہا: تجھ پر سلام" (قال سلام علیك)۔

ممکن ہے کہ یہ سلام الوداعی اور خداحافظی کا سلام ہو، کیونکہ اس کے اور بعد کے چند جملوں کے کہنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے آزر کو چھوڑ دیا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایسا سلام ہو کر جو دعویٰ اور بحث کو ترک کرنے کے لیے کہا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ قصص کی آیہ ۵۵ میں ہے:

لنا اعمالنا ولکم اعمالکم سلام علیکم لا نبتغی الجاھلین

اب جبکہ تم ہماری بات قبول نہیں کرتے ہو، تو ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم پر سلام ہے ہم جاہلوں کے ہوا خواہ نہیں ہیں۔

اس کے بعد مزید کہا: میں عنقریب تیرے لیے اپنے پروردگار سے بخشش کی درخواست کروں گا، کیونکہ وہ میرے لیے رحیم ولطیف اور مہربان ہے۔ (سأستغفر لك ربی انه کان بی حفیًا)۔

حقیقت میں حضرت ابراہیمؑ نے آزر کی خشونت وسختی اور تہدید ودھمکی کے مقابلے میں اسی جیسا جواب دینے کی بجائے اس کے برخلاف جواب دیا اور اُس کے لیے پروردگار سے استغفار کرنے اور اس کے لیے بخشش کی دُعا کرنے کا وعدہ کیا۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے اس سے استغفار کا وعدہ کیوں کیا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آزر ہرگز ایمان نہیں لایا اور مشرکین کے لیے استغفار سورہ توبہ کی صریح آیہ ۱۱۳ کے مطابق ممنوع ہے۔

اس سوال کا جواب ہم سورۂ توبہ کی اسی آیت کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ (تفسیر نمونہ جلد ۵ ص ۲۹ اُردو ترجمہ)

✽ ✽ ✽

اس کے بعد یہ فرمایا کہ: میں تم سے (تجھ سے اور اس بُت پرست قوم سے) کنارہ کشی کرتا ہوں اور اسی طرح اُن سے بھی کہ جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو، یعنی بتوں سے بھی (کنارہ کشی کرتا ہوں) (واعتزلکم وما تدعون من دون اللہ)۔

اور میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ میری دُعا میرے پروردگار کی بارگاہ میں قبول ہوئے بغیر نہیں رہے گی (وادعوا ربی عسیٰ ان لا اکون بدعاء ربی شقیًا)۔

یہ آیت ایک طرف حضرت ابراہیمؑ کے آزر کے مقابلے میں اُدب کی نشاندہی کرتی ہے۔ کہ اُس نے کہا کہ مجھ سے دُور ہو جا تو ابراہیمؑ نے بھی اُسے قبول کر لیا اور دوسری طرف ان کی اپنے عقیدہ میں قاطعیت اور یقین کو واضح کرتی ہے۔ یعنی وہ واضح کر رہے ہیں کہ میری تم سے یہ دُوری اس بنا پر نہیں ہے کہ میں نے اپنے توحید پر اعتقادِ راسخ سے دستبرداری اختیار کر لی ہے بلکہ اس بنا پہ ہے کہ میں تمہارے نظریے کو حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں، لہٰذا میں اپنے عقیدے پر اسی طرح قائم ہوں۔

ضمنی طور پر یہ کہتے ہیں کہ اگر میں اپنے خدا سے دُعا کروں تو وہ میری دعا کو قبول کرتا ہے لیکن تم بیچارے تو اپنے سے زیادہ بیچاروں کو پکارتے ہو۔ اور تمہاری دعا ہرگز قبول نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ تو تمہاری باتوں کو سُنتے تک نہیں۔

ابراہیمؑ نے اپنے قول کی وفا کی اور اپنے عقیدہ پر جتنا زیادہ سے زیادہ استقامت کے ساتھ رہا جا سکتا ہے، باقی رہے۔ ہمیشہ توحید کی منادی کرتے رہے۔ اگرچہ اس وقت کے تمام فاسد اور بُرے معاشرے نے ان کے خلاف قیام کیا لیکن وہ جناب بالآخر اکیلے نہ رہے اور

تمام قرون و اعصار میں بہت سے پیروکار پیدا کر لیے اس طور پر کہ دنیا جہان کے تمام خدا پرست لوگ ان کے وجود پر فخر کرتے ہیں۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے: جس وقت ابراہیم نے ان بت پرستوں سے اور اُن تمام چیزوں سے کہ جن کی وہ اللہ کے سوا پرستش کیا کرتے تھے کنارہ کشی اختیار کر لی تو ہم نے اُسے اسحاق سا بیٹا اور یعقوب سا پوتا عطا فرمایا اور اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے عظیم پیغمبر قرار دیا۔ (فلما اعتزلهم وما يعبدون من دون الله وهبنا له اسحٰق ويعقوب وكلا جعلنا نبيا)۔

اگرچہ بہت زیادہ مدت گزر جانے کے بعد خداوند تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ اور اس کے بعد یعقوب (اسحٰق کا بیٹا) عطا فرمایا۔ لیکن بہرحال یہ بزرگ انعام یعنی اسحٰقؑ جیسا بیٹا اور یعقوب جیسا پوتا، کہ اُن میں سے ہر ایک عالی مقام پیغمبر تھا، اسی استقامت کا نتیجہ تھا کہ جو ابراہیمؑ نے بُتوں سے مبارزہ اور اس دین باطل سے کنارہ کشی کرنے میں اپنی طرف سے دکھائی۔

علاوہ ازیں ہم نے انہیں اپنی رحمت کا ایک حصّہ بخشا۔ (ووهبنا لهم من رحمتنا)۔

وہ خاص رحمت کہ جو خالصین و مخلصین، مردان مجاہد اور راہِ خدا میں مبارزہ کرنے والوں ہی کا حصّہ ہے۔

اور بالآخر" ہم نے اس باپ اور اس کے بیٹوں کے لیے تمام اُمتوں کے درمیان نیک نام، اچھی زبان اور اعلیٰ مقام قرار دیا" (وجعلنا لهم لسان صدق عليا)۔

درحقیقت یہ حضرت ابراہیمؑ کی اُس درخواست کا جواب ہے کہ جو سورہ شعراء کی آیہ ۸۴ میں بیان ہوئی ہے:

واجعل لی لسان صدق فی الأخرين

خدایا! میرے لیے آئندہ آنے والی اُمتوں میں لسان صدق (سچی زبان) قرار دے۔

واقع میں وہ یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد کو اس طرح سے انسانی معاشرے میں سے نکال دیا جائے کہ ان کی کوئی خبر اور ان کا معمولی سا بھی اثر باقی نہ رہے اور وہ ہمیشہ کے لیے بھلا دیے جائیں۔ لیکن اس کے برعکس خداوند تعالیٰ نے ان کے ایثار، فداکاری اور اُس رسالت کی ادائیگی میں اُن کی استقامت کی وجہ سے کہ جو اُن کے ذمہ تھی، ان کی شہرت کو ایسا بام عروج تک پہنچایا کہ ہمیشہ دنیا جہان کے لوگوں کی زبان پر ان کا تذکرہ تھا اور اب تک ہے۔ وہ خداشناسی و جہاد، پاکیزگی و تقویٰ، اور مبارزہ و جہاد کے اسوہ اور نمونہ کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔

" لسان " (زبان) ایسے مواقع پر ایک ایسی " یاد " کے معنیٰ میں ہے کہ جو انسان کی لوگوں کے درمیان رہ جائے اور جب ہم اسکی " صدق " کی طرف اضافت کریں اور (لسان الصدق) کہیں تو اس کا معنیٰ اچھی یاد، نیک نامی اور لوگوں کے دلوں میں اچھا مقام ہے، اور جس وقت " علیا " کے لفظ کے ساتھ کہ جو عالی اور عمدہ کے معنی میں ہے ضمیمہ ہو جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ کسی کی بہت ہی اچھی یاد لوگوں کے درمیان رہ جائے۔

یہ بات کہے بغیر ہی واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس درخواست سے یہ نہیں چاہتے کہ اپنے دل کی خواہش کو پُورا کریں، بلکہ ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ دشمن ان کی تاریخ زندگی کو کہ جو نہایت انسان ساز تھی فراموشی کی بھٹی میں نہ ڈال سکیں اور وہ زندگی جو عالم کے لوگوں کے لیے نمونہ بن سکتی ہے اسے کہیں ہمیشہ کے لیے لوگوں کے دلوں سے محو نہ کر دیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ:-

لسان الصدق للمرء یجعله الله فی الناس خیر من المال یأکله ویورثه :

اچھی یاد اور نیک نامی کہ جو خدا کسی شخص کے لیے لوگوں کے درمیان قرار دے، اس فراواں دولت و ثروت سے بہتر و برتر ہے کہ جس سے انسان خود بھی فائدہ اُٹھائے اور اُسے میراث کے طور پر بھی چھوڑ جائے۔[1]

اصولی طور پر، رُوحانی پہلوؤں سے قطع نظر بھی بعض اوقات اچھی شہرت لوگوں کے درمیان خُود انسان کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے عظیم سرمایہ ہو سکتی ہے کہ جس کے ہم نے بکثرت نمونے دیکھے ہیں۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اس آیت میں حضرت اسمٰعیلؑ کے وجود کی نعمت، کہ جو حضرت ابراہیمؑ کے پہلے فرزند بزرگوار تھے، کیوں بالکل ہی بیان نہیں ہوئی جب کہ حضرت یعقوبؑ کا نام جو کہ حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے صراحت کے ساتھ آیا ہے۔

لیکن قرآن میں ایک دوسرے مقام پر حضرت ابراہیمؑ کے انعامات کے ضمن میں حضرت اسمٰعیلؑ کے وجود کا بیان ہوا ہے جہاں وہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے کہتا ہے :

الحمد لله الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحٰق۔

شکر ہے اُس خدا کا کہ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق بخشے۔ (ابراہیم - ۳۹)

اس سوال کا جواب اس طرح ہے کہ علاوہ اس کے کہ بعد کی دو تین آیات میں حضرت اسمٰعیلؑ کا نام ان کی بعض اعلیٰ صفات کے ساتھ مستقل طور پر آیا ہے، اُوپر والی آیت سے مقصود یہ ہے کہ اولاد ابراہیمؑ میں نبوت کے جاری رہنے اور تسلسل کو بیان کرے اور نشاندہی کرے کہ کس طرح یہ حسنِ شہرت، نیک نامی اور ان کی عظیم تاریخ، ان انبیاء کے ذریعے کہ جو ان کی اولاد میں سے یکے بعد دیگرے آئے، تحقق پذیر ہوئی اور ہم جانتے ہیں کہ طویل ادوار میں حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے بہت سے پیغمبر آئے ہیں، اگرچہ اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے بھی تمام پیغمبروں میں سے سب سے بزرگ ترین پیغمبر یعنی پیغمبرِ اسلامؐ نے عرصہ ہستی میں قدم رکھا لیکن تسلسل اور یکے بعد دیگرے آتے رہنا اولادِ اسحٰقؑ میں ہی تھا۔

اسی لیے سورۂ عنکبوت کی آیہ ۲۷ میں یہ بیان ہوا ہے :

ووھبنا له اسحٰق و یعقوب وجعلنا فی ذریته النبوة و الکتاب

ہم نے اُسے اسحٰق و یعقوب بخشے اور اس کی ذریت میں نبوت اور آسمانی کتاب قرار دی۔

❖ ❖ ❖

۵۱۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ○

---

[1] اصول کافی (مطابق نقل تفسیر نور الثقلین، جلد ۳، ص ۳۳۹)۔

۵۲۔ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ○

۵۳۔ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ○

ترجمہ

۵۱۔ اس (آسمانی) کتاب میں موسٰی کو یاد کرو وہ مخلص تھا اور بلند مرتبہ رسول اور پیغمبر تھا۔

۵۲۔ ہم نے اُسے (کوہ) طور کی دائیں طرف سے پکارا اور اسے قریب کیا اور اُس سے ہم نے گفتگو کی۔

۵۳۔ اور ہم نے اپنی رحمت سے اُسے اس کا بھائی ہارون جو کہ نبی تھا بخشا۔

تفسیر

موسٰیؑ ایک مخلص و برگزیدہ پیغمبر:

زیر نظر تین آیات حضرت موسٰیؑ کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتی ہیں، جو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے ہیں اور ان بزرگوار پر ہونے والی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں، کہ جنہوں نے ابراہیمؑ کے مسلک کی پیروی کرتے ہوئے اس کی تکمیل کی۔

پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رُوئے سخن کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اپنی آسمانی کتاب میں موسٰی کو یاد کرو (واذکر فی الکتاب موسٰی)۔

اس کے بعد ان نعمتوں میں سے جو اللہ نے اس عظیم پیغمبر کو مرحمت فرمائی ہیں پانچ قسم کی نعمتوں کو بیان کیا گیا ہے:

۱۔ وہ خدا کی اطاعت اور بندگی کی وجہ سے اس مقام کو پہنچا کہ پروردگار نے اُسے خالص اور پاک بنا دیا (انه کان مخلصًا)۔

اور یقینی طور پر جو شخص ایسے مقام پر فائز ہو جاتے وہ انحراف اور آلودگی کے خطرے سے محفوظ رہتا ہے، چونکہ شیطان خدا کے بندوں کو منحرف کرنے پر اپنے تمام تر اصرار کے باوجود اعتراف کرتا ہے کہ وہ "مخلصین" کو گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا:

"قال فبعزتك لاغوينهم اجمعين الا عبادك منهم المخلصين"

اُس نے کہا تیری عزت کی قسم تیرے مخلص بندوں کے سوا اُن سب کو گمراہ کروں گا۔ (ص ۸۲، ۸۳)

۲۔ وہ بلند مرتبہ پیغمبر اور رسول ہے۔ (وکان رسولاً نبیًّا)۔

حقیقت رسالت یہ ہے کہ کسی کے ذمہ کوئی کام کیا جائے اور وہ اس ماموریت کی تبلیغ اور ادائیگی کا پابند ہو اور یہ وہ مقام ہے کہ جو ان تمام انبیاء کو حاصل تھا، جو دعوت دینے پر مامور تھے۔

"نبیًّا" کا یہاں اس پیغمبر کے بلند مقام اور رفعت شان کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ لفظ دراصل "نبوہ" (بروزن نغمہ) جو مقام

کی رفعت و بلندی کے معنی میں ہے سے لیا گیا ہے۔ البتہ اس کی ایک دوسری اصل بھی ہے کہ جو "نبأ" سے خبر کے معنی میں ہے، کیونکہ پیغمبر خداوند تعالیٰ کی طرف سے خبر حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو خبر دیتا ہے، لیکن یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

۳۔ بعد والی آیت موسیٰؑ کی رسالت کے آغاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے : ہم نے اُسے کوہ طور کی دائیں طرف سے بلند آواز میں پکارا (وناديناه من جانب الطور الأيمن)۔

اس تاریک اور پُر وحشت رات میں جبکہ وہ اپنی زوجہ کے ساتھ مدین کے بیابانوں سے گزر کر مصر کی طرف جا رہے تھے، تو ان کی زوجہ کو وضع حمل کی تکلیف شروع ہوگئی اور وہ خود ایک شدید سردی کی لپیٹ میں آگیا اور ایک آگ کے شعلے کی تلاش میں جا رہا تھا کہ یکایک اور اچانک دُور سے ایک بجلی چمکی اور ایک آواز آئی اور موسیٰؑ کو رسالت کا فرمان دیا گیا اور یہ اس کی زندگی کا عظیم ترین افتخار اور شیریں ترین لمحہ تھا۔

۴۔ علاوہ ازیں "ہم نے اُسے قریب کیا (اپنا تقرب بخشا) اور اس سے گفتگو کی" (وقربناه نجيا)۔ [1]

خداوند تعالیٰ کی ندا ایک نعمت تھی اور اُن سے تکلم و گفتگو دوسری نعمت۔

◆ ◆ ◆

اور آخر میں "ہم نے اپنی رحمت سے اسے ہارون جیسا بھائی عطا کیا کہ جو خود بھی پیغمبر تھا۔

(ووهبنا له من رحمتنا اخاه هارون نبيا)۔

چند اہم نکات :

۱۔ **مخلَص کسے کہتے ہیں ؟** اُوپر والی آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ خدا نے موسیٰؑ کو اپنے "مخلَص" (لام کی زبر کے ساتھ) بندوں میں سے قرار دیا اور یہ مقام جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، بہت ہی باعظمت مقام ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں خدا کی طرف سے انسان کے لیے لغزشوں اور انحرافات سے بچنے کا گویا بیمہ ہو جاتا ہے، ایسا مقام جہاں شیطان کا کوئی اثر نہیں، یہ مقام مسلسل نفس کے ساتھ جہاد کرنے اور لگا تار خداوند تعالیٰ کے فرمان کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

علمِ اخلاق کے بزرگ علماء اس مقام کو بہت اعلیٰ اور بلند سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ "مخلَصین" خاص صفات اور افتخارات کے حامل ہوتے ہیں جو انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں آئیں گی۔

۲۔ **رسول اور نبی میں فرق :** رسول دراصل اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جس کے ذمے کوئی ماموریت یا پیغام رسانی کا کام لگایا گیا ہو تاکہ وہ اس کو پہنچائے۔ اور "نبی" ایک تفسیر کی بنا پر اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جو وحی الٰہی سے آگاہ ہے اور اس کی خبر دیتا ہے اور دوسری تفسیر کی بنا پر ایک عالی مقام شخص کے معنی میں ہے۔ (دونوں کا مادۂ اشتقاق پہلے بیان ہو چکا ہے) یہ تو لغت کے لحاظ سے ہے۔

لیکن قرآنی تعبیرات اور روایات کی زبان کے لحاظ سے بعض کا نظریہ یہ ہے :

---

[1] "نجی" مناجی کے معنی میں وہ شخص ہے کہ جو دوسرے کے کان میں کوئی بات کہے، یہاں خدا نے پہلے موسیٰؑ کو دُور کے فاصلے سے صدا دی، ان کے نزدیک آنے کے بعد ان سے "نجویٰ" (سرگوشی) میں بات کی۔ (یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ خدا نہ زبان رکھتا ہے اور نہ مکان بلکہ وہ فضا میں صوتی امواج پیدا کر دیتا ہے اور موسیٰؑ جیسے بندے کے ساتھ گفتگو کرتا ہے)۔

رسول وہ شخص ہے کہ جو صاحب دین و آئین ہو اور تبلیغ کرنے پر مامور ہو۔ یعنی وحی الٰہی کو حاصل کرکے لوگوں کو اس کی تبلیغ کرے، باقی رہا "نبی" تو وہ وحی کو حاصل تو کرتا ہے لیکن تبلیغ کرنا اس کی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ وہ وحی صرف اُسی کی اپنی ذمہ داری انجام دینے کے لیے ہوتی ہے یا اگر لوگ اس سے کوئی سوال کریں تو وہ اس کا جواب دیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں "نبی" اس آگاہ طبیب کی طرح ہے کہ جو اپنے مقام پر بیماروں کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہے لیکن وہ بیماروں کے پیچھے نہیں جاتا۔ لیکن اگر بیمار اس کی طرف رجوع کریں تو پھر ان کا علاج کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔

لیکن رسول اُس طبیب کی مانند ہے کہ جو سیار ہے (یعنی بیماروں کے پاس علاج کرنے کے لیے چل کر جاتا ہے) اور اُس تعبیر کے مطابق جو حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں فرمائی ہے۔ (طبیب دوار بطبه)[1]

وہ شہروں میں، دیہات میں، کوہ و دشت و بیابان میں، ہر جگہ جاتا ہے تاکہ بیماروں کو تلاش کرے اور ان کا علاج کرے۔ وہ ایک ایسا چشمہ ہے کہ جو پیاسوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ ایسا چشمہ نہیں ہے کہ جسے پیاسے تلاش کرتے پھریں۔

اُن روایات سے کہ جو اس سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں اور مرحوم کلینی نے کتاب "اصول کافی" کے باب "طبقات الانبیاء والرسل" اور باب "الفرق بین النبی والرسل" میں بیان کی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی وہ ہوتا ہے کہ جو حقائق وحی کو عالم خواب میں دیکھتا ہے (جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کا خواب تھا) یا خواب کے علاوہ بیداری میں بھی وحی کے فرشتے کی آواز سنتا ہے۔

لیکن رسول وہ ہوتا ہے کہ عالم خواب میں وحی حاصل کرنے اور فرشتہ کی آواز سننے کے علاوہ خود اس کا بھی مشاہدہ کرتا ہے۔[2]

البتہ ان روایات میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اُس تفسیر کے منافی نہیں جو ہم نے بیان کی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ نبی و رسول کی ماموریت کا اختلاف و تفاوت وحی حاصل کرنے کے طریقہ پر بھی اثر انداز ہوتا ہو اور دوسرے لفظوں میں ماموریت کا ہر مرحلہ وحی کے ایک مخصوص مرحلہ کے ساتھ ہو (غور کیجیے گا)۔

❖ ❖ ❖

۵۴۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝

۵۵۔ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝

ترجمہ

۵۴۔ اپنی (آسمانی) کتاب میں اسمٰعیل کو یاد کرو۔ وہ اپنے وعدوں میں سچا اور ایک بزرگ پیغمبر اور رسول تھا۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۸۔

[2] اصول کافی، جلد اول، ص ۱۳۳ - ۱۳۴ (چاپ دار الکتب الاسلامیہ)۔

۵۵۔ وہ ہمیشہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتا تھا اور ہمیشہ اپنے پروردگار کی رضاؤں کا حامل تھا۔

تفسیر

اسمٰعیلؑ، صادق الوعد پیغمبر:

ابراہیمؑ اور ان کی فداکاریوں، اور اسی طرح موسٰیؑ کی زندگی کے بارے میں مختصر سا اشارہ کرنے کے بعد، قرآن ابراہیمؑ کے بزرگ ترین فرزند اسمٰعیلؑ کے بارے میں گفتگو شروع کرتا ہے، اور ابراہیمؑ کی یاد کو ان کے فرزند اسمٰعیلؑ کی یاد کے ساتھ اور ان کے پروگراموں کی اسمٰعیلؑ کے پروگراموں کے ساتھ تکمیل کرتا ہے۔ یہاں حضرت اسمٰعیلؑ کی اعلیٰ صفات میں سے پانچ صفات جو سب لوگوں کے لیے نمونہ بن سکتی ہیں بیان کی گئی ہیں۔

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اپنی آسمانی کتاب میں اسمٰعیل کو یاد کرو (واذكر في الكتاب اسمٰعيل)۔

وہ اپنے وعدوں میں سچا تھا (انه كان صادق الوعد)۔

اور عالی مقام پیغمبر تھا (وكان رسولاً نبيًا)۔

وہ ہمیشہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا (وكان يأمر اهله بالصلوٰة والزكوٰة)۔

اور ہمیشہ اپنے پروردگار کی رضا کا حامل رہتا تھا (وكان عند ربه مرضيًا)۔

اِن دو آیات میں صادق الوعد ہونا، عالی مقام پیغمبر ہونا، نماز کا حکم دینا اور خالق کے ساتھ ربط و تعلق رکھنا، زکوٰۃ کا حکم دینا اور مخلوقِ خدا کے ساتھ رابطہ برقرار رکھنا اور آخرکار ایسے کام انجام دینا کہ جن میں خداوند تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو، خداوند تعالیٰ کے اس عظیم پیغمبر کی صفات شمار ہوئے ہیں۔

عہد و پیمان کی وفا اور گھر والوں کی تربیت پر توجہ، ان دو فرائض الٰہی کی انتہائی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اُن میں سے ایک مقامِ نبوّت سے پہلے اور دوسرا بلا فاصلہ مقامِ نبوّت کے بعد ذکر ہوا ہے۔

حقیقتاً جب تک انسان صادق نہ ہو محال ہے کہ رسالت کے اعلیٰ مقام تک پہنچے کیونکہ اس مقام و مرتبہ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وحیِ الٰہی کو بے کم و کاست اس کے بندوں تک پہنچائے۔ لہٰذا ان گنے چنے چند افراد کہ جو انبیاء کے لیے ان کی عمر کے کسی حصّہ میں مقامِ عصمت کا انکار کرتے ہیں، پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صادق ہونے کے مسئلے کو ایک شرطِ اساسی کے طور پر قبول کر لیا ہے یعنی خبروں میں بھی صداقت و راستی، وعدوں میں بھی صداقت و راستی اور تمام چیزوں میں صداقت و راستی۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ جو خداوند تعالیٰ نے اسمٰعیلؑ کو صادق الوعد شمار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے وعدہ کی وفا کرنے میں اس قدر پابند تھے کہ انہوں نے کسی آدمی سے ایک جگہ اس کے انتظار کا وعدہ کر لیا تھا، وہ شخص وہاں نہ آیا، لیکن اسمٰعیلؑ ایک سال تک اس کا انتظار کرتے رہے، اس طویل عرصے کے بعد جس وقت وہ وہاں آیا تو اسمٰعیلؑ نے فرمایا کہ میں تو ہمیشہ تیرے انتظار میں رہا ہ[1]

[1] اصول کافی، جلد دوم صفحہ ۸۶

یہ بات ظاہر ہے کہ اس سے ہرگز یہ منظور نہیں ہے کہ اسمٰعیلؑ نے اپنی زندگی کے دیگر کاموں کو ہی معطل کر دیا تھا، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے دیگر پروگرام جاری رکھتے ہوئے مذکورہ شخص کا انتظار کرتے رہے۔

ایفائے عہد کے سلسلے میں (تیسری جلد ص ۲۶۰ اردو ترجمہ) سورۂ مائدہ کی پہلی آیہ کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کر آئے ہیں۔

دوسری طرف سے تبلیغ رسالت کا پہلا مرحلہ اپنے خاندان اور گھر والوں سے شروع کرنا ہے، کیونکہ وہ انسان کے سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی پہلے اپنی دعوت اپنی زوجۂ گرامی قدر جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا اور اپنے چچازاد بھائی حضرت علی علیہ السلام سے شروع کی اور اس کے بعد "وانذر عشیرتك الاقربین" [1] کے فرمان کے مطابق اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت دی۔

سورۂ طٰہٰ کی آیہ ۱۳۲ میں بھی ہے:

"وأمر اهلك بالصلوٰة واصطبر عليها"

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی نماز کی ادائیگی پر پابند رہو۔

ایک اور نکتہ جو یہاں قابلِ ذکر ہے یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی رضائے الٰہی کا حامل ہونے کے ساتھ توصیف، واقعتاً اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اپنے سارے امور رضائے الٰہی کے سانچے میں ڈھال رکھے تھے۔

اصولاً کوئی نعمت اس سے بالاتر نہیں ہے کہ انسان کا معبود و مولا اور اس کا خالق اُس سے راضی و خوشنود ہو۔ اسی بنا پر سورۂ مائدہ کی آیہ ۱۱۹ میں خدا کے مخصوص بندوں کے لیے بہشتِ جاوداں کا بیان کرنے کے بعد آخر میں فرمایا گیا ہے:

"رضى الله عنهم و رضوا عنه. ذٰلك الفوز العظيم"

خدا اُن سے راضی و خوش ہوا اور وہ بھی اس سے خوش ہوں گے اور یہ ایک عظیم کامیابی اور ایک بہت بڑی نجات ہے [2]۔

❖ ❖ ❖

۵۶۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝

۵۷۔ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝

۵۸۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۝ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ

---

[1] سورۂ شعراء، آیہ ۲۱۴۔

[2] اس سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۳ ص ۲۷۱ (اُردو ترجمہ) میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩

۵۹۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ ۖ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا

۶۰۔ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا

ترجمہ

۵۶۔ اور اس کتاب میں ادریس کو بھی یاد کرو وہ بہت ہی سچا اور عظیم پیغمبر تھا۔

۵۷۔ اور ہم نے اُسے بلند مقام پر پہنچایا۔

۵۸۔ وہ سب کے سب ایسے پیغمبر تھے کہ خداوند تعالیٰ نے انھیں اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ یہ اُن انبیا میں سے تھے کہ جو آدم کی اولاد میں سے تھے اور اُن لوگوں میں سے تھے کہ جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور وہ ابراہیم و یعقوب کی ذریت میں سے تھے اور ایسے تھے کہ جنھیں ہم نے ہدایت کی تھی اور برگزیدہ کیا تھا۔ وہ ایسے افراد تھے کہ جس وقت خدائے رحمٰن کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو وہ زمین پر گر پڑتے تھے اور سجدے میں گریہ کیا کرتے تھے۔

۵۹۔ لیکن ان کے بعد ناشائستہ اور ناخلف اولاد نے ان کی جگہ لے لی، انہوں نے نماز کو ضائع کیا اور شہوات کی پیروی کی اور وہ عنقریب اپنی گمراہی (کی سزا) کو دیکھیں گے۔

۶۰۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں، ایمان لے آئیں اور عمل صالح بھی انجام دیں تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر معمولی سا بھی ظلم نہیں ہو گا۔

تفسیر

یہ سچے پیغمبر تھے، لیکن ۔۔۔۔۔۔

اس سورہ کی یادآوریوں کے آخری حصے میں، حضرت ادریسؑ پیغمبر کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے : اپنی آسمانی کتاب (قرآن) میں ادریس کو یاد کرو وہ صدیق اور پیغمبر تھا (واذکر فی الکتاب ادریس انہ کان صدیقا نبیا)۔

" صدیق " جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ بہت ہی سچ بولنے والے ، خداوند تعالیٰ کی آیات کی تصدیق کرنے والے اور حق وحقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے شخص کو کہتے ہیں ۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اس کے بلند پایہ مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : ہم نے اُسے ایک بلند مقام تک پہنچا دیا (ورفعناہ مکانا علیا)۔

اس بارے میں کہ اس سے حضرت ادریس کے مقام معنوی کی عظمت مراد ہے ۔ یا حسی مکان کی بلندی مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ۔ ہماری طرح بعض نے اس عظیم پیغمبر کے معنوی مقامات اور رُوحانی درجات کی طرف اشارہ سمجھا ہے ۔ بعض کا نظریہ ہے کہ خداوند تعالیٰ حضرت ادریسؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی طرح آسمان کی طرف لے گیا اور وہ (مکانا علیا) کی تعبیر کو اُوپر والی آیت میں اسی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں لیکن لفظ " مکان " کا اطلاق معنوی مقامات کے معنی میں عام چیز ہے ۔ سورہ یوسف کی آیہ ۷۷ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہ جنہوں نے غلط کام انجام دیا تھا کہا :

انتم شر مکانا

تم مقام و منزلت کے لحاظ سے بدترین آدمی ہو ۔

بہرحال حضرت ادریسؑ خداوند تعالیٰ کے ایک بلند مقام اور عالی مرتبہ پیغمبر ہیں کہ جن کے حالات کی تفصیل نکات کے ضمن میں آئے گی۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اُن تمام افتخارات و اعزازات کو، جو گزشتہ آیات میں عظیم انبیاء کے سلسلے میں اور ان کی صفات و حالات اور ان نعمتوں کے بارے میں جو خداوند تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی تھیں، اجتماعی صورت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا : وہ ایسے انبیاء تھے کہ جنہیں خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا (اُولٰئک الذین انعم اللہ علیھم من النبیین)۔

ان میں سے بعض آدمؑ کی اولاد میں سے تھے اور بعض ان لوگوں کی اولاد میں سے تھے جو نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تھے اور بعض ابراہیم اور اسرائیل کی ذریت میں سے تھے۔

(من ذریۃ اٰدم وممن حملنا مع نوح ومن ذریۃ ابراھیم واسرائیل)۔

باوجود اس کے کہ یہ سب کے سب انبیاء آدمؑ کی اولاد سے تھے ان کی کسی نہ کسی بزرگ پیغمبر سے نزدیکی کو مدّنظر رکھتے ہوئے انہیں ذریۃ ابراہیم و اسرائیل سے یاد کیا ہے اور اس آیت کی ترتیب میں ذریت آدمؑ سے مراد ادریسؑ ہیں جو مشہور قول کے مطابق نوحؑ پیغمبر کے جدّ امجد تھے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کی اولاد سے مراد ابراہیمؑ ہیں کیونکہ ابراہیمؑ نوحؑ کے بیٹے سام کی اولاد میں سے تھے ۔

اور ذریت ابراہیمؑ سے مراد اسحٰقؑ، اسمٰعیلؑ اور یعقوبؑ ہیں اور اسرائیل کی ذریت سے مراد موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰ اور عیسیٰؑ ہیں۔ جن کے حالات اور بہت سی اعلیٰ صفات کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے ۔

اس کے بعد اس بحث کی ان عظیم انبیاء کے سچے پیروکاروں کی یاد سے تکمیل کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے : اور ان لوگوں میں سے کہ جنہیں ہم

نے ہدایت کی ہے اور انہیں منتخب کیا ہے ایسے لوگ ہیں کہ جب خدائے رحمٰن کی آیات اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ خاک پر گر پڑتے ہیں اور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلتا ہے (ومن هدينا واجتبينا اذا تتلى عليهم اٰيات الرحمٰن خروا سجدا و بكيا)۔[1]

بعض مفسرین نے "من هدينا واجتبينا ..." کے جملے کو انہی انبیاء کے بارے میں کہ جن کی طرف آیت کے آغاز میں اشارہ ہوا ہے ایک دوسرا بیان سمجھا ہے، لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔[2]

اس بات کی گواہ وہ حدیث ہے کہ جو امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تلاوت کے وقت فرمایا:

نحن عنينا بها

اس آیت سے مراد ہم اہل بیت ہیں۔[3]

ظاہر ہے کہ اس جملے سے ہرگز انحصار مراد نہیں ہے بلکہ یہ انبیاء کے سچے پیروکاروں کے واضح مصداق کا بیان ہے اور ہم نے اسی تفسیر نمونہ میں بارہا اس مطلب کے بہت سے نمونے پیش کیے ہیں۔

لیکن اس حقیقت پر توجہ نہ کرنا اس بات کا سبب بنا کہ آلوسی جیسے مفسرین روح المعانی میں اشتباہ کا شکار ہو گئے اور اس حدیث پر طعن کرنے لگے اور اسے احادیث شیعہ کے معتبر نہ ہونے کی دلیل سمجھ گئے۔ اور یہی نتیجہ ان روایات کے واقعی مفہوم سے واقف نہ ہونے کا ہے کہ جو آیات کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ: گزشتہ آیات میں حضرت مریمؑ کے بارے میں بھی گفتگو ہوئی ہے، حالانکہ وہ انبیاء میں سے نہیں تھیں وہ بھی اُن افراد میں سے ہیں کہ جو "من هدينا" کے جملے کا مصداق ہیں اور یہ جملہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ ایک یا کئی مصداق رکھتا تھا اور رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم سورہ نساء کی آیہ ۶۹ میں بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس میں خداوند تعالیٰ کی نعمتوں کو صرف انبیاء تک منحصر نہیں کیا گیا بلکہ صدیقین و شہداء کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے:

"فاولٰئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء"

سورہ مائدہ کی آیہ ۷۵ میں بھی حضرت عیسیٰؑ کی والدہ مریمؑ کو "صدیقہ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے:

وامه صديقة

اس کے بعد اُس گروہ کے بارے میں کہ جو انبیاء کے انسان ساز مکتب سے الگ ہو کر ناخلف پیروکار بن گئے گفتگو کی گئی ہے۔ قرآن ان کے کچھ بُرے اعمال کو شمار کرتا ہے اور کہتا ہے: ان کے بعد ایسی ناخلف اولاد ہوئی کہ جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا ــــــــــ

---

[1] "سجد" ساجد (سجدہ کرنے والا) کی جمع ہے اور "بکیا" باکی (گریہ کرنے والا) کی جمع ہے۔

[2] کیونکہ اگر یہ گزشتہ انبیاء کی طرف اشارہ ہو تو فعل مضارع "تتلی" جو آئندہ کے زمانہ کے ساتھ مربوط ہے سے ہم آہنگ نہیں ہوگا۔ سوائے اس صورت کے کہ "کانوا" یا اسی جیسا کوئی لفظ مقدر سمجھیں، جو کہ خلاف ظاہر ہے۔

[3] مجمع البیان، محل بحث آیہ کے ذیل میں۔

اورشہوات کی پیروی کرنے لگے یہ لوگ جلد ہی اپنی گمراہی کی سزا پالیں گے۔ (فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشہوات فسوف یلقون غیًّا)۔

"خلف" (بروزن برف) غیر صالح اولاد کے معنی میں ہے اور اصطلاحاً اس کو "ناخلف" کہتے ہیں جبکہ "خلَف" (بروزن صدف) نیک اور صالح فرزند کے معنی میں ہے۔

ممکن ہے یہ جملہ اُس گروہ کی طرف اشارہ ہو کہ جو بنی اسرائیل میں سے گمراہی کی راہ پر چل نکلا تھا۔ انہوں نے خدا کو بھلا دیا تھا، خواہشات کی پیروی کو ذکرِ خدا پر ترجیح دینے لگ گئے تھے۔ انہوں نے دنیا کو فساد سے بھر دیا اور آخر کار دنیا میں بھی انہوں نے اپنے بُرے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیا اور آخرت میں بھی ان کا نتیجہ دیکھیں گے۔

اس بارے میں کہ اس مقام پر "اضاعۂ صلاۃ" سے مراد نماز کو ترک کرنا ہے یا اُس کے وقت سے تاخیر کرنا ہے یا ایسے اعمال بجالانا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں نماز ضائع ہو جائے، مفسرین نے مختلف احتمال پیش کیے ہیں لیکن آخری معنی ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

اِس مقام پر تمام عبادات میں سے صرف نماز ہی کا ذکر کیوں کیا گیا؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نماز، جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسان کو گناہوں سے روکتی ہے۔ جب یہ رکاوٹ دُور ہو جاتی ہے تو اس کا قطعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خواہشات میں غرق ہو جاتا ہے۔

دُوسرے الفاظ میں جس طرح پیغمبروں نے اپنے مقام کے ارتقا کو یادِ خدا سے شروع کیا تھا اور جس وقت خدا کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو وہ خاک پر گر جاتے تھے اور گریہ کرتے تھے، ان ناخلف پیروکاروں نے اپنی تباہی کا آغاز یادِ خدا کو بھلا دینے سے کیا۔

٭ ٭ ٭

قرآن یہی چاہتا ہے کہ ایمان وحق کی طرف آنے کی راہ کھلی رکھے یہاں بھی ناخلف نسلوں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد قرآن اس طرح کہتا ہے: مگر وہ لوگ کہ جو توبہ کر لیں گے، ایمان لے آئیں گے اور عملِ صالح انجام دیں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا سا ظلم بھی نہ ہوگا:

(الا من تاب وآمن وعمل صالحا فاولٰئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون شیئًا)۔

اس بنا پر یہ بات نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص ایک دن خواہشات کی پیروی کر بیٹھے تو ہمیشہ کے لیے ہی اس کی پیشانی پر رحمتِ خدا سے مایوسی اور نااُمیدی کی مہر لگ جائے گی، بلکہ جب تک سانس باقی ہے اور انسان دنیا میں زندہ ہے اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

چند نکات:

ادریسؑ کون تھے؟

بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق ادریسؑ، نوحؑ کے پر دادا تھے ان کا نام توریت میں "اخنوخ" اور عربی میں ادریس ہے جسے بعض "درس" کے مادہ سے سمجھتے ہیں کیونکہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قلم کے ساتھ خط لکھا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے انسان کو لباس سینے کا طریقہ سکھایا۔

اس عظیم پیغمبر کے بارے میں قرآن میں صرف دو مرتبہ ، وہ بھی مختصر سے اشاروں کے ساتھ ، بیان آیا ہے ۔ ایک انہیں زیر بحث آیات میں اور دوسرا سورہ انبیاء کی آیات ۸۵ ۔ ۸۶ میں ۔ مختلف روایات میں ان کی زندگی کے بارے میں تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جسے ہم پورے کا پورا معتبر نہیں سمجھ سکتے ۔ اسی وجہ سے ہم مذکورہ اشارے پر قناعت کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کرتے ہیں ۔

❖ ❖ ❖

۲۔ ایک حدیث میں کہ جو علمائے اہل سنت کی بہت سی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے، یہ کہا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جب آیہ "فخلف من بعدھم خلف ..." کی تلاوت کی تو فرمایا :

یکون خلف من بعد ستین سنة اضاعوا الصلوٰة واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا ثم یکون خلف یقرؤن القراٰن لایعدوا تراقیھم ویقرء القراٰن ثلاثة مؤمن ومنافق وفاجر :

ساٹھ سال کے بعد ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو نماز کو ضائع کر دیں گے اور شہوات میں غرق ہو جائیں گے اور بہت جلدی اپنی گمراہی کا نتیجہ پا لیں گے ۔ ان کے بعد اور گروہ ظاہر ہوگا ۔ یہ لوگ قرآن کو (بڑی شان کے ساتھ) پڑھیں گے ۔ لیکن وہ ان کے شانوں سے اوپر نہ جائے گا ۔ کیونکہ نہ اس میں اخلاص ہوگا ، نہ غور و فکر ہوگا نہ عمل کرنے کے لیے سوچ بچار ہوگا بلکہ وہ ریاکاری اور دکھاوے کے طور پر ہوگا ۔ یا صرف الفاظ پر قناعت ہوگی اور اسی وجہ سے ان کے اعمال خدا کی بارگاہ میں نہ پہنچ پائیں گے[1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر ہم ساٹھ سال کی ابتداء پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت سے لیں تو یہ ٹھیک وہ زمانہ بنتا ہے کہ جب یزید تخت سلطنت پر بیٹھا ۔ اور سید الشہداء امام حسین علیہ السلام اور ان کے یار و انصار نے جام شہادت نوش فرمایا اور اس کے بعد باقی ماندہ زمانہ بنی امیہ اور بنی عباس کا دور ہے کہ جنہوں نے اسلام کے صرف نام پر قناعت کر لی تھی اور قرآن کے صرف الفاظ پر۔ ہم خدا سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہم اس قسم کے ناخلف گروہ میں سے ہوں ۔

۶۱۔ جَنّٰتِ عَدۡنِ ِۣالَّتِیۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ بِالۡغَيۡبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعۡدُهٗ مَاۡتِيًّا ○

۶۲۔ لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمۡ رِزۡقُهُمۡ فِيۡهَا بُكۡرَةً وَّعَشِيًّا ○

۶۳۔ تِلۡكَ الۡجَـنَّةُ الَّتِىۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ كَانَ تَقِيًّا ○

ترجمہ

۶۱۔ دائمی باغات ہیں جن کا خدائے رحمان نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے ۔ اگرچہ ان کو انہوں نے دیکھا نہیں ہے ، لیکن

[1] تفسیر المیزان ، جلد ۱۴ ، ص ۸۴ ۔

خدا کا وعدہ حتمی طور پر پورا ہو کر رہے گا۔

۶۲۔ وہ وہاں ہرگز لغو اور بے ہودہ گفتگو نہیں سنیں گے، اور سوائے سلام کے کوئی بات نہیں ہے، اور اس میں ہر صبح و شام ان کے لیے روزی مقرر ہے۔

۶۳۔ یہ وہی جنت ہے کہ جو ہم بطور میراث اپنے پرہیزگار بندوں کو دیں گے۔

تفسیر

جنت کی توصیف :

ان آیات میں جنت اور جنتوں کی تعریف و توصیف کی گئی ہے جس کا بیان آیات گزشتہ میں آیا ہے۔

پہلے بہشتِ موعود کی اس طرح توصیف کی گئی ہے: ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں کہ جن کا خدائے رحمٰن نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے اور انہوں نے انہیں دیکھا نہیں ہے، (لیکن ان پر ایمان رکھتے ہیں) (جنات عدن التی وعد الرحمٰن عبادہ بالغیب)۔

خدا کا وعدہ حتمی طور پر پورا ہو کر رہے گا (انہ کان وعدہ مأتیًا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں توبہ، ایمان اور عمل صالح کے بارے میں گفتگو تھی اور اس کے بعد بہشت کا وعدہ مفرد "جنت" کی صورت میں آیا تھا لیکن یہاں جمع "جنات" کی صورت میں ہے کیونکہ "جنت" درحقیقت بہت زیادہ پُرنعمت متعدد باغات کا مرکب ہے جو صالح مومنین کے لیے ہے۔

"عدن" کے ساتھ ان کی توصیف جو ہمیشگی اور جاودانی کے معنی میں ہے، اس امر کی دلیل ہے کہ "جنت" اس جہان کے باغات اور نعمتوں کی طرح نہیں ہے کہ جو زائل ہونے والی ہو کیونکہ جو چیز انسان کو اس جہان کی عظیم نعمتوں کے بارے میں پریشان کرتی ہے، یہ ہے کہ یہ سب آخر کار زوال پذیر ہیں لیکن "جنت" کی نعمتوں کے بارے میں یہ پریشانی نہیں ہے۔[1]

"عبادہ" کا لفظ خدا کے مومن بندوں کے معنی میں ہے نہ کہ تمام بندوں کے معنی میں اور "بالغیب" کی تعبیر جو اس کے بعد ہے اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ان کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں اس کے باوجود وہ ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ سورہ فجر کی آیہ ۳۰ میں بیان ہوا ہے:

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں وارد ہو۔

"بالغیب" کے معنی میں یہ احتمال بھی ہے کہ جنت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا۔ یہاں تک کہ کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئیں۔ اس کی نعمتیں کامل طور پر ہماری حس و ادراک سے غائب ہیں۔ وہ ایک ایسا جہان ہے جو اس جہان سے برتر، وسیع تر اور بالاتر ہے۔ اس کا ہم صرف روحانی آنکھ کے ساتھ دور سے ایک دھندلا سا تصور ہی کر سکتے ہیں۔

---

[1] "عدن": لغت کے لحاظ سے اقامت کے معنی میں ہے اور یہاں یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اس کے ساکن ہمیشہ اس میں مقیم رہیں گے۔

اس کے بعد بہشت کی عظیم نعمتوں میں سے ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : وہ وہاں کوئی لغو اور بیہودہ بات ہرگز نہیں سنیں گے (لا یسمعون فیھا لغوا)۔ نہ کوئی جھوٹ، نہ گالی گلوچ ، نہ تہمت، نہ زبان کے زخم، نہ کوئی تمسخر اور مذاق اڑانے کی بات یہاں تک کہ کوئی بیہودہ بات نہیں ہوگی۔

صرف ایک چیز جو وہاں ہمیشہ کان میں آتی رہے گی وہ سلام ہے (الّا سلاما)۔

سلام : اپنے وسیع معنی میں جو اہل بہشت کی روح، فکر، کردار اور گفتار کی سلامتی پر دلالت کرتا ہے۔

ایسا سلام کہ جس نے اس ماحول کو ایک بہشت بنا دیا ہے اور ہر قسم کی اذیت و تکلیف اُس سے ختم کر دی ہے۔

ایسا سلام جو امن و سلامتی کے ماحول کا ایک نمونہ اور صفا و صمیمیت ، پاکیزگی و تقویٰ، صلح و آشتی اور آرام و سکون کے ماحول کی ایک نشانی ہے۔

قرآن کی دوسری آیات میں بھی یہی حقیقت مختلف تعبیروں کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ سورہ زمر کی آیہ ۷۳ میں ہے :

"وقال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خٰلدین"

جنت کے خزینہ دار جنت میں داخل ہوتے وقت اُن سے کہیں گے : آپ پر سلام ہو، ہمیشہ خوش و خرم رہیں، پاک و پاکیزہ رہیں، آیئے تشریف لایئے، جنت میں داخل ہو جایئے اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں قیام فرمایئے۔

سورہ ق کی آیہ ۳۴ میں ہے :

ادخلوھا بسلام ذالك یوم الخلود

سلام و سلامتی کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤ۔ آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں داخلے کا دن ہے

نہ صرف فرشتے اُن پر اور وہ خود ایک دوسرے پر درود و سلام بھیجیں گے بلکہ خدا بھی ان پر درود و سلام بھیجے گا۔ جیسا کہ سورۂ یٰسین کی آیہ ۵۸ میں اُن پر سلام بھیج رہا ہے :

سلامٌ قولاً من رب رحیم

تم پر سلام ہو یہ مہربان پروردگار کی طرف سے تم بہشتیوں پر ایک سلام ہے۔

کیا سلام و سلامتی سے معمور اس ماحول سے بڑھ کر باصفا اور زیبا تر اور بھی کوئی ماحول ہے؟

اس نعمت کے بعد ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہر صبح و شام ان کی روزی بہشت میں ان کے لیے حاضر ہے۔ (ولھم رزقھم فیھا بکرۃ وعشیا)۔

اس جملے سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں :

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا جنت میں صبح و شام ہوتی ہے ؟

اس سوال کا جواب اسلامی روایات میں اس طرح آیا ہے :

اگرچہ بہشت میں ہمیشہ نور اور روشنی ہوتی ہے لیکن بہشتی اُس کے نور اور سائے کے کم و زیادہ

ہونے سے رات اور دن کی تشخیص کریں گے۔

دوسرا سوال : یہ ہے کہ آیاتِ قرآن سے صاف ظاہر ہے کہ اہلِ بہشت جس نعمت اور جس روزی کی خواہش کریں گے ہمیشہ اور ہر وقت اسے حاصل کر سکیں گے۔ یہ کونسا رزق ہوگا جو صرف صبح وشام انہیں ملے گا ؟

اس سوال کا جواب ایک لطیف حدیث سے کہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے، معلوم کیا جا سکتا ہے، جس میں آپ فرماتے ہیں :

وتعطیھم طرف الھدایا من اللہ لمواقیت الصلوٰة التی کانوا یصلون فیھا فی الدنیا۔

خداوند تعالیٰ کی طرف سے ایسے عمدہ عمدہ تحفے اور ہدیے انہیں اُن اوقات میں دیئے جائیں گے جن اوقات میں وہ دنیا میں نماز پڑھا کرتے تھے۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممتاز ہدیے جن کی ماہیت وحقیقت کو قیاس اور اندازے سے بھی بیان نہیں کیا جا سکتا، ایسی قیمتی نعمتیں ہوں گی جو جنّت کی عام نعمتوں کے علاوہ صبح وشام انہیں بطور ہدیہ دی جائیں گی۔

کیا مذکورہ بالا آیت کی تعبیر اور مذکورہ بالا حدیث اِس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ اہلِ بہشت کی زندگی ایک ہی طرز پر نہیں ہوگی بلکہ ہر روز اور ہر صبح وشام نئی نئی نعمتیں اور تازہ بہ تازہ لطف ان کے شاملِ حال ہوگا ؟

اور کیا اس بات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہاں انسان کا ارتقا جاری رہے گا۔ اگرچہ وہ وہاں کوئی نیا عمل بجا نہیں لائے گا لیکن اپنے عقائد واعمال کا جو مرکب اس نے اس جہان میں بنایا ہے اس کے ذریعے اپنی ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہے گا۔

جنّت اور اس کی مادی ورُوحانی نعمتوں کی اجمالی تعریف وتوصیف کے بعد، اہلِ جنّت کا ایک مختصر سے جملے میں تعارف کرواتے ہوئے قرآن کہتا ہے : یہ وہی جنّت ہے کہ جو ہم اپنے پرہیزگار بندوں کو میراث کے طور پر دیں گے (تلك الجنة التی نورث من عبادنا من کان تقیا)۔

گویا اتنی نعمتوں سے بھری جنّت کے دروازے کی کلید "تقویٰ" کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اگرچہ "عبادنا" (ہمارے بندوں) کی تعبیر میں ایمان وتقویٰ کی طرف خود ایک اجمالی اشارہ موجود ہے لیکن یہ ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں اجمالی اشارہ کو کافی سمجھ لیا جائے، بلکہ یہاں صراحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان ہونی چاہیئے کہ جنّت صرف پرہیزگاروں کی جگہ ہے۔

یہاں پھر لفظ "ارث" (میراث) کے ساتھ ہمیں سابقہ پڑتا ہے جو عام طور پر ایسے مال کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی سے اس کی موت کے بعد کسی دوسرے تک پہنچتا ہے، حالانکہ جنّت کسی کی ملکیت نہیں ہے اور ظاہری طور پر کسی سے کسی کو کچھ پہنچنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب دو طریقے سے دیا جا سکتا ہے :

۱۔ "ارث" لغت میں "تملیك" کے معنی میں آیا ہے اور مرنے والے کے مال کے اس کے پسماندگان کی طرف منتقل ہونے پر منحصر نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر رُوح المعانی، ج ۱۶، ص ۱۰۳۔

۲۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

ما من احد الا وله منزل فی الجنة ومنزل فی النار فاما الکافر فیرث المؤمن منزله من النار والمؤمن یرث الکافر منزله من الجنة :

"ہر شخص کا بلا استثنا ایک مکان جنت میں ہوتا ہے اور ایک مکان جہنم میں ہوتا ہے، کافر تو جہنم میں مومنوں کے مکان کے مالک بن جائیں گے اور مومن جنت میں کافروں کے مکان کے وارث ہو جائیں گے۔[1]

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "وراثت" جس معنی میں حدیث میں آیا ہے وہ نسبی تعلق کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ عقائد و عمل تقویٰ کے زیر اثر ہے۔

بعض مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کی جو شان نزول بیان کی ہے اُس سے بھی اسی معنی کی تصدیق ہوتی ہے کہ مشرکین میں سے ایک شخص نے جس کا نام "عاص بن وائل" تھا اپنے مزدور کی اُجرت (جو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان تھا) نہ دی اور طعنہ کے طور پر کہا : اگر وہ باتیں جو محمد کہتا ہے حق ہیں تو ہم ہر شخص سے زیادہ جنت کی نعمتوں کے حقدار ہیں وہاں اس مزدور کی مزدوری پُوری پُوری ادا کر دیں گے تو مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور کہا : "یہ جنت متقی بندوں کے لیے مخصوص ہے"۔

۶۴۔ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمۡرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡنَا وَمَا خَلۡفَنَا وَمَا بَيۡنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۚ

۶۵۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا فَاعۡبُدۡهُ وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۝

ترجمہ

۶۴۔ ہم تیرے پروردگار کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہوتے جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے وہ سب اسی کا ہے اور تیرا پروردگار بھولنے والا نہ تھا (اور نہ ہے)۔

۶۵۔ وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کا پروردگار ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت کرنے میں صبر سے کام لو۔ کیا اس کا کوئی مثل و مانند تمہیں مل سکتا ہے ؟

شانِ نزول :

بہت سے مفسرین مذکورہ بالا آیت کی شانِ نزول یہ بیان کرتے ہیں کہ چند دنوں تک وحی منقطع رہی اور خدائی وحی کا پیغام رساں جبرئیل

[1] نورالثقلین جلد ۳، ص ۳۱۱۔ اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۴ میں ص ۱۱۱ (اُردو ترجمہ) پر بھی بحث کر چکے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کے پاس نہ آیا۔ جب یہ مدت ختم ہوگئی اور جبرئیل پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوا، تو آپؐ نے اُس سے فرمایا : تُو نے دیر کیوں کر دی؟ مَیں تیرا بہت ہی مشتاق رہا۔ تو جبرئیل نے عرض کی، میں تو آپ سے بھی زیادہ مشتاق تھا۔ لیکن مَیں تو حکم کا پابند ہوں۔ جب مجھے حکم ملتا ہے مَیں تو اس وقت آتا ہوں اور جب مجھے کوئی حکم نہ ہو تو میں نہیں آتا۔[1]

تفسیر

ہم تو حکم کے بندے ہیں:

اگرچہ ان آیات کی ایک خاص شانِ نزول ہے جو اُوپر بیان ہوئی ہے، لیکن یہ اس بات سے مانع نہیں ہے کہ اس کا گزشتہ آیات کے ساتھ منطقی ربط و تعلق ہو۔ کیونکہ یہ اس بات پر ایک تاکید ہے کہ جبرئیل جو کچھ گزشتہ آیات میں لے کر آیا ہے وہ سب کا سب بے کم و کاست خدا کی طرف سے ہے اور کوئی بات اُس نے خود اپنی طرف سے نہیں کہی ہے۔ پہلی آیت قاصدِ وحی کی زبانی کہتی ہے: ہم تیرے پروردگار کے فرمان کے بغیر نازل نہیں ہوتے۔ (وما نتنزل الا بامر ربك)۔ سب کچھ اُسی کی طرف سے ہے، اور ہم تو جان و دل برکف بندے ہیں جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اسی کا ہے (له ما بين ايدينا وما خلفنا وما بين ذالك)۔

خلاصہ یہ ہے کہ آئندہ و گزشتہ اور زمانہ حال، یہاں اور وہاں اور سب جگہ، دنیا و آخرت و برزخ سب کچھ پروردگار کی ذاتِ پاک کے ساتھ متعلق ہے اور اسی کا ہے۔

اور یہ بھی جان لو کہ: "تمہارا پروردگار نہ فراموش کرنے والا تھا اور نہ ہے (وما كان ربك نسيًّا)۔

بعض مفسرین نے "له ما بين ايدينا وما خلفنا وما بين ذالك" کی متعدد تفسیریں کی ہیں جو تقریباً گیارہ تک پہنچ جاتی ہیں، لیکن جو کچھ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے وہ سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ سب تیرے پروردگار کے حکم سے ہے " جو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کا پروردگار ہے۔ (ربُّ السمٰوٰت والارض وما بينهما)۔

اب جبکہ یہ بات ہے اور تمام ہدایات اسی کی طرف سے ہیں " تو پھر صرف اسی کی عبادت کرو۔ (فاعبده)۔

ایسی عبادت کہ جو توحید و اخلاص کے ساتھ ہو، اور چونکہ اس راہ ــــ راہِ بندگی و اطاعت اور خدا کی خالص عبادت ــــ میں بہت زیادہ سختیاں اور مشکلات پیش آتی ہیں لہٰذا مزید ارشاد ہوتا ہے: اس کی عبادت کی راہ میں صابر رہ : (واصطبر لعبادته)۔

اور آخری جملے میں ہے : کیا تجھے خدا کا کوئی مثل و مانند نظر آتا ہے : (هل تعلم له سميًّا)۔

یہ جملہ درحقیقت اس بات پر ایک دلیل ہے جو اس سے پہلے جملے میں بیان ہوئی ہے، یعنی کیا اس کی پاک ذات کے لیے کوئی شریک اور

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۶، ص ۴۱۶۸ اور تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں (تھوڑے سے فرق کے ساتھ)۔

مثل و مانند ہے کہ جس کی طرف تم دستِ سوال دراز کرو اور اس کی عبادت کرو؟

لفظ "سمی" اگرچہ ہمنام کے معنی میں ہے لیکن یہ بات صاف طور پر واضح و روشن ہے کہ اس مقام پر صرف نام مراد نہیں ہے، بلکہ نام کا معنی و مفہوم مراد ہے، یعنی کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق، رازق، محیی، ممیت، ہر چیز کا عالم اور ہر چیز پر قادر تمہیں مل سکتا ہے؟

۶۶۔ وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ○

۶۷۔ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ○

۶۸۔ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ○

۶۹۔ ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ مِن كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ○

۷۰۔ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ○

ترجمہ

۶۶۔ انسان کہتا ہے کہ کیا میں مرنے کے بعد آئندہ (قبر سے) زندہ ہو کر باہر نکلوں گا؟

۶۷۔ کیا انسان اس بات کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس سے پہلے اُسے (اس حال میں) خلق کیا تھا جبکہ وہ کوئی چیز تھا ہی نہیں۔

۶۸۔ تیرے پروردگار کی قسم ہم ان سب کو اور شیاطین کو بھی ضرور ضرور زندہ کر کے اُٹھائیں گے۔ اس کے بعد ہم اُن سب کو جہنم کے گرداگرد گھٹنوں کے بل حاضر کریں گے۔

۶۹۔ پھر ہم ہر گروہ اور جماعت میں سے اُن لوگوں کو جو خدائے رحمٰن کے مقابل میں سب سے زیادہ سرکش تھے، الگ کر لیں گے۔

۷۰۔ پھر ہم اُن افراد کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو سب سے پہلے جہنم میں جلنے کے سزاوار ہیں۔ (اور ہم انہیں دوسروں کی نسبت پہلے سزا دیں گے)۔

شانِ نزول:

مفسرین کی ایک جماعت کے قول کے مطابق پہلی آیات "ابی بن خلف" یا "ولید بن مغیرہ" کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ایک بوسیدہ ہڈی کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے ہوئے تھے اور اسے اپنے ہاتھ سے رگڑ کر ہوا میں بکھیر رہے تھے تاکہ اس کا ہر ذرہ کسی نہ کسی گوشے میں بکھر جائے

وہ کہتے تھے کہ محمد کی طرف دیکھو جس کا گمان یہ ہے کہ خدا ہمیں مرنے اور اس ہڈی کی طرح ہماری ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہ بات قطعاً ممکن نہیں ہے۔

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور انہیں دندان شکن جواب دیا، ایسا جواب جو تمام انسانوں کے لیے ہر قرن اور ہر زمانے میں مفید اور سبق آموز ہے۔

تفسیر

دوزخیوں کی کچھ توصیف:

گزشتہ آیات میں قیامت اور بہشت و دوزخ کے بارے میں بحث ہوئی تھی۔ زیر بحث آیات بھی اسی بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔

پہلی آیت میں قیامت کا انکار کرنے والوں کی گفتگو کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے: انسان کہتا ہے کہ کیا مرنے کے بعد آئندہ زمانے میں قبر سے زندہ ہو کر باہر نکلوں گا (ویقول الانسان ءاذا مامت لسوف اخرج حیًّا)۔

البتہ یہ استفہام ایک استفہام انکاری ہے یعنی ایسی بات ممکن نہیں ہے لیکن "انسان" کے ساتھ تعبیر (خصوصاً الف اور لام کہ جو جنس کے طور پر آتے ہیں) جبکہ مناسب یہ تھا کہ اس کی بجائے "کافر" کہا جاتا۔ یہ بات شاید اس وجہ سے ہو کہ ابتدا میں یہ سوال کم و بیش ہر انسان کی طبیعت میں مخفی ہوتا ہے اور (موت کے بعد زندہ ہونے) کو سنتے ہی فوراً استفہامی علامت اُس کے ذہن میں اُبھر آتی ہے؟

٭ ٭ ٭

بلا فاصلہ اسی لب و لہجے اور اُسی تعبیر کے ساتھ اُسے جواب دیا گیا ہے: کیا انسان اس حقیقت کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس سے پہلے اُسے (اس حال میں) پیدا کیا تھا جبکہ وہ مطلقاً کوئی چیز ہی نہیں تھا (اولا یذکر الانسان انا خلقناہ من قبل و لم یک شیئًا)۔

یہاں بھی "الانسان" کی تعبیر ممکن ہے، اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ انسان کو اس خداداد استعداد اور ہوش و حواس کے ساتھ ایسے سوال کے جواب میں خاموش ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیئے، بلکہ اُسے چاہیئے کہ وہ اپنی پہلی خلقت کو یاد کر کے خود اس کا جواب دے، ورنہ اُس نے اپنی "انسانیت" کی حقیقت کو استعمال نہیں کیا۔

یہ آیات بھی معاد سے مربوط بہت سی دوسری آیات کی طرح معادِ جسمانی کو ثابت کر رہی ہیں۔ ورنہ اگر یہ بنا ہوتی کہ صرف رُوح باقی ہے اور جسم کا دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا مطلوب نہ ہوتا تو پھر نہ اس سوال کا کوئی موقع تھا نہ اس جواب کا۔

بہرحال قرآن نے معاد کو ثابت کرنے کے لیے جو دلیل اس مقام پر دی ہے، یہی دلیل قرآن میں دوسرے مواقع پر بھی بیان ہوئی ہے اُن میں سے ایک سورۂ یٰس میں ہے:

اولم یر الانسان انا خلقناہ من نطفة فاذا هو خصیم مبین و ضرب لنا مثلا و نسی خلقه قال من یحی العظام و هی رمیم قل یحییها الذی

انشأها اول مرة وهو بكل خلق عليم

کیا انسان یہ نہیں سوچتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے پھر یہ ناچیز نطفہ اپنے دفاع میں بولنے والے انسان کی شکل میں بدل گیا لیکن اس انسان نے اس حالت کے باوجود ہمارے لیے ایک مثال پیش کی اور اپنی پیدائش کو بالکل ہی بھول گیا، اس نے کہا کہ : ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون دوبارہ زندہ کرے گا تم کہہ دو کہ انہیں وہی خدا زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ اپنی تمام مخلوقات کا علم رکھتا ہے۔ (یٰس - ۷۷ تا ۷۹) [1]

بعض مفسرین نے اس مقام پر ایک سوال اٹھایا ہے کہ اگر یہ دلیل درست ہو کہ جس شخص نے کوئی کام انجام دیا ہو وہ اُسی جیسا اور کام بھی کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو پھر ہم کچھ کاموں کو انجام دینے کے بعد انہی جیسے کاموں کو دوبارہ کرنے پر قادر کیوں نہیں ہوتے ؟ مثلاً ہم بعض اوقات بہت عمدہ شعر کہہ لیتے ہیں یا بہت خوشخط لکھ لیتے ہیں لیکن بعد میں بہت کوشش کے باوجود ویسا کام نہیں کر سکتے ۔

اس سوال پر ہمارا جواب یہ ہے کہ صحیح ہے کہ ہم اپنے اعمال اپنے ارادہ و اختیار سے انجام دیتے ہیں لیکن بعض اوقات غیر اختیاری امور کا ایک سلسلہ ہمارے بعض افعال کی خصوصیات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کبھی ہمارے ہاتھوں کی غیر محسوس لرزش حروف کی دقیق شکل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ہماری قدرت و استعداد ہمیشہ ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کبھی ایسے عوامل پیدا ہو جاتے ہیں کہ جو ہمارے تمام اندرونی قویٰ کو اکٹھا کر دیتے ہیں جس سے ہم ایک شاہکار پیدا کر سکتے ہیں لیکن بعض اوقات عوامل محرکہ کمزور ہوتے ہیں اور ہمارے تمام قویٰ مجتمع نہیں ہو پاتے اور اسی بنا پر دوسری مرتبہ کیا ہوا کام پہلی مرتبہ کیے ہوئے کام جتنا اچھا نہیں ہوتا۔

لیکن وہ خدا جس کی قدرت کی کوئی حد نہیں ہے اُس کے لیے اس قسم کے مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ وہ جو کام بھی انجام دے بالکل اسی جیسا بے کم و کاست دوبارہ سرانجام دے سکتا ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں منکرین معاد اور بے ایمان گنہگاروں کو انتہائی یقینی انداز میں تہدید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : تیرے پروردگار کی قسم ہم ان سب کو اُن شیاطین کے ساتھ کہ جو انہیں وسوسہ میں ڈالتے تھے یا اُن کے معبود تھے، سب کو محشور کریں گے (فو ربك لنحشرنهم والشياطين)۔

پھر ہم اُن سب کو جہنم کے گرداگرد گھٹنوں کے بل حاضر کریں گے : (ثم لنحضرنهم حول جهنم جثيا)۔

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بے ایمان اور گنہگار لوگوں کی دادگاہ جہنم کے نزدیک ہے۔

"جثیا" کی تعبیر (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "جثی" جاثی کی جمع، اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جو گھٹنوں کے بل بیٹھا ہو) شاید یہ ان کے ضعف و ناتوانی اور ذلت و خواری کی طرف اشارہ ہو۔ گویا اُن میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ پاؤں پر کھڑے

---

[1] ہم اس دلیل کے سلسلے میں تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد میں ـــــ (اُردو ترجمہ) "معاد کی مختصر ترین دلیل" کے حوالے سے بحث کر چکے ہیں (اور اسی طرح تفسیر نمونہ کی تیسری جلد کے ـــــ (اُردو ترجمہ) سے آگے بھی۔

ہو سکیں ۔ البتہ اس لفظ کے اور معانی بھی ہیں ۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ بعض نے "جثی" کو "گروہ گروہ" کے معنی میں تفسیر کیا ہے لؤ بعض نے انبوہ اور ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے مثلاً مٹی اور پتھروں کے معنی میں، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب اور زیادہ مشہور ہے ۔

* * *

اس دادگاہِ عدل میں چونکہ اولیت کا لحاظ رکھا جائے گا ، لہٰذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : ہم سب سے پہلے اُن لوگوں کو گرفت میں لیں گے جو سب سے زیادہ سرکش اور سب سے بڑھ کر باغی ہیں ۔ " ہم ہر گروہ اور جماعت میں سے ایسے افراد کو کہ جو خدائے رحمٰن کے سامنے سب سے زیادہ سرکش ہوں گے علیحدہ کرلیں گے " (ثم لننزعن من کل شیعة ایھم اشد علی الرحمٰن عتیا) ۔ لہ

وہی بے شرم لوگ کہ جنہوں نے خدائے رحمٰن کی نعمتوں تک کو بھلا دیا اور اپنے ولی نعمت کے مقابلے میں گستاخی ، نافرمانی اور طغیان و سرکشی پر اُتر آئے ۔ ہاں ! ہاں ! یہی لوگ سب سے زیادہ جہنم کے سزاوار ہیں ۔

* * *

پھر اسی معنی کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے : ہم اُن لوگوں سے کہ جو جہنم کی آگ میں جلنے کے لیے اول نمبر پر ہیں ، اچھی طرح آگاہ ہیں ۔ (ثم لنحن اعلم بالذین ھم اولٰی بھا صلیا) ۔

ہم انہیں انتہائی دقتِ نظر کے ساتھ چھانٹ کر نکال لیں گے اور اس میں کسی قسم کی غلطی یا اشتباہ نہیں ہوگا ۔

" صلی " مصدر ہے کہ جو آگ روشن کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس چیز کے معنی میں بھی کہ جسے آگ میں جلاتے ہیں ۔

* * *

۷۱ ۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ○

۷۲ ۔ ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ○

ترجمہ

۷۱ ۔ اور تم سب کے سب (بلا استثنا) جہنم میں جاؤ گے یہ تیرے پروردگار کا حتمی امر اور قطعی فیصلہ ہے ۔

۷۲ ۔ پھر ہم ان لوگوں کو جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے رہائی بخشیں گے اور ظالموں کو اسی میں رہنے دیں گے جبکہ وہ (کمزوری اور ذلت کے باعث) گھٹنوں کے بل کھڑے ہوں گے ۔

لہ لفظ " شیعہ " اصل لغت میں اس گروہ کے معنی میں ہے کہ جو کسی کام کی انجام دہی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور مذکورہ بالا آیت میں اس تعبیر کا انتخاب ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ بے ایمان اور گمراہ لوگ طغیان و سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا کرتے تھے اور ہم پہلے اسی گروہ کا حساب لیں گے کہ جو سب سے زیادہ سرکش تھے ۔

تفسیر

کیا سب جہنم میں جائیں گے ؟

مذکورہ بالا آیات بھی قیامت کی خصوصیات اور جزا و سزا کے بارے میں ہیں۔ پہلے تو ایک ایسے مطلب کی طرف کہ جس کا سننا شاید اکثر لوگوں کے لیے حیرت انگیز ہو اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : تم سب کے سب بلا استثنا جہنم میں جاؤگے (وان منکم الا واردھا)۔

یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک حتمی امر ہے اور ایک قطعی فیصلہ ہے : (کان علی ربك حتما مقضیا)۔

پھر ہم اُن لوگوں کو کہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا نجات دے دیں گے اور ظالموں اور ستمگروں کو جبکہ وہ کمزوری اور ذلت کی وجہ سے گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے اسی میں رہنے دیں گے۔ (ثم ننجی الذین اتقوا ونذر الظالمین فیھا جثیا)۔

ان دونوں آیات کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان ایک بہت بڑی بحث ہے۔ اس بحث کی بنیاد یہ ہے کہ "ان منکم الا واردھا" کے جملے میں "ورود" سے کیا مراد ہے ؟

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "ورود" اس مقام پر نزدیک ہونے اور جھانکنے کے معنی میں ہے۔ یعنی تمام لوگ، اچھے اور بُرے بلا استثنا حساب کتاب کے لیے یا بدکاروں کے آخری انجام کا مشاہدہ کرنے کے لیے جہنم کے نزدیک آئیں گے، اس کے بعد خدا پرہیزگاروں کو نجات بخشے گا اور ستمگروں کو اسی میں چھوڑ دے گا۔

وہ اس تفسیر کے لیے سورۂ قصص آیہ ۲۳ : ولما ورد ماء مدین .... "جس وقت موسیٰ مدین کے پانی کے پاس پہنچے ..." سے استدلال کرتے ہیں کہ یہاں بھی "ورود" اسی معنی میں ہے۔

دوسری تفسیر کہ جسے اکثر مفسرین نے انتخاب کیا ہے یہ ہے کہ "ورود" اس مقام پر دخول کے معنی میں ہے، اور اس طرح تمام انسان نیک و بد، بلا استثنا جہنم میں وارد ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ دوزخ نیک لوگوں پر سرد و سالم رہے گی، جیسا کہ نمرود کی آگ ابراہیم پر سرد و سالم رہی :

(یا نار کونی بردًا و سلامًا علیٰ ابراھیم)۔

کیونکہ آگ کا ان سے کوئی میل نہیں، اس لیے اُن سے دُور ہو جائے گی اور فرار کرے گی، اور جس جگہ وہ ٹھہریں گے وہاں خاموش ہو جائے گی لیکن دوزخی چونکہ جہنم کی آگ کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں لہٰذا قابل اشتعال مادہ کی طرح جب وہ آگ کے قریب پہنچیں گے تو وہ فوراً بھڑک اٹھیں گے۔

اس بات سے قطع نظر کہ اس کام کا فلسفہ کیا ہے (جس کی ہم انشاء اللہ آگے چل کر تشریح کریں گے) بلاشک مذکورہ بالا آیت کا ظاہر دوسری تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ ہے، کیونکہ ورود کا اصلی معنی دخول ہی ہے اور اس کے علاوہ معنی مراد لینے کے لیے قرینہ کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ ثم ننجی الذین اتقوا "پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے" کا جملہ اسی طرح نذر الظالمین فیھا "ستمگروں کو ہم اسی میں رہنے دیں گے" کا جملہ یہ سب اسی معنی کے شاہد ہیں۔

اس کے علاوہ اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں بہت سی روایات بھی ہیں جو مکمل طور پر اسی معنی کی تائید کرتی ہیں۔

اُن میں سے ایک روایت جابر بن عبداللہ انصاری سے اس طرح نقل ہوئی ہے کہ ایک شخص نے اُن سے اس آیت کے بارے میں پوچھا، تو جابر نے اپنی دونوں انگلیوں کے ساتھ اپنے دونوں کانوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ میں نے جو مطلب اپنے ان دونوں کانوں سے جناب پیغمبرؐ سے سنا ہے اگر جھوٹ بولوں تو یہ دونوں بہرے ہو جائیں، آپؐ فرماتے تھے :

الورود الدخول، لایبقی برّ ولا فاجر لا یدخلھا فیکون علی المؤمنین برداً وسلاماً کما کانت علی ابراھیم حتّٰی ان للنار ـــ اوقال لجھنم ـــ ضجیجاً من بردھا، ثم ننجی اللہ الذین اتقوا ونذر الظالمین فیھا جثیاً :

ورود یہاں دخول کے معنی میں ہے، کوئی نیکوکار یا بدکار نہیں مگر یہ کہ وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ آگ مومنین کے لیے سرد و سالم ہو جائے گی، جیسا کہ ابراہیم کے لیے ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ "آگ" یا "جہنم" (یہاں خود جابر کو لفظ کے بارے میں تردد ہوا ہے) سردی کی شدت سے فریاد کرے گی، پھر خدا پرہیزگاروں کو رہائی بخشے گا اور ظالموں کو ذلت کے ساتھ اسی میں چھوڑ دیگا۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

"تقول النار للمؤمن یوم القیامۃ جز، یا مؤمن! فقد اطفأ نورک لھبی" :

"روزِ قیامت آگ مومن سے کہے گی، مجھ سے جلدی گزر جا، کہ تیرے نور نے میرے شعلے کو بجھا دیا ہے۔"[2]

بعض دیگر روایات سے بھی اس معنی کی تصدیق ہوتی ہے۔

پل صراط کے بارے میں جو پُرمعنی تعبیر روایات میں بیان کی گئی ہے کہ وہ جہنم کے اُوپر واقع ہے، بال سے زیادہ باریک ہے اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، اس تفسیر کا ایک دوسرا شاہد اور گواہ ہے۔[3]

رہ گئی یہ بات جو بعض کہتے ہیں کہ سورۂ انبیاء کی آیہ ۱۰۱ پہلی تفسیر پر دلالت کرتی ہے۔ آیت یہ ہے :

اُولٰئک عنھا مبعدون

وہ (مومنین) جہنم کی آگ سے دُور ہوں گے۔

یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ یہ آیت تو مومنین کی دائمی جگہ اور ابدی مقام کے بارے میں بیان کر رہی ہے، یہاں تک کہ ہم اس سے بعد والی آیت میں یہ پڑھتے ہیں کہ :

لا یسمعون حسیسھا

[1، 2] نور الثقلین، جلد ۳، ص ۳۵۲ - ۳۵۳

[3] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۷۲۔ آیہ "ان ربک لبالمرصاد" (فجر-۱۴) کے ذیل میں۔

مومنین آگ کے شعلوں کی آواز تک بھی نہیں سنیں گے۔

اگر زیر بحث آیت میں " ورود " نزدیک ہونے کے معنی میں ہو تو نہ لفظ مبعدون کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور نہ ہی " لا یسمعون حسیسھا " کے جملہ کے ساتھ۔

❖ ❖ ❖

ایک سوال کا جواب

صرف ایک سوال جو یہاں باقی رہ جاتا ہے یہ ہے کہ پروردگار کی حکمت کے لحاظ سے اس کام کا فلسفہ کیا ہے ؟ اس کے علاوہ کیا مومنین کو اس کام سے کوئی تکلیف اور عذاب نہیں پہنچے گا ؟

اس سوال کا جواب جو دونوں پہلوؤں سے اسلامی روایات میں آیا ہے، معمولی سے غور کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔

حقیقت میں دوزخ اور اس کے عذابوں کا مشاہدہ اس بات کے لیے ایک مقدمہ ہو گا کہ مومنین جنّت کی خداداد نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کریں کیونکہ " عافیت کی قدر اسی کو ہوتی ہے جو کسی مصیبت میں گرفتار ہوا ہو " (وبا لاضداد تعرف الاشیاء)

یہاں مومنین مصیبت میں گرفتار نہیں ہوں گے بلکہ صرف مصیبت کا منظر دیکھیں گے اور جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا روایات میں پڑھا ہے، آگ اُن پر سرد و سالم ہو جائے گی اور ان کا نُور آگ کے شعلوں پر غالب آجائے اور ان کو ماند کر دے گا۔

اس کے علاوہ وہ آگ سے اتنی تیزی کے ساتھ گزریں گے کہ ان پر معمولی سا اثر بھی نہ ہو گا، جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبرؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

> یرد الناس النار ثم یصدرون باعمالھم فاولھم کلمع البرق ثم کمر الریح، ثم کحضر الفرس، ثم کالراکب، ثم کشد الرجل ثم کمشیہ :
>
> " سب کے سب لوگ جہنم کی آگ میں جائیں گے ، اس کے بعد اپنے اعمال کے مطابق اس سے باہر نکلیں گے ، بعض بجلی کے کوندنے (چمکنے) کی طرح ان کے بعد اُن سے کم درجے والے تیز آندھی کی طرح ، بعض گھوڑے کے تیز دوڑنے کی طرح ، بعض معمولی سوار کی طرح ، بعض تیز رو پیدل چلنے والے کی طرح ، اور بعض معمولی رفتار سے چلنے والوں کی طرح "۔ [1]

علاوہ ازیں دوزخی بھی اس منظر کے مشاہدہ سے کہ بہشتی اتنی تیزی کے ساتھ گزر رہے ہیں اور وہ اسی میں رہیں گے مذیادہ سزا اور تکلیف محسوس کریں گے اور اس طرح سے دونوں سوالات کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

۷۳۔ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا ۙ

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۳۵۳۔

أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا ○

۷۴۔ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا ○

۷۵۔ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَٰنُ مَدًّا ۚ حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضْعَفُ جُنْدًا ○

۷۶۔ وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَرَدًّا ○

ترجمہ

۷۳۔ اور جس وقت ہماری واضح آیات اُنہیں سنائی جاتی ہیں تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں (ہم اور تم) میں سے کونسا گروہ مرتبہ و مقام کے لحاظ سے بہتر ہے اور کس کی محبت و مشاورت کی محفلوں کی سج دھج بہتر ہے اور کس کی سخاوت بڑھ کر ہے۔

۷۴۔ ہم نے اُن سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کیا ہے کہ جن کا مال و ثروت بھی ان سے زیادہ تھا اور ظاہری سج دھج میں بھی جو ان سے زیادہ تھے۔

۷۵۔ تم کہہ دو کہ جو شخص گمراہی میں ہے خدا اُسے اس وقت تک مہلت دیتا ہے کہ وہ اس چیز کو اپنی آنکھ سے خود دیکھ لے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور وہ ہے اسی دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب۔ وہ ایسا دن ہو گا کہ جب وہ یہ جان لیں گے کہ کس شخص کا مقام زیادہ بُرا ہے اور کس کا لشکر زیادہ کمزور ہے؟

۷۶۔ لیکن جن لوگوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی خداوند تعالیٰ ان کی ہدایت کو اور بڑھا دیتا ہے، وہ آثار و اعمالِ صالح جو انسان سے باقی رہ جاتے ہیں تیرے پروردگار کی بارگاہ میں ان کا ثواب اچھا اور انجام زیادہ قدر و قیمت والا ہے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں بے ایمان ظالموں کے بارے میں بحث تھی۔ زیر بحث آیات میں ان کی منطق اور انجام کے ایک گوشہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ پہلا گروہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا تھا، ایسے پاک دل مستضعفین کا تھا جن کا ہاتھ دنیا کے مال و منال سے خالی تھا۔ وہی مظلوم و محروم لوگوں کا گروہ جن کی ظالموں اور ستمگروں کے ہاتھوں سے نجات کی خاطر ادیانِ الٰہی آئے۔ بلندہمت اور صاحبانِ ایمان مرد اور عورتیں جیسے بلال، سلمان، عمار، خباب، سمیہ وغیرہ۔

چونکہ اُس زمانے کے جاہلانہ معاشرے میں ــــ ہر دوسرے جاہلانہ معاشرے کی طرح ــــ قدر و قیمت کا معیار وہی زر و زیور، دولت و ثروت، مقام و منصب اور ظاہری ہیئت تھی لہٰذا نضر بن حارث اور اُسی جیسے ستمگار ثروت مند لوگ غریب و فقیر مومنین پر فخر و ناز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ ہماری حیثیت اور شخصیت کی نشانی تو ہمارے ساتھ موجود ہے اور تمہاری کوئی حیثیت و شخصیت نہ ہونے کی نشانی وہی تمہارا فقر و فاقہ اور تمہاری محرومیت ہے۔

وہ کہتے تھے کہ یہی بات خود ہماری حقانیت اور تمہارے حق پر نہ ہونے کی دلیل ہے۔

جیسا کہ قرآن پہلی زیر بحث آیت میں کہتا ہے: جس وقت ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو مغرور و ستمگر کافر مومنوں سے کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں (ہم اور تم) میں سے کونسا گروہ مرتبہ و مقام کے لحاظ سے بہتر ہے، اور کس کی مجلس و مشاورت کی محفلیں سج دھج میں بہتر ہیں اور کس کی سخاوت زیادہ ہے: (واذا تتلی علیهم اٰیاتنا بیّنات قال الذین کفروا للذین اٰمنوا ای الفریقین خیر مقاماً واحسن ندیّا)۔

خصوصاً اسلامی روایات میں منقول ہے کہ یہ سرمایہ دار نہایت خوبصورت لباس پہن کر اور خوب سج دھج کر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے آگے چلتے تھے اور حقارت اور تمسخر آمیز نگاہ سے ان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔

جی ہاں! ہر زمانے میں اس طبقے کا یہی چلن رہا ہے۔

"ندی" اصل میں "ندی" بمعنی رطوبت سے لیا گیا ہے اور بعد ازاں فصیح اور سخنور لوگوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ کلام کرنے کے لیے لعاب دہن کا کافی مقدار میں ہونا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا "ندا" آپس میں بیٹھ کر باتیں کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ جس محفل میں کچھ لوگ باہمی محبت کے طور پر جمع ہوں یا مشاورت کے لیے مل بیٹھیں اسے "نادی" کہا جانے لگا۔

مکہ میں ایک جگہ تھی جہاں سرداران مکہ جمع ہوتے تھے اور مشورے کرتے تھے اسے "دار الندوہ" کہتے تھے۔ یہ لفظ بھی اسی مفہوم میں لیا گیا ہے۔

ضمنی طور پر کبھی سخاوت و بخشش کو "ندی" سے تعبیر کرتے ہیں۔[1]

مذکورہ بالا آیت ممکن ہے کہ ان سب کی طرف اشارہ ہو یعنی ہماری گرمجوشی کی محفل میں تمہاری نسبت زیادہ دلکشی ہے، اور ہماری دولت و ثروت، شان و شوکت اور ہمارے لباس تم سے زیادہ جاذب نظر ہیں اور ہماری گفتگو اور فصیح و بلیغ اشعار تم سے کہیں بہتر ہیں۔

❖ ❖ ❖

لیکن قرآن انہیں ایک بہت مدلل، قاطع اور خاموش کر دینے والا جواب دیتا ہے: گویا انہوں نے بشر کی گزشتہ تاریخ کو بھلا دیا ہے

---

[1] مفردات راغب مادہ "ندی"۔

"اُن سے پہلے بے شمار قومیں ایسی تھیں کہ جن کا مال و دولت اور وسائل زندگی ان سے بہتر تھے اور وہ لوگ ظاہری شان و شوکت کے اعتبار سے بھی ان سے زیادہ آراستہ و پیراستہ تھے لیکن ہم نے ان ستم کاروں اور ظالموں کو نابود کر دیا" (وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَرِءْيًا)[1]

کیا ان کا مال و دولت، ان کی زرق برق مخملیں، ان کے فاخرہ لباس اور خوبصورت چہرے اُن سے خدا کے عذاب کو روک سکتے ہیں، اگر یہ چیزیں بارگاہِ خدا میں ان کی حیثیت اور مقام کی دلیل تھیں تو پھر وہ ایسے بُرے انجام سے کیوں دوچار ہوئے۔ دنیا کی شان و شوکت ایسی ناپائیدار ہے کہ ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے نہ صرف اس کا دفتر الٹ جاتا ہے بلکہ کبھی اس کا طومار ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔

"قرن" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی (تفسیر نمونہ جلد ۳، ص ۲۸۴ (اُردو ترجمہ) پر) بیان کیا ہے، عام طور پر ایک طولانی زمانہ کے معنی میں ہے۔ لیکن چونکہ "اقتران" کے مادہ سے (نزدیکی کے معنی میں) لیا گیا ہے، لہٰذا ایسی قوم و جمعیت جو ایک ہی زمانہ میں جمع ہو، کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد قرآن انہیں ایک اور تنبیہ کرتا ہے کہ تم اُن سے یہ کہہ دو کہ اسے بے ایمان ظالمو! تم یہ گمان نہ کر لینا کہ یہ تمہارا مال و دولت مایۂ رحمت ہے، بلکہ اکثر اوقات یہ عذاب الٰہی کی دلیل ہوتا ہے۔ "جو شخص گمراہی میں مبتلا ہے اور اسی راستے پر چلتے رہنے پر مُصر ہے، خدا اسے مہلت دیتا ہے اور یہ خوشحال زندگی اسی طرح جاری و ساری رہتی ہے": (قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا)۔

"(یہ مہلت) اُس زمانے تک (ہوگی) کہ یہ خود اپنی آنکھوں سے خدا کے وعدوں کو دیکھ لیں، اس دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب" (حَتّٰى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ)۔

"اُس دن انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کی جگہ اور محفل زیادہ بری ہے"

اور کس کا لشکر زیادہ کمزور ہے" (فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا)۔

درحقیقت اس قسم کے منحرف افراد کہ جو پھر ہدایت کے قابل نہیں ہیں، اس بات پر توجہ رکھیں کہ قرآن "مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ" کہتا ہے جو گمراہی میں استمرار کی طرف اشارہ ہے۔۔۔ اس نقطۂ نظر سے کہ وہ خدا کا دردناک ترین عذاب دیکھیں، بعض اوقات خدا انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیتا ہے، جو ان کے لیے غرور و غفلت کا سبب بھی بن جاتی ہیں اور عذاب الٰہی اُن نعمتوں کے سلب ہونے کو اور بھی زیادہ دردناک بنا دیتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو بعض قرآنی آیات میں تدریجی سزا کے عنوان سے بیان کی گئی ہے۔[2]

"فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا" کا جملہ اگرچہ صیغۂ امر کی صورت میں ہے لیکن یہ خبر کے معنی میں ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا انہیں مہلت اور پے در پے نعمتیں عطا کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے اسے اسی امر کے معنی میں لیا ہے جو یہاں نفرین کے مفہوم میں ہے یا خدا پر اس قسم کا سلوک کرنے کے لازم ہونے

---

[1] "اثاث" مال و متاع اور زینت دنیا کے معنی میں ہے اور "رِءْيًا" ہیئت و منظر کے معنی میں ہے۔

[2] تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد میں سورۂ "اعراف" کی آیات ۱۸۲، ۱۸۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔

کے معنی میں ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں "عذاب" کا لفظ اس قرینہ کی بنا پر کہ وہ "الساعة" کے مقابلہ میں آیا ہے، عالم دنیا میں خدا کے عذابوں کی طرف اشارہ ہے، ایسے عذاب جیسے طوفانِ نوح، زلزلہ اور آسمانی پتھر جو قوم لوط پر نازل ہوئے یا ایسے عذاب جو مومنین اور حق کے مورچوں میں جہاد کرنے والوں کے ذریعہ ان کے سروں پر نازل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیہ ۱۴ میں بیان ہوا ہے:

قاتلوهم يعذبهم الله بايديكم:

اُن سے جنگ کرو کیونکہ خدا تمہارے ہاتھوں سے ان پر عذاب کرے گا۔

"الساعة" یہاں یا تو اختتامِ دنیا کے معنی میں ہے یا قیامت میں خدائی عذابوں کے معنی میں (دوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے)۔

* * *

یہ ستمگروں اور دنیا کی شان و شوکت اور لذت کے شیدائیوں کا انجام ہے۔ لیکن جن لوگوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی خدا ان کی ہدایت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے (ويزيد الله الذين اهتدوا هدى)۔

یہ بات واضح ہے کہ ہدایت کے کئی درجے ہوتے ہیں، جس وقت انسان اُس کے ابتدائی درجوں کو خود سے طے کر لیتا ہے تو خدا اُس کی مدد فرماتا ہے اور اسے اعلیٰ سے اعلیٰ درجوں پر فائز کر دیتا ہے اور پھلدار درختوں کی مانند جو ہر روز اپنے ارتقاء کا ایک نیا مرحلہ طے کرتے ہیں، یہ ہدایت پانے والے بھی اپنے ایمان اور اعمالِ صالح کے مطابق ہر روز ایک اونچے سے اونچے مرحلہ میں قدم رکھتے چلے جاتے ہیں۔

آیت کے آخر میں اُن لوگوں کو کہ جنہوں نے دنیا میں ناپائیدار زیب و زینت پر بھروسہ کر لیا تھا اور ان کے ذریعہ دوسروں پر فخر کیا کرتے تھے قرآن یہ جواب دیتا ہے: وہ آثار و اعمالِ صالح جو انسان سے باقی رہ جاتے ہیں تیرے پروردگار کی بارگاہ میں ان کا ثواب بہتر اور ان کا انجام زیادہ قیمتی ہے (والباقيات الصالحات خير عند ربك ثوابا وخير مردا)[1]۔

* * *

۷۷۔ اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝

۷۸۔ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝

۷۹۔ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝

۸۰۔ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ۝

۸۱۔ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝

---

[1] "مرد" (بروزن نمد) دال کی تشدید کے ساتھ یا تو مصدر ہے رد اور بازگشت کے معنی میں، یا اسم مکان ہے (مقامِ بازگشت کے معنی میں کہ جس سے یہاں جنت مقصود ہے، لیکن پہلا احتمال آیت کے معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۸۲۔ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝

ترجمہ

۷۷۔ کیا تُو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا کہ جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور یہ کہا کہ مجھے تو بہت سا مال اور اولاد عطا کی جائے گی۔

۷۸۔ کیا وہ غیب کے بھیدوں کو جان گیا ہے یا اُس نے خدا سے کوئی عہد و پیمان لے لیا ہے۔

۷۹۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے ہم اُسے عنقریب لکھ لیں گے اور اس پر دائمی عذاب کریں گے۔

۸۰۔ اور (مال و اولاد کے بارے میں) جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اُس کے ہم وارث ہو جائیں گے اور وہ تن تنہا ہمارے پاس آئے گا۔

۸۱۔ انہوں نے خدا کے سوا کچھ معبود اپنے لیے منتخب کر لیے ہیں تاکہ وہ ان کی عزت کا سبب بنیں (کیسی خام خیالی ہے!)۔

۸۲۔ ہرگز ایسا نہیں ہے، عنقریب ان کے معبود ان کی عبادت کے منکر ہو جائیں گے بلکہ وہ ان کے برخلاف قیام کریں گے۔

تفسیر

ایک بیہودہ اور انحرافی خیال :

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایمان و پاکیزگی اور تقویٰ ان کے لیے مناسب نہیں ہے اور ان کی وجہ سے وہ دنیا سے محروم رہ جاتے ہیں۔ جب کہ ایمان و تقویٰ کو چھوڑ دینے سے دنیا ان کا رُخ کر لیتی ہے اور وہ مالدار بن جاتے ہیں۔

یہ سوچ خواہ سادہ لوحی اور خرافات کی پیروی کی وجہ سے ہو یا خدائی عہد و پیمان اور ذمہ داریوں سے دُور بھاگنے کے لیے ایک بہانہ ہو، یہ جو کچھ بھی ہو ایک خطرناک طرزِ فکر ہے۔

بعض اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسا گمان کرنے والے بے ایمانوں کی مال و دولت اور کچھ مومنین کے فقر و فاقہ کو اپنی اس بیہودہ سوچ کے لیے ایک دستاویز بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ مال جو ظلم و کفر کرنے اور تقویٰ کے اصولوں کو چھوڑنے سے انسان کو ملتا ہے نہ وہ سببِ افتخار ہے اور نہ ہی ایمان و پرہیزگاری مشروع اور مباح کاموں کے راستے میں کسی طرح سے رکاوٹ بنتے ہیں۔

بہرحال ہمارے زمانے کی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی ـــ کچھ نادان لوگ موجود تھے جو اس قسم کی سوچ رکھتے تھے یا کم از کم اس طرح کا اظہار کرتے تھے۔

قرآن زیر بحث آیات میں ـــ اس بحث کی مناسبت سے کہ جو کفار اور ظالموں کے انجام کے سلسلے میں اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اس طرزِ فکر اور اس کے انجام کے بارے میں بیان کر رہا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے : کیا تُو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جو ہماری آیات کو جھٹلاتا ہے ، اور اُن سے کفر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے بہت زیادہ مال و اولاد حاصل ہوگا۔ (افرأیت الذی کفر بأیاتنا وقال لاوتین مالا و ولدا)[1]

اس کے بعد قرآن انہیں اس طرح جواب دیتا ہے : کیا وہ اسرارِ غیب سے آگاہ ہوگیا ہے یا اُس نے اس بارے میں خدا سے کوئی عہد و پیمان لے لیا ہے۔ (اطلع الغیب ام اتخذ عند الرحمٰن عھدا)۔

اس قسم کی پیشین گوئی تو وہی شخص کر سکتا ہے ، اور وہی شخص مال و اولاد کے ہونے کے ساتھ کفر کے کسی رابطہ کا قائل ہوسکتا ہے کہ جو اسرارِ غیب سے آگاہ ہو ، کیونکہ ہمیں تو ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ نظر نہیں آتا۔ یا پھر اُس نے خدا سے کوئی عہد و پیمان لیا ہو جبکہ اس قسم کی بات بھی بے معنی ہے۔

اس کے بعد قطعی الفاظ کے ساتھ قرآن مزید کہتا ہے : ایسا نہیں ہے (کفر و بے ایمانی ہرگز کسی کے مال و اولاد میں زیادتی کا سبب نہیں ہوگی) ہم عنقریب جو کچھ وہ کہتا ہے اُسے لکھ لیں گے۔ (کلا سنکتب مایقول)۔

ہاں یہ بات ممکن ہے کہ یہ بے بنیاد باتیں بعض سادہ لوح افراد کے انحراف کا سبب بن جائیں ، یہ سب باتیں ان کے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

اور اس پر ہم اپنے عذاب کو دائمی بنا دیں گے (پے درپے اور یکے بعد دیگرے عذاب) (ونمد لہ من العذاب مدا)۔

ممکن ہے یہ جملہ آخرت کے دائمی و دوامی عذاب کی طرف اشارہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اُن عذابوں کی طرف اشارہ ہو جو اسی دنیا میں اس کے کفر و بے ایمانی کی وجہ سے دامن گیر ہوں گے۔ یہ احتمال بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ یہی مال و اولاد جو غرور و گمراہی کا سبب بنے ہوئے ہیں ، خود اس کے لیے ایک دائمی عذاب بن جائیں گے۔

٭ ٭

(مال و اولاد کے بارے میں) وہ جس چیز کا ذکر کر رہا ہے اس کے تو ہم وارث بن جائیں گے اور قیامت کے دن وہ یکہ و تنہا ہمارے پاس آئے گا (ونرثہ مایقول ویأتینا فردا)۔

ہاں انجامِ کار یہ ہے کہ وہ ان تمام مادی وسائل کو یہیں چھوڑ کر چلتا بنے گا اور پروردگار کی داد گاہِ عدل میں خالی ہاتھ حاضر ہوگا۔ اس وقت اس کی حالت یہ ہوگی کہ اس کا نامۂ اعمال گناہوں سے سیاہ اور نیکیوں سے خالی ہوگا۔ وہاں پر وہ دنیا میں اپنی ان بے بنیاد کہی ہوئی باتوں کا نتیجہ

---

[1] بعض مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کی ایک شانِ نزول بیان کی ہے۔ وہ یہ کہ ایک مومن نے جس کا نام "خباب" تھا ایک مشرک سے جس کا نام "عاص بن وائل" تھا ، اپنا دیا ہوا قرضہ واپس لینا تھا۔ مقروض نے استہزا کے طور پر اُس سے کہا : دوسرے جہان میں جب میں مال و اولاد پیدا کروں گا تو تیرا قرض ادا کروں گا۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ شانِ نزول زیرِ بحث آیت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ خاص طور پر جبکہ اولاد کا ذکر بھی اس میں موجود ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ دارِ آخرت میں اولاد نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں بعد کی آیات میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ جس مال کا وہ ذکر کرتا ہے اس کے تو ہم وارث ہو جائیں گے ، اس تعبیر سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد دُنیا کے اموال ہیں نہ کہ آخرت کے۔ بہرحال مفسرین کی ایک جماعت نے اس شانِ نزول کی بناء پر آیت کو آخرت کی طرف اشارہ سمجھا ہے لیکن حق وہی ہے کہ جو بیان کیا جا چکا ہے۔

دیکھ لے گا۔

بعد والی آیت میں ان کی بُت پرستی کے ایک اور سبب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے : انہوں نے خدا کے سوا کچھ اور معبود اپنے لیے بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کی عزت کا سبب بنیں (واتخذوا من دون اللہ اٰلھۃ لیکونوا لھم عزًا)۔

تاکہ وہ خدا کی بارگاہ میں ان کی شفاعت کریں، اور مشکلات میں ان کی مدد کریں لیکن یہ کتنی ناسمجھی اور خام خیالی کی بات ہے؟ جیسا کہ انہوں نے سمجھا ہے ہرگز ایسا نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ بُت ان کے لیے باعثِ عزت نہیں ہوں گے بلکہ وہ تو ذلت اور عذاب کا سرچشمہ ہیں۔ اسی وجہ سے " جلد ہی یعنی قیامت کے دن یہ معبود ان عبادت کرنے والوں کی عبادت کے منکر ہو جائیں گے اور اُن سے اعلانِ بیزاری کریں گے، بلکہ ان کے خلاف ہو جائیں گے"۔ (کلا سیکفرون بعبادتھم ویکونون علیھم ضدًا)۔

یہ جملہ بھی اُسی مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ جو سُورہ فاطر کی آیہ ۱۴ میں بیان ہوا ہے :

والذین تدعون من دونہ مایملکون من قطمیر ان تدعوھم لا یسمعوا دعائکم ... ویوم القیامۃ یکفرون بشرککم

جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ کسی حقیر سی چیز کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری باتوں کو نہیں سُنتے۔ اور وہ روزِ قیامت تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔

نیز سُورہ احقاف کی آیہ ۶ میں ہے :

واذا حشر النّاس کانوا لھم اعداءً

جس وقت لوگ زندہ کرکے اُٹھائے جائیں گے تو یہ معبُود ان کے دشمن ہو جائیں گے۔

بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن جبکہ پردے ہٹ جائیں گے اور تمام حقائق آشکار ہو جائیں گے اور بُتوں کی عبادت کرنے والے خود کو رسوا اور ذلیل دیکھیں گے تو وہ بتوں کی عبادت کرنے کا انکار کر دیں گے اور ان کے خلاف باتیں کریں گے جیسا کہ آیہ ۲۳ سُورہ انعام میں بیان ہوا ہے کہ بُت پرست قیامت میں کہیں گے :

واللہ ربنا ماکنا مشرکین

اس خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے۔ ہم ہرگز مشرک نہیں تھے۔

لیکن پہلی تفسیر آیت کے ظاہر کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہے، چونکہ بُتوں کی عبادت کرنے والے یہ چاہتے تھے کہ ان کے معبود ان کے لیے باعثِ عزت ہوں لیکن آخرکار وہی ان کے خلاف ہو جائیں گے۔

البتہ وہ معبود کہ جو فرشتوں، شیطانوں اور جنوں کی مانند عقل و شعور رکھنے والے ہیں ان کی وضع تو ظاہر و روشن ہے لیکن ایسے معبود کہ جو بے جان ہیں، ممکن ہے کہ اس دن حکمِ خدا سے باتیں کرنے لگیں اور اپنی عبادت کرنے والوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کریں۔

وہ حدیث کہ جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے اس سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے کیونکہ امامؑ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

یکون ھٰؤلاء الذین اتخذوھم اٰلھۃ من دون اللہ ضدًا یوم القیامۃ ویتبرئون منھم ومن عبادتھم الیٰ یوم القیامۃ :

قیامت کے دن وہ معبود کہ جو خدا کے علاوہ انہوں نے بنا رکھے تھے وہ ان کے خلاف ہوجائیں گے اور اُن سے اور ان کی عبادت سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔

جاذبِ توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث کے ذیل میں عبادت کی حقیقت کے بارے میں ایک مختصر اور جامع و پُرمعنی جملہ منقول ہے:

لیس العبادة هی السجود ولا الرکوع، وانما هی طاعة الرجال، من اطاع مخلوقاً فی معصیة الخالق فقد عبده:

"عبادت صرف سجدے اور رکوع کا ہی نام نہیں ہے، بلکہ عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کی اطاعت کرنے لگے، جو شخص خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت کرے تو یہ اُس نے اس کی پرستش و عبادت کی ہے اور اس کا انجام بھی وہی مشرکین اور بُت پرستوں کے انجام جیسا ہوگا۔"[1]

۸۳۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ۝

۸۴۔ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۝

۸۵۔ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ۝

۸۶۔ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۝

۸۷۔ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝

ترجمہ

۸۳۔ کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیجا ہے تاکہ وہ انہیں شدت کے ساتھ تحریک کریں۔

۸۴۔ اس لیے تُو ان کے بارے میں جلدی نہ کر ہم انہیں (اور ان کے اعمال کو) بڑی باریک بینی کے ساتھ شمار کریں گے۔

۸۵۔ جس دن ہم پرہیزگاروں کو خدائے رحمٰن (اور ان کی جزا) کی طرف رہنمائی کریں گے۔

۸۶۔ اور مجرموں کو (ان پیاسے اونٹوں کی طرح جو پانی کے گھاٹ کی طرف جاتے ہیں) جہنم کی طرف ہانکیں گے۔

۸۷۔ انہیں ہرگز شفاعت کا اختیار نہیں ہے۔ سوائے اس شخص کے کہ جو خدائے رحمٰن کی طرف سے کوئی عہد و پیمان رکھتا ہے۔

---

[1] نور الثقلین، ج ۳، ص ۳۵۷۔

تفسیر

شفاعت کیسے لوگ کر سکتے ہیں ؟

اِس بحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو گزشتہ آیات میں مشرکین کے بارے میں بیان ہوئی ہے، زیر بحث آیات درحقیقت ان کے انحراف کے بعض علل واسباب اور پھر ان کی بدبختی اور بُرے انجام کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اس حقیقت کو بھی ثابت کرتی ہیں کہ دوسرے معبود نہ صرف ان کی عزت ووقار کا باعث نہیں تھے بلکہ وہ تو ان کی بدبختی اور ذلت کا سبب بن گئے ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے : کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیجا تا کہ وہ اُنہیں غلط راستوں پر جن پر وہ چل رہے ہیں تیز کردیں بلکہ تہ و بالا کردیں (الم تر انا ارسلنا الشیاطین علی الکافرین تؤزھم ازًّا)۔

" ازّ " جیساکہ راغب مفردات میں کہتا ہے۔ اصل میں دیگ میں اُبال آنے اور جو کچھ اُس کے اندر ہے اُبال کی شدت کے وقت اُس کے زیر وزبر ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شیاطین ان پر اس طرح سے مسلط ہو جائیں گے کہ جس راستے پر وہ چاہیں گے انہیں چلالیں گے اور جس شکل میں چاہیں گے انہیں متحرک کردیں گے اور انہیں تہ و بالا کر دیں گے۔

یہ بات واضح ہے ــــ اور ہم نے بارہا کہا ہے ــــ کہ شیاطین کا انسانوں پر مسلط ہونا جبری اور بے خبری کا تسلط نہیں ہے، بلکہ یہ خود انسان ہی ہے کہ جو شیاطین کو اپنے قلب و رُوح کے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے، ان کی بندگی کا طوق اپنے گلے میں ڈالتا ہے اور ان کی اطاعت کو قبول کرتا ہے جیساکہ قرآن سورۂ نحل کی آیہ ۱۰۰ میں کہتا ہے :

انما سلطانه علی الذین یتولونه والذین هم به مشرکون

شیطان کا تسلط صرف ان ہی لوگوں پر ہوتا ہے کہ جو اس کی ولایت و حکومت کو قبول کرتے ہیں اور جو اُسے اپنا بُت اور معبود بناتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

اس کے بعد رُوئے سُخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ان کے بارے میں جلد بازی سے کام نہ لو۔ ہم ان کے تمام اعمال کو انتہائی باریکی کے ساتھ شمار کرلیں گے (فلا تعجل علیھم انما نعد لھم عدًّا)۔

اور اُن سب کو اس دن کے لیے کہ جس دن عدل الٰہی کی دادگاہ قائم ہوگی ، ثبت اور محفوظ کرلیں گے۔

اِس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ اِس سے مراد ان کی زندگی کے دنوں کو شمار کرنا ، بلکہ ان کے سانسوں کو گننا ہو، یعنی ان کی بقا کی مدّت مختصر ہے اور گننے اور شمار کرنے میں آجاتی ہے کیونکہ کسی چیز کا معدود اور گنا ہوا ہونا عام طور پر اس کے تھوڑے اور مختصر ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

ایک روایت میں " (انما نعد لھم عدًّا) کی تفسیر کے بارے میں امام صادق علیہ السلام سے اس طرح منقول ہے کہ آپؑ نے اپنے ایک صحابی سے سوال کیا :

تیری نظر میں اس آیت میں پروردگار کی مراد کس چیز کو شمار کرنا ہے"؟

اس نے جواب میں عرض کیا : "دنوں کی تعداد"

امامؑ نے فرمایا :

"اولاد کی عمر کے دنوں کا حساب تو ماں باپ بھی رکھتے ہیں۔ ولکنه عدد الانفاس

اس کے شمار کرنے سے مراد سانسوں کی گنتی ہے"۔[1]

امام کی یہ تعبیر ممکن ہے کہ پہلی یا دوسری یا دونوں تفسیروں کی طرف اشارہ ہو۔

بہرحال اس آیت میں بیان کردہ مطالب میں غور و خوض انسان کو ہلا کے رکھ دیتا ہے کیونکہ یہ اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ ہماری ہر چیز یہاں تک کہ ہماری سانسیں بھی حساب شدہ اور گنی ہوئی ہیں اور ایک دن ہمیں ان سب کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا۔

اس کے بعد "متقین" اور "مجرمین" کی آخری منزل کو مختصر اور فصیح عبارت میں اس طرح بیان کرتا ہے : "ہم نے ان تمام اعمال کو اس دن کے لیے ذخیرہ کر لیا ہے جس دن ہم پرہیزگاروں کو عزت و احترام کے ساتھ خداوند رحمان کی طرف یعنی جنت اور اس کے انعامات کی طرف اجتماعی طور پر رہنمائی کریں گے۔ (یوم نحشر المتقین الی الرحمٰن وفدًا)۔

"وفد" بروزن "وعد" اصل میں ایسے گروہ یا جمعیت کو کہتے ہیں جو اپنی مشکلات کے حل کے لیے بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور ان کے نزدیک محترم و مکرم قرار پاتے ہیں۔ اس بنا پر یہ لفظ ضمنی طور پر احترام کا مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ پرہیزگار سواریوں پر سوار ہوں گے اور بہت ہی عزت و احترام کے ساتھ جنت میں جائیں گے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں، کہ علی علیہ السلام نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت "یوم نحشر المتقین الی الرحمٰن وفدا" کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا :

"یا علی الوفد لا یکون الا رکبانا اولئك رجال اتقوا الله عز و جل، فاحبهم واختصهم و رضی اعمالهم فسماهم متقین"

"اے علی! "وفد" مسلمہ طور پر ایسے افراد کو کہتے ہیں کہ جو سواریوں پر سوار ہوں۔ وہ ایسے افراد ہیں کہ جنہوں نے تقویٰ کو اختیار کیا ہے، خدا نے انہیں دوست بنا لیا ہے اور انہیں اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے اور ان کے اعمال سے راضی ہو کر انہیں متقین کا نام دیا ہے"۔[2]

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ :

ہم پرہیزگاروں کو خدائے رحمٰن کی طرف لے جائیں گے، جب کہ بعد والی آیت میں مجرموں کو جہنم کی طرف ہانکنے کی بات ہے۔ کیا یہ زیادہ مناسب نہیں تھا کہ رحمان کے بجائے یہاں جنت کہا جاتا۔ لیکن یہ تعبیر حقیقت میں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ ہے کہ پرہیزگار وہاں جنت

[1] نور الثقلین، ج ۳، ص ۳۵۷۔

[2] نور الثقلین، ج ۳، ص ۳۵۹۔

سے بھی زیادہ بلند مقام پر فائز ہوں گے، وہ قربِ خدا کے مقام اور اس کے خاص جلووں کے نزدیک ہوں گے اور خدا کی رضا جو بہشت سے بھی بہت بڑھ کر ہے حاصل کرلیں گے، (وہ تعبیریں جو اُوپر بیان کردہ حدیث میں پیغمبرِ اکرمؐ سے نقل کی گئی ہیں وہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں)۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں "ہم مجرموں کو اس حالت میں کہ وہ پیاسے ہوں گے جہنم کی طرف ہانکیں گے" (ونسوق المجرمین الی جھنم وردًا)۔

جیسا کہ پیاسے اُونٹوں کو پانی کی طرف ہانکتے ہیں لیکن یہاں پانی نہیں بلکہ آگ ہوگی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "ورد" انسانوں یا جانوروں کے ایسے گروہ کے معنی میں ہے کہ جو پانی کے گھاٹ پر آتے ہیں، اور چونکہ یہ گروہ یقینی طور پر پیاسا ہوتا ہے لہٰذا مفسرین نے اس تعبیر کو یہاں پیاسوں کے معنی میں لیا ہے۔

کتنا فرق ہے ان لوگوں کے درمیان کہ جنہیں عزت و احترام کے ساتھ خدائے رحمٰن کی طرف لے جایا جائے گا اور فرشتے اُن کے استقبال کے لیے دوڑ رہے ہوں گے اور اُن پر درود و سلام بھیج رہے ہوں گے اور اس گروہ کے درمیان کہ جنہیں تشنہ کام جانوروں کی طرح جہنم کی آگ کی طرف ہانک رہے ہوں گے، جبکہ وہ سر نیچے کیے ہوئے، شرمسار، رسوا اور حقیر ہوں گے۔

اور اگر وہ یہ تصور کرتے ہوں کہ وہاں شفاعت کے ذریعے کسی جگہ پہنچ سکتے ہیں، تو انہیں جان لینا چاہیئے کہ "وہ ہرگز وہاں شفاعت کے مالک نہیں ہوں گے" (لا یملکون الشفاعۃ)۔

نہ تو کوئی اور ان کی شفاعت کرے گا اور نہ وہ بطریقِ اولیٰ اس بات پر قادر ہوں گے کہ خود کسی دوسرے کی شفاعت کریں۔

صرف اُنہی لوگوں کو شفاعت کا اختیار ہوگا کہ جو خدائے رحمٰن کے ہاں کوئی عہد و پیمان رکھتے ہوں گے۔ (الا من اتخذ عند الرحمٰن عھدًا)۔

صرف یہی لوگ ایسے ہوں گے کہ جنہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت حاصل ہوسکے گی، یا ان کا مرتبہ و مقام اس سے بھی بالاتر و برتر ہے اور وہ یہ قدرت و اختیار رکھتے ہیں کہ ایسے گنہگاروں کی کہ جو شفاعت کے لائق ہیں شفاعت کریں۔

❖ ❖ ❖

"عہد" کا معنی کیا ہے؟

مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ مذکورہ بالا آیت جو یہ کہتی ہے "صرف انہی لوگوں کو شفاعت کا اختیار ہوگا جو خدا کے ہاں کوئی عہد رکھتے ہیں" عہد سے کیا مراد ہے؟

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ: "عہد" سے مراد پروردگار پر ایمان، اس کی وحدانیت و یگانگی کا اقرار اور خدا کے پیغمبروں کی تصدیق ہی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں "عہد" سے مراد حق تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت، اور ایسے لوگوں سے بیزاری ہے کہ جو خدا کے مقابلے میں کسی پناہ گاہ اور قدرت کے قائل ہیں۔۔ اسی طرح "اللہ" کے سوا کسی اور سے اُمید نہ رکھنا ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی کے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمایا:

من دان بولایة امیرالمؤمنین والائمة من بعده فهو العهد عند الله :

"جو شخص امیر المومنین اور ان کے بعد آئمہ اہل بیت کی ولایت کا عقیدہ رکھتا ہو ، یہ خدا کے نزدیک عہد ہے۔"[1]

ایک اور روایت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

من ادخل علی مؤمن سروراً فقد سرنی و من سرنی فقد اتخذ عند الله عهداً ۔

جو شخص کسی مومن کو خوش کرے اُس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس کا عہد خدا کے پاس ہے۔[2]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

"عہد کی حفاظت پانچوں وقت کی نمازوں کی حفاظت ہی ہے"[3]

مختلف اسلامی منابع میں بیان کردہ مذکورہ بالا روایات کے مطالعہ اور ان میں غور و خوض کرنے سے اور اسی طرح بزرگ اسلامی مفسرین کے اقوال سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا کے نزدیک عہد ــــ جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے معلوم ہوتا ہے ــــ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں پروردگار سے ہر قسم کا رابطہ اور اس کی معرفت و اطاعت اور اسی طرح اولیائے حق کے مکتب سے وابستگی اور ہر قسم کا عمل صالح جمع ہے۔ اگرچہ ہر روایت میں اس کے ایک حصہ یا ایک واضح و روشن مصداق کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

لہٰذا ایک اور حدیث میں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وصیت کرنے کی کیفیت کے بیان میں نقل ہوئی ہے تقریباً تمام اعتقادی مسائل جمع ہیں، اس میں آپ فرماتے ہیں :

"مسلمان کو چاہیئے کہ موت سے پہلے اس طرح وصیت کرے اور کہے" :

پروردگارا ! تو ہی آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے، تو رحمان و رحیم ہے، مَیں اس دنیا میں تجھ سے عہد کرتا ہوں، اور گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، تو واحد و یکتا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں ہے، محمدؐ تیرا بندہ اور تیرا بھیجا ہوا "رسول" ہے، بہشت حق ہے ، دوزخ حق ہے، قیامت اور حساب و کتاب حق ہے، اعمال کی جانچ کے لیے میزان حق ہے ، دین اسی طرح ہے جیسا کہ تُو نے بیان کیا ہے اور اسلام وہی ہے جس کی شریعت تُو نے مقرر فرمائی ہے، (حق) بات وہی ہے کہ جو تُو نے کہی ہے، قرآن اسی طرح ہے کہ جیسے تُو نے نازل کیا ہے، اور حق اور آشکار خدا ہے۔ پروردگارا! محمدؐ کو ہماری طرف سے بہترین جزا دے اور ان پر

---

[1] نورالثقلین، جلد ۳، ص ۳۶۲۔

[2] المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ درمنثور۔

[3] درالمنثور۔

اور اُن کی آل پر درود و سلام بھیج۔

پروردگارا! مشکلات میں تُو ہی میرا سرمایہ اور شدائد میں تو ہی میرا یاور و مددگار ہے۔ تو ہی میرا ولی نعمت ہے، تو ہی میرا اور میرے آباؤ اجداد کا معبود ہے، تو ایک چشم زدن کے لیے بھی مجھے میرے حال پر نہ چھوڑ۔ اگر تو مجھے خود میرے حال پر چھوڑ دے گا تو میں بُرائیوں سے نزدیک اور نیکیوں سے دُور ہو جاؤں گا، اے میرے خدا! تو ہی قبر میں میرا مونس بن جا اور میرے لیے ایک عہد قرار دے جسے میں قیامت کے دن کھلا ہوا دیکھوں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

ان حقائق کا اعتراف کرنے کے بعد جو کچھ انسان ضروری سمجھے وصیت کرے۔ اس وصیت کی تصدیق سورۂ مریم — کی اس آیت میں ہے:

لا یملکون الشفاعة الا من اتخذ عند الرحمٰن عهدًا

یہ ہے عہد و وصیت ......[1]

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مذکورہ بالا مطالب کو عربی یا فارسی (یا کسی بھی زبان میں) اوراد کی طرح پڑھے یا لکھے بلکہ خلوصِ دل کے ساتھ ان پر ایمان رکھتا ہو۔ ایسا ایمان کہ جس کے آثار اس کی زندگی کے پورے طرزِ عمل میں دکھائی دیں۔

❖ ❖ ❖

۸۸۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝

۸۹۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝

۹۰۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝

۹۱۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝

۹۲۔ وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝

۹۳۔ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِى الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں ہے۔

۹۴۔ لَقَدۡ اَحۡصٰهُمۡ وَعَدَّهُمۡ عَدًّا ؕ

۹۵۔ وَكُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا ○

ترجمہ

۸۸۔ انہوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن نے کسی کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔

۸۹۔ تم نے یہ کیسی بُری اور طعن کی بات کی ہے۔

۹۰۔ قریب ہے کہ اس بات پر آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ شدت کے ساتھ گر پڑیں۔

۹۱۔ اس لیے کہ انہوں نے خدائے رحمٰن کے لیے بیٹے کا ادعا کیا ہے۔

۹۲۔ اور یہ بات تو ہرگز سزاوار نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔

۹۳۔ آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب اس کے بندے ہیں۔

۹۴۔ اس نے ان سب کا احصا کر رکھا ہے اور اچھی طرح سے شمار کیا ہوا ہے۔

۹۵۔ اور وہ سب کے سب قیامت کے دن یکہ وتنہا اس کے پاس حاضر ہوں گے۔

تفسیر

خدا اور اولاد کا ہونا؟

چونکہ گزشتہ آیات میں شرک اور مشرکین کے انجام کے بارے میں گفتگو تھی لہذا بحث کے آخر میں شرک کی ایک شاخ یعنی خدا کی اولاد ہونے کے اعتقاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی قباحت اور برائی کو نہایت قاطع انداز میں واضح کیا گیا ہے: انہوں نے کہا کہ، خدائے رحمٰن نے کسی کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ (وقالوا اتخذ الرحمٰن ولدًا)۔

نہ صرف عیسائی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے حقیقی بیٹے ہیں بلکہ یہودی بھی حضرت عزیر کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے نیز بُت پرست فرشتوں کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ رکھتے تھے اور انہیں خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے[1]

اس کے بعد انتہائی سخت لہجے میں فرمایا گیا ہے: تم نے یہ کیسی بُری اور بڑی سخت بات کی ہے۔ (لقد جئتم شیئًا ادًّا)۔

"اِد" (بروزن "ضد") اصل میں ایسی بُری اور کریہہ آواز کو کہتے ہیں کہ جو شدید صوتی امواج کی گردش کی وجہ سے اونٹ کے گلے سے نکل کر کان تک پہنچے۔ بعد ازاں اس لفظ کا بہت ہی بُرے اور وحشت ناک کاموں پر اطلاق ہونے لگا۔

---

[1] حضرت عزیر کے بارے میں سورہ توبہ کی آیہ ۳۰ اور فرشتوں کے بارے میں سورہ زخرف کی آیہ ۱۹ میں گفتگو آئی ہے۔

چونکہ یہ ناروا نسبت اصل توحید کے خلاف ہے، کیونکہ نہ کوئی اس کا مثل ونظیر ہے اور نہ ہی اُسے اولاد کی ضرورت ہے اور نہ ہی وہ جسم اور جسمانیت کے عوارض رکھتا ہے۔ گویا تمام عالم ہستی جس کی بنیاد توحید پر قائم ہے اس ناروا نسبت سے وحشت و اضطراب میں ڈوب جائے گا۔

لہٰذا بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: قریب ہے کہ اس بات پر آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ شدت کے ساتھ گر پڑیں۔ (تکاد السمٰوٰت یتفطرن منہ وتنشق الارض وتخر الجبال ھدًا)۔

❖ ❖ ❖

پھر تاکید کے لیے اور موضوع کی اہمیت کے بیان کی خاطر کہتا ہے: "اس لیے کہ انہوں نے خدائے رحمٰن کے لیے بیٹے کا ادعا کیا ہے۔ (ان دعوا للرحمٰن ولدًا)۔

❖ ❖ ❖

درحقیقت انہوں نے خدا کو کسی طرح سے پہچانا ہی نہیں ورنہ وہ یہ جان لیتے کہ "خدائے رحمٰن کے لیے ہرگز یہ بات سزاوار نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے" (وما ینبغی للرحمٰن ان یتخذ ولدًا)۔

انسان چند چیزوں میں سے کسی ایک کے لیے اولاد کی خواہش کرتا ہے یا تو وہ اس بناء پر کہ اُس کی زندگی ختم ہونے والی ہے لہٰذا اسے بقاءِ نسل کے لیے تولید مثل کی ضرورت ہے۔

یا وہ کمک اور یار و مددگار کا طالب ہے کیونکہ اس کی قوت و طاقت محدود ہے یا اُسے تنہائی سے وحشت ہے لہٰذا اسے کسی مونس کی تلاش ہے۔

لیکن خدا کے بارے میں ان مطالب کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ نہ تو اس کی قدرت محدود ہے نہ اس کی زندگی ختم ہونے والی ہے، نہ اس کے وجود میں ضعف وکمزوری کا نام و نشان ہے، نہ تنہائی کا کوئی احساس اور نہ ہی اسے کوئی ضرورت واحتیاج ہے۔

علاوہ ازیں اولاد کا ہونا، جسم ہونے اور بیوی رکھنے کی دلیل ہے اور یہ تمام باتیں اس کی پاک ذات سے بعید ہیں۔

اسی بناء پر بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب اس کے بندے ہیں اور اس کے تابع فرمان ہیں (ان کل من فی السمٰوٰت والارض الا اٰتی الرحمٰن عبدًا)۔

اور باوجود اس کے کہ تمام بندے اُس کے مطیع اور تابع فرمان ہیں، اُسے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خود وہی اس کے نیازمند اور محتاج ہیں۔

❖ ❖ ❖

وہ ان سب پر محیط ہے اور ان کی تعداد کو پوری طرح سے جانتا ہے (لقد احصاھم وعدھم عدًا)۔

یعنی اِس بات کا ہرگز تصور نہ کرنا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اتنے بندوں کا اس نے حساب رکھا ہوگا۔ اس کا علم اس قدر وسیع و عریض ہے کہ نہ صرف وہ ان کے اعداد و شمار جانتا ہے بلکہ ان کی تمام خصوصیات سے بھی آگاہ ہے۔ نہ تو وہ اس کی حکومت کی حدود سے بھاگ کر باہر نکل سکتے ہیں، اور نہ ہی ان کے اعمال میں سے کوئی چیز اُس سے چھپی ہوئی ہے۔

"وہ سب کے سب قیامت کے دن یکہ و تنہا اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے"۔ (وکلھم اتیہ یوم القیامۃ فردًا)۔
اس بنا پر مسیحؑ بھی، عزیر بھی، فرشتے بھی اور تمام کے تمام انسان بھی اس کے اس ہمہ گیر حکم میں شامل ہیں۔ اس حالت میں یہ بات کس قدر نامناسب ہے کہ ہم اس کے لیے اولاد کا عقیدہ رکھ کر اور اس کی ذاتِ پاک کو عظمت کی بلندیوں سے اس قدر نیچے لے آئیں اور اس کے صفات جلال و جمال کا انکار کر دیں[1]

چند اہم نکات :

۱۔ اَب بھی اُسے خُدا کا بیٹا خیال کرتے ہیں : مذکورہ بالا آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ قاطع ترین الفاظ میں خدا کی اولاد ہونے کی نفی کرتا ہے۔ یہ وہ آیات ہیں جو چودہ سو سال پہلے کا واقعہ بیان کر رہی ہیں جبکہ آج کے زمانے میں اور علم و دانش کی دنیا میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جو حضرت عیسٰیؑ کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ مجازی بیٹا نہیں بلکہ حقیقی بیٹا اور اگر ان کی کچھ تحریروں میں جو تبلیغی مقصد سے لکھی گئی ہیں اور اسلامی علاقوں کے لیے خاص طور پر ترتیب دی گئی ہیں، اس بیٹے کو اعزازی یا مجازی بیٹا کہا گیا ہے ۔ تو وہ ان کی کتب اعتقادی کے اصلی متون سے کسی طرح بھی موافق نہیں ہے۔

یہ معاملہ مسیحؑ کے خدا کا بیٹا ہونے تک منحصر نہیں ہے بلکہ وہ تثلیث کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو مسلّم طور پر تین خداؤں کے معنی میں ہے اور ان کے حتمی و یقینی عقائد میں سے ہے، مسلمان چونکہ اس قسم کی شرک آمیز بات سننے سے وحشت کرتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اسلامی علاقوں میں اپنے لب و لہجہ کو تبدیل کر دیا ہے اور اسے تشبیہ اور مجاز کی قسم قرار دیتے ہیں۔ (مزید وضاحت کے لیے قاموس کتاب مقدس کی طرف "مسیح" اور "تین اقانیم" کے بارے میں رجوع کریں)۔

✤ ✤ ✤

۲۔ آسمان پھٹ کر ریزہ ریزہ کیسے ہوں گے ؟ مذکورہ بالا آیت میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ "قریب ہے کہ آسمان اس ناروا نسبت سے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر پڑیں" اس سے کیا مراد ہے؟ اس سے یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مجید کی تعبیرات کے مطابق، عالمِ ہستی کا مجموعہ ایک قسم کی حیات اور عقل و شعور رکھتا ہے اور کئی ایک آیات کے مطابق خدا تعالیٰ کی شانِ اقدس کی طرف یہ ناروا نسبت دینے سے پورا عالم سخت وحشت میں پڑ جاتا ہے۔ جیسے سورہ بقرہ کی آیہ ۷۴ میں ہے :

وان منہا لما یہبط من خشیۃ اللہ

بعض پتھر خوفِ خدا سے پہاڑوں سے گر پڑتے ہیں۔

اور جیسے سورہ حشر کی آیہ ۲۱ میں ہے :

لو انزلنا ھذا القراٰن علی جبل لرأیتہ خاشعًا متصدعًا من خشیۃ اللہ

---

[1] خدا سے بیٹے کی نفی کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۶ کے ذیل میں اور آٹھویں جلد سورہ یونس آیہ ۶۸ کے ذیل میں بھی بحث کی گئی ہے۔

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر نازل کر دیتے تو وہ خدا کے خوف سے پھٹ پڑتے ــــ

یا پھر یہ اس بات کی انتہائی زیادہ قباحت اور بُرائی کی طرف اشارہ ہے۔ عربی اور فارسی زبان میں ایسی مثالیں عام ملتی ہیں مثلاً ہم کہتے ہیں تو نے ایسا کام کیا ہے کہ گویا آسمانوں اور زمین کو میرے سر پر گرا دیا ہے۔

انشاء اللہ ہم اس بارے میں متعلقہ آیات کے ذیل میں پھر بھی بحث کریں گے۔

۹۶۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ○

۹۷۔ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ○

۹۸۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ○

ترجمہ

۹۶۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے خدائے رحمٰن ان کی محبت دلوں میں ڈال دے گا۔

۹۷۔ ہم نے قرآن کو تیری زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تو پرہیز گاروں کو بشارت دے اور سخت قسم کے دشمنوں کو ڈرائے۔

۹۸۔ ہم نے اُن سے پہلے کتنی ہی (بے ایمان اور گنہگار) قوموں کو ہلاک کیا ہے۔ کیا تم اُن میں سے کسی کو بھی دیکھتے ہو یا ان کی خفیف سی آواز بھی سُنتے ہو؟

تفسیر

ایمان محبوبیت کا سرچشمہ ہے:

مذکورہ بالا تین آیات میں جو سورۂ مریم کی آخری آیات ہیں پھر اہل ایمان مومنین اور بے ایمان ستمگروں کی بات ہو رہی ہے اور قرآن اور اس کی بشارتوں اور اس کی تنبیہوں سے متعلق گفتگو ہے۔ درحقیقت یہ پہلی بحثوں کا تازہ نکات کے ساتھ ایک نچوڑ ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیئے۔ خداوند رحمان ان کی محبت دلوں میں ڈال دے گا (ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لهم الرحمٰن ودًّا)۔

بعض مفسرین اس آیت کو امیرالمومنین علیہ السلام کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں اور بعض اسے تمام مومنین کے لیے عام کہتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا ان کے دشمنوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دے گا اور یہ محبت ان کے لیے ایک ایسی ڈوری بن جائے گی جو انہیں ایمان کی طرف کھینچ لائے گی۔

بعض نے اسے مومنین کی ایک دوسرے سے محبت کے معنی میں سمجھا ہے کہ جو قدرت و قوت اور اتحاد کا سبب ہوگی۔

بعض نے اس سے آخرت میں مومنین کی ایک دوسرے سے دوستی کی طرف اشارہ خیال کیا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کا آپس میں اتنا تعلق ہوجائے گا کہ وہ ایک دوسرے کا دیدار کرکے انتہائی خوشی اور سرور محسوس کریں گے۔

لیکن اگر ہم وسعتِ نظر کے ساتھ آیت کے وسیع مفاہیم پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ آیت کے مفہوم میں یہ تمام تفسیریں جمع ہیں اور ان میں آپس میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔

اس کا اصلی نکتہ یہ ہے کہ "ایمان اور عمل صالح" ایک غیر معمولی قوت جذب وکشش رکھتے ہیں۔ خدا کی وحدانیت اور انبیاء کی دعوت پر ایمان و اعتقاد کی چمک انسان کے قلب و روح، فکر و نظر اور گفتار و کردار میں، اعلیٰ انسانی اخلاق، تقویٰ، پاکیزگی، سچائی، امانت، شجاعت، ایثار و درگزر کی صورت میں جلوہ گر ہے اور عظیم مقناطیسی قوتوں کی مانند اپنی طرف کھینچنے والی ہے۔

یہاں تک کہ ناپاک اور گناہ سے آلودہ لوگ بھی پاک لوگوں سے خوش رہتے ہیں اور اپنے ہی جیسے ناپاک لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر، مثال کے طور پر جب بیوی یا شوہر یا کسی شریک کار کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں تو تاکید کرتے ہیں کہ وہ پاک و نجیب، امین اور اچھے کردار کا ہو۔

یہ فطری بات ہے، اور حقیقت میں یہ پہلی جزا ہے کہ جو خدا مومنین اور صالحین کو دیتا ہے، کہ جس کا دامن دنیا سے لے کر آخری جہان تک کھنچا ہوا ہوتا ہے۔

ہم نے اکثر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس قسم کے پاک لوگ جب دنیا سے آنکھ بند کرتے ہیں تو بہت سی آنکھیں ان کے لیے رو رہی ہوتی ہیں چاہے وہ ظاہری طور پر کم حیثیت دکھائی دیتے ہوں اور کوئی اجتماعی مقام و منزلت نہ رکھتے ہوں۔ تمام لوگ ان کا خلا محسوس کرتے ہیں اور سب لوگ اپنے آپ کو ان کے سوگ میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ بعض اس آیت کو امیرالمومنین علی علیہ السلام کے بارے میں سمجھتے ہیں اور بہت سی روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے تو بلا شک و شبہ اس کا اعلیٰ درجہ اور بلند ترین مقام اس امام متقین کے ساتھ مخصوص ہے۔ (چند اہم نکات کے ذیل میں ہم ان روایات کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے) لیکن یہ امر اس بات سے مانع نہیں ہوگا کہ دوسرے مرحلوں میں تمام مومنین اور صالحین بھی اس محبت و محبوبیت کا مزہ چکھیں اور اس مودتِ الٰہی سے کچھ حصہ حاصل کریں۔ اور یہ امر اس میں بھی مانع نہیں ہوگا کہ دشمن بھی اپنے دلوں میں ان کے لیے محبت و احترام محسوس کریں:

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:-

انّ اللّٰہ اذا احبّ عبدًا دعا جبرئیل، فقال یا جبرئیل انی احب فلانًا فاحبہ، قال فیحبہ جبرئیل ثم ینادی فی اھل السّمآء ان اللّٰہ یحب فلانًا فاحبوہ، قال فیحبہ اھل السّمآء ثم یوضع لہ القبول فی الارض! وان اللّٰہ اذا ابغض عبدًا دعا جبرئیل، فقال یا جبرئیل انی ابغض

فلانًا فابغضہ ، قال فیبغضہ جبرئیل ، ثم ینادی فی اھل السمآء ان اللہ یبغض فلانًا فابغضوہ، قال فیبغضہ اھل السمآء ثم یوضع لہ البغضاء فی الارض!

"خدا جس وقت اپنے بندوں میں سے کسی سے محبت کرتا ہے تو اپنے عظیم فرشتے جبرئیل سے کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اسے دوست رکھ تو جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ آسمانوں میں منادی کرتا ہے کہ اے اہل آسمان، خداوند عالم فلاں شخص کو پسند کرتا ہے۔ تم بھی اسے محبوب رکھو تو اس کے بعد تمام اہل آسمان اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر اس محبت کی قبولیت کا عمل زمین پر جاری ہوتا ہے۔ اور جب خدا کسی کو دشمن رکھتا ہے تو وہ جبرئیل سے کہتا ہے کہ میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں تم بھی اُس سے دشمنی رکھو تو جبرئیل اس سے دشمنی رکھتے ہیں پھر وہ اہل آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ خدا فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے تم بھی اُس سے دشمنی رکھو تو تمام اہل آسمان اُس سے متنفر ہو جاتے ہیں اس کے بعد اس تنفر کا عمل زمین پر جاری ہوتا ہے"[1]

اس کے بعد قرآن کی طرف کہ جو ایمان اور عمل صالح کی ہدایت کا سرچشمہ ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے قرآن کو تیری زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ تو پرہیزگاروں کو اس کے ذریعے بشارت دے اور سخت مزاج اور ہٹ دھرم دشمنوں کو ڈرائے (فانما یسرناہ بلسانک لتبشر بہ المتقین وتنذر بہ قومًا لدًا)۔

"لُدّ" (لام کی پیش اور دال کی شد کے ساتھ) اَلَدّ کی جمع ہے (عدد کے وزن پر) جو ایسے دشمن کے معنی میں ہے جو سخت دشمنی رکھتا ہو اور ایسے اشخاص کے لیے بولا جاتا ہے جو دشمنی کرنے میں متعصب، ہٹ دھرم اور بے منطق ہوں۔

* * *

زیر بحث آخری آیت میں جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی دلجوئی کے لیے (خصوصاً اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی اور اُس وقت مسلمان انتہائی سخت دباؤ میں تھے) اور تمام ہٹ دھرم دشمنوں کو تنبیہ اور تہدید کے لیے قرآن کہتا ہے: ہم نے اُن سے پہلے کتنی ہی بے ایمان اور گنہگار قوموں کو ہلاک و نابود کیا ہے۔ وہ اس طرح نابود اور بھولی بسری ہو گئیں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

"اے پیغمبر! کیا تو اُن میں سے کسی کو محسوس کرتا ہے یا ان کی کوئی خفیف سی آواز سنتا ہے" (وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھل تحس منھم من احد او تسمع لھم رکزًا)۔

"رکز" آہستہ آواز کے معنی میں ہے۔ اور جن چیزوں کو زمین میں چھپاتے ہیں انہیں "رکاز" کہا جاتا ہے یعنی یہ ستمگر قومیں اور حق و حقیقت کے سخت دشمن اس طرح سے درہم برہم ہوئے کہ ان کی خفیف سی آواز تک بھی سنائی نہیں دیتی۔

---

[1] یہ حدیث بہت سے مشہور منابع حدیث اور اسی طرح بہت سی کتب تفسیر میں آئی ہے لیکن ہم نے اُس متن کا انتخاب کیا ہے کہ جو تفسیر فی ظلال کی پانچویں جلد صفحہ ۴۷۹ میں "احمد" "مسلم" اور "بخاری" سے نقل ہوا ہے۔

چند اہم نکات :

۱۔ **مومنوں کے دلوں میں علیؑ کی محبت :** شیعہ کتب کے علاوہ اہل سنت کی حدیث و تفسیر کی بہت سی کتابوں میں متعدد روایات کو جو آیہ : " ان الذین اٰمنوا و عملوا الصلحات سیجعل لھم الرحمٰن ودًّا " کی شانِ نزول میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہیں، ان سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ آیت آغاز میں علی علیہ السلام کے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے علامہ زمخشری نے کشاف میں، سبط ابن الجوزی نے تذکرہ میں، گنجی شافعی اور قرطبی نے اپنی مشہور تفسیر میں، محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ میں نیشاپوری نے اپنی مشہور تفسیر میں، ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ میں، سیوطی نے درالمنثور میں، ہیثمی نے صواعق المحرقہ میں اور آلوسی نے رُوح المعانی میں یہی شانِ نزول نقل کی ہے۔ اُن میں سے کچھ اس طرح ہیں :

۱۔ ثعلبی اپنی تفسیر میں " براء بن عازب " سے اس طرح نقل کرتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا :

قل اللھم اجعل لی عندک عھدًا ، واجعل لی فی قلوب المؤمنین مودة ، فانزل اللہ تعالیٰ : ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمٰن ودًّا

کہو خداوندا ! میرے لیے اپنے ہاں عہد قرار دے اور مومنین کے دلوں میں میری محبت ڈال دے تو اُس وقت آیہ ان الذین اٰمنوا ۔۔۔۔ نازل ہوئی ۔[1]

عین یہی عبارت یا تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ بہت سی دوسری کتابوں میں آئی ہے ۔

۲۔ بہت سی اسلامی کتابوں میں یہی معنی ابن عباس سے نقل ہوا ہے وہ کہتے ہیں :

" نزلت فی علی بن ابی طالب " ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمٰن ودًّا " قال محبة فی قلوب المؤمنین "

یعنی آیہ ان الذین آمنوا ۔۔۔۔ علی بن ابی طالب کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کا معنی یہ ہے کہ خدا آپ کی محبت مومنین کے دلوں میں ڈال دے گا ۔[2]

۳۔ کتاب " صواعق " میں محمد بن حنفیہ سے اس آیت کی تفسیر میں اس طرح نقل ہوا ہے :

لا یبقی مؤمن الّا و فی قلبه ودّ لعلی ولاھل بیته :

کوئی مومن ایسا نہ ملے گا کہ جس کے دل میں علی اور ان کے اہل بیت کی محبت نہ ہو ۔[3]

۴۔ شاید اسی بناء پر صحیح اور معتبر روایت میں خود امیر المومنین علی علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے :

لو ضربت خیشوم المؤمن بسیفی ھذا علی ان یبغضنی ما ابغضنی ولو

---

[1] احقاق الحق ، جلد ۳ ، ص ۸۳ تا ۸۶ بحوالہ تفسیر ثعلبی ۔

[2][3] روح المعانی جلد ۱۶ ، ص ۱۳۰ اور مجمع البیان جلد ۶ ، ص ۵۲۳ اور نہج البلاغہ کلمات قصار ۔ ۴۵ ۔

صبیت الدنیا بجماتها علی المنافق علی ان یحبنی ما احبنی وذالك انه قضی فانقضی علی لسان النبی الامی انه قال لا یبغضك مؤمن ولا یحبك منافق :

اگر میں اپنی یہ تلوار مومن کی ناک پر ماروں کہ وہ مجھ سے دشمنی رکھے تو وہ ہرگز میرا دشمن نہیں ہوگا اور اگر میں ساری دنیا (اور اس کی نعمتیں) منافق کو دے ڈالوں کہ وہ مجھے دوست رکھے تو بھی وہ مجھے دوست نہیں رکھے گا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک قطعی حکم کے ساتھ مجھ سے فرمایا ہے کہ :

اے علیؑ ! کوئی مومن تجھ سے دشمنی نہیں رکھے گا اور کوئی منافق تجھ سے محبت نہ کرے گا۔[1]

۵۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نماز کے آخر میں ایسی بلند آواز کے ساتھ کہ جسے لوگ سنتے تھے، امیر المومنین علی علیہ السلام کے حق میں اس طرح دعا فرماتے تھے :

اللھم هب لعلی المودة فی صدور المؤمنین والهیبة والعظمة فی صدور المنافقین فانزل الله ان الذین اٰمنوا ۔۔۔

" خداوندا ! علی کی محبت مومنین کے دلوں میں ڈال دے اور اسی طرح اس کی عظمت و ہیبت منافقین کے دلوں میں بٹھا دے ۔ تو اس وقت یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت نازل ہوئی ۔"[2]

بہر حال جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا آیات کی تفسیر میں بیان کیا ہے، علی علیہ السلام کے بارے میں اس آیت کا نزول ایک کامل اور اکمل نمونے کے عنوان سے ہے اور یہ تمام مومنین کے لیے ، سلسلۂ مراتب کے ساتھ مفہوم کے اعتبار سے عام ہونے میں مانع نہیں ہوگا۔

۲۔ "یسّرناہ بلسانك" کی تفسیر :

"یسرناہ" "تیسیر" کے مادہ سے "تسہیل" (سہل اور آسان کرنے) کے معنی میں ہے۔ خدا اس جملے میں فرماتا ہے : " ہم نے قرآن کو تیری زبان پر آسان بنا دیا تاکہ تو پرہیز گاروں کو بشارت دے اور سخت قسم کے دشمنوں کو ڈرائے " یہ آسانی ممکن ہے کہ مختلف جہات سے ہو :

۱۔ اس لحاظ سے کہ قرآن فصیح اور رواں عربی زبان میں ہے کہ جس کا لہجہ اور آواز کانوں کو بھلی لگتی ہے اور زبان کے لیے اس کی تلاوت آسان ہے ۔

۲۔ اس لحاظ سے کہ خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو آیات قرآن کے بارے میں ایسی لیاقت اور گرفت عطا کی تھی کہ آسانی کے ساتھ ہر جگہ پر ہر مشکل کے حل کے لیے اس سے استفادہ کرتے تھے اور ہمیشہ مومنین کے سامنے اس کی تلاوت کرتے تھے ۔

۳۔ مطالب و معانی کے لحاظ سے جو انتہائی گہرے اور پُرمایہ ہیں وہ سمجھنے میں سہل، سادہ اور آسان ہیں۔ اصولی طور پر وہ تمام کے تمام عظیم اور اعلیٰ حقائق جو معانی کو سمجھنے کی سہولت کے ساتھ ان محدود الفاظ کے قالب میں ڈھالے گئے ہیں خود اس بات کی نشانی ہیں کہ جو مذکورہ بالا آیت میں بیان ہوا ہے اور جو امدادِ الٰہی کے زیر اثر صورت پذیر ہوا ہے ۔

---

[1] روح المعانی جلد ۱۶ ص ۱۳۰ اور مجمع البیان، جلد ۶، ص ۵۲۳ اور نہج البلاغہ کلمات قصار - ۴۵

[2] نور الثقلین، جلد ۳، ص ۳۶۳

سورہ قمر میں متعدد آیات میں یہ جملہ دہرایا گیا ہے :

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر

ہم نے قرآن کو تذکر اور یاد دہانی کے لیے آسان کیا ہے. تو کیا کوئی پند و نصیحت لینے والا ہے؟

٭ ٭ ٭

پروردگارا ! ہمارے دل کو نورِ ایمان کے ساتھ اور ہمارے تمام وجود کو عمل صالح کے نور کے ساتھ روشن کر دے۔ ہمیں مومنین و صالحین خصوصاً امام المتقین امیر المومنین علی علیہ السلام کے دوستوں میں سے قرار دے اور ہماری محبت بھی تمام مومنین کے دلوں میں ڈال دے۔
بارِ الٰہا ! ہمارا عظیم اسلامی معاشرہ اتنی بڑی تعداد میں ہونے اور اتنے وسیع مادی و معنوی وسائل رکھنے کے باوجود دشمنوں کے پنجے میں گرفتار ہے۔ اور آپس کے انتشار اور پھوٹ کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہے۔ تو مسلمانوں کو ایمان اور عملِ صالح کی شمع کے گرد اکٹھا کر دے۔
خداوندا ! جس طرح تُو نے پہلے زمانے کے سرکشوں اور جابروں کو ایسا ہلاک و محو اور نابود کیا ہے کہ اُن کی بھنک بھی کانوں میں نہیں پڑتی اسی طرح ہمارے زمانہ کی سپر طاقتوں کو بھی پست و نابود کر دے۔ اُن کے شر کو مستضعفین کے سروں سے ٹال دے اور ان مستکبرین کے خلاف مومنین کی جدوجہد کو حتمی کامیابی سے ہمکنار کر دے۔

آمین یارب العالمین

سورہ مریم کا اختتام

جمعہ ۲۳/ بہمن/ ۱۳۶۰

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۰۲

سورۂ طٰہٰ

- مکہ میں نازل ہوئی
- اس کی ۱۳۵ آیات ہیں

سُورہ طٰہٰ کی فضیلت

منابع اسلامی میں اس سورہ کی عظمت اور اہمیت کے بارے میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے منقول ہے کہ خدا نے سُورۂ طٰہٰ اور یٰس کو خلقتِ آدم سے دو ہزار سال پہلے فرشتوں کے سامنے بیان کیا جس وقت فرشتوں نے قرآن کا یہ حصّہ سُنا تو انہوں نے کہا :

طوبیٰ لامۃ ینزل ھذا علیھا ، وطوبیٰ لاجواف تحمل ھذا ، وطوبیٰ لالسن تتکلم بھذا

کیا کہنا اس اُمّت کا کہ جن پر یہ آیتیں نازل ہوں گی ، کیا کہنا ان دلوں کا جو ان آیات کو قبول کریں گے اور کیا کہنا اُن زبانوں کا کہ جن پر یہ آیات جاری ہوں گی [1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

لاتدعوا قرائۃ سورۃ طٰہٰ ، فان اللہ یحبھا ویحب من قرأھا ومن ادمن قرائتھا اعطاہ اللہ یوم القیامۃ کتابہ بیمینہ ، ولم یحاسبہ بما عمل فی الاسلام ، واعطی فی الأخرۃ من الاجر حتی یرضی

سُورۂ طٰہٰ کی تلاوت ترک نہ کرو ، کیونکہ خدا اسے اور اس کی تلاوت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے جو شخص ہمیشہ اس کی تلاوت کرتا رہے خدا قیامت کے دن اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا اور وہ بغیر حساب کے جنّت میں داخل ہوگا اور آخرت میں اسے اتنا اَجر ملے گا کہ وہ راضی ہوجائے گا [2]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے :

من قرأھا اعطی یوم القیامۃ ثواب المھاجرین والانصار

---

[1] مجمع البیان ، جلد ۷ ، ص ۱ ۔

[2] تفسیر نور الثقلین ، جلد ۳ ، ص ۳۶۷ ۔

جو شخص اسے پڑھے گا اُسے روزِ قیامت مہاجرین و انصار کے برابر ثواب ملے گا۔[1]

ہم پھر یہ بات ضروری سمجھتے ہیں کہ اس حقیقت کو دہرائیں کہ تمام ایسے عظیم ثواب جو پیغمبرؐ اور آئمہؑ سے ان سوروں کی تلاوت کے بارے میں ہم تک پہنچے ہیں، ان کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ صرف تلاوت کرنے سے انسان کو یہ سب نتائج حاصل ہو جائیں گے بلکہ اس سے مراد وہ تلاوت ہے جو غور و فکر کا مقدمہ بنے۔ ایسا غور و فکر کہ جس کے آثار انسان کے تمام اعمال و گفتار سے ظاہر ہوں اور اگر ہم اس سورہ کے اجمالی مطالب پر نظر کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ مذکورہ بالا روایات اس سورہ کے مطالب کے ساتھ کامل مناسبت رکھتی ہیں۔

اس سُورہ کے مضامین:

تمام مفسرین کے قول کے مطابق سورۂ طٰہٰ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے مضامین بھی باقی تمام مکی سورتوں کی مانند ہیں جو زیادہ تر "مبدا" و "معاد" کے بارے میں ہیں اور توحید کے نتائج اور شرک کی بدبختیوں کو ایک ایک کرکے بیان کرتی ہیں۔

پہلے حصہ میں عظمتِ قرآن اور پروردگار کی کچھ صفاتِ جلال و جمال کی طرف مختصر سا اشارہ ہے۔

دوسرے حصہ میں کہ جو اسّی سے زیادہ آیات پر مشتمل ہے، موسیٰؑ کی داستان بیان ہوئی ہے۔ یہ اس زمانے کی داستان ہے جب موسیٰؑ نبوت پر مبعوث ہوئے اور اس کے بعد جابر فرعون کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؑ نے فرعونیوں کے ہاتھوں بہت سے مصائب جھیلے۔ جادوگروں کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ وہ ایمان لے آئے۔ اس کے بعد خدا نے معجزانہ طریقے سے فرعون اور اس کے حواریوں کو دریا میں غرق کر دیا اور موسیٰ اور مومنین کو رہائی بخشی۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کی بچھڑے کو پوجنے کی داستان بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہارونؑ و موسیٰؑ کو کس طرح سے ان سے بھی اُلجھنا پڑا۔

تیسرے حصہ میں کچھ معاد کے بارے میں بیان ہے اور کچھ قیامت کی خصوصیات کا ذکر ہے۔

چوتھے حصہ میں قرآن اور اس کی عظمت کا بیان ہے۔

پانچویں حصہ میں جنت میں آدم و حوا کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ ابلیس کی وسوسہ انگیزی کا ماجرا بیان کیا گیا ہے اور انجام کار ان کے زمین پر اُترنے کا تذکرہ ہے۔

آخری حصہ میں مومنین کے لیے بیدار کن پند و نصائح ہیں، کہ جن میں سے اکثر کا رُوئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۷، ص ۱۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ طٰهٰ ۝

۲۔ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝

۳۔ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝

۴۔ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝

۵۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝

۶۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝

۷۔ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝

۸۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ طٰہٰ۔

۲۔ ہم نے قرآن کو تجھ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تو خود کو مشقت میں ڈال دے۔

۳۔ اسے تو صرف اُن لوگوں کی یاد آوری اور تذکرہ کے لیے نازل کیا ہے کہ جو (خدا سے) ڈرتے ہیں۔

۴۔ یہ قرآن اس کی طرف سے نازل ہوا ہے جو زمین اور بلند آسمانوں کا خالق ہے۔

۵۔ وہ خدائے رحمٰن ہے کہ جو عرش پر مسلط ہے۔

۶۔ جو کچھ آسمانوں میں، زمین میں، ان دونوں کے درمیان اور زمین کی گہرائیوں میں موجود ہے سب اسی کا ہے۔

۷۔ اگر تم اونچی آواز سے بات کروگے (یا پوشیدہ طور پر بات کروگے) تو وہ تمام چھپی ہوئی باتوں کو بلکہ خفیہ ترین باتوں کو بھی جانتا ہے۔

۸۔ وہی وہ خدا ہے کہ جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں۔

شانِ نزول :

مذکورہ بالا پہلی آیات کی شانِ نزول میں بہت سی روایات بیان ہوئی ہیں کہ جن سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی و قرآن کے نازل ہونے کے بعد بہت ہی زیادہ عبادت کرنے لگے تھے۔ خاص طور پر کھڑے کھڑے عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاؤں پر ورم آگئے تھے۔ کبھی اس غرض سے کہ عبادت جاری رکھ سکیں، اپنے جسم کا سارا بوجھ ایک پاؤں پر ڈال دیتے اور کبھی دوسرے پاؤں پر، کبھی پاؤں کی ایڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور کبھی پاؤں کی انگلیوں پر۔[1]

تو مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور آپؐ کو حکم دیا گیا کہ اپنے اُوپر اتنی مشقت نہ ڈالیں۔

تفسیر

خود کو اتنا مشقت میں نہ ڈالو :

اس سورہ کے آغاز میں ہمیں پھر حروفِ مقطعہ کا سامنا ہے جو انسان کے احساسِ جستجو کو اُبھارتے ہیں ——— (طٰہٰ)۔

البتہ ہم نے قرآن کے حروفِ مقطعہ کی تفسیر کے بارے میں تین سورتوں کے آغاز میں کافی بحث کی ہے۔[2]

لیکن اس مقام پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مطلب کا اضافہ کریں کہ ممکن ہے کہ تمام ہی یا کم از کم ان حروفِ مقطعہ میں سے کچھ ایک خاص معنی و مفہوم رکھتے ہوں۔ ٹھیک ایک لفظ کی مانند جس کا کوئی نہ کوئی معنی و مفہوم ہوتا ہے۔

اتفاقاً ہمیں بہت سی روایات نیز اس سورہ اور سورہ یٰسٓ کے آغاز میں مفسرین کے کلمات سے اس مطلب کا ثبوت ملتا ہے کہ "طٰہٰ" یا رجل (اے مرد) کے معنی میں ہے۔ کچھ عربی اشعار بھی ایسے ملتے ہیں جن میں "طٰہٰ" "یا رجل" یا اس کے نزدیک کے معنی میں استعمال ہوا ہے ان میں سے بعض اشعار ممکن ہے آغازِ اسلام یا قبل از اسلام کے زمانے سے تعلق رکھتے ہوں۔[3]

اور جیسا کہ ایک باخبر شخص نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ بعض مغربی دانشوروں نے کہ جو اسلامی مسائل کے سلسلے میں مطالعہ کرتے رہتے ہیں اس مطلب کو قرآن کے تمام حروفِ مقطعہ کے لیے عام سمجھا ہے اور ان کا نظریہ ہے کہ حروفِ مقطعہ ہر سورہ کی ابتدا میں ایک مستقل لفظ ہے، اس کا ایک خاص معنی ہے ان میں سے بعض زمانہ گزر جانے سے متروک ہو گئے ہیں اور بعض ہم تک پہنچ گئے ہیں، ورنہ یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ مشرکین عرب حروفِ مقطعہ کو سنیں اور وہ اس کا کوئی مفہوم نہ سمجھیں پھر بھی اس کا مذاق نہ اُڑائیں حالانکہ کسی تاریخ میں یہ بات نظر نہیں آتی کہ ان بد دماغ بہانہ بازوں نے حروفِ مقطعہ کو مذاق اُڑانے کے لیے عنوان بنایا ہو۔

البتہ اس نظریہ کو بطورِ کلی اور تمام حروفِ مقطعہ کے بارے میں قبول کرنا مشکل ہے لیکن بعض کے بارے میں قابلِ قبول ہے اور اسلامی

---

[1] ان روایات سے آگاہی کے لیے تفسیر نور الثقلین اور تفسیر درالمنثور میں سورہ طٰہٰ کی ابتدا سے رجوع کریں۔

[2] سورہ بقرہ، جلد اول، آلِ عمران، جلد دوم۔ اور اعراف جلد چہارم (تفسیر نمونہ)۔

[3] تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

منابع میں بھی اس کے بارے میں بحث ہوئی ہے ۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ "طٰہٰ" پیغمبر اکرمؐ کا ایک نام ہے اور اس کا معنی ہے :

یا طالب الحق الهادی الیه

اے وہ شخص کہ جو حق کا طالب اور اس کی طرف ہدایت کرنے والا ہے ۔

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "طٰہٰ" دو رمزی حروف کا مرکب ہے ۔ "طا" طالب الحق کی طرف اشارہ ہے اور "ھا" "ھادی الیہ" کی طرف ۔ ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ زمانے میں بھی اور موجودہ زمانہ میں بھی رمزی حروف (CODE WORDS) اور مختصر علامات سے استفادہ ہوتا رہا ہے ۔ خاص طور پر ہمارے زمانہ میں تو اس سے بہت ہی استفادہ کیا جاتا ہے ۔

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ لفظ "طٰہٰ" نے لفظ "یٰسٓ" کی طرح زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تدریجاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم خاص کی صورت اختیار کر لی ہے ۔ یہاں تک کہ آل پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "آل طٰہٰ" بھی کہا جاتا ہے اور حضرت مہدی علیہ السلام کو دعائے ندبہ میں "یابن طٰہٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے ۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے : ہم نے قرآن تجھ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تُو اپنے آپ کو مشقت میں ڈال دے (ما انزلنا علیك القرآن لتشقیٰ)۔

یہ ٹھیک ہے کہ پروردگار کی عبادت اور اس کے قرب کی جستجو اس کی پرستش کے ذریعہ بہترین کام ہے لیکن ہر کام ایک حساب سے ہوتا ہے ۔ عبادت بھی ایک حساب سے کی جاتی ہے ۔ تم خود پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ تمہارے پاؤں متورم ہو جائیں اور تبلیغ و جہاد کے لیے تمہاری قوت میں کمی آجائے ۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ "تشقیٰ" مادہ "شقاوت" سے "سعادت" کی ضد ہے لیکن جیسا کہ "راغب" مفردات میں لکھتا ہے کہ بعض اوقات یہ مادہ تکلیف اور دُکھ کے معنی میں بھی آتا ہے اور مذکورہ بالا آیت میں یہی معنی مراد ہیں ، جیسا کہ شانِ نزول میں بھی یہی مطلب بیان ہوا ہے ۔

بعد والی آیت میں قرآن کے نازل کرنے کا مقصد اس طرح بیان کیا گیا ہے :

ہم نے تو قرآن کو صرف اُن لوگوں کی یاد آوری اور تذکر کے لیے نازل کیا ہے کہ جو (خدا سے) ڈرتے ہیں (الا تذکرة لمن یخشیٰ)۔

"تذکرة" سے تعبیر ایک طرف اور "من یخشیٰ" دوسری طرف ایک ناقابلِ انکار واقعیت کی طرف اشارہ ہے ۔ تذکرہ اور یاد دہانی اس بات کی نشاندہی ہے کہ تمام خدائی تعلیمات کا خمیر انسان کی رُوح اور اس کی فطرت میں موجود ہوتا ہے اور انبیاء کی تعلیمات اُسے بارآور بناتی ہیں اس طرح سے کہ گویا وہ کسی مطلب کی یاد دہانی کراتی ہیں ۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ انسان تمام علوم کو پہلے ہی سے جانتا تھا اور اب انہیں بھول گیا ہے اور اس دنیا میں تعلیم کا مقصد یاد دہانی ہے ۔ (جیسا کہ افلاطون کا نظریہ بیان کیا جاتا ہے) بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا اصلی خمیر انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہے ۔ (غور کیجئے گا)

"من یخشٰی" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جب تک انسان میں ایک قسم کا احساس ذمہ داری و جوابدہی نہ ہو، جس کا نام قرآن نے "خشیت و خوف" رکھا ہے، اس وقت تک وہ حقائق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ کیونکہ قبول کرنے والی صلاحیت ہر سچ کے بارآور ہونے میں بھی شرط ہے اور درحقیقت یہ تعبیر اس چیز کے مشابہ ہے کہ جو سورہ بقرہ کی ابتداء میں بیان ہوئی ہے:

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

قرآن متقین کی ہدایت کا سبب ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اس خدا کا تعارف کرواتا ہے کہ جو قرآن کو نازل کرنے والا ہے تاکہ اس کی معرفت کے ذریعے قرآن کی عظمت آشکار ہو۔ لہٰذا ارشاد ہوتا ہے: یہ قرآن اس کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ جو زمین اور بلند آسمانوں کا خالق ہے۔ (تنزيلاً ممن خلق الارض والسمٰوٰت العلى)[1]

حقیقت میں یہ توصیف نزولِ قرآن کی ابتداء اور انتہا کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ اس کی انتہا زمین ہے اور ابتداء آسمان ہیں، یہ اس لفظ کے معنی کی وسعت کے لحاظ سے ہے اور اگر اس مقام پر ـــ قرآن کی دوسری آیات کے مانند ـــ لفظ "ما بينهما" کا اضافہ نہیں ہوا تو شاید اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس سے اصل مقصد ابتداء و انتہا کا بیان کرنا تھا۔

بہرحال وہ خدا کہ جس کی قدرت و تدبیر اور حکمت، آسمان و زمین کی وسعت پر محیط ہے، ظاہر ہے کہ اگر وہ کوئی کتاب نازل کرے گا تو وہ کس قدر فصیح و پُرمعنی ہوگی۔

پھر قرآن کے نازل کرنے والے پروردگار کا تعارف جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ خدا رحمٰن ہے کہ جس کی رحمت کا فیض ہر جگہ پر محیط ہے اور وہ عرش پر مسلط ہے (الرحمٰن على العرش استوٰى)۔

ہم نے سورہ اعراف کی آیت ۵۴ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "عرش" لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس کی چھت ہو، اور کبھی خود چھت کو یا بلند پایوں والے تخت کو یا بادشاہوں کے تخت کو عرش کہتے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کے واقعے میں بیان ہوا ہے:

أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا

تم میں سے کون اُس (بلقیس) کے تخت کو میرے پاس لا سکتا ہے۔ (نمل - ۳۸)

واضح ہے کہ خدا کا نہ تو کوئی تخت ہے اور نہ ہی نوع بشر کے حکمرانوں کی طرح حکومت، بلکہ "عرش خدا" سے مراد مجموعتاً عالم ہستی ہے کہ جو اس کی حکومت کا تخت شمار ہوتا ہے۔ اس بناء پر "استوٰى على العرش" پروردگار کے جہانِ ہستی پر تسلط اور مکمل احاطہ اور سارے عالم میں اس کی تدبیر و فرمان کے نفوذ کی طرف اشارہ ہے۔

اصولی طور پر لغتِ عرب میں "عرش" اور فارسی (اور اُردو زبان) میں "تخت" زیادہ تر قدرت و اقتدار کے معنی میں بولا جاتا ہے،

---

[1] اس بارے میں کہ "تنزيلاً" کا اعراب کے لحاظ سے کیا موقع و محل ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ البتہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ ایک محذوف فعل مجہول کا مفعولِ مطلق ہے اور یہ فقرہ یوں تھا، نزل تنزيلاً ممن خلق الارض......

مثلاً ہم کہتے ہیں کہ انہوں نے فلاں شخص کو تخت سے اُتار دیا یعنی اس کی قدرت و اختیار اور حکومت کو ختم کر دیا یا عربی زبان میں کہتے ہیں (مثل عرشہ) اس کا تخت گر گیا ہے[1]

بہرحال اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس تعبیر سے خدا کے لیے جسم ہونے کا تصور کرے تو یہ انتہائی بچگانہ بات ہوگی۔

عالمِ ہستی پر خدا کی "حاکمیت" کا ذکر کرنے کے بعد اس کی "مالکیت" کے بارے میں بیان کیا گیا ہے: جو کچھ آسمانوں میں، زمین میں، ان دونوں کے درمیان اور زمین کی گہرائیوں میں موجود ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ (له ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وما بینهما وما تحت الثریٰ)

"ثریٰ" اصل میں مرطوب مٹی کے معنی میں ہے اور چونکہ زمین کا صرف اُوپر والا حصہ سُورج کی تپش اور ہوا کے چلنے سے خشک ہوتا ہے لیکن اس کا نچلا طبقہ زیادہ تر مرطوب اور تر ہوتا ہے، اس لیے اس طبقہ کو "ثریٰ" کہتے ہیں، اور اس طرح "ما تحت الثریٰ" زمین کی گہرائیوں اور اس کے اندر والے حصہ کے معنی میں ہے جو سب کا سب مالک الملک اور عالمِ ہستی کے خالق کی ملکیت ہے۔

یہاں تک صفاتِ پروردگار کے ارکان میں سے تین رُکن بیان ہوئے تھے۔ پہلا رُکن خالقیت، دُوسرا رُکن حاکمیت اور تیسرا رُکن اس کی مالکیت ہے۔

بعد والی آیت میں اس کے چوتھے رُکن یعنی اس کی عالمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ اس قدر علمی احاطہ رکھتا ہے کہ اگر تو آشکارا بات کرے تو بھی وہ جانتا ہے اور پوشیدہ اور آہستہ طور پر بات کرے تب بھی وہ جانتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مخفی سے مخفی تر بات سے بھی آگاہ ہے (وان تجهر بالقول فانه یعلم السر واخفی)۔

اس بارے میں کہ "اخفی" (سرّ اور بھید سے زیادہ مخفی) سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "سر" یہ ہے کہ جسے انسان دوسرے سے پنہاں اور مخفی طور پر بیان کرے اور "اخفی" سے مراد یہ ہے کہ جسے انسان دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اور کسی سے بیان نہیں کرتا۔

بعض نے کہا ہے کہ "سر" وہ ہے کہ جو انسان دل میں رکھتا ہو اور اخفی وہ ہے کہ جو کسی کے ذہن میں بھی نہیں آیا لیکن خدا اُسے بھی جانتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "سر" وہ عمل ہے کہ جسے انسان چھپ کر انجام دیتا ہے اور "اخفی" وہ نیت ہے کہ جو وہ دل میں رکھتا ہے۔

بعض نے کہا ہے "سر" لوگوں کے اسرار کے معنی میں ہے اور "اخفی" وہ اسرار ہیں کہ جو خدا کی پاک ذات میں ہیں۔

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"سر" تو وہ ہے کہ جسے تو نے دل میں چھپا رکھا ہے، اور "اخفی" وہ بات ہے کہ جو تیرے دل میں پیدا ہوئی لیکن تو نے اُسے بھلا دیا ہے[2]

ممکن ہے کہ یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ انسان جس چیز کو یاد رکھتا ہے وہ حافظہ کے خزانہ کے سپرد ہو جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا اس مخزن کے کسی گوشے سے ربط منقطع ہو جاتا ہے اور اُس پر نسیان کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی ذریعے سے

---

[1] تفسیر نمونہ کی جلد ۴ ص ۱۳۳ (اردو ترجمہ) —— پر بھی اس بارے میں بحث کی گئی ہے۔

[2] مجمع البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

یاد والی ہو جائے تو وہ اسے بالکل ایک جانی پہچانی بات سمجھتا ہے۔ اس بنا پر جس بات کو انسان بھول چکا ہے وہ اس کے سب سے زیادہ مخفی اسرار میں سے ہے جو حافظہ کے کسی گوشہ میں پنہاں ہو گیا ہے اور وقتی طور پر یا ہمیشہ کے لیے اس کا ربط اُس سے منقطع ہو گیا ہے۔

لیکن بہرحال اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ وہ تمام تفسیریں جو اُوپر بیان کی گئی ہیں "سر" اور "اخفیٰ" کے وسیع معنی میں موجود ہوں۔

اس طرح سے پروردگار کے بے پایاں علم کی ایک واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ اور مذکورہ بالا تمام آیات سے قرآن کے نازل کرنے والے کے بارے میں چار صفات یعنی "خلقت" "حکومت" "مالکیت" اور علم سے متعلق اجمالی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے: وہی اللہ وہ خدا ہے کہ جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، اس کے لیے اچھے اچھے نام اور صفات ہیں (اللہ لا الٰہ الا ھو لہ الاسماء الحسنٰی)۔

جیسا کہ ہم نے (سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۰) کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "اسماء حسنیٰ" کی تعبیر قرآن کی آیات میں بھی اور حدیث کی کتابوں میں بھی بارہا آئی ہے۔ یہ تعبیر دراصل اچھے ناموں کے معنی میں ہے۔ یہ بات محتاج ثبوت نہیں کہ خدا کے سب ہی نام اچھے ہیں لیکن خدا کے اسما و صفات میں سے بعض نام کیونکہ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، لہٰذا وہ اسماء حسنیٰ کہلاتے ہیں۔

بہت سی روایات میں ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ سے ہم تک پہنچی ہیں یہ منقول ہے کہ:

> خدا کے ننانوے (۹۹) نام ہیں جو شخص اُسے ان ناموں کے ساتھ پکارے گا اس کی دعا قبول ہوگی اور جو شخص (از روئے معرفت) ان کا احصا کرلے وہ اہل بہشت میں سے ہے۔

یہ مضمون اہل سُنّت کی حدیث کی معروف کتابوں میں بھی موجود ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ناموں کے احصاء اور شمار کرنے سے مراد ان صفات کا "تخلق" یعنی انہیں اپنانا ہے نہ کہ صرف ان الفاظ کا ذکر کرنا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص صفت عالم و قادر یا رحیم و غفور وغیرہ سے "تخلق" پیدا کرے یعنی ان صفات کو اپنا لے اور ان عظیم خدائی صفات کی شعاعیں اس کے وجود میں چمکنے لگیں تو وہ بہشتی بھی ہے اور اس کی دعا بھی قبول ہوگی (مزید وضاحت کے لیے اس تفسیر کی جلد ۴ صفحہ ۳۴۴ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں)۔

۹۔ وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ○

۱۰۔ إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ○

۱۱۔ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَىٰ ○

۱۲۔ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○

۱۳۔ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى ○

۱۴۔ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ○

۱۵۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ○

۱۶۔ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ○

ترجمہ

۹۔ اور کیا موسٰی کی خبر تم تک پہنچی ہے۔

۱۰۔ جب اُسے (دُور سے) آگ دکھائی دی تو اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا کر تم (تھوڑی دیر کے لیے) رُک جاؤ، مَیں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید مَیں تمہارے لیے اس میں سے ایک چنگاری لے آؤں یا اُس آگ کے ذریعے راستہ معلوم کرلوں

۱۱۔ جس وقت وہ آگ کے پاس آیا تو اُسے ندا دی گئی : اے موسٰی !

۱۲۔ مَیں تیرا پروردگار ہوں ! اپنے جُوتے اُتار دے کیونکہ تو مقدس سرزمین "طوٰی" میں ہے۔

۱۳۔ اور مَیں نے تجھے (مقامِ رسالت کے لیے) منتخب کر لیا ہے۔ اب جو کچھ بھی تیری طرف وحی کی جائے اُسے غور سے سُن۔

۱۴۔ مَیں اللہ ہوں، میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ پس تُو میری ہی عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔

۱۵۔ قیامت (حتماً) آئے گی مَیں اسے اس لیے چُھپا کر رکھنا چاہتا ہوں تا کہ ہر شخص اپنی سعی و کوشش کے بدلے اپنی جزا دیکھ لے۔

۱۶۔ اور جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے تجھے ہرگز اُس سے باز نہ رکھیں ورنہ تُو ہلاک ہو جائے گا۔

تفسیر

بیابان میں آگ کا شعلہ :

یہاں سے خدا کے عظیم پیغمبر حضرت موسٰیؑ کی داستان شروع ہوتی ہے۔ اسّی ۸۰ سے زیادہ آیات میں ان پر گزرنے والے واقعات کے اہم حصّوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے تاکہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے لیے جو اُن دنوں مکہ میں دشمنوں کی طرف سے سخت دباؤ میں تھے، یہ داستان تسلّی اور دلاسے کا کام دے۔

تاکہ وہ یہ جان لیں کہ یہ شیطانی طاقتیں خدا کی قدرت کے مقابلے میں ٹھہرنے کی تاب نہیں رکھتیں اور ان کی یہ سب سازشیں نقش برآب ہیں۔
تاکہ اس داستان سے، جو بہت سے سبق آموز مطالب سے معمور ہے، توحید و خدا پرستی کی جدوجہد میں اپنی منزل کو پالیں۔ زمانے کے فرعونوں اور جادوگروں کے خلاف معرکہ جاری رکھیں اور اسی طرح داخلی انحرافات اور انحرافی میلانات کے خلاف پیکار میں اپنی منزل مقصود کو پالیں۔
یہ ایسے درس ہیں کہ جو ان کے لیے انقلاب اسلامی کے سارے دور میں راہ نما اور راہ گشا ہو سکتے ہیں۔

موسٰی و بنی اسرائیل اور آلِ فرعون کے واقعات پر مشتمل ان آیات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے حصّہ میں ـــ حضرت موسٰیؑ کی نبوت و بعثت کے آغاز اور وحی کی پہلی شعاعوں کا بیان ہے۔ یہ وہ دور ہے جس کی مناسبت اور مطالب زیادہ ہیں۔ یہ وہ دن ہیں جو حضرت موسٰیؑ نے اس "وادی مقدس" میں، اس بیابانِ تاریک میں اور خلوت میں گزارے۔

دُوسرے حصّہ میں ـــ حضرت موسٰیؑ اور ان کے بھائی ہارونؑ کی طرف سے فرعون اور اس کے حواریوں کو توحید پرستی کے دین کی دعوت دینے کا ذکر ہے اور اس کے بعد دشمنوں کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرے حصّہ میں ـــ موسٰیؑ اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے اور فرعون اور اس کے حواریوں کے چنگل سے ان کے نجات پانے کی کیفیت اور دشمنوں کے غرق ہونے کا تذکرہ ہے۔

چوتھے حصّہ میں ـــ بنی اسرائیل کے دینِ توحید سے شرک کی طرف بڑی تیزی سے انحراف کرنے، اور سامری کے وسوسوں کو قبول کرنے کا ذکر ہے۔ نیز اس انحراف پر حضرت موسٰیؑ کے قاطع اور شدید ردِ عمل کا ذکر ہے۔

اب ہم زیرِ بحث آیات کی طرف کہ جو پہلے حصّے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ آیات ایک جاذب و لطیف تعبیر کے ساتھ کہتی ہیں: کیا تمہیں موسٰی کی خبر پہنچی ہے (وھل اتٰك حديث موسٰی)۔

یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں کہ یہ استفہام حصولِ خبر کے لیے نہیں ہے کیونکہ خدا تو تمام اسرار سے آگاہ ہے، بلکہ مشہور تعبیر کے مطابق یہ استفہام تقریری یا دوسرے لفظوں میں ایک ایسا استفہام ہے کہ جو ایک اہم خبر بیان کرنے کے لیے تمہید اور مقدمہ کے طور پر لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی روزمرہ کی زبان میں بھی ایک اہم خبر کو شروع کرتے وقت کہتے ہیں: کیا تم نے یہ خبر سنی ہے کہ ۔۔۔؟

❁ ❁ ❁

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جب آسے (دُور سے) آگ دکھائی دی تو اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم تھوڑی دیر کے لیے رُک جاؤ، میں نے آگ دیکھی ہے۔ میں اس کی طرف جاتا ہوں، شاید میں اُس سے تمہارے لیے ایک چنگاری لے آؤں، یا اس آگ کے ذریعے راستہ معلوم کر لوں (اذ راٰ نارا فقال لاھله امكثوا انی اٰنست نارا لعلی اٰتيكم منها بقبس او اجد علی النار ھدًی)۔

"قَبَس" (بروزن "قفس") تھوڑی سی آگ کے معنی میں ہے کہ جسے کچھ زیادہ آگ سے الگ کر لیتے ہیں۔ بیابانوں میں آگ کا دکھائی دینا عام طور پر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کچھ لوگ اس کے گرد جمع ہیں یا یہ بلندی پر آگ کا شعلہ اس لیے روشن کیا جاتا ہے تاکہ قافلے والے رات کے وقت بھٹک نہ جائیں۔

"امکثو" "مکث" کے مادہ سے مختصر توقف کے معنی میں ہے۔ ان تمام تعبیرات سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت

موسیٰؑ اپنے بیوی اور بچے کے ساتھ اندھیری رات میں بیابان سے گزر رہے تھے۔ رات ایسی سرد اور تاریک تھی کہ وہ راستہ کھو بیٹھے تھے۔ انہیں دُور سے آگ کا ایک شعلہ دکھائی دیا۔ یہ شعلہ دیکھتے ہی حضرت موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا: تھوڑی سی دیر کے لیے ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے، مَیں جا کر اس میں سے تھوڑی سی آگ تمہارے لیے لے آؤں یا آگ کے ذریعے یا اُن لوگوں کے وسیلے سے جو وہاں ہیں راستہ معلوم کر لوں۔

تواریخ میں بھی ہے کہ جب موسیٰؑ کی شعیبؑ کے ساتھ معاہدہ کی مدت مدین میں پوری ہو گئی تو وہ اپنے بیوی بچے اور اپنی بھیڑوں کو لے کر مدین سے مصر کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ بھول گئے، رات ایسی تاریک اور اندھیری تھی کہ بھیڑیں بیابان میں بکھر گئیں۔ اُنہوں نے چاہا کہ آگ روشن کریں تاکہ اس سرد رات میں وہ خود اور ان کے بال بچے گرم ہوں، لیکن آگ جلانے والی چیز سے آگ روشن نہ ہوئی، اسی عرصے میں ان کی حاملہ بیوی کو وضع حمل کی تکلیف شروع ہو گئی۔

گویا مصائب کا ایک طوفان تھا جس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہ وقت تھا جبکہ انہیں دُور سے ایک شعلہ نظر آیا۔ لیکن یہ آگ نہیں تھی بلکہ خدائی نور تھا۔ موسیٰ اس گمان میں کہ وہ آگ ہے، راستہ معلوم کرنے یا آگ لینے کے لیے اس آگ کی طرف چل پڑے۔[1]

اب اس سرگزشت کا آخری حصہ قرآن کی زبان سے سُنتے ہیں:

جب موسیٰؑ آگ کے پاس آئے تو ایک آواز سُنی جو انہیں مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔ اے موسیٰؑ (فلما اتاها نودی یا موسٰی)۔

مَیں تیرا پروردگار ہوں، اپنے جوتے اتار دے کیونکہ تو مقدس سرزمین طویٰ میں ہے (انی انا ربك فاخلع نعليك انك بالواد المقدس طوٰی)۔

سُورہ قصص کی آیہ ۳۰ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ نے یہ ندا اُس درخت کی طرف سے جو وہاں تھا سُنی تھی:

نودی من شاطئ الوادی الایمن فی البقعة المبارکة من الشجرة ان یا موسٰی انی انا الله رب العالمین

مجموعی طور پر ان دونوں تعبیروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ جس وقت قریب گئے تو آگ کو درخت کے اندر دیکھا (جو مفسرین کے قول کے مطابق عناب کا درخت تھا) اور یہ خود ایک واضح و روشن قرینہ تھا، اس بات کا کہ یہ آگ کوئی عام آگ نہیں ہے، بلکہ یہ خدائی نُور ہے، کہ جو نہ صرف یہ کہ درخت کو نہیں جلاتا بلکہ اس کے ساتھ یکجان و آشنا ہے یہ نُورِ حیات ہے۔

موسیٰؑ نے یہ آواز کہ "مَیں تیرا پروردگار ہوں" سُنی تو حیران رہ گئے اور ایک ناقابلِ بیان پُرکیف حالت اُن پر طاری ہو گئی، یہ کون ہے؟ جو مجھ سے باتیں کر رہا ہے؟ یہ میرا پروردگار ہے کہ جس نے لفظ "ربك" کے ساتھ مجھے افتخار بخشا ہے تاکہ یہ میرے لیے اس بات کی نشاندہی کرے کہ مَیں نے آغازِ بچپن سے لے کر اب تک اس کی آغوشِ رحمت میں پرورش پائی ہے اور ایک عظیم رسالت کے لیے تیار

[1] مجمع البیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

کیا گیا ہوں۔

حکم ملا کہ پاؤں سے اپنا جُوتا اُتار دو، کیونکہ تُو نے مقدس سرزمین میں قدم رکھا ہے وہ سرزمین کہ جس میں نُورِ الٰہی جلوہ گر ہے، وہاں خدا کا پیغام سننا ہے، اور رسالت کی ذمہ داری کو قبول کرنا ہے، لہٰذا انتہائی خضوع اور انکساری کے ساتھ اس سرزمین میں قدم رکھو۔ یہ ہے دلیل پاؤں سے جُوتا اُتارنے کی۔

اس بنا پر بعض مفسرین نے جوتا اُتارنے کے سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اُنہوں نے بعض چند در چند دوسروں کے اقوال نقل کیے ہیں جو بہت زیادہ ہیں۔ اِن میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو بہت بعید معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ جو روایات اِس آیت کی تاویل کے سلسلے میں نقل ہوئی ہیں، ہم نکات کے ذکر کے موقع پر اُن کے بارے میں بحث کریں گے۔

"طویٰ" کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ اس سرزمین کا نام طویٰ تھا، جیسا کہ اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے اور یا یہ بات ہے کہ "طویٰ" جو کہ اصل میں لپیٹنے کے معنی میں ہے، یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس سرزمین کو معنوی برکات نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا اسی بنا پر سورہ قصص کی آیہ ۳۰ میں اسے "البقعة المبارکة" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اُسی کہنے والے سے یہ بات بھی سُنی: اور مَیں نے تجھے مقامِ رسالت کے لیے چُن لیا ہے، اب جو بھی وحی تیری طرف ہوتی ہے اُسے غور سے سنو (وانا اخترتك فاستمع لما یوحٰی)۔

اور اس کے بعد موسٰی نے وحی کا پہلا جملہ اس صُورت میں حاصل کیا: مَیں اللہ ہوں، میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے (اننی انا اللّٰہ لا الٰہ الا انا)۔

اب جبکہ یہ بات ہے تو صرف میری ہی عبادت کر، ایسی عبادت کر جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہو۔ (فاعبدنی)۔

اور نماز قائم کرتا کہ ہمیشہ میری یاد میں رہے (واقم الصلوٰة لذکری)۔

اس آیت میں انبیاؑ کی دعوت کی اہم ترین بنیاد یعنی مسئلہ توحید کو بیان کرنے کے بعد خدائے یگانہ کی عبادت کا موضوع، ایمان و توحید کے درخت کے ایک ثمر کے عنوان سے بیان ہوا ہے اور اس کے بعد عظیم ترین عبادت اور خلق کا خالق کے ساتھ اہم ترین تعلق اور اس کی ذاتِ پاک کو فراموش نہ کرنے کی مؤثر ترین راہ یعنی نماز کا حکم دیا گیا ہے۔

فرمانِ رسالت کے ساتھ، جو اس سے پہلی آیت میں آیا ہے، اِن تینوں احکام کا بیان اور مسئلہ معاد کا بیان جو اس سے بعد والی آیت میں آیا ہے، اصول و فروعِ دین کے ایک کامل اور مختصر مجموعہ کو بیان کرتا ہے۔ اور استقامت کے حکم کے ساتھ جو زیرِ بحث آیات کی آخری آیت میں آئے گا ہر لحاظ سے اس سلسلۂ کلام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

اور چونکہ "توحید" اور اس کی فروعات کے ذکر کے بعد دوسرا بنیادی مسئلہ معاد ہے لہٰذا بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے قیامت یقیناً آئے گی، مَیں چاہتا ہوں کہ اُسے مخفی رکھوں تاکہ ہر شخص اپنی سعی و کوشش کے مطابق جزا پائے (ان الساعة اٰتیة اکاد اخفیھا لتجزٰی کل نفس بما تسعٰی)۔

اس جملہ میں دو نکات ہیں کہ جن کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے :

پہلا نکتہ : یہ ہے کہ (اکاد اخفیھا) کے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ "نزدیک" ہے کہ میں قیام قیامت کی تاریخ کو مخفی رکھوں اور اس تعبیر کے لیے یہ بات لازم آتی ہے کہ میں نے (ابھی تک) مخفی نہیں رکھا ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی بہت سی صریح کاؤ واضح آیات کے مطابق کوئی شخص بھی تاریخ قیامت سے آگاہ نہیں ہے۔ جیساکہ سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۷ میں بیان ہوا ہے :

یسئلونك عن الساعة ایان مرسٰھا قل انما علمھا عند ربی

لوگ قیامت کے بارے میں تجھ سے سوال کرتے ہیں تم کہہ دو کہ اس کا علم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے ۔

مفسرین نے اس سوال کے جواب میں بہت سی باتیں کی ہیں۔ بہت سے مفسرین یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ تعبیر ایک قسم کا مبالغہ ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے شروع ہونے کی تاریخ اس قدر مخفی اور پنہاں ہے کہ نزدیک ہے کہ میں خود اپنے آپ تک سے بھی اُسے پنہاں رکھوں۔ اس بارے میں ایک روایت بھی وارد ہوئی ہے اور احتمال یہی ہے کہ مفسرین کی اس جماعت نے اپنا مطلب اسی روایت سے اخذ کیا ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "کاد" کے مشتقات ہمیشہ نزدیک ہونے کے معنی میں نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض اوقات تاکید کے معنی میں آتے ہیں اور اُس میں نزدیک ہونے کے معنی نہیں ہوتے۔

لہٰذا بعض مفسرین نے "اکاد" کو "ارید" (میں چاہتا ہوں) کے معنی کے ساتھ تفسیر کیا ہے۔ اور بعض متونِ لغت میں یہ معنی صراحت کے ساتھ آئے ہیں [1]

دُوسرا نکتہ یہ ہے کہ: زیر بحث آیت کے مطابق قیامت کو مخفی رکھنے کی علت و سبب یہ ہے کہ "خدا یہ چاہتا ہے کہ ہر شخص کو اس کی سعی و کوشش کے مطابق جزا دے" دوسرے لفظوں میں اس کے مخفی رہنے سے سب کے لیے ایک قسم کی آزادی عمل پیدا ہوگی اور دوسری طرف سے چونکہ اس کا کوئی خاص وقت معلوم نہیں ہے اور ہر زمانہ میں اس کا احتمال ہے لہٰذا اس کا نتیجہ ہمیشہ آمادہ رہنے کی حالت یا تربیتی پروگراموں کو جلدی قبول کرنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ جیساکہ "شب قدر" کے پوشیدہ رکھنے کے فلسفہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سال کی تمام راتوں یا ماہِ مبارک رمضان کی تمام راتوں کا احترام کریں اور خدا کی درگاہ میں حاضری دیں۔

❖ ❖ ❖

آخری زیر بحث آیت میں ایک اساسی مسئلے کی طرف کہ جو تمام مذکورہ عقیدتی اور تربیتی پروگراموں کے اجرا کا ضامن ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے تجھے ہرگز اس سے باز نہ رکھیں ورنہ تُو ہلاک ہو جائے گا (فلا یصدنك عنھا من لا یؤمن بھا واتبع ھواہ فتردٰی)۔

تم بے ایمان لوگوں، ان کے وسوسوں اور کاموں میں رکاوٹیں ڈالنے کے مقابلے میں مضبوطی سے کھڑے ہو جاؤ۔ نہ لوگوں کی کثرت سے وحشت زدہ ہو، نہ ان کی سازشوں سے کسی قسم کا خوف کرو اور نہ ہی ان کی اس ہاؤ ہُو اور شور و غل سے اپنی دعوت کی حقانیت اور اپنے مکتب

[1] قاموس اللغت میں "کاد" کے مادہ میں آیا ہے : وتکون بمعنی اراد اکاد اخفیھا ارید (کاد کا معنی ہے میں چاہتا ہوں)۔

کی اصالت میں کسی قسم کا شک و شبہ کرو۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہاں پر " لا یؤمن " صیغہ مضارع کی صورت میں اور " واتبع ھواہ " صیغہ ماضی کی صورت میں ہے۔ یہ درحقیقت اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے منکرین کا ایمان نہ لانا ہوائے نفس کی پیروی کی وجہ سے ہے۔ گویا وہ یہ چاہتے ہیں کہ آزاد رہیں اور جو کچھ ان کا دل چاہے کریں، لہٰذا اس سے بہتر اور کیا ہے کہ قیامت کا ہی انکار کردیں تاکہ ان کی ہوا و ہوس اور خواہشاتِ نفسانی کی آزادی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

چند اہم نکات :

۱۔ " فاخلع نعلیك " سے کیا مراد ہے ؟ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ موسیٰ کو اس مقدس سرزمین کے احترام کا حکم دیا گیا کہ اپنے پاؤں سے جوتے اتار دے اور اس وادی میں نہایت عجز و انکساری کے ساتھ قدم رکھے حق کو سننے اور فرمانِ رسالت حاصل کرے لیکن بعض مفسرین کچھ روایات کی پیروی کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ : یہ حکم اس وجہ سے دیا گیا تھا چونکہ اس جوتے کا چمڑا مردہ جانور کا تھا۔

یہ بات خود اپنے طور پر بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ موسیٰؑ اس قسم کے آلودہ چمڑے اور جوتے سے استفادہ کرتے۔ بعض دوسری روایات میں اس کا انکار بھی پایا جاتا ہے۔ ایک روایت وہ ہے کہ جو امام زمانہ (ارواحنا له الفداء) کے ناحیۂ مقدس سے نقل ہوئی ہے کہ جو اس تفسیر کی شدت کے ساتھ نفی کرتی ہے۔[1]

موجودہ تورات کے سفر خروج فصل سوم میں بھی یہی تعبیر کہ جو قرآن میں ہے، نظر آتی ہے۔

بعض دوسری روایات جن میں آیت کی تاویل اور اس کے بطون کی طرف اشارہ ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ :

فاخلع نعلیك ای خوفیك : خوفك من ضیاع اهلك وخوفك من فرعون

" فاخلع نعلیك " سے مراد یہ ہے کہ اپنے سے دو خوف و خطر دور کردے۔ ایک اپنے گھر والوں کے اس بیابان میں تباہ ہوجانے کا خوف اور دوسرا فرعون کا خوف۔[2]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے اس واقعہ سے متعلق ایک عمدہ مطلب نقل ہوا ہے، آپؑ فرماتے ہیں :

کن لما لا ترجوا ارجی منك لما ترجوا، فان موسٰی بن عمران خرج لیقبس لاهله نارًا فرجع الیهم وهو رسول نبی !

جن چیزوں کی تمہیں امید نہیں ہے ان کی ان چیزوں سے بھی زیادہ امید رکھو کہ جن کی تمہیں امید ہے کیونکہ موسیٰ بن عمران ایک چنگاری لینے کے لیے گئے تھے لیکن عہدۂ نبوت و رسالت کے ساتھ واپس پلٹے۔[3]

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۳۷۳۔

[2] و [3] نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۳۷۴۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کی اُمید رکھتا ہے مگر وہ اُسے حاصل نہیں ہوتی لیکن بہت سی اہم ترین چیزیں جن کی اُسے کوئی اُمید نہیں ہوتی لُطفِ پروردگار سے اُسے مل جاتی ہیں۔

یہی معنی امیرالمومنین علی علیہ السلام سے بھی نقل ہوا ہے۔[1]

۲۔ ایک سوال کا جواب : بعض مفسرین نے یہاں ایک سوال اُٹھایا ہے اور وہ یہ کہ موسٰیؑ نے کہاں سے اور کیسے یہ جان لیا کہ یہ آواز جو وہ سُن رہے ہیں خدا کی طرف سے ہے اور یہ یقین کیسے پیدا ہوا کہ پروردگار انہیں (رسالت پر) مامور کر رہا ہے؟

یہ سوال تمام انبیاء کے بارے میں اُٹھایا جا سکتا ہے۔ دو طریقے سے جواب دیا جا سکتا ہے۔ پہلا جواب یہ ہے کہ: اس حالت میں ایک قسم کا مکاشفہ باطنی اور اندرونی احساس، جو انسان کو یقینِ کامل تک پہنچا دیتا ہے اور ہر قسم کا شک وشبہ زائل کر دیتا ہے تمام پیغمبروں کو حاصل ہو جاتا ہے۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ: ممکن ہے کہ وحی کا آغاز معجزاتی طور پر ایسے کام سے کیا جاتا ہو کہ جو پروردگار کی قدرت کے سوا ممکن ہی نہ ہو جیسا کہ موسٰی علیہ السلام نے سبز درخت کے اندر آگ دیکھی، اور اسی سے سمجھ گئے کہ یہ ایک خدائی اور اعجاز آمیز مسئلہ ہے۔

اس بات کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ خدا کا کلام سُننا اور وہ بھی بغیر کسی واسطے کے، اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ خدا حنجرہ اور آواز رکھتا ہے بلکہ وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے فضا میں آواز کی لہریں پیدا کر دیتا ہے اور ان لہروں کے ذریعے اپنے پیغمبروں سے کلام کرتا ہے، اور چونکہ حضرت موسٰیؑ کی نبوت کا آغاز اسی طرح ہوا تھا اسی لیے انہیں "کلیم اللہ" کہا جاتا ہے۔

۳۔ نماز یادِ خدا کا بہترین ذریعہ ہے : زیرِ بحث آیات میں نماز کے ایک اہم فلسفہ کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس جہان کی زندگی میں — غافل کرنے والے عوامل کو مدّ نظر رکھتے ہوئے — یاد دہانی کا محتاج ہے، ایسے وسیلے کے ذریعے، جو مختلف زمانی فاصلوں میں، خدا، قیامت، پیغمبروں کی دعوت اور مقصد خلقت کو اُسے یاد دلائے، اور اسے غفلت اور جہالت کے گرداب میں غرق ہونے سے بچائے، نماز اس اہم ذمہ داری کو پُورا کرتی ہے۔

انسان صبح سویرے نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ وہ نیند کہ جس نے اسے اس جہان کی ہر چیز سے بیگانہ کر دیا تھا زندگی کے پروگرام کو نئے سرے سے شروع کرنا چاہتا ہے، ہر چیز سے پہلے نماز میں مشغول ہوتا ہے اپنے دل وجان کو خدا کی یاد کے ساتھ جلا بخشتا ہے، اُس سے قوت و مدد حاصل کرتا ہے اور پاکیزگی و صداقت کے ساتھ سعی و کوشش کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

پھر جس وقت وہ روزانہ کے کاموں میں مشغول ہوتا ہے، اور چند گھنٹے گزر جاتے ہیں اور اکثر اس کے اور خدا کی یاد کے درمیان جدائی ہو جاتی ہے، اچانک ظہر کا وقت ہو جاتا ہے اور وہ مؤذن کی آواز سُنتا ہے" اللہ اکبر ۔۔۔ حیّ علی الصلوٰۃ!": "خدا ہر چیز سے برتر ہے کہ اس کی تعریف و توصیف کی جا سکے ۔۔۔ نماز کے لیے آؤ" تو وہ نماز کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اپنے معبود کے سامنے راز و نیاز کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے، اور اگر کسی قسم کی غفلت کا گرد و غبار اس کے دل پر بیٹھ گیا ہوتا ہے تو وہ اسے دھو دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خدا وحی کے آغاز میں ابتدائی احکامات میں حضرت موسٰیؑ سے کہتا ہے: نماز قائم کرو تاکہ میری یاد میں رہو۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہ آیت کہتی ہے کہ نماز قائم کر تاکہ تُو میری یاد میں رہے لیکن سورۂ رعد کی آیہ ۲۸ میں ہے:

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۱، صفحہ ۵۱۳۔

الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب

ذکر خدا اطمینان اور سکونِ قلب کا سبب ہے۔

اور سورہ فجر کی آیہ ۲۷ تا ۳۰ میں فرماتا ہے:

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

اے نفس مطمئنہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ، جبکہ تو بھی اس سے خوش ہے اور وہ بھی تجھ سے خوش ہے، تو میرے بندوں میں داخل ہوجا، اور میری جنت میں چلا آ۔

ان تینوں آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر ہم اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں کہ نماز انسان کو خدا کی یاد دلاتی ہے، خدا کی یاد اس کے نفس کو مطمئن بناتی ہے اور نفس مطمئن اُسے مخصوص بندوں اور بہشت جاوداں میں پہنچا دیتا ہے۔

۱۷۔ وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ○

۱۸۔ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ○

۱۹۔ قَالَ أَلْقِهَا يٰمُوسٰى ○

۲۰۔ فَأَلْقٰىهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ○

۲۱۔ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۖ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولٰى ○

۲۲۔ وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرٰى ○

۲۳۔ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرٰى ○

ترجمہ

۱۷۔ اور اے موسیٰ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟

۱۸۔ کہا : یہ میرا عصا ہے ، میں اس پر سہارا لیتا ہوں ، اس سے اپنی بھیڑوں کے لیے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں ، اور اس سے اپنی اور دوسری ضروریات بھی پُورا کرتا ہوں ۔

۱۹۔ کہا اے موسٰی ! اسے نیچے پھینک دے ۔

۲۰۔ (موسٰی نے) اُسے پھینکا تو وہ اچانک ایک بہت بڑا سانپ بن گیا اور چلنے لگا ۔

۲۱۔ فرمایا اسے پکڑ لے اور ڈر نہیں ہم اسے اس کی اُسی پہلی صُورت میں پلٹا دیں گے ۔

۲۲۔ اور اپنا ہاتھ اپنی بغل کے اندر لے جا ، تو وہ بے عیب ، سفید اور چمکتا ہوا نکلے گا ، یہ دُوسرا معجزہ ہے ۔

۲۳۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بڑی بڑی نشانیاں تجھے دکھائیں ۔

تفسیر

موسٰیؑ کا عصا اور ید بیضا :

اس میں شک نہیں کہ انبیاء کو اپنا خدا کے ساتھ ربط ثابت کرنے کے لیے معجزے کی ضرورت ہے ، ورنہ ہر شخص پیغمبری کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔ اس بناء پر سچے انبیاء کا جھوٹوں سے امتیاز معجزے کے علاوہ نہیں ہو سکتا ، یہ معجزہ خود پیغمبر کی دعوت کے مطالب اور آسمانی کتاب کے اندر بھی ہو سکتا ہے اور حسّی اور جسمانی قسم کے معجزات دُوسرے اُمور میں بھی ہو سکتے ہیں ۔ علاوہ ازیں معجزہ خود پیغمبر کی رُوح پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور وہ اُسے قوتِ قلب ، قدرت ایمان اور استقامت بخشتا ہے ۔

بہر حال حضرت موسٰیؑ کو فرمانِ نبوت ملنے کے بعد اس کی سند بھی ملنی چاہیئے ، لہٰذا اسی پُر خطرات جناب موسٰیؑ نے دو عظیم معجزے خدا سے حاصل کیے ۔

قرآن اس ماجرے کو اس طرح بیان کرتا ہے :

خدا نے موسٰی سے سوال کیا : " اے موسٰی ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے " (وما تلك بيمينك يا موسٰى) ۔

اس سادہ سے سوال ــــ میں لُطف و محبت کی چاشنی تھی ــــ فطرتاً موسٰیؑ ــــ کی رُوح میں اس وقت طوفانی لہریں موجزن تھیں لیسے میں یہ سوال اطمینانِ قلب کے لیے بھی تھا اور ایک عظیم حقیقت کو بیان کرنے کی تمہید بھی تھا ۔

❊ ❊ ❊

موسٰی نے جواب میں کہا : یہ لکڑی میرا عصا ہے (قال هي عصاي) ۔

اور چونکہ محبوب نے ان کے سامنے پہلی مرتبہ یُوں اپنا دروازہ کھولا تھا لہٰذا وہ اپنے محبوب سے باتیں جاری رکھنا اور انہیں طول دینا چاہتے تھے اور اس وجہ سے بھی کہ شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ میرا صرف یہ کہنا کہ یہ میرا عصا ہے ، کافی نہ ہو بلکہ اس سوال کا مقصد اس عصا کے آثار و فوائد کو بیان کرنا ہو ۔ لہٰذا مزید کہا ، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں (اتوكؤا عليها) ۔

اور اس سے اپنی بھیڑوں کے لیے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں (واهش بها على غنمي [1])

([1] اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس کے علاوہ میں اس سے دوسرے کام بھی لیتا ہوں۔ (ولی فیھا مآرب اخرٰی)[1]

البتہ یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ عصا رکھنے والے عصا سے کون کون سے کام لیتے ہیں۔ کبھی اس سے موذی جانوروں اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دفاعی ہتھیار کے طور پر کام لیتے ہیں۔ کبھی اس کے ذریعے بیابان میں سائبان بنا لیتے ہیں، کبھی اس کے ساتھ برتن باندھ کر گہری نہر سے پانی نکالتے ہیں۔

بہرحال حضرت موسٰیؑ ایک گہرے تعجب میں تھے کہ اس عظیم بارگاہ سے یہ کس قسم کا سوال ہے اور میرے پاس اس کا کیا جواب ہے پہلے جو فرمان دیئے گئے تھے وہ کیا تھے، اور یہ پرسش کس لیے ہے؟

❁ ❁ ❁

اچانک انہیں حکم دیا گیا اے موسٰی! اپنا عصا پھینک دے (قال القھا یا موسٰی)۔

موسٰی نے فوراً اسی وقت عصا پھینک دیا، وہ اچانک ایک بہت بڑا سانپ بن گیا، اور وہ چلنے پھرنے لگا۔ (فالقاھا فاذا ھی حیۃ تسعٰی)۔

"تسعٰی" "سعی" کے مادہ سے تیزی کے ساتھ راہ چلنے کے معنی میں ہے جو دوڑنے کی حد تک نہ ہو۔

❁ ❁

اس موقع پر موسٰی کو حکم دیا گیا کہ اسے پکڑ لے اور ڈر نہیں، ہم اسے اس کی اسی پہلی صورت میں پلٹا دیں گے۔ (قال خذھا ولا تخف سنعیدھا سیرتھا الاولٰی)[2]

سورہ قصص کی آیہ ۳۱ میں ہے:

ولی مدبرا ولم یعقب یاموسٰی اقبل ولا تخف

موسٰی اس عظیم سانپ کو دیکھ کر ڈر گئے اور پیچھے ہٹے۔ خدا نے دوبارہ ان سے کہا اے موسٰی! پلٹ آؤ اور ڈرو نہیں۔

اگرچہ یہاں موسٰی کے ڈرنے کا مسئلہ بہت سے مفسرین کے لیے سوال کا باعث بن گیا ہے کہ یہ حالت اس شجاعت کے ساتھ، جو حضرت موسٰیؑ کے بارے میں ہمیں معلوم ہے میل نہیں کھاتی۔ ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے ساری عمر فرعونیوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے گزاری اور اپنی شجاعت کا عملی طور پر ثبوت دیا، جبکہ یہ بات انبیاء کی شرائط کلی میں سے بھی ہے ــــ تو پھر یہاں یہ صورت کس طرح درست ہو سکتی ہے؟

لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس کا جواب واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ بات ہر انسان کے لیے فطری ہے ــــ چاہے وہ

(گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) "اھش" "ھش" (ھاء کی فتح کے ساتھ) کے مادہ سے درختوں کے پتوں پر مارنے اور انہیں جھاڑنے کے معنی میں ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)
[1] "مآرب" جمع ہے "مأربۃ" کی جو حاجت، نیاز اور مقصد کے معنی میں ہے۔

[2] "سیرۃ" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے، باطنی حالت کے معنی میں ہے، چاہے وہ حالت غریزی ہو یا اکتسابی۔ بعض نے یہاں ہیئت و صورت کے معنی کیے ہیں۔

کتنا ہی شجاع اور نڈر ہو ۔ کہ اگر وہ یہ دیکھ لے کہ لکڑی کا ایک ٹکڑا اچانک ایک بہت بڑے سانپ میں بدل گیا ہے، اور وہ تیزی کے ساتھ چلنے لگا ہے تو وہ وقتی طور پر وحشت زدہ ہوگا ۔ اور خود کو اُس سے بچائے گا، سوائے اِس صورت کے کہ اس منظر کو اس کے سامنے بار بار دہرایا جائے ۔ اِس فطری اثر کا موسیٰ پر کسی طرح بھی اعتراض نہیں ہوسکتا، اور سُورۂ احزاب کی آیہ ۳۹ میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ :

الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولایخشون احدًا الّا اللہ

"جو لوگ اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں وہ اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے ۔"

اس کے منافی نہیں، چونکہ یہ ایک فطری زُود گزر اور وقتی وحشت ہے جو ایک ایسے حادثہ سے ہوئی ہے جس سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا اور جو خلافِ معمول ہے ۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد حضرت موسیٰ کے دوسرے معجزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا گیا ہے :

اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں لے جا تاکہ سفید چمکدار اور روشن ہو کر باہر آئے اور اس میں کوئی عیب و نقص نہ ہوگا اور یہ تمہارے لیے ایک دُوسرا معجزہ ہے (واضمم یدک الٰی جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء اٰیۃ اخرٰی)[1]

اگرچہ (واضمم یدک الٰی جناحک ۔ ۔ ۔) کے جملے کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں لیکن سورہ قصص کی آیہ ۳۲ کی طرف توجہ کرنے سے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے :

اسلک یدک فی جیبک

اور سورہ نمل کی آیہ ۱۲ جس میں یہ بیان ہوا ہے :

وادخل یدک فی جیبک

بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ جناب موسیٰ کو اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالیں ۔ اور اُسے بغل یا پہلو کے نیچے تک لے جائیں (کیونکہ جناح اصل میں پرندوں کے پروں کے معنی میں ہے اور یہاں ہوسکتا ہے کہ زیرِ بغل کے لیے کنایہ ہو)۔

" بیضاء " سفید کے معنی میں ہے، اور " من غیر سوء " اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تیرے ہاتھ کی سفیدی برص یا اُسی جیسی کسی بیماری کے اثر سے نہ ہوگی، کیونکہ اس میں ایک خاص قسم کی چمک اور روشنی ہوگی، وہ ایک لمحہ کے لیے ظاہر ہوگی اور دوسرے ہی لمحہ میں غائب ہو جائے گی ۔

لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں انتہائی زیادہ نورانیت پیدا ہو جاتی تھی، اگر ایسا تھا تو پھر ہمیں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ (من غیر سوء) کا مفہوم اس کے علاوہ بھی ہے کہ جو ہم نے اُوپر بیان کیا ہے یعنی اُس میں ایک ایسی

[1] " اٰیۃ " منصوب ہے، کیونکہ یہ ایک ایسا اسم ہے جو حال کی جگہ آیا ہے، اِس ضمیر کا حال ہے کہ جو " تخرج " میں مستتر ہے۔

بے عیب نورانیت تھی، جو نہ آنکھ کو تکلیف دیتی تھی نہ اُس کے درمیان کوئی سیاہ دھبہ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کوئی اور ایسی چیز تھی۔

❖ ❖ ❖

پہلی آیات میں جو کچھ بیان کیا گیا اُس سے نتیجہ نکالتے ہوئے آخری زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ان کو تیرے اختیار میں دے دیا ہے، تاکہ ہم تجھے اپنی عظیم نشانیاں دکھائیں (لنریك من اٰیاتنا الکبریٰ)۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ "آیاتِ کبریٰ" سے مراد وہی دو اہم معجزے ہیں کہ جن کا اُوپر ذکر آیا ہے، اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ دوسرے معجزات کی طرف اشارہ ہے جو خدا نے جناب موسیٰ کو بعد میں عطا فرمائے، یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے۔

❖ ❖

چند اہم نکات:

۱۔ **دو عظیم معجزے:** اس میں شک نہیں کہ موسیٰ کے عصا کے ایک بہت بڑے سانپ میں تبدیل ہو جانے کے بارے میں زیر نظر آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے یہاں تک کہ سورہ اعراف کی آیات ۱۰۷ میں اُسے "ثعبان" (اژدھا) سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی طرح ایک مختصر سے لمحہ کے لیے ہاتھ میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہونا اور پھر اس کا پہلی حالت کی طرف پلٹ جانا، یہ ایک معمولی یا نادر و کمیاب امر نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں خلافِ معمول اور معجزہ شمار ہوتے ہیں۔ جو ایک مافوق بشر قوت کے سہارے اور مدد کے سوا یعنی خدائے عظیم کی قدرت کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔

جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے علم و قدرت کو بے پایاں سمجھتے ہیں وہ ان امور کا ہرگز انکار نہیں کر سکتے، اور نہ ہی مادہ پرستوں کی طرح اسے خرافات کہہ سکتے ہیں۔

معجزہ میں جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ وہ عقلی طور پر محال نہ ہو اور یہ بات اس مقام پر پُورے طور سے صادق آتی ہے، کیونکہ کوئی عقلی دلیل عصا کے بہت بڑے سانپ میں تبدیل ہونے کے امکان کی نفی پر دلالت نہیں کرتی۔

کیا عصا اور بڑا سانپ دونوں ماضی بعید میں مٹی سے ہی پیدا نہیں ہوتے؟ یقینی طور پر شاید لاکھوں یا کروڑوں سال گزر گئے ہوں کہ جب اس قسم کی موجودات وجود میں آئی ہوں (اور اس مسئلہ میں کوئی فرق نہیں ہے خواہ ہم انواع کے ثبوت کو مانیں یا اس کے ارتقا کے قائل ہوں، کیونکہ ہر حال میں درختوں کی لکڑی بھی مٹی سے ہی پیدا ہوئی ہے اور حیوانات بھی)۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ یہ کام معجزانہ طور پر انجام پایا ہے کیونکہ وہ مراحل جو ہزاروں سالوں میں طے ہونے چاہئیں تھے وہ ایک لمحے اور ایک انتہائی کم اور مختصر مدت میں انجام پا گئے ہیں، کیا ایسا کام محال نظر آتا ہے؟

ممکن ہے کہ میں تو ایک ضخیم کتاب کو ہاتھ سے ایک سال میں لکھوں، اب اگر کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے کہ وہ اعجاز کے سہارے اتنی تیزی کے ساتھ لکھے کہ وہ ایک گھنٹے یا اس سے بھی کم وقت میں لکھی جائے، تو یہ محال عقلی نہیں ہے، یہ خلافِ معمول ہے (غور کیجئے گا)۔

بہر حال معجزات کے بارے میں عاجلانہ فیصلے اور خدا نخواستہ ان کو خرافات کہنا منطق اور عقل سے دُور ہے، محض ایک چیز جو کبھی کبھی ایسے

افکار کو جنم دیتی ہے یہ ہے کہ ہم معمول کی علت و معلول کے خوگر ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان کو ایک ضرورت قرار دینے لگ گئے ہیں اور جو کچھ اس کے خلاف ہو اسے مخالف ضرورت سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ ان طبعی اور عادی علت و معلول کی شکل ہرگز بھی ضرورت کا پہلو نہیں رکھتی، اور اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ماوق طبیعت عامل ان میں تبدیلیاں پیدا کر دے۔[1]

۲۔ **چیزوں کی فوق العادت استعداد** : مسلمہ طور پر جس دن حضرت موسیٰؑ نے چرواہوں والی وہ لاٹھی اپنے لیے منتخب کی تھی وہ یہ نہ جانتے تھے کہ یہ سادہ سا وجود خدا کے حکم سے اتنا عظیم کام کرے گا۔ اس طرح سے کہ فرعون کی قدرت کو درہم و برہم کر کے رکھ دے گا لیکن خدا نے اُسے دکھایا کہ اسی سادہ سے وسیلے کے ذریعہ ایسی خارق العادت قوت پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ دراصل تمام انسانوں کے لیے ایک درس ہے کہ وہ اس دُنیا میں کسی چیز کو معمولی نہ سمجھیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جن چیزوں یا افراد کو ہم حقارت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، ان کے اندر ایک عظیم طاقت پنہاں ہوتی ہے کہ جس سے ہم بے خبر ہوتے ہیں۔

۳۔ **تورات اس بارے میں کیا کہتی ہے** : زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے کہ موسیٰ نے جس وقت اپنے ہاتھ کو گریبان سے باہر نکالا تو وہ بلا کسی عیب کے سفید اور روشن تھا۔ ممکن ہے یہ جملہ اس تعبیر کی نفی کے لیے ہو جو توریت میں تحریف شدہ دکھائی دیتا ہے چونکہ اس موجودہ تورات میں اس طرح لکھا ہے:

> اور خدا نے پھر اُس سے کہا ; اب تُو اپنے ہاتھ کو اپنی بغل میں دے لے، تو موسیٰ نے اپنے ہاتھ کو بغل میں دے لیا، اور پھر اس کو باہر نکالا، تو اس کا ہاتھ برف کی مانند مبروص تھا۔[2]

کلمہ "مبروص" "برص" کے مادہ سے کوڑھ کے معنی میں ہے جو ایک قسم کی بیماری ہے، اور مسلمہ طور پر اس تعبیر کا اس موقع پر استعمال غلط اور ناجائز ہے۔

۲۴۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۟

۲۵۔ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۟

۲۶۔ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۟

۲۷۔ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۟

۲۸۔ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۟

۲۹۔ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۟

۳۰۔ هٰرُوْنَ اَخِي ۟

---

[1] اس کے بارے میں ہم نے جلد ۶ / ب پر بھی بات کی ہے۔

[2] تورات سفر خروج فصل : ۴ ، جلد : ۶ ۔

۳۱۔ اُشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ۝

۳۲۔ وَاَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ ۝

۳۳۔ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ۝

۳۴۔ وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ۝

۳۵۔ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ۝

۳۶۔ قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰى ۝

ترجمہ

۲۴۔ فرعون کے پاس جا کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔

۲۵۔ عرض کیا، پروردگارا! میرے سینہ کو کشادہ کر دے۔

۲۶۔ میرے کام کو مجھ پر آسان کر دے۔

۲۷۔ اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے۔

۲۸۔ تاکہ وہ میری باتوں کو سمجھیں۔

۲۹۔ میرے خاندان میں سے میرا ایک وزیر قرار دے۔

۳۰۔ میرے بھائی ہارون کو۔

۳۱۔ اس کے ذریعے میری کمر کو مضبوط کر دے۔

۳۲۔ اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔

۳۳۔ تاکہ ہم تیری بہت بہت تسبیح کریں۔

۳۴۔ اور تجھے بہت بہت یاد کریں۔

۳۵۔ کیونکہ تو ہمیشہ ہماری حالت سے آگاہ رہا ہے۔

۳۶۔ فرمایا: اے موسٰیؑ تو نے جتنی درخواستیں کیں وہ سب کی سب تجھے عطا کر دی گئیں۔

تفسیر

موسٰیؑ کے سنجے تلے تقاضے:

اب حضرت موسٰیؑ مرتبۂ نبوت پر فائز ہو چکے ہیں اور انہوں نے اہم معجزات حاصل کر لیے ہیں، لیکن اس کے بعد ان کے

نام فرمانِ رسالت صادر ہوتا ہے، ایسی رسالت کہ جو بہت ہی عظیم اور سنگین ہے، ایسی رسالت جو علاقے کے طاقتور ترین اور خطرناک ترین لوگوں کو فرمانِ الٰہی پہنچانے سے شروع ہوتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے: فرعون کی طرف جا کہ وہ سرکش ہو گیا ہے (اذھب الی فرعون انہ طغیٰ)۔

ہاں ایک فاسد اور خراب شدہ ماحول کی اصلاح اور ہر جہت سے ایک انقلاب برپا کرنے کے لیے فساد کے سرغنوں اور کفر کے سربراہوں سے کام شروع کرنا چاہیئے، ایسے لوگوں سے کہ جو معاشرے کے تمام لوگوں میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور وہ خود یا اُن کے افکار و نظریات یا ان کے اعوان و انصار ہر جگہ موجود ہوتے ہیں، ایسے لوگ کہ جنہوں نے تمام تبلیغی، نشریاتی، اقتصادی اور سیاسی اداروں کو اپنے قبضہ میں لیا ہوا ہے۔ اگر ان کی اصلاح ہو جائے یا اصلاح نہ ہونے کی صورت میں وہ جڑ سے اُکھاڑ پھینکے جائیں تو معاشرے کی نجات کی اُمید کی جا سکتی ہے، ورنہ جس قسم کی بھی اصلاح ہوگی، وہ وقتی، سطحی اور ناپائیدار ہوگی۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ: فرعون سے شروع کرنے کے لازم ہونے کی دلیل، ایک مختصر سے جملہ "انہ طغیٰ" (اس نے طغیان کیا ہے) میں بیان ہوئی ہے کہ اس کلمۂ "طغیان" میں سب کچھ جمع ہے، ہاں طغیان و سرکشی بھی اور زندگی کے تمام شعبوں میں حد سے تجاوز بھی، اور اسی بنا پر اس قسم کے افراد کو "طاغوت" کہا جاتا ہے کہ جو اسی مادہ سے لیا گیا ہے۔

موسیٰؑ — اس قسم کی سنگین ماموریت پر نہ صرف گھبرائے نہیں، بلکہ معمولی سی تخفیف کے لیے بھی خدا سے درخواست نہ کی، اور کھلے دل سے اس کا استقبال کیا۔ زیادہ سے زیادہ اس ماموریت کے سلسلے میں کامیابی کے وسائل کی خدا سے درخواست کی۔

اور چونکہ کامیابی کا پہلا ذریعہ عظیم رُوح، فکرِ بلند اور عقل توانا ہے، اور دوسرے لفظوں میں سینہ کی کشادگی و شرحِ صدر ہے لہٰذا: عرض کیا میرے پروردگار! میرا سینہ کشادہ کر دے (قال رب اشرح لی صدری)۔

ہاں! ایک رہبرِ انقلاب کا سب سے اوّلین سرمایہ، کشادہ دلی، فراواں حوصلہ، استقامت و بُردباری اور مشکلات کے بوجھ کو اُٹھانا ہے۔ اسی بنا پر امیرالمومنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ:

آلة الرياسة سعة الصدر

سینہ کی کشادگی رہبری و قیادت کا وسیلہ ہے[1]

(شرحِ صدر اور اس کے مفہوم کے بارے میں ہم اس تفسیر کی جلد ۵ میں سورہ انعام کی آیہ ۲۵ کے ذیل میں بھی بحث کر چکے ہیں)۔

اور چونکہ اس راستے میں بے شمار مشکلات ہیں، جو خدا کے لطف و کرم کے بغیر حل نہیں ہوتیں، لہٰذا خدا سے دُوسرا سوال یہ کیا کہ میرے کاموں کو مجھ پر آسان کر دے اور مشکلات کو راستے سے ہٹا دے۔ آپ نے عرض کیا: "میرے کام کو آسان کر دے" (ویسر لی امری)

اس کے بعد جنابِ موسیٰؑ نے زیادہ سے زیادہ قوتِ بیان کا تقاضا کیا۔ کہنے لگے میری زبان کی گرہ کھول دے۔ (واحلل عقدة من لسانی)۔

یہ ٹھیک ہے کہ شرحِ صدر کا ہونا بہت اہم بات ہے، لیکن یہ سرمایہ اسی صورت میں کام دے سکتا ہے، جب اس کو ظاہر کرنے کی قدرت بھی کامل طور پر موجود ہو۔ اسی بنا پر جنابِ موسیٰؑ نے شرحِ صدر اور رکاوٹوں کے دُور ہونے کی درخواستوں کے بعد یہ تقاضا کیا کہ خدا ان کی زبان کی گرہ کھول دے۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار حکمت ۱۷۶۔

اور خصوصیت کے ساتھ اس کی علت یہ بیان کی : تاکہ وہ میری باتوں کو سمجھیں (یفقھوا قولی)۔

یہ جملہ حقیقت میں پہلی آیت کی تفسیر کر رہا ہے اور اس سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ زبان کی گرہ کے کھلنے سے مُراد یہ نہ تھی کہ موسٰی کی زبان میں بچپنے میں جل جانے کی وجہ سے کوئی لکنت آگئی تھی ــــ جیسا کہ بعض مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے ــــ بلکہ اس سے گفتگو میں ایسی رکاوٹ ہے جو سُننے والے کے لیے سمجھنے میں مانع ہوتی ہے، یعنی میں ایسی فصیح و بلیغ اور ذہن میں بیٹھ جانے والی گفتگو کروں کہ ہر سننے والا میرا مقصد اچھی طرح سے سمجھ لے۔

سورہ قصص کی آیہ ۳۴ اس تفسیر کی شاہد ہے :

واخی ھارون ھوا فصح منی لسانًا

میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ " افصح " " فصیح " کے مادہ سے دراصل کسی چیز کے زائد باتوں سے پاک ہونے کے معنی میں ہے۔ بعد میں ایسی گفتگو، کے لیے استعمال ہونے لگا جو فہمیدہ، رسا، منہ بولتی اور ہر غیر ضروری چیز سے پاک ہو۔

بہرحال ایک کامیاب رہبر و رہنما وہ ہوتا ہے کہ جو سوچ فکر اور قدرت رُوح کے علاوہ ایسی فصیح و بلیغ گفتگو کرسکے کہ جو ہر قسم کے ابہام اور نارسائی سے پاک ہو۔

نیز اس بارِ سنگین کے لیے ــــ یعنی رسالت الٰہی، رہبریٔ بشر اور طاغوتوں اور جابروں کے ساتھ مقابلے کے لیے یار و مددگار کی ضرورت ہے اور یہ کام تنہا سرانجام دینا ممکن نہیں ہے لہذا حضرت موسٰیؑ نے پروردگار سے جو چوتھی درخواست کی وہ یہ تھی: خداوندا! میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک وزیر اور مددگار قرار دے (واجعل لی وزیرا من اھلی)۔

" وزیر " " وزر " کے مادہ سے دراصل سنگین بوجھ کے معنی میں ہے اور چونکہ وزیر نظام مملکت میں بہت بھاری بوجھ اُٹھاتے ہیں لہذا یہ لفظ ان کے لیے بولا جانے لگا۔ نیز لفظ " وزیر " کا معاون اور یار و مددگار پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

البتہ یہ بات کہ حضرت موسٰیؑ تقاضا کر رہے ہیں کہ یہ وزیر اُن ہی کے خاندان سے ہو، اس کی دلیل واضح ہے۔ چونکہ اُس کے بارے میں معرفت اور شناخت بھی زیادہ ہوگی اور اس کی ہمدردیاں بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ہوں گی۔ کتنی اچھی بات ہے کہ انسان کسی ایسے شخص کو اپنا شریکِ کار بنائے کہ جو رُوحانی اور جسمانی رشتوں کے حوالے سے اُس سے مربوط ہو۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد خصوصی طور پر اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا : یہ ذمّہ داری میرے بھائی ہارون کے سپرد کر دے۔ (ھارون اخی)۔

ہارونؑ بعض مفسرین کے قول کے مطابق حضرت موسٰیؑ کے بڑے بھائی تھے اور اُن سے تین سال بڑے تھے۔ بلند قامت، فصیح البیان اور اعلیٰ علمی قابلیت کے مالک تھے۔ انہوں نے حضرت موسٰیؑ کی وفات سے تین سال پہلے رحلت فرمائی۔[1]

وہ پیغمبر مرسل تھے جیسا کہ سُورہ مومنون کی آیہ ۴۵ میں بیان ہوا ہے :

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ثم ارسلنا موسٰی واخاہ ھارون بآیاتنا و سلطان مبین

اور وہ نور اور باطنی روشنی کے بھی حامل تھے، اور حق و باطل میں خُوب تمیز بھی رکھتے تھے۔ جیسا کہ سورۂ انبیاء کی آیہ ۴۸ میں بیان ہوا ہے :

ولقد اٰتینا موسٰی و ھارون الفرقان وضیاءً

آخری بات یہ ہے کہ وہ ایک ایسے پیغمبر تھے جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے موسٰی کو بخشا تھا :

ووھبنا له من رحمتنا اخاہ ھارون نبیًّا (مریم - ۵۳)

وہ اس بھاری ذمّہ داری کی انجام دہی میں اپنے بھائی موسٰی کے دوش بدوش مصروف کار رہے ۔

یہ ٹھیک ہے کہ موسٰی نے اس اندھیری رات میں، اس وادیٔ مقدس کے اندر، جب خدا سے فرمانِ رسالت کے ملنے کے وقت یہ تقاضا کیا، تو وہ اُس وقت دس سال سے بھی زیادہ اپنے وطن سے دُور گزار کر آ رہے تھے، لیکن اصولی طور پر اس عرصہ میں بھی اپنے بھائی کے ساتھ ان کا رابطہ کامل طور پر منقطع نہ ہوا۔ اسی لیے اس صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کے بارے میں بات کر رہے ہیں، اور خدا کی درگاہ سے اِس عظیم مشن میں اس کی شرکت کے لیے تقاضا کر رہے ہیں ۔

اِس کے بعد جناب موسٰیؑ ہارونؑ کو وزارت و معاونت پر متعین کرنے کے لیے اپنے مقصد کو اس طرح بیان کرتے ہیں : خداوندا! میری پشت اس کے ذریعے مضبوط کر دے ۔ (اشدد به ازری)۔

" ازر " دراصل " ازار " کے مادہ سے لباس کے معنی میں لیا گیا ہے، خاص طور پر اِس لباس کو کہا جاتا ہے جس کے بند کی کمر میں گرہ لگائی جاتی ہے۔ اسی سبب سے کبھی یہ لفظ "کمر" پر یا "قوت" و "قدرت" کے معنی میں بھی آتا ہے ۔

❖ ❖ ❖

اِس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ تقاضا کرتے ہیں : اسے میرے کام میں شریک کر دے (واشرکه فی امری)۔

وہ مرتبہ رسالت میں بھی شریک ہو اور اس عظیم کام کو روبہ عمل لانے میں بھی شرکت کرے۔ البتہ حضرت ہارون ہر حال میں تمام پروگراموں میں جناب موسٰیؑ کے پیرو تھے اور موسٰیؑ ان کے امام و پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے۔

آخر میں اپنی تمام درخواستوں کا نتیجہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؛ تاکہ ہم تیری بہت بہت تسبیح کریں (کی نسبحك کثیرًا)۔

اور تجھے بہت بہت یاد کریں (و نذکرك کثیرًا)

کیونکہ تُو ہمیشہ ہی ہمارے حالات سے آگاہ رہا ہے (انك کنت بنا بصیرًا)۔

تو ہماری ضروریات و حاجات کو اچھی طرح جانتا ہے اور اس راستے کی مشکلات سے ہر کسی کی نسبت زیادہ آگاہ ہے، ہم تجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ تو ہمیں اپنے فرمان کی اطاعت کی قدرت عطا فرما دے اور ہمارے فرائض، ذمّہ داریوں، اور فرائض کے انجام دینے کے لیے ہمیں توفیق اور کامیابی عطا فرما ۔

چونکہ جناب موسٰیؑ کا اپنے مخلصانہ تقاضوں میں سوائے زیادہ سے زیادہ اور کامل تر خدمت کے اور کچھ مقصد نہیں تھا، لہٰذا خدا نے ان کے تقاضوں کو اسی وقت قبول کر لیا : " اُس نے کہا: اے موسٰیؑ ! تمہاری تمام درخواستیں قبول ہیں " (قال قد اوتیت سؤلك یا موسٰی)۔

حقیقت میں ان حساس اور تقدیر ساز لمحات میں چونکہ موسیٰؑ پہلی مرتبہ خدائے عظیم کی بساطِ مہمانی پر قدم رکھ رہے تھے، لہٰذا جس جس چیز کی انہیں ضرورت تھی ان کا خدا سے اکٹھا ہی تقاضا کر لیا، اور اُس نے بھی مہمان کا انتہائی احترام کیا، اور اس کی تمام درخواستوں اور تقاضوں کو ایک مختصر سے جملے میں حیات بخش ندا کے ساتھ قبول کر لیا اور اس میں کسی قسم کی قید و شرط عائد کی اور موسیٰؑ کا نام مکرر لا کر، ہر قسم کے ابہام کو دُور کرتے ہوئے اس کی تکمیل کر دی، یہ بات کس قدر شوق انگیز اور افتخار آفرین ہے کہ بندے کا نام مولا کی زبان پر بار بار آئے۔

چند اہم نکات:

۱۔ انقلاب کی رہبری کی شرائط: اس میں شک نہیں کہ انسانی معاشروں میں بنیادی تبدیلیاں، اور مادی اور شرک آلود قدروں کی معنوی اور انسانی قدروں میں تبدیلی، خاص طور پر ایسے مقام پر کہ جس کا راستہ فرعونوں اور خود سر لوگوں کی قلمرو سے ہو کر گزرتا ہو، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایسا کام رُوحانی و جسمانی آمادگی، قدرتِ فکر اور قوتِ بیان، راستے سے آگاہی، خدائی امداد نیز قابلِ اطمینان اور بہادر یار و مددگار کا محتاج ہوتا ہے۔

یہ وہی امور ہیں جن کا حضرت موسیٰؑ نے اس عظیم رسالت کے آغاز میں ہی خدا سے تقاضا کیا۔

یہ امور خود یہ بات واضح کرتے ہیں کہ موسیٰؑ نبوت سے پہلے بھی بیدار اور آمادہ رُوح رکھتے تھے اور یہ امور اس حقیقت کو بھی واضح کر رہے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے ہر جہت سے اچھی طرح واقف تھے اور وہ یہ جانتے تھے کہ ان حالات میں کن ہتھیاروں کے ساتھ میدان میں آنا چاہیئے تاکہ فرعونی نظام کے ساتھ مقابلے کی طاقت موجود ہو۔

اور یہ ہر زمانے میں، تمام خدائی رہبروں اور اس راستے کے تمام راہ رو افراد کے لیے ایک نمونہ ہے۔

۲۔ سرکشوں کے خلاف جنگ: اس میں شک نہیں کہ فرعون میں بہت سی انحرافی باتیں موجود تھیں۔ وہ کافر تھا، بُت پرست تھا، ظالم اور بیداد گر تھا، وغیرہ وغیرہ لیکن قرآن نے ان تمام انحرافات میں سے صرف اس کے "طغیان" کا ذکر کیا ہے، : (انہ طغٰی) کیونکہ خدا کے فرمان سے طغیان اور سرکشی کی رُوح ان تمام انحرافات کا نچوڑ اور ان سب باتوں کی جامع ہے۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے مرحلے میں انبیاء کا ہدف و مقصد طاغوتوں اور مستکبرین سے مقابلہ ہوتا ہے اور مارکسسٹ مذہب کا جو تجزیہ کرتے ہیں یہ بات اس کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ وہ مذہب کو طغیان گروں اور استعمار پیشہ لوگوں کا خدمت گار سمجھتے ہیں۔

ممکن ہے ان کی یہ باتیں خود ساختہ غیر معقول مذاہب کے بارے میں صحیح ہوں۔ لیکن سچے انبیاء کی تاریخ، مذاہب آسمانی کے بارے میں ان کے بے ہودہ خیالات کی پُوری صراحت کے ساتھ سو فیصد نفی کرتی ہے۔ اس سلسلے میں موسیٰ بن عمران کا قیام خاص طور پر ایک شاہد ناطق ہے۔

۳۔ ہر کام کے لیے پروگرام اور وسائل کی ضرورت ہے: حضرت موسیٰؑ کی زندگی کا یہ حصہ ہمیں جو دوسرا سبق دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین تک بھی اپنے کاموں کی پیش رفت کے لیے اتنے معجزات رکھنے کے باوجود عام وسائل سے مدد لیتے تھے۔ مؤثر اور بیانِ رسا کے ذریعے بھی اور معاونین کی فکری و جسمانی قوت و طاقت سے بھی۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم زندگی میں ہمیشہ معجزات کی انتظار میں رہیں بلکہ پروگرام اور وسائل کار کو تیار کرنا چاہیئے۔ اور طبیعی طریقوں سے پیش رفت کو جاری رکھنا چاہیئے اور جہاں کاموں میں رکاوٹ پڑ جائے تو وہاں خدائی لطف وکرم کا انتظار کرنا چاہیئے۔

۴۔ **تسبیح اور ذکر:** جیسا کہ زیر نظر آیات میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنی درخواستوں کا اصلی مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ: تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح کریں اور تجھے بہت بہت یاد کریں۔

یہ بات واضح ہے کہ "تسبیح" کے معنی خدا کو "شرک اور امکانی نقائص" کی تہمت سے منزّہ و مبرّا قرار دینا ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جناب موسیٰؑ کی مراد یہ نہ تھی کہ "سبحان اللہ" کے جملے کی مسلسل تکرار کرتے رہیں بلکہ اصل مقصد اس زمانہ کے آلودہ معاشرے میں اس کی حقیقت کو رُو بہ عمل لانا تھا یعنی بتوں کو ختم کرنا، بُت خانوں کو ویران کرنا، ذہنوں کو شرک آلود افکار سے پاک کرنا اور مادی و معنوی نقائص کو دُور کرنا۔ یہ تھی ان کے نزدیک تسبیح اور یہ تھا ان کے قرین ذکر الٰہی۔ اس راستے سے گزر کردہ ذکرِ خدا، اس کی یاد اور اس کی صفات کی یاد دلوں میں زندہ کرنا چاہتے تھے اور صفاتِ خداوندی کو معاشرے، پر سایہ فگن کرنا چاہتے تھے۔ لفظ "کثیراً" کا استعمال اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اسے عمومی شکل دینا چاہتے تھے اور ایک محدود دائرے میں مخصوص رہنے سے نکالنا چاہتے تھے۔

۵۔ **پیغمبر اسلامؐ بھی موسیٰؑ کے تقاضوں کی تکرار کرتے ہیں:** ان روایات سے کہ جو علمائے اہلسنّت کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں اور شیعہ علماء کی کتابوں میں بھی وارد ہوئی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے بھی انہی وسائل کی، جو حضرت موسیٰؑ نے اپنے مقاصد کی پیش رفت کے لیے خدا سے چاہے تھے، تمنا کی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ آپؐ نے ہارونؑ کے نام کی جگہ علی علیہ السلام کا نام لیا اور اس طرح عرض کیا:

"اللّٰھم انی اسألك بما سألك اخی موسیٰ ان تشرح لی صدری، وان تیسرلی امری، وان تحل عقدة من لسانی، یفقھوا قولی، واجعل لی وزیرًا من اھلی، علیًا اخی، اشدد به ازری، واشرکه فی امری کی نسبحك کثیرًا ونذکرك کثیرًا، انك کنت بنا بصیرًا

پروردگارا! میں بھی تجھ سے وہی سوال کرتا ہوں جس کا میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے تقاضا کیا تھا، میں تجھ سے یہ چاہتا ہوں کہ تُو میرے سینے کو کشادہ رکھ، کاموں کو مجھ پر آسان کر دے، میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری باتوں کو سمجھیں، میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک وزیر قرار دے، میرے بھائی علی (علیہ السلام) کو، خداوندا میری پُشت کو اس کے ذریعے مضبوط کر دے اور اسے میرے کام میں شریک کر دے تاکہ ہم تیری بہت بہت تسبیح کریں اور تجھے بہت بہت یاد کریں کیونکہ تُو ہمارے حال سے اچھی طرح آگاہ ہے۔"

اس حدیث کو سیوطی نے تفسیر درالمنثور میں اور مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اور بہت سے دُوسرے سُنّی و شیعہ بزرگ علماء نے کچھ تفاوت کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اسی حدیث سے مشابہ حدیث منزلت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا :

"الا ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی الا انہ لانبی بعدی"

کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسٰی سے تھی ، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

یہ حدیث جو اہل سنت کی پہلے درجے کی کتب میں بیان ہوئی ہے اور (تفسیر المیزان کے مطابق) محدث بحرانی نے اپنی کتاب "غایت المرام" میں اہل سنت کے طرق سے سو طریقوں سے اور شیعہ طرق سے ستر طریقوں سے نقل کیا ہے، اس قدر معتبر ہے کہ اس میں کسی قسم کے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

ہم نے حدیث منزلت کے بارے میں تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد میں سورۂ اعراف کی آیہ ۱۴۲ کے ذیل میں کافی بحث کی ہے۔

لیکن جس بات کا ذکر کرنا ہم یہاں ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ بعض مفسرین نے (جیسا کہ آلوسی نے رُوح المعانی میں) اصل روایت کو قبول کرنے کے ساتھ اس کی دلالت میں اعتراض کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جملہ (واشرکہ فی امری) اُس کو میرے کام میں شریک کر دے ، لوگوں کو حق کی طرف دعوت دینے اور ہدایت کرنے کے کاموں میں شرکت کرنے کے سوا اور کسی چیز کو ثابت نہیں کرتا۔"

لیکن یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ مسئلہ ہدایت و ارشاد میں شرکت ، اور دوسرے لفظوں میں امر بالمعروف ، نہی عن المنکر اور حق کی دعوت کو پھیلانا ہر مسلمان کا فرداً فرداً فریضہ ہے ، اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، علی علیہ السلام کے متعلق مانگتے' یہ تو ایک توضیح واضح ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعا کی ہرگز یہ تفسیر نہیں کی جاسکتی۔

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس سے امر نبوت میں شرکت بھی مراد نہیں تھی۔ بنابریں ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ نبوت کے علاوہ اور ارشاد و ہدایت کے عمومی فریضہ کے سوا کوئی اور خاص مقام و منصب تھا۔ تو کیا یہ ولایت خاصہ کے مسئلہ کے سوا کوئی اور چیز ہو سکتی ہے ؟ کیا یہ وہی خلافت (ایک خاص مفہوم میں جس کے شیعہ قائل ہیں) نہیں ہے ؟ اور لفظ " وزیرا " بھی اسی کی تائید اور تقویت کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں کچھ ذمہ داریاں ایسی ہیں کہ جو تمام لوگوں کا کام نہیں ہے اور وہ دین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر قسم کی تحریف و انحراف سے بچانا اور اس کی حفاظت کرنا اور دین کے مفاہیم کے بارے میں ہر قسم کے ابہام کی جو بعض کو لاحق ہو جاتا ہے، تفسیر کرنا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیبت میں اور ان کے بعد اُمت کی رہبری کرنا اور پیغمبر اکرمؐ کے مقاصد کی پیش رفت کے لیے انتہائی مؤثر طریقہ سے کمک اور مدد کرنا ہے۔

یہ سب کی سب وہی چیزیں ہیں کہ جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے " اشرکہ فی امری " کا جملہ کہہ کر خدا سے علیؑ کے بارے میں مانگی تھیں۔

اور اس سے یہ بات واضح و روشن ہو جاتی ہے کہ ہارونؑ کا موسٰیؑ سے پہلے وفات پا جانا اس بحث میں کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا۔ کیونکہ خلافت و جانشینی کبھی تو رہبر کی غیبت کے زمانے میں ہوتی ہے جیسا کہ ہارونؑ موسٰیؑ کی غیبت میں ان کے خلیفہ و جانشین تھے اور کبھی یہ رہبر کی وفات کے بعد ہوتی ہے جیسا کہ علی علیہ السلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جانشین ہوتے۔ دونوں ایک ہی قدر مشترک اور ایک ہی قدر جامع رکھتے ہیں اگرچہ ان کے مصداق مختلف ہیں (غور کیجیے گا)۔

۳۷۔ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ۝

۳۸۔ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ۝

۳۹۔ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ ۚ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ۝

۴۰۔ إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُ ۖ فَرَجَعْنَاكَ إِلَىٰ أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَاكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ ۝

۴۱۔ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۝

ترجمہ

۳۷۔ اور ایک مرتبہ اور بھی ہم نے تم پر احسان کیا تھا۔

۳۸۔ اس وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو وہ وحی کی تھی جس کی ضرورت تھی۔

۳۹۔ کہ تم اسے صندوق میں ڈال دو اور اس صندوق کو دریا میں بہا دو تو دریا اسے کنارے پر جا لگائے گا (وہاں سے) میرا دشمن

اور اس کا دشمن اُسے اُٹھائے گا اور میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی تھی تاکہ تم میری نگرانی میں پرورش کیے جاؤ۔

۴۰۔ اس وقت جبکہ تیری بہن (فرعون کے محل کے پاس) چل رہی تھی، اور کہہ رہی تھی۔ کیا مَیں تمہیں ایک ایسے گھر کی نشاندہی کروں جو اِس نومولود بچے کی کفالت کرے۔ (اور وہاں اِس کے لیے ایک اچھی دایہ ہے) تو پھر ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹا دیا۔ تاکہ اس کی آنکھیں تجھ سے ٹھنڈی رہیں اور وہ غمگین نہ ہو اور تُو نے (فرعونیوں میں سے) ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تجھے غم و اندوہ سے نجات دی، اور تمہیں ہر طرح سے آزمایا۔ اس کے بعد تُو کئی سال مدین کے لوگوں کے درمیان رہا پھر ایک معین وقت پر (فرمانِ رسالت کے حصول کے لیے) تُو اس جگہ آیا۔

۴۱۔ اور مَیں نے تجھے اپنے لیے پرورش کی۔

تفسیر

کتنا مہربان خدا ہے!

ان آیات میں خدا، حضرت موسیٰ کی زندگی کے ایک اور حصے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ان کے بچپن کے دور اور فرعونیوں کے غیظ و غضب سے معجزانہ طور پر نجات پانے سے متعلق ہے۔ اگرچہ تاریخی تسلسل کے لحاظ سے یہ حصہ زندگی، رسالت و نبوت کے زمانے سے پہلے تھا لیکن چونکہ موسیٰؑ پر خدا کی نعمتوں کا، موسیٰؑ کی آغازِ عمر سے بیان ہو رہا تھا۔ لہٰذا اہمیت کے اعتبار سے اسے موضوعِ رسالت سے دوسرے درجہ پر رکھا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے موسیٰ! ہم نے تجھ پر ایک مرتبہ پہلے بھی احسان کیا تھا اور تجھ کو اپنی نعمتوں سے نوازا تھا (ولقد مننا علیك مرة اخرٰی)[1]

اس اجمال کے ذکر کے بعد اس کی تفصیل شروع کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

اس وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو وہ وحی کی تھی جس وحی کی اس وقت ضرورت تھی:

(اِذ اَوحینا الی امك ما یوحٰی)۔

---

[1] جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے۔ لفظ "منت" اصل میں "من" سے لیا گیا ہے۔ اور یہ اُن بڑے بڑے پتھروں کے معنی میں ہے کہ جن کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر ہر گراں بہا نعمت بخشنے کو منت کہتے ہیں، اور زیرِ بحث آیت میں یہی معنی مراد ہے اور اس کا یہ مفہوم ایک پسندیدہ اور عمدہ مفہوم ہے لیکن اگر کوئی اپنے چھوٹے کام کو باتوں سے بڑا بنائے اور دوسرے پر احسان جتلائے تو یہ ایک بُرا کام ہے اور "منت" کا قابلِ مذمت مصداق ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس روز، موسیٰ کے فرعونیوں کے چنگل سے نجات پانے کے لیے جس قدر رہنمائی کی ضرورت تھی وہ سب ہم نے موسیٰ کی ماں کو تعلیم کر دی تھی۔

کیونکہ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو بڑی سختی کے ساتھ دبایا ہوا تھا۔ خاص طور پر اس نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دو اور لڑکیوں کو کنیزی کے لیے باقی رکھو۔ اس نے یہ حکم بنی اسرائیل کی قوت اور ان کی شورش کے احتمال سے بچنے کے لیے دے رکھا تھا یا مؤرخین اور مفسرین کی ایک جماعت کے قول کے مطابق اس بچے کو وجود میں آنے سے روکنے کے لیے کہ جس کے بارے میں یہ پیشین گوئی کی ہوئی تھی کہ وہ بنی اسرائیل سے اُٹھے گا، اور فرعون کا تخت حکومت اُلٹ کے رکھ دے گا۔

فرعون کے جاسوس بنی اسرائیل کے محلوں اور گھروں کی سختی کے ساتھ نگرانی کیا کرتے تھے اور لڑکوں کی پیدائش کی اطلاع دارالحکومت کو دیا کرتے تھے اور وہ بھی بہت جلد انہیں ہلاک کر دیا کرتے تھے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ایک طرف تو فرعون یہ چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل کی قوت کو ختم کر کے رکھ دے اور دوسری طرف ان کی نسل کے کلی طور پر خاتمہ پر بھی آمادہ نہیں تھا کیونکہ وہ اس کے لیے مہیا غلاموں کا کام دیتے تھے، لہٰذا اُس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ ایک سال کے پیدا ہونے والے بچوں کو زندہ رکھیں اور دوسرے سال کے لڑکوں کو تہ تیغ کر دیں۔ اتفاق سے موسیٰ اس سال پیدا ہوئے جو لڑکوں کے قتل عام کا سال تھا۔

بہرحال ماں نے محسوس کیا کہ اس کے نولود بچے کی جان خطرے میں ہے اور اسے وقتی طور پر مخفی رکھنے سے بھی مشکل حل نہیں ہوگی۔ ایسے وقت میں اُس خدا نے کہ جس نے اِس بچے کو ایک عظیم قیام کے لیے نامزد کیا ہوا ہے، اس ماں کے دل میں الہام کیا کہ اسے اب ہمارے حوالے کر دو اور دیکھتی رہو کہ ہم اس کی کس طرح حفاظت کریں گے اور اسے تیری طرف واپس لوٹا دیں گے۔

موسیٰؑ کی ماں کے دل پر یہ الہام ہوا: "تم اسے ایک صندوق میں ڈال دو اور صندوق کو دریا میں ڈال دو": (ان اقذفیه فی التابوت فاقذفیه فی الیم)۔

"یم" یہاں پر عظیم دریائے نیل کے معنی میں ہے کہ جس کی وسعت اور بہت زیادہ پانی کی وجہ سے کبھی اس پر سمندر کا اطلاق ہوتا ہے۔

"اقذفیه فی التابوت" (اس کو تابوت میں ڈال دو) کی تعبیر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی قسم کے خوف اور دہم کے بغیر دل کو مطمئن رکھو اور پوری جرأت و استقامت سے اُسے صندوق میں رکھ دو اور کسی قسم کی پروا کیے بغیر اسے دریائے نیل میں پھینک دو اور کسی قسم کا خوف نہ کھاؤ۔

لفظ "تابوت" لکڑی کے صندوق کے معنی میں ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ ہمیشہ اُس صندوق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں مُردوں کو رکھا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ جو بعض اوقات دوسرے صندوقوں پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ طالوت و جالوت کے واقعہ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۸ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: دریا اس بات پر مامور ہے کہ اس کو ساحل پر ڈال دے تاکہ آخرکار میرا دشمن بھی اور اس کا

[1] تفسیر نمونہ کی پہلی جلد، صفحہ ۵۷۹ (اردو ترجمہ) ـــــ کی طرف رجوع کریں۔

دشمن بھی اسے اُٹھائے (اور اپنے دامن میں اس کی پرورش کرے) (فلیلقه الیم بالساحل یأخذه عدو لی وعدو له)۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اس مقام پر لفظ "عدو" مکرر آیا ہے اور یہ درحقیقت فرعون کی خدا کے بارے میں بھی اور موسٰی اور بنی اسرائیل کے بارے میں بھی دشمنی پر ایک تاکید ہے، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص دشمنی اور عداوت میں اس حد تک پہنچا ہوا تھا اسی نے موسٰی کی خدمت اور پرورش اپنے ذمہ لے لی تاکہ خاکی بشر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ نہ صرف یہ کہ وہ فرمانِ خدا کے مقابلے میں کھڑا ہونے کی قدرت نہیں رکھتا، بلکہ خدا اس کے دشمن کی اسی کے ہاتھوں سے اور اُسی کے دامن میں پرورش کروا سکتا ہے۔

اور جس وقت خدا ظالم سرکشوں کی نابودی کا ارادہ کرے، تو انہیں اُنہیں کے ہاتھوں سے نابود کر دے اور جو آگ اُنہوں نے خود جلائی ہے اُسی کے ذریعے اُن کو جلا کر رکھ دے، کیسی عجیب قدرت کا مالک ہے وہ!

موسٰی کو اس نشیب و فراز سے پُر راستے میں ایک ڈھال کی ضرورت تھی لہٰذا خدا نے اپنی محبت کا سایہ اُن پر ڈال دیا۔ اس طرح سے کہ جو بھی انہیں دیکھے ان کا فریفتہ اور گرویدہ ہو جائے، نہ صرف یہ کہ ان کے قتل کیے جانے پر راضی نہ ہو بلکہ وہ اس بات پر بھی راضی نہ ہو کہ ان کا کوئی بال بھی بیکا ہو جائے، جیسا کہ قرآن ان آیات کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

میں نے اپنی طرف سے تیرے اُوپر محبت ڈال دی (والقیت علیك محبة منی)۔

کتنی عجیب و غریب ڈھال ہے کہ جو بالکل دکھائی نہیں دیتی، لیکن فولاد اور لوہے سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔

کہتے ہیں کہ موسٰیؑ کی دایہ آلِ فرعون میں سے تھی اور اس کا یہ پکا ارادہ تھا کہ اس کی ولادت کی خبر جابر فرعون کے دربار میں جا کر دے، لیکن جب اس کی نگاہیں پہلی مرتبہ نومولود کی آنکھوں پر پڑیں، تو اسے ایسے لگا جیسے اس کی آنکھوں میں ایک بجلی کوندگئی ہو جس نے دایہ کے دل کو روشن و منور کر دیا اور وہ موسٰیؑ کی فریفتہ ہوگئی اور ہر قسم کا بُرا ارادہ اس کے دماغ سے نکل گیا۔

اس سلسلے میں ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

> جب موسٰی پیدا ہوئے اور ان کی والدہ نے دیکھا کہ یہ نومولود لڑکا ہے تو ان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا، اس پر دایہ نے پوچھا کہ تیرا رنگ اس طرح سے کیوں زرد ہو گیا تو اُنہوں نے کہا مجھے اس بات کا خوف ہے کہ میرے بیٹے کا سر قلم کر دیا جائے گا، لیکن دایہ نے کہا: تم ہرگز اس قسم کا خوف نہ کرو۔
>
> وكان موسٰى لا يراه احد الا احبه
>
> موسٰی کی حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی انہیں دیکھتا تھا ان سے محبت کرنے لگ جاتا تھا[1]

اور یہی محبت کی وہ ڈھال تھی کہ جس نے ان کی فرعون کے دربار میں بھی پُوری طرح حفاظت کی۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اس سے مقصد یہ تھا کہ تُو میرے حضور اور میرے ہی علم کی نگاہوں کے سامنے پرورش پائے (ولتصنع علی عینی)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ آسمان و زمین کا کوئی بھی ذرہ خدا کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے اور سب اُس کی بارگاہ میں حاضر ہیں لیکن یہ تعبیر

---

[1] نور الثقلین، جلد ۳، ص ۳۷۸۔

اس جگہ ایک خاص عنایت کی طرف اشارہ ہے کہ جو خدا نے حضرت موسیٰؑ پر ان کی پرورش کے سلسلے میں کی۔

اگرچہ بعض مفسرین نے "ولتصنع علی عینی" کو حضرت موسیٰؑ کی شیر خواری وغیرہ کے زمانے تک محدود سمجھا ہے لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی پرورش و تربیت اور موسیٰ کا پروردگار کی خاص عنایت سے پرچم رسالت اٹھانے کے لائق اور اہل بننا تک شامل ہے۔

❊ ❊ ❊

ان آیات اور قرآن مجید کی ان ہی جیسی دوسری آیات میں موجود قرائن سے اور روایات و تواریخ میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اُس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ موسیٰؑ کی ماں نے آخرکار وحشت و پریشانی کے ساتھ اس صندوق کو کہ جس میں موسیٰؑ کو رکھا گیا تھا، دریائے نیل میں ڈال دیا، نیل کی موجوں نے اسے اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا، ماں جو اس منظر کو دیکھ رہی تھی، وہ غم اور حسرت سے دیکھتی رہ گئی۔ لیکن خدا نے اس کے دل میں الہام کیا، کہ تم اپنے دل میں کسی قسم کا غم نہ کرو، ہم بالآخر اُسے صحیح وسالم تیری طرف لوٹا دیں گے۔

فرعون کا محل دریائے نیل کے ایک کنارے پر بنا ہوا تھا۔ ایک احتمال یہ ہے کہ اس عظیم دریا کی ایک شاخ اس کے محل کے اندر سے گزرتی تھی پانی کی موجیں موسیٰؑ کی نجات کے صندوق کو اپنے ساتھ اس شاخ کی طرف کھینچ لائیں۔ اس وقت فرعون اور اس کی بیوی پانی کے کنارے دریا کی لہروں کا نظارہ کر رہے تھے۔ اچانک اِس پُراسرار صندوق نے ان کی توجہ کو اپنی طرف موڑ لیا۔ فرعون نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ صندوق کو پانی سے نکال لائیں۔ جب صندوق کو کھولا گیا تو انہوں نے انتہائی تعجب کے ساتھ اس میں ایک خوبصورت نومولود بچے کو دیکھا۔ اور یہ ایسی چیز تھی کہ جس کا انہیں گمان تک بھی نہ تھا۔

فرعون کو خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ نومولود بچہ ضروری طور پر بنی اسرائیل میں سے ہے جو مامورین دربار کے خوف سے اس قسم کے انجام سے دوچار ہوا ہے، لہٰذا اس نے اس کے قتل کرنے کا حکم دے دیا لیکن اس کی بیوی جو بانجھ تھی وہ بچے کی محبت میں گرفتار ہوگئی اور ایک ایسی پُراسرار شعاع اس نومولود بچہ کی آنکھ سے نکلی جو اُس عورت کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی اور اسے اپنا گرویدہ اور فریفتہ بنا لیا۔ اس نے فرعون کا دامن پکڑ لیا وہ کہہ رہی تھی یہ بچہ تو آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ اُس نے تقاضا کیا کہ وہ اس بچے کے قتل سے باز آجائے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس نے درخواست کی کہ ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں اور اسے اپنے مستقبل کی اُمیدوں کے سرمایہ کے طور پر اپنے دامن میں پروان چڑھائیں۔ آخرکار وہ بڑے اصرار سے اپنی بات کو بادشاہ کے دل میں بٹھانے میں کامیاب ہوگئی۔

دُوسری طرف بچے کو بھوک لگ گئی۔ وہ دُودھ کے لیے بے چین تھا، رو رہا ہے، آنسو بہا رہا ہے۔ فرعون کی بیوی سے اس کے آنسو دیکھے نہ گئے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ ملازمین دربار جتنا جلدی ہو سکے دایہ کی تلاش میں نکلیں لیکن وہ جس دایہ کو بھی لے کر آتے، نومولود نے اس کا دودھ پینے سے انکار کر دیا کیونکہ خدا نے یہ مقدر کر دیا تھا، کہ وہ اپنی ہی ماں کے پاس لوٹ کر جائے۔ ملازمین دربار، پھر تلاش کے لیے نکلے، اور کسی اور دایہ کو لانے کے لیے دربدر مارے مارے پھرنے لگے۔

اب ہم باقی داستان آیات کی زبانی بیان کرتے ہیں۔

ہاں! اے موسیٰ ہم نے یہ مقدر کر دیا تھا کہ تم ہماری (علم کی) نگاہوں کے سامنے پرورش پاؤ، "اس وقت جب کہ تمہاری بہن (فرعون کے محل کے پاس سے) چلی جا رہی تھی اور ماں کے حکم کے مطابق تیرے حالات کی نگرانی کر رہی تھی"۔ (اذ تمشی اختك)۔

وہ فرعون کے ماموریں سے کہنے لگی : کیا میں تمہیں ایک ایسی عورت کا تعارف کراؤں' جو اس نومولود کی سرپرستی کر سکے (فتقول هل ادلكم على من يكفله)۔

اور شاید اُس نے یہ بھی کہا کہ اس عورت کا دُودھ پاک و پاکیزہ ہے اور مجھے اطمینان ہے کہ یہ نومولود بچہ اس کا دُودھ پی لے گا۔

ماموریں دربار اس پر بہت خوش ہوتے اور اس اُمید پر کہ شاید جس کی اُنہیں تلاش ہے، اس طریقے سے وہ مل جائے، اس کے ساتھ چل پڑے ۔ موسیٰؑ کی بہن جو خود کو ایک اجنبی ظاہر کر رہی تھی اس نے ماں کو ساری سرگزشت سے آگاہ کیا ، ماں بھی اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھتے ہوئے، محبت اور اُمید کا ایک طوفان دل میں لیے فرعون کے دربار میں آپہنچی۔ اُنہوں نے بچہ اس کی گود میں ڈال دیا بچے نے ماں کی خوشبو سُونگھی۔ آشنا خوشبو۔ اچانک اس کے پستان کو جان شیریں کی طرح پکڑ لیا اور انتہائی شوق اور رغبت کے ساتھ دُودھ پینے میں مشغول ہوگیا۔ حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ اور فرعون کی بیوی کی آنکھیں بھی خوشی اور شوق سے چمک اُٹھیں ۔

بعض کہتے ہیں کہ فرعون کو اس واقعے پر تعجب ہوا اور اس سے پوچھا کہ تو کون ہے کہ اس نومولود بچے نے تیرا دُودھ قبول کر لیا ہے' جب کہ دوسری تمام عورتوں کو اُس نے رد کر دیا تھا ؟ ماں نے جواب دیا کہ مَیں ایک ایسی عورت ہوں جس میں پاکیزہ خوشبو ہے اور میرا دُودھ بہت اچھا ہے اور کوئی بچہ میرا دُودھ رد نہیں کرتا۔

بہرحال فرعون نے بچے کو اس کے سپرد کر دیا اور اس کی بیوی نے اس کی حفاظت و نگرانی کی بہت زیادہ تاکید کی اور اسے حکم دیا کہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بچہ اسے دکھانے کے لیے لایا کرے ۔

اس مقام پر قرآن کہتا ہے، : ہم نے تجھے تیری ماں کے پاس لوٹا دیا ، تاکہ اس کی آنکھیں تیری وجہ سے ٹھنڈی رہیں' اور اس کے دل میں کوئی غم نہ آنے پائے : (فرجعناك الى امك كى تقر عينها ولا تحزن)۔

اور پُوری دلجمعی اور آلِ فرعون کی طرف سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہ کرتے ہوئے، اطمینان کے ساتھ بچے کی پرورش کر سکے ۔

مذکورہ بالا جملے سے یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ فرعون نے بچے کو ماں کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اُسے اپنے گھر لے جائے لیکن فطری طور پر ایسا بچہ جو فرعون کا منہ بولا بیٹا بن گیا ہو اور اس کی بیوی اُسے بہت ہی زیادہ چاہتی ہو اس کا تھوڑے تھوڑے وقفے سے اُنہیں دکھانے کے لیے لانا ضروری تھا۔

سالہا سال گزر گئے اور موسیٰؑ نے خدا کے لطف و محبت کے سائے اور امن و امان کے ماحول میں پرورش پائی اور رفتہ رفتہ وہ جوان ہونے لگے ۔

ایک دن موسیٰ ایک راستے سے گزر رہے تھے کہ دو آدمیوں کو اپنے سامنے لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ اُن میں سے ایک بنی اسرائیل میں سے تھا اور دوسرا قبطیوں (مصریوں اور فرعون کے ہوا خواہوں) میں سے بنی اسرائیل ہمیشہ ہی ظالم قبطیوں کے دباؤ اور تشدد کا شکار رہتے تھے، ان میں سے بھی مظلوم بنی اسرائیل میں سے تھا ۔ حضرت موسیٰ اس کی مدد کے لیے لپکے اور اُس کا دفاع کرتے ہوئے ایک زوردار مُکا قبطی کو رسید کیا لیکن مظلوم کے دفاع میں یہ (مُکا) کسی نازک جگہ پر جا لگا ، اور اس ایک مُکے سے قبطی کا کام تمام ہوگیا ۔

موسیٰؑ اس واقعے سے پریشان ہوگئے۔ چونکہ بالآخر فرعون کے ماموریں کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ قتل کس کے ہاتھوں ہوا ہے۔ لہٰذا وہ بڑی شدت کے ساتھ آپ کے تعاقب میں نکل پڑے ۔

لیکن حضرت موسیٰ اپنے بعض دوستوں کی نصیحت کے مطابق، پوشیدہ طور پر مصر سے باہر نکل گئے اور مدین کی طرف چل پڑے۔ وہاں حضرت شعیب پیغمبر کے پاس امن وامان کا ایک ماحول مل گیا ــ جس کی تفصیل انشا اللہ سورہ قصص کی تفسیر میں آئے گی ــ

اس مقام پر قرآن کہتا ہے: تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور غم واندوہ میں ڈوب گیا، لیکن ہم نے تجھے اس غم واندوہ سے نجات بخشی (وقتلت نفسا فنجیناک من الغم)۔

اس کے بعد "ہم نے تجھے حادثات کے ذریعہ یکے بعد دیگرے آزمایا" (وفتناک فتونا)۔

پھر تُو سالہا سال مدین کے لوگوں میں ٹھہرا رہا: (فلبثت سنین فی اھل مدین)۔

یہ طولانی راستہ طے کرنے اور روحانی وجسمانی طور پر آمادہ ہونے اور حادثات کے طوفانوں سے کامیابی وکامرانی کے ساتھ باہر نکلنے کے بعد "تُو اس زمانہ میں کہ جو فرمانِ رسالت لینے کے لیے مقدر تھا یہاں آیا: (ثم جئت علی قدر یا موسٰی)۔

لفظ "قدر" بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق اس زمانے کے معنی میں ہے کہ جس میں حضرت موسیٰ کے لیے یہ مقدر کیا گیا تھا کہ وہ رسالت پر مبعوث کیے جائیں، لیکن بعض دوسرے مفسرین نے اسے "مقدار" کے معنی میں لیا ہے جیسا کہ بعض قرآنی آیات میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے (مثلاً حجر ـ ۲۱) اس تفسیر کے مطابق جملے کا معنی اس طرح ہوگا: اے موسیٰ! تُو ــ بہت سے نشیب وفراز اور طرح طرح کے امتحانات کے بعد اور شعیب جیسے عظیم پیغمبر کے جوار میں طویل مدت گزار کر پرورش پانے کے بعد آخر کار اس قدر ومقام اور شخصیت کا مالک بن گیا کہ وحی کے قبول کرنے کے لائق ہو گیا۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: میں نے تجھے اپنے لیے پرورش کیا اور بنایا سنوارا ہے: (واصطنعتك لنفسي)۔ میں نے تیری پرورش وحی حاصل کرنے کی سنگین ذمہ داری کے لیے، رسالت قبول کرنے کے لیے اور اپنے بندوں کی ہدایت ورہبری کے لیے کی ہے اور میں نے تجھے حادثات کی کٹھالیوں میں آزمایا ہے، تجھے قوت وطاقت عطا کی ہے اور اب جبکہ یہ عظیم ذمہ داری تیرے کندھے پر ڈالی جارہی ہے تو تُو ہر طرح سے تیار ہو چکا ہے، اور بنایا سنوارا جا چکا ہے۔

"اصطناع" "صنع" کے مادہ سے کسی چیز کی اصلاح کے لیے پُرتاکید اقدام کے معنی میں ہے (جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے) یعنی میں نے تیری ہر طرح سے اصلاح کر دی ہے، گویا میں تجھے اپنے لیے چاہتا ہوں، اور یہ انتہائی محبت آمیز بات ہے کہ جو خدا نے اس عظیم پیغمبر کے حق میں کہی ہے، اور بعض کے قول کے مطابق یہ اُس بات کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے کہ جو حکما نے کہی ہے کہ:

"ان اللہ تعالٰی اذا احب عبداً تفقدہ کما یتفقد الصدیق صدیقہ"

خدا جب کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے تو اس طرح سے اس کی دیکھ بھال کرتا ہے جیسا کہ کوئی مہربان دوست اپنے دوست کی کرتا ہے۔

❖ ❖ ❖

۴۲۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝

۴۳۔ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝

۴۴۔ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝

۴۵۔ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝

۴۶۔ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝

۴۷۔ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝

۴۸۔ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝

ترجمہ

۴۲۔ تو اور تیرا بھائی (دونوں) میری آیات کے ساتھ فرعون کے پاس جاؤ اور میری یاد میں کوتاہی نہ کرو۔

۴۳۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔

۴۴۔ لیکن اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ متوجہ ہو یا (خدا سے) ڈرے۔

۴۵۔ (موسٰی اور ہارون) دونوں نے کہا، پروردگارا! ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا، یا سرکشی کرے گا

۴۶۔ فرمایا ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں (ہر چیز کو) سُنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔

۴۷۔ تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو: ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور ان پر تشدد و آزار نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی طرف سے تیرے لیے واضح نشانی لے کر آئے ہیں اور سلام و درود ہو اس پر کہ جو ہدایت کی پیروی کرے۔

۴۸۔ (اس سے کہو) کہ ہماری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ اُس شخص پر عذاب ہوگا کہ جو (آیات الٰہی) کو جھٹلائے گا اور رُوگردانی کرے گا

تفسیر

جابر فرعون کے ساتھ پہلی ٹکر:

اب جب کہ تمام چیزیں مہیا ہو چکی ہیں اور تمام ضروری وسائل حضرت موسٰیؑ کو حاصل ہو چکے ہیں تو انہیں اور ان کے بھائی

ہارونؑ دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "تُو اور تیرا بھائی دونوں جو آیات میں نے تمہیں دی ہیں ان کے ساتھ اب نکل پڑو (اذهب انت واخوك بآياتي)۔

وہ آیات جن میں موسیٰؑ کے یہ دو عظیم معجزے بھی اور پروردگار کی وہ تمام نشانیاں، تعلیمات اور وہ سارے پروگرام بھی شامل ہیں کہ جو خود بھی اس کی دعوت کی حقانیت بیان کرتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ ان پُر مغز تعلیمات کا ایسے شخص کے ذریعے اظہار ہو رہا ہے کہ جس نے ظاہراً اپنی عمر کا اہم حصہ بھیڑ بکریاں چرانے میں گزارا ہے۔

اور ان کی رُوحانی تقویت کے لیے اور زیادہ سے زیادہ سعی و کوشش کی تاکید کرنے کی خاطر مزید فرمایا: میرے ذکر اور میری یاد اور میرے احکام کے اجرا میں سستی نہ کرنا (ولا تنيا في ذكري)۔

کیونکہ سستی اور قاطعیت کو ترک کرنا، تمہاری ساری زحمتوں کو برباد کر دے گا۔ لہٰذا مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور کسی بھی حادثہ سے ہراساں نہ ہو، اور کسی بھی طاقت کے مقابلہ میں سستی اور کمزوری نہ دکھاؤ۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اُن کے بھیجنے کا اصل مقصد اور وہ خاص بات کہ جس کی طرف انہیں توجہ رکھنا ہے، بیان کرتے ہوئے فرمایا: تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ (اذهبا الى فرعون انه طغى)۔

اس وسیع و عریض سرزمین کی عام بدبختیوں کا عامل اور اصل سبب وہی ہے اور جب تک اس کی اصلاح نہ ہو گی کوئی کام نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی قوم کی پیش رفت یا پسماندگی اور خوش بختی یا بدبختی کا اصل عامل ہر چیز سے زیادہ اس قوم کے رہنما اور سردار ہی ہوا کرتے ہیں لہٰذا سب سے پہلے تمہارا ہدف انہی کو ہونا چاہیئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہارونؑ اس وقت اس بیابان میں موجود نہیں تھے اور جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے کہ خدا نے انہیں اس ماجرے سے آگاہ کیا اور وہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے اپنے بھائی موسیٰؑ کے استقبال کی خاطر مصر سے باہر آئے۔ لیکن بہرحال اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ مخاطب تو دو افراد ہوں جبکہ اس وقت صرف ایک حاضر ہو اور فارسی روزمرہ میں بھی (اور اردو میں بھی) ایسے نمونے عام ہیں مثلاً ہم کہتے ہیں: تم اور تمہارا بھائی جو کل سفر سے واپس آئے گا دونوں میرے پاس آنا۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد آغاز کار میں فرعون سے ملاقات کے مؤثر طریقے کی تشریح اس طرح کی گئی ہے اس غرض سے کہ تم اس پر اثر انداز ہو سکو، "نرم انداز سے اس سے گفتگو کرنا، شاید وہ متوجہ ہو یا خدا سے ڈرے (فقولا له قولاً لينا لعله يتذكر او يخشى)۔ یہاں "یتذکر" اور "یخشی" کے درمیان فرق یہ ہے کہ اگر تم نرم اور ملائم انداز میں بات کرو اور مطالب بھی صراحت اور قاطعیت کے ساتھ بیان کرو تو ایک احتمال تو یہ ہے کہ وہ تمہارے منطقی دلائل کو دل سے قبول کرے اور ایمان لے آئے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کم از کم دنیا یا آخرت میں خدا کے عذاب کے خوف سے اور اپنی طاقت کے برباد ہو جانے کے ڈر سے سر تسلیم خم کرے اور تمہاری مخالفت نہ کرے

البتہ ایک تیسرا احتمال بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ نہ وہ متوجہ ہو اور نہ خدا سے ڈرے بلکہ مخالفت اور مقابلہ کا راستہ اختیار کرے۔

"لعل" (شاید) کی تعبیر سے اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ تو اس صورت میں اس کے لیے اتمام حجت ہو جائے گی۔ یعنی اس انداز پر

عمل کرنا کسی حال میں بھی بے فائدہ نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کو علم تھا کہ اس کا انجام کار کیا ہو گا لیکن مذکورہ تعبیرات میں موسیٰؑ و ہارونؑ اور راہِ خدا کے تمام رہبروں کے لیے ایک درس ہے۔[1]

* * *

لیکن اس کے باوجود موسیٰؑ و ہارون اِس بات پر پریشان تھے کہ کہیں یہ سرکش و زور مند اور متکبر شخص جس کی سخت گیری اور سخت مزاجی کا ہر جگہ چرچا ہے، اس سے پہلے کہ موسیٰ و ہارون اسے دعوت دیں وہ پیش قدمی کرتے ہوئے انہیں ختم ہی نہ کر دے۔ لہذا "عرض کی: پروردگارا! ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ ہماری بات سُننے سے پہلے ہی ہمیں سزا دینے کا حکم صادر نہ کر دے اور تیرا پیغام اس کے اور اس کے مصاحبین کے کانوں تک پہنچنے ہی نہ پائے یا سُننے کے بعد سرکشی کرنے لگے" (قالا ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا او ان یطغٰی)۔

"یفرط" "فرط" (بروزن "شرط") کے مادہ سے آگے بڑھنے کے معنی میں ہے۔ اسی بناء پر اس شخص کو کہ جو سب سے پہلے پانی کے گھاٹ پر پہنچے "فارط" کہتے ہیں۔ علی علیہ السلام کے کلمات، جو آپ نے دروازۂ کوفہ کے پیچھے قبروں کے سامنے کھڑے ہو کر فرمائے تھے، میں ہے کہ:

انتم لنا فرط سابق

تم اس قافلے سے آگے بڑھ جانے والے ہو اور ہم سے پہلے دیارِ آخرت کی طرف روانہ ہو گئے ہو۔[2]

بہرحال موسیٰؑ اور ان کے بھائی ہارون کو دو باتوں کا ڈر تھا۔ پہلی بات یہ کہ فرعون ان کی باتیں سننے سے پہلے ہی کہیں سختی پر نہ اُتر آئے اور یا سنتے ہی بلا فاصلہ اور بلا تامل اس قسم کا اقدام کر بیٹھے اور دونوں صورتوں میں ان کا کام خطرے میں پڑ جائے گا اور نامکمل رہ جائے گا۔

لیکن خدا نے قطعی انداز میں اُن سے فرمایا: تم بالکل نہ ڈرو، مَیں خود تمہارے ساتھ ہوں، سنتا ہوں اور دیکھتا بھی ہوں: (قال لا تخافا اننی معکما اسمع واریٰ)۔

اس بنا پر ایسے خدائے توانا کے ہوتے ہوئے کہ جو ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے اور اسی وجہ سے ہر چیز اور ہر بات کو سُنتا ہے، ہر چیز کو دیکھتا ہے اور تمہارا حامی و مددگار ہے، ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

* * *

اس کے بعد اپنی دعوت کو فرعون کے سامنے پیش کرنے کی کیفیت انتہائی باریکی کے ساتھ پانچ مختصر، قاطع اور پُر معنی و مطلب جملوں

---

[1] "لعل" کے معنی کے بارے میں اور یہ قرآن میں کس معنی میں آیا ہے، ہم نے تفسیر نمونہ، جلد ۲ میں سورۂ نساء کی آیہ ۸۴ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار، شمارہ ۱۳۰۔

میں بیان فرمائے ہے۔ ان میں سے ایک اصل ماموریت کے ساتھ مربوط ہے، دوسرے میں ماموریت کا معنی و مفہوم اور مطلب بتلایا گیا ہے، تیسرے میں دلیل و سند کا بیان ہے، چوتھے میں قبول کرنے والوں کو شوق دلایا گیا ہے اور پانچویں اور آخری جملہ میں مخالفت کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے۔

پہلے کہتا ہے: تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے (بھیجے ہوئے) رسول ہیں: (فأتیاه فقولا انا رسولا ربك)۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ہمارا پروردگار کی بجائے تیرا پروردگار کہا گیا ہے تاکہ فرعون کے ذہن کو اس نکتے کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اس کا ایک پروردگار ہے۔ اور یہ اس کے پروردگار کے نمائندے ہیں اور ضمنی طور پر اشاروں ہی اشاروں میں اُسے یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ کسی بھی شخص کے لیے ربوبیت کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے اور یہ صرف خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

دوسرے یہ کہ: بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں اذیت و تکلیف نہ پہنچا (فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبھم)۔

یہ ٹھیک ہے کہ موسیٰؑ کی دعوت صرف بنی اسرائیل کو آلِ فرعون کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے نہیں تھی بلکہ قرآن کی دوسری آیات کی گواہی کے مطابق، خود فرعون اور اس کے حواریوں کو شرک و بت پرستی کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے بھی تھی لیکن اس امر کی اہمیت اور اس کے موسیٰؑ کے ساتھ منطقی تعلق کی وجہ سے آپ نے یہ مسئلہ خاص طور پر پیش کیا چونکہ بنی اسرائیل سے خدمات لینا اور ان کو اتنی تکلیف اور عذاب کے ساتھ اپنا غلام بنائے رکھنا، ایسا کام نہیں تھا کہ جس کی توجیہ کی جا سکے۔

پھر اپنی دلیل اور ثبوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا کہتا ہے کہ اس سے کہو: ہم تیرے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی (اور دلیل) لے کر آئے ہیں: (قد جئناك بآية من ربك)۔

ہم بیہودہ اور فضول بات نہیں کرتے اور بغیر دلیل کے کوئی گفتگو نہیں کرتے۔ لہٰذا عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ کم سے کم ہماری باتوں پر غور تو کرے اور اگر ٹھیک ہو تو انہیں قبول کرے۔

اس کے بعد مومنین میں شوق پیدا کرنے کے لیے مزید ارشاد ہوتا ہے: جو ہدایت کی پیروی کرتے ہیں ان پر سلام ہے:
(والسلام علی من اتبع الھدیٰ)۔

یہ جملہ ممکن ہے کہ ایک دوسرے معنی کی طرف بھی اشارہ ہو اور وہ یہ کہ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی تکلیف، رنج، خدا کے دردناک عذاب اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی مشکلات سے سلامتی صرف انہیں لوگوں کے لیے ہے جو خدائی ہدایت کی پیروی کرتے ہیں اور درحقیقت یہ موسیٰؑ کی دعوت کا آخری نتیجہ ہے۔

❖ ❖ ❖

انہیں حکم دیا گیا کہ آخر میں اس دعوت سے روگردانی کا بُرا انجام بھی اسے سمجھا دیں اور اس سے کہیں کہ: ہماری طرف وحی ہوئی ہے کہ عذابِ الٰہی اُن لوگوں کے دامن گیر ہوگا کہ جو اس کی آیات کو جھٹلائیں گے اور اس کے فرمان سے روگردانی کریں گے۔ (انا قد اوحی الینا ان العذاب علی من کذب وتولیٰ)۔

ممکن ہے کسی کو یہ گمان ہو کہ اِس جملہ کا ذکر اُس نرم گفتار کے مطابق نہیں ہے جس پر وہ مامور تھے لیکن یہ اشتباہ ہے کیونکہ اس بات میں کیا امر مانع ہے کہ ایک ہمدرد طبیب نرم لہجے میں اپنے مریض سے کہے کہ جو شخص اس دوا کو استعمال کرے گا وہ نجات پائے گا، یعنی شفایاب ہو جائے گا اور جو نہ کرے گا وہ لقمۂ اجل بن جائے گا۔

اس بیان میں کوئی شدّتِ عمل والی بات نہیں بلکہ اُس کے طرزِ عمل کے پیشِ نظر یہ ایک حقیقت ہے جو اُس کے سامنے واشگاف الفاظ میں بیان کی جا رہی ہے۔

٭ ٭ ٭

چند اہم نکات:

۱۔ خُدا کی عجیب قُدرت نمائی:

تاریخ میں بہت سے واقعات ایسے گزرے ہیں کہ خود سر اور طاقتور افراد قدرتِ خدا کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں لیکن خدا نے کسی موقعے پر بھی زمین و آسمان کے کوئی خاص لشکر ان کی سرکوبی کے لیے جمع نہیں کیے بلکہ ایسے سادہ اور آسان طریقہ سے انہیں مغلوب کیا جس کا کسی شخص کو تصور بھی نہیں تھا۔

خصوصیت کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اُنہیں کو اپنی موت کے ذرائع کی طرف بھیج دیتا ہے اور ان کی نابودی خود اُنہیں کے سپُرد کر دیتا ہے۔

فرعون کی یہی داستان گواہ ہے کہ اس کے اصلی دُشمن یعنی موسیٰ کو خود اُسی کے دامن میں پرورش کرائی اور اللہ نے انہیں خود اسی کی حفاظت میں رکھا۔

سب سے بڑھ کر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تاریخ کے مطابق موسیٰؑ کی دایہ بھی قبطیوں میں سے تھی۔ وہ بڑھئی کہ جس نے ان کی نجات کا صندوق بنایا تھا وہ بھی ایک قبطی ہی تھا۔ صندوق کو پانی سے نکالنے والے فرعون کے ملازم تھے۔ صندوق کو کھولنے والی خود اس کی بیوی تھی۔ فرعون کے دربار کی طرف سے ہی موسیٰؑ کی ماں کو دُودھ پلانے والی کی حیثیت سے دعوت دی گئی اور قبطی کے قتل کے واقعے کے بعد فرعونی پیادوں کی طرف سے تعاقب آپؑ کی مدین کی طرف ہجرت اور شعیبؑ جیسے پیغمبر کے مکتب میں مکمل تعلیم و تربیت کا ایک دُور گزارنے کا سبب بنا۔

ہاں! جب خُدا چاہتا ہے کہ اپنی قدرت کو ظاہر کرے تو وہ اسی طرح سے کیا کرتا ہے تاکہ سارے کے سارے سرکش جان لیں کہ ان کی حیثیت اس سے کہیں کمتر و حقیر ہے کہ اس کے ارادہ اور مشیّت کے مقابلے میں ان کی کچھ پیش جا سکے۔

٭ ٭ ٭

۲۔ دشمنوں کے ساتھ مدارات:

لوگوں کے دلوں میں اثر و نفوذ پیدا کرنے کے لیے (چاہے وہ کتنے ہی گمراہ اور گنہگار کیوں نہ ہو) قرآن کا سب سے پہلا دستور یہ ہے کہ اُن سے ملائمت اور مہر و محبت کے ساتھ ملاقات کی جائے۔ خشونت اور سختی بعد کے مراحل سے تعلق رکھتی ہے اور اُس وقت ہے جب دوستانہ طریقے سے ملاقات کرنے کا کوئی اثر نہ ہو۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان کی طرف کھنچیں، نصیحت حاصل کریں اور ہدایت پائیں۔ یا اپنے بُرے کام کے انجام سے ڈریں:

(لعلہ یتذکر او یخشی)۔

ہر مکتب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں جذب وکشش ہو اور بلاوجہ لوگوں کو اپنے سے دُور نہ بھگائے۔ انبیاءؑ اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے حالاتِ زندگی اسی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی پُوری زندگی میں کبھی بھی اس طرزِ عمل سے انحراف نہیں کیا۔

ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی محبت آمیز طرزِ عمل بھی بعض لوگوں کے ساتھ دل پر اثرانداز نہ ہو اور خشونت اور سختی کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہ ہو۔ تو یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن ایک اصلِ کلی اور ابتدائے کار میں نہیں۔ پہلا قرینہ محبت اور ملائمت ہی ہے اور یہ وہی درس ہے جو زیرِ نظر آیات ہمیں واضح طور پر دے رہی ہیں۔

یہ بات جو بعض روایات میں منقول ہوئی ہے قابلِ توجہ ہے:

موسٰیؑ کو یہ حکم تھا کہ فرعون کو اس کے بہترین نام کے ساتھ پکاریں۔

شاید اس کے تاریک دل پر یہ بات اثر کر جائے۔

۴۔ کیا انبیاءؑ کے علاوہ کسی اور پر وحی ہوسکتی ہے: اس میں شک نہیں کہ قرآن میں وحی کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ کبھی یہ آہستہ آواز کے معنی میں یا کسی بات کو آہستہ سے کہنے کے معنی میں آیا ہے۔ (یہ عربی زبان میں اس کا اصلی معنی ہے)۔

کبھی کسی رمز یا اشارہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً:

فاوحٰی الیھم ان سبحوا بکرۃ وعشیا

زکریاؑ نے جو اس وقت بولنے سے قاصر تھے، بنی اسرائیل سے اشارہ کے ساتھ کہا کہ صبح و شام خدا کی تسبیح کرو۔ (مریم ۔ ۱۱)

کبھی فطری الہام کے معنی میں بیان ہوا ہے، مثلاً:

اوحٰی ربك الی النحل

تیرے رب نے شہد کی مکھی کو فطری الہام کیا۔ (نحل ۔ ۶۸)

کبھی حکم تکوینی کے معنی میں آیا ہے۔ یعنی وہ فرمان جو خلقت و آفرینش کی زبان سے دیا جاتا ہے، مثلاً:

یومئذ تحدث اخبارھا بان ربك اوحٰی لھا

قیامت کے دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے وحی کی ہے۔ (زلزال ۔ ۵)

اور کبھی الہام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایسا الہام جو صاحبِ ایمان لوگوں کے دل پر ہوتا ہے، چاہے وہ پیغمبر اور امام نہ بھی ہوں مثلاً:

اذ اوحینا الی امك ما یوحٰی

اے موسٰیؑ ہم نے تیری ماں کی طرف جس وحی کی ضرورت تھی وہ اُسے کی۔ (طٰہٰ ۔ ۳۸)

لیکن اس کا ایک اہم ترین مقام استعمال قرآن مجید میں خدا کے وہ پیغامات ہیں کہ جو پیغمبروں کے ساتھ ہی مخصوص ہیں، مثلاً:

انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ):

ہم نے تیری طرف اسی طرح سے وحی بھیجی ہے جس طرح سے کہ نوح اور اس کے بعد والے انبیاء کی طرف وحی بھیجی تھی۔ (نساء۔ ۱۶۳)

اس بنا پر لفظ وحی ایک وسیع اور جامع مفہوم رکھتا ہے کہ جو ان تمام مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح ہمیں اس بات پر کوئی تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ اگر زیر بحث آیات میں موسٰیؑ کی ماں کے بارے میں وحی کا لفظ استعمال ہوگیا ہے۔

۴۔ ایک سوال کا جواب: ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں اُوپر والی آیات کے مطالعہ سے یہ سوال پیدا ہو کہ موسٰیؑ ان خدائی وعدوں کے باوجود پریشانی، شک اور تشویش سے کیوں دوچار ہوئے۔ یہاں تک کہ خدا نے انہیں صراحت کے ساتھ کہا کہ جاؤ میں ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوں، تمام باتوں کو سُنتا ہوں اور تمام چیزوں کو دیکھتا ہوں اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے

اس سوال کا جواب اس بات سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ماموریت حقیقت میں بہت ہی سنگین تھی۔ موسٰیؑ بظاہر ایک چرواہے تھے۔ اب انہیں صرف اپنے بھائی کو ساتھ لے کر ایک خودسر، طاقتور اور سرکش آدمی سے جنگ کرنے کے لیے جانا تھا کہ جس کے قبضہ میں اس زمانے کے عظیم ترین طاقتور وسائل جمع تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ حکم انہیں یہ ملا کہ پہلی دعوت خود فرعون سے شروع کریں نہ یہ کہ پہلے دوسروں کے پاس جائیں اور لشکر اور یار و مددگار فراہم کریں بلکہ پہلا وار ہی فرعون کے دل پر کریں۔ یہ ماموریت واقعاً ایک بہت ہی پیچیدہ اور انتہائی زیادہ مشکل تھی۔ علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ علم و آگاہی کے کئی مراتب و مدارج ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک بات کو یقینی طور پر جانتا ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ علم الیقین اور عین اطمینان کے مرحلے میں پہنچ جائے، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے معاد پر قطعی ایمان ہونے کے باوجود خدا سے یہ درخواست کی کہ اسی دنیا میں مُردوں کے زندہ ہونے کا منظر میری آنکھوں کو دکھا تاکہ زیادہ سے زیادہ اطمینانِ قلب پیدا ہو۔

۞ ۞ ۞

۴۹۔ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝

۵۰۔ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝

۵۱۔ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝

۵۲۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝

۵۳۔ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝

۵۴۔ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۝

۵۵۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝

ترجمہ

۴۹۔ (فرعون نے) کہا: اے موسٰی! تمہارا پروردگار کون ہے؟

۵۰۔ (موسٰی نے) کہا: ہمارا پروردگار تو وہ ہے کہ جس نے ہر موجود کو وہ کچھ دیا جو اس کی خلقت کے لیے لازم تھا پھر اس کو ہدایت کی۔

۵۱۔ اس نے کہا: پھر ہم سے پہلے لوگوں کا حال کیا ہوگا؟

۵۲۔ موسٰی نے کہا: ان کا علم میرے پروردگار کے پاس ایک کتاب میں ثبت ہے۔ میرا پروردگار نہ تو گمراہ ہوتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔

۵۳۔ وہ خدا وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے آرام و آسائش کی جگہ قرار دیا اور اس میں تمہارے لیے راستے بنائے اور آسمان سے پانی برسایا کہ جس کے ذریعے ہم نے انواع واقسام کے نباتات (اندھیری خاک سے) نکالے۔

۵۴۔ تم خود اس میں سے کھاؤ اور اپنے چوپاؤں کو بھی چراؤ۔ بیشک اس میں صاحبانِ عقل کے لیے واضح نشانیاں ہیں۔

۵۵۔ ہم نے تمہیں اسی (خاک) سے پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تم کو پھر لوٹا دیں گے۔ اور اسی سے تمہیں دوبارہ بھی (زندہ کرکے) نکال کھڑا کریں گے۔

تفسیر

تمہارا پروردگار کون ہے؟

یہاں قرآن مجید نے اپنے طریقے کے مطابق اِن مطالب کو حذف کر دیا ہے جو اس داستان میں آئندہ آنے والی بحثوں میں سمجھے جا سکتے ہیں۔ اور موسٰیؑ اور ہارونؑ کی فرعون کے ساتھ گفتگو کو براہِ راست بیان کرنا شروع کر دیا ہے۔

درحقیقت معاملہ یہ ہے کہ:

موسٰیؑ فرمانِ رسالت حاصل کرنے اور فرعون کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بارے میں ایک ہمہ گیر، مکمل اور جامع دستورالعمل لینے کے بعد اس مقدس سرزمین سے چل پڑتے ہیں اور مورخین کے قول کے مطابق مصر کے قریب اپنے بھائی ہارونؑ کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ دونوں مل کر، فرعون کے پاس جانے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ بہت سی مشکلات کے بعد فرعون کے افسانوی محل کے اندر کہ جس میں بہت ہی

کم لوگ آجا سکتے تھے پہنچ جاتے ہیں۔

جس وقت موسیٰؑ فرعون کے سامنے جاکر کھڑے ہوئے، تو وہی مؤثر اور بچے تلے جملے جو خدا نے فرمانِ رسالت دیتے وقت انہیں تعلیم کیے تھے، بیان کرنا شروع کر دیئے:

ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔

بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں آزار نہ دے۔

ہم تیرے پروردگار کے پاس سے دلیل اور واضح معجزہ اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔

جو شخص ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہے۔

اور تو یہ بات بھی جان لے کہ ہمیں یہ وحی ہوئی ہے کہ عذابِ خدا ان لوگوں کی انتظار میں ہے کہ جو تکذیب کریں اور فرمانِ خدا سے رُوگردانی کریں۔

جس وقت فرعون نے یہ باتیں سنیں تو اس کا پہلا ردِّ عمل یہ تھا کہ اس نے کہا: اے موسیٰ! بتاؤ تمہارا پروردگار کون ہے (قال فمن ربکما یا موسیٰ)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ مغرور اور خود سر فرعون یہ تک کہنے کے لیے تیار نہ ہوا کہ میرا پروردگار کہ جس کے تم مدعی ہو کون ہے؟ بلکہ یہ کہا کہ تمہارا پروردگار کون ہے؟

٭ ٭ ٭

موسیٰ نے فوراً ہی پروردگار کا بہت ہی جامع اور انتہائی مختصر تعارف کروایا:

"کہا، ہمارا پروردگار تو وہی ہے جس نے ہر موجود کو وہ کچھ عطا کیا جو اس کی خلقت کا لازمہ تھا اور اس کے بعد مختلف مراحل ہستی میں اس کی رہبری اور ہدایت کی": (قال ربنا الذی اعطٰی کل شیء خلقه ثم هدٰی)۔

اس مختصر سی گفتگو میں حضرت موسیٰؑ آفرینش اور عالمِ ہستی کے دو بنیادی اور اساسی اصولوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک معرفتِ پروردگار کے لیے ایک واضح اور مستقل دلیل ہے۔

پہلی بات یہ کہ ہر موجود کو جس چیز کی اُسے ضرورت و احتیاج تھی اُسے دی ہے۔ یہ وہی مطلب ہے کہ جس کے بارے میں کتابوں کی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں بلکہ لوگوں نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔

اگر ہم نباتات اور اُن جانداروں کے بارے میں کہ جو مختلف علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ خواہ وہ پرندے ہوں یا چرند، دریائی جانور ہوں یا حشرات الارض، یا زمین پر رینگنے والے جانور۔ تھوڑا سا بھی غور کریں، تو ہم دیکھیں گے کہ اُن میں سے ہر ایک اپنے محیط اور ماحول کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتا ہے اور جس جس چیز کی اُسے ضرورت ہے وہ اسے حاصل ہے۔

پرندوں کی ساخت ایسی بنائی گئی ہے کہ جو انہیں شکل، وزن اور مختلف حواس کے لحاظ سے پرواز کے لیے درکار ہے۔ سمندروں کی گہرائیوں میں رہنے والے جانوروں کی ساخت بھی ان کے مطابق رکھی گئی ہے۔

ظاہر ہے اُن سب کے بارے میں بحث کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔

دُوسرا مسئلہ : موجودات کی ہدایت ورہبری کا ہے کہ جسے قرآن نے "ثُمَّ" کے لفظ سے ان کی ضروریات وحاجات کو پُورا کرنے کے بعد والے درجہ میں قرار دیا ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یا چیز زندگی کے وسائل سے مالامال تو ہو لیکن اُن سے استفادہ کرنے کے طریقوں سے واقف نہ ہو۔ لہٰذا سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ان سے کام لینے کے طریقوں سے آشنا ہو اور یہ وہی چیز ہے جو مختلف موجودات میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی زندگی کا سفر جاری رکھنے کے لیے کیسے بہترین طریقے پر اپنی قوتوں کو استعمال کرتا ہے۔ جانور کس طرح سے اپنا ٹھکانا بناتے ہیں، کیسے اولاد پیدا کرتے ہیں، کیسے اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہیں، کس طرح دشمنوں کی دسترس سے مخفی رہتے ہیں اور دشمن سے مقابلے کے لیے کیسے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

انسان بھی اس ہدایت تکوینی کا حامل ہے لیکن چونکہ انسان ایک ایسا موجود ہے کہ جو عقل وشعور رکھتا ہے لہٰذا خدا نے اس کی ہدایتِ تکوینی کو اس کی ہدایت تشریعی کے ساتھ کہ جو انبیاء کے ذریعہ کی جاتی ہے ملا دیا ہے اور اگر وہ اس راستے سے منحرف نہ ہو تو یقیناً مقصد کو پالے۔

دوسرے لفظوں میں انسان عقل وشعور اور ارادہ واختیار رکھنے کی وجہ سے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں رکھتا ہے اور ان کی تکمیل کے لیے کچھ ارتقائی پروگراموں کا حامل ہے جو حیوانات نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر انسان تکوینی ہدایات کے ساتھ ساتھ تشریعی ہدایت کی احتیاج بھی رکھتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ موسٰیؑ فرعون کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ عالم ہستی نہ تو تجھ میں منحصر ہے اور نہ ہی سرزمین مصر میں، نہ آج کے زمانے کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ ہی گزشتہ زمانہ سے۔

اس وسیع عالم کا گزشتہ زمانہ بھی تھا اور آئندہ بھی ہوگا۔ گزشتہ زمانے میں نہ تو تھا اور نہ تو اور اس عالم کے دو بنیادی مسائل ہیں: ایک ضروریات کو مہیا کرنا اور دوسرے موجودات کی پیش رفت کے لیے قوت اور وسائل کو بروئے کار لانا۔ یہ دونوں چیزیں تجھے ہمارے پروردگار سے اچھی طرح سے آشنا کر سکتی ہیں اور اس سلسلے میں تو جتنا زیادہ غور وفکر کرے گا اس کی عظمت وقدرت کے بیشمار دلائل تجھے ملتے چلے جائیں گے۔

فرعون نے یہ جامع اور عمدہ جواب سُن کر ایک اور سوال پیش کیا: "اُس نے کہا اگر ایسا ہے تو پھر ہم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی ذمہ داری کیا ہوگی" (قال فما بال القرون الاولی)۔

اب یہ بات کہ فرعون کی اس جملے سے کیا مراد تھی، مفسرین نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں:

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ موسٰیؑ نے اپنے آخری جملے میں توحید کے سب مخالفین کے لیے عذاب الٰہی کا ذکر کیا تھا۔ لہٰذا فرعون نے سوال کیا کہ پھر وہ تمام مشرک قومیں کہ جو گزشتہ زمانے میں تھیں، اس قسم کے عذاب میں کیوں مبتلا نہیں ہوئیں؟

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ موسٰیؑ نے خداوند عالم کا سب کے لیے پروردگار اور معبود ہونے کا تعارف کرایا تھا، لہٰذا فرعون نے سوال کیا کہ پھر ہمارے بڑے اور سب گزشتہ قومیں کیوں مشرک تھیں؟ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ شرک اور بُت پرستی کوئی غلط کام نہیں ہے۔

۳۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ موسیٰ کی گفتگو کا مفہوم یہ تھا کہ آخرکار سب کے سب اپنے اعمال کے نتیجے کو پہنچیں گے اور جنہوں نے خدا کے فرمان سے روگردانی کی ہے انہیں عذاب و سزا ہوگی۔ تو فرعون نے پوچھا کہ پھر ان کی ذمہ داری کیا ہوگی کہ جو فنا ہوگئے ہیں اور دوبارہ اس زندگی کی طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے؟

بہرحال موسیٰ نے جواب دیا کہ گزشتہ اقوام کے تمام امور میرے پروردگار کے پاس ایک کتاب میں ثبت ہیں میرا پروردگار کبھی بھی انہیں سنبھال رکھنے میں گمراہ نہیں ہوتا اور نہ ہی بھولتا ہے" (قال علمها عند ربي في كتاب لا يضل ربي ولا ينسى)[1]

اس بنا پر ان کا حساب کتاب محفوظ ہے اور آخرکار وہ اپنے اعمال کی جزا یا سزا تک پہنچ جائیں گے۔ اس حساب کتاب کی نگہداشت کرنے والا وہ خدا ہے کہ جس کے کسی کام میں نہ تو کوئی غلطی ہے اور نہ ہی بھول چوک۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ موسیٰ نے اصل توحید اور خدا کے تعارف کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ پورے طور پر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس ہستی کے لیے۔ کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ضروریات اور احتیاجات کامل طور پر عطا کی ہیں اور پھر اس کی ہدایت بھی کرتا ہے ــــ اس حساب کی نگہداشت کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

"لا یضل" اور "لا ینسی" کے مفہوم میں کیا فرق ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ "لا یضل" پروردگار سے ہر قسم کے اشتباہ اور غلطی کی نفی کی طرف اشارہ ہے اور "لا ینسی" نسیان کی نفی کی طرف اشارہ ہے یعنی نہ تو وہ ابتدائے کار میں افراد کے حساب میں اشتباہ اور غلطی کرتا ہے اور نہ ہی وہ ان کے حساب کی نگہداشت کرنے میں بھول چوک کرتا ہے۔

اس طرح موسیٰ ضمنی طور پر ہر چیز پر پروردگار کے علمی احاطے کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ تاکہ فرعون اس واقعیت کی طرف متوجہ ہو کر اس کے اعمال میں سے ذرہ برابر بھی، خدا کے علم کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔ حقیقت میں خدا کا یہ احاطۂ علمی اس بات کا نتیجہ ہے کہ جو موسیٰ نے سب سے پہلے کہی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کہ جس نے ہر موجود کو اس کی ضرورت و حاجت کی ہر چیز دی ہے اور اسے ہدایت بھی کی ہے، وہ ہر شخص اور ہر چیز سے آگاہ اور باخبر ہے۔

حضرت موسیٰ کی گفتگو کا ایک حصہ چونکہ مسئلہ توحید اور خداشناسی کے بارے میں تھا، لہٰذا قرآن اس مقام پر ایک اور بات بھی کرتا ہے: وہی خدا کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے مہد آسائش بنایا اور اس میں راستے پیدا کیے اور آسمان سے پانی برسایا (الذي جعل لكم الارض مهدا وسلك لكم فيها سبلا وانزل من السماء ماء)۔

ہم نے اس پانی کے ذریعے انواع و اقسام کی مختلف نباتات مٹی سے نکالیں (فاخرجنا به ازواجا من نبات شتى)۔

---

[1] یہاں لفظ "کتاب" نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے جو کہ اس کتاب کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جس میں بندوں کے اعمال ثبت ہیں۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں آیا ہے:

لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها

کوئی چھوٹا یا بڑا عمل نہیں ہے مگر یہ کہ اس کتاب میں اس کا حساب موجود ہے۔ (کہف - ۴۹)

اس ساری آیت میں خدا کی عظیم نعمتوں میں سے چار حصوں کی طرف اشارہ ہوا ہے :

۱۔ زمین: کہ جو انسان کے لیے آرام و آسائش کا گہوارہ ہے۔ قانون جاذبہ کی برکت سے اور اسی طرح عظیم ہوائی قشر سے کہ جس نے اس کے اطراف کو گھیر رکھا ہے، انسان راحت اور امن و امان کے ساتھ اس پر زندگی گزار سکتا ہے۔

۲۔ راستے: جو خدا نے زمین میں پیدا کیے ہیں کہ جو اس کے تمام منطقوں کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ سر بفلک پہاڑوں کے سلسلوں کے درمیان اکثر درّے اور راستے موجود ہیں کہ جن میں سے انسان گزر سکتا ہے اور اپنے مقصد اور منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

۳۔ پانی : جو مایۂ حیات اور تمام برکات کا سرچشمہ ہے، آسمان سے نازل فرمایا۔

۴۔ چارے اور طرح طرح کی نباتات: جو اس پانی کے ذریعہ زمین سے اُگتی ہیں۔ جن کے ایک حصہ سے انسان کے لیے غذائی سامان تیار ہوتا ہے، کچھ حصہ دواؤں کے طور پر کام آتا ہے، کچھ حصہ کو انسان لباس بنانے کے کام میں لاتا ہے اور دوسرے حصہ کو وسائل زندگی (مثلاً دروازے، لکڑی کے گھر، کشتیاں، جہاز اور بہت سے ذرائع نقل و حمل) کے لیے استعمال کرتا ہے۔

بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ چاروں عظیم نعمتیں، اسی ترتیب سے کہ جس ترتیب کے ساتھ زیر بحث آیت میں بیان ہوئی ہیں، انسانی زندگی کی سب سے اوّل اور سب سے مقدم ضرورتیں ہیں۔ سب چیزوں سے پہلے سکون و آرام کی جگہ کی ضرورت ہے، اس کے بعد ایک علاقے کو دوسرے سے ملانے والے راستوں کی ضرورت ہے، پھر پانی اور پھر نباتات اور زرعی محصولات کی۔

آخر میں خدا کی ان تمام نعمتوں میں سے پانچویں اور آخری نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ان نباتات سے حاصل ہونے والی چیزوں میں سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے چوپاؤں کو بھی ان میں سے غذا فراہم کرو: (کلوا وارعوا انعامکم)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے حیوانات اور جانور بھی جو تمہاری غذا، لباس اور زندگی کے دوسرے وسائل کے ایک اہم حصہ کو مہیا کرتے ہیں، وہ بھی اسی زمین اور اسی پانی کی برکت سے ہیں کہ جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔

اور آخر میں جب ان تمام نعمتوں کی طرف اشارہ کر چکا تو فرماتا ہے : ان چیزوں میں صاحبانِ عقل کے لیے واضح و روشن نشانیاں ہیں: (ان فی ذٰلک لاٰیات لاولی النھٰی)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "نھٰی" جمع "نھیہ" (بروزن کپیہ) اصل میں نہی کے مادے سے (جو امر کی ضد ہے) لیا گیا ہے۔ اور عقل و دانش کے معنی میں ہے جو انسان کو برائیوں سے روکتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قسم کی فکر اور دانش ہی اس حقیقت کو سمجھ سکتی ہے۔

⁂

اس مناسبت سے کہ ان آیات کے توحیدی بیان میں زمین اور اس کی نعمتوں کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے، معاد کو بھی آخری زیر بحث آیت میں اسی زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے، فرماتا ہے : اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں دوبارہ لوٹا دیں گے اور اسی سے تمہیں (زندہ کر کے) نکال کھڑا کریں گے (منھا خلقناکم وفیھا نعیدکم و

منہا نخرجکم تارۃ اخریٰ)۔

یہ انسان کے گزشتہ، موجودہ اور آئندہ کے بارے میں کتنی جچی تلی اور منہ بولتی ہوئی تعبیر ہے۔ ہم سب مٹی سے پیدا ہوئے ہیں سب کے سب پھر مٹی ہی میں مل جائیں گے اور پھر سب کے سب دوبارہ مٹی ہی سے (زندہ کرکے) اُٹھا کر کھڑے کیے جائیں گے۔

ہم سب کا مٹی میں مل جانا، یا مٹی سے دوبارہ اٹھائے جانا بالکل واضح اور روشن ہے۔ لیکن یہ بات کہ ہم سب کی ابتدا مٹی سے کس طرح ہوئی، اس سلسلے میں دو تفسیریں ہیں۔ پہلی یہ کہ ہم سب آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے اور دوسری یہ کہ ہم خود بھی مٹی ہی سے پیدا ہوئے ہیں کیونکہ تمام غذائی مواد کہ جس سے ہمارے اور ہمارے ماں باپ کے بدن بن کر تیار ہوئے ہیں، وہ اسی مٹی سے حاصل ہوتے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر تمام سرکشوں اور فرعون صفت لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہے۔ کہ وہ یہ بات نہ بھولیں کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور انہیں کہاں جانا ہے۔ یہ سب غرور و نخوت اور سرکشی و طغیان، اس موجود کے لیے کہ جو کل تک مٹی تھا اور کل مٹی ہو جائے گا، کس لیے؟

چند اہم نکات:

۱۔ لفظ "مھد" و "مھاد" کا مفہوم: دونوں ایسی جگہ کے معنی میں ہیں کہ جو بیٹھنے، سونے اور آرام کرنے کے لیے تیار کی گئی ہو اور اصل میں لفظ "مھد" اس جگہ کو کہا جاتا ہے کہ جس میں بچّہ کو سلاتے ہیں (گہوارہ یا اسی قسم کی کوئی چیز)۔

گویا انسان ایک ایسا بچّہ ہے کہ جسے زمین کے گہوارے کے سپرد کیا گیا ہے۔ اور اس گہوارے میں غذا اور اس کی زندگی کے تمام وسائل موجود ہیں۔

۲۔ لفظ "ازواجاً" کا مطلب: یہ "زوج" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہ نباتات کے مختلف اصناف کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے اور عالمِ نباتات میں مسئلہ زوجیت (نر اور مادہ ہونے) کی طرف بھی ایک سربستہ اشارہ ہو سکتا ہے۔ جس کے بارے میں ہم انشاءاللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں گفتگو کریں گے۔

۳۔ "اولوا النھیٰ" کی تفسیر: اس سلسلے میں اصول کافی میں پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ:

ان خیارکم اولوا النھیٰ، قیل یا رسول اللہ و من اولوا النھیٰ؟
قال ھم اولوا الاخلاق الحسنة والاحلام الرزینة وصلة الارحام والبررة بالامھات والاباء والمتعاھدین للفقراء والجیران والیتامیٰ ویطعمون الطعام ویفشون السلام فی العالم، ویصلون والناس نیام غافلون:

"تم میں سے سب سے بہتر اولوا النھیٰ (صاحبانِ فکر و اندیشہ مسئول) ہیں۔
لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! اولوا النھیٰ کون ہیں؟
فرمایا: وہ لوگ کہ جو اخلاقِ حسنہ اور عقلِ سلیم کے مالک ہیں اور صلۂ رحمی کرنے والے، ماں باپ سے نیکی کرنے والے، فقیروں، ضرورتمند ہمسایوں اور یتیموں کی مدد کرنے والے ہیں اور

وہ لوگ کہ جو جھگڑوں کو سیر کرتے ہیں۔ عالم میں صلح و آشتی پھیلاتے ہیں اور جب لوگ غافل سوئے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ:

ایک شخص نے ان بزرگوار سے نماز کی ہر رکعت میں دو سجدے کرنے کا مطلب پوچھا تو امام نے فرمایا:

"پہلے سجدہ کا مطلب، جب تو زمین پر سر رکھتا ہے۔ یہ ہے کہ پروردگارا! میں ابتدا میں اسی مٹی سے تھا اور جس وقت تو سر اٹھاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ تو نے مجھے اسی مٹی سے باہر نکالا ہے اور دوسرے سجدہ کا مفہوم یہ ہے کہ تو مجھے اسی مٹی کی طرف پلٹائے گا اور جس وقت تو دوسرے سجدہ سے سر اُٹھاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ دوبارہ مجھے اسی مٹی سے (زندہ کرکے) اُٹھا کھڑا کرے گا۔[2]

❖ ❖ ❖

۵۶۔ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ○

۵۷۔ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ○

۵۸۔ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ○

۵۹۔ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ○

۶۰۔ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ○

۶۱۔ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ○

۶۲۔ فَتَنَازَعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ○

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، باب "المؤمن وعلاماتہ وصفاتہ" صفحہ ۲۳۲۔

[2] بحارالانوار، چاپ جدید، ج ۸۵، ص ۱۳۲۔

۶۳ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ○

۶۴۔ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ○

ترجمہ

۵۶۔ ہم نے اپنی ساری نشانیاں اُسے دکھائیں لیکن اُس نے تکذیب کی اور انکار کیا۔

۵۷۔ اُس نے کہا : اے موسیٰ ! کیا تُو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہماری سرزمین سے اپنے اس جادو کے ذریعہ نکال باہر کرے۔

۵۸۔ ہم بھی یقینی طور پر اُسی جیسا جادو تیرے لیے لے آئیں گے، ابھی سے (اس کی تاریخ معین کرلے اور) ہمارے اور اپنے درمیان مدت مقرر کرلے، کہ ہم اور تم، دونوں جس کی خلاف ورزی نہ کریں، ایسی جگہ طے کرو جو سب کے لیے یکساں ہو۔

۵۹۔ (موسیٰ نے) کہا : ہمارا، تمہارا وعدہ زینت کے دن (روزِ عید) کا ہوا۔ شرط یہ ہے کہ سب کے سب لوگ دن چڑھتے ہی جمع ہوجائیں۔

۶۰۔ فرعون اُس مجلس سے اُٹھا اور اُس نے اپنے تمام مکر و فریب جمع کیے اور پھر (مقررہ دن) ان سب کو لے آیا۔

۶۱۔ موسیٰ نے اُن سے کہا : تم پر وائے ہو، خدا پر جھوٹ نہ باندھو، کہ وہ تمہیں اپنے عذاب کے ساتھ نابود کردے گا اور نااُمیدی (اور شکست) اُسی شخص کے لیے ہے کہ جو (خدا پر) افترا باندھے۔

۶۲۔ ان کے درمیان آپس میں اُن کے کام کے سلسلے میں نزاع پیدا ہوگیا اور وہ آپس میں سرگوشی کے ساتھ چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔

۶۳۔ انہوں نے کہا کہ : مسلّم طور پر یہ دونوں کے دونوں جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنے جادو کے ذریعے تمہاری سرزمین سے نکال دیں اور تمہارے بلند مرتبہ دین کو ختم کردیں۔

۶۴۔ (اب جبکہ یہ بات ہے تو) اپنی تمام قوت و تدبیر جمع کرلو (اور مقابلے کے میدان میں) صف باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور کامیابی تو آج اُسی کی ہے کہ جو اپنی برتری ثابت کردے۔

تفسیر

آخری مقابلے کے لیے فرعون کی تیاری :

آیات کے اس حصّے میں موسیٰؑ اور فرعون کے مقابلے کے ایک اور مرحلہ کا بیان ہو رہا ہے۔ قرآن مجید اس حصّے کو اس جملے کے ساتھ شروع کرتا ہے : ہم نے اپنی سبھی نشانیاں فرعون کو دکھائیں، لیکن اُن میں سے کوئی بھی اس کے سیاہ دل پر اثر نہ کرسکی۔ اُس نے سب کی تکذیب کی اور انہیں قبول کرنے سے انکار کردیا (ولقد اریناہ اٰیاتنا کلھا فکذب وابٰی)۔

یقینی بات ہے کہ ان آیات سے یہاں وہ تمام معجزات مراد نہیں ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی پوری زندگی میں مصر میں اُن سے ظاہر ہوئے، بلکہ یہ اُن معجزات کے ساتھ مربوط ہے جو انہوں نے ابتداء دعوت میں فرعون کو دکھائے تھے یعنی "معجزہ عصا" "یدبیضا" اور" ان کی آسمانی دعوت کے مطالب" جو کہ خود ان کی حقانیت کی ایک زندہ دلیل ہے۔

اسی لیے اس واقعے کے بعد جادوگروں کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ اور ان کے نئے معجزات کا ذکر ہے۔

اَب آیئے، دیکھتے ہیں کہ سرکش، متکبر اور ہٹ دھرم فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے معجزات کے جواب میں کیا کہا؟ —— تمام جھوٹے صاحبانِ اقتدار کی طرح انہیں کس طرح —— متہم کیا؟ قرآن کہتا ہے : اُس نے کہا ، اے موسیٰ ! کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہماری سرزمین اور وطن سے اپنے جادو کے ذریعے باہر نکال دے ؟ (قال اجئتنا لتخرجنا من ارضنا بسحرک یا موسٰی)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ : ہم جانتے ہیں کہ دعویٰ نبوت ، دعوتِ توحید اور یہ معجزہ نمائی، سب حکومت پر قبضے اور ہمیں اور قبطیوں کو ہمارے آباؤ اجداد کی زمین سے نکالنے کے لیے ایک سازش ہے۔ تیرا مقصد دعوتِ توحید ہے اور نہ بنی اسرائیل کی نجات۔ تیرا مقصد صرف حکومت حاصل کرنا، اس سرزمین پر تسلط جمانا اور مخالفین کو باہر نکال دینا ہے۔

یہ تہمت بالکل وہی حربہ ہے جو پُوری تاریخ میں، سب صاحبانِ اِقتدار اور استعمارگر استعمال کرتے رہے ہیں۔ جس وقت وہ اپنے آپ کو خطرے میں پاتے، تو اپنے بچاؤ اور مفاد کی خاطر، لوگوں کو تحریک کرنے کے لیے "ملک خطرے میں ہے" کا ہوّا کھڑا کر دیتے، ملک! یعنی ان صاحبانِ اقتدار کی حکومت اور اس مملکت کی بقا ؛ یعنی خود ان کی اپنی بقا۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اصل میں بنی اسرائیل کو مصر لانے اور ان کی اس سرزمین میں نگہداشت صرف ان سے غلاموں کی شکل میں ان کی کام کی طاقت سے فائدہ اُٹھانے کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے، کہ بنی اسرائیل جو کہ ایک طاقتور قوم تھے، طاقت پیدا کرکے کہیں خطرے کا سبب نہ بن جائیں اسی طرح اُن کے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم بھی صرف موسیٰؑ کے پیدا ہونے کے خوف سے نہیں تھا بلکہ وہ بھی ان کی طاقت و قوت کو ختم کرنے کے لیے تھا۔ اور یہ وہ کام ہے کہ جسے تمام خودسر انجام دیتے ہیں۔ اس بنا پر —— موسیٰ کی خواہش کے مطابق —— باہر جانے کا مطلب، اس ملت کا طاقت حاصل کرنا تھا۔ اِس صورت میں فراعنہ کا تاج و تخت خطرے میں پڑ جاتا تھا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس مختصر سی عبارت میں فرعون نے موسٰیؑ کو جادو کی تہمت بھی دی، وہی تہمت جو تمام انبیاءؑ پر ان کے واضح معجزات کے جواب میں لگائی گئی۔

جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیہ ۵۲ اور ۵۳ میں بیان ہوا ہے:

کذالک ما اتی الذین من قبلھم من رسول الا قالوا ساحر او مجنون اتواصوا بہ بل ھم قوم طاغون۔

کوئی پیغمبر ان سے پہلے نہیں آیا مگر یہ کہ انہوں نے کہا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے، کیا وہ اس (تہمت و افترا) کی ایک دوسرے کو وصیت کر جایا کرتے تھے (کہ وہ سب اس میں ہم آواز تھے) بلکہ وہ ایک سرکش قوم ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایسے موقعوں پر حبُّ الوطنی کے احساسات و جذبات کا دامن تھامنا، بڑی سوچی سمجھی بات تھی، کیونکہ اکثر لوگ اپنے وطن کی سرزمین کو اپنی جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کی کچھ آیات میں یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں:

ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم

اگر ہم نے ان پر یہ واجب کر دیا ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو قتل ہونے کے لیے پیش کریں، یا اپنے وطن اور گھر سے باہر نکل جائیں، تو صرف تھوڑے سے افراد ہی اس پر عمل کرتے۔ (نساء ۶۶)

فرعون نے اس کے بعد مزید کہا: تم یہ گمان نہ کر لینا، کہ ان جادوؤں کی مانند (جادو) پیش کرنا ہمارے بس میں نہیں "یقیناً جان لو کہ ہم عنقریب تیرے جواب میں اسی قسم کا جادو لے آئیں گے": (فلناتینک بسحر مثلہ)۔

اور اس غرض سے کہ زیادہ سے زیادہ قاطعیت کا اظہار کرے، اس نے کہا: ابھی اسی وقت اس کی تاریخ مقرر کر، ہمارے اور تیرے درمیان وعدہ ہونا چاہیئے کہ جس سے نہ ہم اِدھر اُدھر ہوں اور نہ تو، وہ ہو بھی ایسی جگہ کہ جو ہم سب کے لیے برابر ہو: (فاجعل بیننا و بینک موعدا لا نخلفہ نحن ولا انت مکانا سوی)۔

"مکانا سوی" کی تفسیر میں بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ تھا کہ اس جگہ کا فاصلہ تجھ سے اور ہم سے برابر کا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا فاصلہ شہر کے تمام لوگوں کے لیے یکساں ہو، یعنی ایسی جگہ جو ٹھیک شہر کے مرکز میں ہو، اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد ایک ہموار زمین ہے کہ جس پر تمام لوگ آسکیں اور بلند و پست اس میں یکساں ہوں۔ ہم کہتے ہیں ان تمام معانی کو مجموعی طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے کہ طاقتور برسرِ اقتدار لوگ اس غرض سے کہ وہ اپنے حریف کو میدان سے باہر نکال پھینکیں، اور اپنے مصاحبین اور حواریوں میں جو بعض اوقات متاثر ہو گئے ہوتے ہیں (اور موسٰی کا واقعہ اور ان کے معجزات سے وہ حتمی طور پر متاثر ہو گئے تھے) طاقت و قوت اور جذبہ پیدا کریں۔ ظاہراً بڑے اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور بہت زیادہ شور و غل کرتے ہیں۔

لیکن حضرت موسیٰ نے تحمل اور بُردباری کا دامن نہ چھوڑا اور فرعون کے شور و غل پر ہرگز نہ گھبرائے اور پُوری صراحت اور قاطعیت کے ساتھ کہا: میں بھی تیار ہوں! ابھی اسی وقت، دن اور وقت کا تعین کیے دیتا ہوں۔" ہمارا اور تمہارا وعدہ زینت کے دن (روزِ عید) کا ہوا۔ شرط یہ ہے کہ تمام لوگ دن چڑھے تک اِس جگہ جمع ہو جائیں": (قال موعدکم یوم الزینة و ان یحشر الناس ضحیً)[1]

"یوم الزینة" (زینت کا دن) کی تعبیر مسلمہ طور پر کسی عید کے دن کی طرف اشارہ ہے۔ جسے ہم مخصوص طور پر معین نہیں کرسکتے لیکن اہم بات یہ ہے کہ لوگ اس دن اپنے کاروبار کی چھٹی کیا کرتے تھے۔ لہٰذا اس قسم کے پروگرام میں شرکت کے لیے وہ طبعی طور پر تیار تھے۔
بہرحال فرعون نے موسیٰ کے حیرت انگیز معجزات اور اپنے حواریوں میں ان معجزات کے نفسیاتی اثرات دیکھے تو پختہ ارادہ کرلیا کہ وہ جادوگروں کی مدد سے ان کا مقابلہ کرے گا۔ لہٰذا اس نے موسیٰ کے ساتھ معاہدہ کیا اور "اس مجلس سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے تمام مکر و فریب سیٹ کر سب کو مقررہ روز لے کر پہنچ گیا": (فتولّٰی فرعون فجمع کیدہ ثم اتی).

اس مختصر سے جملے میں وہ تمام حالات و واقعات، جو سُورۂ اعراف و شعراء میں مفصل اور مبسوط طور پر بیان کیے گئے، بطورِ خلاصہ بیان ہوئے ہیں۔ چونکہ فرعون نے اِس مجلس سے اُٹھنے اور موسیٰ و ہارون سے جُدا ہونے کے بعد، اپنے مخصوص مشیروں اور متکبر حامیوں کے ساتھ مختلف میٹنگیں کیں۔ اس کے بعد اُس نے سارے ملک مصر سے جادوگروں کو دارالحکومت میں آنے کی دعوت دی۔ اُس نے بہت شوق انگیز ذرائع سے انہیں اِس تقدیر ساز مقابلے کی دعوت دی۔ ان کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں جن کی بحث کے لیے یہاں پر گنجائش نہیں ہے۔ البتہ قرآن نے ان تمام باتوں کو، ان تین جملوں میں جمع کر دیا ہے: فرعون موسیٰ سے جُدا ہوا، اپنے تمام مکروں کو جمع کیا، اور پھر تیار ہو کے آگیا۔[2]

✣ ✣ ✣

آخر کار مقرر دن آ پہنچا۔ حضرت موسیٰ لوگوں کے اِس عظیم اجتماع کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ مدِ مقابل گروہ میں سے کچھ لوگ جادوگر تھے۔ ان کی تعداد بعض مفسرین کے قول کے مطابق ۷۲ افراد تھی، بعض کے مطابق چار سو افراد تک تھی، اور بعض دوسروں نے اس سے بہت زیادہ تعداد بھی بیان کی ہے۔

ان میں سے کچھ افراد فرعون اور اس کے مصاحبین اور اطرافیوں پر مشتمل تھے۔ باقی اکثریت تماشائی عوام تھے۔
حضرت موسیٰ نے اس موقع پر جادوگروں کی طرف، یا فرعونیوں اور جادوگروں کی طرف رُخ کیا، اور اُن سے کہا: وائے ہو تم پر، تم خدا پر جھوٹ نہ باندھو کیونکہ وہ تمہیں اپنے عذاب سے تباہ و برباد کر دے گا" (قال لهم موسٰی ویلکم لا تفتروا علی اللّٰه کذبا فیسحتکم بعذاب)

"اور شکست و نااُمیدی اور خسارہ اُس کے لیے ہے کہ جو خدا پر افترا باندھتا ہے، اور اس کی طرف باطل کی نسبت دیتا ہے":

---

[1] "ضحیٰ" لغت میں سُورج کے پھیلاؤ کے معنی میں ہے، یا سُورج کا اُوپر آنا ہے، اور "وان یحشر الناس ضحیٰ" میں "واؤ" معیت کی دلیل ہے۔

[2] اگرچہ لفظ "تولّٰی" یہاں پر، موسیٰ سے جُدا ہونے یا اُس مجلس سے اُٹھنے کے معنی میں تفسیر ہوا ہے، لیکن ممکن ہے کہ اس کی لغت کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرعون کے موسیٰ پر اعتراض کرنے، ناراض ہونے، اور اس کی معاندانہ نکتہ چینی کے لیے بھی استعمال ہوا ہو۔

(وقد خاب من افترٰی)۔

یہ بات واضح ہے کہ موسٰی کی خدا پر افترا سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو یا کسی چیز کو اس کا شریک قرار دینا، خدا کے بھیجے ہوئے معجزات کو جادو سے تعبیر کرنا اور فرعون کو اپنا معبود اور الٰہ خیال کرنا تھا۔ یقیناً جو شخص خدا پر اس قسم کے افترا باندھے گا اور پوری قوت کے ساتھ نورِ حق کو بجھانے کی کوشش کرے گا۔ خدا اسے بغیر سزا دیئے نہ چھوڑے گا۔

حضرت موسٰیؑ کی یہ دو ٹوک باتیں، جو جادوگروں کی باتوں کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتی تھیں ــــ بلکہ اس کا طریقہ تمام سچے پیغمبروں والا تھا ــــ اور موسٰی کے پاکیزہ دل سے نکلی ہوئی تھیں، بعض کے دلوں پر اثر کر گئیں، اور اس پر ان لوگوں میں اختلاف پڑ گیا۔ بعض شدتِ عمل کے طرفدار تھے بعض شک و شبہ میں پڑ گئے، اور کہنے لگے ہو سکتا ہے موسٰی خدا کے عظیم پیغمبر ہوں اور اگر ایسا ہوا ان کی تہدید اور دھمکیاں مؤثر ہو کر رہیں گی۔ خاص طور پر، ان کا اور ان کے بھائی ہارون کا وہی چرواہوں والا سادہ لباس تھا۔ ان کے چہرے پر عزم راسخ کی جھلک تھی۔ تنہا ہونے کے باوجود ان میں کوئی کمزوری اور کسی قسم کا تغیر نظر نہیں آرہا تھا۔ ان کی گفتگو، ان کی سچائی کی ایک اور دلیل تھی۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے: وہ آپس میں اپنے کاموں کے بارے میں نزاع میں پڑ گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کرنے لگے: (فتنازعوا امرھم بینھم واسروا النجوٰی)۔

ممکن ہے کہ یہ سرگوشی اور پوشیدہ باتیں موسٰی کے سامنے ہو رہی ہوں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ باتیں فرعون کے سامنے ہوں اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس منظر سے متاثر ہونے والوں نے مخفی طور پر عوام سے اس قسم کی سرگوشی اور نزاع شروع کر دیا ہو۔

⁂

لیکن بہر حال مقابلہ جاری رکھنے اور شدتِ عمل کے طرفدار کامیاب ہو گئے۔ اُنھوں نے گفتگو کا سلسلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مختلف طریقوں سے، موسٰی کے ساتھ مقابلہ کرنے والوں کو تحریک کرنے لگے پہلے، "اُنھوں نے کہا یہ دونوں جادوگر ہیں"۔ (قالوا ان ھٰذٰن لسٰحران)[1]

اس بنا پر ان کے مقابلہ میں گھبرانا نہیں چاہیئے کیونکہ تم اس وسیع و عریض ملک میں جادوگروں کے سردار اور بزرگ ہو اور تمہاری قوت و طاقت اُن سے زیادہ ہے۔

دُوسرے یہ کہ: "وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے جادو کے ذریعہ باہر نکال دیں" وہ سرزمین کہ جو تمہیں جان کی طرح عزیز ہے اور تم اس سے تعلق رکھتے ہو اور تم تعلق رکھتی ہے (یریدان ان یخرجاکم من ارضکم بسحرھما)۔

علاوہ ازیں وہ صرف تمہیں تمہارے وطن سے نکال دینے پر ہی قانع نہیں ہیں، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ تمہارے مقدسات کا بھی مذاق اُڑائیں" اور تمہارے بلند مرتبہ دین اور سچے مذہب ہی کو ختم کر دیں" (ویذھبا بطریقتکم المثلٰی)[2]

---

[1] یہ جملہ اعراب کے لحاظ سے اس طرح ہے کہ "اِن" "اِنّ" کا مخفف ہے، اور اسی وجہ سے اس نے اپنے مابعد پر عمل نہیں کیا۔ علاوہ ازیں "اِنّ" کے اسم کا رفع لغتِ عرب میں کمیاب نہیں ہے۔

[2] "طریقۃ" رَوِش کے معنی میں ہے، اور یہاں مذہب مراد ہے۔ اور "مثلٰی" مثل کے مادہ سے یہاں عالی اور افضل کے معنی میں ہے (ای الاشبہ بالفضیلۃ)۔

اب جب کہ یہ بات ہے تو شک و شبہ کو کسی طرح بھی اپنے قریب نہ پھٹکنے دو" اور اپنی تمام طاقت، منصوبہ، مہارت و قوت جمع کرو، اور کام میں لاؤ" (فاجمعوا کیدکم)۔

"اس کے بعد سب کے سب متحد ہو کر ایک ہی صف میں، میدانِ مقابلہ میں قدم رکھو": (ثم ائتوا صفا)۔

کیونکہ اس تقدیر ساز مقابلے میں وحدت و اتحاد ہی، تمہاری کامیابی و کامرانی کا ضامن ہے۔

اور آخر میں، "کامیابی تو آج اسی کے لیے ہوگی جو اپنی برتری اپنے حریف پر ثابت کر دے گا": (وقد افلح الیوم من استعلیٰ)۔

۶۵۔ قَالُوا يٰمُوسٰى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ○

۶۶۔ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ○

۶۷۔ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ○

۶۸۔ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ○

۶۹۔ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۗ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۗ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ○

ترجمہ

۶۵۔ (جادوگروں نے) کہا اے موسیٰ! کیا تو پہلے (اپنے عصا کو) پھینکے گا یا پہلے ہم پھینکیں؟

۶۶۔ (موسیٰ نے) کہا: پہلے تم پھینکو، تو فوراً ہی ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے اُسے ایسی نظر آنے لگیں جیسے وہ حرکت کر رہی ہوں۔

۶۷۔ موسیٰ ـــ اس وقت اپنے دل میں کچھ ڈرے۔

۶۸۔ ہم نے کہا ڈرو نہیں یقیناً کامیاب تو تم ہی ہوگے۔

۶۹۔ اور جو چیز تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے (زمین پر) ڈال دو، یہ اُن تمام چیزوں کو جنہیں انہوں نے بنایا ہے نگل جائے گی کیونکہ وہ تو صرف جادوگر کا مکر و فریب ہی ہیں اور جادوگر جہاں کہیں بھی جائے گا فلاح نہیں پائے گا۔

تفسیر

موسٰی بھی میدان میں آجاتے ہیں :

جادوگر ظاہراً متحد ہو گئے اور انہوں نے عزم بالجزم کر لیا کہ موسٰی کے ساتھ مقابلہ کریں گے ۔ جس وقت میدان میں قدم رکھا تو انہوں نے کہا : "اے موسٰی ! کیا تو پہلے جادو کے آلات پھینکے گا یا ہم پہلے پھینکیں (قالوا یا موسٰی اما ان تلقی واما ان نکون اول من القٰی)۔

بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ جادوگروں کی یہ تجویز کہ موسٰی پہلے اقدام کریں، یا وہ پہل کریں، ان کی طرف سے یہ موسٰی کا ایک قسم کا احترام تھا۔ اور شاید یہی چیز تھی، کہ جس نے اس قصے کے بعد انہیں ایمان لانے کی توفیق فراہم کی ۔

لیکن یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کیونکہ وہ پوری قوت کے ساتھ یہ کوشش کر رہے تھے کہ موسٰیؑ اور ان کے معجزے کو درہم برہم کر دیں۔ بنابریں یہ تعبیر شاید اس لیے ہو کہ وہ عوام پر اپنی خود اعتمادی ظاہر کریں ۔

❖ ❖ ❖

لیکن موسٰیؑ نے جلد بازی نہ کی کیونکہ انہیں اپنی کامیابی کا پورا اطمینان تھا اور اس سے قطع نظر، اس قسم کے مقابلوں میں عموماً وہ بازی لے جاتا ہے کہ جو پیش قدمی نہ کرے ـــــ انہوں نے ان سے "کہا تم پہلے پھینکو" (قال بل القوا)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسٰیؑ کی طرف سے ان کو یہ دعوتِ مقابلہ، حق کے آشکار ہونے کی ایک تمہید تھی اور جناب موسٰیؑ کی نظر میں یہ کام نہ صرف یہ کہ کوئی امر قبیح نہیں تھا بلکہ ایک امرِ واجب کا مقدمہ تھا۔

جادوگروں نے بھی اس بات کو قبول کر لیا اور جتنی لاٹھیاں اور رسیاں وہ جادو کرنے کے لیے اپنے ہمراہ لائے تھے، اُن سب کو ایک ہی بار میدان میں ڈال دیا، اور اگر ہم اس روایت کو کہ جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ : وہ ہزاروں آدمی تھے، قبول کر لیں، تو اس کا مفہوم یہ ہو گا، کہ انہوں نے ہزاروں لاٹھیاں اور رسیاں کہ جن کے اندر ایک خاص قسم کا مواد بھرا ہوا تھا ایک لمحے کے اندر میدان میں پھینک دیں۔

"اچانک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے اس طرح نظر آئیں جیسے وہ حرکت کر رہی ہوں" (فاذا حبالھم وعصیھم یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعٰی)۔

ہاں ! چھوٹے بڑے، رنگ برنگے مختلف شکلوں کے سانپ اچھلنے کودنے لگے ۔ قرآن کی دوسری آیات میں اس سلسلے میں ہے :

سحروا اعین الناس واسترھبوھم وجآءو بسحر عظیم (اعراف ۱۱۶)

انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں وحشت و گھبراہٹ میں ڈال دیا ۔ اور یہ ان کا بہت ہی بڑا جادو تھا۔

اور سورہ شعراء کی آیہ ۴۴ کی تعبیر کے مطابق :

جادوگروں نے پکار کر کہا : وقالوا بعزۃ فرعون انا لنحن الغالبون

فرعون کی عزت کی قسم ہم کامیاب ہیں۔

بہت سے مفسرین نے لکھا ہے، کہ انہوں نے بہت سا ایسا مواد جیسے "پارہ" ان رسیوں اور لاٹھیوں کے اندر بھرا ہوا تھا، کہ جس سے سورج کی دھوپ میں اس مادہ کے گرم ہو جانے کی وجہ سے، غیر معمولی دوڑ بھاگ، اور مختلف قسم کی تیز حرکتیں ان میں شروع ہوگئیں یقیناً یہ حرکتیں چلنے پھرنے کی نہیں تھیں، لیکن وہ بات جو جادوگروں نے لوگوں کو پہلے سے سجھائی ہوئی تھی، اس کے ساتھ یہ خاص منظر جو وہاں وجود میں آیا اس سے لوگوں کو یوں لگا جیسے ان موجودات میں جان آگئی ہے۔ اور وہ چل پھر رہے ہیں۔ "سحروا اعین الناس" کی تعبیر یعنی "لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا" بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے اور اسی طرح "یخیل الیہ" یعنی موسیٰ کو یوں لگا بھی ہوسکتا ہے کہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہو۔

بہر حال بہت ہی عجیب منظر تھا، جادوگر کہ جن کی تعداد بھی زیادہ تھی اور اس فن سے اُن کی آگاہی بھی کمال درجہ کی تھی اور وہ اجسام کے طبیعاتی و کیمیائی خواص سے استفادہ کرنے کے طریقوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے، لہٰذا وہ حاضرین پر اس طرح اثر انداز ہونے کے قابل ہوگئے کہ انہیں یہ یقین دلا دیں کہ یہ تمام بے جان چیزیں جاندار بن گئی ہیں۔

خوشی کا ایک شور فرعونیوں کی طرف سے بلند ہوا۔ کچھ لوگ خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے چیخنے لگے اور پیچھے کی طرف ہٹ گئے۔

* *

• اس موقع پر موسیٰ نے ایک خفیف سا خوف، اپنے دل میں محسوس کیا"۔ (فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ)۔

"اوجس" "ایجاس" کے مادہ سے اصل میں "وجس" (بروزن "حبس") سے ہے۔ جو ایک پوشیدہ آواز کے معنی سے لیا گیا ہے اس بنا پر "ایجاس" ایک پوشیدہ اور اندرونی احساس کے معنی میں ہے، اور یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ موسیٰ کا یہ اندرونی خوف بالکل معمولی اور خفیف سا تھا، اور وہ بھی اس وجہ سے نہیں تھا، کہ وہ جادوگروں کے جادو کے اثر سے، جو رعب انگیز منظر وجود میں آیا تھا ان کی کسی اہمیت کے قائل ہوگئے تھے بلکہ انہیں خوف اس بات کا تھا کہ کہیں لوگ اس منظر سے متاثر نہ ہو جائیں۔ اس طرح سے کہ انہیں واپس لوٹانا آسان نہ رہے۔

یا یہ کہ اس سے پہلے کہ موسیٰ کو اپنا معجزہ دکھانے کی مہلت ملے، کچھ لوگ اس میدان سے ہی چلے جائیں، یا انہیں یہاں سے باہر نکال دیا جائے اور حق واضح نہ ہوسکے۔

جیسا کہ نہج البلاغہ کے چھٹے خطبے میں ہے:

لم یوجس موسٰی (ع) خیفۃ علی نفسہ بل اشفق من غلبۃ الجھال ودول الضلال

موسیٰ نے ہرگز اپنے دل میں اپنے لیے خوف محسوس نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس بات سے ڈرے کہ جاہل غالب آجائیں اور گمراہ حکومت کامیاب ہو جائے۔ [1]

---

[1] حضرت علی علیہ السلام نے یہ بات اس وقت فرمائی ہے جبکہ وہ لوگوں کے انحراف سے پریشان تھے۔ وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ میری پریشانی بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ مجھے حق کے متعلق کچھ شک و شبہ ہے کیونکہ میں نے تو جس دن سے حق کو دیکھا ہے ذرہ بھر شک بھی مجھے اس میں نہیں ہوا ہے بلکہ میں لوگوں کے انحراف کی وجہ سے پریشان ہوں۔

جو کچھ بیان ہو چکا، اب اس کے بعد، حضرت موسیٰؑ کے خوف کے بارے میں جو دُوسرے جوابات ذکر ہوئے ہیں، ہم ان کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔

❁ ❁ ❁

بہرحال اس موقع پر خدا کی مدد اور نصرت موسیٰؑ کے پاس آ پہنچی اور وحی کے فرمان نے ان کی ذمّہ داری واضح کر دی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ہم نے اُس سے کہا: خوف کر اپنے قریب بھی نہ آنے دو یقیناً تم ہی غالب رہو گے: (قلنا لاتخف انك انت الاعلیٰ)۔

یہ جملہ پُوری قاطعیت کے ساتھ موسیٰ کو ان کی کامیابی کے بارے میں دلی اطمینان دلا رہا ہے، (لفظ "ان" اور ضمیر کا تکرار دونوں اس معنی پر ایک مستقل تاکید ہیں، اور اسی طرح اس جملے کا جملۂ اسمیہ ہونا بھی) اور اس طرح سے موسیٰ نے اپنی قوّت قلب کو جو لمحہ بھر کے لیے متزلزل ہوئی تھی، پھر سے مجتمع کیا۔

پھر ان سے فرمایا گیا جو کچھ تیرے دائیں ہاتھ میں ہے اُسے نیچے ڈال دے۔ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے یہ ان سب کو نگل جائے گا۔ (والق ما فی یمینك تلقف ما صنعوا)۔

چونکہ ان کا کام تو صرف جادوگر کا مکر و فریب ہے: (انما صنعوا کید ساحر)۔

اور جادوگر جہاں کہیں بھی جائے گا کامیاب نہ ہوگا۔ (ولا یفلح الساحر حیث اتٰی)۔

"تلقف" "لقف" کے مادہ سے (جو "وقف" کے وزن پر ہے) نگلنے کے معنی میں ہے۔ لیکن راغب مفردات میں یہ کہتا ہے، کہ یہ لفظ اصل میں کسی چیز کو مہارت کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے، چاہے منہ کے ساتھ ہو یا ہاتھ کے ساتھ اور بعض ارباب لغت نے اسے "تیزی کے ساتھ پکڑنے" کے معنی میں سمجھا ہے جیسے فارسی میں اس کی جگہ "ربودن" استعمال ہوتا ہے[1]

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ، یہ نہیں فرمایا کہ "اپنا عصا پھینکو" بلکہ فرمایا: "جو کچھ تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے اسے پھینکو"۔ یہ تعبیر شاید عصا سے بے اعتنائی کے عنوان سے ہو اور اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ عصا کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جو بات اہم ہے وہ خدا کا ارادہ اور اس کا حکم ہے۔ اگر اس کا ارادہ ہو تو عصا تو آسان ہے، اس سے چھوٹی اور حقیر چیز بھی اس قسم کی قدرت نمائی کر سکتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ زیر بحث آیت میں لفظ "ساحر" پہلی مرتبہ نکرہ کی شکل میں اور بعد میں اسم معرفہ کی صورت میں الف لام جنس کے ساتھ آیا ہے۔ یہ فرق شاید اس بناء پر ہو کہ پہلی مرتبہ تو مقصد یہ ہے کہ ان جادوگروں کے کام سے بے اعتنائی برتی جائے اور جملے کا مفہوم یہ ہے کہ جو کام انہوں نے کیا ہے وہ کسی جادوگر کے مکر سے زیادہ کچھ نہیں ہے لیکن دوسری مرتبہ اس حقیقت کو سمجھانا چاہتا ہے کہ نہ صرف یہ جادوگر بلکہ ہر جادوگر، جس زمانہ، اور جس جگہ پیدا ہو، وہ کامیاب اور فلاح یافتہ نہیں ہوگا۔

چند اہم نکات:

۱۔ **جادو کی حقیقت کیا ہے؟** اگرچہ ہم اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ اس سلسلے میں بحث کر چکے ہیں، لیکن ہم اس مقام پر بھی، مختصر وضاحت کے طور پر، چند جملے بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ "سحر" دراصل ہر اس چیز اور ہر اُس کام کے معنی میں ہے کہ

[1] اُردو میں اسے "اچک لینا" کہتے ہیں۔

جس کا ماخذ مخفی اور پنہاں ہو لیکن روزمرہ کی زبان میں ایسے غیر معمولی کاموں کو کہا جاتا ہے کہ جو مختلف وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے انجام پاتے ہیں۔

کبھی تو اس میں محض چالاکی، دھوکہ، فریب نظر اور ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے۔

کبھی بعض اجسام و مواد کے طبیعاتی و کیمیائی غیر معلوم خواص سے استفادہ کیا جاتا ہے اور کبھی شیاطین سے مدد لی جاتی ہے۔

اور یہ سب مفہوم اس جامع لغوی مفہوم میں داخل ہیں۔

تاریخ میں ہمیں جادو اور جادوگروں کے بارے میں بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ اور آج بھی ہمارے اس زمانہ میں ایسے اشخاص کہ جو اس قسم کے کاموں میں مشغول ہیں کم نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ موجودات کے بہت سے خواص جو گزشتہ زمانہ میں عام لوگوں سے مخفی تھے۔ ہمارے زمانے میں واضح اور آشکار ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ مختلف موجودات کے تعجب انگیز آثار کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، لہذا جادوگروں کے جادو کا بہت سا حصہ اُن کے ہاتھ سے چھن گیا ہے۔

مثلاً آج ہم علم کیمیا کے ذریعے بہت سے ایسے اجسام کو جانتے ہیں کہ جن کا وزن ہوا سے بھی زیادہ ہلکا ہے اور اگر انہیں کسی جسم کے اندر رکھا جائے تو ممکن ہے کہ اس جسم میں حرکت پیدا ہو جائے اور کسی کو اس سے تعجب بھی نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانے کے بچوں کے بہت سے کھلونے شاید گزشتہ زمانے میں جادو کی کوئی قسم معلوم ہوتے ہوں۔

آج کل سرکسوں میں ایسی نمائشیں دکھائی جاتی ہیں، کہ جو گزشتہ زمانے کے جادوگروں کے جادو کے مشابہ ہیں، آئینے، طبیعاتی اور کیمیائی اجسام کے خواص، روشنی کی چمک سے کئی طرح سے استفادہ کرتے ہوئے، عجیب و غریب منظر پیش کیے جاتے ہیں، کہ جنہیں دیکھ کر بعض اوقات دیکھنے والوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔

البتہ ریاضت کرنے والوں کے غیر معمولی اعمال اپنے مقام پر خود ایک علیحدہ داستان ہیں۔ جو بہت ہی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہیں۔

بہرحال جادو اور سحر کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کا انکار کیا جائے یا اُسے خرافات اور فضول باتوں سے نسبت دی جائے، چاہے گزشتہ زمانہ میں ہو یا موجودہ زمانہ میں۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ جادو اسلام میں ممنوع اور گناہان کبیرہ میں سے ہے۔ کیونکہ بہت سے موقعوں میں، لوگوں کے گمراہ ہونے، حقائق کی تحریف کرنے اور سادہ لوح افراد کے عقائد کی بنیاد کو متزلزل کرنے کا باعث ہو جاتا ہے۔ البتہ اس اسلامی حکم میں، بہت سے دوسرے احکام کی مانند، استثنائی صورتیں بھی ہیں۔ منجملہ ان کے نبوّت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے کے دعوے کو باطل کرنے کے لیے یا جادو کے اثر کو ان لوگوں سے دُور کرنے کے لیے کہ جو اس سے تکلیف اُٹھا رہے ہوں، جادو کا سیکھنا مستثنیٰ ہے۔

سُورۃ بقرہ کی آیت ۱۰۲ و ۱۰۳ کے ذیل میں بھی، اس تفسیر کی پہلی جلد میں، ہم اس بارے میں تفصیل کے ساتھ بات کر چکے ہیں۔

۲۔ جادوگر، کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا؟ بہت سے لوگ پُوچھتے ہیں کہ اگر جادوگر خارق عادت کام — جو کہ معجزہ سے مشابہ ہیں — انجام دے سکتے ہیں تو پھر ان کے کاموں اور معجزہ میں کس طرح فرق کیا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جادوگر کا کام ایک محدود انسانی قوت کے سہارے

سے ہوتا ہے اور معجزہ خدا کی بے پایاں اور لازوال قدرت سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔

لہٰذا جادوگر کچھ محدود کام ہی سر انجام دے سکتا ہے اور اگر وہ ان کے علاوہ کچھ اور کرنا چاہے تو عاجز ہو جاتا ہے۔ وہ صرف انہی کاموں کو انجام دے سکتا ہے جن کی اس نے پہلے سے مشق کی ہو اور ان کا ماہر ہو اور ان کے پیچ وخم سے آگاہ ہو لیکن ان کے علاوہ دوسرے کاموں میں وہ بالکل عاجز ولاچار ہو گا جبکہ انبیاء و رسل چونکہ خدا کی لازوال قدرت سے مدد لیا کرتے تھے، وہ زمین و آسمان میں ہر طرح اور ہر قسم کا خارقِ عادت کام انجام دینے پر قادر تھے۔

جادوگر لوگوں کی فرمائش کے مطابق خارقِ عادت کام انجام نہیں دے سکتا، مگر یہ کہ اتفاقیہ طور پر اس کے کام کے مطابق ہو جائے۔ (اگرچہ وہ بعض اوقات اپنے ایسے دوستوں کو جنہیں لوگ پہچانتے نہیں ہیں یہ بات سکھا دیتے ہیں کہ وہ لوگوں کے درمیان میں سے اُٹھ کھڑے ہوں اور وہ فرمائشیں کریں جو پہلے سے معین شدہ ہیں)۔

لیکن انبیاء بارہا اور کئی اہم معجزات کہ جو حق کے متلاشی لوگ ان سے سندِ نبوت کے طور پر طلب کیا کرتے تھے انجام دیتے رہے ہیں جیسا کہ ہم حضرت موسٰیؑ کی اسی سرگزشت میں مشاہدہ کریں گے۔

اس کے علاوہ جادو چونکہ ایک انحرافی کام ہے اور ایک قسم کا دھوکا اور فریب ہے۔ لہٰذا فطری طور پر ایسی طبیعتیں چاہتا ہے کہ جو اس سے ہم آہنگ ہوں اور جادوگر بلا استثناء دھوکا باز، مکار اور فریبی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جنہیں ان کے مزاج اور اعمال و کردار کے مطالعے اور تحقیق سے، بہت جلد پہچانا جا سکتا ہے۔ جبکہ انبیاء کا اخلاص و پاکیزگی اور پاکبازی ایک ایسی سند ہے کہ جو ان کے اعجاز کے ساتھ مل کر اس کے اثر کو کئی گنا کر دیتی ہے، (غور کیجئے گا)۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیرِ نظر آیت کہتی ہے،

ولا یفلح الساحر حیث اتٰی

جادوگر کہیں بھی ہو، اور جن حالات اور جس زمانہ میں ہو وہ فلاح اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

بقول معروف بہت جلد اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے، کیونکہ اس کی قوت محدود ہوتی ہے اور اس کے افکار و صفات انحرافی ہوتے ہیں۔ یہ بات صرف انہی جادوگروں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کہ جو انبیاء کے مقابلے میں آتے تھے، بلکہ تمام جادوگروں پر پوری طرح صادق آتی ہے کہ وہ جلد ہی پہچان لیے جاتے ہیں اور کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

* * *

۷۰۔ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰی ○

۷۱۔ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ

النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ○

۷۲۔ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○

۷۳۔ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ○

۷۴۔ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ○

۷۵۔ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ○

۷۶۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ○

ترجمہ

۷۰۔ (موسٰی نے اپنا عصا پھینکا اور جو کچھ انہوں نے بنا رکھا تھا وہ اسے نگل گیا تو) سب کے سب جادوگر سجدے میں گر پڑے اور انہوں نے کہا ہم ہارون اور موسٰی کے پروردگار پر ایمان لائے ہیں۔

۷۱۔ (فرعون نے) کہا: کیا میری اجازت کے بغیر تم اس پر ایمان لے آئے ہو، یقیناً وہ تمہارا بڑا ہے کہ جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ یقیناً میں تمہارے ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ ڈالوں گا اور کھجور کے تنوں کے اوپر تمہیں سُولی چڑھا دوں گا اور تم جان لوگے کہ ہم میں سے کس کی سزا زیادہ دردناک اور زیادہ پائیدار ہے۔

۷۲۔ انہوں نے کہا: اُس خدا کی قسم کہ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے ہم واضح و روشن دلائل پر جو ہم تک پہنچی ہیں تجھے ہرگز مقدم نہ رکھیں گے، جو حکم تو کرنا چاہے کر، کیونکہ تُو تو صرف اِس دُنیا کی زندگی میں حکم چلا سکتا ہے۔

۷۳۔ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لائے ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو اور جو جادوگری کے لیے تُو نے ہمیں مجبور کیا اسے بخش دے

اور خدا بہتر اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔

۷۴۔ جو شخص مجرم ہو کر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوگا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے کہ جس میں وہ نہ تو مرے گا اور نہ جیئے گا۔

۷۵۔ اور جو شخص مومن ہو اور اُس نے نیک عمل انجام دیئے ہوں (جب وہ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوگا) تو اس کے لیے عالی درجات ہیں۔

۷۶۔ جنّت کے دائمی باغات کہ جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ اس کی جزا ہے کہ جو اپنے آپ کو پاک کرے۔

تفسیر

مُوسیٰ علیہ السلام کی عظیم کامیابی:

گزشتہ آیات میں ہم یہاں تک پہنچے تھے، کہ موسیٰ کو یہ حکم دیا گیا، کہ وہ اپنا عصا پھینکیں، تاکہ جادوگروں کے جادو کی کاروائیوں کا خاتمہ کر دیں۔

زیر بحث آیات میں بھی اسی مسئلہ کو بیان کیا جا رہا ہے۔ البتہ جو جملے واضح تھے وہ حذف کر دیئے گئے ہیں (یعنی موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا، عصا ایک عظیم سانپ میں بدل گیا اور جادوگروں کے جادو کے تمام اسباب و آلات نگل گیا، تمام لوگوں میں ایک شور و غل بلند ہُوا فرعون سخت پریشان ہوا، اور اس کے مصاحبین کے منہ حیرت سے کھُلے کے کھُلے رہ گئے)۔

جادوگر، جنہوں نے آج تک بھی اِس قسم کا منظر نہیں دیکھا تھا اور جو جادو اور دوسری باتوں کا فرق اچھی طرح سے پہچانتے تھے، انہوں نے یقین کر لیا کہ یہ کام خدا کے معجزے کے سوا کچھ اور نہیں ہے اور یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا ہے کہ جو اُنہیں اُن کے پروردگار کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اُن کے دلوں میں ایک طوفان اُٹھا اور ایک عظیم انقلاب ان کی رُوح میں پھُوٹ پڑا۔

اَب اِس بات کا آخری حصّہ آیات کی زبان سے سُنتے ہیں:

"سب کے سب جادوگر سجدے میں گر پڑے اور انہوں نے کہا: "ہم موسیٰ و ہارون کے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں"

(فالقی السحرۃ سجدًا قالوا اٰمنا برب ھارون و موسیٰ)۔

"القی" کی تعبیر (فعل مجہول سے استفادہ کرتے ہوئے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ موسیٰ کی طرف ایسے کھنچے اور ان کے معجزے سے ایسے متاثر ہوئے کہ گویا بے اختیار سجدے میں جا پڑے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے صرف ایمان لانے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ انہوں نے اس بات کو اپنی ذمہ داری سمجھا، کہ وہ موسیٰ و ہارون کے پروردگار پر اس ایمان لانے کا ایک واضح اور روشن صُورت میں اور ایسے جملوں کے ساتھ کہ جن میں کوئی کسی قسم کا ابہام نہ ہو یعنی پُوری تاکید کے ساتھ اظہار کریں تاکہ اگر کچھ لوگ ان کے اس کام سے متاثر ہو کر گمراہ ہو گئے ہوں تو وہ پلٹ آئیں اور اس

لحاظ سے کسی قسم کی جاذبیت ہی ان کے ذہن باقی نہ رہے۔

یہ بات واضح اور بدیہی ہے کہ جادوگروں کے اس عمل نے فرعون کے پیکر اور اس کی جابر، خودسر اور ظالم حکومت پر ایک ضرب کاری لگائی اور اس کے تمام ارکان کو ہلا کے رکھ دیا۔

سارے ملک مصر میں اس مسئلے کے بارے میں مدتوں پروپیگنڈا ہوتا رہا تھا، اور جادوگروں کو ہر گوشہ و کنار سے اکٹھا کیا گیا تھا۔ اور ان کے لیے کامیابی کی صورت میں طرح طرح کے انعامات اور اعزازات کا وعدہ کیا گیا تھا۔

لیکن اب وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ جو لوگ مقابلے کے لیے صفِ اول میں کھڑے تھے وہی ایک دم دشمن کے آگے جھک گئے اور نہ صرف یہ کہ وہ سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں بلکہ وہ تو بڑی سختی کے ساتھ اس کا دفاع کرنے لگے اور یہ ایک ایسا مسئلہ تھا کہ جس کے بارے میں فرعون سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور بلاشک و شبہ لوگوں میں سے بھی ایک گروہ جادوگروں کی پیروی کرتے ہوئے موسٰی اور ان کے دین سے وابستہ ہو گیا تھا۔

لہٰذا فرعون کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ شور و غل اور سخت اور غلیظ قسم کی دھمکیوں کے ساتھ، اپنی رہی سہی حیثیت کو بچائے۔ جادوگروں کی طرف رُخ کرتے ہوئے اس نے کہا: کیا تم میری اجازت کے بغیر ہی اس پر ایمان لے آئے ہو (قال اٰمنتم له قبل ان اٰذن لكم)۔

یہ جابر و متکبر، نہ صرف اس بات کا مدعی تھا، کہ اس کی لوگوں کے جسم و جان پر حکومت ہے بلکہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہارے دل بھی میرے ہی قبضہ و اختیار میں ہیں اور مجھ ہی سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا تمہارے دل کا ارادہ بھی میری اجازت کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ یہ وہی کام ہے کہ جو ہر زمانے اور ہر عصر کے فرعون اپناتے ہیں۔

ان میں سے بعض تو فرعونِ مصر کی طرح، پریشانی کے وقت کھلم کھلا اپنی زبان سے کہہ دیتے ہیں اور بعض پُر اسرار طریقے سے ذرائع ابلاغ اور ربطِ اجتماعی سے استفادہ کرکے اور مختلف قسم کے سنسر لگا کر، عملی طور پر اپنے لیے اس حق کے قائل ہیں اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ لوگوں کو آزادانہ طور پر سوچنے کی اجازت نہیں دینا چاہیئے، بلکہ کبھی کبھی تو آزادیٔ فکر کے نام تک سے، لوگوں کی آزادی کو سلب کر لینا چاہیئے۔

بہرحال فرعون نے اسی بات پر قناعت نہ کی، بلکہ فوراً ہی جادوگروں پر ایک فقرہ چست کیا، اور ان پر اتہام لگاتے ہوئے کہا کہ "یہ تمہارا بڑا ہے، اسی نے تمہیں جادو سکھایا ہے اور یہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت ایک سازش ہے": (انه لكبيركم الذي علمكم السحر)۔

بلاشک فرعون کو معلوم تھا اور اُسے اس بات کا یقین تھا کہ جو بات وہ کہہ رہا ہے جھوٹ ہے اور بنیادی طور پر اس قسم کی سازش کہ جو سارے مصر کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور اس کے جاسوسوں اور خفیہ کارندوں کو خبر ہی نہ ہو ممکن نہیں ہے۔ اصولی طور پر موسٰی کو فرعون نے اپنی آغوش میں پالا تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ وہ مصر سے غائب رہے ہیں۔ اگر وہ مصر کے جادوگروں سے بڑے ہوتے تو ہر جگہ اس عنوان سے مشہور ہو جاتے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ جسے چھپایا جا سکتا۔

لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس وقت بے لگام اور خودسر لوگ اپنی نامشروع حیثیت کو خطرے میں دیکھتے ہیں تو وہ کسی قسم کے جھوٹ اور تہمت لگانے سے باک نہیں کرتے۔

پھر اس بات پر ہی بس نہ کی بلکہ جادوگروں کو نہایت سخت لہجے میں موت کی دھمکی دیتے ہوئے کہا، "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھوں کو اور دوسری طرف کے پاؤں کو قطع کر دوں گا اور بلند کھجور کے تنے پر تمہیں سُولی چڑھا دوں گا تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ میرا عذاب زیادہ دردناک اور زیادہ پائیدار ہے یا موسٰی و ہارون کے خدا کا عذاب" (فلاُقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ولاُصلبنکم فی جذوع النخل ولتعلمن اینا اشد عذابا وابقٰی)[1]

درحقیقت "اینا اشد عذابا" کا جُملہ اُس تہدید کی طرف اشارہ ہے کہ جو موسٰی نے پہلے کی تھی اور اس قصے سے پہلے ہی خصوصیت کے ساتھ جادوگروں کو سُنا دی تھی کہ اگر تم خدا پر جھُوٹ باندھو گے تو وہ تمہیں اپنے عذاب سے نیست و نابود کر دے گا۔

"من خلاف" کی تعبیر (تمہارے ہاتھ پاؤں ایک دوسرے کے خلاف کاٹوں گا) اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دائیں ہاتھ کے ساتھ بایاں پاؤں یا اس کے برعکس ــ شاید جادوگروں کے لیے اس قسم کی سزا کا انتخاب اِس لیے تھا کیونکہ اس طرح سے انسان زیادہ دیر میں مرتا ہے، یعنی خونریزی زیادہ سست ہوگی اور تکلیف بیشتر ہوگی۔ علاوہ ازیں گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں تمہارے بدن کو دونوں طرف سے ناقص کر دوں گا۔

باقی رہی یہ دھمکی کہ تمہیں کھجور کے درخت پر سُولی دوں گا، تو یہ شاید اس بنا پر ہو کہ یہ درخت زیادہ اُونچے اور بلند ہوتے ہیں اور نزدیک و دُور سے سب لوگ اس شخص کو دیکھ لیتے ہیں جو اس پر لٹکایا گیا ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ اس زمانے میں اس طرح سے سولی نہیں چڑھایا جاتا تھا جس طرح سے ہمارے زمانہ میں سولی دیا جاتا ہے وہ سولی کی رسّی کو اُس شخص کی گردن میں، جسے سولی دینا مطلوب ہوتا تھا، نہیں ڈالتے تھے بلکہ اس کے ہاتھوں یا شانوں سے باندھ دیتے تھے، تاکہ وہ تکلیف اُٹھاتا رہے۔

❁ ❁ ❁

آیئے اب یہ دیکھتے ہیں کہ فرعون کی ان شدید دھمکیوں کے جواب میں جادوگروں نے کیا ردِّ عمل دکھایا؟ وہ نہ صرف یہ کہ مرعوب نہیں ہوتے اور اپنی جگہ سے نہیں ہلے اور میدان سے باہر نہ نکلے بلکہ وہ میدان میں مضبوطی سے ڈٹے رہے اور کہا: "اُس خدا کی قسم کہ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، ہمیں جو واضح دلائل میسر آئے ہیں، ہم اُن پر ہرگز تجھے مقدم نہ رکھیں گے" (قالوا لن نؤثرک علٰی ما جاءنا من البینات والذی فطرنا)۔

"تو جو فیصلہ کرنا چاہے کر لے" : (فاقض ما انت قاض)۔

"لیکن یہ جان لے کہ تُو تو صرف اس دنیاوی زندگی کے بارے میں ہی فیصلہ کر سکتا ہے: (مگر آخرت میں ہم کامیاب ہوں گے اور تو شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا) (انما تقضی ھٰذہ الحیاۃ الدنیا)۔

اس طرح سے انہوں نے تین، دو ٹوک جُملے فرعون سے کہے۔ پہلا یہ کہ تم جان لو کہ، ہم نے جو ہدایت پائی ہے، اُسے کسی چیز سے نہیں بدلیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہم تیری دھمکیوں سے کبھی بھی ہراساں نہ ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ تیری حکومت و فعالیت یہی چار روزہ ہے۔

---

[1] مشہور یہ ہے کہ "ولاُصلبنکم فی جذوع النخل" میں "فی" کا لفظ "علٰی" کے معنی میں ہے یعنی تمہیں کھجور کے درختوں پر سولی لٹکاؤں گا لیکن فخر رازی کا نظریہ تو یہ ہے کہ "فی" یہاں پر اپنا ہی معنی دیتا ہے کیونکہ "فی" ظرفیت کے لیے ہوتا ہے اور ہر چیز کی ظرفیت اس سے مناسبت رکھتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ سولی کی لکڑی اس شخص کیلئے بطور ظرف استعمال ہوتی ہے کہ جسے سولی چڑھایا جائے (لیکن یہ توجیہ کچھ صحیح نظر نہیں آتی)۔

پھر انہوں نے مزید کہا: "اگر تو یہ دیکھ رہا ہے کہ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں، تو یہ اس لیے ہے تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو بخش دے" (ہم جادو اور جادوگری کی وجہ سے بہت سے گناہوں کے مرتکب ہو چکے ہیں)۔ (انا اٰمنا بربنا لیغفرلنا خطایانا)۔

اور اسی طرح "وہ بڑا گناہ (یعنی رسولِ خدا کے مقابلے میں جادو کا مظاہرہ) جس کے کرنے پر تُو نے ہمیں مجبور کیا تھا، اللہ ہمیں معاف کرتے ہوئے اپنی رحمت میں شامل کرے اور خدا ہر چیز سے بہتر اور باقی رہنے والا ہے" (وما اکرھتنا علیہ من السحر واللہ خیر وابقٰی)۔

مختصر یہ کہ ہمارا مقصد گزشتہ گناہوں سے پاک ہونا ہے۔ اُن میں سے (ایک گناہ) خدا کے سچے پیغمبر کے ساتھ مقابلہ کرنا بھی ہے ہم اس طرح سے یہ چاہتے ہیں کہ سعادت ابدی حاصل کرلیں لیکن تو ہمیں اس دنیا کی موت سے ڈرا رہا ہے۔ یہ تھوڑا سا ضرر اُس عظیم بھلائی کے مقابلے میں ہمیں قبول ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جادوگروں نے ظاہراً خود اپنی خوشی سے اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ اگرچہ فرعون نے اُن سے بہت سے وعدے کیے تھے۔ تو پھر زیر بحث آیت میں "اکراہ" (مجبور کرنا) کیوں آرہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی دلیل ایسی نظر نہیں آتی کہ جادوگر شروع سے ہی اس دعوت کو قبول کرنے پر مجبور نہیں تھے بلکہ "یاتوک بکل ساحر علیم" (مامورین جاکر ہر ماہر جادوگر کو لے آئیں) (اعراف۔ ۱۱۲) کے جملہ کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ ہر جادوگر کے لیے اس دعوت کو قبول کرنا لازمی و ضروری تھا۔ یقیناً فرعون کی خودسر اور استبدادی حکومت میں یہ کام بالکل طبیعی نظر آتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور ارادوں کی تکمیل کے لیے لوگوں کو مجبور کرتے تھے۔ باقی رہا اُن میں شوق پیدا کرنے کے لیے انعام و اکرام مقرر کرنا۔ تو یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ بے لگام ستمگر حکومتیں زور اور طاقت سے کام لینے کے ساتھ ساتھ مادی لالچ سے بھی استفادہ کرتی ہیں۔

یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ جادوگر جونہی حضرت موسیٰؑ کے سامنے آئے کچھ قرائن سے اُن پر یہ واضح ہوگیا تھا کہ موسیٰؑ حق پر ہیں یا کم از کم وہ شک و شبہ میں پڑگئے تھے اور اسی بنا پر ان میں گومگو کی حالت پیدا ہوگئی تھی جیسا کہ ہم نے اسی سورہ کی آیہ ۶۲ میں پڑھا ہے:

فتنازعوا امرھم بینھم

فرعون اور اس کے درباری اس صورتِ حال سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے انہیں مقابلہ جاری رکھنے پر مجبور کیا۔

جادوگروں نے اس کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر ہم ایمان لے آئے ہیں تو اس کی دلیل واضح و روشن ہے: "کیونکہ جو شخص بے ایمان اور گنہگار قیامت میں خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوگا، اُس کے لیے دوزخ کی جلانے والی آگ ہے"۔ (انہ من یأت ربہ مجرماً فان لہ جھنم)۔

اور دوزخ میں سب سے بڑی مصیبت اس کے لیے یہ ہے کہ: "اس میں نہ تو وہ مرے گا اور نہ زندہ ہوگا" (لا یموت فیھا ولا یحیٰی)۔

بلکہ وہ ہمیشہ موت اور زندگی کی کشمکش میں رہے گا ایسی زندگی کہ جو موت سے زیادہ تلخ اور تکلیف دہ ہوگی۔

"اور جو شخص اس عظیم بارگاہ میں ایمان اور عمل صالح کے ساتھ پہنچے گا، وہ عالی درجوں پر فائز ہوگا": (ومن یأته مؤمنا قد عمل الصالحات فاولٰئك لهم الدرجات العلٰی)۔

"ہمیشہ باقی رہنے والی جنتیں کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے": (جنات عدن تجری من تحتها الانهار خالدین فیها)۔

"اور یہ اس شخص کی جزا ہے کہ جو ایمان اور اطاعت پروردگار کے ساتھ اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ کرے" (وذالك جزاء من تزکٰی)۔

آخر کی تین آیات جادوگروں کی اس گفتگو کا حصہ ہیں جو انہوں نے فرعون کے سامنے کی تھی یا خدا کی طرف سے مستقل جملے ہیں کہ جو بیان اُن کی گفتگو کی تکمیل کے لیے فرمائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض انہیں جادوگروں کی گفتگو کا آخری حصہ سمجھتے ہیں اور شاید "انه" سے شروع ہونا کہ جو واقعاً علت کے بیان کرنے کے لیے آتا ہے، اس نظریہ کی تائید کرتا ہے۔

لیکن وہ تفصیل، جو ان تینوں آیات میں صالح مومنین اور مجرم کافروں کے مستقبل کے بارے میں بیان ہوئی ہے اور "ذالك جزاء من تزکٰی" (یہ اس کی جزا ہے جو پاکیزگی اختیار کرے) کے جملہ پر ختم ہوتی ہے اور وہ اوصاف بھی کہ جو جنت اور دوزخ کے بارے میں اس میں بیان ہوئے ہیں، دوسرے نظریہ کی تائید کرتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ کیونکہ جادوگر ایسی بات جبھی کرسکتے تھے کہ انہوں نے اس مختصر سی مدت میں معرفت و علوم الٰہی کا وافر حصہ حاصل کر لیا ہو کہ جس کی بناء پر وہ جنت و دوزخ اور مومنین و مجرمین کے انجام کے بارے میں اس قسم کا دو ٹوک اور آگاہانہ فیصلہ کرسکیں۔

مگر یہ کہ ہم یہ کہیں کہ خدا نے ان کے ایمان کی وجہ سے یہ پُرمعنی باتیں ان کی زبان پر جاری کر دی تھیں۔ اگرچہ یہ بات خدائی تربیت اور نتیجہ کے لحاظ سے ہمارے لیے کوئی فرق نہیں ڈالتی کہ خدا نے خود فرمایا ہو یا خدا کی طرف سے تعلیم یافتہ مومنین نے خاص طور پر جبکہ قرآن اسے تائید کے لہجے میں بیان کر رہا ہے۔

❖ ❖ ❖

چند اہم نکات:

۱۔ **علم، ایمان و انقلاب کا سرچشمہ ہے:** سب سے اہم مسئلہ کہ جو زیر بحث آیات میں نظر آتا ہے موسیٰ کے مقابلے میں آنے پر جادوگروں میں پیدا ہونے والی گہری اور فوری تبدیلی ہے۔ وہ جس وقت حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے، تو ان کے انتہائی سخت دشمن تھے لیکن حضرت موسیٰؑ کا پہلا ہی معجزہ دیکھ کر اس طرح سے بدل گئے، بیدار ہوگئے اور انہوں نے اپنے راستے کو بدل لیا کہ سب لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔

کفر سے ایمان کی طرف، انحراف سے درستی و استقامت کی طرف، کجی سے راستی کی طرف اور ظلمت سے نور کی طرف، اس فوری اور تیزی کے ساتھ راستے کی تبدیلی نے سب کو ایسی بوکھلاہٹ میں ڈالا کہ شاید فرعون کو بھی اس بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ لہٰذا اس نے کوشش کی کہ اسے ایک پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ اور سازش قرار دے حالانکہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی یہ بات جھوٹی ہے۔

کونسا عامل اس گہرے اور سریع انقلاب ذہنی کا سبب بنا اور کونسے عامل نے نور ایمان اس قوت سے ان کے دل میں چمکایا کہ وہ

اپنے وجود اور ہستی تک کو اس کام کی خاطر داؤ پر لگانے کے لیئے تیار ہو گئے ۔۔۔ یہاں تک کہ تاریخ کہتی ہے کہ فرعون نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا اور انہیں اس وحشیانہ طریقے سے شہید کر دیا ۔

کیا علم و آگاہی کے سوا کوئی اور عامل یہاں دکھائی دیتا ہے ؟ وہ چونکہ جادو کے فنون اور رموز سے آشنا تھے ، اور انہوں نے صاف طور پر جان لیا تھا کہ موسیٰ کا کام جادو نہیں ہے بلکہ خدائی معجزہ ہے۔ لہذا اُنہوں نے بڑی جرأت سے اور قاطع انداز میں اپنا راستہ تبدیل کر لیا ۔

اس سے ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ افراد یا معاشرے میں تبدیلی لانے اور ایک تیز اور سچا انقلاب پیدا کرنے کے لیے ہر چیز سے پہلے انہیں علم و آگاہی دینے کی ضرورت ہے ۔[1]

۲۔ **ہم تجھے "بیّنات" پر مقدم نہیں کرتے** : یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے بے منطق و دلیل فرعون کے مقابلے میں منطقی ترین تعبیر کو اختیار کیا ۔ پہلے انہوں نے کہا کہ ہم نے موسیٰ کی حقانیت اور اس کی خدائی دعوت پر روشن اور واضح دلائل پلئے ہیں اور ہم کسی بھی چیز کو ان روشن اور واضح دلائل پر مقدم نہیں کریں گے ۔ اس کے بعد انہوں نے " والذی فطرنا " (قسم ہے اُس کی جس نے ہمیں خلق فرمایا) کہہ کر اس مطلب کی تاکید کی ۔ کلمہ " فطرنا " ان کی فطرتِ توحیدی کی طرف گویا ایک اشارہ ہے یعنی ہم اپنی رُوح کے اندر بھی نورِ توحید کی جھلک دیکھ رہے ہیں اور دلیلِ عقل سے بھی سمجھ رہے ہیں تو ان واضح و آشکار دلائل کے ہوتے ہوئے ، ہم اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھے راستوں پر کیسے چل سکتے ہیں ؟

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے " والذی فطرنا " کو قسم کے معنی میں نہیں لیا بلکہ اسے " ماجاءنا من البینات " پر عطف جانا ہے ۔ اس بنا پر پُورے جملے کا معنی اس طرح ہوگا ؛ " ہم تجھے ان واضح و روشن دلائل اور اُس خدا پر کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے ہرگز مقدم نہ کریں گے ۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان دونوں کا ایک دوسرے پر عطف کچھ مناسب نہیں ہے (غور کیجئے گا) ۔

۳۔ **مجرم سے کون مراد ہے ؟** زیر بحث آیات میں ہے : " جو شخص بھی میدانِ محشر میں مجرم (کی حیثیت سے) وارد ہوگا ، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے ۔"

اس کا ظاہری معنی ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب ہے ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر مجرم کا انجام یہی ہے ؟

لیکن اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ بعد والی آیات میں کہ جو اس کے فریقِ مقابل کو بیان کرتی ہیں ، لفظ " مؤمن " آیا ہے ۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں " مجرم " سے مراد کافر ہے ۔ علاوہ ازیں اس لفظ کا کافر کے معنی میں استعمال قرآن مجید کی اور بھی بہت سی آیات میں دکھائی دیتا ہے ۔

مثلاً ، قوم لوط کے بارے میں کہ جو ہرگز اپنے پیغمبر پر ایمان نہیں لائی ، یہ بیان ہوا ہے کہ :

وامطرنا علیهم مطرًا فانظر کیف کان عاقبة المجرمین

ہم نے اُن پر پتھروں کی بارش کی ، پس دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا ؟ (اعراف ۔ ۸۴)

---

[1] اس سلسلے میں ہم ۔۔۔۔ سورہ اعراف کی آیہ ۱۲۳ تا ۱۲۶ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں ۔ دیکھئے جلد ۶

اور سورہ فرقان کی آیہ ۳۱ میں ہے:

وکذالك جعلنا لكل نبی عدوا من المجرمین

ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے کچھ دشمن قرار دیئے ہیں۔

۴۔ ماحول کی مجبوری ایک بہانہ ہے: زیرِ نظر آیات میں جادوگروں کی سرگزشت نے یہ بات واضح کردی ہے کہ ماحول کی مجبوری کا مسئلہ ایک جھوٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان فاعلِ مختار ہے اور ارادے کی آزادی کا مالک ہے۔ جس وقت بھی وہ مصمم ارادہ کرے اسی وقت باطل کی طرف سے حق کی جانب اپنے راستے کو بدل سکتا ہے، چاہے اس کے ماحول کے تمام لوگ گناہ میں غرق اور منحرف ہی ہوں۔ وہ جادوگر جو سالہا سال سے اسی شرک آلود ماحول میں نہایت شرک آمیز اعمال کے خود مرتکب ہو رہے تھے، جس وقت انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ حق کو قبول کریں اور اس کے راستہ میں عاشقانہ انداز میں ڈٹ جائیں تو وہ کسی دھمکی سے نڈرے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ عظیم مفسر مرحوم طبرسی کے قول کے مطابق:

"کانوا اول النهار کفارا سحرة و اخر النهار شهداء بررة!"

وہ صبح کے وقت تو کافر اور جادوگر تھے اور شام کے وقت راہِ حق کے نیکو کار شہید بن گئے۔[1]

اس سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح اور روشن ہو جاتی ہے کہ مذہب کی پیدائش کے بارے میں مادئین خصوصاً مارکسسٹوں کے افسانے کس قدر کمزور اور بے بنیاد ہیں، وہ ہر تحریک کا عامل اور سبب اقتصادی مسائل ہی کو سمجھتے ہیں۔ جبکہ یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا کیونکہ جادوگر شروع میں ایک طرف تو فرعون کے غلبہ و اقتدار کے دباؤ سے، اور دوسری طرف اس کے اقتصادی لالچ میں آکر حق کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آئے تھے لیکن اللہ پر ایمان نے ان سب چیزوں کو ختم کر دیا۔ انہوں نے مال و مقام کو بھی کہ جس کا فرعون نے اُن سے وعدہ کیا تھا ایمان کے قدموں میں ڈال دیا اور اپنی عزیز جان بھی اس عشق میں قربان کر دی۔

۷۷۔ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ○

۷۸۔ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ○

۷۹۔ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ○

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ج ۴، ص ۴۶۴ (آیہ ۱۲۶ سورہ اعراف کے ذیل میں)۔

ترجمہ

۷۷۔ ہم نے موسٰی کی طرف وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو (مصر سے) اپنے ساتھ لے جا اور ان کے لیے دریا میں سے خشک راستہ بنا دے تاکہ نہ تو (فرعونیوں کے) تعاقب سے تجھے خوف ہو اور نہ دریا میں غرق ہونے کا ڈر ہو۔

۷۸۔ (اس طرح سے) فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور دریا نے انہیں (اپنی پرخروش موجوں کے درمیان) پوری طرح چھپا لیا۔

۷۹۔ اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا اور ہرگز ہدایت نہ کی۔

تفسیر

بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونیوں کا غرق ہونا:

جب حضرت موسیٰؑ نے جادوگروں پر دوٹوک اور نمایاں کامیابی حاصل کر لی اور کثیر تعداد میں موجود یہ جادوگر آپ پر ایمان لے آئے تو آپ کا دین باقاعدہ طور پر مصر کے لوگوں کے افکار و اذہان میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ قبطیوں کی اکثریت نے اُسے قبول نہیں کیا لیکن یہ ان کے لیے ہمیشہ ایک مسئلہ بنا رہا۔ مصر میں بنی اسرائیل اقلیت میں تھے تاہم حضرت موسیٰؑ کی رہبری میں ہمیشہ کے لیے آلِ فرعون کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔

کئی سال اسی طرح سے گزر گئے اور کئی تلخ و شیریں حادثات پیش آئے۔ جن کے بعض حصے قرآن نے سورۂ اعراف کی آیہ ۱۲۷ کے بعد بیان کیے ہیں۔

زیرِ بحث آیات میں ان واقعات کا آخری حصہ یعنی بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات مصر سے باہر نکال کر لے جا (ولقد اوحینا الی موسٰی ان اسر بعبادی)۔

بنی اسرائیل، معینہ علاقے (فلسطین) کی طرف چلنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن جس وقت وہ دریائے نیل کے کنارے پہنچے تو فرعونیوں کو خبر ہو گئی۔ فرعون نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ بنی اسرائیل نے اپنے آپ کو دریا اور دشمن کے محاصرہ میں پایا۔ ایک طرف عظیم دریائے نیل اور دوسری طرف غیظ و غضب میں ڈوبا ہوا طاقتور اور خونخوار دشمن۔

لیکن خدا تو یہ چاہتا تھا کہ اس صاحبِ ایمان محروم و ستم رسیدہ قوم کو ظالموں کے چنگل سے نجات بخشے اور ستمگروں کو ہلاک و نابود کر دے۔

اُس نے موسیٰ کو حکم دیا: "ان کے لیے دریا میں خشک راستہ بنا دے" (فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا)۔

ایسا راستہ کہ جس وقت تم اس میں قدم رکھو تو "نہ فرعونیوں کے پیچھا کرنے کا خوف ہو اور نہ ہی دریا میں غرق ہونے کا"

(لا تخاف درکا ولا تخشی)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ نہ صرف راستہ بن گیا بلکہ یہ راستہ، خدا کے حکم سے ایک خشک راستہ تھا۔ حالانکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اگر دریا یا سمندر کا پانی ہٹ بھی جائے تو پھر بھی اس کی نشیبی جگہیں مدتوں قابلِ عبور نہیں ہوتیں۔

"راغب" "مفردات" میں کہتا ہے کہ "دَرک" (بروزن "مرگ") سمندر کی گہرائی کے سب سے نچلے حصّہ کے معنی میں ہے اور اُس رسّی کو بھی "درک" (بروزن "محک") کہا جاتا ہے جسے دوسری رسی کے ساتھ اس لیے جوڑتے ہیں تاکہ وہ پانی تک پہنچ جائے۔ اسی طرح وہ خسارے، جو انسان کو اُٹھانے پڑتے ہیں انہیں بھی "درک" کہتے ہیں۔ "درکات نار" "درجات جنّت" کے مقابلہ میں، دوزخ کے نچلے مراحل کے معنی میں ہے۔

لیکن سورۂ شعراء کی آیت ۶۱ کے مطابق — جب بنی اسرائیل فرعون کے لشکر کی آمد سے باخبر ہوئے تو انہوں نے موسٰی سے کہا "انا لمدرکون" "ہم تو فرعونیوں کے چنگل میں پھنس گئے"۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ بحث آیت میں "درک" سے مراد یہ ہے کہ تمہیں اس طرح سے گرفتار بھی نہیں کیا جائے گا، اور "لا تخشٰی" کا مطلب یہ ہے کہ دریا کا بھی تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

❖ ❖ ❖

اس طرح موسٰی اور بنی اسرائیل اِن راستوں میں داخل ہوگئے کہ جو دریا میں پانی کے ہٹ جانے کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے اس موقع پر فرعون اپنے لشکر کے ساتھ دریا کے کنارے پر پہنچ گیا اور اس نے یہ غیر متوقع اور حیرت انگیز منظر دیکھا "اور فرعون نے اپنے لشکر کو بنی اسرائیل کے پیچھے لگا دیا۔ اور خود بھی اسی راستہ پر چلنے لگا" (فاتبعھم فرعون بجنودہ)[1]

مسلّمہ طور پر فرعون کا لشکر شروع میں اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ اس خطرناک ناشناختہ جگہ میں قدم رکھے اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرے۔ کم از کم ایسے عجیب و غریب معجزے کا مشاہدہ اُنہیں اِس راستے پر چلنے سے روکنے کے لیے کافی تھا۔

لیکن فرعون — جس کے دماغ میں غرور و نخوت کی ہوا بھری ہوئی تھی — ہٹ دھرمی اور سرکشی پر تلا ہوا تھا، وہ ایک ایسے عظیم معجزے کے پاس سے بے اعتنائی کے ساتھ گزر گیا اور اپنے لشکر کو ان انجانے دریائی راستوں میں داخل ہونے کے لیے اُبھارا۔

ادھر فرعون کے لشکر کا پہلا آدمی دریا میں اُترا اور اُدھر بنی اسرائیل کا آخری شخص دریا سے باہر نکل گیا۔

اُس وقت پانی کی موجوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی پہلی جگہ پر پلٹ آئیں، موجیں اُس فرسودہ عمارت کی مانند کہ جس کی بنیادیں نکال دی جائیں، ایک دم ان کے اُوپر آ پڑیں: "اور وہ پوری طرح دریا کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کے نیچے چُھپ گئے (فغشیھم من الیم ما غشیھم)[2]

اور اس طرح سے ایک جابر و ستمگر اپنے طاقتور اور زبردست لشکر کے ساتھ پانی کی موجوں میں غوطے کھانے لگا۔ اور اُس کے لشکری

---

[1] اس جملہ کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی پیش کیا جاتا ہے کہ "با" "بجنودہ" میں "مع" کے معنی میں ہے اور اس جملہ کا یہ معنی ہے: "فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کا پیچھا کیا" اگرچہ ان دونوں تفسیروں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

[2] "یم" سمندر کے معنی میں ہے اور عظیم دریا کے معنی بھی دیتا ہے۔ بعض محققین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ ایک قدیم مصری لغت کا لفظ ہے نہ کہ عربی۔ مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۴ صفحہ ۲۳۵ (اردو ترجمہ) کے حاشیہ کی طرف رجوع کریں۔

دریا کی مچھلیوں کا لقمہ بن گئے۔

ہاں " فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ہرگز انہیں ہدایت نہ کی" (واضل فرعون قومه وماهدٰی)۔

یہ ٹھیک ہے کہ " اضل " اور " ماهدٰی " کے جملے تقریباً ایک ہی مفہوم دیتے ہیں اور شاید اسی بنا پر بعض مفسرین نے اسے تاکید سمجھا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں فرق رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ " اضل " تو گمراہ کرنے کی طرف اشارہ ہے لو " ماهدٰی " گمراہی کے واضح اور روشن ہونے کے بعد ہدایت نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ، ایک رہبر سے بعض اوقات اشتباہ بھی ہو جاتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو غلط اور انحرافی راستہ پر چلانے لگتا ہے لیکن جب وہ متوجہ ہو تو فوراً انہیں صحیح راستہ کی طرف پلٹا کرلے جاتا ہے لیکن فرعون اس قدر ہٹ دھرم تھا کہ گمراہی کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی اس نے اپنی قوم سے حقیقت کو بیان نہیں کیا اور انہیں اس طرح سے بے راہ روی کی طرف کھینچتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اور اس کی قوم سب نابود ہو گئے۔

بہر حال یہ جملہ درحقیقت فرعون کی اُس بات کی کہ جو سورۂ مومن کی آیہ ۲۹ میں بیان ہوئی ہے نفی کرتا ہے:

وما اهديكم الا سبيل الرشاد۔

میں تمہیں سیدھی راہ کی ہی ہدایت کرتا ہوں۔

واقعات نے نشاندہی کر دی ہے کہ اس کا یہ جملہ — اس کے دوسرے جھوٹوں کی طرح — ایک بہت بڑا جھوٹ تھا۔

۸۰۔ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝

۸۱۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝

۸۲۔ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝

ترجمہ

۸۰۔ اے بنی اسرائیل ہم نے تمہیں تمہارے دشمن (کے چنگل) سے نجات دی اور کوہِ طور کی دائیں طرف کے لیے تمہارے ساتھ وعدہ کیا اور تم پر من و سلویٰ نازل کیا۔

۸۱۔ وہ پاکیزہ رزق کہ جو ہم نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے کھاؤ۔ لیکن اس میں سرکشی نہ کرو (ورنہ) میرا غضب تم پر آئے گا اور جس پر میرا غضب آیا وہ تباہ ہوگیا۔

۸۲۔ میں ان لوگوں کو بخش دوں گا کہ جو توبہ کرلیں، ایمان لے آئیں اور عمل صالح انجام دیں، اس کے بعد ہدایت پر رہیں۔

تفسیر

نجات کی واحد راہ:

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی آل فرعون کے چنگل سے نجات کا بیان ایک عظیم معجزہ کی صورت میں کیا گیا تھا۔ اب زیر نظر تینوں آیات میں بنی اسرائیل سے عمومی اعتبار سے گفتگو ہو رہی ہے اور انہیں وہ عظیم نعمتیں یاد دلائی جارہی ہیں جو خدا نے انہیں بخشی ہیں اور انہیں راہِ نجات کی نشاندہی کی جارہی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہیں تمہارے دشمن کے چنگل سے رہائی بخشی (یا بنی اسرائیل قد انجیناکم من عدوکم)۔

یہ بات واضح ہے کہ ہر مثبت فعالیت کی بنیاد دُوسروں کے تسلط اور غلبہ سے نجات پانا اور استقلال و آزادی کا حصول ہے۔ اسی بنا پر سب سے پہلے اسی چیز کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے تمہیں ایک مقدس وعدہ گاہ کی طرف دعوت دی، کوہ طور کے دائیں طرف، جو وحی الٰہی کا مرکز ہے": (وواعدناکم جانب الطور الایمن)۔

یہ حضرت موسیٰؑ کے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے ساتھ طور کی وعدہ گاہ کی طرف جانے کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی وعدہ گاہ میں خدا نے موسیٰؑ پر تورات کی الواح نازل کیں اور اُن سے باتیں کیں اور پروردگار کے جلوہ خاص کا سب نے مشاہدہ کیا۔[1]

اس کے بعد ایک اہم مادی نعمت — کہ جو بنی اسرائیل کے لیے خدا کا ایک لطفِ خاص تھا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تم پر "من" و "سلویٰ" نازل کیا: (و نزلنا علیکم المن والسلوٰی)۔

جب تم اُس بیابان میں سرگردان تھے۔ پاس کوئی مناسب غذا نہیں تھی، تو لطفِ خدا تمہاری مدد کے لیے آگے بڑھا۔ لذیذ اور خوش مزہ کھانا اتنی مقدار میں کہ جتنی تمہیں ضرورت تھی، تمہیں مہیا کیا۔ تم اُس سے استفادہ کرتے رہے۔

اِس بارے میں کہ "من و سلویٰ" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے بہت بحث کی ہے، جیسے ہم نے اسی تفسیر کی پہلی جلد میں (سورہ بقرہ کی آیہ ۵۷ کے ذیل میں) بیان کیا ہے اور مفسرین کے اقوال نقل کرنے کے بعد ہم نے لکھا ہے کہ، بعید نہیں ہے کہ "مَن" ایک قسم کا طبیعی شہد ہو کہ جو اس بیابان کے قریب کے پہاڑوں میں پایا جاتا تھا، یا یہ ایک مخصوص قسم کا قوت بخش نباتی شیرہ ہو، کہ جو اس بیابان کے اطراف میں اُگے ہوئے درختوں سے نکلتا تھا اور "سلویٰ" ایک قسم کا حلال گوشت کبوتر کے مشابہ پرندہ تھا (مزید وضاحت

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل چوتھی جلد سورہ اعراف کی آیہ ۱۵۵، ۱۵۶ کے ذیل میں مطالعہ فرمائیں۔

کے لیے جلد اول میں مذکورہ آیت کے ذیل میں رجوع کریں)۔

⁂

بعد والی آیت میں ان تینوں بیش بہا نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد قرآن انہیں اس طرح سے خطاب کرتا ہے: ہم نے جو پاکیزہ روزی تمہیں دی ہے اس میں سے کھاؤ، لیکن اس میں سرکشی نہ کرنا (کلوا من طیبات ما رزقناکم ولا تطغوا فیه)۔

نعمتوں میں طغیان یہ ہے کہ انسان ان سے خدا کی اطاعت اور اپنی سعادت کے لیے استفادہ کرنے کی بجائے، ان کو گناہ، ناشکری، کفرانِ نعمت، سرکشی اور اِدھر اُدھر کے افکار کا اسیر بننے کا ذریعہ بنالے جیسا کہ بنی اسرائیل نے کیا۔ ان کو یہ تمام خدائی نعمتیں حاصل تھیں اور پھر بھی کفر و طغیان و گناہ کی راہ پر چل پڑے۔

اس کے بعد انہیں خبردار کیا ہے: اگر تم طغیان و سرکشی کروگے تو میرا غضب تمہیں دامن گیر ہوجائے گا (فیحل علیکم غضبی)۔

اور جس پر میرا غضب نازل ہوجائے وہ تباہ و برباد ہوجاتا ہے: (ومن یحلل علیه غضبی فقد هوی)۔

"هوی" دراصل بلندی سے گرنے کے معنی میں ہے، کہ جس کا نتیجہ عام طور پر نابود ہونا ہے۔ علاوہ ازیں یہاں پر برتر مقام سے گرنا، اور قربِ پروردگار سے دُوری اور اس کی جناب سے راندۂ درگاہ ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

چونکہ یہ بات ہمیشہ ضروری ہے کہ تنبیہ و تہدید کے ساتھ ساتھ تشویق و بشارت بھی ہو تا کہ اُمید و بیم کی قوت کو — کہ جو ارتقاء و تکامل کے لیے بنیادی عامل ہے — یکساں طور پر اُبھارے اور توبہ کرنے والوں کے لیے واپسی کے دروازوں کو کھلا رکھے۔ لہٰذا بعد والی آیت کہتی ہے: میں اُن لوگوں کو بخش دوں گا کہ جو توبہ کرلیں، ایمان لے آئیں، نیک عمل انجام دیں۔ اور اس کے بعد ہدایت پر بھی قائم رہیں: (وانی لغفار لمن تاب وآمن وعمل صالحا ثم اهتدی)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "غفار" مبالغہ کا صیغہ ہے، یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ خدا اس قسم کے لوگوں کو نہ صرف ایک دفعہ بلکہ بار بار، اپنی بخشش اور مغفرت سے نوازتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ توبہ کی پہلی شرط گناہ کا ترک کرنا ہے اور جب اِنسان کی رُوح سے گناہوں کی آلودگی برطرف ہوجائے تو اس کے بعد دوسری شرط یہ ہے کہ خدا پر ایمان اور توحید کا نور اِس میں جلوہ گر ہو۔

اور تیسرے مرحلہ میں ایمان و توحید کے شگوفے — جو کہ اعمالِ صالح اور پسندیدہ کام ہیں — وجودِ انسان کی شاخوں پر پھوٹنے چاہئیں۔ لیکن قرآن کی دوسری تمام آیات کے برخلاف — کہ جو صرف توبہ، ایمان اور عملِ صالح کی بات کرتی ہیں — یہاں پر چوتھی شرط کا "ثم اهتدی" کے عنوان کے تحت اضافہ ہوگیا ہے۔

اس کے معنی کے بارے میں مفسرین نے بہت بحث کی ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کی مختلف تفسیروں میں دو زیادہ جاذبِ نظر معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی تفسیر، تو یہ ہے کہ یہ راہِ ایمان و تقویٰ اور عملِ صالح کو دوام بخشنے اور جاری رکھنے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی توبہ گزشتہ گناہوں کو تو دھوڈالتی ہے اور باعثِ نجات بنتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ توبہ کرنے والا شخص پھر اُسی شرک و گناہ کے گڑھے میں نہ جاگرے

اور وہ ہمیشہ اس بات پر نظر رکھے کہ شیطانی وسوسے اور اس کا نفس اُسے سابقہ راستے پر ہی نہ لے جائیں ۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ جملہ خدائی رہبروں کی رہبری کو قبول کرنے اور ان کی ولایت کو تسلیم کرنے کے وجوب کی طرف اشارہ ہے یعنی توبہ و ایمان و عمل صالح اسی وقت باعثِ نجات ہو سکتے ہیں کہ جب یہ خدائی رہبروں کی ہدایت کے زیرسایہ انجام پذیر ہوں ۔ وہ ایک زمانے میں موسیٰؑ تھے، دوسرے زمانہ میں پیغمبرِ اسلامؐ تھے ۔ ان کے بعد امیرالمومنین علی علیہ السلام تھے اور آج حضرت مہدی (سلام اللہ علیہ) ہیں ۔

کیونکہ ارکانِ دین میں سے ایک پیغمبر کی دعوت اور ان کی رہبری کو قبول کرنا ہے اور ان کے بعد ان کے جانشینوں کی رہبری کو قبول کرنا ہے ۔

مرحوم طبرسی اس آیت کے ذیل میں امام باقرؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا :

" ثم اھتدٰی کے جملے سے مراد ہم اہل بیتؑ کی ولایت کی ہدایت ہے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا :

فواللہ لو ان رجلا عبد اللہ عمرہ مابین الرکن والمقام ثم مات ولم یجیٔ بولایتنا لاکبہ اللہ فی النار علی وجھہ

خدا کی قسم اگر کوئی شخص تمام عمر (خانہ کعبہ کے پاس) رکن و مقام کے درمیان عبادت کرے اور پھر دنیا سے اس حالت میں جائے کہ ہماری ولایت کو اُس نے قبول نہ کیا ہو، تو خدا اُسے منہ کے بل جہنم کی آگ میں پھینکے گا ۔

اس روایت کو اہل سُنّت کے مشہور محدث " ابوالقاسم حاکم حسکانی " نے بھی نقل کیا ہے ۔[1]

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اصل کو ترک کرنا، کس حد تک موجب ہلاکت و تباہی ہے، بعد کی آیات میں غور و فکر کرنا ہی کافی ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰؑ اور اُن کے جانشین ہارونؑ کی ولایت کے دامن کو چھوڑنے اور ان کی ہدایت کی پیروی سے باہر نکل جانے کے سبب کس طرح سے گوسالہ پرستی اور شرک و کفر میں گرفتار ہو گئے ۔

آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں ان روایات میں سے کچھ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اہل بیتؑ کی محبت واجب ہونے میں تو ہمارے نزدیک بھی تردید کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کا بنی اسرائیل اور موسیٰؑ کے زمانے سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے —— ہماری مندرجہ بالا گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ آلوسی کا یہ اشکال بے بنیاد ہے ۔

چونکہ اوّل تو بحث محبت کے بارے میں نہیں ہے بلکہ بات رہبری کو قبول کرنے سے متعلق ہے اور دوسرے اہل بیتؑ میں رہبری کو منحصر کرنا مراد نہیں ہے بلکہ موسیٰؑ کے زمانے میں وہ اور ان کے بھائی ہارون رہبر تھے، اور ان کی ولایت کو قبول کرنا واجب تھا اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں آنحضرتؐ کی ولایت اور آئمہ اہل بیتؑ کے زمانے میں اُن کی ولایت کو قبول کرنا واجب تھا ۔

---

[1] مجمع البیان، آیۂ زیر بحث کے ذیل میں ۔

یہ بات بھی بالکل واضح و روشن ہے کہ اس آیت کے مخاطب اگرچہ بنی اسرائیل ہیں لیکن یہ بات انہیں میں منحصر نہیں ہے بلکہ جو بھی شخص یا گروہ ان چاروں مراحل کو طے کرے گا، خدا کی مغفرت اور بخشش اس کے شامل حال ہوگی۔

۸۳۔ وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ○

۸۴۔ قَالَ هُمۡ اُولَاۤءِ عَلٰٓى اَثَرِىۡ وَعَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ○

۸۵۔ قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ○

۸۶۔ فَرَجَعَ مُوۡسٰۤى اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوۡمِ اَلَمۡ يَعِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيۡكُمُ الۡعَهۡدُ اَمۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ يَّحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُمۡ مَّوۡعِدِىۡ ○

۸۷۔ قَالُوۡا مَاۤ اَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَكَ بِمَلۡكِنَا وَلٰـكِنَّا حُمِّلۡنَاۤ اَوۡزَارًا مِّنۡ زِيۡنَةِ الۡقَوۡمِ فَقَذَفۡنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلۡقَى السَّامِرِىُّ ○

۸۸۔ فَاَخۡرَجَ لَهُمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوۡا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمۡ وَاِلٰهُ مُوۡسٰى ۙ فَنَسِىَ ○

۸۹۔ اَفَلَا يَرَوۡنَ اَلَّا يَرۡجِعُ اِلَيۡهِمۡ قَوۡلًا ۙ وَّلَا يَمۡلِكُ لَهُمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا ○

۹۰۔ وَلَقَدۡ قَالَ لَهُمۡ هٰرُوۡنُ مِنۡ قَبۡلُ يٰقَوۡمِ اِنَّمَا فُتِنۡتُمۡ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحۡمٰنُ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ وَاَطِيۡعُوۡۤا اَمۡرِىۡ ○

۹۱۔ قَالُوۡا لَنۡ نَّبۡرَحَ عَلَيۡهِ عٰكِفِيۡنَ حَتّٰى يَرۡجِعَ اِلَيۡنَا مُوۡسٰى ○

ترجمہ

۸۳۔ اے موسٰی! کیا سبب ہوا کہ تو (کوہِ طور پر آنے کے لیے) اپنی قوم سے جلدی کرکے آگے پہنچ گیا؟

۸۴۔ عرض کیا: پروردگارا! وہ تو میرے پیچھے پیچھے (آرہے) ہیں اور میں نے تیری طرف (آنے کی اس لیے) جلدی کی ہے تاکہ تُو مجھ سے راضی ہو۔

۸۵۔ فرمایا: ہم نے تیری قوم کو تیرے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کردیا ہے۔

۸۶۔ موسٰی اپنی قوم کی طرف غصّہ میں بھرے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے پلٹے اور (ان سے) کہا: اے میری قوم! کیا تمہارے پروردگار نے تمہارے ساتھ اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا تم سے میری جدائی کی مدت زیادہ ہوگئی ہے یا تم یہ چاہتے تھے کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب ٹوٹ پڑے کہ تم نے میرے وعدے کی مخالفت کی ہے۔

۸۷۔ انہوں نے کہا: ہم نے اپنے ارادہ و اختیار سے تو تیرے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ (ہوا یہ کہ) ہم (فرعون کی قوم کے کچھ زیورات اُٹھا لائے تھے، ہم نے ان کو (آگ میں) ڈال دیا اور سامری نے بھی اسی طرح (زیور آگ میں) ڈال دیا۔

۸۸۔ پھر اُس نے (اُنہی پگھلے ہوئے زیورات سے) ان کے لیے ایک بچھڑا بنا ڈالا وہ ایک ایسی مورت تھی جس میں سے گائے کی سی آواز آتی تھی اور لوگوں نے کہا کہ یہ تمہارا خدا ہے اور موسٰی کا خدا بھی یہی ہے۔ (مگر) اُس (سامری) نے فراموش کردیا۔ (اُس عہد و پیمان کو جو اُس نے خدا سے باندھا تھا)۔

۸۹۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ (یہ بچھڑا) ان کا جواب تک نہیں دیتا اور نہ وہ انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔

۹۰۔ اور ہارون نے اُن سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے (میری) قوم! تمہاری اس بچھڑے کے ذریعے سے آزمائش کی گئی ہے اور بلاشبہ تمہارا پروردگار (تو) خدائے رحمٰن ہے۔ پس تم میری پیروی کرو اور میرے فرمان کی اطاعت کرو۔

۹۱۔ (اس پر) انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم تو (عبادت کے لیے) اسی کے گرد گھومتے رہیں گے۔ (اور بچھڑے کی پرستش ہی جاری رکھیں گے) جب تک کہ خود موسٰی ہمارے پاس پلٹ کر نہ آئیں۔

تفسیر

سامری کا شور و غوغا:

اِن آیات میں موسٰی اور بنی اسرائیل کی زندگی کا ایک اور اہم حصّہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ حضرت موسٰیؑ کے بنی اسرائیل کے نمائندوں کے ساتھ کوہ طور کی وعدہ گاہ پر جانے اور پھر ان کی غیبت کے زمانے میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے متعلق ہے۔

پروگرام یہ تھا کہ حضرت موسٰیؑ تورات کے احکام حاصل کرنے کے لیے کوہ طور پر جائیں اور بنی اسرائیل کے کچھ افراد بھی اس سفر

میں ان کے ساتھ رہیں تاکہ اس سفر میں خدا شناسی اور وحی کے بارے میں نئے حقائق ان کے لیے آشکار ہوں۔
پروردگار سے مناجات کا شوق اور وحی کی آواز سننے کا اشتیاق حضرت موسیٰؑ کے دل میں موجزن تھا۔ اس طرح سے کہ گویا آپ کو اپنی خبر نہ تھی، اور یہاں تک کہ روایات میں ہے کہ آپ کو کھانے پینے اور آرام کا ہوش نہ تھا۔ لہذا انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ یہ راستہ طے کیا اور دوسروں سے پہلے اکیلے ہی پروردگار کی وعدہ گاہ میں پہنچ گئے۔
یہاں آپ پر وحی نازل ہوئی "اے موسیٰ! کیا سبب ہوا کہ اپنی قوم سے پہلے ہی آ پہنچا اور اس قدر جلدی کی (وما اعجلك عن قومك یاموسٰی)۔
موسیٰ نے فوراً عرض کیا، پروردگارا! وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں اور میں نے تیری میعادگاہ اور محضر وحی تک پہنچنے کے لیے اس لیے جلدی کی ہے تاکہ تو مجھ سے راضی اور خوشنود ہو (قال ھم اولاء علٰی اثری وعجلت الیك رب لترضٰی)۔
نہ صرف تیری مناجات اور تیری بات سننے کے عشق نے مجھے بے قرار کیا ہوا تھا بلکہ میں مشتاق تھا کہ جتنا جلدی ہو سکے تیرے قوانین و احکام حاصل کروں اور تیرے بندوں تک انہیں پہنچاؤں اور اس طرح خوب تیری رضا حاصل کروں۔ ہاں! میں تیری رضا کا عاشق ہوں اور تیرا فرمان سننے کا مشتاق ہوں۔

❁ ❁ ❁

لیکن آخر میں، پروردگار کے معنوی جلوؤں کے دیدار کی مدت تیس راتوں سے بڑھا کر چالیس راتیں کر دی گئیں طرح طرح مختلف قسم کے اسباب جو پہلے سے ہی بنی اسرائیل میں انحراف کے لیے موجود تھے، اپنا کام کر گئے۔ سامری جیسا ہوشیار اور منحرف آدمی استاد بن گیا اس نے کچھ چیزوں سے کام لے کر ایک بچھڑا بنایا اور قوم کو اس کی پرستش کرنے کی دعوت دی۔ ان چیزوں کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔
اس میں شک نہیں کہ چند ایسی باتیں رونما ہوئیں کہ جو مل کر توحید سے کفر کی طرف ان کے عظیم انحراف کا سبب بنیں جیسے مصریوں کی گوسالہ پرستی یا دریائے نیل کو عبور کرنے کے بعد بت پرستی (گاؤ پرستی) کا منظر دیکھنا اور ان کا انہیں کی مانند بت بنانے کی خواہش کرنا اور اسی طرح موسیٰؑ کی طور پر ٹھہرنے کی مدت بڑھ جانا اور منافقین کی طرف سے ان کی موت کی خبر اڑانا اور آخر کار اس قوم کی جہالت و نادانی نے اثر دکھایا کیونکہ اجتماعی واقعات و حادثات عام طور پر کسی تمہید کے بغیر پیش نہیں آتے۔ زیادہ سے زیادہ ہوتا یہ ہے کہ کبھی تو یہ مقدمات آشکار اور واضح ہوتے ہیں اور کبھی چھپے ہوئے۔
بہر حال شرک اپنی بدترین صورت میں بنی اسرائیل کو دامن گیر ہو گیا۔ خاص طور پر جبکہ قوم کے بزرگ بھی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ میعادگاہ میں موجود تھے اور اس قوم کے رہبر صرف اور صرف ہارونؑ ہی تھے اور ان کا کوئی مؤثر حامی و مددگار بھی موجود نہیں تھا۔
آخر کار یہی موقع تھا کہ خدا نے موسیٰؑ کو اسی میعادگاہ میں فرمایا: ہم نے تمہاری قوم کی تمہارے بعد آزمائش کی ہے لیکن وہ اس امتحان میں پورے نہیں اترے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے: (قال فانا قد فتنا قومك من بعدك واضلھم السامری)۔
حضرت موسیٰؑ یہ بات سنتے ہی ایسے پریشان ہو گئے گویا ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ شاید وہ دل ہی دل میں

کھتے ہوں گے، میں نے سالہا سال تک خونِ جگر پیا، زحمتیں اٹھائیں، ہر قسم کے خطرے کا سامنا کیا۔ تب جاکر کہیں اس قوم کو توحید سے آشنا کیا لیکن افسوس صد افسوس! میری چند روزہ غیبت میں میری محنتیں برباد ہوگئیں۔

لہٰذا فوری طور پر "موسیٰ غصّے میں بھرے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے اپنی قوم کی طرف پلٹے" (فرجع موسٰی الٰی قومه غضبان اسفًا)۔

جس وقت ان کی نگاہ، گوسالہ پرستی کے اس تکلیف دہ منظر پر پڑی تو وہ چیخ اُٹھے، اے میری قوم! کیا تمہارے پروردگار نے تمہارے ساتھ اچھا وعدہ نہیں کیا تھا" (قال یا قوم الم یعدکم ربکم وعدًا حسنًا)۔

یہ اچھا وعدہ یا تو وہ وعدہ تھا کہ جو بنی اسرائیل سے تورات کے نزول اور اس میں آسمانی احکام کے بیان کے سلسلے میں کیا گیا تھا یا یہ نجات پانے اور آلِ فرعون پر کامیابی حاصل کرنے اور زمین کی حکومت کا وارث بن جانے کا وعدہ تھا یا یہ اُن لوگوں کے لیے کہ جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عملِ صالح بجالائیں، مغفرت اور بخشش کا وعدہ تھا یا ان تمام امور سے متعلق وعدہ تھا۔

اس کے بعد مزید کہا: "کیا تم سے میری جدائی کی مدت زیادہ ہوگئی ہے؟" (افطال علیکم العھد)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ: میں نے مانا کہ میری واپسی کی مدت تیس دن سے بڑھ کر چالیس دن ہوگئی تھی مگر یہ کوئی ایسا زیادہ طولانی زمانہ نہیں ہے۔ کیا تمہیں خود ہی نہیں چاہیے تھا کہ اس مختصر سی مدت میں اپنے آپ کو محفوظ رکھتے۔ یہاں تک کہ اگر میں سالہا سال بھی تم سے دُور رہتا تو بھی خدا کا دین کہ جس کی میں نے تمہیں تعلیم دی ہے اور وہ معجزات کہ جن کا تم نے خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے ــــ تمہارے پیشِ نظر ہونے چاہئیں تھے اور تمہیں میری تعلیمات کی پیروی کرنا چاہیے تھی۔

"یا تم اپنے اس قبیح عمل کے ذریعے یہ چاہتے تھے کہ تمہارے پروردگار کا غضب تم پر نازل ہو، جبھی تو تم نے مجھ سے باندھے ہوئے عہد کی مخالفت کی ہے" (ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی)[1]

میں نے تم سے یہ عہد لیا تھا کہ تم عقیدۂ توحید، اور پروردگار کی خالص اطاعت کی راہ پر قائم رہوگے اور اس سے معمولی سا انحراف بھی نہیں کروگے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے میری عدم موجودگی میں میری ان ساری باتوں کو بھلا دیا اور میرے بھائی ہارون کا حکم ماننے سے بھی تم نے انکار کر دیا۔

* * *

بنی اسرائیل نے جب دیکھا کہ موسیٰؑ ان پر سخت غصّے میں ہیں اور اس بات پر متوجہ ہوئے کہ واقعاً انہوں نے بہت ہی بُرا کام انجام دیا ہے تو عذر تراشی پر اُتر آئے اور کہنے لگے: ہم نے اپنے اختیار کے ساتھ تو تیرے عہد کی خلاف ورزی نہیں کی" (قالوا ما اخلفنا موعدك بملکنا)[2]

---

[1] یہ بات واضح ہے کہ کسی بھی شخص کا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے لیے پروردگار کا غضب خریدے لہٰذا اس عبارت سے مراد یہ ہے کہ تمہارا عمل اس قسم کا ہے کہ گویا تم نے خود اپنے لیے اس قسم کا ارادہ کر لیا ہے۔

[2] "مَلک" (بروزن درک) اور "مُلک" (بروزن پلک) دونوں کسی چیز کے مالک ہونے کے معنی میں ہیں اور بنی اسرائیل کی اس سے مراد یہ تھی کہ ہم اس کام کے کرنے میں صاحب اختیار اور مالک نہیں تھے بلکہ ہم اس سے ایسے متاثر ہوئے کہ دین و دل ہاتھ سے جاتا رہا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

دراصل ہم خود اپنے ارادے سے گوسالہ پرستی کی طرف مائل نہیں ہوئے تھے۔ "فرعونیوں کے کچھ قیمتی زلورات ہمارے ساتھ تھے کہ جنہیں ہم نے اپنے سے دُور پھینک دیا اور سامری نے بھی انہیں پھینک دیا" (ولٰکنا حملنا اوزارًا من زینۃ القوم فقذفناھا فکذالك القی السامری)۔

اِس بارے میں کہ بنی اسرائیل نے کیا کیا اور سامری نے کیا کیا اور اُوپر والی آیات کے جملوں کا حقیقتاً کیا معنی ہے؟ اس میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں کہ جن میں نتیجہ کے لحاظ سے کوئی زیادہ فرق نظر نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ "قذفناھا" یعنی ہم نے اُن زلورات کو جنہیں مصر سے چلنے سے پہلے فرعونیوں سے لیا تھا، آگ میں پھینک دیا۔ سامری کے پاس بھی جو کچھ تھا، اُس نے بھی آگ میں پھینک دیا۔ یہاں تک کہ وہ پگھل گئے تو اُس نے اُن سے گوسالہ بنالیا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس جملے کا معنی یہ ہے کہ ہم نے زلورات کو اپنے سے دُور پھینک دیا اور سامری نے انہیں اُٹھا کر آگ میں ڈال دیا تاکہ اس سے گوسالہ بنائے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ " فکذالك القی السامری " ان سارے منصوبوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو سامری نے جاری کیے تھے۔

بہرحال یہ عام معمول ہے کہ جس وقت کوئی بزرگ اپنے سے چھوٹوں کو اس گناہ کے بارے میں کہ جس کے وہ مرتکب ہوئے ہیں ملامت کرتا ہے، تو وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی طرف سے گناہ کی تردید کریں اور کسی دوسرے کی گردن پر ڈال دیں۔ بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستی کرنے والوں نے بھی، جو اپنے ارادہ اور رغبت کے ساتھ توحید سے شرک کی طرف مائل ہوئے تھے، یہی چاہا کہ سارا گناہ سامری کی گردن پر ڈال دیں۔

بہرحال سامری نے فرعونیوں کے آلاتِ زینت سے کہ جو فرعونیوں نے ظلم و ستم کے ذریعے حاصل کیے ہوئے تھے اور جن کا اس کے علاوہ اور کوئی مصرف نہیں تھا کہ وہ اِس قسم کے فعل حرام پر خرچ ہوں، " ان کے لیے ایک بچھڑے کا مجسمہ بنایا جو ایک ایسی مورت تھی، جس میں سے گائے کی سی آواز آتی تھی" (فاخرج لھم عجلًا جسدًا لہ خوار[1])

بنی اسرائیل نے جب یہ منظر دیکھا تو اچانک حضرت موسیٰؑ کی تمام توحیدی تعلیمات کو بھول گئے" اور ایک دوسرے سے کہنے لگے: یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا!" (فقالوا ھٰذا الٰھکم و الٰہ موسٰی)۔

یہ احتمال بھی ہے، کہ یہ بات کہنے والے سامری، اس کے یار و مددگار اور اس کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والے تھے۔

" اور اس طرح سامری نے موسیٰ کے ساتھ، بلکہ موسیٰ کے خدا کے ساتھ کیا ہوا اپنا عہد و پیمان بھلا دیا اور لوگوں کو گمراہی میں دھکیل دیا

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)

بعض مفسرین نے اس جملہ کو بنی اسرائیل کی ایک اقلیت سے متعلق سمجھا ہے کہ جنہوں نے گوسالہ کی پرستش نہیں کی تھی۔ (کہتے ہیں کہ اُن میں سے چھ لاکھ افراد گوسالہ پرستی کرنے لگ گئے تھے۔ صرف بارہ ہزار افراد توحید پر باقی رہے) لیکن جو تفسیر ہم نے اُوپر بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

[1] " خوار" گائے اور گوسالہ کی آواز کے معنی میں ہے، اور کبھی اُونٹ کی آواز پر بھی بولا جاتا ہے۔

(فنسی)۔

بعض مفسرین نے یہاں "نسیان" کی گمراہی اور بے راہ روی کے معنی میں تفسیر کی ہے، یا نسیان کا فاعل موسیٰ کو جانا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ جملہ سامری کا کلام ہے، وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ، موسیٰ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ یہی بچھڑا تمہارا خدا ہے لیکن یہ تمام تفسیریں آیت کے ظاہر کے مخالف ہیں کہ سامری نے موسیٰ اور موسیٰ کے خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو بھلا دیا اور بت پرستی کا راستہ اختیار کرلیا۔

٭ ٭ ٭

یہاں خدا ان بت پرستوں کو توبیخ و سرزنش کے عنوان سے کہتا ہے: کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ بچھڑا ان کا جواب تک نہیں دیتا۔ نہ تو اُن سے کسی قسم کے ضرر کو دور کرسکتا ہے، اور نہ ہی انہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے: (افلا یرون الا یرجع الیھم قولًا ولا یملك لھم ضرًا ولا نفعًا)۔

ایک حقیقی معبود کو کم از کم اپنے بندوں کے سوالات کے جواب تو دینے چاہئیں۔ کیا صرف اس مجسمہ طلائی سے آواز کا سنائی دینا ــــ ایسی آواز کہ جس میں کسی ارادہ واختیار کا احساس نہیں ہے ــــ پرستش کرنے کی دلیل بن سکتا ہے؟

اور فرض کریں کہ ان کی باتوں کا جواب دے بھی دے، تو زیادہ سے زیادہ وہ ایک ایسا وجود ہوگا، جیسا کہ ایک ناتواں انسان ہے کہ جو نہ کسی دوسرے کے نفع و نقصان پر قادر ہے اور نہ ہی خود اپنے نفع و نقصان کا مالک ہے۔ کیا کوئی اس صورت میں بھی معبود ہوسکتا ہے؟

کونسی عقل اِس بات کی اجازت دیتی ہے کہ انسان ایک بے جان مجسمہ کی کہ جس سے کبھی کبھی بے معنی آواز نکلتی ہو، پرستش کرے اور اس کے سامنے سر تعظیم جھکائے؟

٭ ٭ ٭

اِس میں شک نہیں کہ اِس شور و غوغا میں حضرت موسیٰ کے جانشین اور خدا کے بزرگ پیغمبر ہارون نے اپنی رسالت کے فرائض کو پورے طور پر انجام دیا ــــ اور انحراف و فساد سے مقابلہ کرنے کا فریضہ جتنا ان کے لیے ممکن تھا ادا کرتے رہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "ہارون نے موسیٰ کے میعادگاہ سے واپس آنے سے پہلے بنی اسرائیل سے یہ بات کہی تھی کہ تم سخت آزمائش میں ڈال دیئے گئے ہو۔ لہٰذا تم دھوکا نہ کھاؤ اور راہِ خدا (توحید) سے منحرف نہ ہو" (ولقد قال لھم ھارون من قبل یا قوم انما فتنتم بہ)۔

اس کے بعد مزید کہا: "تمہارا پروردگار مسلماً وہی بخشنے والا خدا ہے کہ جس نے یہ سب نعمتیں تمہیں مرحمت فرمائی ہیں" (وان ربکم الرحمٰن)۔

تم غلام تھے، اس نے تمہیں آزادی دی۔ تم اسیر تھے، اس نے تمہیں رہائی بخشی۔ تم گمراہ تھے، اُس نے تمہیں ہدایت کی۔ تم پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے، اُس نے تمہیں ایک الٰہی انسان کی رہبری کے زیر سایہ جمع اور متحد کیا۔ تم جاہل اور بھٹکے ہوئے تھے، اُس نے تمہیں علم کے نور سے اُجالا بخشا اور توحید کے صراطِ مستقیم کی طرف تمہاری ہدایت کی۔

• اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو : (فاتبعونی واطیعوا امری)۔
کیا تم یہ بات بھول گئے ہو کہ میرے بھائی موسیٰ نے مجھے اپنا جانشین بنایا ہے اور میری اطاعت تم پر فرض اور واجب قرار دی ہے۔ پھر تم عہد شکنی کیوں کر رہے ہو اور کس لیے خود کو ہلاکت و تباہی کے گڑھے میں گرا رہے ہو ؟

❖ ❖ ❖

لیکن بنی اسرائیل اس طرح ہٹ دھرمی کے ساتھ اس بچھڑے سے لپٹے ہوئے تھے کہ اس مردِ خدا اور ہمدرد رہبر کی یہ قوی منطق اور روشن دلائل ان کے اوپر اثر انداز نہ ہوئے۔ انہوں نے صراحت کے ساتھ حضرت ہارونؑ کی مخالفت کا اعلان کیا اور کہا " ہم تو اسی طرح اس گوسالہ کی پرستش کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ خود موسیٰ ہمارے پاس پلٹ کر آئیں" (قالوا لن نبرح علیه عاکفین حتی یرجع الینا موسیٰ)[1]

خلاصہ یہ کہ انہوں نے ہٹ دھرمی نہ چھوڑی اور کہنے لگے کہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چلے گا کہ گوسالہ پرستی کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ موسیٰ لوٹ آئیں اور ان سے اس بات کا فیصلہ کرائیں۔ ہوسکتا ہے وہ بھی ہمارے ساتھ مل کر گوسالہ کے سامنے سجدہ کریں۔ لہٰذا تم خود کو زیادہ ہلکان نہ کرو اور ہمارا پیچھا چھوڑو۔

اس طرح انہوں نے عقل کے مسلمہ حکم کو بھی پاؤں تلے روند ڈالا اور اپنے رہبر کے جانشین کے فرمان کی بھی پرواہ نہ کی۔

لیکن جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے ـــ اور قاعدہ بھی یہی ہے ـــ کہ ان حالات میں جب ہارون نے اپنی رسالت کو انجام دیا اور اکثریت نے اسے قبول نہ کیا تو آپ اس گنی چنی اقلیت کے ساتھ کہ جو ان کی تابع تھی ان سے الگ ہوگئے اور ان سے دوری اختیار کرلی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ساتھ میل جول ان کے انحرافی طرز عمل کی تصدیق کی دلیل بن جائے۔[2]

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ انحرافی تبدیلیاں صرف گنتی کے چند دنوں کے اندر اندر واقع ہوگئیں۔ جب موسیٰ کو میعاد گاہ کی طرف گئے ہوئے ۳۵ دن گزر گئے تو سامری نے اپنا کام شروع کردیا اور بنی اسرائیل سے مطالبہ کیا کہ وہ تمام زیورات جو انہوں نے فرعونیوں سے عاریتاً لیے تھے اور ان کے غرق ہوجانے کے بعد وہ انھیں کے پاس رکھے تھے انہیں جمع کریں۔ چھتیسویں، سینتیسویں اور اڑتیسویں دن انہیں ایک کٹھالی میں ڈالا اور پگھلا کر اس سے گوسالہ کا مجسمہ بنا دیا اور انتالیسویں دن انہیں اس کی پرستش کی دعوت دی اور ایک بہت بڑی تعداد (کچھ روایات کی بنا پر چھ لاکھ افراد) نے اسے قبول کرلیا اور ایک روز بعد یعنی چالیس روز گزرنے پر موسیٰ واپس آگئے۔

لیکن بہرحال ہارونؑ تقریباً بارہ ہزار ثابت قدم مومنین کی اقلیت کے ساتھ اس قوم سے الگ ہوگئے جبکہ جاہل اور ہٹ دھرم اکثریت اس بات پر آمادہ ہوچکی تھی کہ انہیں قتل کردے۔

---

[1] " نبرح " " برح " کے مادہ سے زائل ہونے کے معنی میں ہے اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ " برح الخفاء " کا جملہ آشکار و واضح ہونے کے معنی میں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خفاء کا زائل ہونا ظہور کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے اور چونکہ " لن " کا معنی نفی ہے تو " لن نبرح " کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مسلسل یہ کام کرتے رہیں گے۔

[2] مجمع البیان ـ زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

چند اہم نکات :

۱۔ شوقِ دیدار : جو لوگ عشقِ خدا کے جذبے سے بے خبر ہیں انہیں موسیٰ کی وہ گفتگو جو انہوں نے پروردگار کے اس سوال ۔ کہ تم میعاد گاہ کی طرف اتنی تیزی اور جلدی سے کیوں چلے آئے ۔ کے جواب میں کی ، ممکن ہے عجیب معلوم ہوتی ہو۔ کیونکہ وہ یہ جواب دیتے ہیں :

وعجلت الیك رب لترضٰی

پروردگارا ! میں نے تیری طرف (آنے کے لیے اس لئے) جلدی کی تاکہ تیری رضا حاصل کروں۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک ٭ آتشِ عشق تیز تر گردد

جب وعدہ وصل کا وقت نزدیک آ جاتا ہے تو عشق کی آگ اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کونسی پُراسرار قوت موسیٰ کو " اللہ " کی میعاد گاہ کی طرف کھینچ کر لے جا رہی تھی اور وہ اتنی تیزی کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ ان افراد کو بھی کہ جو ان کے ساتھ تھے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

موسیٰ نے اس سے پہلے بھی دوست کے وصال کی حلاوت اور پروردگار کے ساتھ مناجات کا مزہ چکھا ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پوری دُنیا بھی اس مناجات کے ایک لمحہ کے برابر نہیں ہو سکتی۔

ہاں، اُن لوگوں کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے ۔ جو عشقِ مجازی سے گزر کر، عشقِ حقیقی اور عشقِ معبودِ جاودانی کے مرحلے میں قدم رکھ چکے ہیں ۔ اس خدا کا عشق کہ جس کی ذاتِ پاک میں فنا کی گنجائش ہی نہیں ہے اور کمالِ مطلق ہے اور بے حد و انتہا خوبی کا مالک ہے

آنچہ خوباں ہمہ دارند او تنہا دارد

بلکہ سب میں جو الگ الگ خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ اس کی جاوداں خوبی کا ایک معمولی سا پرتو ہے۔

اے عظیم پروردگار ! اس مقدس عشق کا ایک ذرہ ہمیں بھی چکھا دے۔

ایک روایت کے مطابق امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

" المشتاق لا یشتھی طعامًا ، ولا یلتذ شرابًا ، ولا یستطیب رقادًا ، ولا یأنس حمیمًا ، ولا یأوی دارًا ۔ ۔ ۔ ۔ ویعبد اللہ لیلًا ونھارًا راجیًا بان یصل الی ما یشتاق الیہ ۔ ۔ ۔ کما اخبر اللہ عن موسٰی بن عمران فی میعاد ربہ بقولہ وعجلت الیك رب لترضٰی ۔

عاشقِ بے قرار کو نہ تو کھانے کا ہوش ہوتا ہے ، نہ اسے خوشگوار شربت کی طلب ہوتی ہے نہ اُسے چین کی نیند آتی ہے نہ اس کا کسی دوست سے جی لگتا ہے ۔ اور نہ ہی کسی گھر میں اُسے آرام آتا ہے ۔ ۔ ۔ بلکہ وہ خدا کی رات دن بندگی کرتا ہے ۔ اس امید پر کہ اپنے

محبوب (اللہ) تک پہنچ جائے ۔ ۔ ۔ جس طرح سے کہ خدا موسٰی بن عمران کے بارے میں اس کے پروردگار کی میعادگاہ (میں پہنچنے) کے سلسلے میں بیان فرماتا ہے، کہ
"عجلت الیك رب لترضٰی "[1]

۲۔ انبیاء کے انقلاب کی مخالف تحریکیں: عام طور پر ہر انقلاب کے مقابلے میں ایک انقلاب دشمن تحریک وجود میں آجاتی ہے، جو یہ کوشش کرتی ہے کہ انقلاب نے جو کچھ پیش کیا ہے اُسے درہم برہم کر دیا جائے اور معاشرے کو انقلاب سے پہلے والی حالت کی طرف پلٹا دیا جائے۔ اس تاریخ کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ ایک انقلاب کے برپا ہونے سے تمام گزشتہ فاسد عناصر یک دم نابود اور ختم نہیں ہو جاتے بلکہ عام طور پر کچھ نہ کچھ تلچھٹ اس کی باقی رہ جاتی ہے۔ وہ لوگ اپنے وجود کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حالات کے آثار چڑھاؤ کے مطابق کھلم کھلا یا خفیہ طریقے سے انقلاب دشمن کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی آزادی اور توحید و استقلال کی طرف موسٰی بن عمران کی انقلابی تحریک میں سامری اس رجعت پسند تحریک کا سرا تھا۔ وہ جو کہ ۔ تمام رجعت پسند تحریکوں کے لیڈروں کی طرح ۔ اپنی قوم کے کمزور پہلوؤں سے اچھی طرح باخبر تھا اور جانتا تھا کہ ان کمزوریوں سے استفادہ کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کیا جا سکتا ہے، اس نے کوشش کی کہ ان زیورات اور طلائی چیزوں سے کہ جو دنیا پرستوں کا معبود ہے اور عوام الناس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے والا ہے، گوسالہ بنائے اور اسے ایک خاص طریقے سے ہوا کے چلنے کے رُخ پر کھڑا کر دے (یا کسی اور طریقے سے کام لے) تاکہ اس سے کوئی آواز نکلے۔ موسٰی کی چند روزہ غیبت کو اس نے غنیمت جانا یہ بات اُس کی نظر میں تھی کہ بنی اسرائیل نے دریا سے نجات پانے کے بعد اور ایک بُت پرست قوم کے قریب سے گزرتے ہوئے موسٰیؑ سے (اپنے لیے) ایک بُت بنانے کا تقاضا کیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ اس نے تمام نفسیاتی کمزوریوں اور زمانی و مکانی مناسب موقعوں سے استفادہ کرتے ہوئے، اپنے مخالفِ توحید منصوبے کا آغاز کر دیا اور اس کے مواد کو اس طرح سے ماہرانہ انداز میں منظم کیا کہ تھوڑی سی مدت میں بنی اسرائیل کی ایک بڑی اکثریت کو راہِ توحید سے منحرف کر کے شرک کی راہ کی طرف کھینچ لے گیا۔

یہ سازش اگرچہ موسٰی کے واپس آتے ہی اُن کی قدرتِ ایمانی اور نورِ وحی کے پرتو میں ان کی منطق سے ناکام ہو گئی لیکن ہمیں سوچنا چاہیئے کہ اگر موسٰی واپس نہ آتے تو کیا ہوتا؟ یقیناً یا تو وہ ان کے بھائی ہارون کو قتل کر دیتے یا وہ انہیں اس طرح سے گوشہ نشین کر دیتے کہ اُن کی آواز بھی کسی کے کانوں تک نہ پہنچتی۔

ہاں! ہر انقلاب کے آغاز میں اسی طرح کی مخالف تحریکیں ہوتی ہیں اور (اُن سے) پورے طور پر خبردار رہنا چاہیئے اور رجعت پسندوں کی معمولی سے معمولی شرک آلود حرکتوں کو نظر میں رکھنا چاہیئے اور دشمن کی سازشوں کو شروع میں ہی کچل دینا چاہیئے۔

ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ بہت سے سچے انقلابات، مختلف دلائل و وجوہ کی بنا پر آغاز میں کسی فرد یا کچھ مخصوص افراد کے سہارے برپا ہوتے ہیں اگر وہ بیچ میں نہ رہیں تو انقلاب کے اُلٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ جتنا بھی جلدی ہو سکے، انقلابی معیاروں کو معاشرے کی گہرائی میں اُتار دیں اور لوگوں کی اس طرح سے تربیت کی جائے کہ انقلاب کے مخالف تمام طوفان انہیں کسی طرح بھی اپنے مقام سے نہ ہلا سکیں اور وہ پہاڑ کی مانند ہر رجعت پسند

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۳، ص ۳۸۸۔

قدامت پرست تحریک کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔

یا دوسرے لفظوں میں یہ سچے رہبروں کی ایک ذمہ داری ہے کہ وہ معیاروں کو ـــــ اپنے معاشرے کی طرف منتقل کریں، اس میں شک نہیں کہ اس اہم کام کے لیے کچھ مدت چاہیئے لیکن کوشش کرنا چاہیئے کہ یہ زمانہ جتنا ممکن ہو ـــــ کم سے کم ہو۔

اس بارے میں کہ سامری کون تھا اور اس کا انجام کیا ہوا، انشاء اللہ ہم بعد والی آیات میں گفتگو کریں گے۔

* * *

۳۔ **رہبری کے مراحل** : اس میں شک نہیں کہ حضرت ہارونؑ نے حضرت موسیٰؑ کی غیبت کے زمانے میں اپنی رسالت کے انجام دینے میں معمولی سے معمولی سستی بھی نہیں کی لیکن ایک طرف سے تو لوگوں کی جہالت نے اور دوسری طرف سے مصر میں غلامی اور بت پرستی کے دور کی رسومات نے ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

مذکورہ بالا آیات کے مطابق انہوں نے اپنی ذمہ داری کو چار مرحلوں میں پورا کیا:

پہلا مرحلہ: یہ کہ ان پر یہ ظاہر کیا کہ یہ واقعہ ایک انحرافی راستہ اور تم سب کے لیے ایک خطرناک آزمائش کا میدان ہے تا کہ سوئے ہوئے دماغ بیدار ہوں اور لوگ بیٹھ کر سوچیں اور اہم چیز یہی تھی (یا قوم انما فتنتم بہ)۔

دوسرا مرحلہ: یہ تھا کہ خدا کی وہ قسم قسم کی نعمتیں، جو موسیٰ کے قیام کی ابتداء سے لے کر فرعونیوں کے چنگل سے نجات پانے کے زمانے تک، بنی اسرائیل کے شاملِ حال ہوئی تھیں، وہ انہیں یاد دلائیں اور خصوصیت کے ساتھ خدا کی عمومی صفتِ رحمت کے ساتھ اس کی توصیف کی تا کہ اس کا زیادہ گہرا اثر ہو اور انہیں اس بہت بڑی خطا کی بخشش کی بھی اُمید دلائی جا سکے (وان ربکم الرحمٰن)۔

تیسرا مرحلہ: یہ تھا کہ انہیں اپنے مقامِ نبوت اور اپنے بھائی موسیٰ کی جانشینی کی طرف متوجہ کیا (فاتبعونی)۔

چوتھا مرحلہ: یہ تھا کہ انہیں ان کی الٰہی ذمہ داریوں سے باخبر کیا (واطیعوا امری)۔

۴۔ **ایک اعتراض کا جواب** : مشہور مفسر فخرالدین رازی نے یہاں ایک اعتراض پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:
شیعہ حضرات علی علیہ السلام کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث : انت منی بمنزلة هارون من موسٰی :

> " تجھے مجھ سے وہی نسبت ہے جو موسیٰ کو ہارون سے تھی " سے ولایت علی کے لئے استدلال کرتے ہیں، حالانکہ ہارون نے بت پرستوں کے عظیم انبوہ کے مقابلہ میں ہرگز تقیہ اختیار نہیں کیا تھا اور صراحت کے ساتھ لوگوں کو اپنی پیروی اور دوسروں کی متابعت ترک کرنے کی دعوت دی تھی۔
>
> اگر واقعاً اُمتِ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی رحلت کے بعد خطا کی راہ اختیار کر لی تھی، تو علی (علیہ السلام) پر یہ واجب تھا کہ وہ بھی ہارون کا سا طرزِ عمل اپناتے۔ منبر پر جاتے اور کسی قسم کا خوف اور تقیہ کیے بغیر " فاتبعونی واطیعوا امری " کہتے۔ چونکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اُمت کا طریقۂ کار اس زمانے

میں حق اور درست تھا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فخرالدین رازی نے اس بارے میں دو بنیادی نکات سے غفلت کی ہے۔

۱۔ یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ علی علیہ السلام نے اپنی خلافت بلا فصل کے متعلق کسی بات کا اظہار نہیں کیا، اشتباہ ہے اور غلط ہے کیونکہ ہمارے پاس بیشمار حوالے ایسے موجود ہیں کہ امام ؑ نے مختلف مواقع پر اس امر کو بیان فرمایا ہے۔ کبھی صریح اور کھلم کھلا طور پر اور کبھی در پردہ طریقے سے۔ کتاب نہج البلاغہ میں آپ کے کلام کے مختلف حصے نظر آتے ہیں، مثلاً خطبہ شقشقیہ، خطبہ سوم، خطبہ ۸۷، خطبہ ۹۷، خطبہ ۹۴، خطبہ ۱۵۴ اور خطبہ ۱۴۷، کہ جو سب کے سب اس سلسلے میں بیان ہوئے ہیں۔

تفسیر نمونہ کی تیسری جلد میں سورۂ مائدہ کی آیہ ۶۷ کے ذیل میں واقعہ غدیر کے بیان کرتے ہوئے بعد ہم نے متعدد روایات نقل کی ہیں کہ خود حضرت علیؑ نے بارہا اپنی حیثیت اور خلافت بلا فصل ثابت کرنے کے لیے، حدیث غدیر سے استناد کیا ہے (مزید وضاحت کے لیے جلد ۳، ص ۲۸ کے بعد کے صفحات کی طرف رجوع کریں)۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مخصوص حالات تھے۔ وہ منافق کہ جو وفات پیغمبر کے انتظار میں دن گن رہے تھے انہوں نے خود کو از سرِ نو اسلام پر آخری ضرب لگانے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اصحاب الردہ (اسلامی انقلاب کے مخالف گروہ) نے فوراً ابوبکر کی خلافت کے زمانہ میں قیام کیا۔ اگر مسلمانوں کی وحدت، اجتماعیت اور ہوشیاری نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ اسلام پر ناقابل تلافی ضربیں لگاتے۔ علیؑ نے اس امر کی خاطر بھی خاموشی اختیار کی کہ دشمن غلط فائدہ نہ اٹھائے۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ نے بھی ۔۔۔ باوجود اس کے کہ موسیٰؑ زندہ تھے ۔۔۔ بھائی کی سرزنش کے جواب میں کہ تو نے کوتاہی کیوں کی صریحاً یہی کہا کہ:

انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل

میں اس بات سے ڈرا کہ تو مجھ سے یہ کہے کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا۔ (طٰہٰ ۹۴)

اور یہ بات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ علیؑ نے بھی اختلاف کے خوف سے ایک حد تک خاموشی اختیار کی۔

٭ ٭ ٭

۹۲۔ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝

۹۳۔ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝

۹۴۔ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝

۹۵۔ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ○

۹۶۔ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ○

۹۷۔ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ○

۹۸۔ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ○

ترجمہ

۹۲۔ (موسیٰ نے) کہا: اے ہارون! جس وقت تو نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہوگئے ہیں، تو تجھے کس چیز نے روکا۔

۹۳۔ کہ تو نے میری پیروی نہ کی۔ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے؟

۹۴۔ (ہارون نے) کہا: اے ماں جائے! میری داڑھی اور سر نہ پکڑو۔ میں تو اس بات سے ڈرا کہ تُو یہ کہنے لگے کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا اور میری نصیحت پر عمل نہ کیا۔

۹۵۔ (پھر موسیٰ نے سامری کی طرف رُخ کیا اور) کہا: اے سامری! تُو نے یہ کام کیوں کیا؟

۹۶۔ (سامری نے) کہا: میں نے ایسی چیز دیکھی جو انہوں نے نہیں دیکھی۔ میں نے (خدا کے بھیجے ہوئے) رسول کے آثار میں سے کچھ حصہ اُٹھا لیا۔ اس کے بعد میں نے اس کو ڈال دیا اور میرے نفس نے اس مطلب کو اسی طرح خوشنما بنایا۔

۹۷۔ (موسیٰ نے) کہا: پھر تو دُور ہو جا۔ تیرا دنیا کی زندگی میں حصہ (صرف) یہ ہے کہ (جو شخص تیرے نزدیک ہوگا) تو (اس سے) کہے گا: مجھے مت چھونا اور تیرے لیے (خدا کی طرف سے عذاب کا) ایک وقت مقرر ہے کہ ہرگز اس کے خلاف نہیں ہوگا۔ (اب) تو اپنے معبود کی طرف دیکھ، جس کی تو مسلسل پرستش کرتا رہا ہے اور دیکھ پہلے تو ہم اسے جلائیں گے اور پھر اس کے ذرات کو دریا میں بکھیر دیں گے۔

۹۸۔ تمہارا معبود تو صرف وہی خدا ہے کہ جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ اور اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تفسیر

سامری کا عبرت ناک انجام :

اس بحث کے بعد جو موسٰیؑ نے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی شدید مذمت کے بارے میں کی تھی اور جو اس سے پہلی آیات میں بیان ہو چکی ہے زیر بحث آیات میں پہلے موسٰی کی اپنے بھائی ہارون کے ساتھ گفتگو اور اس کے بعد سامری کے ساتھ جو باتیں ہوئیں، کو بیان کیا جارہا ہے۔

پہلے اپنے بھائی ہارونؑ کی طرف رُخ کرکے " کہا : اے ہارون ! جس وقت تُو نے یہ دیکھا کہ یہ قوم گمراہ ہوگئی ہے تو تو نے میری پیروی کیوں نہ کی" (قال یا ھارون ما منعك اذ رأیتھم ضلوا الا تتبعن)۔

کیا میں نے اُس وقت جبکہ میں میعادگاہ کی طرف جانا چاہتا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ تُو میرا جانشین ہے اور اس گروہ کے درمیان اصلاح کرنا اور مفسدین کے راستے کو اختیار نہ کرنا[1]

تو ان بت پرستوں کے ساتھ مقابلے کے لیے کیوں اُٹھ کھڑا نہ ہوا ؟

اس بنا پر " الا تتبعن " کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ بت پرستی کے بارے میں میری شدتِ عمل کی روش کی۔ تو نے پیروی کیوں نہ کی۔

لیکن یہ بات، جو بعض نے بیان کی ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ تو اس اقلیت کے ساتھ کہ جو توحید پر باقی رہ گئی تھی، میرے پیچھے پیچھے کوہ طور پر کیوں نہ آیا، بہت ہی بعید نظر آتی ہے اور یہ اُس جواب کے ساتھ کہ جو ہارونؑ نے بعد کی آیات میں دیا ہے، کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔

اس کے بعد موسٰی نے مزید کہا : کیا تو نے میرے فرمان کی خلاف ورزی کی ہے (افعصیت امری)۔

موسٰیؑ انتہائی شدت اور سخت غصّہ کی حالت میں، یہ باتیں اپنے بھائی سے کر رہے تھے اور ان کے سامنے چیخ رہے تھے جبکہ ان کی داڑھی اور سر کو پکڑا ہوا تھا، اور کھینچ رہے تھے۔

ہارونؑ نے جب اپنے بھائی کو شدید پریشان دیکھا تو اس لیے کہ انہیں لطف و مہربانی کی طرف لائیں اور ان کی بے قراری اور بے چینی میں کمی کریں اور ضمنی طور پر اس واقعے کے سلسلے میں اپنا عذر پیش کریں کہا : اے میرے ماں جاتے ! میری داڑھی اور سر کو نہ پکڑ، میں نے تو یہ سوچا کہ اگر میں مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور ان کی گرفت کرتا ہوں، تو بنی اسرائیل میں ایک شدید تفرقہ پڑ جاتے گا اور میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں تو واپس پر کہنے لگے کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ کیوں ڈالا اور میری غیبت کے زمانے میں میری نصیحت کا خیال نہیں کیا : (قال یا بن ام لا تأخذ بلحیتی ولا برأسی انی خشیت ان تقول فرقت بین

---

[1] اخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین ۞ (اعراف ۱۴۲)

بنی اسرائیل ولم ترقب قولی)۔
درحقیقت حضرت ہارونؑ کی نظر اسی بات کی طرف ہے کہ جو حضرت موسیٰؑ نے میعاد گاہ کی طرف جانے سے پہلے کہی تھی کہ جس کا معنی و مفہوم اصلاح کی طرف دعوت دینا ہے۔ (اعراف - ۱۴۲)
وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر میں اُن پر سختی اور گرفت کرتا، تو وہ تیرے حکم کے برخلاف ہوتا اور پھر تجھے یہ حق پہنچتا کہ مجھ سے مواخذہ کرے۔

اس طرح حضرت ہارونؑ نے اپنی بے گناہی کو ثابت کر دیا۔ خصوصاً ایک اور جملے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو سورۂ اعراف کی آیہ ۱۵۰ میں آیا ہے:

ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی

اس نادان قوم نے مجھے ضعیف کر دیا اور ہم لوگ تھوڑے رہ گئے اور قریب تھا کہ وہ مجھے قتل ہی کر دیں، میں بے گناہ ہوں بے گناہ۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ موسیٰؑ و ہارونؑ دونوں، بلا شک وشبہ پیغمبر اور معصوم تھے تو پھر موسیٰؑ کی طرف سے ایسی کھینچا تانی، بحث اور شدید عتاب و خطاب اور وہ دفاع کہ جو اپنا ہارونؑ کر رہے ہیں کس طرح قابل توجیہ ہے؟
اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ موسیٰؑ کو یقین تھا کہ ان کا بھائی بے گناہ ہے لیکن وہ اس طریقے سے دو باتیں ثابت کرنا چاہتے تھے: پہلی یہ کہ وہ بنی اسرائیل کو یہ سمجھا دیں کہ وہ بہت ہی عظیم گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ایسا گناہ کہ جو موسیٰؑ کے بھائی تک کو بھی کہ جو خود ایک عالی قدر پیغمبر تھے مواخذے کے لیے عدالت کی طرف کھینچ کر لے گیا اور وہ بھی اتنا شدت عمل کے ساتھ یعنی یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ جتنا بعض بنی اسرائیل نے سمجھ لیا ہے۔ توحید سے انحراف اور شرک کی طرف بازگشت، وہ بھی ان تمام تعلیمات اور ان تمام معجزات اور عظمت حق کے آثار دیکھنے کے بعد۔ یہ بات یقین کرنے کے قابل نہیں ہے۔ لہذا جتنا زیادہ سے زیادہ قاطعیت کے ساتھ ہو سکے اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔
کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی عظیم حادثہ واقع ہو جاتا ہے تو انسان ہاتھ بڑھا کر اپنا ہی گریبان چاک کر لیتا ہے اور اپنا ہی سر پیٹ لیتا ہے، تو اپنے بھائی کو مورد عتاب و خطاب قرار دینے کی تو بات ہی کچھ نہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہدف اور مقصد کی حفاظت اور افراد منحرف میں نفسیاتی اثر پیدا کرنے کے لیے اور ان پر گناہ کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے، اس قسم کا طرز عمل بہت مؤثر ہوتا ہے اور ہارون بھی اس طریقے میں بالکل راضی تھے۔
دوسرا یہ کہ ہارونؑ کی بے گناہی ان توضیحات کے ساتھ کہ جو وہ دے رہے تھے، سب پر ثابت ہو جائے اور بعد میں انہیں اپنی رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے کا اتہام نہ لگائیں۔
اپنے بھائی سے گفتگو کرنے اور ان کے بری الذمہ ثابت ہونے کے بعد، سامری سے بازپرس شروع کی اور کہا: "یہ کام تھا کہ جو تُو نے انجام دیا ہے اور اے سامری! تجھے کس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا" (قال فما خطبك یا سامری)۔

اس نے جواب میں کہا: "مَیں کچھ ایسے مطالب سے آگاہ ہوا کہ جو انہوں نے نہیں دیکھے اور وہ اس سے آگاہ نہیں ہوئے"
(قال بصرت بمالم یبصروا بہ)۔

"مَیں نے ایک چیز خدا کے بھیجے ہوئے رسول کے آثار میں سے لی اور پھر مَیں نے اسے دُور پھینک دیا اور میرے نفس نے اس بات کو اسی طرح مجھے خوش نما کرکے دکھایا" (فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها وکذالك سولت لی نفسی)۔

اس بارے میں کہ اس گفتگو سے سامری کی کیا مراد تھی، مفسرین کے درمیان دو تفسیریں مشہور ہیں:

پہلی یہ کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرعون کے لشکر کے دریائے نیل کے پاس آنے کے موقع پر مَیں نے جبرئیل کو ایک سواری پر سوار دیکھا کہ وہ لشکر کو دریا کے خشک شدہ راستوں پر ورود کے لیے تشویق دینے کی خاطر ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ مَیں نے کچھ مٹی ان کے پاؤں کے نیچے سے یا ان کی سواری کے پاؤں کے نیچے سے اُٹھائی اور اسے سنبھال رکھا اور اسے سونے کے بچھڑے کے اندر ڈالا اور یہ صدا اسی کی برکت سے پیدا ہوئی ہے۔

دُوسری تفسیر یہ ہے کہ میں ابتدا میں خدا کے اس رسول (موسیٰؑ) کے کچھ آثار پر ایمان لے آیا۔ اس کے بعد مجھے اس میں کچھ شک اور تردد ہوا۔ لہٰذا میں نے اُسے دُور پھینک دیا اور بُت پرستی کے دین کی طرف مائل ہوگیا اور یہ میری نظر میں زیادہ پسندیدہ اور زیبا ہے۔

پہلی تفسیر کے مطابق لفظ "رسول" جبرئیل" کے معنی میں ہے جبکہ دُوسری تفسیر کے مطابق "رسول" موسیٰؑ کے معنی میں ہے۔

لفظ "اثر" پہلی تفسیر کی رُو سے "پاؤں کے نیچے کی مٹی" کے معنی میں ہے، اور دوسری تفسیر میں "تعلیمات کا کچھ حصّہ" کے معنی میں ہے۔

"نبذتها" کا لفظ پہلی تفسیر میں مٹی کو گوسالہ میں ڈالنے کے معنی میں ہے اور دوسری تفسیر میں تعلیمات موسیٰؑ کو دُور پھینکنے اور چھوڑ دینے کے معنی میں ہے اور آخر میں "بصرت بمالم یبصروا بہ" پہلی تفسیر میں جبرئیلؑ کو دیکھنے کی طرف اشارہ ہے کہ جو ایک گھڑ سوار کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے (شاید کچھ اور لوگوں نے بھی انہیں دیکھا لیکن پہچانا نہیں) لیکن دوسری تفسیر میں دین موسیٰ کے بارے میں کچھ خاص معلومات کی طرف اشارہ ہے۔

بہرحال ان دونوں تفاسیر میں سے ہر ایک کے طرفدار ہیں اور ان میں کچھ روشن یا مبہم نکات موجود ہیں لیکن دوسری تفسیر کئی جہات سے بہتر نظر آتی ہے۔ خاص طور پر جبکہ کتاب "احتجاج طبرسی" میں ایک حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب امیرالمومنین علی علیہ السلام نے بصرہ کو فتح کرلیا تو لوگ آپؑ کے گرد جمع ہوگئے۔ ان میں "حسن بصری" بھی تھا اور وہ اپنے ساتھ کچھ تختیاں لے کر آیا تھا کہ امیرالمومنینؑ جو بات کرتے وہ اُسے فوراً یادداشت کے طور پر لکھ لیتا۔ امامؑ نے بلند آواز کے ساتھ ان لوگوں میں سے اسے مخاطب کرکے فرمایا:

تو کیا کر رہا ہے، تو اُس نے عرض کیا کہ میں آپ کے آثار اور ارشادات کو لکھ رہا ہوں تاکہ لوگوں کے لیے انہیں بیان کروں، امیرالمومنینؑ نے فرمایا:

اما ان لكل قوم سامريا، وهذا سامری هذه الامة، انه لا يقول لا مساس ولكنه يقول لا قتال:

یہ بات ذہن نشین کرلو کہ ہر قوم اور ہر گروہ میں کوئی نہ کوئی سامری ہوتا ہے اور یہ (حسن بصری)

اس اُمّت کا سامری ہے۔ اس کا موسیٰ کے زمانے کے سامری سے صرف اتنا فرق ہے کہ
جو شخص اُس سامری کے قریب ہوتا تھا تو وہ کہتا تھا "لا مساس" (کوئی شخص مجھے نہ چھوئے)
لیکن یہ لوگوں سے یہ کہتا ہے کہ "لا قتال" (یعنی کسی سے جنگ نہیں کرنا چاہیئے، حتیٰ کہ
منحرفین سے بھی۔ یہ اُس پروپیگنڈہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو حسن بصری جنگ جمل کے خلاف کرتا تھا)[1]۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سامری بھی ایک منافق آدمی تھا کہ جس نے حق کے کچھ مطالب سے استفادہ کرتے ہوئے لوگوں کو منحرف کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ معنی دوسری تفسیر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے[2]۔

یہ بات صاف طور پر واضح اور روشن ہے کہ موسیٰؑ کے سوال کے جواب میں سامری کی بات کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں تھی لہٰذا حضرت موسیٰؑ نے اس کے مجرم ہونے کا فرمان اسی عدالت میں صادر کر دیا اور اُسے اور اس کے گوسالہ کے بارے میں تین حکم دیئے:

پہلا حکم یہ کہ اس سے کہا "تو لوگوں کے درمیان سے نکل جا اور کسی کے ساتھ میل ملاپ نہ کر اور تیری باقی زندگی میں تیرا حصّہ صرف اتنا ہے کہ جو شخص بھی تیرے قریب آئے گا تو اُس سے کہے گا کہ "مجھ سے مس نہ ہو" (قال فاذهب فان لك فی الحیٰوة ان تقول لا مساس)۔

اس طرح ایک قاطع اور دو ٹوک فرمان کے ذریعے سامری کو معاشرے سے باہر نکال پھینکا اور اُسے مطلق گوشہ نشینی میں ڈال دیا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "لا مساس" کا جملہ شریعت موسیٰؑ کے ایک فوجداری قانون کی طرف اشارہ ہے کہ جو بعض ایسے افراد کے بارے میں کہ جو سنگین جرم کے مرتکب ہوتے تھے صادر ہوتا تھا۔ وہ شخص ایک ایسے موجود کی حیثیت سے کہ جو پلید و نجس و ناپاک ہو، قرار پاجاتا تھا۔ کوئی اس سے میل ملاپ نہ کرتا اور نہ اُسے یہ حق ہوتا تھا کہ وہ کسی سے میل ملاپ رکھے[3]۔

سامری اس واقعے کے بعد مجبور ہو گیا کہ وہ بنی اسرائیل اور ان کے شہر و دیار سے باہر نکل جائے اور بیابانوں میں جا رہے اور یہ اُس جاہ طلب انسان کی سزا ہے کہ جو اپنی بدعتوں کے ذریعے چاہتا تھا کہ بڑے بڑے گروہوں کو منحرف کر کے اپنے گرد جمع کرے۔ ایسے ناکام ہی ہونا چاہیئے یہاں تک کہ ایک بھی شخص اس سے میل ملاپ نہ رکھے۔ اور اس قسم کے انسان کے لیے یہ مکمل بائیکاٹ موت اور قتل ہونے سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ وہ ایک پلید اور آلودہ وجود کی صورت میں ہر جگہ سے راندہ اور دھتکارا ہوا ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ سامری کا بڑا جرم ثابت ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے اس کے بارے میں نفرین کی اور خدا نے اُسے ایک پُراسرار بیماری میں مبتلا کر دیا کہ جب تک وہ زندہ رہا کوئی شخص اُسے چھو نہیں سکتا تھا اور اگر کوئی اُسے چھو لیتا تو وہ بھی بیماری میں گرفتار ہو جاتا۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۳۹۲۔

[2] اس حدیث سے کوئی خاص تائید دوسری تفسیر کی نہیں ہوتی اور آیت کا ظاہر پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم (مترجم)۔

[3] تفسیر فی ظلال، جلد ۵، صفحہ ۴۹۲۔

یا یہ کہ سامری ایک قسم کی نفسیاتی بیماری میں جو ہر شخص سے وسواس شدید اور وحشت کی صورت میں تھی گرفتار ہو گیا۔ اس طرح سے کہ جو شخص بھی اس کے نزدیک ہوتا وہ چلاتا کہ "لا مساس" (مجھے مت چھونا)[1]
سامری کے لیے دوسری سزا یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ نے اسے قیامت میں ہونے والے عذاب کی بھی خبر دی۔ اور کہا: تیرے آگے ایک وعدہ گاہ ہے۔ خدائی دردناک عذاب کا وعدہ۔ کہ جس سے ہرگز نہیں بچ سکے گا (وان لك موعدًا لن تخلفه)[2]
تیسرا کام یہ تھا کہ جو موسیٰ نے سامری سے کہا: "اپنے اس معبود کو کہ جس کی تو ہمیشہ عبادت کرتا تھا ذرا دیکھ اور نگاہ کر۔ ہم اس کو جلا رہے ہیں اور پھر اس کے ذرات کو دریا میں بکھیر دیں گے" (وانظر الی الٰهك الذی ظلت علیه عاكفًا لنحرقنه ثم لننسفنه فی الیم نسفًا)۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ "لنحرقنه" (ہم اس کو یقیناً جلائیں گے)، اس بات کی دلیل ہے کہ گوسالہ ایک جلانے کے قابل جسم تھا اور یہ چیز ان لوگوں کے نظریہ کی کہ جو یہ کہتے ہیں کہ گوسالہ طلائی نہیں تھا، بلکہ جبرئیل کے پاؤں کی خاک کی وجہ سے ایک زندہ وجود میں تبدیل ہو گیا تھا، تائید کرتا ہے۔

ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ "جسدًا له خوار" کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ گوسالہ ایک بے جان مجسمہ تھا، کہ جس سے گوسالہ کی آواز کے مشابہ آواز (جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے) نکلتی تھی۔ باقی رہا جلانے کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ دو اسباب میں سے کسی ایک سبب سے ہو: ایک تو یہ کہ یہ مجسمہ صرف سونے کا نہیں تھا بلکہ احتمال یہ ہے کہ اس میں لکڑی بھی استعمال ہوئی تھی اور سونا صرف اس کے سرپوش کے طور پر اس پر چڑھا تھا۔ دوسرا یہ کہ فرض کریں کہ وہ سارے کا سارا سونا ہی تھا، تب بھی اس کا جلانا، اس کی تحقیر و توہین اور اس کی شکل و صورت کو ختم کرنے کے لیے تھا۔ جیسا کہ یہ عمل ہمارے زمانے کے جابر بادشاہوں کے دھات کے مجسموں کے بارے میں دہرایا گیا ہے۔ اس بنا پر اسے جلانے کے بعد بعض ذرائع سے ریزہ ریزہ کر کے پھر اس کے ذرات کو دریا میں پھینک دیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اس سارے سونے کو دریا میں پھینکنا جائز تھا اور اسراف شمار نہیں ہوتا تھا۔
اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ایک اہم اور عالی مقصد کی خاطر مثلاً: بت پرستی کے عقیدہ کی سرکوبی کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ بت کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جائے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فساد کا مادہ لوگوں کے درمیان باقی رہ جائے اور پھر بعض لوگوں کے لیے وسوسہ کا سبب بن جائے۔

زیادہ واضح عبارت میں، اگر موسیٰ اس سونے کو کہ جو گوسالہ کے بنانے میں استعمال ہوا تھا، باقی رہنے دیتے یا اُسے لوگوں میں تقسیم کر دیتے تو پھر یہ ممکن تھا کہ کسی دن جاہل اور نادان لوگ اُسے ہی مقدس سمجھنے لگ جاتے اور گوسالہ پرستی کی رُوح نئے سرے سے ان میں زندہ ہو جاتی۔ یہاں پر ضروری تھا کہ اس گراں قیمت مادہ کو لوگوں کے اعتقاد کی حفاظت پر قربان کر دیا جائے اور اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا اور

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۶، صفحہ ۴۲۶۱
[2] "لن تخلفه" ایک فعل مجہول ہے کہ جس کا نائب فاعل یہاں سامری ہے اور اس کی خبر دوسرا مفعول ہے اور اس کا فاعل اصل میں خدا ہے اور سارے جملے کا معنی اس طرح ہے، تیرے لیے ایک وعدہ گاہ کہ جس سے خدا تیرے بارے میں تخلف نہیں کرے گا۔

حضرت موسیٰؑ نے سامری کے بارے میں بھی اور اس کے گوسالہ کے بارے میں بھی انتہائی قاطع اور سخت روش اختیار کی تبھی تو گوسالہ پرستی کے فتنہ کو ختم کرنے پر قادر ہوئے اور اس کے نفسیاتی اثرات لوگوں کے ذہنوں سے پاک کیے۔ بعد میں بھی ہم دیکھیں گے کہ آپ نے گوسالہ پرستوں کے ساتھ جس دو ٹوک طریقہ سے نمٹا اُس نے بنی اسرائیل کے دماغوں میں ایسا نفوذ کیا کہ وہ آگے چل کر کبھی بھی ان انحرافی راستوں پر نہ چلے۔[۱]

٭ ٭ ٭

آخری جملہ میں حضرت موسیٰؑ نے مسئلہ توحید پر بہت زیادہ تاکید کرتے ہوئے "اللہ" کی حاکمیت کو واضح کیا اور اس طرح کہا :

"تمہارا معبود صرف اللہ ہے، وہی اللہ کہ جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، وہی کہ جس کے علم نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے" :

(انما الٰھکم اللّٰہ الذی لا الٰہ الا ھو وسع کل شیءٍ علمًا)۔

وہ گھڑے ہوئے بتوں کی طرح نہیں ہے کہ جو نہ کسی بات کو سنتے ہیں، نہ کوئی جواب دیتے ہیں، نہ کوئی مشکل حل کرتے ہیں اور نہ کسی نقصان کو دور کرتے ہیں۔

واقع میں "وسع کل شیءٍ علمًا" اس توصیف کے مدِمقابل آیا ہے کہ جو قبل کی چند آیات میں گوسالہ اور اس کی نادانی اور ناتوانی کے بارے میں بیان ہوئی تھی۔

٭ ٭ ٭

چند اہم نکات :

۱۔ مشکلات کے مقابل ڈٹ جانا چاہیئے : بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے مقابلے میں حضرت موسیٰ کی روش، سخت اور پیچیدہ انحرافات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر زمان و مکاں کے لیے ایک قابلِ تقلید روش ہے۔

اگر حضرت موسیٰؑ یہ چاہتے کہ صرف پند و نصیحت اور کچھ وعظ و استدلال کے لیے لاکھوں گوسالہ پرستوں کے سامنے کھڑے ہوں تو مسلمہ طور پر اس کام کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔ انہیں یہی چاہیئے تھا کہ وہ اس موقع پر تین امور کے لیے قاطعانہ اور جرأتمندانہ طور پر کھڑے ہو جائیں۔ اپنے بھائی کے سامنے، سامری کے سامنے اور گوسالہ پرستوں کے سامنے پہلے انہوں نے اپنے بھائی سے کام شروع کیا۔ ان کی ریش مبارک پکڑ لی اور اُسے اپنی طرف کھینچا اور چیخنے اور چلانے لگے اور حقیقت میں ان کے لیے یہ ایک عدالت قائم کی، (اگرچہ آخرکار ہارونؑ کی بیگناہی لوگوں پر ثابت ہو گئی) تاکہ دوسرے اپنا حساب خود سوچ لیں۔

اس کے بعد اس سازش کے اصلی عامل یعنی سامری کی طرف گئے اور اُسے ایسی سزا دی کہ جو قتل کرنے سے بھی بدتر تھی۔ اُسے معاشرے سے باہر نکال دیا، اس کو گوشہ نشین کر دیا اور اُسے ایک نجس اور آلودہ وجود قرار دیا کہ جس سے سب کا دُوری اختیار کرنا ضروری ہو گیا اور اس کے لیے

---

[۱] اس دو ٹوک ٹکر کی ایک نظیر انحرافی افکار کی بیخ کنی کے لیے مسجد ضرار کے بارے میں قرآن میں اشارے کے طور پر اور تاریخ و حدیث میں تفصیلی طور پر بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ مسجد ضرار کو پہلے جلا دیں اور جو کچھ باقی رہ جائے اس کو ویران کر دیں اور اس کی جگہ کو مدینہ کے لوگوں کے لیے کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ قرار دیں (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۴ سورہ توبہ کی آیات ۱۰۷ تا ۱۱۰ کے ذیل میں ملاحظہ کریں)۔

پروردگار کی طرف سے دردناک عذاب کی تہدید کی۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستوں کی طرف آئے اور انہیں سمجھایا کہ تمہارا یہ گناہ اس قدر بڑا ہے کہ جس سے توبہ کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ اپنے درمیان تلوار رکھ دو اور ایک گروہ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو اور یہ گندہ خون معاشرے کے جسم سے نکال دیا جائے اور اس طرح گنہگاروں کی ایک جماعت کے لوگ اپنے ہی ہاتھوں سے مارے جائیں تاکہ یہ انحرافی فکر ہمیشہ کے لیے ان کے دماغ سے نکل جائے۔ اس واقعہ کی تفصیل ہم جلد اوّل سورۂ بقرہ کی آیہ ۵۱ تا ۵۴ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔

تو اس طرح سب سے پہلے جمعیت کے رہبر کی جواب طلبی ہونی چاہیئے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ اُس نے اپنے کام میں کوتاہی کی ہے یا نہیں اور اس کی بے گناہی ثابت ہونے کے بعد عامل فساد کا پیچھا کیا جائے اور اس کے بعد فساد کے طرفداروں اور ہوا خواہوں کا پیچھا کیا جانا چاہیئے۔

۲۔ **سامری کون ہے؟** اصل لفظ "سامری" عبرانی زبان میں "شمری" ہے اور چونکہ یہ معمول ہے کہ جب عبرانی زبان کے الفاظ عربی زبان میں آتے ہیں تو "شین" کا لفظ "سین" سے بدل جاتا ہے، جیسا کہ "موشی" "موسیٰ" سے اور "یشوع" "یسوع" سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر سامری بھی "شمرون" کی طرف منسوب تھا، اور "شمرون" "یشاکر" کا بیٹا تھا، جو یعقوبؑ کی چوتھی نسل ہے۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بعض عیسائیوں کا قرآن پر یہ اعتراض بالکل بے بُنیاد ہے۔ کہ قرآن نے ایک ایسے شخص کو کہ جو موسیٰ کے زمانہ میں رہتا تھا اور وہ گوسالہ پرستی کا سرپرست بنا تھا، شہر سامرہ سے منسوب "سامری" کے طور پر متعارف کرایا ہے، جب کہ شہر سامرہ اِس زمانے میں بالکل موجود ہی نہیں تھا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ "سامری" شمرون کی طرف منسوب ہے نہ کہ سامرہ شہر کی طرف [1]

بہر حال سامری ایک خود خواہ اور منحرف شخص ہونے کے باوجود بڑا ہوشیار تھا۔ وہ بڑی جرأت اور مہارت کے ساتھ بنی اسرائیل کے ضعف کے نکات اور کمزوری کے پہلوؤں سے استفادہ کرتے ہوئے اس قسم کا عظیم فتنہ کھڑا کرنے پر قادر ہو گیا کہ جو ایک قطعی اکثریت کے بُت پرستی کی طرف مائل ہونے کا سبب بنے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ اُس نے اپنی اس خود خواہی اور فتنہ انگیزی کی سزا بھی اسی دنیا میں دیکھ لی۔

٭ ٭ ٭

۹۹۔ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۚ

۱۰۰۔ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۙ

۱۰۱۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۙ

---

[1] اعلام قرآن صفحہ ۳۵۹۔

۱۰۲۔ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ۝

۱۰۳۔ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝

۱۰۴۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۝

ترجمہ

۹۹۔ ہم اسی طرح سے تمہارے لیے گزری ہوئی خبروں کو بیان کرتے ہیں اور ہم نے اپنی طرف سے تجھے ذکر (قرآن) عطا فرمایا۔

۱۰۰۔ جو شخص اس سے منہ پھیرلے وہ قیامت کے دن (گناہ اور جوابدہی کا) سنگین بوجھ (اپنے کندھے پر) اُٹھائے گا۔

۱۰۱۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور قیامت کے دن ان کے اُٹھانے کے لیے بہت ہی بُرا بوجھ ہے۔

۱۰۲۔ وہ دن کہ جس میں صور پھونکا جائے گا اور اس دن ہم مجرمین کو نیلے بدنوں کے ساتھ جمع کریں گے۔

۱۰۳۔ وہ آپس میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے ہوں گے (بعض کہیں گے) تم نے (عالم برزخ میں) صرف دس شبانہ روز قیام کیا ہے۔

۱۰۴۔ وہ جو کچھ کہیں گے ہم اُس سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ جب کہ وہ شخص جس کی روش ان میں سے سب سے بہتر ہے کہے گا کہ تم تو صرف ایک ہی دن ٹھہرے ہو۔

تفسیر

ان کے کندھوں پر بدترین بوجھ، گزشتہ آیات اگرچہ موسیٰ، بنی اسرائیل، سامری اور فرعونیوں کی تاریخ کے بارے میں تھیں۔ اس کے باوجود ان آیات کے متن کی مناسبت سے طرح طرح کی بحثیں ہو چکی ہیں۔ ان مباحث کے اختتام پر قرآن ایک کلی نتیجہ بھی پیش کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ: ہم اسی طرح سے گزری ہوئی خبروں کو یکے بعد دیگرے تیرے لیے بیان کرتے ہیں (كذالك نقص عليك من انباء ما قد سبق)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ہم نے اپنی طرف سے تجھے قرآن دیا (وقد اٰتيناك من لدنا ذكرًا)۔

وہ قرآن، کہ جو دروس عبرت، دلائل عقلی، گزشتہ قوموں کی سبق آموز خبروں اور آئندہ آنے والے لوگوں کو بیدار کرنے والے مسائل سے معمور ہے۔

اصولی طور پر قرآن مجید کا اہم حصہ گزشتہ لوگوں کی سرگزشت کا بیان ہے۔

قرآن ایک انسان ساز کتاب ہے ــــ اس میں گزرے ہوئے لوگوں کی یہ تمام تاریخ بلاوجہ نہیں ہے ۔ بلکہ اس کی وجہ ان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں، کامیابی و شکست کے عوامل اور سعادت و بدبختی کے اسباب سے اور ان کی تاریخ کے صفحات میں چھپے ہوئے فراواں تجربات سے استفادہ کرنا ہے ۔

کُلی طور پر علوم میں سے سب سے زیادہ قابلِ اطمینان تجرباتی علوم ہیں کہ جو تجربہ گاہوں میں تجربے سے گزارے جاتے ہیں اور ان کے عینی نتائج کا مشاہدہ کیا جاتا ہے ۔

تاریخ ، انسانوں کی زندگی کی عظیم تجربہ گاہ ہے اور اس تجربہ گاہ میں، اقوام کی سربلندی و شکست ، کامیابی و ناکامی، خوش بختی و بدبختی سب کی سب تجربے کے لیے رکھی گئی ہیں ۔ اُن کے عینی نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں ، اور ہم زندگی کے مسائل کے سلسلہ میں اپنے علوم و دانش کے زیادہ قابلِ اطمینان حصّہ کو اُن سے سیکھ سکتے ہیں ۔

دوسرے لفظوں میں انسان کی زندگی کا حاصل ــــ ایک لحاظ سے ــــ تجربہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے ۔ اور تاریخ ــــ میں کسی قسم کی تحریف نہ کی گئی ہو تو انسانوں کے ہزاروں سال کی زندگی کا نچوڑ ہوتی ہے اور یہ سب کچھ مطالعہ کرنے والوں کو ایک ہی جگہ سے مل جاتا ہے ۔

اسی بنا پر امیرالمومنین علی علیہ السلام اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو اپنے حکیمانہ پند و نصائح میں خصوصاً اسی نکتہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں :

ای بنی انی وان لم اکن عمرت عمر من کان قبلی، فقد نظرت فی اعمالھم و فکرت فی اخبارھم، وسرت فی اثارھم حتٰی عدت کاحدھم بل کانی بما انتھی الیّ من امورھم قد عمرت مع اولھم الی اخرھم ، فعرفت صفو ذالک من کدرہ، ونفعہ من ضررہ فاستخلصت لک من کل امر نخیلہ

اے بیٹا ! یہ ٹھیک ہے کہ مَیں نے ان تمام لوگوں جتنی، کہ جو مجھ سے پہلے ہو گزرے ہیں، زندگی نہیں گزاری لیکن مَیں نے ان کے کردار پر نظر ڈالی اور ان کی خبروں میں غور و فکر کیا اور ان کے آثار میں سیر و سیاحت کی ۔ یہاں تک کہ میں ان میں سے ایک کی طرح ہو گیا ہوں ، بلکہ چونکہ ان کی تاریخ مجھ تک پہنچی ہے تو گویا میں اُن سب کے ساتھ اولِ دنیا سے لے کر آج کے دن تک رہا ہوں ۔ مَیں نے ان کی زندگی کے صاف و شفاف حصّہ کو گدلے اور تاریک حصّہ سے الگ کرکے پہچان لیا ہے ۔ ان کے نفع و نقصان کو جان لیا ہے اور ان تمام میں سے تیرے لیے اہم اور منتخب حصّوں کا خلاصہ بیان کیا ہے [1]

اس بناء پر تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے کہ جو گزشتہ زمانہ کو عیاں کرتا ہے اور ایک ایسا حلقہ ہے کہ جو آج کو کل کے ساتھ متصل کر دیتا ہے ۔ تاریخ انسان کی عمر کو اس کے اندازے سے بڑا بنا دیتی ہے ۔

---

[1] نہج البلاغہ کا خط ۳۱ (خطوط کا حصّہ) ۔

تاریخ ایک ایسا معلم ہے کہ جو امتوں کی عزت اور ذلت کے بھیدوں کو کھول کر رکھ دیتا ہے۔ تاریخ ستمگروں کو پہلے زمانے کے ظالموں کے بُرے انجام سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ ظالم جو اُن سے زیادہ طاقتور تھے۔ تاریخ مردانِ حق کو بشارت دیتی ہے اور استقامت اور پامردی کی دعوت دیتی ہے اور انہیں اپنے سفر کے لیے گرماتی ہے۔

تاریخ ایک ایسا چراغ ہے کہ جو انسانوں کی زندگی کے راستوں کو روشن کرتا ہے اور موجودہ زمانے کے لوگوں کے لیے راہیں کھولتا اور ہموار کرتا ہے۔ تاریخ آج کے انسانوں کی تربیت کرتی ہے اور آج کے انسان کل کی تاریخ بناتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدائی ہدایت کے اسباب میں سے ایک تاریخ ہے۔

لیکن اس بارے میں کوئی اشتباہ اور غلط فہمی نہ ہونے پائے کہ ایک سچی تاریخ کا بیان جس قدر تعمیری اور تربیتی ہے اسی قدر جعلی اور تحریف شدہ تاریخیں گمراہی کا باعث ہوتی ہیں۔ اسی بناء پر جن لوگوں کے دل بیمار ہیں انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ وہ تاریخ میں تحریف کرکے انسانوں کو دھوکا دیں اور خدا کے راستہ سے روکیں۔ ہمیشہ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ تاریخ میں بہت زیادہ تحریف ہوتی ہے[1]

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ لفظ "ذکر" یہاں اور قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں خود قرآن کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کی آیات انسانوں کی بیداری اور ہوشمندی کے لیے تذکر اور یادآوری کا موجب ہوتی ہیں۔

❖ ❖ ❖

اسی بناء پر بعد والی آیت ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے کہ جو قرآن کے حقائق اور تاریخ کے عبرت انگیز سبق کو بھول جاتے ہیں "جو قرآن سے منہ پھیرے لے گا وہ قیامت میں گناہ اور جوابدہی کا سنگین بوجھ کندھے پر اُٹھائے ہوئے ہوگا"؛

(من اعرض عنه فانه يحمل يوم القيامة وزرا)۔

ہاں! پروردگار سے رُوگردانی، انسان کو اس طرح سے بےراہ روی کی طرف کھینچ کرلے جاتی ہے کہ قسم قسم کے گناہوں اور فکری و عقیدتی انحرافات کا سنگین بوجھ اس کے کندھے پر رکھ دیتی ہے (اصولی طور پر لفظ "وزر" خود سنگین بوجھ کے معنی میں ہے اور اسے نکرہ کی شکل میں پیش کرنا، اس بارے میں مزید تاکید ہے)۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ اپنے ان اعمال کے بوجھ تلے ہمیشہ ہمیشہ دبے رہیں گے: (خالدين فيه)۔

"اور گناہ کا یہ سنگین بوجھ، ان کے لیے قیامت کے دن بہت ہی بُرا بوجھ ہے" (وساء لهم يوم القيامة حملا)۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ فیہ کی ضمیر اس آیت میں وزر کی طرف لوٹتی ہے یعنی وہ اسی وزر و "وبال" ہی میں اپنے سنگین بوجھ میں ہمیشہ رہیں گے (ہمارے پاس اس بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم یہاں پر کسی چیز کو مقدر مانیں اور یہ کہیں کہ وہ عذاب میں یا جہنم میں ہمیشہ رہیں گے) نیز یہ آیت خود تجسم اعمال کے مسئلہ کی طرف ایک اشارہ ہے اور یہ کہ انسان اُنہی اعمال اور کاموں کی وجہ سے کہ جو اس نے اس جہان میں انجام دیئے ہیں قیامت میں اچھی جزا یا بُری سزا دیکھے گا۔

---

[1] ہم نے تاریخ اور اس کی اہمیت کے بارے میں سورہ یوسف کی ابتداء اور آخر میں" جلد ۵، ص ۴۲۸ اُردو ترجمہ اور جلد ۵ ص ۲۰۷ اُردو ترجمہ اور اسی طرح سورہ ہود جلد ۵ ص ۴۱۳ اُردو ترجمہ میں بحث کی ہے۔

اس کے بعد قیامت کے دن کی توصیف اور اس کے آغاز کے بیان کو شروع کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: وہی دن کہ جس میں صور پھونکا جائے گا اور ہم گنہگاروں کو نیلے اور سیاہ بدنوں کے ساتھ، اس دن جمع کریں گے (یوم ینفخ فی الصور و نحشر المجرمین یومئذٍ زرقًا)۔

جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔ آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا اختتام اور دوسرے جہان کا آغاز، دو انقلابی اور ناگہانی جنبشوں کے ساتھ صورت پذیر ہوگا کہ جن میں سے ہر ایک کو "نفخۂ صور" (صور پھونکنے) سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی تشریح ہم انشاء اللہ سورہ زمر کی آیہ ۶۸ کے ذیل میں کریں گے۔

لفظ "زرق" "ازرق" کی جمع ہے جو عام طور پر نیلی آنکھ والے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن کبھی اس شخص پر بھی کہ جس کا بدن درد اور تکلیف کی شدت کی وجہ سے سیاہ اور نیلا ہو چکا ہو، بولا جاتا ہے کیونکہ بدن درد اور تکلیف کے وقت نحیف اور کمزور ہو کر اپنی طراوت اور رطوبت کو کھو بیٹھتا ہے اور نیلا نیلا سا نظر آتا ہے۔

بعض نے اس لفظ کی "نابینا" کے معنی سے بھی تفسیر کی ہے کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیلی آنکھ والے افراد کی بینائی بہت کمزور ہوتی ہے اور عام طور پر ان کے بدن کے بال بھی کمزور ہوتے ہیں لیکن جو کچھ ہم نے اوپر کی تفسیر میں بیان کیا ہے، شاید وہ سب سے بہتر ہو۔

اس حالت میں مجرمین آپس میں عالم برزخ میں اپنے توقف کی مقدار کے بارے میں آہستہ آہستہ گفتگو کریں گے۔ بعض کہیں گے کہ تم تو صرف دس راتیں (یا دس رات دن) عالم برزخ میں رہے ہو۔ (یتخافتون بینھم ان لبثتم الا عشرًا)۔[1]

اس میں شک نہیں کہ عالم برزخ میں ان کے توقف کی مدت بہت طولانی تھی لیکن قیامت کی عمر کے مقابلہ میں بہت ہی مختصر نظر آتی ہے۔

ان کا یہ آہستہ آہستہ کہنا یا تو اس شدید وحشت اور رعب کی وجہ سے ہوگا کہ جو قیامت کا منظر دیکھ کر انہیں لاحق ہوگا یا ضعف و ناتوانی کے اثر سے ہوگا۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ دنیا میں ان کے توقف کی طرف اشارہ ہے کہ جو آخرت اور اس کے وحشت ناک حوادث کے مقابلہ میں چند مختصر دن ہی معلوم ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم اس سے کہ جو وہ کہتے ہیں مکمل طور پر آگاہ ہیں: (نحن اعلم بما یقولون)۔
چاہے وہ آہستہ سے کہیں یا بلند آواز سے۔

"اور اس موقع پر وہ شخص کہ جو سب سے بہتر راہ و روش اور عقل و شعور رکھتا ہے، یہ کہے گا کہ تم تو صرف ایک ہی دن ٹھہرے ہو"

---

[1] عربی ادب کے لحاظ سے چونکہ "عشرًا" یہاں مذکر کی شکل میں آیا ہے لہٰذا یقیناً اس کا مضاف الیہ "لیال" ہونا چاہیئے جو کہ مؤنث ہے۔ اور اگر اس کا مضاف الیہ "ایام" ہوتا تو "عشرۃ" کہا جاتا۔ لیکن بعض عرب ادباء کہتے ہیں کہ جس وقت عدد تنہا شکل میں ظاہر ہو اور اس کی تمیز محذوف ہو تو پھر سابقہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ لہٰذا "عشر" یہاں دس دنوں کی طرف اشارہ ہے۔

(اذ یقول امثلھم طریقۃً ان لبثتم الا یومًا)۔

مسلمہ طور پر نہ تو دس دن کی طولانی مدت ہے اور نہ ہی ایک دن کی لیکن ان میں یہ فرق ہے کہ ایک دن تو اکائیوں میں سے سب سے کمتر عدد کی طرف اشارہ ہے اور دس دن دھائیوں میں سے کم عدد کی طرف۔ لہٰذا پہلا زیادہ کم مدت کی طرف اشارہ کرتا ہے، اسی لیے قرآن نے اس کے کہنے والے کے بارے میں "امثلھم طریقۃً" (جس کی روش اور طریقہ بہتر ہے) فرمایا ہے۔ کیونکہ عمرِ دنیا کی کوتاہی یا برزخ کا چھوٹا ہونا، آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں اور اسی طرح ان کی کیفیت کا ناچیز ہونا اس کی کیفیت کے مقابلہ میں، کم سے کم عدد کے ساتھ ہی مناسبت رکھتا ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

۱۰۵۔ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ۝

۱۰۶۔ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝

۱۰۷۔ لَا تَرٰى فِيهَا عِوَجًا وَّلَا أَمْتًا ۝

۱۰۸۔ يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ ۚ وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا ۝

۱۰۹۔ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۝

۱۱۰۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ۝

۱۱۱۔ وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ۝

۱۱۲۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ۝

ترجمہ

۱۰۵۔ "اور تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں تم کہہ دو کہ میرا پروردگار انہیں (ریزہ ریزہ کرکے) تباہ کردے گا۔"

۱۰۶۔ پھر زمین کو صاف ہموار اور بے آب وگیاہ چھوڑ دے گا۔

۱۰۷۔ (اس طرح سے کہ) تو اس میں کسی قسم کی پستی اور بلندی نہیں دیکھے گا۔

۱۰۸۔ اس دن سب کے سب خدائی دعوت کرنے والے کی پیروی کریں گے (اور نئی زندگی کے لیے اس کی دعوت پر لبیک کہیں گے) اور تمام آوازیں عظمتِ خدا کے سامنے خاضع ہوں گی اور سوائے آہستہ آواز کے تو کچھ نہ سنے گا۔

۱۰۹۔ اس دن (کسی شخص کی) شفاعت فائدہ نہیں دے گی، سوائے اُس شخص کے کہ جسے خدائے رحمٰن نے اجازت دی ہے اور وہ اس کی گفتگو سے راضی ہے۔

۱۱۰۔ جو کچھ اُن (مجرمین) نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ انہوں نے (دنیا میں) اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ اسے جانتا ہے، لیکن یہ لوگ اس (اللہ) کے علم کا احاطہ نہیں کرسکتے۔

۱۱۱۔ اور (اس دن) تمہارے چہرے خدائے حیّ وقیوم کے سامنے خاضع ہوں گے اور مایوس (اور زیاں کار) وہ لوگ ہوں گے کہ جنہوں نے ظلم کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔

۱۱۲۔ (لیکن) وہ شخص کہ جو مومن ہونے کی حالت میں نیک عمل انجام دے گا، نہ تو اُسے کسی ظلم کا خوف ہوگا اور نہ ہی اپنے حق کے نقصان کا۔

تفسیر

قیامت کا ہولناک منظر:

چونکہ گزشتہ آیات میں اختتامِ دُنیا اور آغازِ قیامت کے بارے میں گفتگو تھی، زیرِ بحث آیت میں بھی وہی مسئلہ جاری ہے۔

پہلی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے پیغمبرِ اسلام سے، دُنیا کے اختتام کے موقع پر پہاڑوں کے انجام کے بارے میں سوال کیا ہوگا۔ شاید اس بنا پر کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ اس قسم کے موجودات کہ جن کی جڑیں زمین کی گہرائی میں گئی ہوئی ہیں اور سرِ آسمان سے باتیں کررہے ہیں، اپنی جگہ سے ہل سکتے ہیں اور اگر یہ بات ہو کہ انہیں جڑ سے ہی اکھاڑ دیا جائے گا، تو وہ کونسا طوفان اور آندھی ایسی ہے کہ جو ایسا کرسکے گی۔

لہٰذا قرآن کہتا ہے: تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں (ویسئلونك عن الجبال)۔

جواب میں اُن سے "کہہ دو کہ میرا پروردگار انہیں بکھیر کر سنگریزوں میں تبدیل کردے گا اور پھر انہیں تباہ وبرباد کردے گا"؛ (فقل ینسفها ربی نسفا)[1]

پہاڑوں کے انجام کے بارے میں، قرآن کی تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میدانِ قیامت میں مختلف مراحل طے کریں گے۔

(۱ے اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

پہلے تو وہ لرزہ براندام ہوں گے :

یوم ترجف الارض والجبال (مزمل - ۱۴)

پھر وہ چلنے لگ جائیں گے :

وتسیر الجبال سیراً (طور - ۱۰)

اور تیسرے مرحلے میں وہ بکھر کر سنگریزوں کی شکل اختیار کر لیں گے :

وکانت الجبال کثیباً مھیلاً (مزمل ۱۴)

اور آخری مرحلے میں طوفان اور آندھیاں انہیں اپنی جگہ سے اُٹھا کر فضا میں بکھیر دیں گی کہ وہ دھنکی ہوئی رُوئی کی طرح نظر آئیں گے :

وتکون الجبال کالعھن المنفوش (قارعہ - ۵)

بعد والی آیت کہتی ہے کہ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے اور ان کے ذرات کے بکھر جانے کے ساتھ " خدا صفحۂ زمین کو ایک صاف اور ہموار بے آب و گیاہ چٹیل میدان کی طرح کر دے گا" : (فیذرھا قاعاً صفصفاً)۔[1]

اس طرح سے کہ تم اس میں کسی طرح کا ٹیڑھا پن اور پستی و بلندی نہ دیکھو گے" : (لا تری فیھا عوجاً ولا امتاً)۔[2]

" اس وقت خدا کی طرف سے دعوت کرنے والا ، زندہ ہو کر محشر میں جمع ہونے اور حساب کتاب کی دعوت دے گا اور بے کم و کاست سب کے سب اس کی دعوت پر لبیک کہیں گے ۔ اور اس کی پیروی کریں گے" : (یومئذ یتبعون الداعی لا عوج لہ)۔

کیا یہ دعوت کرنے اور پکارنے والا " اسرافیل " ہو گا یا خدا کے بزرگ فرشتوں میں سے کوئی اور عظیم فرشتہ ہو گا ؟ قرآن سے واضح نہیں ہوتا لیکن جو کوئی بھی ہو ، اس کا حکم اس طرح سے نافذ ہو گا کہ کسی شخص میں اس کی خلاف ورزی کرنے کی طاقت نہ ہو گی۔

" لا عوج لہ " (کسی قسم کا انحراف اور کجی نہیں رکھتا) ممکن ہے کہ اس دعوت کرنے والے کی دعوت کا وصف ہو یا جن کو دعوت دی جائے گی ان کی توصیف ہو یا یہ دونوں کے لیے ہو ۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ جس طرح سطح زمین اس طرح صاف اور ہموار ہو جائے گی کہ اس میں معمولی سا ٹیڑھا پن بھی باقی نہ رہے گا ، اسی طرح خدا کا فرمان اور اس کی صاف دعوت دینے والا بھی ویسا ہی صاف و مستقیم ہو گا اور اس کی پیروی بھی ایسی صاف ستھری ہو گی کہ اس میں کسی قسم کی کجی اور انحراف نظر نہیں آئے گا۔

اس موقع پر پروردگار رحمان کی عظمت کے سامنے تمام کی تمام آوازیں خاضع ہو جائیں گی اور آہستہ آہستہ سی آوازوں کے سوا تمہیں کوئی

---

[1] (گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) " نسف " کا مادہ لغت میں غذائی دانوں کو چھلنی میں ڈال کر ہلانے اور چھٹکنے کے معنی میں ہے تا کہ چھلکے دانوں سے علیحدہ ہو جائیں اور یہاں پہاڑوں کے بکھرنے ، خراب ہونے اور اس کے بعد تباہ و برباد ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔

(اس صفحہ کا حاشیہ) " قاع " صاف و ہموار زمین کو کہتے ہیں ۔ بعض نے اس کو ایک ایسی جگہ کہ جس میں پانی جمع ہو سے تفسیر کیا ہے ۔ رہا " صفصف " تو یہ کبھی تو ایسی زمین کے معنی میں آتا ہے کہ جو ہر قسم کی گھاس سے خالی ہو اور کبھی صاف زمین کے معنی میں ۔ ان دونوں صفات کے مجموعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دن پہاڑ اور گھاس وغیرہ سب کچھ زمین سے ختم ہو جائیں گے اور صاف اور سادہ زمین باقی رہ جائے گی ۔

[2] " عوج " کجی اور گڑھے کے معنی میں ہے اور " امت " اونچی زمین اور ٹیلے کے معنی میں ہے ۔ اس بنا پر آیت مجموعی طور پر یہ معنی دے گی کہ اس دن کسی قسم کی پستی و بلندی زمین میں نظر نہیں آئے گی۔

چیز سنائی نہ دے گی" (وخشعت الاصوات للرحمٰن فلا تسمع الا همسا)^۱

آوازوں کی یہ خاموشی یا تو عرصہ محشر میں عظمتِ الٰہی کے رعب کی وجہ سے ہوگی کہ جس کے سامنے سب کے سب خضوع کریں گے یا حساب و کتاب اور نتیجہ اعمال کے خوف سے اور یا دونوں وجوہ سے ۔

چونکہ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس اشتباہ میں گرفتار ہو جائیں کہ گناہوں میں غرق ہونے کے باوجود کچھ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے ذریعہ بچنا ممکن ہو جائے گا تو فوراً فرمایا گیا ہے : اُس دن کسی کی شفاعت فائدہ نہیں دے گی ، سوائے اُن لوگوں (کی شفاعت) کے کہ جنہیں خدائے رحمٰن شفاعت کی اجازت دیدے گا اور اس سلسلے میں ان کی گفتگو سے راضی ہوگا (یومئذٍ لا تنفع الشفاعة الا من اذن له الرحمٰن ورضی له قولًا)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں شفاعت بے حساب نہیں ہوگی بلکہ شفاعت کا پروگرام ، شفاعت کرنے والوں کے بارے میں بھی اور جن کی شفاعت ہو سکے گی ، اُن کے بارے میں بھی ، ایک دقیق پروگرام ہے اور جب تک لوگوں میں اس بات کی لیاقت اور استحقاق نہ ہوگا کہ ان کی شفاعت کی جائے ، شفاعت بے معنی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگ شفاعت کے بارے میں غلط خیالات رکھتے ہیں اور اُسے بلا تشبیہ دنیا کی پارٹی بازیوں کی طرح سمجھتے ہیں حالانکہ شفاعت اسلام کی منطق کے لحاظ سے تربیت کا ایک اعلیٰ درجہ ہے اور ان لوگوں کے لیے کہ جو راہِ حق میں جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں ایک درس ہے ۔ لیکن وہ کبھی کبھی اعمال کی کمی اور لغزشوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں ، ممکن ہے کہ یہ لغزشیں مایوسی اور نا اُمیدی میں گرفتار کر دیں ۔ اس مقام پر شفاعت ایک قوی محرک کے طور پر ان کے پاس آتی ہے اور کہتی ہے کہ مایوس نہ ہو اور راہِ حق پر اسی طرح چلتے رہو اور اس راہ میں سعی و کوشش سے دستبردار نہ ہو اور اگر تم سے کوئی لغزش ہو گئی ہے تو ایسے شفاعت کرنے والے موجود ہیں کہ جو خدائے رحمٰن کی اجازت ـــــ کہ جس کی عمومی رحمت نے سب کو گھیر رکھا ہے ـــــ تمہاری شفاعت کریں گے ۔

یہ شفاعت سستی اور کاہلی یا مسئولیت وجوابدہی سے فرار ، یا ارتکاب گناہ کے لیے سبز باغ نہیں ہے ۔ بلکہ شفاعت راہِ حق میں استقامت اور جہاں تک ممکن ہو سکے ، گناہوں کو کم سے کم کرنے کی دعوت ہے ۔

اگرچہ ہم شفاعت کی بحث جلد اول سورہ بقرہ کی آیہ ۴۸ ـ ۴۸ کے ذیل میں اور جلد اول سورہ بقرہ آیہ ۲۵۵ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں ، البتہ کوئی حرج نہیں ہے کہ یہاں بھی ایک عمدہ داستان کا اضافہ کریں اور وہ یہ ہے کہ عالم ربانی مرحوم یاسری کہ جو علمائے تہران میں سے تھے ، اس طرح نقل کرتے ہیں کہ ایک شاعر جس کا نام حاجب تھا ، مسئلہ شفاعت میں عامیانہ اشتباہات میں گرفتار تھا ، اس نے اس مضمون کا ایک شعر کہا :

حاجب اگر معاملہ حشر با علیؑ است
من ضامنم کہ ہر چہ بخواہی گناہ کن

اے حاجب ! اگر حشر کا معاملہ علیؑ کے ہاتھ میں ہے ، تو میں ضامن ہوں تم جتنے چاہو

---

۱ " همس " (بروزن لمس) جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے ، آہستہ اور پنہاں آواز کے معنی میں ہے بعض اس کو پاؤں کی آہستہ چاپ (ننگے پاؤں سے چلنے کی آواز) کے معنی میں تفسیر کرتے ہیں اور بعض لبوں کی حرکت سے بغیر اس کے کہ ان کی آواز سنی جائے ۔ ان تمام میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ۔

گناہ کرو۔

وہ رات کے وقت عالم خواب میں امیرالمومنین علی علیہ السلام کو دیکھتا ہے کہ وہ جناب انتہائی غصہ اور غضب کی حالت میں ہیں، اور فرما رہے ہیں، کہ (اے حاجب) تو نے شعر ٹھیک نہیں کہا ہے۔ وہ عرض کرتا ہے کہ پھر کیا کہوں؛ تو آپ فرماتے ہیں کہ تو اپنے شعر کی اس طرح اصلاح کر:

حاجب اگر معاملہ حشر با علیؑ است

شرم از رُخ علیؑ کن و کمتر گناہ کن

اے حاجب! اگر حشر کا معاملہ علی کے ہاتھ میں ہے، تو علیؑ کے چہرے سے شرم کر اور گناہوں کو چھوڑ دے۔

❖ ❖ ❖

اور چونکہ لوگوں کا قیامت کے میدان میں حساب اور جزا کے لیے حاضر ہونا، اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ خدا ان کے اعمال و کردار سے آگاہ ہے۔ لہٰذا بعد والی آیت میں اس طرح اضافہ کیا گیا ہے: خدا ان تمام باتوں کو جو انہوں نے آگے بھیجی ہیں اور جنہیں وہ دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں، جانتا ہے اور ان کے تمام افعال و اقوال اور نیات سے جو وہ پہلے رکھتے تھے اور اس جزا و سزا سے کہ جو انہیں آئندہ پیش آنے والی ہے باخبر ہے لیکن وہ پروردگار کے بارے میں احاطہ علمی نہیں رکھتے (یعلم ما بین ایدیهم وما خلفهم ولا یحیطون به علما)[1]

اس طرح سے خدا کا علمی احاطہ ان کے اعمال کے بارے میں بھی ہے اور ان کی جزا کے سلسلے میں بھی اور یہ دونوں حقیقت میں کامل اور عادلانہ فیصلے کے دو رکن ہیں کہ قاضی ان حادثات سے بھی کہ جو رونما ہوتے ہیں کامل طور پر باخبر ہو اور ان کے فیصلہ اور جزا سے بھی آگاہ ہو۔

❖ ❖ ❖

"اور اس دن تمام لوگ خدائے حیّ و قیوم کے سامنے مکمل طور پر خاضع ہوں گے": (وعنت الوجوه للحی القیوم)۔

"عنت" "عنوة" کے مادہ سے خضوع اور ذلت کے معنی میں ہے۔ لہٰذا قیدی کو "عانی" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ قید کرنے والے کے ہاتھ میں خاضع اور ذلیل ہوتا ہے۔

اور اگر ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں پر خضوع کی "وجوہ" (چہروں) کی طرف نسبت دی گئی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نفسیاتی اظہارات۔ کہ جن میں سے ایک خضوع بھی ہے ۔۔۔ سب سے پہلے اس کے آثار چہروں پر ہی ظاہر ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "وجوہ" یہاں پر رؤسا اور امرا اور صاحبانِ اقتدار کے معنی میں ہے کہ اس دن وہ سب کے سب بارگاہ میں ذلیل و خاضع ہوں گے (لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے)۔

---

[1] بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ پہلے جملے میں جمع کی ضمیریں شفاعت کرنے والوں کی طرف لوٹتی ہیں اور بعض نے یہ بھی احتمال ذکر کیا ہے کہ "بہ" کی ضمیر مجرمین کے اعمال اور ان کے نتائج کی طرف لوٹتی ہے لیکن جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے وہ زیادہ صحیح نظر آتا ہے (غور کیجئے گا)

اس مقام پر خدا کی تمام صفات میں سے "حیّ و قیوم" کا انتخاب اس وجہ سے ہے کیونکہ یہ دونوں صفات قیامت کے مسئلہ کے ساتھ کہ جو سب کی زندگی اور قیام کا دن ہے، مناسبت رکھتی ہے۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: خدائی ثواب سے مایوس اور نااُمید وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ظلم و ستم کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھایا ہوا ہے (وقد خاب من حمل ظلما)۔

گویا ظلم و ستم ایک ایسے عظیم بوجھ کی طرح ہے کہ جو انسان کے کندھوں پر وزن ڈالتا ہے اور اس کو خدا کی دائمی نعمتوں کی طرف بڑھنے سے روکتا ہے۔ ظالم چاہے انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہو یا دوسروں پر نااُمید ہو کر ان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے اس لیے کہ اس دن اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ ہلکے بوجھ والے جنت کی طرف چلے جا رہے ہیں لیکن وہ ظلم کے سنگین بوجھ میں دبے ہوئے جہنم کے قریب گھٹنے ٹیکے ہوئے ہیں۔

⁂

چونکہ قرآن کی روش عام طور پر مسائل میں مطابقت کو بیان کرنا ہے لہٰذا اس دن ظالموں اور مجرموں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد، مومنین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: باقی رہے وہ لوگ کہ جو اعمال صالح بجا لائیں اور وہ مومن بھی ہوں، تو وہ نہ تو کسی ظلم و ستم سے ڈرتے ہیں اور نہ ہی اپنے حق کا نقصان ہو جانے سے (ومن یعمل من الصالحات وھو مؤمن فلا یخاف ظلما ولا ھضما)[1]۔

"من الصالحات" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ تمام نیک اعمال کو انجام نہیں دے سکتے، تو کم از کم ان میں سے کچھ تو بجا لائیں کیونکہ ایمان عمل صالح کے بغیر ایک ایسا درخت ہے کہ جس پر پھل نہ لگتے ہوں۔ جیسا کہ عمل صالح ایمان کے بغیر ایسا درخت ہے کہ جس کی جڑیں نہ ہوں، جو ممکن ہے کچھ دن کھڑا رہے، لیکن آخرکار خشک ہو جائے گا۔ اسی بنا پر عمل صالح کے ذکر کے بعد زیر نظر آیت میں "وھو مؤمن" شرط کا ذکر ہے۔

اصولی طور پر عمل صالح ایمان کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور اگر کبھی بے ایمان لوگ کوئی نیک کام انجام دیں تو بلاشک و شبہ وہ محدود، کمزور اور استثنائی ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس غرض سے کہ عمل صالح مسلسل، پائیدار اور گہرا انجام پائے، اسے پاک اور صحیح عقیدے سے سیراب ہونا چاہیئے۔

چند نکات:

۱۔ "ظلم" اور "ھضم" میں فرق: زیر بحث آیات کے آخری جملہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ صالح مومنین اس دن نہ تو ظلم سے ڈریں گے اور نہ ہی ھضم سے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "ظلم" تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں اس دادگاہ عدل میں ہرگز اس بات کا خوف نہیں ہوگا کہ ان پر کوئی ظلم و ستم ہوگا اور کسی ایسے گناہ پر ان کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا جسے انہوں نے انجام نہیں دیا۔

---

[1] "ھضم" لغت میں "نقص" اور کمی کے معنی میں ہے اور اگر بدن میں غذا کے جذب ہونے کو ھضم کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غذا ظاہراً کم ہو جاتی ہے اور اس کی تلچھٹ باقی رہ جاتی ہے۔

اور "ہضم" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں اپنے ثواب میں کمی کے بارے میں بھی کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی جزا پوری پوری بے کم و کاست انہیں دی جائے گی۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی بیان کیا ہے کہ پہلا لفظ تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو اپنی تمام نیکیوں کے برباد ہوجانے کا خوف نہیں ہوگا۔ اور دوسرا لفظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں اس میں تھوڑی سی کمی ہو جانے کے بارے میں کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی کیونکہ خدائی حساب دقیق ہوگا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ان صالح مومنین سے کچھ لغزشیں بھی سرزد ہوگئی تھیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ان لغزشوں کو اس سے زیادہ کہ جتنی یہ ہیں، ان کے لیے نہیں لکھا جائے گا اور ان کے اعمالِ صالح کے ثواب میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں کی جائے گی۔ مذکورہ بالا تفاسیر کیونکہ ایک دوسرے کے منافی نہیں لہٰذا ہوسکتا ہے کہ زیرِ بحث جملہ ان تمام معانی کی طرف اشارہ ہو۔

۲۔ قیامت کے مرحلے: زیرِ بحث آیات میں حوادث کے ایک سلسلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو دورِ قیامت شروع ہونے سے پہلے اور اس کے بعد ظاہر ہوں گے:

۱۔ مُردے نئی زندگی کی طرف پلٹیں گے (یوم ینفخ فی الصور)۔

۲۔ گنہگار مجتمع اور محشور ہوں گے (نحشر المجرمین)۔

۳۔ زمین کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے اور سطح زمین بالکل صاف ہموار ہو جائے گی (ینسفھا ربی نسفًا)۔

۴۔ سب کے سب خدا کی طرف سے پکارنے والے کے فرمان پر کان دھرے ہوئے ہوں گے۔ اور تمام آوازیں خاموش اور دھیمی ہوجائیں گی (یومئذ یتبعون الداعی ...)۔

۵۔ اس دن اِذنِ خدا کے بغیر شفاعت مؤثر نہیں ہوگی (یومئذ لا تنفع الشفاعة ...)۔

۶۔ خدا اپنے بے انتہا علم کے ساتھ تمام کو حساب و کتاب کے لیے حاضر کرے گا (یعلم ما بین ایدیھم)۔

۷۔ سب کے سب اس کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کریں گے (وعنت الوجوہ للحی القیوم)۔

۸۔ ظالم و ستمگر مایوس ہو جائیں گے (وقد خاب من حمل ظلمًا)۔

۹۔ اور مومن لطفِ پروردگار کے اُمیدوار ہوں گے (ومن یعمل من الصالحات وھو مؤمن ...)۔

* * *

۱۱۳۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ○

۱۱۴۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ

یُقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ ۫ وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا ۝

ترجمہ

۱۱۳۔ اور اسی طرح سے ہم نے اس قرآن کو (فصیح و بلیغ زبان) عربی میں اُتارا ہے اور اس میں ہم نے طرح طرح سے خوف دلایا ہے کہ شاید وہ تقویٰ اختیار کرلیں یا یہ ان کے لیے (نصیحت اور) یاد دہانی کا سبب بنے۔

۱۱۴۔ پس بلند مرتبہ ہے وہ خدا کہ جو بادشاہ برحق ہے اور تم قرآن پڑھنے میں، اس سے پہلے کہ اس کی وحی تجھ پر پوری ہو، جلدی نہ کیا کرو اور یہ کہا کرو کہ اے میرے پروردگار! میرے علم کو اور زیادہ کر دے۔

تفسیر

پروردگارا! میرے علم کو اور زیادہ کر دے:

گزشتہ آیات میں قیامت اور وعدو وعید سے مربوط تربیتی مسائل کے بارے میں جو کچھ آیا ہے، تو درحقیقت ان آیات میں اس کی طرف مجموعی اعتبار سے اشارہ ہے۔

فرمایا گیا ہے: اسی طرح سے ہم نے اسے عربی (فصیح و بلیغ زبان) میں قرآن کی صورت میں اُتارا ہے اور ہم نے اس میں مختلف بیانات و عبارات کے ذریعے ڈرایا ہے کہ شاید وہ تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کریں یا کم سے کم ان کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہو۔ (وکذلک انزلناہ قرأنا عربیا وصرفنا فیہ من الوعید لعلھم یتقون او یحدث لھم ذکرا)۔

"کذلک" کی تعبیر حقیقت میں ان مطالب کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس آیت سے پہلے بیان ہوئے ہیں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی انسان کسی دوسرے کے لیے بیدارکن اور عبرت انگیز مطالب بیان کرے اور اس کے بعد کہے کہ یوں پند و نصیحت کرنا چاہیئے ——— (اس بناء پر ہمیں دوسری تفسیروں کی ضرورت نہیں رہتی جو بعض مفسرین نے اس مقام پر بیان کی ہیں۔ اور وہ آیت کے معنی کے ساتھ کوئی مطابقت بھی نہیں رکھتیں)۔

لفظ "عربی" اگرچہ عربی زبان کے معنی میں ہے لیکن دو لحاظ سے یہاں قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کے مفاہیم کے رسا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

پہلا یہ کہ اصولی طور پر عربی زبان ——— دنیا بھر کے زبان شناسوں کی تصدیق کے مطابق ——— ایک رساترین زبان ہے اور اس کا ادب قوی ترین ادب ہے۔

دوسرا یہ کہ کبھی "صرفنا" مختلف قسم کے بیانات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جو قرآن ایک حقیقت بیان کرنے میں اختیار کرتا ہے مثلاً وعید اور مجرموں کی سزا، کبھی گزشتہ اُمتوں کی سرگزشت کے لباس میں کبھی حاضرین سے خطاب کی صورت میں کبھی میدانِ قیامت میں ان کے

حالات کی تصویر کشی کی صورت میں اور کبھی کسی دوسرے پیرائے میں بیان کرتا ہے۔

"لعلھم یتقون" کا "یحدث لھم ذکرا" سے فرق ممکن ہے کہ اس لحاظ سے ہو کہ پہلے جملے میں تو وہ یہ کہتا ہے کہ مقصد، تقویٰ کا کامل صورت میں پیدا ہوتا ہے اور دوسرے جملہ کا مقصد یہ ہے کہ اگر مکمل طور پر تقویٰ پیدا نہیں ہوتا تو کم از کم بیداری و آگاہی تو ہونا چاہیئے تاکہ اس وقت تک تو کچھ حدود میں اسے محدود کردے اور آئندہ کے لیے مثبت حرکت کا سرچشمہ بن جائے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پہلا جملہ تو غیر پرہیزگاروں کے لیے پرہیزگاری اور تقویٰ اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہو اور دوسرا جملہ پرہیزگاروں کے لیے نصیحت اور یاددہانی کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ سورہ انفال کی آیہ ۲ میں بیان ہوا ہے:

اذا تلیت علیھم ایاته زادتھم ایمانا

جس وقت قرآن کی آیات مومنین کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو اُن کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

دراصل زیر بحث آیت میں تعلیم و تربیت کے دو مؤثر اصولوں کی طرف اشارہ ہوا ہے؛ اول بیان کی صراحت اور عبارات کے رسا ہونے اور ان کے روشن و دلنشین ہونے کا مسئلہ ہے اور دوسرے مطالب کو طرح طرح کے لباسوں میں بیان کرنا ہے تاکہ تکرار کا موجب نہ ہو اور دلوں میں اُتر جانے کا باعث ہو۔

⁂

بعد والی آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے: بلند مرتبہ ہے وہ خدا کہ جو بادشاہ برحق ہے، (فتعالی اللہ الملك الحق)۔

ممکن ہے لفظ "حق" کا ذکر لفظ "ملک" کے بعد اس بناء پر ہو کہ لوگ عام طور پر لفظ "ملک" (بادشاہ) سے بُرا مفہوم لیتے ہیں اور اس سے ان کے ذہن میں ظلم و ستم اور خودسری کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لہذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: خدا بادشاہ برحق ہے۔

بعض اوقات پیغمبر اکرمؐ آیات قرآن حاصل کرنے کے اشتیاق اور اُسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے حفظ کرنے کی خاطر نزولِ وحی کے وقت جلدی فرمایا کرتے تھے اور جبرئیلؑ کو پورے طور پر اس بات کی مہلت نہ دیتے تھے کہ وہ اپنی بات کو تمام کرلیں۔ اس آیت کے آخر میں نہیں نصیحت کی جارہی ہے: قرآن کے لیے جلدی نہ کیا کرو، اس سے پہلے کہ اس کی وحی پوری ہو: (ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیك وحیه)۔

"اور یہ کہا کرو کہ اسے پروردگار! میرے علم میں زیادتی فرما (وقل رب زدنی علما)۔

قرآن کی بعض دوسری آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر میں نزول وحی کے وقت ایک خاص کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی کہ جو اس بات کا سبب بنتی تھی کہ وہ حصول وحی میں جلدی کریں۔ مثلاً:

لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علینا جمعه وقرانه فاذا قراناه فاتبع قرانه

اپنی زبان کو جلدی کی خاطر وحی حاصل کرتے وقت حرکت نہ دیا کرو۔ اُسے تیرے سینے میں جمع کرنا ہمارے ذمہ ہے تاکہ تُو اُسے تلاوت کرسکے۔ پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر تو اس کی

تلاوت کی پیروی کرے۔

چند نکات :

۱۔ حصولِ وحی تک میں عجلت نہ کرو :

ان جملوں میں چند تربیتی سبق موجود ہیں۔ اُن میں سے ایک حصولِ وحی کے وقت عجلت کرنے سے نہی ہے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ کسی بات کہنے والے کی بات سُنتے وقت ابھی اس کا مطلب ختم ہونے نہیں پاتا کہ اسے دہرانے یا پُورا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس کام کی بنیاد کبھی تو بے صبری ہوتی ہے اور کبھی غرور و خود نمائی۔ البتہ بعض اوقات مطلب حاصل کرنے اور ماموریت کی انجام دہی کے لیے اشتیاق اور لگاؤ بھی انسان کو اس کام کے لیے آمادہ کر دیتا ہے۔ اس صورت میں عجلت پر اُبھارنے والا جذبہ تو مقدس ہوتا ہے لیکن نفس عمل یعنی عجلت کرنا عام طور پر مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے زیرِ بحث آیات میں اس کام سے منع کیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ صحیح مقصد کے لیے ہی ہو۔ اصولی طور پر وہ کام جو جلد بازی میں انجام پاتے ہیں، عیب و نقص سے خالی نہیں ہوتے۔ یقینی طور پر پیغمبر اکرمؐ کا کام مقامِ عصمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے خطا و اشتباہ سے محفوظ تھا لیکن چونکہ انہیں ہر چیز میں لوگوں کے لیے نمونۂ عمل ہونا چاہیئے تاکہ لوگ اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ جہاں وحی کو حاصل کرنے میں جلدبازی کرنا مناسب نہیں ہے تو پھر باقی کاموں کا معاملہ تو بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

البتہ عجلت کا سرعت کے ساتھ اشتباہ نہیں کرنا چاہیئے۔ سرعت تو اس کو کہتے ہیں کہ پروگرام مکمل طور پر منظم ہو چکا ہے اور تمام مسائل کی جانچ پڑتال کر لی گئی ہے، اس کے بعد وقت ضائع کیے بغیر بلا تاخیر اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا جائے۔ لیکن عجلت اس کو کہتے ہیں کہ ابھی پروگرام اچھی طرح بنا نہیں ہے اور اس کے لیے ابھی تکمیل اور غور و خوض کی ضرورت ہے اور کام شروع کر دیا جائے۔ اسی بناء پر "سرعت" ایک پسندیدہ عمل ہے اور "عجلت" اور جلد بازی کرنا ناپسندیدہ کام ہے۔

البتہ اس جملہ کی تفسیر میں بعض دوسرے احتمالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک احتمال یہ ہے کہ بعض اوقات وحی کے آنے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ بے تاب ہو جایا کرتے تھے۔ یہ آیت آپؐ کو یہ تعلیم دے رہی ہے کہ بے تاب نہ ہوں، ہم ہر محل جو کچھ ضروری ہوا آپ پر وحی کریں گے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ قرآن مجید کی آیات چونکہ مجموعی صورت میں ایک ہی مرتبہ شب قدر میں قلب پیغمبرؐ پر نازل ہو گئی تھیں اور دوسری مرتبہ بتدریج ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہوئیں۔ لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تدریجی طور پر نازل ہوتے وقت کبھی کبھی جبرئیل سے پہلے ہی پڑھنے لگ جایا کرتے تھے۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ تم اس کام میں عجلت مت کرو اور نزول تدریجی کو اس کے موقع اور محل پر انجام پانے دو۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ علم میں اضافے کے طلبگار رہو :

اس سبب سے کہ وحی حاصل کرتے وقت جلد بازی سے ممانعت ممکن ہے یہ وہم پیدا کرے کہ یہاں زیادہ علم حاصل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: یہ کہا کرو کہ اے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما (قل ربّ زدنی علمًا)۔

لہ سورہ قیامت ۱۵ تا ۱۷۔

اس جملے سے مذکورہ خیال کو رد کیا گیا ہے۔ یعنی عجلت اور جلد بازی درست نہیں ہے۔ لیکن علم میں اضافے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ پہلے جملے میں نبی کریمؐ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آیات کے تمام پہلوؤں کو دوسری آیات میں وضاحت سے پہلے سمجھنے میں جلدی نہ کیا کرو اور دوسرے جملے میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ خدا سے قرآن کی آیات کے مختلف مفاہیم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی طلب کرو۔

بہرحال جہاں رسول اللہؐ اس علم سے سرشار اور آگہی سے معمور روح کے باوجود اس بات پر مامور ہوں کہ آخری عمر تک خدا سے علم میں اضافے کی دعا کرتے رہیں تو دوسروں کی ذمہ داری کامل طور پر واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔ درحقیقت اسلام کی نظر میں علم کی کوئی حد یا سرحد نہیں ہوتی۔ بہت سے امور میں زیادتی اور اضافہ کا مطالبہ مذموم ہے لیکن علم میں ممدوح ہے۔ افراط بری چیز ہے لیکن علم میں افراط کا کوئی معنی نہیں ہے۔

علم کی کوئی مکانی سرحد نہیں ہے۔ چین اور ثریا تک بھی اس کی طلب میں دوڑنا چاہیئے۔ علم کوئی زمانی سرحد بھی نہیں رکھتا۔ گہوارے سے لے کر قبر تک جاری ہے۔

اسلام معلم اور استاد کے لحاظ سے بھی کوئی سرحد نہیں بناتا کیونکہ حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے۔ جس شخص کے پاس سے اسے ملے اس سے حاصل کرے اور اگر کوئی موتی کسی ناپاک شے سے گرے تو اسے اٹھا لے۔

تلاش و کوشش کی نظر سے بھی اس کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ سمندروں کی گہرائیوں میں جائے اور علم حاصل کرے۔ یہاں تک کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنی عزیز جان بھی دے دے۔

اس طرح سے منطق اسلام میں لفظ "فارغ التحصیل" ایک بے معنی لفظ ہے۔ ایک سچے مسلمان کی تحصیل علم ختم نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ ہی علم کا متلاشی اور طالب علم رہتا ہے۔ چاہے وہ بہترین استاد ہی کیوں نہ ہو جائے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

ہم ہر شب جمعہ ایک خاص سرور اور خوشی حاصل کرتے ہیں۔

اس نے عرض کیا:

خدا اس خوشی میں اور زیادتی کرے، یہ کونسی خوشی ہے۔

تو آپؑ نے فرمایا:

اذا كان ليلة الجمعة وافى رسول الله (ص) العرش ووافى الائمة (عليهم السلام) ووافينا معهم فلا ترد ارواحنا بابداننا الا بعلم مستفاد ولولا ذالك لانفدنا۔

جب شب جمعہ ہوتی ہے تو رسول اللہ (ص) کی روح پاک اور آئمہ (علیہم السلام) کی ارواح اور ہم ان کے ساتھ عرش خدا کی طرف جاتے ہیں اور ہماری روحیں بدنوں کی طرف نہیں لوٹتیں مگر نئے علم کے ساتھ اور اگر ایسا نہ ہو تو ہمارے علوم ختم ہو جائیں۔[1]

یہ مضمون متعدد روایات میں مختلف عبارات کے ساتھ بیان ہوا ہے جو کہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ کے علم میں ہمیشہ

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۳، ص ۳۹۶۔

اضافہ ہوتا رہتا ہے بلکہ رہتی دنیا تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ایک اور روایت میں پیغمبر بزرگوار اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اذا اتی علیّ یوم لا ازداد فیہ علماً یقربنی الی اللّٰہ فلا بارک اللّٰہ لی فی طلوع شمسہ۔

جو دن مجھ پر ایسا آئے کہ اُس میں کسی علم کا مجھ میں اضافہ نہ ہو کہ جو مجھے اللہ کے قریب کرے اس دن کا طلوع آفتاب مجھ پر مبارک نہ ہو۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی منقول ہے:

اعلم الناس من جمع علم الناس الی علمہ، واکثر الناس قیمۃ اکثرھم علماً واقل الناس قیمۃ اقلھم علماً۔

لوگوں میں سے سب سے زیادہ صاحب علم وہ ہے کہ جو لوگوں کے علم کا اپنے علم میں اضافہ کرے۔
تمام لوگوں میں سے زیادہ گراں قدر وہ شخص ہے جس کا علم زیادہ ہو اور سب سے کم قدر و قیمت والا وہ شخص ہے کہ جس کا علم سب سے کم اور تھوڑا ہو۔[2]

یہ ہے علم کی قدر و قیمت اسلام کی نظر میں۔

⁂

۱۱۵۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ۝

۱۱۶۔ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ ۝

۱۱۷۔ فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ ۝

۱۱۸۔ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝

۱۱۹۔ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۝

---

[1] تفسیر مجمع البیان و نور الثقلین و صافی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۲، ص ۲۱۹ (مادہ علم)

۱۲۰۔ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ○

۱۲۱۔ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ○

۱۲۲۔ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ○

ترجمہ

۱۱۵۔ ہم نے آدم سے پہلے پہل عہد لے لیا تھا لیکن وہ اُسے بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم و استقامت نہ پائی۔

۱۱۶۔ جس وقت ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کیا (اور سجدہ نہ کیا)

۱۱۷۔ ہم نے کہا: اے آدم! یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنّت سے باہر نکال دے کیونکہ اس طرح تو تم زحمت اور مشقت میں پڑ جاؤ گے۔

۱۱۸۔ (لیکن بہشت میں تم راحت و آرام سے ہو) اس میں تمہیں نہ تو بھوک لگے گی اور نہ ہی تم برہنہ ہوگے۔

۱۱۹۔ اور اس میں نہ تمہیں پیاس لگے گی نہ سُورج کی دھوپ تمہیں تکلیف پہنچائے گی۔

۱۲۰۔ لیکن شیطان نے اُسے وسوسے میں ڈال دیا اور کہا: اے آدم! کیا تُو یہ چاہتا ہے کہ میں تجھے عمرِ جاوداں کے درخت اور لافانی ملک کی طرف رہنمائی کروں؛

۱۲۱۔ آخرکار دونوں نے اس میں سے کھا لیا (اور ان کا بہشتی لباس اُتر گیا) اور ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر ہوگئیں اور وہ دونوں بہشت کے درختوں کے پتوں کو اپنے اُوپر لپیٹنے لگے اور (آخرکار) آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور (اس کے انعامات سے) محروم ہوگیا۔

۱۲۲۔ اس کے بعد اس کے پروردگار نے اُس کو برگزیدہ بنا لیا اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اُسے ہدایت کی۔

تفسیر

شیطان کی فریب کاری:

اس سورہ کا ایک اہم حصّہ موسٰی و بنی اسرائیل کی سرگزشت اور فرعون اور اس کے حواریوں کے ساتھ ان کے مقابلے کے ذکر پر مشتمل تھا لیکن

زیر بحث آیات آدم و حوا کی داستان اور ابلیس کی اُن سے دشمنی اور مقابلہ کرنے کے بارے میں ہیں۔

شاید یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق و باطل کی جنگ آج اور کل اور موسیٰ و فرعون میں منحصر نہیں ہے۔ یہ ابتدائے آفرینش آدم سے جاری ہے اور اسی طرح سے جاری رہے گی۔

اگرچہ آدم و ابلیس کی سرگزشت بارہا قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے لیکن ہر موقع پر کچھ نئے نکات بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں پر پہلے آدم کے خدا سے عہد و پیمان کی بات ہو رہی ہے۔ فرمایا گیا ہے : ہم نے آدم سے پہلے عہد و پیمان لے لیا تھا لیکن وہ اُسے بھول گیا اور اپنے عہد و پیمان کا پابند نہ رہا (ولقد عهدنا الی اٰدم من قبل فنسی ولم نجد له عزماً)۔

اس بارے میں کہ اس عہد سے کونسا عہد مراد ہے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ ممنوعہ درخت کے نزدیک نہ جانے کا خدا کا فرمان ہے۔ متعدد روایات بھی اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے دوسرے احتمالات بھی ذکر کیے ہیں۔ انہیں بھی اسی معنی کے شاخ و برگ شمار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً خدا کا آدم کو اس خطرے کی خبر دینا کہ شیطان تمہارا سخت دشمن ہے، تم اس کی پیروی نہ کرنا۔

باقی رہا "نسیان" تو مسلمہ طور پر وہ مطلق فراموشی اور بھول جانے کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ مطلق فراموشی میں عتاب اور ملامت نہیں ہو سکتی بلکہ یہ یا تو ترک کرنے کے معنی میں ہے، جیسا کہ ہم روزمرہ کی گفتگو میں اُس شخص سے کہ جس نے اپنے عہد کی وفا نہ کی ہو، کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو اپنے عہد کو بھول گیا ہے۔ یعنی تجھے یاد ہونا بھی فراموش کرنے والے کی طرح ہے یا یہ اُن فراموش کاریوں کے معنی میں ہے کہ جو توجہ کی کمی اور اصطلاح کے مطابق "ترک تحفظ" کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہاں "عزم" سے مراد مصمم اور محکم ارادہ ہے کہ جو انسان کی شیطان کے قوی وسوسوں کے مقابلے میں حفاظت کرتا ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ آدمؑ کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ ان سے صرف "ترک اولیٰ" سرزد ہوا یا دوسرے لفظوں میں آدمؑ کی جنت میں سکونت کا دور، تکلیف (یا ذمہ داری یا مسئولیت) کا دور نہیں تھا۔ بلکہ یہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے تیار ہونے اور ذمہ داریوں کی جوابدہی کو قبول کرنے کا ایک تجرباتی دور تھا۔ خاص طور پر یہ بات کہ اس مقام پر خدا کی ممانعت اخلاقی پہلو کی حامل تھی کیونکہ اس سے فرمایا تھا کہ اگر ممنوعہ درخت سے کھاؤ گے تو حتماً بہت سی زحمت و تکلیف میں گرفتار ہو جاؤ گے (ان سب باتوں کی تفصیلات اور اسی طرح یہ بات کہ شجرۂ ممنوعہ سے کیا مراد تھی اور اس قسم کے دیگر مباحث چوتھی جلد میں سورۂ اعراف کی آیہ ۱۹ تا ۲۲ کے ذیل میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں)۔

اس کے بعد اسی قصہ کے ایک دوسرے حصّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : اس وقت کو یاد کرو کہ جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، ان سب نے تو سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، اُس نے انکار کر دیا (واذ قلنا للملٰئكة اسجدوا لاٰدم فسجدوا الا ابليس ابٰى)۔

اس سے آدم کا باعظمت مقام اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ وہ آدم کہ جو مسجودِ ملائکہ تھا اور پروردگار کی اس عظیم مخلوق کے لیے لائق احترام تھا۔ ضمنی طور پر اُن سے ابلیس کی دشمنی پہلے ہی قدم پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ اُس نے عظمتِ آدم کے سامنے ہرگز سرِ تعظیم نہ جھکایا۔

اس میں شک نہیں کہ سجدہ، پرستش و عبادت کے معنی میں خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور خدا کے سوا کوئی شخص اور کوئی چیز بھی معبود نہیں ہو سکتی ہے۔ اس بنا پر فرشتوں کا یہ سجدہ خدا کے لیے تھا، زیادہ سے زیادہ اس باعظمت وجود کی آفرینش کی خاطر سے کہ :

شائستہ ستائش آں آفریدگاری است ✤ کارد چنیں دل آویز نقشی ز ماء و طینی !

وہ خالق ہی لائق تعریف ہے کہ جس نے پانی اور مٹی سے ایسا دل آویز نقش بنایا۔

یا یہاں "سجدہ" خضوع اور انکساری کے معنی میں ہے۔

✤ ✤ ✤

بہرحال ہم نے اس موقع پر آدم کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور" ہم نے کہا اے آدم ! اس طرزِ عمل سے یہ تصدیق ہوگئی کہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ اس کا خیال رکھنا کہ کہیں وہ تمہیں جنت سے باہر نہ نکال دے۔ جس سے تو رنج و تکلیف میں مبتلا ہوجائیگا:

(فقلنا یاٰدم انّ ھٰذا عدو لک و لزوجک فلا یخرجنکما من الجنۃ فتشقٰی)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں جنّت " دار آخرت کی بہشتِ جاوداں کے معنی میں نہیں ہے کہ جو ایک نقطہ تکامل وارتقا ہے اور اس سے باہر نکلنا اور وہاں سے بازگشت ممکن نہیں ہے یہ جنت جس کا یہاں ذکر ہے ایک باغ تھا کہ جس میں اس دنیا کے باغوں کی سب چیزیں موجود تھیں اور پروردگار کے لطف و کرم سے اس میں کوئی تکلیف اور زحمت نہیں تھی۔ لہٰذا خدا آدم کو اس خطرے سے خبردار کرتا ہے کہ اگر اس امن و امان کی جگہ سے تم باہر نکل گئے تو رنج و مشکل میں مبتلا ہوجاؤ گے۔ "تشقٰی" شقاوت کے مادہ سے ہے اور شقاوت کے معانی میں سے ایک درد و رنج بھی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اپنا روئے سخن پہلے دونوں یعنی آدم و حوا کی طرف کیوں کیا ہے اور فرمایا ہے کہ :

فلا یخرجنکما من الجنۃ

شیطان تم دونوں کو جنت سے نہ نکال دے۔

لیکن باہر آنے کا نتیجہ مفرد کی صورت میں آدم کے بارے میں بیان کیا ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے :

فتشقٰی

اے آدم ! تو درد و رنج میں جا پڑے گا۔

تعبیر کا یہ اختلاف ممکن ہے کہ اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ پہلے درجے میں درد و رنج آدم ہی کے حصہ میں آتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ انہی کی ذمہ داری تھی کہ اپنی بیوی کی مشکلات بھی اپنے کندھے پر اُٹھائیں اور مردوں کی ذمہ داری شروع دن سے اسی طرح سے چلی آرہی ہے۔

یا یہ بات ہے، کہ چونکہ شروع میں آدم سے ہی عہد و پیمان لیا گیا تھا، لہٰذا آخر میں بھی اُنہی سے خطاب کیا گیا ہے۔

✤ ✤ ✤

اس کے بعد خدا، بہشت کے راحت و آرام اور اس سے باہر کے ماحول کے درد و رنج کی آدم کے لیے اس طرح تشریح کرتا ہے :

تو یہاں پر نہ تو بھوکا رہے گا۔ اور نہ ہی برہنہ ہوگا: (ان لک الا تجوع فیھا ولا تعرٰی)۔

• نہ تو اس میں پیاسا رہے گا اور نہ ہی سورج کی تپتی ہوئی دھوپ تجھے تکلیف پہنچائے گی" (وانک لا تظمؤا فیھا ولا تضحٰی)۔

یہاں مفسرین کے لیے ایک سوال سامنے آیا ہے اور وہ یہ کہ پیاس کا حرارت آفتاب کے ساتھ اور بھوک کا برہنگی کے ساتھ کیوں ذکر کیا گیا ہے حالانکہ عام طور پر پیاس کا ذکر بھوک کے ساتھ کرتے ہیں۔

اِس سوال کے جواب میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ پیاس اور سُورج کی دھوپ میں تعلق ناقابلِ انکار ہے۔ "تضحیٰ" "ضحیٰ" کے مادہ سے سورج کا بادل وغیرہ کے سائے کے بغیر چمکنا ہے۔

باقی رہا بھوک کا برہنگی کے ساتھ جمع ہونا، تو ممکن ہے، یہ اس وجہ سے ہو کر بھوک بھی غذا سے اندرونی برہنگی کی ایک قسم ہے (بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ دونوں ۔ برہنگی اور گرسنگی ۔ (عریانی اور بھوک) فقر وفاقہ کی دو خاص نشانیاں ہیں کہ جو عام طور پر ایک ہی ساتھ بیان کی جاتی ہیں ؛ (بھوکے ننگے) بہرحال ان دونوں آیات میں انسان کی چار اصلی اور ابتدائی ضروریات یعنی کھانا، پانی، لباس اور مکان (سُورج سے بچاؤ کے لیے سائے) کی ضرورت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ان ضروریات کا جنّت میں حاصل ہونا، نعمت کی فراوانی کی وجہ سے تھا درحقیقت ان امور کا ذکر ان باتوں کی ایک وضاحت ہے کہ جن کا بیان "فتشقیٰ" (تو زحمت اور مشقت میں پڑ جائے گا) کے جملے میں ہوا ہے۔

٭ ٭ ٭

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود شیطان نے آدم کے خلاف عداوت اور دشمنی پر کمر باندھ لی۔ اسی وجہ سے وہ آرام سے نہ بیٹھا۔ اُس نے آدم کو وسوسہ ڈالنا شروع کر دیا اور کہا: اے آدم! کیا میں تجھے عمرِ جاودانی کے درخت کا پتہ نہ دوں کہ جو شخص اس کا پھل کھالے گا وہ ہمیشہ زندہ رہے گا، کیا تو ہمیشہ کی حکومت وسلطنت تک پہنچنے کی راہ جاننا چاہتا ہے: (فوسوس الیه الشیطان قال یاٰدم هل ادلك علی شجرة الخلد وملك لا یبلی)۔

"وسوسه" دراصل بہت ہی آہستہ اور دھیمی آواز کے معنی میں ہے۔ بعدازاں ذہن میں بُرے مطالب اور بے بنیاد افکار پیدا ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ خواہ وہ (بُرے مطالب) انسان کے اندر سے خود بخود پیدا ہوں یا باہر سے کوئی ان کا عامل اور سبب بنے۔

حقیقت میں شیطان نے یہ اندازہ لگا لیا کہ آدم کا میلان کس چیز کی طرف ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ زندگی جاوداں اور بے زوال قدرت واقتدار تک پہنچنے کا خواہشمند ہے لہٰذا اُس نے انہیں پروردگار کی مخالفت کی طرف کھینچنے کے لیے اُنہی دونوں عوامل سے استفادہ کیا دوسرے لفظوں میں، جس طرح سے خدا نے آدم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تم شیطان کو اپنے سے دُور رکھوگے تو ہمیشہ کے لیے اپنے ربّ کی نعمتوں سے بہرہ مند رہوگے، شیطان نے بھی اپنے وسوسوں میں اسی نکتے کو ملحوظ رکھا۔

ہاں شیاطین اپنے منصوبوں کی ابتداء انہی راستوں سے کرتے ہیں کہ جن سے راہِ حق کے رہبر کرتے ہیں لیکن کچھ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ اُسے انحراف کی طرف کھینچ کرلے جاتے ہیں اور راہِ حق کی کشش کو گمراہیوں تک پہنچنے کے لیے ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

آخرکار جو نہیں ہونا چاہیئے تھا، وہ ہوگیا۔ آدم وحوا دونوں نے ممنوعہ درخت سے کھالیا اور اس کے ساتھ ہی بہشتی لباس ان کے بدنوں سے گر پڑے اور ان کے اعضاء آشکار ہوگئے: (فاکلا منها فبدت لهما سواٰتهما)۔[1]

جب آدم وحوا نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً "جنّت کے درختوں کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپنے لگے" (وطفقا یخصفان

---

[1] "سواٰت" جمع ہے "سوئة" (بروزن "عورة") کی۔ یہ اصل میں اس چیز کے معنی میں ہے کہ جو ناپسند ہو۔ لہٰذا کبھی مردہ جسم پر اور کبھی شرم گاہ کے معنی میں بولا جاتا ہے اور یہاں یہی آخری معنی مراد ہے۔

علیھما من ورق الجنة۔[1]

ہاں! آخرکار "آدم نے اپنے پروردگار کی حکم عدولی کی اور اس کی جزا اور انعام سے محروم ہوگیا" (وعصٰی اٰدم ربہ فغوٰی)۔

"غوٰی" "غی" کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو ایسے جاہلانہ کام کے معنی میں ہے کہ جس کا سرچشمہ عقیدہ ہو اور چونکہ حضرت آدمؑ نے یہاں شیطانی وسوسے سے پیدا ہونے والے وسوسے کی بنا پر عدم آگاہی سے اُس شجرہ ممنوعہ سے کھا لیا تھا۔ لہٰذا اُس کو "غوی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے "غوی" کو اس جہل و نادانی کے معنی میں لیا ہے کہ جو غفلت سے پیدا ہو، بعض نے محرومیت کے معنی میں اور بعض نے زندگی میں فساد پیدا ہونے کے معنی میں لیا ہے۔

بہرحال "غی" "رشد" کا نقطۂ مقابل ہے۔ رشد یہ ہے کہ انسان کسی ایسے راستے سے جائے کہ اپنے مقصد تک پہنچ جائے لیکن "غی" یہ ہے کہ اپنے مقصود تک پہنچنے سے رہ جائے اور محروم رہ جائے۔

لیکن چونکہ آدم ذاتاً پاک اور مومن تھے اور رضائے خدا کی راہ میں قدم اُٹھاتے تھے اور یہ غلطی جو شیطانی وسوسے کی وجہ ہوگئی۔ ایک استثنائی پہلو رکھتی تھی۔ لہٰذا خدا نے انہیں ہمیشہ کے لیے اپنی رحمت سے دُور نہیں کیا بلکہ "اس واقعہ کے بعد اس کے پروردگار نے اسے برگزیدہ بنا لیا اور اس کی توبہ قبول کرلی اور اسے ہدایت کی": (ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدٰی)۔

کیا آدم گناہ کے مرتکب ہوئے تھے؟

اگرچہ لفظ "عصیان" آج کے عرف میں گناہ کے معنی میں ہی بولا جاتا ہے لیکن لغت میں اطاعت و فرمان سے باہر ہوجانے کے معنی میں ہے (چاہے فرمان وجوبی ہو یا استحبابی) لہٰذا لفظ عصیان سے لازمی طور پر ترک واجب یا ارتکاب حرام کا معنی مراد نہیں ہے۔ بلکہ ایک مستحب کا ترک یا مکروہ کا ارتکاب بھی ہوسکتا ہے۔

اس سے قطع نظر کرتے ہوئے "امر و نہی" کبھی ارشادی پہلو بھی رکھتے ہیں، مثلاً ڈاکٹر کے اوامر و نواہی، جو بیمار کو حکم دیتا ہے کہ فلاں دوا کھاؤ اور فلاں غیر مناسب غذا سے پرہیز کرو۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بیمار طبیب کے حکم کی مخالفت کرے گا تو صرف خود کو ہی نقصان پہنچائے گا کیونکہ اُس نے طبیب کے ارشاد اور ہدایات کی پرواہ نہیں کی۔

خدا نے بھی آدم سے فرمایا تھا کہ ممنوعہ درخت کا پھل نہ کھانا کیونکہ اگر تم اُسے کھاؤ گے تو جنت سے باہر نکلنا پڑے گا اور زمین میں بے حد رنج و تکلیف میں جا کر گرفتار ہوجاؤ گے۔ اُنہوں نے اس امر ارشادی کی مخالفت کی اور اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا۔

یہ بات اس چیز کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیادہ واضح ہوجاتی ہے کہ آدم کے جنت میں ٹھہرنے کا زمانہ تجرباتی تھا، تکلیف اور ذمہ داری کا زمانہ نہیں تھا۔

اس سے قطع نظر عصیان و گناہ کبھی مطلق پہلو رکھتے ہیں، یعنی سب کے لیے بغیر کسی استثنا کے گناہ ہوتے ہیں مثلاً جھوٹ بولنا، ظلم کرنا،

---

[1] "یخصفان" "خصف" کے مادہ سے یہاں لباس سینے کے معنی میں ہے۔

حرام مال کھانا اور کبھی وہ نسبتی پہلو رکھتے ہیں یعنی یہ ایسا کام ہوتا ہے کہ اگر ایک انسان سے سرزد ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہیں ہوتا بلکہ کبھی اس کی نسبت سے وہ ایک مطلوب اور شائستہ عمل ہوتا ہے لیکن اگر وہی کام کسی دوسرے سے سرزد ہو جائے تو اس کے مرتبہ و مقام کا لحاظ کرتے ہوئے وہ غیر مناسب ہوتا ہے۔

مثلاً ایک ہسپتال بنانے کے لیے لوگوں سے امداد کی اپیل کی جاتی ہے۔ ایک کاریگر آدمی اپنی ایک دن کی مزدوری کہ جو کبھی چند روپے سے زیادہ نہیں ہوتی دے دیتا ہے۔ یہ عمل اس کی نسبت سے ایثار اور اچھا عمل ہے، کامل طور پر مطلوب و پسندیدہ ہے لیکن اگر ایک دولت مند آدمی بھی اتنی ہی مقدار میں مدد کرے تو نہ صرف یہ کہ یہ عمل اُس کی طرف سے ناپسندیدہ ہے بلکہ ملامت و مذمت کے لائق ہے حالانکہ اصولی طور پر نہ صرف یہ کہ اُس نے کوئی حرام کام نہیں کیا ہے بلکہ ظاہراً ایک کارِ خیر میں مدد بھی کی ہے۔

یہ وہی بات ہے کہ جسے ہم یوں کہتے ہیں :

حسنات الابرار سیئات المقربین

نیک لوگوں کی اچھائیاں مقربین کے لیے گناہ ہیں۔

نیز یہ وہی چیز ہے کہ جو ترکِ اولیٰ کے عنوان سے مشہور ہوئی ہے اور ہم اسے گناہِ نسبتی سے یاد کرتے ہیں کہ جو نہ تو گناہ ہے اور نہ ہی مقامِ عصمت کے خلاف ہے۔

اسلامی احادیث میں بھی کبھی کبھی مستحبات کی مخالفت پر معصیت کا اطلاق ہوا ہے۔ ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے روزانہ کی نافلہ نمازوں کے بارے میں فرمایا :

> "یہ سب مستحب ہیں واجب نہیں ہیں ۔۔۔۔ اور جو شخص ان کو ترک کرے اُس نے معصیت کی کیونکہ مستحب ہے کہ جب انسان کسی نیک کام کو انجام دیتا ہے تو اس کام کو جاری رکھنا چاہیئے۔

اس موضوع اور حضرت آدم سے مربوط دوسرے مسائل اور ان کے جنّت سے باہر نکلنے کے بارے میں چوتھی جلد سورہ اعراف کی آیہ ۱۹ سے بعد اور جلد اول سورہ بقرہ کی آیہ ۳۰ تا ۳۸ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں، یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۲۳۔ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ○

۱۲۴۔ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ○

۱۲۵۔ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ○

۱۲۶۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ○

۱۲۷۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ○

ترجمہ

۱۲۳۔ (خدا نے) فرمایا: تم دونوں (اور اسی طرح شیطان) اس (باغ) سے نیچے اُترو۔ اس حالت میں کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو لیکن جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی رنج و تکلیف میں مبتلا ہوگا۔

۱۲۴۔ اور جو شخص میری یاد سے رُوگردانی کرے گا، وہ تنگ زندگی گزارے گا اور قیامت کے دن ہم اُسے نابینا محشور کریں گے۔

۱۲۵۔ وہ کہے گا: پروردگارا: تُو نے مجھے نابینا کیوں محشور کیا؟ میں تو بینا تھا۔

۱۲۶۔ (خدا) فرمائے گا: یہ اس بنا پر ہے کہ میری آیات تیرے پاس پہنچیں اور تُو نے انہیں بُھلا دیا۔ اسی طرح آج تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔

۱۲۷۔ اور جو شخص اسراف کرے گا اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں لائے گا، ہم اُسے اسی قسم کی جزا دیں گے اور آخرت کا عذاب زیادہ شدید اور زیادہ پائیدار ہے۔

تفسیر

تنگ زندگی:

آدمؑ کی توبہ اگرچہ قبول ہوگئی تھی مگر اُنہوں نے ایسا کام کیا تھا کہ اب پہلی جیسی حالت کی طرف لوٹنا ممکن نہیں تھا، لہٰذا خدا نے "اُنہیں اور حوا کو حکم دیا کہ تم دونوں، اور اسی طرح شیطان بھی تمہارے ساتھ، جنّت سے زمین پر اُتر جاؤ (قال اهبطا منها جميعًا)۔

"درآنحالیکہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے" (بعضكم لبعض عدو)۔

لیکن مَیں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ راہ سعادت اور نجات تمہارے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ "پس جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے تو تم میں سے جو کوئی اِس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ ہی بدبخت" (فاما یاتینکم منی هدًی

فمن تبع ھدای فلا یضل ولا یشقٰی)۔

اور اس غرض سے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے فرمان کو بھلا دیتے ہیں، ان کی پریشانی کا نتیجہ بھی واضح ہو جائے، مزید فرمایا گیا ہے:

اور جو شخص میری یاد سے رُوگردانی کرے گا وہ تنگ اور سخت زندگی بسر کرے گا: (ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا)۔

• اور قیامت کے دن ہم اُسے نابینا محشور کریں گے" (ونحشرہ یوم القیامۃ اعمٰی)۔

وہاں وہ یہ "عرض کرے گا کہ پروردگارا! تو نے مجھے نابینا کیوں محشور کیا ہے جب کہ پہلے تو میں بینا تھا" (قال ربّ لم حشرتنی اعمٰی وقد کنت بصیرا)۔

خدا کی طرف سے اُسے فوراً یہ جواب دیا جائے گا: یہ اس بنا پر ہے کہ ہماری آیات تیرے پاس آئی تھیں، تو تُو نے انہیں فراموش کر دیا اور انہیں ملحوظ نظر نہ رکھا لہٰذا آج کے دن تو بھی فراموش کر دیا جائے گا۔ (قال کذالک اتتک اٰیاتنا فنسیتھا وکذالک الیوم تنسٰی)۔

اور تیری آنکھیں پروردگار کی نعمتوں اور اس کے مقام قرب کو نہ دیکھ پائیں گی۔

❖ ❖ ❖

اور آخر میں مجموعی نتیجہ نکالتے ہوئے آخری زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ اسراف کریں گے اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں لائیں گے ہم انہیں اسی قسم کی جزا دیں گے: (وکذالک نجزی من اسرف ولم یؤمن باٰیات ربہ)۔

• اور آخرت کا عذاب اِس سے بھی زیادہ شدید اور زیادہ پائیدار ہے۔[1]
(ولعذاب الاٰخرۃ اشد وابقٰی)۔

❖ ❖ ❖

چند اہم نکات:

۱۔ **یادِ خدا سے غفلت اور اس کے نتائج:** کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے سامنے زندگی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اُسے بند دروازوں کا سامنا ہوتا ہے اور کبھی اس کے بالکل برعکس وہ جدھر بھی جاتا ہے ہر طرف اپنے لیے دروازوں کو کھلا ہوا پاتا ہے، ہر کام کے لیے حالات سازگار ہوتے ہیں اور کوئی بندش اور کسی قسم کی گرہ اس کے سامنے نہیں ہوتی تیا اس حالت کو وسعت زندگی کہتے ہیں جب کہ پہلی حالت کو "ضیق" اور زندگی کی تنگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "معیشت ضنک" کی تعبیر کہ جو اوپر والی آیت میں آئی ہے، اُس سے بھی یہی مراد ہے۔[1]

کبھی معیشت کی تنگی اس بنا پر نہیں ہوتی کہ اس کی آمدنی کم ہے، بسا اوقات اس کی آمدنی میں ریل پیل ہوتی ہے لیکن بُخل،

---

[1] "ضنک" سختی اور تنگی کے معنی میں ہے، یہ لفظ ہمیشہ مفرد کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تثنیہ، جمع اور مؤنث نہیں ہے۔

حرص اور لالچ زندگی کو اس پر تنگ کر دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ایسا شخص اس بات پر مائل نہیں ہوتا کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا ہو اور دوسرے اس کی زندگی سے فائدہ اُٹھائیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے بھی اسے کھلا نہیں رکھنا چاہتا۔

علی علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق :

"وہ اپنی زندگی تو فقیروں کی طرح سے بسر کرتا ہے لیکن اُس کا حساب سرمایہ داروں کا سا ہوگا۔"

واقعاً انسان ان تنگیوں اور سختیوں میں کیوں گرفتار ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا اصلی عامل یادِ خدا سے رُوگردانی ہے۔ یادِ خدا رُوح کے لیے آرام وسکون اور تقویٰ و شہامت کا باعث ہے اور اس کو بُھلا دینا اضطراب، خوف اور پریشانی کا سبب ہے۔

جس وقت انسان خدا کو بُھلا دینے کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کو بُھلا دے تو وہ شہوات، خواہشات، حرص اور طمع میں غرق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے حصّہ میں تنگ زندگی ہی ہوگی۔ نہ اس میں کچھ قناعت ہوگی کہ جو اس کی رُوح کی تسکین کا موجب ہو نہ اُس کی معنویت کی طرف توجہ ہوگی کہ جو اُسے رُوحانی غنا اور تونگری عطا کر دے اور نہ ہی اس کا وہ اخلاق ہوگا کہ جو اُسے طغیانِ شہوات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا سکے۔

اصولاً زندگی کی یہ تنگی زیادہ تر معنویات کی کمی اور رُوحانی استغنا کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مستقبل کے بارے میں مطمئن نہ ہونا، موجودہ امکانات و وسائل کے نابود ہو جانے کا خوف اور مادی دُنیا کے ساتھ انتہائی وابستگی بھی اس کا سبب بنتی ہے۔ اور وہ شخص کہ جو خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اُس نے اس کی پاک ذات کے ساتھ دل لگایا ہے، وہ ان تمام پریشانیوں سے امان میں ہوتا ہے۔

البتہ یہاں تک تو بات ایک فرد سے متعلق تھی لیکن جب ہم ایسے معاشرے میں جائیں کہ جو یادِ خدا سے منہ پھیرے ہوئے ہو تو پھر مسئلہ اس سے بھی زیادہ دہشت ناک ہو جائے گا۔ وہ معاشرے کہ جو تعجب خیز اور حیرت انگیز صنعتی ترقی کے باوجود اور زندگی کے تمام وسائل فراہم ہونے کے باوجود شدید اضطراب اور پریشانی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں، وہ عجیب و غریب تنگی اور سختی میں گرفتار ہیں اور وہ اپنے آپ کو محبوس اور قیدی سمجھتے ہیں۔

سب ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں۔ کوئی شخص کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا۔ تمام روابط اور تعلقات ذاتی مفادات کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ جنگ کے خوف سے اسلحہ سازی کا بھاری بوجھ ان کے زیادہ تر اقتصادی وسائل کو نگل گیا ہے اور ان کی کمریں اس بھاری بوجھ کے نیچے خم ہو گئی ہیں۔

قید خانے مجرموں سے بھرے پڑے ہیں ان کے اپنے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہر گھڑی اور ہر منٹ میں کئی قتل اور کئی ہولناک جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے نشہ آور چیزوں اور فحاشی نے انہیں اپنا غلام اور قیدی بنا رکھا ہے۔ ان کے گھروں کے ماحول میں نہ نورِ محبت ہے اور نہ ہی نشاط بخش پیار کا رشتہ۔

ہاں ! یہ ہے ان کی سخت زندگی اور "معیشت ضنک"۔

امریکہ (شیطانِ اعظم) کے ایک سابق صدر نکسن نے اپنی پہلی صدارتی تقریر میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

ہم اپنے گرداگرد ایسی زندگیاں دیکھ رہے ہیں کہ جو اندر سے خالی ہیں۔ ہم خود کو خوش

رکھنے کی آرزو رکھتے ہیں، لیکن ہم ہرگز خوش نہیں ہوتے۔

انہی کے ایک اور مشہور آدمی نے کہ جس کا منصوبہ تھا معاشرے میں ــــ سب کے لیے خوشی پیدا کی جائے، یہ کہا ہے کہ:

میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ انسانیت ایک تاریک کوچے میں دوڑ رہی ہے کہ جس کے آخر میں سوائے مطلق پریشانی کے اور کچھ نہیں ہے۔[1]

یہ بات بھی خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا کہ آیہ "من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا" سے کیا مراد ہے؛ تو آپؑ نے فرمایا:

اس سے مراد ولایتِ امیرالمومنین علیہ السلام سے اعراض کرنا ہے۔[2]

ہاں علی علیہ السلام وہ عظیم انسان تھے کہ جن کی نظر میں تمام دنیا درخت کے ایک پتّے سے بھی کم قیمت ہے۔ جو شخص اُن کی زندگی کو اپنے لیے نمونۂ عمل قرار دے اور اس طرح سے خدا کے ساتھ دل لگالے کہ سارا جہان اس کی نظر میں حقیر ہو جائے وہ کوئی بھی ہو اس کی زندگی کشادہ اور وسیع ہوگی۔ لیکن جو لوگ ان نمونوں کو بھلا دیں وہ بہرحال تنگیٔ حیات میں گرفتار ہوں گے۔

بہت سی روایات میں زیرِ بحث آیت میں حق تعالیٰ کی یاد سے اعراض ــــ ان لوگوں کے لیے کہ جو حج کرنے پر قادر ہیں ــــ "ترکِ حج" سے تفسیر ہوا ہے، اور یہ اس بنا پر ہے کہ حج کے بلا کر رکھ دینے والے مراسم، انسان کے خدا کے ساتھ نئے روابط اور تعلق پیدا کر دیتے ہیں اور یہی ارتباط اور تعلق اس کی زندگی کی راہوں کو کھول دینے والا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس مادیات سے زیادہ سے زیادہ دلبستگی تنگیٔ حیات کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ **اندرونی اور بیرونی نابینائی:** اُن لوگوں کے لیے کہ جو خدا کی یاد سے رُوگردانی کرتے ہیں، زیرِ بحث آیات میں دو سزائیں معین کی گئی ہیں۔ ایک اس جہان کی تنگیٔ حیات کہ جس کی طرف گزشتہ نکتے میں اشارہ ہوا ہے اور دوسری دوسرے جہان میں نابینائی اور اندھاپن۔

ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ عالمِ آخرت عالمِ دنیا کی ایک پھیلی ہوئی اور وسیع مجسم صورت ہے اور اس دنیا کے تمام حقائق وہاں پر ایک متناسب شکل و صورت میں مجسم ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جن کی رُوحانی آنکھیں (چشمِ بصیرت) اس عالم میں حقائق کو دیکھنے سے نابینا ہیں، اس جہان میں ان کے جسم کی آنکھیں بھی نابینا ہو جائیں گی۔ لہٰذا جس وقت وہ یہ کہیں گے کہ ہم تو پہلے بینا تھے۔ اب نابینا کیوں محشور ہوئے ہیں تو انہیں یہ جواب ملے گا کہ یہ اس بنا پر ہے کہ تم نے خدا کی آیات کو بھلا دیا تھا (اور یہ حالت اس حالت کا عکس العمل ہے)

یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ قیامت میں تمام لوگ "بینا" ہوں گے اور اُن سے یہ کہا جائے گا کہ اپنا نامۂ عمل پڑھو:

اقرأ کتابک ... (اسراء / ۱۴)

---

[1] معمائے ہستی، صفحہ ۵۱
[2] نورالثقلین، جلد ۳ صفحہ ۴۰۵

یا یہ کہ گنہگار جہنم کی آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے :

ورأی المجرمون النار ..... (کہف - ۵۳)

یہ تعبیرات کچھ لوگوں کے نابینا ہونے کے ساتھ کس طرح مطابقت رکھتی ہیں۔

بعض بزرگ مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ اس جہان کی وضع و کیفیّت اُس جہان سے مختلف ہے کتنے ہی ایسے افراد ہیں کہ جو بعض امور کو تو دیکھ سکتے ہیں اور بعض دوسرے امور کے لیے نابینا ہیں ۔ مرحوم طبرسی نے بعض مفسرین سے نقل کیا ہے :

" انھم اعمیٰ عن جھات الخیر لا یھتدی لشیئٍ منھا "

وہ اُن چیزوں کے لیے کہ جو خیر و سعادت اور نعمت ہیں، نابینا ہوں گے اور اُن چیزوں کے لیے کہ جو عذاب و شر اور حسرت و بدبختی کا سبب ہیں بینا ہوں گے۔

کیونکہ اُس جہان کا نظام اِس جہان کے نظام سے مختلف ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ بعض منازل و مواقف میں تو نابینا ہوں گے اور بعض میں بینا ہو جائیں گے ۔

ضمنی طور پر مجرمین کا دوسرے جہان میں فراموش کیا جانا یہ نہیں ہے کہ خدا انہیں بھول جائے گا بلکہ یہ بات واضح ہے کہ اس سے مراد ان کے ساتھ فراموشی والا معاملہ کرنا ہے جیسا کہ ہماری روزمرہ کی زبان میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے بے اعتنائی کرے تو وہ کہتا ہے کہ ہمیں کیوں بھلا دیا ہے؟

۳ ۔ **گناہ میں اسراف** : یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ نظر آیات میں یہ دردناک سزائیں اور عذاب ایسے افراد کے لیے ذکر ہوئے ہیں کہ جو اسراف کرتے ہیں اور خدا کی آیات پر ایمان نہیں لاتے ۔

یہاں " اسراف " کے ساتھ تعبیر ممکن ہے کہ اِس بات کی طرف اشارہ ہو کہ انہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمتوں مثلاً آنکھ، کان اور عقل کو غلط راستوں پر ڈال دیا ہے اور اسراف اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان نعمت کو فضول اور بیہودہ طور پر برباد کرے ۔

اور یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گنہگاروں کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ کے تو کچھ محدود گناہ ہیں اور ان کے دل میں خدا کا خوف بھی ہے یعنی انہوں نے اپنے پروردگار سے اپنا رابطہ بالکل منقطع نہیں کر لیا۔

اگر فرض کریں ایک شخص کوئی ظلم و ستم کرتا ہے مگر کسی یتیم و بے سہارا پر نہیں اور خود کو قصوروار بھی سمجھتا ہے اور بارگاہِ خدا میں اپنے آپ کو رُوسیاہ جانتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا آدمی بھی گنہگار ہے اور سزا کا مستحق ہے لیکن یہ ایسے شخص سے بہت مختلف ہے کہ جو بے حساب گناہ کرتا ہے، جو گناہ کے لیے کسی حد اور شرط کا قائل نہیں ہے اور بعض اوقات گناہ انجام دینے پر فخر کرتا ہے یا گناہ کو چھوٹا سمجھتا ہے کیونکہ پہلا گروہ ممکن ہے کہ آخرکار توبہ اور تلافی کے لیے تیار ہو جائے لیکن جو لوگ گناہ کرنے میں اسراف کرتے ہیں وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے ۔

۴ ۔ **" ھبوط " کیا ہے ؟** " ھبوط " لغت میں قہراً نیچے کی طرف آنے کے معنی میں ہے، مثلاً پتھر کا بلندی سے

گرنا۔ جس وقت یہ لفظ انسان کے بارے میں استعمال ہو تو سزا کے طور پر تنزل کی طرف راندہ درگاہ ہونے کے معنی دیتا ہے۔
اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آدم زمین پر ہی زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اور وہ جنت بھی اسی جہاں کا سرسبز و پرنعمت کوئی علاقہ تھا لہٰذا آدم کا ھبوط و نزول یہاں نزول مقامی کے معنی میں ہے نہ کہ نزول مکانی کے معنی میں۔
یعنی خدا نے ان کے مرتبہ و مقام کو ترکِ اُولیٰ کی وجہ سے تنزل کیا اور اُن سب جنتی نعمتوں سے محروم کر دیا اور اس جہان کے رنج و بلا میں گرفتار کر دیا۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہاں مخاطب کرنے کے لیے تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ "اھبطا" یعنی تم دونوں نیچے اُتر جاؤ۔ ممکن ہے اس سے مراد آدم و حوا ہوں اور اگر بعض دوسری آیات میں "اھبطوا" جمع کی صورت میں ذکر ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان بھی اس خطاب میں شریک تھا کیونکہ وہ بھی بہشت سے راندہ گیا تھا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مخاطب آدم اور شیطان ہوں کیونکہ اس کے بعد کے جملے میں قرآن کہتا ہے: "بعضکم لبعض عدو" (تم میں سے بعض دوسرے بعض کے دشمن ہوگے)

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "بعضکم لبعض عدو" سے مراد جو کہ جمع کی صورت میں خطاب ہے یہ ہے کہ ایک طرف سے آدم و حوا اور دوسری طرف سے شیطان کے درمیان عداوت پیدا ہو گئی یا ایک طرف سے آدم اور ان کی اولاد اور دوسری طرف سے شیطان اور اس کی ذریت کے درمیان دشمنی پیدا ہو گئی ہے۔

لیکن بہر حال "اما یأتینکم منی ھدی" (جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے) کے جملہ میں حتماً آدم و حوا کی اولاد ہی مخاطب ہے کیونکہ خدا کی ہدایت انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ باقی رہا شیطان اور اس کی ذریت تو چونکہ انہوں نے اپنا حساب کتاب خدائی ہدایت سے جدا کر لیا ہے۔ لہٰذا وہ اس خطاب میں شامل نہیں ہیں۔

۱۲۸۔ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۟

۱۲۹۔ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ۟

۱۳۰۔ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۟

ترجمہ

۱۲۸۔ کیا ان کی ہدایت کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے بہت سے گذشتہ لوگوں کو (کہ جنہوں نے سرکشی اور فساد کیا) ہلاک کر دیا اور یہ ان کے (ویران شدہ) مکانوں میں آتے جاتے ہیں۔ ان میں صاحبانِ عقل کے لیے واضح دلائل ہیں۔

۱۲۹۔ اور اگر تیرے پروردگار کی سنت و تقدیر اور مقررہ زمانے کا لحاظ نہ ہوتا تو عذابِ الٰہی بہت جلد انہیں دامن گیر ہو جاتا۔

۱۳۰۔ اس بنا پر جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کرو اور طلوعِ آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور اسی طرح اثنائے شب میں اور دن کے اطراف میں پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لاؤ تاکہ تم خوش رہو۔

تفسیر

گذشتگان کی تاریخ سے عبرت حاصل کرو:

چونکہ گذشتہ آیات میں مجرمین کے بارے میں بہت بحث ہو چکی ہے۔ لہٰذا پہلی زیر بحث آیت میں بیداری کے ایک بہترین اور مؤثر ترین طریقے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ۔ ارشاد ہوتا ہے:

کیا اُن کی ہدایت کے لیے یہی بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے بہت سی گذشتہ اقوام کو کہ جو گذشتہ زمانوں میں زندگی بسر کرتی تھیں ہلاک کر دیا۔ (افلم یھد لھم کم اھلکنا قبلھم من القرون)[۱]

وہی لوگ کہ جو خدا کے دردناک عذاب میں گرفتار ہوئے اور "یہ ان کے ویران شدہ گھروں میں آتے جاتے ہیں" (یمشون فی مساکنھم)۔

یہ اپنی آمد و رفت کے راستے میں (یمن کے سفر میں) قوم عاد کے گھروں سے (شام کے سفر میں) قوم ثمود کے مساکن سے اور (فلسطین کے سفر میں) قوم لوط کے زیر و زبر مکانوں سے گزرتے ہیں اور اُن کے آثار دیکھتے ہیں لیکن درسِ عبرت نہیں لیتے وہ ویرانیاں کہ جو اپنی زبان بے زبانی سے گذشتہ لوگوں کے دردناک قصّے بیان کر رہی ہیں اور آج کے لوگوں اور آنے والے لوگوں کو ان ہلاکت میں پڑنے والی نافرمان قوموں کی پیروی سے روکتی ہیں اور ان کو خبردار کر رہی ہیں ـــــ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں اور ظلم و کفر و فساد کے انجام کو بیان کر رہی ہیں۔

ہاں، ہاں! "ان میں صاحبانِ عقل کے لیے واضح دلائل اور بے شمار نشانیاں موجود ہیں" (ان فی ذٰلک لاٰیات لاولی النھٰی)[۲]۔

---

[۱] جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ "قرون" "قرن" کی جمع ہے جو ایسے لوگوں کے معنی میں ہے کہ جو ایک ہی زمانہ میں زندگی بسر کریں اور کبھی خود زمانہ کو بھی قرن کہا جاتا ہے (مقارنۃ کے مادہ سے)۔

[۲] "نُھٰی" "نُھیۃ" کی جمع ہے یہاں عقل کے معنی میں ہے کیونکہ عقل انسان کو بُرائیوں اور بدیوں سے منع کرتی ہے۔

گزشتہ لوگوں کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کا موضوع ان مسائل میں سے ایک ہے جو قرآن اور اسلامی احادیث میں بار بار آیا ہے اور حق بات یہ ہے کہ یہ ایک بیدار کرنے والا معلم ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو کسی بھی وعظ و نصیحت کی بات سے پند و نصیحت حاصل نہیں کرتے لیکن گزشتہ لوگوں کے آثارِ عبرت کے مناظر کا دیکھنا انہیں ہلا کر رکھ دیتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے راستوں کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ سے ایک حدیث میں منقول ہے:

"اغفل الناس من لم یتعظ بتغیر الدنیا من حال الیٰ حال":

لوگوں میں سے سب سے زیادہ غافل وہ شخص ہے کہ جو دنیا کے ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے اور متغیر ہونے سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اور رات اور دن کے بدلنے میں غور و فکر نہیں کرتا۔[1]

بعد والی آیت درحقیقت ایک سوال کا جواب ہے کہ جو یہاں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس پروگرام کو جو خدا نے گزشتہ زمانہ کے مجرمین کے لیے ترتیب دیا تھا، اس گروہ کے لیے کیوں ترتیب نہیں دیتا۔ قرآن کہتا ہے: اگر تیرے پروردگار کی سنّت اور تقدیر اور مقرر زمانہ نہ ہوتا، تو عذاب الٰہی جلد ہی انہیں دامن گیر ہو جاتا: (ولولا کلمة سبقت من ربك لكان لزاما واجل مسمّی)۔

سنّتِ الٰہی کہ جسے قرآن میں متعدد مواقع پر "کلمہ" کہا گیا ہے، یہ انسانوں کی آزادی کے بارے میں حکمِ فطرت اور فرمانِ آفرینش کی طرف ایک اشارہ ہے۔ کیونکہ اگر ہر مجرم کو فوراً ہی اور بغیر کسی قسم کی مہلت دیئے سزا دے دی جائے، تو ایمان اور عمل صالح، تقریباً اضطراری اور اجباری پہلو اختیار کر لیں گے اور زیادہ تر خوف اور سزا کی وحشت سے فوری طور پر انجام پا جائیں گے۔ اس بنا پر وہ حصولِ کمال اور ارتقاء کا ذریعہ ــ کہ جو ان کا اصل مقصد ہے ــ نہ ہوں گے۔

علاوہ ازیں اگر تمام مجرموں کو فوراً سزا دیئے جانے کا حکم ہو جائے تو پھر تو کوئی بھی روئے زمین پر زندہ نہ بچے گا:

ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترک علیھا من دابۃ (نحل-۶۱)

اس بنا پر ضروری ہے کہ کچھ مہلت ہو تا کہ گنہگار سوچ بچار کر لیں اور اصلاح کی راہ اختیار کریں اور راہِ حق کے تمام راہیوں کو خود سازی کے لیے کچھ مہلت بھی دے دی جائے۔

"اجل مسمّی" کی تعبیر جیسا کہ قرآن کی کچھ آیات سے معلوم ہوتا ہے، انسان کی زندگی کے ختم ہونے کے حتمی اور یقینی وقت کی طرف اشارہ ہے۔[2]

بہرحال بے ایمان ستمگروں اور جسارت کرنے والے مجرموں کو عذاب الٰہی کی تاخیر سے مغرور نہیں ہونا چاہیئے اور اس حقیقت

---

[1] سفینۃ البحار (مادہ عبر) جلد ۲، ص ۱۴۶۔

[2] مزید وضاحت کے لیے تیسری جلد سورہ انعام کی آیہ ۱، ۲ کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔ ترکیب نحوی کے لحاظ سے "اجل مسمّی" "کلمۃ" پر عطف ہے۔

کو بے پرواہی کے ساتھ نہیں دیکھنا چاہیئے کیونکہ یہ لطفِ خدا ، یہ سنّتِ الٰہی اور قانونِ تکامل و ارتقا ہے کہ جس نے میدان کو اُن کے لیے کھلا رکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد رُوئے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے ، اب جب کہ یہ بنا نہیں ہے کہ ان بدکاروں کو فوری طور پر سزا دی جائے ۔ تو تم ان کی باتوں پر جو وہ تمہیں کہتے ہیں صبر سے کام لو: (فاصبر علی ما یقولون) پیغمبر اکرمؐ کو رُوحانی طور پر تقویت پہنچانے اور ان کے دل کو تسلی دینے کے لیے انہیں خدا کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرنے اور نماز و تسبیح کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے : سُورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور اسی طرح رات کے درمیان اور دن کے اطراف میں اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لاؤ تاکہ تم راضی اور خوشنود رہو اور تمہارا دل ان کی دُکھ پہنچانے والی باتوں سے پریشان نہ ہو:

(وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن اٰناء الليل فسبح واطراف النهار لعلك ترضٰى)۔

اس میں شک نہیں کہ مشرکین کی بدگوئیوں اور ناروا باتوں پر صبر کرتے ہوئے یہ حمد و تسبیح شرک و بُت پرستی کے خلاف ایک مظاہرہ ہے۔

لیکن اس بارے میں کہ اس سے مراد مطلق حمد و تسبیح ہے یا یہ روزانہ کی مخصوص پنجگانہ نماز کی طرف اشارہ ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا نظریہ تو یہ ہے کہ ظاہرِ عبارت کو اس کے اسی وسیع معنی میں رہنے دیا جائے اور اس سے مطلق تسبیح و حمد کا استفادہ کرنا چاہیئے جبکہ دوسرا گروہ اسے نمازِ پنجگانہ کی طرف اشارہ سمجھتا ہے، اس ترتیب سے کہ:

"قبل طلوع الشمس" نمازِ صبح کی طرف اشارہ ہے۔

اور "قبل غروبها" نمازِ عصر کی طرف اشارہ ہے (یا نمازِ ظہر و عصر کی طرف کہ جن کا وقت غروب تک باقی رہتا ہے)

"من اٰناء الليل" نمازِ مغرب و عشا کی طرف اشارہ ہے (اور اسی طرح نمازِ شب کی طرف بھی)

لیکن "اطراف النهار" کی تعبیر نمازِ ظہر کی طرف اشارہ ہے کیونکہ "اطراف" "طرف" کی جمع ہے کہ جو جانب کے معنی میں ہے، اگر دن کو دو نصف حصّوں میں تقسیم کریں تو نمازِ ظہر دوسرے نصف کی ایک جانب یا طرف قرار پاتی ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اطراف النهار" مستحبی نمازوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں انسان دن کے مختلف اوقات میں انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ "اطراف النهار" یہاں پر "اٰناء الليل" کے مقابلہ میں ہے اور دن کے تمام اوقات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے (خصوصاً اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اطراف جمع کی شکل میں آیا ہے جب کہ دن میں دو سے زیادہ طرفیں نہیں ہوتیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ "اطراف" ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں دن کی مختلف ساعتیں شامل ہیں)۔

تیسرا احتمال بھی آیت کی تفسیر میں موجود ہے اور وہ یہ کہ یہ کچھ خاص اذکار کی طرف اشارہ ہے کہ جو اسلامی روایات میں ان مخصوص اوقات کے لیے وارد ہوئے ہیں مثلاً : اُوپر والی آیت کی تفسیر میں، امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا :

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے دس دس مرتبہ یہ ذکر پڑھے :

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریك له، له الملك وله الحمد یحیی ویمیت

وھو حیّ لا یموت بیدہ الخیر وھو علی کل شیٔ قدیر۔

لیکن بہرحال یہ تفسیریں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں، اور ممکن ہے کہ یہاں تسبیحات کی طرف بھی اشارہ ہو اور شب و روز کی واجب و مستحب نمازوں کی طرف بھی اشارہ ہو اور اس طرح سے وہ تضاد جو اس سلسلے میں روایات میں پایا جاتا ہے وہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ بعض روایات میں مخصوص اذکار کے ساتھ اور بعض میں نماز کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔

اِس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "لعلك ترضٰی" کا جملہ حقیقت میں پروردگار کی حمد و تسبیح نیز ان کی باتوں پر صبر و شکیبائی کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ حمد و تسبیح اور شب و روز کی نمازیں انسان کے خدا کے ساتھ رشتہ اور تعلق کو اِس طرح محکم کر دیتے ہیں کہ وہ اس کے علاوہ کسی چیز کی فکر اور خیال نہیں کرتا، سخت حادثات سے ہراساں نہیں ہوتا اور ایسی مضبوط پناہ گاہ کے ہوتے ہوئے کسی شے سے خوف نہیں کھاتا اور اس طرح سے آرام و سکون اور اطمینان اس کی رُوح پر چھا جاتے ہیں۔

اور "لعل" = "شاید" کی تعبیر ممکن ہے کہ اُسی مطلب کی طرف اشارہ ہو کہ جو ہم پہلے بھی اس لفظ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ "لعل" عام طور پر ایسے حالات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جو نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ مثلاً : نماز اور ذکرِ خدا ایسی شرائط اور حالات میں اس قسم کے سکون و آرام کا سبب بنتا ہے کہ جو حضور قلب اور کامل آداب کے ساتھ انجام پائے۔

ضمناً اگرچہ اس آیت میں مخاطب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں لیکن قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ حکم عمومی پہلو رکھتا ہے۔

۱۳۱۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ○

۱۳۲۔ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِٱلصَّلَوٰةِ وَٱصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَٱلْعَٰقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ○

۱۳۳۔ وَقَالُوا۟ لَوْلَا يَأْتِينَا بِـَٔايَةٍ مِّن رَّبِّهِۦٓ ۚ أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِى

الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝

۱۳۴۔ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ۝

۱۳۵۔ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ۝

ترجمہ

۱۳۱۔ وہ مادی نعمتیں جو ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو دے رکھی ہیں، تم ہرگز ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا۔ یہ دنیاوی زندگی کے شگوفے ہیں اور یہ اس لیے ہیں تاکہ ہم ان کے ذریعہ ان کی آزمائش کریں اور تیرے پروردگار کی روزی ہی بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔

۱۳۲۔ اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور تم بھی اس کی انجام دہی پر پابند رہو۔ ہم تم سے روزی نہیں چاہتے بلکہ ہم ہی تمہیں روزی عطا کرتے ہیں اور اچھا انجام تو تقویٰ کے لیے ہے۔

۱۳۳۔ (اور انہوں نے یہ) کہا کہ پیغمبر ہمارے لیے اپنے پروردگار کا کوئی معجزہ یا نشانی لے کر کیوں نہیں آتا (تم اُن سے یہ کہہ دو کہ) کیا گذشتہ قوموں کی واضح خبریں کہ جو گذشتہ آسمانی کتابوں میں تھیں، اُن کے لیے نہیں آئیں۔

۱۳۴۔ اگر ہم انہیں اس (قرآن کے نزول) سے پہلے عذاب کے ذریعے ہلاک کر دیتے (تو وہ قیامت میں کہتے پروردگارا! تو نے ہمارے لیے کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی تیری آیات کی پیروی کرتے۔

۱۳۵۔ تم کہہ دو (ہم اور تم) سب ہی انتظار میں ہیں (ہم تو تم پر کامیابی اور فتح کے وعدہ کی انتظار میں ہیں اور تم ہم سے شکست کے انتظار میں ہو)۔ جب یہ بات ہے تو انتظار کرو لیکن تم جلدی ہی جان لوگے کہ صراطِ مستقیم پر کون ہے اور کون ہدایت یافتہ ہے۔

تفسیر

ان آیات میں پیغمبر اکرمؐ کو کئی احکام دیئے گئے ہیں کہ جن سے حقیقت میں عام مسلمان مراد ہیں اور یہ اُس بحث کی تکمیل ہے کہ جو صبر و شکیبائی کے سلسلہ میں گذشتہ آیات میں شروع ہوئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ مادی نعمتیں جو ہم نے کفار و مخالفین کے مختلف گروہوں کو دے رکھی ہیں، تم ہرگز ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر

نہ دیکھنا۔ (ولا تمدن عینیك الی ما متعنا به ازواجا منهم)۔

ہاں " یہ ناپائیدار نعمتیں دنیاوی زندگی کے شگوفے ہیں " (زهرة الحیوة الدنیا)۔
ایسے شگوفے (اور پھول) کہ جو جلدی کھل جاتے ہیں اور (پھر) مُرجھا جاتے ہیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جاتے ہیں اور چند دِنوں سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے۔

اِس کے باوجود " یہ سب اِس لیے ہیں تاکہ ہم انہیں ان کے ذریعہ آزمائیں " (لنفتنهم فیه)۔
اور بہرحال " جو کچھ تیرے پروردگار نے تجھے روزی دے رکھی ہے وہ زیادہ بہتر اور پائیدار ہے " (ورزق ربك خیر وابقٰی)۔
خدا نے تجھے انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کی ہیں۔ ایمان و اسلام، قرآن و آیاتِ الٰہی، حلال و پاکیزہ روزی، اور آخر میں آخرت کی جاوداں اور دائمی نعمتیں۔ یہ پائیدار اور جاودانی رزق ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی رُوح کو خوش کرنے اور ان کے دل کو تقویت پہنچانے کے لیے فرمایا گیا ہے: اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس کے انجام دینے کے لیے پابندی کرو (وأمر اهلك بالصلوٰة واصطبر علیها)۔
کیونکہ یہ نماز تیرے لیے اور تیرے خاندان کے لیے دل کی پاکیزگی اور صفائی اور رُوح کی تقویت اور یادِ خدا کے دوام کا سبب ہے۔
اس میں شک نہیں کہ لفظ " اهل " کا ظاہر یہاں پیغمبر اکرمؐ کا بطورِ کلی خاندان ہے لیکن چونکہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے، لہٰذا اُس وقت اھل کا مصداق خدیجہ اور علی علیہ السلام ہی تھے اور ممکن ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے کچھ اور نزدیکیوں کے بارے میں بھی ہو، لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ خاندانِ پیغمبرؐ کا دامن بھی وسیع ہو گیا۔
اِس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ اگر نماز کا حکم تجھے اور تیرے خاندان کو دیا گیا ہے تو اس کے فائدے اور برکات بھی صرف تمہارے ہی لیے ہوں گے " ہم تجھ سے روزی نہیں چاہتے بلکہ ہم ہی تجھے روزی دیتے ہیں " (لا نسئلك رزقا نحن نرزقك)۔
یہ نماز پروردگار کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتی بلکہ تم انسانوں کے لیے سرمایہ تکامل و ارتقا اور تربیت کا اعلیٰ درجہ ہے۔
یا دوسرے لفظوں میں خدا بادشاہوں اور امراء کی طرح نہیں ہے کہ جو اپنی قوم اور رعایا سے باج و خراج لیا کرتے تھے اور اپنی اور اپنے مصاحبین کی زندگی کا نظام چلاتے تھے۔ خدا سب سے بے نیاز ہے اور سب اُسی کے نیازمند اور محتاج ہیں۔
درحقیقت یہ تعبیر اُسی چیز کے مشابہ ہے کہ جو سورہ ذاریات کی آیہ ۵۶ تا ۵۸ میں بیان ہوئی ہے:

وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون وما ارید منهم من رزق وما اریدان یطعمون ان الله هوالرزاق ذوالقوة المتین۔

میں نے جنّ و اِنس کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں، میں ان سے روزی کا طلب گار نہیں ہوں اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔ خدا ہی سب کو روزی دینے والا ہے اور مستحکم قدرت کا مالک ہے۔

اور اس طرح سے عبادات کا نتیجہ اور فائدہ براہِ راست عبادت کرنے والوں کو ہی پہنچ جاتا ہے اور آیت کے آخر میں مزید

فرمایا گیا ہے: عاقبت اور نیک انجام تو تقویٰ اور پرہیزگاری کے لیے ہی ہے (والعاقبة للتقویٰ)۔

جو چیز باقی رہنے والی ہے اور جس کا انجام مفید، تعمیری اور حیات بخش ہے، وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہی ہے۔ پرہیزگار ہی آخرکار کامیاب ہوں گے اور غیر متقی لوگ شکست کھائیں گے۔

اس جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا مقصد عبادات میں رُوح تقویٰ اور اخلاص کے لیے تاکید کرنا ہو۔ کیونکہ عبادات کی بنیاد یہی ہے۔ سُورۂ حج کی آیہ ۳۷ میں بیان ہوا ہے:

لن ینال اللّٰه لحومها ولا دماؤها ولٰکن یناله التقوٰی منکم

قربانی کے جانوروں کے گوشت اور خون خدا کو نہیں پہنچتے بلکہ تمہارا تقویٰ اس تک پہنچتا ہے۔

تمہارے اعمال میں سے جو کچھ اُس کے مقام قرب میں جا پہنچتا ہے وہ ان کا چمڑا اور ظاہری وجود بھی نہیں ہے بلکہ وہ اخلاص و رُوح اور سوچ کہ جو اُس میں کارفرما ہے، وہی اس کے مقام قرب تک پہنچتے ہیں۔

بعد والی آیت میں کفار کی ایک بہانہ جوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے کہا: پیغمبر! اپنے پروردگار کے پاس سے ہماری من پسند کا کوئی معجزہ کیوں نہیں لاتا: (وقالوا لولا یأتینا بایة من ربه)۔

فوراً ہی انہیں جواب دیا گیا ہے: کیا گذشتہ اقوام کی واضح خبریں کہ جو گذشتہ آسمانی کتابوں میں آئی تھیں، ان کے لیے نہیں آئیں (کہ جو پے درپے معجزات پیش کرنے کے لیے تقاضے اور عذر تراشیاں کرتے تھے اور معجزات دیکھنے کے بعد بھی اپنے کفر و انکار پر باقی رہتے تھے اور خدا کا شدید عذاب انہیں آپکڑتا تھا۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اگر یہ بھی اُسی راہ پر چلیں گے تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا) (اولم تأتهم بینة ما فی الصحف الاولیٰ)۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ "بینة" سے مراد خود قرآن ہے کہ جو گذشتہ آسمانی کتابوں کے حقائق کو اعلیٰ ترین معیار کے مطابق بیان کرنے والا ہے۔ زیر بحث آیت کہتی ہے: یہ معجزہ کیوں طلب کرتے ہیں اور بہانہ سازی کیوں کر رہے ہیں، کیا یہی قرآن، ان عظیم امتیازات اور خصوصیات کے ساتھ کہ جو گذشتہ آسمانی کتابوں کے حقائق کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، ان کے لیے کافی نہیں ہے۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے باوجود اس کے کہ کسی سے درس نہیں پڑھا تھا ایسی واضح، روشن اور آشکار کتاب لے کر آئے کہ آسمانی کتابوں کے متون میں جو کچھ تھا اُس کے ہم آہنگ ہے اور یہ بات خود اس کے اعجاز کی ایک نشانی ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہؐ کی صفات اور ان کی کتاب، ان نشانیوں کے ساتھ کہ جو پہلی آسمانی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں، کامل طور پر مطابقت رکھتی ہے اور یہ اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔[1]

❁ ❁ ❁

بہرحال یہ بہانہ سازی کرنے والے، حق طلب لوگ نہیں ہیں بلکہ یہ ہمیشہ نئی سے نئی بہانہ تراشی میں لگے رہتے ہیں یہاں تک کہ

---

[1] پہلی تفسیر "مجمع البیان" میں اور دوسری تفسیر "فی ظلال" میں اور تیسری تفسیر فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں بیان کی ہے۔ یہ تفاسیر اگرچہ مختلف ہیں، تاہم ان میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے، خصوصاً دوسری اور تیسری تفسیر میں۔

"اگر ہم اس قرآن کے نزول اور پیغمبر اسلام کے آنے سے پہلے، انہیں سزا دے کر ہلاک کر دیتے، تو وہ یہ کہتے کہ پروردگارا! تُونے ہمارے لیے کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے، اس سے پہلے کہ ہم ذلیل و رُسوا ہو جائیں"؛ : (ولو انا اهلكناهم بعذاب من قبله لقالوا ربنا لولا ارسلت الينا رسولاً فنتبع آياتك من قبل ان نذل ونخزی)۔

لیکن اب جبکہ یہ عظیم پیغمبر ایسی باعظمت کتاب لے کر ان کے پاس آیا ہے تو ہر روز نئی سے نئی بات کرتے ہیں اور حق سے فرار کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تراشتے رہتے ہیں۔

انہیں خبردار کر دو اور یہ "کہہ دو کہ ہم اور تم سب کے سب انتظار کر رہے ہیں": (قل كل متربص)۔ ہم تو تمہارے بارے میں خدائی وعدوں کے انتظار میں ہیں اور تم بھی اس انتظار میں ہو کہ مشکلات و مصائب ہمیں دامن گیر ہوں۔

"اب جب کہ یہ بات ہے تو انتظار کرو" (فتربصوا)۔

"لیکن تم بہت جلد جان لوگے کہ راہِ مستقیم اور دینِ حق پر کون لوگ ہیں اور حق کی منزل اور خدا کی جاوداں نعمت کی طرف ہدایت پانے والے کون ہیں": (فستعلمون من اصحاب الصراط السوی ومن اهتدی)۔

اور اس قاطع اور پُر معنی جملے کے ساتھ قرآن ہٹ دھرم اور بہانہ ساز منکرین سے اپنی گفتگو کو ختم کر دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ چونکہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی اور اس زمانے میں پیغمبر اکرمؐ اور مسلمان دشمنوں کی طرف سے سخت دباؤ میں تھے، خدا اس سورہ کے آخر میں ان کی دلجوئی کرتا ہے؛ کبھی کہتا ہے کہ ان کا مال و دولت اس جلدی گزر جانے والی دنیا کا سرمایہ ہے اور ان کی آزمائش اور امتحان کے لیے ہے، یہ تمہاری آنکھوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرے۔

اور کبھی نماز اور صبر و استقامت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ان کی معنوی قوت کو دشمنوں کی کثرت کے مقابلے میں تقویت دے۔

اور آخر میں مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے کہ اگر یہ گروہ ایمان نہ لائیں گے تو ان کا انجام بہت تاریک ہوگا کہ جس کے انتظار میں انہیں رہنا چاہیئے۔

پروردگارا! ہمیں ہدایت یافتہ اور صراطِ مستقیم پر چلنے والوں میں سے قرار دے۔

خداوندا! ہمیں وہ قدرت اور رُعب عطا فرما کہ (جس سے) نہ تو ہم دُشمنوں کی کثرت سے ڈریں اور نہ ہی سخت حوادث اور مشکلات سے ہراساں ہوں۔ ہٹ دھرمی اور بہانہ بازی کو ہم سے دُور رکھ اور ہمیں حق قبول کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

سورہ طٰہٰ کا اختتام
جمعرات ۲۰ جمادی الثانی (روزِ ولادت
باسعادت بانوئے اسلام فاطمہ زھراء
سلام اللہ علیہا)۔
سال ۱۴۰۱ھ قمری



سورۂ انبیاء

- مکہ میں نازل ہوئی
- اس کی ۱۱۲ آیات ہیں

سورۂ انبیاء کی فضیلت

پیغمبر اسلامؐ سے اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں منقول ہے:

من قرء سورة الانبیاء حاسبه الله حسابًا یسیرًا، وصافحه وسلم علیه کل نبی ذکر اسمه فی القرآن۔

جو شخص سورۂ انبیاء کو پڑھے گا، خدا اس کے حساب کو آسان کردے گا۔ (روزِ قیامت اس کے اعمال کا حساب لینے میں سخت گیری نہیں کرے گا) اور ہر وہ پیغمبر کہ جس کا نام قرآن میں ذکر ہوا ہے وہ اُس سے مصافحہ کرے گا اور اسے سلام کرے گا۔[1]

اور امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہے:

من قرء سورة الانبیاء حبًا لها کان کمن رافق النبیین اجمعین فی جنات النعیم، وکان مهیبًا فی اعین الناس حیاة الدنیا۔

جو شخص سُورۂ انبیاء کو عشق و محبت کے ساتھ پڑھے گا وہ جنت کے پُر نعمت باغوں میں تمام انبیاءؑ کا رفیق اور ہم نشین ہوگا اور دنیا کی زندگی میں بھی لوگوں کی نگاہ میں باوقار ہوگا۔[2]

لفظ "حبًا لها" (اس سورہ سے عشق و محبت رکھتے ہوئے) درحقیقت اِن روایات کے معنی کے سمجھنے کے لیے ایک کلید ہے مگر جو قرآن کی سورتوں کی فضیلتوں کے سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں یعنی صرف الفاظ کا پڑھ لینا ہی مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معانی و مطالب سے محبت کرنا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ معنی و مفہوم سے محبت عمل کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی، اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں فلاں سُورہ کا عاشق ہوں اور اس کا عمل اس کے مفاہیم کے خلاف ہو تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کتاب عقیدہ و عمل ہے اور اس کا پڑھنا مقدمہ اور تمہید ہے سمجھنے کے لیے اور سمجھنا مقدمہ ہے ایمان و عمل کے لیے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۴۱۲۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۴۱۲۔

اِس سُورہ کے مضامین

۱۔ یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، انبیاءؑ کی سورت ہے کیونکہ اس میں سولہ انبیاءؑ کے نام آئے ہیں بعض کے خاص خاص حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں اور بعض کا صرف ذکر ہے۔ اور وہ ہیں : موسٰی، ہارون، ابراہیم، لوط، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، اسمٰعیل، ادریس، ذاالکفل، ذاالنون (یونس) زکریا اور یحیٰی علیہم السلام۔

اس بناء پر اس سورہ کے اہم مباحث انبیاءؑ کے پروگراموں کے بارے میں ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ ایسے انبیاءؑ بھی ہیں کہ جن کے نام اس سورہ میں صراحت کے ساتھ نہیں لیے گئے لیکن ان کے بارے میں کچھ باتیں بیان ہوئی ہیں مثلاً پیغمبرِ اسلامؐ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام۔

۲۔ اس کے علاوہ مکی سورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ عقائدِ دینی خصوصاً مبداء و معاد کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں —— اس سورہ میں بھی یہ بات پوری طرح موجود ہے۔

۳۔ اس سورہ میں خالق کی وحدت اور یہ کہ اس کے سوا اور کوئی معبود اور پیدا کرنے والا نہیں ہے نیز عالم کی پیدائش، مقصد اور پروگرام کے مطابق ہونے اور اس جہان پر حاکم قوانین کی وحدت اور اسی طرح حیات و ہستی کے سرچشمہ کی وحدت نیز موجودات کی فنا اور موت کے پروگرام میں وحدت کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔

۴۔ اس سورہ کے ایک حصہ میں حق کی باطل پر، توحید کی شرک پر، عدل و انصاف کے لشکر کی جنودِ ابلیس پر کامیابی و کامرانی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

۵۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہ سورہ غافل اور بے خبر لوگوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کرتے ہوئے حساب و کتاب سے شروع ہوتا ہے اور اس کے اختتام میں بھی اسی سلسلہ کی دوسری تنبیہیں ہیں۔

وہ انبیاءؑ کہ جن کے نام اس سورہ میں آئے ہیں ان میں سے بعض کی زندگی کا بیان اور ان کے تفصیلی پروگرام دوسری سورتوں میں ذکر ہوئے ہیں لیکن اس سورہ میں زیادہ تر انبیاءؑ کے حالات کے اس حصہ کا ذکر ہے کہ وہ جس وقت سخت قسم کی تنگی میں گرفتار ہوتے تھے تو وہ حق تعالٰی کے دامنِ لطف کی طرف کس طرح سے دستِ توسل پھیلاتے تھے اور کس طرح سے خدا ان کے لیے بند دروازے کھول دیتا تھا اور طوفان و گرداب سے انہیں نجات بخشتا تھا۔

ابراہیمؑ جب نمرود کی آگ میں گرفتار ہوئے۔

یونسؑ جب مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔

زکریاؑ نے جب اپنی عمر کے آفتاب کو غروب ہونے کے قریب دیکھا لیکن ان کا کوئی جانشین نہیں تھا کہ جو ان کے پروگراموں کی تکمیل کرے۔

اور اسی طرح باقی انبیاءؑ جب وہ سخت مشکلات میں گھرے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِیۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝

۲۔ مَا یَاۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡهُ وَهُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ۝

۳۔ لَاهِیَةً قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجۡوَی ٭ۖ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ٭ۖ هَلۡ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ۝

۴۔ قٰلَ رَبِّیۡ یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِی السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ۫ وَهُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ۝

۵۔ بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۭ بَلِ افۡتَرٰىهُ بَلۡ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلۡیَاۡتِنَا بِاٰیَةٍ كَمَاۤ اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ لوگوں کا حساب کتاب ان کے نزدیک آچکا ہے لیکن وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

۲۔ جو کوئی بھی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس آتی ہے وہ اسے کھیل سمجھتے ہیں اور مذاق اُڑانے کے انداز میں اُسے سنتے ہیں۔

۳۔ (حالت یہ ہے کہ) ان کے دل کھیل اور بے خبری میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ ظالم چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کیا اس کے سوا کچھ اور بات ہے کہ یہ تم ہی جیسا ایک بشر ہے؟ کیا تم دیکھتے بھالتے جادو کے پاس جاتے ہو؟

۴۔ (لیکن پیغمبر نے) کہا: میرا پروردگار آسمان اور زمین کی ہر بات جانتا ہے اور وہ (بڑا) سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۵۔ انہوں نے کہا (جو کچھ محمدؐ لایا ہے یہ وحی نہیں ہے بلکہ) یہ پریشان خواب و خیال ہیں بلکہ اُس نے دل سے جھوٹ گھڑ کے خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بلکہ وہ ایک شاعر ہے۔ (اگر وہ سچا ہے) تو ہمارے لیے ایسا ہی ایک معجزہ لائے

جیسے معجزے پہلے انبیاء کو دے کر بھیجا گیا تھا۔

تفسیر

طرح طرح کے بہانے :

یہ سورہ ـــ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے ـــ تمام لوگوں کے لیے ایک سخت تنبیہ کے ساتھ شروع ہوتی ہے، ایک ہلا دینے والی اور بیدار کن تنبیہ ـــ فرمایا گیا ہے : لوگوں کا حساب ان کے قریب آپہنچا ہے ، حالانکہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور منہ موڑے ہوئے ہیں (اقترب للناس حسابھم وھم فی غفلۃ معرضون)۔

ان کا عمل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس غفلت اور بے خبری نے ان کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے ورنہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ انسان حساب کے نزدیک ہونے پر ایمان رکھتا ہو ـــ وہ بھی انتہائی دقیق حساب ـــ اور پھر وہ تمام مسائل کو معمولی سمجھے اور ہر قسم کے گناہ میں آلودہ ہو۔

لفظ " اقترب " میں " قرب " کی نسبت کہیں زیادہ تاکید پائی جاتی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حساب بہت ہی نزدیک آگیا ہے۔

" ناس " کی تعبیر اگرچہ ظاہری طور پر عام لوگوں کے لیے آئی ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ سب کے سب غفلت میں ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ جب بھی عمومی بات ہوگی تو اس میں استثناء بھی ہوگا۔ اور یہاں ایسے بیدار دل لوگوں کو کہ جو ہمیشہ حساب کی فکر میں رہتے ہیں اور اس کے لیے آمادہ و تیار رہتے ہیں، اس حکم سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ حساب لوگوں کے نزدیک ہو رہا ہے، نہ کہ لوگ حساب کے۔ گویا حساب تیزی کے ساتھ لوگوں کی طرف دوڑ رہا ہے۔

ضمنی طور پر " غفلت " اور " اعراض " کے درمیان فرق ، ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ وہ حساب کے نزدیک ہونے سے غافل ہیں اور یہ غفلت اس بات کا سبب بنتی ہے ، کہ وہ حق کی آیات سے رُوگردانی کریں۔ درحقیقت " حساب سے غفلت " علت ہے اور " آیاتِ حق سے اعراض " اس کا معلول ہے یا اس عظیم عدالت میں جواب دینے کے لیے آمادگی سے اور خود حساب سے اعراض مراد ہے یعنی چونکہ غافل ہیں لہٰذا اپنے آپ کو حساب کے لیے آمادہ نہیں کرتے اور رُوگردانی کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حساب کا نزدیک ہونا اور قیامت کس معنی میں ہے ؟

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ باقی ماندہ دنیا گزشتہ کے مقابلہ میں کم ہے۔ تو اس بناء پر قیامت نزدیک ہوگی یعنی گزشتہ کی نسبت نزدیک خاص طور پر جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

بعثت انا والساعۃ کھاتین

میری بعثت اور قیامت ان دونوں (انگلیوں) کی طرح ہے (شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو ایک

دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔[1]

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ یہ تعبیر قیامت کے (حتمی طور پر واقع) ہونے کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ عربوں کی مشہور ضرب المثل میں کہا جاتا ہے کہ:

کل ما ھو اٰت قریب

جو چیز قطعی و یقینی طور پر آکر رہے گی، وہ قریب ہے۔

اس کے باوجود یہ دونوں تفسیریں آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے دونوں نکات کی طرف اشارہ ہو۔

بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں "حساب" "قیامتِ صغریٰ" یعنی موت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ موت کے وقت بھی کچھ نہ کچھ محاسبہ ہوتا ہے اور انسان کو اس کے اعمال کا کچھ بدلہ دیا جاتا ہے۔[2]

لیکن زیر بحث آیت ظاہراً قیامتِ کبریٰ کی طرف راجع نظر آتی ہے۔

بعد والی آیت ان کے اعراض اور روگردانیوں کی ایک نشانی کو اس صورت میں بیان کرتی ہے: اُن کے ربّ کی جو بھی کوئی نئی نصیحت اور یاد دہانی ان کے پاس آتی ہے، وہ اُسے کھیل اور مذاق کے مُوڈ میں سنتے ہیں: (ما یاتیھم من ذکر من ربھم محدث الا استمعوہ وھم یلعبون)۔

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی سورہ یا آیت — اور پروردگار کی طرف سے کسی بھی بیدار کرنے والی بات پر سنجیدگی سے سوچیں اور کچھ دیر اس پر غور و فکر کریں اور کم از کم یہ احتمال ہی کرلیں کہ یہ بات ان کی زندگی اور مستقبل پر اثر کرنے والی ہوگی۔ وہ نہ تو خدا کی طرف سے حساب کے لیے جانے کی فکر کرتے ہیں اور نہ ہی پروردگار کی تنبیہوں کی۔

اصولی طور پر جاہل، متکبر اور خود غرض لوگوں کی ایک بدبختی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ خیر خواہی کرنے والوں کی پند و نصائح کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہی بات اس کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ ہرگز خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوں جبکہ ایک مرتبہ بھی وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں تو ہوسکتا ہے کہ ان کی زندگی کا راستہ اسی لیے تبدیل ہو جائے۔

زیرِ غور آیت میں لفظ "ذکر" ہر بیدار کرنے والی بات کی طرف اشارہ ہے اور "محدث" (نیا اور جدید) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمانی کتابیں یکے بعد دیگرے نازل ہوتی ہیں اور قرآنی سورتیں اور اس کی آیتیں، ہر ایک تازہ بہ تازہ اور نئے نئے مفاہیم و مضامین لیے ہوئے ہوتی ہیں کہ جو مختلف اثرانگیز طریقوں سے غافلوں کو بیدار کرتی ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے کیا فائدہ کہ جو ان سب کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

گویا وہ نئی چیزوں سے وحشت رکھتے ہیں۔ وہ انہی قدیم خرافات پر کہ جو انہیں اپنے بڑوں سے ورثہ میں ملی ہیں، خوش ہیں، گویا انہوں نے ہمیشہ کے لیے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ ہر نئی حقیقت کی مخالفت کریں گے۔ جبکہ قانونِ ارتقاء کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انسان کو ہر روز تازہ بہ تازہ اور نئے سے نئے مسائل کا سامنا ہو۔

---

[1] مجمع البیان آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

[2] تفسیر قرطبی، جلد ۶، صفحہ ۴۳۰۔

پھر مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے : وہ ایسی حالت میں ہیں کہ ان کے دل لہو و لعب اور بے خبری میں ڈوبے ہوئے ہیں ؛ (لاهية قلوبهم)۔

کیونکہ وہ تمام محکم اور سنجیدہ مسائل کو ظاہری لحاظ سے شوخی اور لہو و لعب سمجھتے ہیں۔

(جیسا کہ لفظ "یلعبون" فعل مضارع اور مطلق صورت میں، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے) اور باطنی لحاظ سے غفلت میں ڈالنے والے فضول مسائل کے ساتھ لہو و لعب اور فکری مشغولیت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اور یہ امر فطری اور طبیعی ہے کہ ایسے افراد ہرگز راہ سعادت نہیں پاسکتے۔

اس کے بعد ان کے شیطانی منصوبوں کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

یہ ظالم سازش پر مبنی اپنی سرگوشیاں چھپاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تم ہی جیسا ایک عام بشر ہے : (واسروا النجوی الذین ظلموا هل هذا الا بشر مثلكم)۔[1]

جبکہ وہ ایک عام بشر سے زیادہ نہیں ہے، تو لازماً اس کے یہ خارق عادت کام اور اس کی بات کی اثر پذیری جادو کے سوا کچھ نہیں" تو کیا تم جادو کے پیچھے جاتے ہو، حالانکہ تم (یہ سب کچھ) دیکھ رہے ہو" (افتاتون السحر وانتم تبصرون)۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت دشمنان اسلام بہت طاقتور تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنی باتوں کو چھپائیں، یہاں تک کہ اپنی سرگوشیوں کو بھی (اس بات پر توجہ رہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ اپنی سرگوشیوں کو مخفی رکھتے تھے)۔

ممکن ہے یہ اس بنا پر ہو کہ وہ ان مسائل میں کہ جو کسی سازش اور منصوبہ بندی کا پہلو رکھتے تھے، مشورہ کرتے ہوں تاکہ عام لوگوں کے سامنے ایک ہی منصوبہ کے ماتحت پیغمبر اکرمؐ کا مقابلہ کریں۔

علاوہ ازیں وہ قدرت و طاقت کے لحاظ سے تو مسلط آگئے تھے لیکن منطق اور نفوذ کلام کی قدرت کے لحاظ سے پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔ اور یہی برتری اس بات کا سبب بنتی تھی کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کے مقابلہ کے لیے جعلی باتیں گھڑتے ہمل بیٹھ کر خفیہ مشورے کرتے تھے۔

بہر حال وہ اپنی اس گفتگو میں دو چیزوں کا سہارا لیتے تھے۔ ایک رسول اللہؐ کا بشر ہونا اور دوسرے ان کی طرف جادو کی نسبت دینا۔ اور بعد کی آیات میں جو اور چیزیں انہوں نے غلط منسوب کیں ان کا ذکر بھی آئے گا۔ قرآن ان کا بھی جواب دیتا ہے۔

٭ ٭ ٭

لیکن پہلے قرآن کلی صورت میں رسول اکرمؐ کی زبان سے اس طرح جواب دیتا ہے :

میرا پروردگار ہر بات کو جانتا ہے چاہے وہ آسمان میں ہو یا زمین میں (قال ربی یعلم القول فی السماء والارض)۔

---

[1] عربی ادب میں معمول ہے کہ اگر فاعل اسم ظاہر ہو تو فعل مفرد لایا جاتا ہے لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض اوقات خاص علل و اسباب کی بنا پر فعل کو جمع کی شکل میں اور فاعل کو اسم ظاہر لاتے ہیں۔ " واسروا النجوی الذین ظلموا " کا جملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔

یہ تصور نہ کرنا کہ تمہاری مخفی باتیں اور پوشیدہ سازشیں اُس پر مخفی ہیں۔ کیونکہ "وہ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے" (وھو السمیع العلیم)۔

وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے اور تمام کاموں سے باخبر ہے۔ نہ صرف وہ باتوں کو سُنتا ہے بلکہ وہ ان خیالات و تصورات کو بھی جو ان کے ذہنوں میں گزرتے ہیں اور ان ارادوں کو بھی کہ جو ان کے سینوں میں چھپے ہوئے ہیں، جانتا ہے۔

٭ ٭ ٭

مخالفین کی بہانہ بازیوں کی دو قسموں کا بیان کرنے کے بعد، ان بہانہ بازیوں کی دوسری چار قسموں کا ذکر شروع کرتے ہوئے قرآن اس طرح کہتا ہے: انہوں نے کہا کہ پیغمبر جو کچھ وحی کے عنوان سے لایا ہے، یہ پریشان خوابوں اور پراگندہ خیالوں کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جنہیں وہ حقیقت اور واقعیت سمجھ بیٹھا ہے: (بل قالوا اضغاث احلام)[1]۔

اور کبھی اپنی اس بات کو بدل کر کہتے ہیں کہ: "وہ جھوٹا آدمی ہے اور اس نے خدا سے یہ باتیں جھوٹ منسوب کی ہیں (بل افتراہ)۔

اور کبھی کہتے ہیں کہ: "نہیں وہ تو ایک شاعر ہے" اور یہ باتیں اس کے شاعرانہ تخیلات کا مجموعہ ہیں (بل ھو شاعر)۔

اور آخری مرحلہ میں کہتے ہیں کہ اگر ہم ان تمام باتوں کو چھوڑ دیں پھر بھی، اگر وہ سچ کہتا ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا (رسول) ہے تو ہمارے لیے کوئی معجزہ لے کر آئے جیساکہ گزشتہ انبیاء معجزات کے ساتھ بھیجے گئے تھے" (فلیأتنا بآیۃ کما ارسل الاولون)۔

رسول اللہؐ کی طرف ان چیزوں کی نسبت، جو ایک دوسرے کی نقیض اور ضد ہیں، کا مطالعہ اور تحقیق خود اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ وہ لوگ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی نہیں تھے بلکہ ان کا مقصد بہانہ جوئی اور حریف کو ہر قیمت اور ہر صورت میں میدان سے باہر نکالنا تھا۔

کبھی جادوگر کہتے، کبھی شاعر، کبھی مفتری اور کبھی (معاذ اللہ) خیالی دنیا میں بسنے والا ایک شخص کہ جو اپنے خواب پریشان کو وحی کہنے لگا ہے۔

اگر ہمارے پاس ان کی باتوں کو باطل کرنے کے لیے، ان کی اِدھر اُدھر کی ان منتشر باتوں کے علاوہ اور کوئی بھی دلیل نہ ہوتی، تو ان کے باطل ہونے کے لیے یہی کافی تھیں لیکن بعد کی آیات میں ہم دیکھیں گے کہ قرآن دوسرے طریقوں سے بھی انہیں قاطع جواب دیتا ہے۔

ایک نکتہ:

کیا قرآن حادث ہے؟ بعض مفسرین نے ان آیات کے ذیل میں لفظ "محدث" کی مناسبت سے کہ جو دوسری زیر بحث آیت میں ہے "کلام اللہ" کے حادث یا قدیم ہونے کے بارے میں بہت بحث کی ہے۔ یہ وہی مسئلہ ہے کہ

---

[1] "اضغاث": جمع "ضغث" (بروزن "حرص") خشک لکڑیوں یا گھاس وغیرہ کے گٹھے کے معنی میں ہے۔

"احلام" جمع ہے "حلم" کی (بروزن "نہم") خواب اور رؤیا کے معنی میں اور چونکہ لکڑی وغیرہ کے گٹھوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بکھری ہوئی چیزوں کو ایک دوسرے کے اُوپر رکھتے ہیں اس لیے اس تعبیر کا خواب پریشان پر بھی اطلاق ہوا ہے۔

جو خلفاء بنی عباس کے زمانہ میں سالہا سال تک بحث و تنقید کا موضوع بنا رہا اور جس نے ایک طویل مدت تک بہت سے علماء کو اُلجھائے رکھا۔

لیکن ہم موجودہ زمانہ میں اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ بحث زیادہ تر سیاسی پہلو رکھتی تھی۔ حکمران چاہتے تھے کہ علمائے اسلام کو آپس میں اُلجھائے رکھیں اور اصولی اور بنیادی مسائل کہ جو وضع حکومت اور لوگوں کے طرزِ زندگی اور اسلام کے اصلی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں سے توجہ ہٹائے رکھیں۔

موجودہ زمانے میں ہمارے لیے یہ بات پورے طور پر واضح ہے کہ اگر "کلام اللہ" سے مراد اس کا معنی و مفہوم ہے، تو وہ قطعی طور پر قدیم ہے یعنی ہمیشہ وہ علم خدا تھا اور خدا کا علم ہمیشہ سے اس پر محیط ہے۔

اور اگر اس سے مراد یہ الفاظ اور یہ کلمات اور یہ وحی ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئی، تو وہ بلاشک وشبہ "حادث" ہے۔ کون عاقل یہ کہتا ہے کہ الفاظ و کلمات ازلی ہیں، یا پیغمبر پر وحی کا نزول دورِ بعثت کے آغاز سے نہیں ہوا؛ لہٰذا آپ ملاحظہ کریں گے کہ ہم بحث کو جس طرف سے بھی لیں مسئلہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔

دوسرے الفاظ میں قرآن الفاظ بھی رکھتا ہے اور معانی بھی۔ اس کے الفاظ قطعاً و یقیناً "حادث" ہیں اور اس کے معانی قطعاً یقیناً "قدیم" ہیں۔ لہٰذا کھینچا تانی اور بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور پھر یہ بحث اسلامی معاشرے کی کونسی علمی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی مشکل کو حل کرتی ہے۔ حیرت ہے کہ بعض گزشتہ علمائے مکار اور سازشی حکام اور بادشاہوں کی فریب کاریوں سے دھوکا کیوں کھایا۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ بعض آئمہ اہل بیتؑ نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے واضح اور عملی طور پر انہیں خبردار کیا ہے کہ وہ اس قسم کی بحثوں سے پرہیز کریں [1]

۶۔ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝

۷۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

۸۔ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝

۹۔ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَ

---

[1] نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۴۱۲۔ بحوالہ احتجاج طبرسی

اَهۡلَكۡنَا الۡمُسۡرِفِيۡنَ ۝

۱۰۔ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ كِتٰبًا فِيۡهِ ذِكۡرُكُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝

ترجمہ

۶۔ تمام آبادیاں کہ جنہیں ہم نے اُن سے پہلے ہلاک کیا (اُنہوں نے بھی طرح طرح کے معجزات کا تقاضا کیا تھا اور ان کے مطالبات کے مطابق معجزات دکھا دیئے گئے تھے لیکن) وہ ہرگز ایمان نہ لائے، تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے؟

۷۔ ہم نے تجھ سے پہلے (بھی) مرد ہی بھیجے کہ جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے۔ (وہ سب کے سب انسان ہی تھے اور نوع بشر میں سے تھے) اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھ لو۔

۸۔ ہم نے انہیں ایسے جسم نہ دیئے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ عمر جاوداں رکھتے تھے۔

۹۔ اس کے بعد جو وعدہ ہم نے اُن سے کیا تھا اس کی ہم نے وفا کی اُنہیں اور جس جس کو ہم چاہتے تھے (ان کے دشمنوں کے چنگل سے) نجات دی اور زیادتی کرنے والے کو ہم نے ہلاک کر دیا۔

۱۰۔ ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جس میں تمہارے لیے نصیحت (اور بیداری) کا وسیلہ موجود ہے۔ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔

تفسیر

تمام پیغمبر نوع بشر میں سے تھے:

گزشتہ آیات میں دشمنانِ اسلام کی طرف سے ایسے چھ اعتراضات کا ذکر تھا کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ زیر بحث آیات انہیں کا جواب دے رہی ہیں۔ ان میں کبھی کلی صورت میں اور کبھی کسی خاص مسئلے کے اعتبار سے جواب دیا گیا ہے۔

پہلی زیر بحث آیت ان کے من پسند معجزات[1] طلب کرنے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اور کہتی ہے: تمام شہر اور آبادیاں کہ جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے، انہوں نے بھی اسی قسم کے معجزات کا تقاضا کیا تھا لیکن جب ان کے مطالبات پورے کر دیئے گئے تو وہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے (ما اٰمنت قبلھم من قریة اھلکنا ھا افھم یؤمنون)۔

اس ضمن میں انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ اگر اقتراحی معجزات کے سلسلے میں تمہارے تقاضے کو پورا کر دیا جائے اور پھر بھی تم ایمان نہ لاؤ، تو تمہاری تباہی و نابودی حتمی و یقینی ہو جائے گی۔

---

[1] من پسند کے معجزات کو اصطلاح میں "اقتراحی معجزات" کہتے ہیں۔ ان معجزات کا تقاضا درحقیقت بہانہ سازی کے طور پر تھا۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ قرآن اس آیت میں ان کے تمام ایسے اعتراضات کی طرف کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں، اشارہ کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ : سچے پیغمبروں کی دعوت کے سلسلے میں اس طرح کی تکرار کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہٹ دھرم اور ضدی افراد ہمیشہ ہی اسی قسم کے بہانوں کو وسیلہ بنایا کرتے تھے اور آخر کار ان کا انجام بھی سوائے کفر کے اور اس کے بعد ان کی ہلاکت اور دردناک عذاب الٰہی کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت ان کے سب سے پہلے اعتراض کا خصوصیت سے جواب دے رہی ہے، یہ اعتراض پیغمبر کے بشر ہونے کے سلسلے میں تھا۔ آیت کہتی ہے تو ہی نہیں کہ جو پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی ہے بلکہ تمام کے تمام پیغمبر جو تجھ سے پہلے آئے ہیں وہ سب کے سب مرد ہی تو تھے کہ جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے (وما ارسلنا قبلك الا رجالاً نوحی الیهم)۔
یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ جسے سب لوگ جانتے ہیں اور اس سے آگاہ ہیں" اور اگر تم نہیں جانتے، تو جو آگاہ ہیں اُن سے پوچھ لو" (فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون)۔

٭ ٭ ٭

اہلِ ذکر کون ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ "اہل ذکر" لغوی مفہوم کے لحاظ سے تمام آگاہ اور باخبر افراد کے لیے بولا جاتا ہے اور زیرِ نظر آیت " جاہل کے عالم کی طرف رجوع کرنے " کے ایک کلی عقلی قانون کو بیان کر رہی ہے۔ اگرچہ موقع کے لحاظ سے آیت کا مصداق علماء اہل کتاب ہی تھے، لیکن یہ بات قانون کی کلیت میں مانع نہیں ہے۔
اسی بناء پر علماء اور فقہائے اسلام نے اس آیت سے " مجتہدینِ اسلام کی تقلید کرنے کے جواز کے " مسئلہ میں استدلال کیا ہے۔
اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُن روایات میں، کہ جو اہلِ بیت ؑ کی طرف سے ہم تک پہنچی ہیں، اہلِ ذکر کی علی علیہ السلام یا تمام آئمہ اہلبیت ؑ سے تفسیر کی گئی ہے تو یہ منحصر ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس قانون کلی کے واضح ترین مصادیق کا بیان ہے۔
اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے سورۂ نحل کی آیہ ۴۳ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت انبیاء کے بشر ہونے کے سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے : ہم نے پیغمبروں کو ایسے جسم نہیں دیئے تھے کہ جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ ہرگز عمرِ جاوداں بھی نہیں رکھتے تھے۔ (وما جعلناهم جسدًا لا یأکلون الطعام وما کانوا خالدین)۔
" لا یأکلون الطعام " کا جملہ اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ جو قرآن میں دوسرے مقام پر اسی اعتراض کے سلسلے میں آئی ہے :

" وقالوا مال هذا الرسول یأکل الطعام و یمشی فی الاسواق

انہوں نے کہا یہ پیغمبر کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازاروں میں کیوں چلتا پھرتا ہے۔ (فرقان۔ ۷)

" ماکانوا خالدین " کا جملہ بھی اسی معنی کی ایک تکمیل ہے۔ کیونکہ مشرکین یہ کہتے تھے کہ بشر کی بجائے اگر چہ فرشتہ بھیجا جاتا تو اچھا تھا۔ ایسا فرشتہ جو عمر جاودانی رکھتا ہوتا اور اسے موت نہ آتی۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: گزشتہ انبیاء میں سے کوئی بھی عمر جاودانی نہیں رکھتا تھا کہ پیغمبر اسلام کے بارے میں یہ بات کی جائے۔

بہرحال جیسا کہ ہم نے بارہا بیان کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانوں کے رہبر کو انہیں کی نوع میں سے ہونا چاہیئے، ان ہی اغراض، احساسات، جذبات، احتیاجات اور علائق کے ساتھ تاکہ وہ ان کے درد اور تکالیف کو محسوس کرے۔ اور علاج کا بہترین طریقہ اپنی تعلیمات کے ذریعے پیش کرے تاکہ وہ تمام انسانوں کے لیے نمونہ اور ایک اسوہ بنے اور سب پر حجت تمام کرے۔

اس کے بعد سخت اور ہٹ دھرم منکرین کو تنبیہ اور خبردار کرنے کے عنوان سے قرآن اس طرح کہتا ہے: ہم نے اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا تھا کہ ہم انہیں دشمنوں کے چنگل سے رہائی بخشیں گے اور ان کے دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں گے۔ ہاں! آخرکار ہم نے اپنے اس وعدہ کو پورا کیا اور ان کی صداقت کو آشکار کیا انہیں اور ان تمام لوگوں کو کہ جنہیں ہم چاہتے تھے نجات دی اور زیادتی کرنے والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا: (ثم صدقناهم الوعد فانجيناهم ومن نشآء واهلكنا المسرفين)۔

ہاں! جس طرح افرادِ بشر میں سے رہبرانِ بشر کو منتخب کرنا ہماری سنت تھی، یہ بھی ہماری سنت تھی ——————— کہ ہم مخالفین کی سازشوں کے مقابلہ میں ان کی حمایت کریں اور اگر پے در پے پند و نصائح ان پر اثرانداز نہ ہوں تو صفحۂ زمین کو ان کے وجود کی گندگی سے پاک کر دیں۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ " ومن نشاء " (اور جسے ہم چاہیں) سے مراد ایسا چاہنا ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح کے معیار پر پورا اترے اور یہ بھی واضح ہے کہ " مسرفین " سے یہاں ایسے لوگ مراد ہیں کہ جنہوں نے اپنے بارے میں اور اس معاشرے کے بارے میں کہ جس میں وہ زندگی بسر کرتے تھے، اسراف کیا ہے، آیاتِ خداوندی کا انکار کر کے اور پیغمبروں کو جھٹلا کر۔

اس لیے قرآن میں ایک دوسری جگہ پر بیان ہوا ہے کہ:

كذالك حقًا علينا ننجي المؤمنين

اسی طرح سے ہم پر حق اور ضروری تھا کہ ہم مومنین کو نجات دیں۔ (یونس۔ ۱۰۳)

آخری زیر بحث آیت میں ایک مختصر اور پُرمعنی جملے میں مشرکین کے اکثر اعتراضات کا نئے سرے سے جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جس میں تمہاری بیداری کا وسیلہ موجود ہے کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے: (ولقد انزلنا اليكم كتابا فيه ذكركم افلا تعقلون)۔

جو شخص اس کتاب کی آیات کا مطالعہ کرے کہ جو معاشرے کے لیے تذکر اور دل کی بیداری اور فکر و نظر کے تحرک اور پاکیزگی کا موجب ہیں، تو وہ اچھی طرح سے جان لے گا کہ یہ ایک واضح اور جاودانی معجزہ ہے۔ اس آشکار معجزے کے ہوتے ہوئے کہ جس میں مختلف جہات سے اعجاز کے آثار نمایاں ہیں۔ (انتہائی زیادہ قوتِ جاذبہ کی جہت سے، مضامین کی جہت سے، احکام و قوانین

کی جہت سے اور عقائد و معارف وغیرہ کی جہت سے) کیا پھر بھی کسی دوسرے معجزے کی انتظار میں ہو؟ اس سے بہتر اور کونسا معجزہ پیغمبر اسلام کی دعوت کی حقانیت کو ثابت کر سکتا ہے؟

اس سے قطع نظر اس کتاب کی آیات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ جادو نہیں ہے، حقیقت و واقعیت ہے اور اس کی تعلیمات جاذب و پُر معنی ہیں۔ کیا پھر بھی یہی کہتے ہو کہ یہ جادو ہے؟

کیا ان آیات کی طرف "اضغاث احلام" کی نسبت دی جا سکتی ہے؟ بے معنی اور پریشان خواب کہاں اور یہ موزوں اور ایک دوسرے سے مربوط باتیں کہاں؟

کیا اسے جھوٹ اور افترا شمار کیا جا سکتا ہے؟ جب کہ سچائی کے آثار اس کے ہر مقام سے نمایاں ہیں۔

اور کیا اسے لانے والا شاعر ہو سکتا ہے جبکہ شعر تخیل کے محور کے گرد چکر لگاتا ہے اور اس کتاب کی تمام آیات حقیقتوں پر مبنی ہیں مختصر یہ کہ اس کتاب میں غور و فکر کرنے اور اس کا مطالعہ کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ نسبتیں کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں ایسے پیوند ہیں کہ جو ہم رنگ نہیں ہیں اور ایسی باتیں ہیں کہ جو احمقانہ ہیں۔

یہ بات کہ زیر بحث آیت میں "ذکرکم" کس معنی میں ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے بیانات مختلف ہیں۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی آیات تمہارے لیے نصیحت اور افکار و اذہان کی بیداری کا سبب ہیں جیسا کہ ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:

فذکر بالقرآن من یخاف وعید

اس قرآن کے ذریعے اُن لوگوں کو کہ جو خدائی عذاب اور سزا سے ڈرتے ہیں نصیحت کرو اور یاد دہانی کراؤ۔ (ق - ۴۵)

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ قرآن تمہارے نام اور شہرت کو دنیا میں بلند کرے گا یعنی یہ تمہاری عزت و شرف کا باعث ہے تم مومنین و مسلمین کی یا تم قوم عرب کی کیونکہ قرآن تمہاری زبان میں نازل ہوا ہے۔ اور اگر یہ تم سے لے لیا جائے تو تمہارا دنیا میں نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس قرآن میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں کہ جو تمہارے دین و دنیا کے لیے ضروری ہیں اور یا مکارم اخلاق کے سلسلہ میں جن کے تم محتاج ہو، ان سب کے لیے یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

اگرچہ یہ تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ یہ سب کی سب "ذکرکم" کی تفسیر میں جمع ہوں تاہم پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ قرآن بیداری کا سبب کس طرح ہے جبکہ بہت سے مشرکین نے اُسے سنا لیکن وہ بیدار نہیں ہوئے، تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ قرآن کا بیدار کرنے والا ہونا، جبری اور اضطراری پہلو نہیں رکھتا بلکہ اس کی شرط یہ ہے کہ انسان خود

چاہتا ہو اور وہ اپنے دل کے دریچے اس کے سامنے کھول دے ۔

۱۱۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ۝

۱۲۔ فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُونَ ۝

۱۳۔ لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ ۝

۱۴۔ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝

۱۵۔ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ۝

ترجمہ

۱۱۔ ہم نے کتنی ہی ایسی بستیوں کو کہ جو ظالم تھیں درہم برہم کر دیا اور ان کے بعد ہم ایک دوسری قوم کو لے آئے ۔

۱۲۔ انہوں نے جس وقت ہمارے عذاب کو محسوس کیا تو انہوں نے اچانک راہِ فرار اختیار کی ۔

۱۳۔ فرار نہ کرو اور اپنی ناز و نعمت سے پُر زندگی کی طرف لوٹ آؤ اور اپنے خوبصورت گھروں میں (آجاؤ) تاکہ سائل آئیں اور تم سے سوال کریں ۔ (اور تم ان کو محروم کر کے پلٹا دو) ۔

۱۴۔ انہوں نے کہا کہ ہائے افسوس ہم پر کہ ہم ظالم و ستمگر تھے ۔

۱۵۔ وہ اسی طرح سے اپنی ان باتوں کو دُہرا رہے تھے ، یہاں تک کہ ہم نے انہیں جڑ سے کاٹ کر خاموش کر دیا ۔

تفسیر

ظالم عذاب کے چنگل میں کیسے گرفتار ہوئے ؟

زیر بحث آیات میں ان باتوں کے بعد کہ جو ہٹ دھرم مشرکین اور کفار کے بارے میں گزریں، قرآن گزشتہ قوموں کے انجام کے ساتھ ان کے انجام کا موازنہ کرکے واضح کرتا ہے :

پہلے کہتا ہے : کتنی ظالم اور ستمگر آبادیاں ایسی تھیں کہ جنہیں ہم نے تہ و بالا کر دیا (وکم قصمنا من قریۃ کانت ظالمۃ)۔

" اور ان کے بعد ایک دوسری قوم کو میدانِ آزمائش میں لے آئے " (وانشأنا بعدھا قوماً اٰخرین)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ " قصمو " شدت کے ساتھ توڑنے کے معنی میں ہے ، یہاں تک کہ بعض اوقات کوٹنے کے معنی میں آتا ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان قوموں کے ظالم ہونے کا ذکر ہے ، اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ خدا ظالم و ستمگر قوموں کے بارے میں شدید ترین انتقام اور سزا وعذاب کا قائل ہے ۔

ضمنی طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر تم گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو تم جان لوگے کہ پیغمبرِ اسلام کی تہدید یں بے بنیاد اور مذاق نہیں ہیں بلکہ وہ ایک تلخ حقیقت ہیں کہ جس کے بارے میں تمہیں خوب غور و فکر کرنا چاہیئے ۔

❖ ❖ ❖

اَب ان کے حالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جب کہ عذاب ان کی آبادیوں کو آلیتا تھا ۔ خدائی عذاب کے مقابلہ میں ان کی بیچارگی واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : جس وقت انہوں نے محسوس کیا کہ خدا کا عذاب انہیں دامن گیر ہوکے رہے گا تو انہوں نے فرار کی راہ اختیار کی : (فلما احسوا بأسنا اذا ھم منھا یرکضون)[1]

ٹھیک ایک شکست خوردہ لشکر کی مانند کہ جو دشمن کی برہنہ شمشیروں کو اپنی پشت پر دیکھ کر اِدھر اُدھر بھاگ کھڑا ہو ۔

❖ ❖ ❖

لیکن سرزنش کے عنوان سے انہیں کہا جائے گا : بھاگو نہیں ! اور اپنی ناز و نعمت سے پُر زندگی اور زر و جواہر سے بھرے ہوئے مکانوں ، محلوں ، بنگلوں کی طرف پلٹ آؤ ، شاید سائل آئیں اور تم سے سوال کریں : (لا ترکضوا وارجعوا الیٰ ما اترفتم فیہ ومساکنکم لعلکم تسئلون)۔

یہ عبارت ، ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہمیشہ ان کی پُر ناز و نعمت زندگی میں سائل اور خیرات مانگنے والے ان کے

---

[1] " رکض " کا معنی تیزی سے دوڑنا بھی ہے اور سواری کو دوڑانا بھی ہے اور کبھی زمین پر پاؤں مارنے کے معنی میں بھی آتا ہے ،

ارکض برجلک ھذا مغتسل بارد و شراب

اے ایوب تم اپنا پاؤں زمین پر مارو (تو ایک چشمہ پھوٹ نکلے گا) کہ جو نہانے کے لیے بھی ہے اور پینے کیلئے بھی (ص ۔ ۴۲)

گھروں کے دروازوں پر اُمید لے کر آتے تھے اور محروم ہو کر پلٹ جاتے تھے۔ انہیں کہا گیا ہے کہ "پلٹ جاؤ اور انہیں نفرت انگیز مناظر کو پھر دہراؤ۔"

یہ حقیقت میں ایک قسم کا استہزاء اور سرزنش ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "لعلکم تسئلون" ان کے جاہ وجلال کے دربار کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خود ایک گوشہ میں بیٹھے رہتے اور مسلسل فرمان جاری کرتے، اور خدمت گار پے درپے ان کے پاس آتے، اور پوچھتے کہ حضور کا کیا حکم ہے؟

باقی رہا یہ کہ اس بات کا کہنے والا کون ہے؟ تو یہ بات آیت میں صراحت کے ساتھ بیان نہیں کی گئی۔

ممکن ہے کہ یہ ندا خدا کے فرشتوں یا انبیاء یا ان کے قاصدوں کی ہو یا خود اُنہی کے ضمیر اور وجدان کی آواز ہو۔

حقیقت میں یہ خدا کی ندا ہی تھی کہ جو انہیں سنائی دے رہی تھی کہ: بھاگو نہیں! پلٹ آؤ کہ جو ان تینوں میں سے کسی ایک ذریعہ سے ان تک پہنچ رہی تھی۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ تمام مادی نعمتوں میں سے یہاں خصوصیت کے ساتھ "مسکن" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ شاید یہ اس بناء پر ہو کہ انسان کے آرام وسکون کا پہلا وسیلہ ایک مناسب جائے سکونت کا ہونا ہے۔ اور یا یہ بات ہے کہ انسان عام طور پر اپنی زندگی کی بیشتر آمدنی اپنے مکان پر صرف کرتا ہے اور اس کا زیادہ تر لگاؤ بھی اُسی سے ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭

بہر حال وہ اُس وقت بیدار ہوں گے اور جس چیز کو وہ پہلے مذاق سمجھتے تھے اُسے سنجیدہ ترین صورت میں اپنے سامنے دیکھیں گے اور وہ چیخ اُٹھیں گے" اور کہیں گے وائے ہو ہم پر کہ ہم ظالم وستمگر تھے"۔ (قالوا یا ویلنا انا کنا ظالمین)۔

لیکن یہ اضطراری بیداری کہ جو عذاب کے حقیقی مناظر کے سامنے ہر شخص میں پیدا ہو جاتی ہے بے قدر وقیمت ہے اور اس سے ان کا انجام بدل نہیں سکتا لہٰذا قرآن آخری زیر بحث آیت میں اضافہ کرتا ہے:

اور وہ اس طرح اِس بات کا کہ "وائے ہو ہم پر کہ ہم ظالم تھے" تکرار کر رہے تھے کہ ہم نے ان کی جڑ کو کاٹ کر رکھ دیا اور انہیں خاموش کر دیا (فما زالت تلک دعوٰھم حتّٰی جعلنٰھم حصیدًا خامدین)۔

کٹی ہوئی کھیتیوں (حصید) کی طرح زمین پر گر پڑیں گے اور ان کا آباد اور جوش وخروش سے پُر شہر، ویران قبرستان اور خاموشی میں بدل جائے گا" (خامدین)[1]

---

[1] "خامد" اصل میں "خمود" کے مادہ سے ("جنود" کے وزن پر) آگ بجھ جانے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ ہر اُس چیز پر بولا جانے لگا کہ جس کا جوش وخروش ختم ہو جائے۔

۱۶۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○

۱۷۔ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ○

۱۸۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ○

ترجمہ

۱۶۔ ہم نے آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔

۱۷۔ بفرضِ محال اگر ہم چاہتے بھی کہ کوئی سرگرمی ڈھونڈیں، تو اپنے شایانِ شان کسی چیز کا انتخاب کرتے۔

۱۸۔ بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں تاکہ اُسے ہلاک کردیں اور اس طرح باطل نابود ہوجاتا ہے لیکن تم پر وائے ہو اس توصیف پر کہ جو تم کرتے ہو۔

تفسیر

آسمان وزمین کی خلقت کھیل نہیں ہے:

چونکہ گزشتہ آیات میں یہ حقیقت بیان ہوئی تھی کہ ظالم بے ایمان اپنی خلقت کے بارے میں سوائے عیش وعشرت کے کسی مقصد کے قائل نہیں تھے اور حقیقتاً اس جہان کو بے مقصد خیال کرتے تھے۔ قرآن مجید زیر بحث آیات میں، اس طرزِ فکر کو باطل قرار دینے اور پوری کائنات خصوصاً انسانوں کی خلقت کے لیے گراں قدر مقصد ہونے کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے آسمان، زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اُسے فضول اور بے ہودہ پیدا نہیں کیا ہے: (وما خلقنا السمآء والارض وما بینھما لاعبین)۔

یہ پھیلی ہوئی زمین، یہ وسیع آسمان اور ان میں موجود یہ قسم قسم کی موجودات، اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ کوئی اہم مقصد پیشِ نظر تھا۔

ہاں! مقصد تھا اور وہ یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ اُس عظیم پیدا کرنے والے کے وجود کا ثبوت بنیں اور دوسری طرف سے "معاد" کے لیے دلیل بنیں ورنہ یہ سب شور وغل چند دن کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان کسی بیابان کے وسط میں تمام وسائل سے آراستہ وپیراستہ ایک محل بنائے، صرف اس غرض سے

کہ تمام عمر میں جو ایک گھنٹہ کے لیے وہاں سے گزرے گا، تو اس میں آرام کرے گا۔

مختصر یہ ہے کہ اگر ہم اس باعظمت جہان کو بے ایمان لوگوں کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ فضول اور بے مقصد ہے، صرف مبداء و معاد پر ایمان ہی ہے کہ جو اسے بامقصد بناتا ہے۔

* * *

بعد کی آیت کہتی ہے کہ اب جبکہ یہ بات مسلم ہوگئی کہ عالم بے مقصد نہیں ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ اس خلقت کا مقصد، خدا کا خلقت کے کام میں سرگرم اور مشغول رہنا نہیں ہے کیونکہ ایسی سرگرمی اور مشغولیت غیر معقول ہے" بفرض محال اگر ہم چاہتے کہ اپنے لیے کوئی سرگرمی ڈھونڈیں، تو ایسی چیز کا انتخاب کرتے کہ جو ہمارے لیے مناسب ہوتی" (لو اردنا ان نتخذ لھوا لا تخذ ناہ من لدنا ان کنا فاعلین)۔

حقیقت میں لفظ "لعب" بے مقصد کام کے معنی میں ہے اور "لھو" نامعقول مقاصد اور سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے۔

زیر بحث آیت دو حقائق کو بیان کررہی ہے۔ اوّل تو لفظ "لو" کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو لغت عرب میں امتناع کے لیے ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امر محال ہے کہ پروردگار کا مقصد اپنے آپ کو مشغول رکھنا ہو۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے، فرض کریں کہ اگر مقصد مشغول رہنا ہو، تو یہ سرگرمی اس کی ذات کے شایان شان ہونا چاہیے عالم مجردات اور اسی قسم کی چیزوں میں سے، نہ کہ اُس عالم سے کہ جو مادہ میں محدود ہے۔[1]

اس کے بعد قطعی اور دو ٹوک الفاظ میں اُن احمقوں کے اوہام کو باطل کرنے کے لیے کہ جو دُنیا کو بے مقصد یا صرف مشغول اور سرگرم رہنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں، قرآن اس طرح کہتا ہے: یہ جہان ایک ایسا مجموعہ ہے کہ جو حقیقت و واقعیت ہے، یہ ایسا نہیں ہے کہ جس کی بنیاد باطل پر ہو بلکہ ہم حق کو باطل کے سر پر دے پٹکیں گے تاکہ اسے نابود اور ہلاک کر دے اور باطل محو و نابود ہو جائے": (بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا ھو زاھق)۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: لیکن تم پر وائے ہو، اس توصیف پر، کہ جو تم عالم کے بے مقصد ہونے کے بارے میں کرتے ہو (ولکم الویل مما تصفون)۔

یعنی ہم ہمیشہ بے ہودگی کی طرف مائل لوگوں کے خیالات و اوہام کے مقابلے میں عقلی دلائل، واضح استدلالات اور اپنے آشکار معجزات پیش کرتے ہیں تاکہ غور و فکر کرنے والوں اور صاحبانِ عقل کی نظروں میں، یہ خیالات و اوہام درہم برہم ہو جائیں۔ خدا کی معرفت کے دلائل روشن ہیں۔ معاد کے برپا ہونے کے دلائل آشکار ہیں۔ انبیاء کی حقانیت کے براہین واضح ہیں۔

---

[1] کچھ مفسرین نے زیر نظر آیات کو عیسائیوں کے عقائد کی نفی کی طرف اشارہ سمجھا ہے، یعنی لھو کو بیوی اور بیٹے کے معنی میں لیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ آیت ان کے جواب میں یہ کہہ رہی ہے کہ اگر ہم چاہتے کہ بیٹا اور بیوی کا انتخاب کرتے، تو نوع انسانی میں سے انتخاب نہ کرتے۔

لیکن یہ تفسیر کئی جہت سے مناسب نظر نہیں آتی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ زیر بحث آیات کا ربط گزشتہ آیات سے منقطع ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ "لہو" خصوصاً جب "لعب" کے بعد ذکر ہو تو سرگرمی اور مشغولیت کے معنی میں ہوتا ہے، نہ کہ بیوی بیٹے کے معنی میں۔

اور درحقیقت ان لوگوں کے لیے کہ جو ہٹ دھرم اور بہانہ باز نہیں ہیں۔ حق باطل سے کامل طور پر الگ اور نمایاں ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ " نقذف " "قذف" کے مادہ سے پھینکنے کے معنی میں ہے۔ خصوصاً دُور سے پھینکنا اور چونکہ دُور سے پھینکنا، تیزی، سرعت اور زیادہ قوّت رکھتا ہے، یہ تعبیر حق کی باطل پر کامیابی کی قدرت کو بیان کرتی ہے۔ لفظ "علیٰ" بھی اسی معنی کی تائید کرتا ہے کیونکہ عام طور پر یہ لفظ "علو" اور بلندی کے مقام پر استعمال ہوتا ہے۔

"یدمغہ" کا جملہ، راغب کے قول کے مطابق کھوپڑی کو توڑنے کے معنی میں ہے، جو کہ انسانی بدن کا حساس ترین عالم شمار ہوتا ہے۔ یہ لشکرِ حق کے غالب ہونے کی ایک عُمدہ تعبیر ہے۔ آنکھوں سے دکھائی دینے والا قطعی اور ظاہر بظاہر غلبہ۔

"اذا" کی تعبیر یہ نشاندہی کرتی ہے کہ ایسی جگہ بھی کہ جہاں یہ توقع ہی نہ ہو کہ حق کامیاب ہوگا، وہاں ہم ایسا انجام دیتے ہیں۔

"زاھق" کی تعبیر اُس چیز کے معنی میں ہے کہ جو کُلی طور پر مضمحل ہو جائے نیز اس مقصد کے لیے یہ بھی ایک تاکید ہے۔

اور یہ بات کہ " نقذف " اور " یدمغ " کے الفاظ فعل مضارع کی شکل میں کیوں آئے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ اس عمل کے استمرار، تسلسل اور ہمیشگی کی دلیل ہے۔

* * *

ایک نکتہ :

مقصدِ خلقت : مادیین خلقت کے بارے میں کسی ھدف و مقصد کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ بے عقل و شعور اور بے ھدف و مقصد، طبیعت کو مبداء خلقت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ پوری ہستی کے بے فائدہ اور فضول ہونے کے داعی ہیں۔ ان کے برعکس فلاسفہ الٰہی اور ادیانِ آسمانی کے پیروکار سب کے سب آفرینش و خلقت کے لیے ایک اعلیٰ مقصد کا عقیدہ رکھتے ہیں کیونکہ عالم اور قادرِ حکیم مبداء سے یہ امر محال ہے کہ وہ کوئی کام بغیر ھدف و مقصد کے انجام دے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ ھدف و مقصد کیا ہے ؟

بعض اوقات ہم خدا کا اپنے اُوپر قیاس کرتے ہوئے اس توہم میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ شاید خدا میں کوئی کمی تھی کہ عالم ہستی کی خلقت سے، کہ جس میں سے ایک انسان بھی ہے، اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔

کیا وہ ہماری عبادت و پرستش کا محتاج ہے ؟ کیا وہ یہ چاہتا تھا کہ پہچانا جائے، اس لیے اس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے، تاکہ وہ پہچانا جائے اور اس کی شناخت ہو ؟!

لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ ایک عظیم اشتباہ ہے کہ جو "خدا" کے "خلق" پر قیاس کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ صفاتِ خدا کی شناخت اور معرفت کی بحث میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی غلط قسم کا قیاس ہے۔ لہٰذا اس بحث میں پہلی بنیاد تھی کہ ہم یہ جانیں کہ وہ کسی چیز میں ہم سے مشابہت نہیں رکھتا۔

ہم ہر نظر سے ایک محدود وجود ہیں اور اسی وجہ سے ہماری تمام کوششیں اپنی خامیوں اور نقائص کو دُور کرنے کے لیے ہوتی ہیں، ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں تاکہ پڑھے لکھے ہو جائیں اور ہماری علم کی کمی دُور ہو جائے۔ کاروبار کے لیے جاتے ہیں تاکہ فقر و فاقہ اور ناداری کا

مقابلہ کرسکیں۔ فوج اور قوت مہیا کرتے ہیں تاکہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی قدرت و طاقت کی کمی کی تلافی کریں۔ یہاں تک کہ معنوی مسائل اور تہذیب نفس اور مقاماتِ رُوحانی کی سیر بھی، خامیوں اور نقائص کو دُور کرنے کی ہی کوششیں ہیں۔

لیکن کیا وہ ہستی جو ہر لحاظ سے غیر محدود ہے، جس کا علم و قدرت اور قوتیں بے انتہا ہیں، اور کسی لحاظ سے بھی جس میں کوئی کمی نہیں ہے کیا یہ بات اس کے لیے کہنا معقول ہے کہ وہ کوئی کام اپنی کمی کو دُور کرنے کے لیے کرے؟

اس تجزیے سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک طرف تو آفرینش و خلقت بے ہدف و مقصد نہیں ہے اور دوسری طرف سے یہ ہدف و مقصد آفریدگار و خالق سے متعلق نہیں ہے۔

تو اب آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ حتماً اور بلا شک و شبہ یہ ہدف و مقصد ایسی چیز ہے کہ جو خود ہمارے ہی ساتھ تعلق رکھتی ہے۔

اس تمہید پر توجہ کرتے ہوئے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ غرضِ خلقت ہمارے ہی تکامل و ارتقاء اور بلندی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے دوسرے لفظوں میں عالمِ ہستی ایک ایسی یونیورسٹی ہے کہ جو ہمارے علم کی تکمیل کے لیے بنائی گئی ہے۔

تربیت کے لحاظ سے ایک ایسی یونیورسٹی ہے کہ جو ہمارے نفوس کی تہذیب کے لیے ہے۔

معنوی درآمدات کو کسب کرنے کے لیے یہ ایک تجارت خانہ ہے۔

انسان کی طرح طرح کی ضروریات کی پیدائش کے لیے ایک زرخیز زمین ہے۔

ہاں!

الدنیا مزرعة الاخرة ... الدنیا دار صدق لمن صدقها و دار غنی لمن تزود منها و دار موعظة لمن اتعظ منها۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے، دنیا سچائی کا گھر ہے جو اس سے سچ بولے، تونگری کا گھر ہے جو اس سے زادِ راہ اور توشۂ آخرت حاصل کرے اور وعظ و نصیحت کا گھر ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے[1]

یہ قافلہ عالمِ عدم سے چلا ہے اور مسلسل لامتناہی منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

قرآن مجید مختصر اور بہت معنی خیز اشارات کے ذریعہ مختلف آیات میں، ایک طرف تو خلقت و آفرینش میں ہدف و مقصد کے اصل وجود کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس ہدف و مقصد کو مشخص بھی کر رہا ہے۔

پہلے حصے میں کہتا ہے:

ایحسب الانسان ان یترك سدًی

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل پیدا کیا گیا ہے، اور فضول چھوڑ دیا جائے گا۔ (قیامت-۳۶)

افحسبتم انما خلقنٰکم عبثاً و انکم الینا لاترجعون

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار ۱۳۱

کیا تم نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہم نے تمہیں عبث اور فضول پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے۔ (مومنون - ۱۱۵)

وما خلقنا السماوات والارض وما بینهما باطلا ذالك ظن الذین کفروا

ہم نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ باطل اور فضول پیدا نہیں کیا ہے، یہ تو کافروں کا گمان ہے۔ (ص - ۲۷)

اور دوسرے حصے میں کبھی تو آیاتِ قرآن میں آفرینش کا ہدف و مقصد خدا کی عبودیت اور بندگی کو قرار دیا ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ (ذاریات - ۵۶)

یہ بات واضح ہے کہ عبادت انسان کی مختلف جہات سے تربیت کا ایک مکتب ہے۔ عبادت کا وسیع معنی ہے، فرمانِ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا۔ اس لحاظ سے عبادت انسان کی رُوح کو گوناں گوں مراحل میں تکامل و ارتقاء بخشتی ہے۔ اُس کی تفصیل ہم عبادات سے مربوط مختلف آیات کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

اور کبھی کہتا ہے: خلقت کا ہدف و مقصد آگاہی و بیداری اور تمہارے ایمان و اعتقاد کی تقویت ہے:

الله الذی خلق سبع سماوات ومن الارض مثلهن یتنزل الامر بینهن لتعلموا ان الله علی کل شیء قدیر

خدا وہی تو ہے کہ جس نے سات آسمان اور انہی کے مانند زمینیں پیدا کی ہیں، اس کا حکم ان میں جاری و ساری ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (طلاق - ۱۲)

اور کبھی کہتا ہے کہ خلقت کا مقصد تمہارے حسنِ عمل کی آزمائش ہے:

الذی خلق الموت والحیوة لیبلوکم ایکم احسن عملا

خدا وہی تو ہے کہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں حُسنِ عمل کے میدان میں آزمائے اور تمہاری تربیت کرے۔ (ملک - ۲)

مندرجہ بالا تینوں آیات میں سے ہر ایک انسانی وجود کی کسی ایک جہت (آگاہی و ایمان، اخلاق اور عمل) کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ہر ایک خلقت کے تکاملی و ارتقائی مقصد کو بیان کرتی ہے کہ جس کی بازگشت خود انسان کی طرف ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ لفظ "تکامل" آیاتِ قرآن میں ان مباحث میں بیان نہیں ہوا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ایک وارداتی فکر ہو۔ لیکن اس اعتراض کا جواب واضح ہے کیونکہ ہم خاص الفاظ کی قید میں پابند نہیں ہیں اور مندرجہ بالا آیات میں تکامل کے مصادیق اچھی طرح روشن ہیں۔ کیا علم و آگاہی اس کا واضح مصداق نہیں ہے اور اسی طرح عبودیت اور حسنِ عمل میں پیش رفت۔

سورۂ محمدؐ کی آیہ ۱۷ میں بیان ہوا ہے:

والذین اهتدوا زادهم هدًی۔

وہ لوگ کہ جو راہِ ہدایت پر آ گئے، خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

کیا اضافہ کی تعبیر تکامل و ارتقا کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ھدف و مقصد تکامل و ارتقا ہی تھا تو پھر خدا نے انسان کو ابتدا میں ہی کیوں تمام جہات میں کامل پیدا نہ کر دیا تاکہ تکامل کے مراحل کو طے کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی؟

اس اعتراض کی بنیاد اس نکتے سے غفلت ہے کہ تکامل کی اصلی شاخ "تکامل اختیاری" ہے۔ دوسرے لفظوں میں تکامل یہ ہے کہ انسان راستہ اپنے پاؤں اور اپنے ارادہ و اختیار سے طے کرے۔ اگر اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی آگے لے جایا جائے تو یہ نہ باعث فخر ہے اور نہ ہی تکامل و ارتقا۔ مثلاً اگر انسان ایک روپیہ اپنی خواہش اور ارادہ و اختیار کے ساتھ خرچ کرے تو اس نے اسی نسبت سے اخلاقی کمال کی راہ طے کی ہے۔ جبکہ اگر اس کی دولت میں سے لاکھوں روپے جبراً چھین کر خرچ کر دیئے جائیں تو اس نے ایک قدم بھی اس راہِ تکامل میں آگے نہیں بڑھایا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی مختلف آیات میں یہ حقیقت کھول کر بیان کی گئی ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام لوگ جبری طور پر ایمان لے آتے، لیکن اس ایمان کا ان کے لیے کوئی فائدہ نہ ہوتا:

ولو شاء ربك لأمن من فی الارض کلهم جمیعًا (یونس - ۹۹)

۱۹۔ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝

۲۰۔ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝

۲۱۔ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝

۲۲۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

۲۳۔ لَا يُسْـَٔـلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔــلُوْنَ ۝

۲۴۔ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا

يَعْلَمُونَ الْحَقَّ فَهُمْ مُعْرِضُونَ ۝

۲۵۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝

ترجمہ

۱۹۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اُسی کا ہے اور جو اُس کے پاس ہیں وہ کبھی اس کی عبادت پر گھمنڈ نہیں کرتے اور نہ ہی تھکتے ہیں۔

۲۰۔ رات دن تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور کمزوری اور کاہلی نہیں دکھلاتے۔

۲۱۔ کیا انہوں نے ایسے زمینی خدا بنا لیے ہیں کہ جو پیدا کرکے انہیں پھیلاتے ہوں۔

۲۲۔ اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا اور کئی خدا ہوتے، تو ان دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ (اور دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا)۔ یہ لوگ جو توصیفات بیان کر رہے ہیں، عرش کا پروردگار اللہ ان تمام باتوں سے منزّہ اور پاک ہے۔

۲۳۔ کوئی شخص اُس کے کام پر اعتراض نہیں کر سکتا جبکہ ان کے کاموں پر اعتراض ہو سکتا ہے۔

۲۴۔ کیا انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود اختیار کر لیے ہیں۔ تم کہہ دو کہ اپنی دلیل لاؤ، یہ تو میری اور ان (پیغمبروں) کی بات ہے کہ جو مجھ سے پہلے تھے لیکن اُن میں سے اکثر حق کو نہیں سمجھتے اسی وجہ سے وہ اس سے رُوگردان ہو جاتے ہیں۔

۲۵۔ ہم نے تجھ سے پہلے کوئی بھی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے لہذا میری ہی عبادت کرو۔

تفسیر

شرک خیال آرائی سے شروع ہوتا ہے

گزشتہ آیات میں اِس حقیقت کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ عالمِ ہستی بغیر ہدف و مقصد کے نہیں ہے، نہ مذاق اور کھیل تماشہ ہے اور نہ ہی لہو و لعب۔ بلکہ یہ انسانوں کے لیے ایک جچا تلا ہدفِ کمال رکھتا ہے۔

ممکن ہے یہ توہم پیدا ہو کہ خدا کو ہمارے ایمان اور عبادت کی کیا ضرورت ہے لہذا زیر بحث آیات پہلے اسی بات کا جواب دیتی ہیں اور کہتی ہیں: تمام (ذوی العقول) جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اسی کی ملکیت ہیں: (وله من في السماوات والارض)۔

• اور وہ فرشتے کہ جو مقربانِ بارگاہِ الٰہی ہیں، کبھی بھی اس کی عبادت پر تکبر نہیں کرتے اور نہ کبھی تھکتے ہیں": (ومن عندہ لا یستکبرون عن عبادتہ ولا یستحسرون)[1]

وہ ہمیشہ رات دن تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور معمولی کمزوری اور کاہلی بھی وہ اپنے پاس نہیں آنے دیتے (یسبحون اللیل والنھار لا یفترون)

اِن حالات میں اُسے تمہاری اطاعت وعبادت کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب عظیم فرشتے شب وروز اس کی تسبیح میں لگے ہوتے ہیں بلکہ وہ تو ان کی عبادت کا بھی محتاج نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اُس نے تمہیں ایمان عمل صالح، بندگی اور عبودیت کا حکم دیا ہے تو اس کا فائدہ تمہارے ہی لیے ہے۔

یہ نکتہ بھی خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ظاہری غلامی کے نظام میں غلام جتنا آقا سے نزدیک ہوگا، اتنا ہی اس کا خضوع کم ہوتا چلا جائے گا کیونکہ وہ اب آقا کا خاص ہوگیا ہے اور اسے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

لیکن "خلق" اور "خالق" کے نظامِ عبودیت میں معاملہ برعکس ہے۔ فرشتے اور اولیاء خدا جتنا خدا سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں ان کا مقامِ عبودیت بڑھتا جاتا ہے۔[2]

جب گزشتہ آیات میں عالمِ ہستی کے فضول اور بے مقصد ہونے کی نفی ہوچکی اور یہ ثابت ہوگیا کہ یہ عالم ایک مقدس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، تو اس کے بعد زیرِ بحث آیات میں اس جہان کے مبدء و مدبر اور وحدتِ معبود کا مسئلہ شروع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے" کیا انہوں نے زمین پر کچھ خدا بنا لیے ہیں، ایسے خدا کہ جو موجودات کو تخلیق و حیات عطا کریں۔ اور جہانِ ہستی میں انہیں پھیلا سکیں:

(ام اتخذوا الھۃ من الارض ھم ینشرون)[3]

یہ جملہ اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ معبود وہی ہونا چاہیئے کہ جو خالق ہو۔ خاص طور پر حیات کا خالق کیونکہ حیات خلقت کے روشن ترین چہروں میں سے ہے۔ یہ حقیقت میں اسی چیز کے مشابہ ہے کہ جو سورہ حج کی آیہ ۷۳ میں بیان ہوئی ہے:

ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ

---

[1] "یستحسرون" "حسر" کے مادہ سے اصل میں پوشیدہ چیز کو کھولنے اور جس میں وہ تھی اُسے الگ کر دینے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ بعد ازاں خستگی، تکان اور ضعف کے معنی میں بولا جانے لگا۔ گویا اس حالت میں انسان کی سب قوتیں آشکار اور خرچ ہو جاتی ہیں لہٰذا اس سے کوئی چیز اس کے بدن میں چھپی ہوئی نہیں رہتی۔

[2] المیزان، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[3] "ینشرون" مادہ "نشو" سے پوشیدہ چیزوں کو پھیلانے کے معنی میں ہے اور زمین و آسمان کی وسعتوں میں مخلوقات کو پیدا کرنے اور پھیلانے کے لیے بھی کنایہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ بعض مفسرین کا اِس بات پر اصرار ہے کہ یہ لفظ "معاد" اور مردوں کے دوبارہ زندہ ہوکر اُٹھ کھڑا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ حالانکہ بعد والی آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ گفتگو خدا کی پاک ذات کی توحید اور معبودِ حقیقی کے بارے میں ہے نہ کہ معاد اور موت کے بعد کی زندگی کے متعلق۔

وہ تمام معبود کہ جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تو اتنی بھی قدرت نہیں رکھتے کہ ایک مکھی ہی خلق کرسکیں، چاہے وہ سب کے سب اس کے لیے اکٹھے ہی کیوں نہ ہو جائیں، اس حال میں وہ کیسے لائق عبادت ہوسکتے ہیں۔

"الھة من الارض" (زمین میں سے کچھ خدا) کی تعبیر بتوں اور اُن معبودوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں لوگ پتھر اور لکڑی وغیرہ سے بناتے تھے اور انہیں آسمانوں پر حاکم خیال کرتے تھے۔

بعد والی آیت مشرکین کے بہت سے معبودوں اور خداؤں کی نفی کے لیے ایک نہایت روشن دلیل کو اس طرح سے بیان کرتی ہے: اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور بھی کوئی معبود اور خدا ہوتا، تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ اور نظام جہاں درہم برہم ہو جاتا (لو کان فیھما الھة الا اللہ لفسدتا)۔

"عرش کا پروردگار خدا اس توصیف سے کہ جو وہ کرتے ہیں منزہ اور پاک ہے": (فسبحان اللہ رب العرش عما یصفون)۔

یہ ناروا نسبتیں اور یہ بناوٹی خدا اور خیالی معبود اوہام و خیالات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور اس کی پاک ذات کی کبریائی کا دامن ان ناروا نسبتوں سے آلودہ نہیں ہوسکتا۔

دلیل تمانع:

وہ دلیل، جو مذکورہ بالا آیت میں توحید کے اثبات اور کئی معبودوں کی نفی کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ سادہ، آسان، روشن اور واضح ہونے کے باوجود اس سلسلے کی دقیق فلسفی دلیلوں میں سے ایک ہے کہ جسے علماء "برہان تمانع" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ اس دلیل کا خلاصہ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

ہم بلا شک وشبہ اس جہان میں ایک نظام واحد کو حکم فرما دیکھ رہے ہیں، ایسا نظام کہ جو تمام جہات سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے قوانین ثابت اور آسمان و زمین میں جاری ہیں۔ اس کے پروگرام آپس میں منطبق اور اس کے اجزاء متناسب ہیں۔

قوانین کی یہ ہم آہنگی اور نظام آفرینش اس بات کی ترجمانی کرتے ہیں کہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی مبداء ہے کیونکہ اگر متعدد مبداء ہوتے اور اس میں متعدد ارادے کارفرما ہوتے تو یہ ہم آہنگی ہرگز موجود نہ ہوتی اور وہی چیز کہ جسے قرآن "فساد" سے تعبیر کرتا ہے دنیا میں صاف طور پر نظر آتی۔

اگر ہم کچھ تحقیق اور مطالعہ کرنے والے ہوں تو کسی ایک کتاب کے مطالعہ سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اسے ایک شخص نے لکھا ہے یا چند افراد نے۔

وہ کتاب جو ایک شخص کی تالیف ہو اس کی عبارات میں ایک خاص نظم اور ہم آہنگی، جملہ بندی، مختلف تعبیرات، کنایات و اشارات، عنوانات و نکات، مباحث کی طرز، خلاصہ یہ کہ اس کے تمام حصے بالکل ہم آہنگ ہوں گے۔ چونکہ وہ ایک فکر کی تخلیق

اور ایک قلم کی تحریر ہے۔

لیکن اگر دو یا چند افراد ـــ چاہے وہ سب عالم و دانشمند ہوں اور اکٹھے ایک ساتھ کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ـــ ہر ایک اُس کے ایک حصّہ کی تالیف اپنے ذمّہ لے تو اس کی عبارات والفاظ کی گہرائیوں میں اور بحثوں کی طرز میں فرق نمایاں ہوگا۔

اس کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ دو نفر چاہے کتنے ہی ہم فکر اور ہم سلیقہ ہوں، پھر بھی وہ دو نفر ہیں۔ اگر ان کی ہر چیز ایک ہوتی تو پھر تو وہ ایک نفر ہو جاتے۔ اس بناء پر قطعی اور یقینی طور پر اُن میں فرق ہونا چاہیئے تاکہ وہ دو نفر ہوسکیں اور یہ فرق آخرکار اپنا اثر ان کی تحریروں میں مرتب کرے گا۔

اب یہ کتاب چاہے کتنی ہی بڑی اور مفصل ہو اور نوع بنوع موضوعات کے بارے میں بحث کرتی ہو، یہ ناہم آہنگی بہت جلد محسوس ہو جائے گی۔

عالمِ آفرینش کی عظیم کتاب ـــ کہ جس کی عظمت اس قدر ہے کہ ہم اپنے پورے وجود کے ساتھ اُس کی عبارات کے اندر گم ہو جاتے ہیں، اس پر بھی یہی قانون جاری ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی ساری عمر میں بھی اس تمام کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے لیکن اتنی ہی مقدار کہ جس کے مطالعہ کی ہمیں اور دنیا کے تمام علماء کو توفیق ہوئی ہے، اس میں ایسی ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ جو اس کے مؤلف کی وحدت کی بخوبی حکایت کرتی ہے۔

ہم اِس عجیب کتاب کی جتنی بھی ورق گردانی کرتے ہیں، ہر جگہ ایک عالی نظام، نظم و ضبط اور ناقابلِ توصیف ہم آہنگی اس کے کلمات، سطور اور صفحات میں نمایاں ہے۔

اگر اس جہان اور اس کے نظام کو چلانے میں کئی ارادے اور متعدد مبداء کا دخل ہوتا تو اِس ہم آہنگی کا پیدا ہونا ممکن نہیں تھا۔ واقعاً خلاء سے متعلق علم رکھنے والے خلائی جہازوں کو کامل باریک بینی کے ساتھ فضا میں کیونکر بھیج دیتے ہیں اور چاند گاڑیوں کو ٹھیک اسی جگہ اُتار لیتے ہیں کہ جس کا سائنسی اعتبار سے یقین کیا گیا ہو اور پھر انہیں مقرر شدہ مقام پر زمین کی طرف نیچے لے آتے ہیں۔

کیا یہ حساب کتاب کی باریکی اس بناء پر نہیں ہے کہ پورے عالمِ ہستی پر جو نظام حاکم ہے ـــ وہ دقیق، منظم اور ہم آہنگ ہے اور اگر اس میں ذرہ برابر بھی ناہم آہنگی (زمانے کے لحاظ سے ایک سیکنڈ کا سوال حصّہ بھی) ہوتی تو ان کے تمام اندازے درہم برہم ہو جاتے۔

مختصر یہ کہ اگر دو یا چند ارادے عالم پر حاکم ہوتے تو ہر ایک کا الگ تقاضا ہوتا اور ہر ایک دوسرے کے اثر کو ختم کر دیتا اور آخرکار سارے عالم کا نظام بگڑ کر رہ جاتا۔

ایک سوال اور اس کا جواب :

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس کا جواب گزشتہ توضیحات سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جہان میں خداؤں کا تعدد اِس صورت میں موجبِ فساد ہے جبکہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں لیکن اگر ہم اس بات کو قبول کر لیں وہ (خدا) حکیم اور آگاہ ہیں تو حتمی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے عالمِ ہستی کا نظام چلائیں گے۔

اِس سوال کا جواب زیادہ پیچیدہ نہیں ہے۔ ان کا حکیم و دانا ہونا ان کے تعدد کو ختم نہیں کرتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ متعدد ہیں

تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ایک نہیں ہیں کیونکہ اگر وہ تمام جہات سے ایک ہوں تو پھر وہ ایک خدا ہو جائیں گے۔ اس بنا پر جہاں تعدد ہے، وہاں حتمی طور پر تفاوت اور اختلافات موجود ہوں گے کہ جو چاہنے اور نہ چاہنے (دونوں صورتوں میں) ارادہ و عمل پر اثر انداز ہوں گے اور جہانِ ہستی کو ہرج مرج اور بگاڑ کی طرف کھینچ کرلے جائیں گے (غور کیجئے گا)۔

اس برہان تمانع کو دوسری صورتوں میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو ہماری بحث کی حدود سے باہر ہے اور جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے وہی بہتر ہے۔

اِن استدلالات میں سے بعض میں کہا گیا ہے کہ اگر دو ارادے عالمِ خلقت میں حکم فرما ہوتے، تو اصلاً کوئی جہان وجود میں ہی نہ آتا، جبکہ اُوپر والی آیت جہان کے فساد اور نظام میں خلل پڑنے سے متعلق گفتگو کر رہی ہے نہ کہ جہان کے موجود نہ ہونے کے بارے میں۔ (غور کیجئے گا)۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اُس حدیث میں کہ جو ہشام بن حکم نے امام صادق علیہ السلام نے نقل کی اس طرح بیان ہوا ہے کہ امامؑ نے ایک بے ایمان شخص کے جواب میں جو خدا کے تعدد کے بارے میں بات کر رہا تھا فرمایا:

یہ دو خدا جو تو کہتا ہے یا تو دونوں قدیم و ازلی اور طاقتور ہیں، یا دونوں ضعیف و ناتواں ہیں یا اُن میں سے ایک قوی ہے اور دوسرا ضعیف و کمزور ہے۔ اگر دونوں قوی ہوں تو پھر اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو ہٹا کیوں نہیں دیتا اور عالم کی تدبیر اکیلا ہی اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں لے لیتا اور اگر تیرا گمان یہ ہے کہ ان میں سے ایک قوی ہے اور دوسرا ضعیف ہے تو تُو نے خدا کی توحید کو قبول کر لیا ہے کیونکہ دوسرا تو ضعیف و کمزور ہے لہٰذا وہ خدا نہیں ہے اور اگر تو یہ کہے کہ وہ دو ہیں تو معاملہ دو حالت سے خالی نہیں ہے یا تو وہ تمام جہات سے متفق ہیں یا مختلف ہیں لیکن جبکہ ہم نظامِ خلقت کو منظم دیکھ رہے ہیں۔ آسمان کے ستارے اپنے مخصوص راستوں پر چل رہے ہیں، رات اور دن ایک خاص نظم و ضبط کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں اور سورج اور چاند ہر ایک اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے۔ تدبیرِ جہان کی یہ ہم آہنگی اور اس کے امور کا نظم و ضبط اِس بات کی دلیل ہے کہ مدبرِ عالم ایک ہے۔

اس سے قطع نظر، اگر تیرا پھر بھی یہی دعویٰ ہو کہ خدا دو ہیں تو لازمی طور پر ان کے درمیان کوئی فاصلہ (یا کسی قسم کا امتیاز) ہونا چاہیئے تاکہ ان کے درمیان دوئی مانی جاسکے۔ تو یہاں یہ فاصلہ (امتیاز) خود ایک تیسرا موجود ازلی ہو جائے گا اور اس طرح خدا تین ہو جائیں گے اور اگر تم یہ کہو گے کہ وہ تین ہیں تو پھر اُن کے درمیان دو فاصلے (امتیاز) ہونے چاہئیں۔ تو اس صورت میں تُو پانچ قدیم و ازلی وجودوں کا قائل ہو جائے گا اور اس طرح سے یہ تعداد بڑھتی ہی چلی جائے گی، جس کی کوئی حد اور انتہا نہ ہو گی[1]

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۴۱۸، ۴۱۹ بحوالہ توحید صدوق۔

اِس حدیث کی ابتداء میں بُرہانِ تمانع کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بعد ایک اور دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ جسے "برھان فرجه" یا "مابه الاشتراك ومابه الامتیاز" کا فرق کہتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ہشام بن حکم نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا:

ما الدلیل علی ان الله واحد؛ قال: إتصال التدبیر وتمام الصنع، کما قال الله عزوجل: لوکان فیهما الهة الا الله لفسدتا۔

خدا کے ایک ہونے کی کیا دلیل ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "تدبیر جہان میں نظم وضبط اور ہم آہنگی اور خلقت کا ہر طرح سے کامل ہونا، جیسا کہ خدا فرماتا ہے: لوکان فیهما الهة الا الله لفسدتا (اگر آسمان وزمین میں اللہ کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو نظامِ جہاں بگڑ جاتا)۔[1]

٭ ٭ ٭

جب اِس استدلال سے کہ جو آیت میں بیان ہوا ہے، عالم کے مدبّر اور اسے چلانے والے کی توحید ثابت ہوگئی تو اس کے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: اُس نے اِس طرح سے حکیمانہ طور پر جہان کو نظام بخشا ہے کہ کسی قسم کے اعتراض وگفتگو کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہے۔ کوئی شخص اس کے کام پر تنقید نہیں کرسکتا اور نہ ہی کوئی (اعتراض کے طور پر) اس سے سوال کرسکتا ہے جبکہ دوسرے اس طرح نہیں ہیں۔ ان کے افعال وکردار میں بہت سے اعتراضات اور سوالوں کی گنجائش ہے: (لا یسئل عما یفعل وهو یسئلون)۔

اگرچہ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے لیکن جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ صحیح دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم دو قسم کے سوال کرتے ہیں۔ سوال کی ایک قسم تو وہ ہے جسے توضیحی سوال کہتے ہیں کیونکہ انسان کچھ مسائل سے بے خبر ہوتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ان کی حقیقت معلوم کرے۔ یہاں تک کہ اس بات کا علم اور ایمان ہونے کے باوجود کہ جو کام انجام پایا ہے وہ ایک صحیح کام ہے۔ پھر بھی وہ اس کے اصلی ہدف کو جاننا چاہتا ہے، اِس قسم کے سوالات خدا کے افعال کے بارے میں بھی جائز ہیں۔ بلکہ یہ وہی سوال ہے کہ جو علمی مسائل اور جہانِ خلقت میں تحقیق وجستجو کا سرچشمہ شمار ہوتا ہے اور اس قسم کے سوالات چاہے عالمِ تکوین سے تعلق رکھتے ہوں یا تشریع سے، پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ کے اصحاب نے اکثر کیے ہیں۔

باقی رہی سوال کی دوسری قسم، وہ اعتراضی سوال ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انجام دیا گیا فعل نادرست اور غلط تھا۔ مثلاً ہم اُس شخص سے کہ جس نے اپنے عہد وپیمان کو بغیر کسی دلیل کے توڑ دیا ہو، یہ کہتے ہیں کہ تو عہد شکنی کیوں کرتا ہے؟ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ہم اُس سے وضاحت طلب کررہے ہیں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اس پر اعتراض کریں۔

مسلمہ طور پر خداوند حکیم کے افعال پر اِس قسم کے اعتراضات کوئی معنی نہیں رکھتے اور اگر کبھی کسی سے سرزد ہوجائیں تو حتمی طور پر وہ ناآگاہی اور جہالت کی وجہ سے ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے افعال میں اس قسم کے سوالات کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۴۱۷-۴۱۸، بحوالہ توحید صدوق۔

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس آیت کے بارے میں جابر جعفی کے سوال کے جواب میں آپؑ نے فرمایا :

لانہ لا یفعل الا ما کان حکمة وصوابا

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی کام انجام نہیں دیتا مگر یہ کہ اس میں حکمت ہوتی ہے اور وہ بالکل صحیح اور درست ہوتا ہے۔

ضمنی طور پر اس گفتگو سے یہ نتیجہ واضح طور پر نکالا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسری قسم کا سوال کرتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی اُس نے خدا کو اچھی طرح سے پہچانا نہیں ہے اور اس کے حکیم ہونے کے بارے میں آگاہ نہیں ہے۔

بعد والی آیت نفیِ شرک کے سلسلے میں دو دوسری دلیلوں پر مشتمل ہے۔ گزشتہ دلیل سے مل کر یہ مجموعاً تین دلیلیں ہو جائیں گی۔

پہلے فرمایا گیا ہے : کیا انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے لیے کچھ اور معبود منتخب کر لیے ہیں ؛ تم کہہ دو کہ تم اپنی دلیل پیش کرو :
(ام اتخذوا من دونه الهة قل هاتوا برهانكم)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر گزشتہ دلیل ہے کہ جس کی بنیاد یہ تھی کہ عالم ہستی کا نظام توحید کی دلیل ہے، صرف نظر کر لو تو کم از کم شرک اور ان خداؤں کی الوہیت ثابت کرنے کے لیے تو کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے۔ تو پھر عاقل انسان ایسی بات بغیر دلیل کے کیسے قبول کرتا ہے ؟

اس کے بعد آخری دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ صرف میں اور میرے ہمراہی ہی نہیں کہ جو توحید کی بات کرتے ہیں بلکہ تمام گزشتہ انبیاء اور سب ایمان لانے والے موحد ہی تھے (هذا ذكر من معى وذكر من قبلى)۔

یہ وہی دلیل ہے کہ جسے علماء عقائد نے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ پر انبیاء کے اجماع و اتفاق کے عنوان کے ماتحت بیان کیا ہے۔

ممکن ہے کہ کبھی بُت پرستوں کی کثرت ــ بعض لوگوں کے لیے توحید قبول کرنے میں مانع ہو خصوصاً ان حالات میں جیسے قبلِ ہجرت مکّہ میں مسلمانوں کو درپیش تھے اور جن کی طرف سورہ انبیاء اشارہ کر رہی ہے۔ لہٰذا قرآن مزید کہتا ہے : لیکن اُن میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے اس لیے انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا ہے : (بل اكثرهم لا يعلمون الحق فهم معرضون)۔

بہت سے معاشروں میں نادان اکثریت کی مخالفت کرنا ہمیشہ بے خبر لوگوں کے لیے رُوگردانی کے مترادف قرار دی جاتی رہی ہے اور قرآن نے بہت سی مکّی اور مدنی آیات میں اس اکثریت کے طرزِ عمل کو بنیاد بنانے کی شدّت کے ساتھ مذمت کی ہے اور اس کی نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ وہ دلیل و منطق کو ہی معیار سمجھتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض بے خبر یہ کہنے لگیں کہ ہمارے سامنے عیسٰیؑ جیسے انبیاء بھی ہیں کہ جنہوں نے متعدد خداؤں کی طرف دعوت دی ہے، تو قرآن آخری زیرِ بحث آیت میں کہتا ہے : ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا کہ جس کے پاس یہ وحی نہ آئی ہو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، لہٰذا میری ہی عبادت کرو؛ (وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحى اليه انه لا اله الا انا فاعبدون)۔

اس طرح سے یہ ثابت ہو گیا کہ نہ عیسیٰ نے اور نہ ہی ان کے علاوہ کسی اور پیغمبر نے کبھی شرک کی دعوت دی تھی اور اس قسم کی نسبتیں تہمت ہیں۔

۲۶۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ

۲۷۔ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ۝

۲۸۔ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝

۲۹۔ وَمَنْ یَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِیْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ۝ ۧ

ترجمہ

۲۶۔ انہوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن اولاد رکھتا ہے۔ اس کی ذات (اس عیب ونقص سے) منزہ ہے یہ (فرشتے) اس کے مکرم بندے ہیں۔

۲۷۔ جو ہرگز بات کرنے میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

۲۸۔ وہ ان کے آج کے اور آیندہ کے تمام اعمال کو بھی جانتا ہے اور ان کے گزشتہ اعمال سے بھی آگاہ ہے اور وہ سوائے اس شخص کے کہ جس سے خدا راضی ہے (اور اس کی شفاعت کی اجازت اُس نے دی ہے) کسی کی شفاعت نہیں کرتے اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔

۲۹۔ اور جو کوئی اُن میں سے یہ کہے کہ مَیں خدا کے سوا معبود ہوں۔ تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے اور ہم ظالموں کو اسی طرح سے سزا دیتے ہیں۔

تفسیر

فرشتے مکرم اور فرمانبردار بندے ہیں :

چونکہ گزشتہ بحث کی آخری آیت میں پیغمبروں اور ہر قسم کے شرک کی نفی (اور ضمناً عیسٰی خدا کا بیٹا ہونے کی نفی) کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات سب کی سب فرشتوں کے خدا کی اولاد ہونے کی نفی کے بارے میں ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ بہت سے مشرکین عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی اولاد ہیں اور اسی بناء پر کبھی ان کی پرستش کرتے تھے۔ قرآن مندرجہ بالا آیات میں صراحت کے ساتھ اس بے ہودہ اور بے بنیاد عقیدے کی مذمت کرتا ہے اور مختلف دلائل کے ساتھ اس کا بطلان ظاہر کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے : انہوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن کی اولاد ہے۔ (وقالوا اتخذ الرحمٰن ولداً)۔

اگر ان کی مراد حقیقی بیٹا ہو تو اس کے لیے جسم لازم ہے اور اگر یہ متبنٰی (منہ بولا بیٹا) ہو کہ جو عربوں میں معمول تھا، تو وہ بھی ضعف و احتیاج کی دلیل ہے اور ان سب باتوں سے قطع نظر اصولی طور پر بیٹے کی احتیاج اور ضرورت اسے ہوتی ہے جو فنا ہونے والا ہو، تو اس کی نسل، جائیداد اور آثار کی بقا کے لیے اس کا بیٹا مدت دراز تک اس کی زندگی کو دوام بخشے، یا (اسے بیٹے کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے تاکہ اُسے) تنہائی کا احساس نہ ہو اور وہ اس کا مونس تنہائی بنے یا اپنی طاقت میں اضافے کے لیے لیکن ایسا ازلی ابدی وجود جو جسم نہ رکھتا ہو اور ہر لحاظ سے بے نیاز ہو اس کے بارے میں بیٹا یا اولاد کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔

لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے : وہ اس عیب و نقص سے پاک اور منزہ ہے (سبحانہ)۔

اس کے بعد فرشتوں کی صفات چند شقوں میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ مجموعی طور پر اس بات پر ایک روشن دلیل ہیں کہ وہ خدا کی اولاد نہیں ہیں :

۱۔ وہ بندگانِ خدا ہیں (بل عباد)۔

۲۔ وہ مکرم و محترم بندے ہیں (مکرمون)۔

وہ بھاگ جانے والے غلاموں کی طرح نہیں ہیں کہ جو اپنے آقا کی سختی اور دباؤ تلے رہ کر خدمت کرتے ہیں بلکہ وہ ایسے بندے ہیں کہ جو ہر لحاظ سے مکرم ہیں اور جو راہِ عبودیت کو اچھی طرح سے جانتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ خدا نے بھی عبودیت میں ان کے خلوص کی وجہ سے انہیں مکرم و محترم قرار دیا ہے۔ اور انہیں اپنی بہت سی نعمات عطا کی ہیں۔

٭ ٭ ٭

۳۔ وہ اس قدر مؤدب اور خدا کے فرمانبردار ہیں کہ "کبھی بات کرنے میں اس پر سبقت نہیں کرتے" (لایسبقونہ بالقول)۔

۴۔ اور عمل کے لحاظ سے بھی "وہ صرف اسی کے فرمان پر عمل کرتے ہیں" (وھو بامرہ یعملون)۔

کیا یہ صفات، اولاد کی ہو سکتی ہیں یا بندوں کی ؟

٭ ٭ ٭ ٭

اس کے بعد ان کے بارے میں خدا کے احاطۂ علمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

خدا ان کے آج اور آیندہ کے اعمال کو بھی جانتا ہے اور گزشتہ کو بھی۔ ان کی دنیا سے بھی آگاہ ہے اور ان کی آخرت سے بھی۔ ان کے وجود سے پہلے بھی اور ان کے وجود کے بعد بھی۔ (یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم)[1]

مسلمہ طور پر فرشتے اس امر سے آگاہ ہیں کہ خدا ان کے بارے میں یہ سب کچھ جانتا ہے اور یہی عرفان اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ نہ تو اس سے پہلے کوئی بات کہتے ہیں اور نہ ہی اس کے فرمان سے سرتابی کرتے ہیں۔ اور اس طرح سے یہ جملہ ہو سکتا ہے کہ سابق آیت کے لیے تعلیل کا حکم رکھتا ہو۔

۵۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جو کہ خدا کے مکرم و محترم بندے ہیں، حاجت مندوں کے لیے شفاعت کریں گے لیکن اس بات پر توجہ رہے کہ "وہ ہرگز کسی ایسے کی شفاعت نہیں کریں گے جس کے بارے میں یہ نہ جان لیں کہ خدا اس سے راضی ہے اور اس نے اس کی شفاعت کی اجازت دے دی ہے"۔ (ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ)۔

یقیناً خدا کا راضی ہونا اور اس کا شفاعت کی اجازت دے دینا بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔ حتماً یہ اس سچے ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے ہے جس کے باعث انسان کا خدا کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر ممکن ہے انسان گناہ سے آلودہ ہو جائے لیکن اگر وہ اپنا رابطہ خدا اور اولیاء خدا سے بالکل منقطع نہ کرے تو اس کے بارے میں شفاعت کی امید ہے۔

لیکن اگر فکر اور عقیدے کے لحاظ سے اس کا تعلق بالکل ٹوٹ جائے یا عملی طور پر اس قدر آلودہ ہو کر شفاعت کی اہلیت کھو بیٹھا ہو، تو اس موقع پر کوئی پیغمبر، مرسل یا مقرب فرشتہ اس کی شفاعت نہیں کرے گا۔

یہ وہی مطلب ہے کہ جسے ہم فلسفۂ شفاعت کی بحث کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں کہ شفاعت ایک انسان ساز مکتب ہے اور گناہوں میں آلودہ لوگوں کو واپس صحیح راستے پر لانے کا ایک وسیلہ ہے نیز شفاعت کا عقیدہ یاس و ناامیدی سے بچاتا ہے کیونکہ ناامیدی انحراف اور گناہ میں غرق ہونے کا ایک عامل ہے۔ اس قسم کی شفاعت پر ایمان رکھنا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ گنہگار لوگ اپنا رابطہ خدا، انبیاء اور آئمہ سے منقطع نہ کریں، اپنے لوٹنے کے تمام راستوں کو ویران نہ کریں[2]

ضمنی طور پر یہ جملہ ان لوگوں کا جواب ہے کہ جو یہ کہتے تھے کہ ہم فرشتوں کی اس لیے عبادت کرتے ہیں تاکہ وہ بارگاہ خداوندی میں ہماری شفاعت کریں۔ قرآن کہتا ہے: وہ اپنی طرف سے کوئی کام نہیں کر سکتے لہٰذا جو کچھ چاہتے ہو وہ براہِ راست خدا سے چاہو، یہاں تک کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کی اجازت بھی۔

---

[1] بزرگ مفسرین نے اس جملے کی تفسیر میں تین باتیں کی ہیں، ہم نے مذکورہ بالا عبارت میں ان تینوں کو جمع کر دیا ہے۔ چونکہ یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں

[2] ہم شفاعت کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیہ ۴۸ اور ۲۵۴ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں، وہاں رجوع فرمائیں۔

۶۔ اسی معرفت اور آگاہی کے سبب سے "وہ صرف خدا سے ڈرتے ہیں اور صرف اسی کے خوف کو اپنے دل میں راہ دیتے ہیں" (وھو خشیتہ مشفقون)۔

وہ اس لیے نہیں ڈرتے کہ انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے بلکہ وہ عبادت میں کوتاہی یا ترک اُولیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "خشیت" اصل لغت کے لحاظ سے ہر قسم کے خوف کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایسا خوف ہوتا ہے کہ جو تعظیم و احترام کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

"مشفق" مادہ "اشفاق" سے، اُس توجہ کے معنی میں ہے کہ جو خوف کی آمیزش رکھتی ہو (چونکہ اصل میں یہ "شفق" کے مادہ سے لیا گیا ہے کہ جو ایسی روشنی ہے کہ جو تاریکی کے ساتھ ملی ہوئی ہو)

اس بنا پر ان کا خدا سے خوف ایسا نہیں ہے جیسا کہ کسی انسان کو ایک وحشتناک حادثہ کا خوف ہوتا ہے اور اسی طرح ان کا "اشفاق" ایسے بھی نہیں جیسے کہ انسان کسی خطرناک چیز سے ڈرتا ہے بلکہ ان کا خوف و اشفاق احترام، عنایت، توجہ، معرفت اور احساس مسئولیت کی آمیزش کے ساتھ ہوتا ہے[1]

یہ بات واضح ہے کہ فرشتے ان عمدہ اور امتیازی صفات اور خالص مقام عبودیت کے باوجود ہرگز خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے۔ لیکن اگر یہ فرض کرلیں کہ "اُن میں سے کوئی یہ کہنے لگے کہ خدا نہیں میں معبود ہوں تو ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے، ہاں! ظالموں کو ہم اسی طرح سے سزا دیا کرتے ہیں"۔ (ومن یقل منھم انی الٰہ من دونہ فذٰلک نجزیہ جھنم، کذٰلک نجزی الظالمین)۔

درحقیقت الوہیت کا دعویٰ کرنا، اپنے اُوپر بھی اور معاشرے کے اُوپر بھی ظلم کرنے کا ایک واضح مصداق ہے اور قانونِ کلی میں "کذٰلک نجزی الظالمین" درج ہے۔

۳۰۔ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○

۳۱۔ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ○

۳۲۔ وَجَعَلْنَا السَّمَاۗءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ښ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا

---

[1] مفردات راغب: مادہ "خشیت" "شفق" اور تفسیر المعانی آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

مُعْرِضُونَ ۝

۳۳۔ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝

ترجمہ

۳۰۔ کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ہم نے انہیں ایک دوسرے سے جُدا کیا اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا وہ ایمان نہیں لاتے؟

۳۱۔ اور ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے تاکہ وہ آرام و سکون میں رہیں اور زمین ان کے ساتھ کسی طرف کو ڈھلک نہ جائے اور ان میں درے اور راستے قرار دیے تاکہ اپنی منزلِ مقصود کو جا پہنچیں۔

۳۲۔ اور آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا لیکن وہ اس کی آیات سے رُوگرداں ہیں۔

۳۳۔ وہ وہی ہے جس نے رات دن بنائے نیز سورج اور چاند کو پیدا کیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک اپنے ہی مدار میں گردش کر رہا ہے۔

تفسیر

جہانِ ہستی میں خدا کی مزید نشانیاں:

گزشتہ آیات میں مشرکین کے بیہودہ عقائد کا ذکر تھا اور ان میں توحید سے متعلق دلائل پیش کیے گئے تھے۔ اس کے بعد زیربحث آیات میں عالمِ ہستی کے نظام میں خدا کی نشانیوں کا ایک سلسلہ اور اس کی منظم تدبیر کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ گزشتہ مباحث پر مزید تاکید ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا کفار نے یہ نہیں دیکھا کہ سارے آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے اور ہم نے انہیں کھول دیا:

(اولم یر الذین کفروا ان السماوات والارض کانتا رتقًا ففتقناھما)۔

اور ہم نے ہر زندہ موجود کو پانی سے پیدا کیا ہے: (وجعلنا من الماء کل شیء حی)۔

کیا ان آیات اور نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے باوجود بھی وہ ایمان نہیں لاتے: (افلا یؤمنون)۔

اس بارے میں کہ "رتق" و "فتق" (پیوستگی اور جدائی) کہ جو یہاں آسمانوں اور زمین کے بارے میں کہی گئی ہے ۔ اس سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں کہ جن میں تین تفسیریں آیت کے مفہوم کے زیادہ نزدیک معلوم ہوتی ہیں اور جیسا کہ ہم بیان کریں گے ممکن ہے تینوں تفسیریں آیت کے مفہوم میں جمع ہوں[1]۔

---

[1] فخر رازی تفسیر کبیر میں اور بعض دوسرے مفسرین۔

۱۔ آسمان و زمین کی ایک دوسرے سے پیوستگی، ابتداء خلقت کی طرف اشارہ ہے۔
محققین کے نظریے کے مطابق یہ جہان مجموعی طور پر حرارت سے پیدا شدہ بھاپ کے ایک عظیم ملے ہوئے ٹکڑے کی صورت میں تھا کہ جس میں اندرونی تغیرات اور حرکت کی وجہ سے آہستہ آہستہ اور بتدریج اجزاء بکھرتے رہے اور نظامِ شمسی کے تمام سیارے اور ستارے اور کرۂ زمین وجود میں آئے اور ابھی بھی یہ جہان اسی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔
۲۔ پیوستگی سے مراد یہ ہے کہ جہان کا مادہ ایک ہی طرح کا تھا۔ اس طرح سے کہ سب کے سب آپس میں ملے ہوئے تھے اور ایک مادۂ واحد کی صورت میں معلوم ہوتے تھے لیکن زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مادے ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے اور ان میں نئی نئی ترکیبیں پیدا ہونے لگیں اور آسمان و زمین میں طرح طرح کی نباتات، حیوانات اور دوسری موجودات ظاہر ہوئیں۔ ایسی موجودات کہ اُن میں سے ہر ایک موجود ایک مخصوص نظام، آثار اور امتیازی خواص رکھتا ہے اور اُن میں سے ہر ایک پروردگار کی عظمت، علم اور لامتناہی قدرت کی نشانی ہے۔[1]
۳۔ آسمان کی باہم پیوستگی سے مراد یہ ہے کہ ابتداء میں بارش نہیں ہوتی تھی اور زمین کی باہم پیوستگی سے مراد یہ ہے کہ اُس زمانے میں کوئی نباتات نہ اُگتی تھیں لیکن خدا نے ان دونوں کو کھول دیا۔ آسمان سے بارش نازل کی اور زمین سے انواع واقسام کی نباتات اُگائیں۔
متعدد روایات ___ جو اہلِ بیتؑ سے بیان ہوئی ہیں ___ آخری معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اُن میں سے بعض پہلی تفسیر کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔[2]
اس میں شک نہیں کہ آخری تفسیر ایک ایسی چیز ہے کہ جو آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہے کہ آسمان سے کس طرح بارش نازل ہوتی ہے اور زمینیں شگافتہ ہوتی ہیں اور نباتات اُگتی ہیں اور یہ "اولم یر الذین کفروا" (کیا وہ لوگ کہ جو کافر ہوگئے ہیں، انہوں نے نہیں دیکھا ۔ ۔ ۔) کے جملہ کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور یہ "وجعلنا من الماء کل شیء حی" (اور ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز کو بنایا ہے) کے جملہ کے ساتھ بھی پوری پوری ہم آہنگی رکھتی ہے۔
لیکن پہلی اور دوسری تفسیر بھی ان جملوں کے وسیع معنی کے مخالف نہیں ہے کیونکہ "رویت" بعض اوقات علم کے معنی میں بھی آتی ہے یہ ٹھیک ہے کہ یہ علم وآگاہی سب کے لیے نہیں ہے۔ یہ صرف کچھ ہی صاحبِ علم ہوتے ہیں کہ جو آسمان و زمین کے گزشتہ کے بارے میں اور ان کی پیوستگی اور پھر اُن کی جدائی کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ قرآن ایک زمانہ یا ایک صدی کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ انسانوں کے لیے ہر دور میں رہبر رہا ہے۔
اسی بنا پر قرآن میں اس قسم کے عمیق اور گہرے مطالب ہیں یہ ہر گروہ اور ہر زمانے کے لیے قابلِ استفادہ ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ زیرِ بحث آیت تینوں تفاسیر کی حامل ہو کہ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر صحیح اور کامل ہے اور ہم نے بارہا کہا ہے کہ کسی لفظ کا ایک سے زیادہ معنی میں استعمال، نہ صرف یہ کہ قابلِ اعتراض نہیں بلکہ کبھی کمالِ فصاحت کی دلیل ہوتا ہے۔

---

[1] المیزان، زیرِ بحث آیہ کے ذیل میں۔
[2] تفسیر صافی اور تفسیر نور الثقلین میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں رجوع کریں۔

اور یہ جو روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ " قرآن کے کئی مختلف بُطون ہیں "، ہوسکتا ہے یہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو۔

باقی رہا تمام زندہ موجودات کے پانی سے پیدا ہونے کے بارے میں کہ جس کی طرف زیرِ بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے، تو اس کے لیے دو تفسیریں مشہور ہیں :

۱۔ تمام زندہ موجودات کی حیات ــــ خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوانات ــــ پانی کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہی پانی کہ بالآخر جس کا مبداء وہی بارش ہے کہ جو آسمان سے نازل ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ یہاں " ماء " نطفہ کے پانی کی طرف اشارہ ہے کہ جس سے عام طور پر زندہ موجودات وجود میں آتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے محققین اور سائنس دان یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ زندگی کا سب سے پہلا جاندار سمندروں کی گہرائیوں میں پیدا ہوا، اسی بناء پر وہ زندگی اور حیات کا آغاز پانی سے سمجھتے ہیں۔

نیز اگر قرآن انسان کی خلقت کو مٹی سے شمار کرتا ہے، تو اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ مٹی سے مراد وہی " طین " (گارا) ہے کہ جو پانی اور مٹی سے مل کر بنتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ، دانشمند محققین کی تحقیق کے مطابق انسان کے بدن اور بہت سے حیوانات کے بدن کا زیادہ حصہ پانی ہی سے بنا ہوا ہے۔ (تقریباً ستر فیصد حصہ)۔

اور یہ جو بعض نے اعتراض کیا ہے کہ فرشتوں اور جنات کی پیدائش، باوجود اس کے کہ وہ بھی زندہ موجودات ہیں، مسلمہ طور پر پانی سے نہیں ہے، اس کا جواب واضح ہے کیونکہ یہاں مقصد وہ زندہ موجودات ہیں کہ جنہیں ہم محسوس کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک شخص نے امام صادقؑ سے پوچھا کہ پانی کا کیا ذائقہ ہے تو امامؑ نے پہلے فرمایا :

سل تفقھًا ولا تسئل تعنتًا

سمجھنے کے لیے سوال کر بہانہ سازی کے لیے نہ پوچھ۔

اس کے بعد آپؑ نے مزید فرمایا :

طعم الماء طعم الحیاۃ ! قال اللہ سبحانہ وجعلنا من الماء کل شیء حی

" پانی کا ذائقہ وہی ہے جو حیات کا ذائقہ ہے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم نے ہر زندہ موجود کو پانی سے پیدا کیا ہے "۔

خصوصاً جب انسان گرمیوں میں بہت عرصہ پیاسا رہے، ہوا بھی جھلسانے والی ہو، اس کے بعد اسے خوشگوار پانی میسر آجائے تو جونہی پانی کا پہلا گھونٹ پیتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے بدن میں جان ڈالی جارہی ہے۔ حقیقت میں امامؑ یہ چاہتے ہیں کہ زندگی اور پانی کے ارتباط اور پیوستگی کو اس خوبصورت انداز میں ظاہر کریں۔

بعد والی آیت توحید کی نشانیوں اور اس کی عظیم نعمتوں کے ایک اور حصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے : ہم نے زمین میں مضبوط پہاڑ گاڑ دیے تاکہ وہ انسانوں کو نہ لرزائے (وجعلنا فی الارض رواسی ان تمید بھم)[1]

---

[1] رواسی جمع ہے راسیہ کی اس کا معنی ہے سخت اور گڑے ہوئے پہاڑ اور یہ کہ اس قسم کے پہاڑ نیچے بنیادوں میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں لہٰذا ممکن ہے اس پیوستگی کی طرف اشارہ ہو اور سائنسی لحاظ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ پہاڑوں کی جڑوں کی یہ باہم پیوستگی زمین کے لرزنے اور جھٹکے کھانے سے روکنے میں گہرا اثر رکھتی ہے۔ " تمید " میدٌ کے مادہ سے بڑی بڑی چیزوں کے ناموزوں جھٹکوں اور لرزنے کے معنی میں ہے۔

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ پہاڑوں نے کرۂ زمین کو ایک زرہ کی طرح اپنے اندر لیا ہوا ہے اور یہ زمین کے اندر گیسوں کے دباؤ کی وجہ سے جو شدید جھٹکے اور زلزلے پیدا ہوتے ہیں، انہیں بہت حد تک روکنے کا سبب بنتے ہیں۔

علاوہ ازیں پہاڑوں کی یہی وضع و کیفیت، چاند کی کشش سے ہونے والے مدو جزر کے مقابلہ میں زمین کے اوپر کے حصہ کی حرکات کو کم سے کم رکھتی ہے۔

دوسری طرف اگر پہاڑ نہ ہوتے تو سطح زمین ہمیشہ تیز ہواؤں کی زد میں ہوتی اور اس میں کوئی آرام و سکون دکھائی نہ دیتا، جیسا کہ شور زدہ زمینوں اور خشک جلانے والے بیابانوں میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور نعمت کی طرف کہ وہ بھی اس کی عظمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے ان عظیم پہاڑوں کے اندر درّے اور راستے بنا دیئے ہیں تاکہ ان کی راہنمائی ہو اور وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں:

(وجعلنا فیھا فجاجًا سبلًا لعلھم یھتدون)۔

سچ مچ اگر یہ درّے اور شگاف نہ ہوتے تو زمین میں ان عظیم پہاڑوں کا موجود سلسلہ مختلف علاقوں کو ایک دوسرے سے اس طرح جدا کر دیتا کہ ان کا تعلق ایک دوسرے سے بالکل ختم ہو جاتا اور یہ بات اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ سب ظہور پذیر ہونے والے امور ایک حساب اور پروگرام کے مطابق ہیں۔

٭ ٭

اور چونکہ انسان کی زندگی کے سکون کے لیے زمین کا سکون تنہا کافی نہیں ہے بلکہ اوپر کی طرف سے بھی اس کے لیے امن و امان ہونا چاہیئے لہٰذا بعد والی آیت میں یہ اضافہ کیا گیا ہے: ہم نے آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا ہے لیکن وہ اس وسیع آسمان میں موجود توحید کی آیات اور نشانیوں سے منہ پھیرے ہوئے ہیں (وجعلنا السماء سقفا محفوظا وھم عن اٰیاتھا معرضون)۔

یہاں پر آسمان سے مراد — جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں — وہ فضا ہے کہ جس نے زمین کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور محققین کی تحقیقات کے مطابق اس کی ضخامت کئی سو کلو میٹر ہے۔ یہ ظاہری طور پر لطیف قشر کہ جو ہوا اور گیسوں سے مل کر بنا ہے اس قدر محکم اور مضبوط ہے کہ باہر کی طرف سے جو بھی ٹکرانے والی موجود چیز زمین کی طرف آئے گی وہ نابود ہو جائے گی اور یہ زمین کے کرہ کو رات دن "شہاب" کے پتھروں کی بمباری سے، کہ جو ہر قسم کے گولوں سے زیادہ خطرناک ہیں، محفوظ رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں سورج کی وہ شعاعیں کہ جو موت کا پیغام بن سکتی ہیں، اس کے ذریعے سے صاف ہو جاتی ہیں اور ان مہلک شعاعوں کو کہ جو فضا سے زمین کی طرف آرہی ہوتی ہیں روک دیتا ہے۔

ہاں! یہ آسمان بہت ہی مضبوط اور پائیدار چھت ہے کہ جسے خدا نے منہدم ہونے سے بچا رکھا ہے[1]

---

[1] بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کو ان آیات سے ہم آہنگ سمجھا ہے کہ جو قرآن مجید میں شہاب کے ذریعے شیاطین کے آسمانوں پر چڑھنے سے محفوظ رہنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ (مثلاً: وحفظا من کل شیطان مارد۔ صافات)

لیکن یہ بات واضح اور روشن ہے کہ یہ تفسیر لفظ "سقف" (چھت) کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ چھت ان لوگوں کے لیے کہ جو اس کے نیچے ہوتے ہیں، ایک ڈھانپنے کی چیز ہوتی ہے، کہ جو اس کے اوپر ہو۔ (غور کیجئے گا)

آخری زیر بحث آیت میں رات دن اور سورج و چاند کی خلقت کا بیان شروع کرتے ہوئے کہا گیا ہے: وہی ہے کہ جس نے رات دن اور سورج و چاند کو پیدا کیا ہے: (وھو الذی خلق اللیل والنھار والشمس والقمر)۔

اور ان میں سے ہر ایک اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے: (کل فی فلک یسبحون)۔

چند اہم نکات:

۱۔ "کل فی فلک یسبحون" کا مفہوم: اس کی تفسیر کے بارے میں مفسرین نے مختلف بیانات دیئے ہیں لیکن وہ بات کہ جو علم افلاک کے ماہرین کی مسلمہ تحقیقات سے ہم آہنگ ہے یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سورج کی حرکت سے مراد یا تو حرکت دوری ہے کہ جو وہ خود اپنے گرد کرتا ہے یا وہ حرکت ہے کہ جو وہ نظام شمسی کے ہمراہ رکھتا ہے۔

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ لفظ "کل" ممکن ہے چاند اور سورج کی طرف اشارہ ہو اور اسی طرح ستاروں کی طرف بھی اشارہ ہو کیونکہ کلمہ "لیل" (شب) سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "شب" اور "روز" اور چاند اور سورج (چاروں) کی طرف اشارہ ہو کیونکہ رات تو زمین کا مخروطی سایہ ہی ہے۔ نیز اس کا اپنا مدار بھی ہے۔ اگر کوئی شخص کرۂ زمین سے باہر دور سے اس کی طرف دیکھے تو وہ اس تاریک مخروطی سائے کو زمین کے گرد دائما اور ہمیشہ حرکت میں دیکھے گا اور اسی طرح سورج کی وہ روشنی کہ جو زمین پر پڑتی ہے اور جس سے دن کا ظہور ہوتا ہے، اس ستون کی مانند ہے کہ جو اس کرہ کے گرد ہمیشہ نقل مکانی کرتا رہتا ہے، لہٰذا رات اور دن بھی اپنے لیے ایک گردش اور ایک مکان رکھتے ہیں[1]۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ سورج کی حرکت سے مراد ہمارے احساس میں اس کی حرکت ہے کیونکہ زمین پر کھڑے ہو کر دیکھنے والے کے لیے سورج اور چاند دونوں گردش میں ہیں۔

۲۔ آسمان محکم چھت ہے: ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ "سماء" (آسمان) قرآن میں مختلف معانی کے لیے آیا ہے۔ کبھی تو وہ زمین کی فضا یعنی ہوا کے اس ضخیم قشر کے معنی میں آیا ہے کہ جس نے کرۂ ارض کو چار طرف سے گھیرا ہوا ہے جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں ہے۔ اس مقام پر فزکس کے ماہرین کی زبان سے اس عظیم چھت کی مضبوطی اور استحکام کے بارے میں مزید وضاحت بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

"فرانک آلن" جو فزکس کا استاد ہے، اس طرح لکھتا ہے:

> وہ فضائی قشر (جو) کہ جو سطح زمین پر زندگی کی نگہبانی کرنے والی گیسوں سے مل کر بنا ہوا ہے، اس قدر ضخیم ہے کہ جو ایک زرہ کی طرح، زمین کو، ایسے بیس ملین آسمانی پتھروں کے شر سے کہ جو موت کا پیغام ہوتے ہیں اور جو ۵۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے اُس کے

---

[1] یہ اقتباس المیزان سے لیا گیا ہے۔

ساتھ آٹکراتے ہیں، امان میں رکھ سکتا ہے۔

زمین کا فضائی قشر (جو) اُن دوسرے کاموں کے علاوہ سطح زمین پر درجہ حرارت کو بھی زندگی کے لیے درکار حدود تک محفوظ رکھتا ہے اس کے علاوہ پانی اور پانی کے بخارات کے بہت ہی ضروری ذخیرے کو سمندروں سے خشکی کی طرف منتقل کرتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام براعظم شوردار، خشک، ناقابلِ زیست زمین میں تبدیل ہوجاتے۔ اس طرح یوں کہنا چاہیئے کہ سمندر اور جوِ زمین، زمین کے لیے کنویں سے پانی کھینچنے والی چرخی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان شہابوں میں سے بعض کا وزن کہ جو زمین کی طرف آتے ہیں ایک گرام کے ہزارویں حصّے کی مقدار کے برابر ہوتا ہے لیکن حد سے زیادہ سرعت اور تیزی کی وجہ سے اس کی قوت وطاقت، ایٹمی ذرّات کی طاقت کے برابر ہوتی ہے کہ جن سے تباہ کن بم تیار ہوتے ہیں اور اُن شہابوں کا حجم بعض اوقات ریت کے ایک ذرّہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

اِن شہابوں میں سے کئی ملین شہاب ہر روز زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی جل جاتے ہیں یا بخارات میں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن بعض اوقات بعض شہابوں کا حجم اور وزن اِس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ گیسوں کے قشر سے گزر کر سطح زمین کے ساتھ ٹکراتے ہیں۔

منجملہ اُن شہابوں کے جو مذکورہ گیسوں سے نکل کر زمین تک پہنچے ایک بہت بڑا مشہور شہاب "سیبری" ہے کہ جو ۱۹۵۹ء میں زمین سے آٹکرایا تھا۔ اس کا قطر اتنا بڑا تھا کہ اس نے تقریباً ۲ کیلومیٹر زمین کو گھیر لیا تھا اور اس کے گرنے سے بہت سے نقصانات ہوئے تھے۔

ایک اور شہاب وہ ہے کہ جو امریکہ میں "اریزونا" کے مقام پر گرا تھا کہ جس کا قطر ایک کیلومیٹر اور اس کی موٹائی بیس میٹر تھی۔ اس کے گرنے سے زمین میں گہرا شگاف پڑ گیا تھا اور اُس کے پھٹنے سے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے شہاب پیدا ہوگئے تھے کہ جو دُور دُور جا گرے تھے۔

"کرسی موریسن لکھتا ہے: اگر وہ ہوا کہ جو زمین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، اس کی نسبت کہ جتنی اب ہے کچھ بھی کم اور پتلی ہوتی تو اجرام سماوی اور شہاب ثاقب کہ جو روزانہ کئی ملین کی تعداد میں اس سے آٹکراتے ہیں اور اسی فضا کے اندر باہر ہی باہر منتشر اور نابود ہو جاتے ہیں، ہمیشہ سطح زمین پر پہنچ جاتے اور اس کے گوشہ و کنار سے آ آ کر ٹکراتے رہتے یہ اجرامِ فلکی چھ سے چالیس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتے ہیں اور جس چیز سے بھی جا ٹکراتے ہیں اُسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور اس میں آگ بھڑکا دیتے ہیں۔

اگر ان اجرام سماوی کی حرکت اور تیزی، اس سے کمتر ہوتی، جتنی کہ اب ہے، مثلاً وہ ایک گولی کی سرعت اور تیزی کے برابر ہوتی، تو وہ سب کے سب سطح زمین پر آ گرتے اور ان کی تباہی کا نتیجہ واضح ہے، منجملہ ان کے اگر خود انسان ان اجرام سماوی کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کی زد میں آجاتا، تو اس کی حرارت کی شدت کے باعث — کہ جو گولی کی سرعتِ حرکت کی نسبت نوّے گنا زیادہ ہے، ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ ہو جاتا۔

زمین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوا کی موٹائی اِس قدر ہے کہ وہ سُورج کی شعاعوں کو صرف اتنی ہی مقدار میں کہ جتنی نباتات کی نشوونما کے لیے ضروری ہے، زمین کی طرف آنے دیتی ہے اور تمام ضرر رساں جراثیم کو اسی فضا کے اندر نیست و نابود کر دیتی ہے اور مفید وٹامن پیدا کرتی ہے [1]

۳۴۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ○

۳۵۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ○

ترجمہ

۳۴۔ ہم نے تجھ سے پہلے کسی بھی انسان کو دائمی زندگی نہیں دی، (تو اس وقت وہ لوگ کہ جو تیری موت کا انتظار کر رہے ہیں) اگر تو مر جائے تو کیا وہ ہمیشہ جیتے ہی رہیں گے ؟

۳۵۔ ہر انسان موت کا ذائقہ چکھے گا ——— اور ہم مصیبت و راحت کے ذریعے تمہاری آزمائش کریں گے اور آخر کار تم ہماری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے۔

تفسیر

موت سب کے لیے ہے :

گذشتہ آیات کے ایک حصہ میں بیان ہوا ہے کہ مشرکین پیغمبر اکرمؐ کی نبوّت کی تردید کے لیے ان کے انسان ہونے کو بہانہ بناتے تھے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ پیغمبر کو حتمی طور پر فرشتہ ہونا اور ہر قسم کے بشری عوارض سے خالی ہونا چاہیئے۔

زیر بحث آیات ان کے کچھ اور اعتراضات کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کبھی تو وہ یہ کہتے تھے کہ پیغمبر نے جو شاعرانہ سر و صدا بلند کر رکھی ہے، ہمیشہ نہیں رہے گی اور اس کے مرنے سے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ سورہ طور کی آیہ ۳۰ میں بیان ہوا ہے :

[1] کتاب "رازِ آفرینش انسان" ص ۳۴ تا ۳۵۔

ام یقولون شاعر نتربص بہ ریب المنون

اور کبھی یہ خیال کرتے تھے کہ چونکہ اس شخص کا نظریہ یہ ہے کہ یہ خاتم انبیاءؐ ہے۔ لہٰذا اُسے ہرگز نہیں مرنا چاہیئے تاکہ اپنے دین کا محافظ ہو۔ لہٰذا اس کی موت اس کے دعویٰ کے باطل ہونے کی دلیل ہوگی۔

قرآن مندرجہ بالا پہلی آیت میں مختصر سے جملے میں انہیں جواب دیتا ہے اور کہتا ہے : ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کو جاودان زندگی نہیں دی : (وما جعلنا لبشر من قبلك الخلد)۔

یہ فطرت کا ناقابل تغیر قانون ہے کہ کوئی بھی شخص حیات جاودانی نہیں رکھتا ، لہٰذا جو لوگ ابھی سے تیری موت کی خوشی منا رہے ہیں کیا اگر تجھے موت آنی ہے تو وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے : (افان مت فھم الخالدون)۔

شاید اِس بات کی وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ شریعت و دین و آئین کی بقا اس کے لانے والے کی بقا کی محتاج نہیں ہے۔ ابراہیمؑ و موسٰیؑ اور عیسٰیؑ اگرچہ حیات جاوید نہ رکھتے تھے لیکن ان عظیم پیغمبروں کی وفات کے (اور حضرت عیسٰیؑ کے آسمان کی طرف صعود کرنے کے) بعد بھی قرنوں تک ان کا آئین و دین باقی رہا۔

لہٰذا دین و مذہب کی بقا اس بات کی محتاج نہیں کہ پیغمبر اس کی حفاظت کے لیے ہمیشہ موجود رہے کیونکہ اس کے جانشین اس کی تعلیمات اور ہدایات کو جاری اور برقرار رکھ سکتے ہیں۔

اور یہ بات کہ جو وہ خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر کے چلے جانے کے بعد تمام چیزیں ختم ہو جاتی ہیں ، درحقیقت ان کے بالکل اندھے پن کا ثبوت ہیں کیونکہ یہ بات ان مسائل کے بارے میں تو صحیح ہے کہ جو کسی شخص کے ساتھ قائم ہوں اسلام نہ تو شخصی اعتبار سے پیغمبر کے ساتھ قائم تھا اور نہ ہی آپ کے انصار و اصحاب کے ساتھ۔ یہ ایک ایسا زندہ اور رواں دواں دین و آئین ہے کہ جو اپنی اندرونی حرکت کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے۔ اور زمان و مکان کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے اپنی حرکت اور سفر جاری رکھتا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد تمام نفوس کے بارے میں موت کے بلا استثناء عمومی قانون کو اس طرح بیان کرتا ہے : ہر انسان موت کا ذائقہ چکھے گا : (کل نفس ذائقۃ الموت)۔

یہ بات یاد دلانا ضروری ہے کہ لفظ " نفس " قرآن مجید میں مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے " نفس " کا پہلا معنی " ذات " یا اپنا آپ ہے۔ یہ ایک وسیع معنی ہے ، یہاں تک کہ خدا کی ذات پاک پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا ہے :

کتب علی نفسہ الرحمۃ

خدا نے رحمت کو اپنے اُوپر لازم قرار دے لیا ہے۔ (انعام - ۱۲)

بعد میں یہ لفظ انسان کے لیے یعنی جسم و رُوح کے مجموعے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ مثلاً :

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا

جو شخص کسی انسان کو بغیر اس کے کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد کیا ہو قتل کر دے تو یہ ایسے ہے جیسے اُس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا ہو۔ (مائدہ - ۳۲)

کبھی خصوصیت کے ساتھ یہ لفظ انسان کی رُوح کے لیے استعمال ہوا ہے مثلاً :

اخرجوا انفسکم

رُوحوں کو قبض کرنے والے فرشتے کہیں گے کہ اپنی رُوح کو باہر نکالو۔ (انعام ۹۳)

یہ بات ظاہر ہے کہ زیر بحث آیت میں " نفس " سے دوسرا معنی مراد ہے۔ مقصد انسانوں کے بارے میں عمومی قانون بیان کرنا ہے اور اس طرح سے آیت میں کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ " نفس " کی تعبیر تو خدا یا فرشتوں کے لیے بھی آئی ہے، تو آیہ کو کس طرح جانداروں کے لیے مختص قرار دیا جائے اور خدا اور فرشتوں کو اس میں سے کیسے خارج کیا جائے۔[1]

موت کے عمومی قانون کو بیان کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ناپائیدار زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے؟

قرآن اسی آیت کے آخر میں کہتا ہے : ہم تمہارا شر اور خیر کے ذریعے امتحان لیں گے اور آخر کار تم ہماری طرف ہی لوٹ کر آؤ گے: (ونبلوکم بالشر والخیر فتنة والینا ترجعون)۔

تمہاری اصلی جگہ یہ جہان نہیں ہے بلکہ دوسرا جہان ہے۔ تم یہاں صرف امتحان دینے کے لیے آئے ہو اور امتحان ختم ہونے اور ضروری تکمیل کے بعد اپنی اصلی جگہ کی طرف، جو کہ دارِ آخرت ہے، چلے جاؤ گے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ امتحان کے امور میں " شر " کو " خیر " پر مقدم بیان کیا گیا ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ خدائی آزمائش اگرچہ کبھی نعمت کے ذریعے ہوتی ہے اور کبھی بلا و مصیبت کے ذریعے لیکن مسلمہ طور پر بلا و مصیبت کے ذریعے ہونے والی آزمائش زیادہ سخت اور زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

یہ نکتہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ یہاں " شر " مطلق شر کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ یہاں ایسا " شر " مراد ہے کہ جو آزمائش اور تکامل کا ذریعہ ہے۔ اس بنا پر یہاں مراد نسبی شر ہے اور اصولی طور پر صحیح توحیدی نقطۂ نظر سے تمام عالمِ ہستی میں مطلق شر وجود ہی نہیں رکھتا (غور کیجیے گا)۔

لہٰذا ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک دفعہ امامؑ بیمار ہو گئے تو کچھ بھائی اور دوست آپؑ کی عیادت کے لیے آئے اور عرض کیا :

کیف نجدك یا امیرالمؤمنین ؟ قال بالشر

اے امیر المومنینؑ آپ کا حال کیسا ہے ؟ آپؑ نے فرمایا : شر ہے۔

قالوا ماھذا کلام مثلك

انہوں نے کہا یہ بات آپ جیسی ہستی کے لائق نہیں ہے۔ امامؑ نے فرمایا :

" ان اللہ تعالٰی یقول و نبلوکم بالشر والخیر فتنة فالخیر الصحة والغنا والشر المرض والفقر "

خداوند تعالٰی فرماتا ہے کہ ہم تمہاری " شر " اور " خیر " کے ذریعے سے آزمائش کرتے ہیں،

[1] المیزان، جلد ۱۴، ص ۳۱۲۔

خیر تو تندرستی اور تونگری ہے اور "شر" بیماری اور فقر و فاقہ ہے (یعنی یہ وہ تعبیر ہے کہ جسے ہم نے قرآن مجید سے انتخاب کیا ہے)۔

یہاں ایک اہم سوال باقی رہ جاتا ہے کہ خدا بندوں کی آزمائش کیوں کرتا ہے اور اصولی طور پر خدا کے بارے میں آزمائش کیا مفہوم رکھتی ہے؟

اس سوال کا جواب ہم تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیہ ۱۵۵ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں کہ خدا کے بارے میں آزمائش، تربیت کرنے کے معنی میں ہے۔ (اس موضوع کی مکمل تفصیل کا وہاں پر مطالعہ کریں)۔

٭ ٭ ٭

۳۶۔ وَإِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا إِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ إِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

۳۷۔ خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۭ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۝

۳۸۔ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

۳۹۔ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

۴۰۔ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۶۔ جب کفار تجھے دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق اڑانے کے سوا انہیں اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ (اور وہ یہ کہتے ہیں کہ) کیا یہ وہی شخص ہے کہ جو تمہارے خداؤں کے بارے میں باتیں بناتا ہے؟ حالانکہ وہ خود خدائے رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں۔

۳۷۔ ہاں! انسان جلد باز مخلوق ہے اگر تم جلدی نہ کرو، میں عنقریب تمہیں اپنی آیات دکھاؤں گا۔

۳۸۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو (تو بتاؤ) یہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا؟

۳۹۔ لیکن اگر کافر اس زمانے کو جانتے ہوتے کہ جب وہ آگ کے شعلوں کو اپنے چہروں اور اپنی پشتوں سے دُور نہیں کرسکیں گے اور کوئی شخص ان کی مدد بھی نہیں کرے گا (تو پھر اس قدر قیامت کے بارے میں جلدی نہ کرتے)

۴۰۔ ہاں! یہ خدائی عذاب اچانک ان کے پاس آئے گا اور انہیں مبہوت کردے گا۔ اس طرح سے کہ اسے دُور کرنے کی ان میں طاقت نہ ہوگی اور انہیں مہلت بھی نہیں دی جائے گی۔

تفسیر

اِنسان جلدباز مخلوق ہے:

ان آیات میں مشرکین کی پیغمبر اسلام کے متعلق ـــــ کچھ اور نکتہ چینیوں اور اعتراضات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں اصولی مسائل میں ان کی انحرافی طرزِ فکر کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس وقت کفار تجھے دیکھتے ہیں، تو تیرا تمسخر اُڑانے کے سوا انہیں اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا: (واذا راٰك الذین کفروا ان یتخذونك الا ھزوًا)۔

وہ بے پروائی کے ساتھ تیری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: کیا یہ وہی ہے کہ جو تمہارے خداؤں اور بتوں کی بُرائی کرتا ہے (اھٰذا الذی یذکر اٰلھتکم)[1]

حالانکہ وہ خود خدائے رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں (وھم بذکر الرحمٰن ھم کافرون)۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ اگر کوئی شخص ان پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے بتوں کی بُرائی کرے ـــــ بُرائی ہی بیان نہ کرے، بلکہ حقیقت کا اظہار کرے اور یہ کہے کہ یہ بے رُوح وبے شعور اور ایک بے قدر وقیمت موجودات ہیں، تو وہ اس بات پر تعجب کرتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ایسے مہربان اور بخشنے والے خدا کا منکر ہو جائے کہ جس کی رحمت کے آثار وسعتِ عالم پر محیط ہیں اور ہر چیز میں اس کی عظمت اور رحمت کی دلیل موجود ہے، تو یہ ان کے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ہاں! جس وقت انسان کو کسی چیز کی عادت ہو جاتی ہے اور اس کی خُو لُو اس میں رچ بس جاتی ہے اور اس میں پختہ ہو جاتا ہے تو وہ چیز اس کی نظروں کو اچھا لگنے لگتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی بدترین کیوں نہ ہو اور جس وقت وہ کسی چیز سے عداوت و دشمنی اختیار کر لیتا ہے تو آہستہ آہستہ وہ چیز اس کی نظروں کو بُری لگنے لگتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی زیبا اور محبوب کیوں نہ ہو۔

❁ ❁ ❁

اس کے بعد ان بے مہار انسانوں کے ایک اور قبیح اور بے سروپا کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: انسان جلدباز مخلوق ہے: (خلق الانسان من عجل)۔

---

[1] یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ میں یہ کہتے تھے، کہ یہ وہی شخص ہے کہ جو تمہارے خداؤں کے بارے میں باتیں کرتا ہے۔ وہ اس بات تک کے لیے راضی نہ تھے کہ بُرائی کا لفظ اپنی عبارت میں لے آئیں اور یہ کہیں کہ یہ تمہارے خداؤں کی بدگوئی کرتا ہے یا انہیں بُرا کہتا ہے۔

اگرچہ مفسرین نے یہاں پر "انسان" اور "عجل" کے بارے میں مختلف باتیں کی ہیں لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہاں پر انسان سے مراد نوع انسان ہی ہے (البتہ ایسے انسان کہ جو تربیت یافتہ نہ ہوں، بلکہ خدائی رہبروں کی رہبری سے باہر رہے ہوں) اور "عجل" سے مراد تیزی اور جلد بازی ہے۔ جیسا کہ بعد والی آیات اس بات پر شاہد ناطق ہیں اور قرآن میں ایک اور جگہ پر بیان ہوا ہے:

وکان الانسان عجولاً

انسان جلد باز ہے۔ (بنی اسرائیل - ۱۱)

درحقیقت "خلق الانسان من عجل" کی تعبیر ایک قسم کی تاکید ہے۔ یعنی انسان اس طرح کا جلد باز ہے کہ گویا جلد بازی اور "عجلہ" سے پیدا ہوا ہے اور اس کے وجود کے تار و پود اسی سے بنے ہیں اور سچ مچ بہت سے آدمی اسی بات کے عادی ہیں۔ وہ خیر اور بھلائی میں بھی جلد باز ہیں اور شر اور برائی میں بھی۔ یہاں تک کہ جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے کفر اور گناہ اختیار کیا تو عذاب الٰہی تمہارے دامن گیر ہو جائے گا تو وہ کہتے ہیں کہ یہ عذاب پھر جلدی کیوں نہیں آتا؟

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: جلدی نہ کرو، میں اپنی آیات تمہیں عنقریب دکھاؤں گا: (سأوریکم آیاتی فلا تستعجلون)۔

ممکن ہے یہاں پر "آیاتی" کی تعبیر، عذاب، بلا، مصائب اور سزاؤں کی آیات اور نشانیوں کی طرف اشارہ ہو کہ پیغمبر جس سے مخالفین کو ڈراتے تھے اور یہ کور مغز بار بار یہی کہتے تھے کہ وہ بلائیں اور مصیبتیں جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے کہاں گئیں؟

قرآن کہتا ہے کہ جلدی نہ کرو، زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ وہ تمہیں آلیں گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اُن معجزات کی طرف اشارہ ہو کہ جو پیغمبر اسلامؐ کی صداقت کی دلیل ہیں یعنی اگر تم تھوڑا سا صبر کرو، تو تمہیں کافی معجزات دکھائے جائیں گے۔

یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں، کیونکہ مشرکین دونوں چیزوں میں جلد بازی کرتے تھے اور خدا نے بھی دونوں ہی انہیں دکھائیں ــــ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور بعد والی آیات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

ان کے ایک اور عاجلانہ تقاضے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا: (و یقولون متٰی ھذا الوعد ان کنتم صادقین)۔

وہ انتہائی بے صبری کے ساتھ قیام قیامت کے منتظر تھے حالانکہ وہ اس بات سے غافل تھے کہ قیامت کے آتے ہی ان کی بیچارگی اور بدبختی کا آغاز ہو جائے گا لیکن کیا کیا جا سکتا ہے، جلد باز انسان اپنی بدبختی و نابودی کے لیے بھی جلد بازی کرتا ہے۔

ان کنتم صادقین (اگر تم سچے ہو) کی تعبیر جمع کی صورت میں ہے۔ حالانکہ مخاطب پیغمبر اسلامؐ تھے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ اس خطاب میں ان کے سچے پیروکاروں کو بھی شریک کیا گیا ہے اور وہ ضمنی طور پر یہ کہنا چاہتے تھے کہ قیامت کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ تم سب کے سب جھوٹے ہو۔

بعد والی آیت ان کو جواب دیتے ہوئے کہتی ہے: اگر کافر اس زمانے کو جانتے ہوتے کہ جب وہ آگ کے شعلوں کو

اپنے چہروں اور پشتوں سے دُور نہیں کرسکیں گے، اور کوئی شخص ان کی امداد کے لیے بھی نہیں آئے گا، تو وہ ہرگز عذاب کے لیے جلدی نہ کرتے اور یہ نہ کہتے کہ قیامت کب آئے گی۔ (لو یعلم الذین کفروا حین لا یکفون عن وجوههم النار ولا عن ظهورهم ولا هم ینصرون)۔

زیر بحث آیت میں "چہروں" اور "پشتوں" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دوزخ کی آگ اس طرح نہیں ہوگی کہ وہ ان کے ایک ہی طرف رہے بلکہ ان کے سامنے کا حصہ بھی آگ میں ہوگا اور پُشت والا حصہ بھی۔ گویا وہ آگ کے اندر غرق ہوں گے۔

"ولا هم ینصرون" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بُت کہ جن کے بارے میں وہ یہ گمان کرتے رہتے تھے کہ وہ ان کے شفیع و مددگار ہوں گے، اُن سے کچھ نہیں ہوسکے گا۔

اور یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ" یہ خدائی سزا اور جلا ڈالنے والی آگ اس طرح سے اچانک اُنہیں آلے گی کہ وہ مبہوت ہو کر رہ جائیں گے": (بل تأتیهم بغتة فتبهتهم)۔

" اور انہیں اس طرح سے غافل اور مقہور و مغلوب کردے گی کہ اُن میں اسے دُور کرنے کی بھی طاقت نہ ہوگی": (فلا یستطیعون ردها)۔

یہاں تک کہ اگر وہ اب مہلت کی خواہش بھی کریں اور اُس کے برخلاف کہ جس کے لیے وہ پہلے جلد بازی کیا کرتے تھے تاخیر کی درخواست کرنے لگیں تو بھی" انہیں مہلت نہیں دی جائے گی": (ولا هم ینظرون)۔

چند اہم نکات :

۱۔ جلد باز کو جلد بازی سے ممانعت : زیر بحث آیات پر توجہ کرتے ہوئے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر انسان فطری طور پر جلد باز ہے تو پھر اسے جلد بازی سے منع کرتے ہوئے کیوں کہا گیا ہے: " فلا تستعجلون " (تم جلدی نہ کرو)۔ کیا یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔

ہم جواب میں کہیں گے کہ انسان کے ارادہ کے اختیار اور آزادی اور اس کی اخلاقی صفات، خصوصیات اور جذبات و روحیات کے قابلِ تغیر ہونے کی طرف توجہ دیں تو واضح ہوگا کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ تربیت اور تزکیۂ نفس کے ذریعے اس حالت کو بدلا جاسکتا ہے۔

۲۔ " بل تأتیهم بغتة فتبهتهم " کا مفہوم : اس کا معنی ہے عذاب الٰہی اچانک ان کی طرف لپکے گا اور انہیں مبہوت کردے گا"۔ یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ قیامت کے عذاب کی ہر چیز دنیا کے عذاب سے مختلف ہے۔ مثلاً: جہنم کی آگ کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے:

نار الله الموقدة التی تطلع علی الافئدة

خدا کی روشن کی ہوئی آگ تو (ایسی ہے کہ جو) انسان کے دل میں جا کے لگے گی۔ (ہمزہ - ۶-۷)

یا یہ کہ جہنم کے ایندھن کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ:

وقودها الناس والحجارة

جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ (بقرہ۔ ۲۴)

اس قسم کی تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جہنم کی آگ اچانک اور غفلت کی حالت میں آنے والی اور مبہوت کر دینے والی ہے۔

۴۱۔ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝ ع

۴۲۔ قُلْ مَنْ يَكْلَؤُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمَٰنِ ۗ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُعْرِضُونَ ۝

۴۳۔ أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِنْ دُونِنَا ۚ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِنَّا يُصْحَبُونَ ۝

۴۴۔ بَلْ مَتَّعْنَا هَٰؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ ۝

۴۵۔ قُلْ إِنَّمَا أُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۚ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ إِذَا مَا يُنْذَرُونَ ۝

ترجمہ

۴۱۔ (اگر یہ تیرا مذاق اڑاتے ہیں تو پریشان نہ ہو) تجھ سے پہلے پیغمبروں کا بھی مذاق اڑایا جاتا تھا لیکن آخر کار جس چیز کا تمسخر اڑایا کرتے تھے، وہی عذاب تمسخر اڑانے والوں کے دامن گیر ہوگیا۔

۴۲۔ تم کہہ دو کہ رات کو اور دن کو خدا (کے عذاب) سے تمہیں کون بچا سکتا ہے؟ لیکن وہ اپنے پروردگار کی یاد

سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

۴۳۔ کیا ان کے معبود ایسے ہیں کہ جو ہمارے مقابلہ میں ان کا دفاع کریں؟ یہ (بناوٹی خدا) تو اپنی مدد بھی نہیں کرسکتے (دوسروں کی مدد کیا کریں گے) اور نہ ہی ہماری طرف سے کسی طاقت کے ذریعہ ان کی مدد ہوگی۔

۴۴۔ ہم نے انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کیا، یہاں تک کہ انہوں نے طولانی عمر پائی (اور وہی ان کے غرور و طغیان کا سبب بن گئی) کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم پے در پے اور مسلسل زمین (اور اُس میں رہنے والوں) میں کمی کرتے جارہے ہیں، کیا وہ غالب ہیں (یا ہم)؟

۴۵۔ تم کہہ دو کہ میں تو تمہیں صرف وحی کے ذریعے ڈراتا ہوں۔ لیکن وہ لوگ کہ جن کے کان بہرے ہیں، جس وقت انہیں ڈرایا جاتا ہے تو وہ باتوں کو سنتے ہی نہیں ہیں۔

تفسیر

کان دھر کے سنو اگر تمہارے کان ......

گزشتہ آیات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مشرکین اور کفار پیغمبر اکرمؐ کا مذاق اُڑاتے تھے۔ وہی کام کہ جو تمام جاہل اور مغرور لوگوں کی پرانی عادت ہے کہ وہ حقیقی اور اہم واقعات کو بھی مذاق اور استہزاء کے طور پر لیتے ہیں۔

زیر بحث پہلی آیت میں پیغمبرؐ کو دلاسہ اور تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ صرف تم ہی نہیں ہو کہ جس کا مذاق اُڑایا جارہا ہے بلکہ "تجھ سے پہلے جو پیغمبر آئے تھے انہوں نے ان کا بھی مذاق اُڑایا تھا": (ولقد استهزئ برسل من قبلك)۔

" لیکن آخر کار وہ عذاب الٰہی کہ جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے تمسخر اُڑانے والوں کے دامن گیر ہوگیا: (فحاق بالذين سخروا منهم ما كانوا به يستهزءون)۔

لہٰذا تم کسی قسم کے غم و اندوہ کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دو اور جاہلوں کے اِس طرح کے کام سے تیری عظیم روح پر معمولی سا اثر بھی نہیں ہونا چاہیئے اور یہ تیرے آہنی عزم میں کسی قسم کا خلل نہ ڈالنے پائیں۔

* * *

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: نہ صرف قیامت میں عذاب الٰہی سے تمہیں کوئی نہیں بچاسکے گا۔ بلکہ اس دنیا میں بھی یہی حال ہے۔ تم کہہ دو کہ رات اور دن میں خدائے رحمان کے عذاب سے تمہیں کون بچا سکتا ہے: (قل من يكلؤكم بالليل والنهار من الرحمٰن)۔

حقیقت میں اگر خدا نے آسمان (جوّ زمین) کو ایک محفوظ چھت قرار نہ دیا ہوتا — جیسا کہ پہلی آیات میں بیان ہوا ہے۔ — تو تمہارے لیے صرف یہی کافی تھا کہ رات دن تم آسمانی پتھروں کی زد میں ہوتے۔

خدائے رحمٰن تم سے اس قدر محبت رکھتا ہے کہ اس نے تمہاری نگہبانی اور حفاظت کے لیے ایسے ایسے مامورین قرار دیئے ہوئے

کہ اگر وہ ایک لحظہ کے لیے تم سے جُدا ہو جائیں تو مصائب و آلام کا سیلاب تم پر ٹوٹ پڑے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "اللہ" کی بجائے "رحمٰن" استعمال ہوا ہے۔ یعنی تم یہ تو دیکھو کہ تم نے کس قدر گناہ کیے ہیں کہ تم نے اُس خدا کو بھی ناراض کر دیا ہے جو رحمتِ عامہ کا مرکز ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: لیکن اُنہوں نے پروردگار کی یاد سے منہ موڑ لیا ہے، نہ اس کے انبیاء کے مواعظ و نصائح کی طرف کان دھرتے ہیں اور نہ ہی خدا اور اس کی نعمتوں کی یاد ان کے دلوں کو ہلاتی ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس بارے میں سوچتے ہیں "بلکہ انہوں نے اپنے پروردگار کی یاد سے منہ پھیر لیا ہے": (بل ھم عن ذکر ربھم معرضون)۔

پھر سوال کیا گیا ہے کہ: یہ ظالم اور گنہگار کافر، خدائی عذاب کے مقابلے میں کس پر اعتماد کیے ہوئے ہیں "کیا وہ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کا دفاع کر سکیں": (ام لھم اٰلھۃ تمنعھم من دوننا)۔

"ان کے یہ جعلی خدا تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور نہ اپنا دفاع کر سکتے ہیں: (لا یستطیعون نصر انفسھم)۔

اور نہ ہی ان کی ہماری طرف سے رحمت اور معنوی قوت کے ذریعے کوئی مدد کی جائے گی اور نہ ہی ان کا کسی طرح سے کوئی ساتھ دیا جائے گا: (ولا ھم منا یصحبون)[1]

بعد والی آیت میں بے ایمان لوگوں کی سرکشی اور طغیان کی ایک اہم علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے: ہم نے انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کیں، یہاں تک کہ انہوں نے طولانی عمریں پائیں. (بل متعنا ھٰؤلاء و اٰباءھم حتیٰ طال علیھم العمر)۔

لیکن بجائے اس کے کہ یہ طولانی عمر اور فراواں نعمت اُن میں شکرگزاری کا احساس اُبھارتی اور وہ حق تعالیٰ کے آستانِ عبودیت پر سر رکھتے، یہی ان کے غرور اور طغیان کا سبب بن گئی۔

لیکن کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ جہان اور اس کی نعمتیں پائیدار نہیں ہیں۔ "کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم مسلسل زمین اور زمین کے رہنے والوں میں کمی کر رہے ہیں"؟ (افلا یرون انا ناتی الارض ننقصھا من اطرافھا)۔

اقوام و قبائل یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، چھوٹے اور بڑے افراد میں سے کوئی بھی عمرِ جاودانی نہیں رکھتا اور سب کے سب اپنا سر نقابِ فنا چھپا رہے ہیں۔ وہ قومیں جو ان سے زیادہ قوی، زیادہ طاقتور اور زیادہ سرکش تھیں سب نے تاریک مٹی کے نیچے اپنا منہ چھپا لیا۔ یہاں تک کہ دانشمند بزرگ اور علماء کہ جو اقوام زمین تھے، انہوں نے بھی اس جہان سے آنکھیں بند کر لیں "تو ان حالات میں کیا وہ غالب ہیں، یا ہم غالب ہیں"، (افھم الغالبون)۔

اس بارے میں کہ "انا ناتی الارض ننقصھا من اطرافھا" (ہم زمین کی طرف آتے ہیں اور مسلسل اس کے اطراف کو کم کرتے رہتے ہیں) کے جملے سے کیا مراد ہے، مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں۔

---

[1] "یصحبون" باب افعال سے ہے۔ اصل میں اس کا معنی ہے کسی چیز کو مدد اور حمایت کے طور پر کسی شخص کو دے دینا۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بُت نہ ذاتی طور پر دفاع کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی پروردگار کی طرف سے اس قسم کی قدرت ان کے اختیار میں دی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ عالم ہستی میں ہر دفاعی قوت یا کسی ذات کے اندر سے اُبھرتی ہے یا خدا کی طرف سے دی جاتی ہے۔

۱۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا مشرکین کی زمینوں اور لبستیوں میں بتدریج کمی کر رہا ہے اور مسلمانوں کے شہروں میں اضافہ کر رہا ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اور اُس زمانے میں مسلمانوں کو ایسی فتوحات حاصل نہیں ہو رہی تھیں، یہ تفسیر مناسب نظر نہیں آتی۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد زمینوں کی تدریجی خرابی اور ویرانی ہے۔

۳۔ بعض اسے زمین میں رہنے والوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

۴۔ بعض نے یہاں خصوصیت سے دانشمندوں اور علماء کا ذکر کیا ہے۔

لیکن ان سب سے زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ زمین سے مراد اس دنیا کے مختلف علاقوں کے لوگ ہیں، وہ مختلف افراد اور قومیں جو بتدریج دیارِ عدم کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں اور دنیا کی زندگی کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ اور اس طرح سے دائمی طور پر اطراف زمین کم ہوتی رہتی ہیں۔

بعض روایات میں کہ جو آئمہ اہلِ بیتؑ سے نقل ہوئی ہیں، یہ آیت علماء اور دانشمندوں کی موت سے تعبیر ہوتی ہے۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

نقصانها ذهاب عالمها

زمین کا نقصان اور کم ہونا علماء کے فقدان کے معنی میں ہے۔[1]

البتہ ہم جانتے ہیں کہ یہ روایات عموماً واضح اور ظاہر مصداق بیان کرنے کے لیے ہیں نہ یہ کہ مفہوم آیت کو مخصوص افراد میں انحصار کرتی ہیں۔

اس طرح سے آیت کا منشاء و مفہوم یہ ہے کہ بزرگوں، بڑی بڑی قوموں یہاں تک کہ علماء کی تدریجی موت کو، مغرور اور بے خبر کافروں کے لیے ایک درسِ عبرت کے طور پر بیان کرے اور اس بات کی نشاندہی کرے کہ خدا سے مقابلہ کرنے کی صورت میں ان کے لیے کامیابی ممکن نہیں۔

اس کے بعد یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ پیغمبرؐ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو وحی کے ذریعے ڈرائے۔ اس لیے رُوئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دو کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، میں تو صرف وحی کے ذریعے تمہیں ڈراتا ہوں (قل انما انذركم بالوحي)۔

اور اگر تمہارے سخت دل پر اس کا اثر نہیں ہوتا تو یہ بات باعثِ تعجب نہیں ہے اور نہ ہی وحی آسمانی میں کسی نقص کی دلیل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ "بہرے لوگوں کو جب ڈرایا جاتا ہے تو وہ سُنتے ہی نہیں"۔ (ولا يسمع الصم الدعاء اذا ما ينذرون)۔

سُننے والے کان کی ضرورت ہے تاکہ وہ خدا کی بات سُنے نہ کہ ایسے کان کی کہ جن پر گناہ، غفلت اور غرور کے پردے اس طرح پڑے ہوئے ہوں کہ وہ حق بات سُننے کی اہلیت بالکل کھو چکے ہیں۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۳، صہ ۴۲۱۔

۴۶۔ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○

۴۷۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ○

ترجمہ

۴۶۔ اگر تیرے پروردگار کا معمولی سا عذاب بھی انہیں چھو لے تو وہ چیخ اٹھیں اور کہنے لگیں کہ ہائے افسوس ہم تو سب ظالم تھے۔

۴۷۔ قیامت کے دن ہم عدل کے ترازو نصب کریں گے، لہٰذا کسی بھی شخص پر ذراسی بھی زیادتی نہیں ہوگی، اور اگر کسی نے رائی برابر بھی کوئی نیکی یا برائی کی ہوگی تو ہم اس کو حاضر کردیں گے اور اس کے لیے یہی کافی ہے کہ حساب کرنے والے ہم ہوں گے

تفسیر

قیامت میں عدل کے ترازو:

گزشتہ آیات میں بے ایمان لوگوں کے غرور اور بے خبری کی حالت بیان کی گئی تھی۔ زیرِ نظر آیات میں فرمایا گیا ہے: یہ مغرور اور بے خبر لوگ نعمت اور سکون کی حالت میں تو ہرگز خدا کے بندے نہیں بنتے (لیکن) اگر تیرے پروردگار کے عذاب کا ایک ذرہ بھی ان کے دامن کو آ لگے، تو اس طرح سے وحشت زدہ ہو جائیں اور چیخنے لگیں کہ ہائے افسوس ہم تو سب کے سب ظالم تھے۔ (ولئن مستهم نفحة من عذاب ربك ليقولن يا ويلنا انا كنا ظالمين)۔

مفسرین اور اربابِ لغت کے قول کے مطابق لفظ "نفحة" حقیر یا کم مقدار چیز یا ملائم ہوا کے معنی میں ہے، اگرچہ یہ لفظ زیادہ تر رحمت و نعمت کی ہواؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن عذاب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے[1]

تفسیر کشاف کے مطابق "لئن مستهم نفحة ..." میں تین تعبیریں ایسی ہیں کہ جو سب ناچیزی اور کمی کی طرف اشارہ

---

[1] تفسیر رازی، تفسیر فی ظلال، مفردات راغب آیہ زیر بحث اور مادہ "نفحة" کے ذیل میں۔

کرتی ہیں۔ "مس" کی تعبیر اور "نفحۃ" کی تعبیر مادۂ لغت کے اعتبار سے نیز وزن اور صیغہ کے لحاظ سے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ دل کے اندھے، سالہا سال تک پیغمبر کی باتیں اور وحی کی منطق سنتے رہتے ہیں مگر ان پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا مگر جس وقت عذاب کا تازیانہ ــ چاہے وہ کتنا ہی خفیف اور مختصر ہو ــ ان کی پشت پر لگے گا تو پھر ان کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے اور کہنے لگیں گے کہ "انا کنا ظالمین" ــ توکیا عذاب کا تازیانہ کھا کر ہی انہیں بیدار ہونا چاہیئے ؟

اس کا کیا فائدہ ؟ کیونکہ یہ اضطراری بیداری بھی ان کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگی، اس لیے کہ اگر طوفانِ عذاب رُک جائے اور وہ سکون حاصل کرلیں تو وہ پھر اسی راستے پر چلنے لگیں گے اور وہی طرزِ عمل اپنا لیں گے۔

❋ ❋ ❋

زیر بحث دوسری آیت قیامت میں دقیق حساب کتاب اور عادلانہ جزا و سزا کی طرف اشارہ کر رہی ہے، تاکہ بے ایمان اور ستمگر یہ جان لیں کہ اگر بالفرض دنیا کا عذاب انہیں دامنگیر نہ ہوا تو آخرت کی سزا توحتمی ہے اور باریک بینی کے ساتھ ان کے تمام اعمال کا حساب کتاب لیا جائے گا۔

لہٰذا ارشاد ہوتا ہے: ہم قیامت کے دن عمل کے ترازو نصب کریں گے: (ونضع الموازين القسط ليوم القيامة)۔

"قسط" کبھی تو عدم تبعیض اور ٹکڑے ٹکڑے نہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی مطلق طور پر عدالت کے معنی میں اور یہاں دوسرا معنی مناسب ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "قسط" کا لفظ یہاں پر "موازین" کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ یہ ناپ تول کے ترازو ایسے دقیق اور منظم ہیں کہ گویا عین عدالت ہیں[1]۔

اسی بنا پر ساتھ ہی مزید ارشاد ہوتا ہے: کسی بھی شخص پر وہاں معمولی سا بھی ظلم وستم نہیں ہوگا: (فلا تظلم نفس شيئًا)۔

نہ نیکی کرنے والوں کی جزا میں کوئی کمی ہوگی اور نہ ہی بدکاروں کی سزا میں کوئی زیادتی کی جائے گی۔

لیکن ظلم وستم کی اس نفی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ حساب کتاب میں باریک بینی نہیں ہوگی بلکہ "اگر رائی[2] کے برابر بھی کسی کا کوئی نیک یا بدکام ہوگا، تو ہم اُسے حاضر کردیں گے" (اور اُسے تول کر دکھائیں گے): (وان كان مثقال حبة من خردل اتينابها)۔

"اور (عدل کے لیے) اتنی بات ہی کافی ہے کہ بندوں کے اعمال کا حساب کرنے والے ہم خود ہوں گے": (وكفى بنا حاسبين)۔

"خردل" کالے رنگ کے بہت چھوٹے چھوٹے دانوں والی ایک گھاس ہوتی ہے۔ یہ چھوٹے پن اور حقیر اور معمولی چیز ہونے میں ضرب المثل ہے۔

اس تعبیر کی ایک نظیر قرآن میں ایک اور جگہ "مثقال ذرة" "ایک ذرہ کا وزن" (ایک بہت ہی چھوٹی سی چیونٹی یا مٹی اور

---

[1] : اگرچہ "موازین" جمع ہے اور "قسط" مفرد لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قسط مصدر ہے اور مصدر کی جمع نہیں ہوتی لہٰذا کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی۔

[2] : ہمارے ہاں اسے "رائی" کہتے ہیں۔ (مترجم)

غبار کا ایک چھوٹا سا ذرّہ) کے عنوان سے آئی ہے۔ (زلزال - ۷)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید میں چھ موقعوں پر "مثقال ذرۃ" کی تعبیر اور دو موقعوں پر "مثقال حبۃ من خردل" کی تعبیر آئی ہے۔

درحقیقت زیرِ نظر آیت میں قیامت کے دن کے دقیق حساب وکتاب کے مسئلے پر چھ مختلف تعبیروں کے ساتھ تاکید ہوئی ہے۔

۱۔ لفظ "موازین" وہ بھی جمع کی صُورت میں

۲۔ پھر "قسط" کے وصف کا ذکر

۳۔ اس کے بعد ظلم کی نفی پر تاکید "فلا تظلم نفس"

۴۔ اس کے بعد کلمہ "شیئًا" (کوئی بھی چیز) کا استعمال

۵۔ اور اس کے بعد رائی کے دانے کی مثال

۶۔ اور آخر میں "کفی بنا حاسبین" (یہی کافی ہے کہ حساب لینے والے ہم ہوں گے) کا جملہ

یہ سب تاکیدیں اس بات کی دلیل ہیں کہ قیامت کے دن حساب کتاب حد سے زیادہ دقیق اور ہر قسم کے ظلم وستم سے پاک ہوگا۔

اس بارے میں کہ ناپ تول کے ترازو سے مراد کیا ہے؟ بعض نے تو یہ خیال کیا ہے کہ وہاں اس دنیا کے ترازوؤں کی طرح کے ترازو نصب ہوں گے اور اس بناء پر فرض کر لیا ہے کہ انسان کے اعمال وہاں پر بوجھ اور وزن رکھتے ہوں گے تاکہ وہ ان ترازوؤں میں تولے جانے کے قابل ہوں۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ یہاں پر "میزان" ناپ تول اور وزن کرنے کے وسیلہ اور ذریعہ کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہر چیز کے وزن کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ خود اس کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ تھرمامیٹر (گرمی کی مقدار معلوم کرنے کا آلہ) بیرومیٹر (ہوا کی رفتار معلوم کرنے کا آلہ) اور اسی طرح دوسرے موازین۔ ہر ایک اسی چیز کے مطابق ہوتا ہے، جسے اس وسیلے اور ذریعے سے ماپنا مطلوب ہوتا ہے۔

احادیث اسلامی میں آیا ہے کہ قیامت کے دن وزن کرنے کے ترازو انبیاء، آئمہ اور نیک پاک لوگ ہوں گے کہ جن کے نامۂ عمل میں کوئی تاریک نقطہ ہے ہی نہیں۔[1]

ہم (زیارت میں) پڑھتے ہیں:

السلام علی میزان الاعمال

اعمال کے ترازو پر سلام ہے۔

(اس موضوع کی مزید تفصیل جلد ۴ کے صفحہ ۴۲ ——— پر دیکھیے)

یہ بھی ممکن ہے کہ "موازین" کا ذکر جمع کی صورت میں (کہ جو میزان کی جمع ہے) اسی بات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ہر وہان حق

[1] بحار الانوار، ج ۷، صفحہ ۲۵۲ (اشاعت جدید)۔

میں سے ہر ایک انسان کے اعمال کے لیے کسی نہ کسی ناپ تول کی میزان ہیں۔ علاوہ اس کے کہ وہ سب کے سب ممتاز حیثیت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی اُن میں سے ہر ایک کا ایک خاص امتیاز بھی ہے کہ جو اس خاص حصّے کی ناپ تول کے لیے ترازو یا نمونہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو شخص جتنی مقدار میں اُن سے شباہت رکھتا ہوگا اور صفات و اعمال کے لحاظ سے ان بزرگوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوگا، اسی قدر اس کا وزن بوجھل ہوگا۔ جس قدر وہ ان بزرگوں سے دُور اور اُن سے مختلف ہوگا، اتنا ہی ہلکا وزن رکھنے والا ہوگا۔

۴۸۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسٰى وَهٰرُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

۴۹۔ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ

۵۰۔ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۚ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۸۔ ہم نے موسٰی و ہارون کو فرقان (حق کو باطل سے جُدا کرنے کا وسیلہ) نور اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت کا ذریعہ عطا فرمایا۔

۴۹۔ وہی (پرہیزگار) کہ جو اپنے پروردگار سے غیب میں ڈرتے ہیں اور قیامت کا خوف رکھتے ہیں۔

۵۰۔ اور یہ قرآن ایک مبارک ذکر ہے، جسے ہم نے (تم پر) نازل کیا ہے۔ تو کیا تم اس کا انکار کرتے ہو؟

تفسیر

انبیاءؑ کی کچھ داستان:

ان آیات میں اور ان کے بعد انبیاءؑ کی زندگی کے کچھ حالات بیان ہوئے ہیں کہ جن میں بہت سے تربیتی نکات ہیں۔ ان حالات سے پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کے بارے میں گزشتہ بحثوں اور مخالفین کے ساتھ ان کے مقابلے اور مشکلات، زیادہ واضح ہو جاتے ہیں کیونکہ ان میں بہت سے مشترک پہلو موجود ہیں۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے موسٰی و ہارون کو "فرقان" یعنی حق کو باطل سے جُدا کرنے کا ذریعہ، نور اور پرہیزگاروں

کے لیے نصیحت عطا کی، (ولقد اٰتینا موسٰی و ھارون الفرقان وضیاءً و ذکرًا للمتقین)۔

" فرقان" دراصل ایسی چیز کے معنی میں ہے کہ جو حق کو باطل سے جُدا کر دے اور ان دونوں کی پہچان کا ذریعہ ہو۔ یہ کہ اس سے مراد کیا ہے، تو علماء نے اس کے لیے متعدد تفسیریں بیان کی ہیں:

بعض نے تو اس سے مراد تورات لی ہے۔

بعض نے اسے بنی اسرائیل کے لیے دریا کا شق ہو جانا سمجھا ہے کہ جو حق کی عظمت اور موسٰی کی حقانیت کی واضح نشانی تھی۔

جبکہ بعض نے ان تمام دلائل اور سارے معجزات کہ جو موسٰی و ہارون کو دیئے گئے تھے، کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

لیکن یہ تمام تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ فرقان "تورات" کی طرف بھی اشارہ ہو، اور موسٰی کے تمام معجزات و دلائل کی طرف بھی اشارہ ہو۔

نیز تمام آیات میں، " فرقان" کا کبھی تو خود " قرآن" پر اطلاق ہوا ہے۔ مثلاً:

تبارك الذی نزل الفرقان علٰی عبدہ لیکون للعالمین نذیرًا

بزرگ اور برکتوں والا ہے وہ خدا کہ جس نے اپنے بندہ پر فرقان کو نازل کیا تا کہ وہ سارے جہان والوں کو ڈرانے والا ہو۔ (فرقان - ۱)

کبھی اُن معجزانہ کامیابیوں پر، اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ کو حاصل ہوئیں۔ جیسا کہ جنگ بدر کے بارے میں " یوم الفرقان" فرمایا ہے۔ (انفال - ۴۱)

باقی رہا لفظ " ضیاء" تو وہ نور اور روشنی کے معنی میں ہے کہ جو کسی ذات کے اندر سے پیدا ہو اور مسلمہ طور پر قرآن، تورات اور انبیاءؑ کے معجزات اسی طرح کے ہیں[1]۔

" ذکر" ہر وہ چیز ہے کہ جو انسان کو غفلت اور بے خبری سے دُور رکھے اور یہ بھی آسمانی کتابوں اور خدائی معجزات کے واضح آثار میں سے ہے۔

ان تینوں تعبیروں کو یکے بعد دیگرے بیان کرنا، گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان مقصد تک پہنچنے کے لیے پہلے فرقان کا محتاج ہے۔ یعنی دوراہے یا چوراہے پر کھڑا ہوا اصلی راستے کو معلوم کرے۔ جب وہ اپنے مقصد تک پہنچنے کا راستہ معلوم کر لے تو پھر راستہ چلتے چلتے کبھی رکاوٹ بھی پیش آجاتی ہے۔ ایسی رکاوٹوں میں سب سے اہم غفلت ہے۔ لہٰذا کسی ایسے وسیلے اور ذریعے کا محتاج ہے کہ جو اُسے مسلسل خبردار کرتا رہے، یاد دلاتا رہے اور ذکر کرتا رہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ " فرقان" معرفہ کی صورت میں آیا ہے اور " ضیاء" اور " ذکر" نکرہ کی صورت میں ہے اور اس کا اثر متقین اور پرہیزگاروں کے ساتھ مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ معجزات اور پیامِ آسمانی تو سب کے لیے راستہ واضح کرتے ہیں لیکن سب لوگ ایسے نہیں ہوتے کہ جو مصمم ارادہ کر لیں اور ضیاء و ذکر سے استفادہ کریں، بلکہ

---

[1] ضیاء کے معنی اور نور سے اس کے فرق کے بارے میں سورہ یونس آیہ ۵ کے ذیل میں ہم نے جلد ۵ میں مزید وضاحت کی ہے۔

وہ صرف وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جو مسؤلیت اور ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں، اور تقویٰ شعار ہوتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت پرہیزگاروں کا اس طرح تعارف کراتی ہے: وہ وہی لوگ ہیں کہ جو اپنے پروردگار سے غیب میں اور پنہاں طور پر ڈرتے ہیں: (الذین یخشون ربھم بالغیب)۔

اور قیامت کے دن کا خوف رکھتے ہیں: (وھم من الساعة مشفقون)۔

لفظ "غیب" کی یہاں پر دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ پہلی تفسیر تو یہ ہے کہ یہ پروردگار کی ذات پاک کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی باوجود اس کے کہ خدا نظروں سے پوشیدہ اور پنہاں ہے، وہ عقل کی دلیل کی بنا پر اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور اس کی پاک ذات کے سامنے مسؤلیت اور ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ پرہیزگار لوگ صرف معاشرے کے سامنے ہی خدا کا خوف نہیں رکھتے، بلکہ اپنی خلوت گاہوں میں بھی اسے حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ خدا سے خوف کے لیے لفظ "خشیت" استعمال ہوا ہے۔ اور قیامت کے بارے میں "اشفاق" کی تعبیر آئی ہے۔ یہ دونوں الفاظ اگرچہ خوف کے معنی میں ہیں لیکن کتاب مفردات میں راغب کے قول کے مطابق "خشیت" اس حال میں بولا جاتا ہے کہ جب خوف احترام و تعظیم کے ساتھ ہو۔ اس خوف کی مانند کہ جو ایک بیٹا اپنے والد بزرگوار سے رکھتا ہے، اس بنا پر پرہیزگاروں کا خدا سے خوف معرفت کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔

لیکن "اشفاق" کا لفظ اُس تعلق اور توجہ کے معنی میں ہے کہ جو خوف سے ملا ہوا ہو۔ مثلاً یہ تعبیر کبھی اولاد اور دوستوں کے بارے میں استعمال ہوتی ہے کہ انسان جن سے تعلق اور دوستی رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ وہ آفات و تکلیف میں گرفتار ہو سکتے ہیں لہٰذا ان کے بارے میں ڈرتا رہتا ہے۔

حقیقت میں پرہیزگار لوگ قیامت کے دن سے بہت لگاؤ اور تعلق رکھتے ہیں کیونکہ وہ جزا اور خدا کی رحمت کا مرکز ہے لیکن اس کے باوجود معاملہ حساب و کتاب کا بھی خوف رکھتے ہیں۔

البتہ بعض اوقات یہ دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

آخری زیر بحث آیت میں قرآن کا گزشتہ کتابوں سے ایک موازنہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ ایک مبارک ذکر ہے کہ جسے ہم نے تم پر نازل کیا ہے: (وھٰذا ذکر مبارک انزلناہ)۔

کیا تم اس کا انکار کرتے ہو: (افانتم لہ منکرون)۔

انکار کیوں کرتے ہو؟ یہ تو ذکر ہے اور تمہارے لیے بیداری و آگاہی اور یاد آوری کا باعث ہے۔ یہ تو مرکز برکت ہے، اس میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے اور یہ تمام کامیابیوں اور خوش بختیوں کا سرچشمہ ہے۔

کیا ایسی کتاب سے بھی انکار کی گنجائش ہے؟ اس کی حقانیت کی دلیلیں خود اسی کے اندر پوشیدہ ہیں، اس کی نورانیت آشکار ہے

اور اس کے راستے پر چلنے والے سعادت مند اور کامیاب ہیں۔

اس بات کو جاننے کے لیے کہ یہ قرآن کس حد تک آگاہی کا سبب اور برکت کا موجب ہے، یہی بات کافی ہے کہ ہم قرآن کے نزول سے جزیرہ عرب میں رہنے والوں کی حالت کو دیکھیں۔ کہ وہ وحشت و جہالت، فقر و فاقہ، بدبختی اور پراگندگی میں زندگی بسر کرتے تھے ـــــ اور اُن کی نزولِ قرآن کے بعد کیا کیفیت ہوگئی۔ بعد میں وہ دوسروں کے لیے اسوہ اور نمونہ بن گئے ـــــ اسی طرح دوسری اقوام کی ان کے درمیان قرآن کے ورود سے پہلے اور بعد کی وضع و کیفیت کو دیکھیں۔

۵۱۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝

۵۲۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝

۵۳۔ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝

۵۴۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

۵۵۔ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۝

۵۶۔ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

۵۷۔ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝

۵۸۔ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۱۔ ہم نے ابراہیم کو پہلے سے ہی رشد و ہدایت (کا ذریعہ) دے دیا تھا اور ہم اس (کی اہلیت) سے آگاہ تھے۔

۵۲۔ جس وقت اُس نے اپنے باپ (چچا آزر) اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ بے رُوح مجسّمے کہ جن کی تم ہمیشہ پرستش کرتے رہتے ہو، کیا ہیں؟

۵۳۔ (انہوں نے) کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو دیکھا ہے کہ وہ ان کی عبادت کرتے ہیں۔

۵۴۔ (ابراہیم نے) کہا کہ یقیناً تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی کھلی گمراہی میں پڑے رہے ہو۔

۵۵۔ (انہوں نے) کہا کہ کیا تو حق بات لے کر ہمارے پاس آیا ہے، یا مذاق کر رہا ہے؟

۵۶۔ (ابراہیم نے) کہا (میں تو کامل طور پر حق لے کر آیا ہوں کہ) تمہارا پروردگار تو وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے کہ جس نے اُن کو پیدا کیا ہے اور میں بھی اِس بات کا گواہ ہوں۔

۵۷۔ خدا کی قسم میں تمہارے جانے کے بعد تمہاری غیبت میں تمہارے بتوں کی نابودی کا منصوبہ بناؤں گا۔

۵۸۔ آخرکار (ایک مناسب موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے) ان کے بڑے بت کے سوا ــ ان سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تاکہ وہ اس کے پاس آئیں (اور وہ بڑا بُت ان سے حقیقت بیان کرے)۔

تفسیر

ابراہیمؑ بتوں کی نابودی کا منصوبہ بناتے ہیں:

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں ــ سولہ پیغمبروں کے حالات اور واقعات بیان ہوئے ہیں اور اِس سورہ کے نام سے بھی ظاہر ہے کہ یہ انبیاء کے بارے میں ہے۔ گزشتہ آیات میں موسیٰؑ و ہارونؑ کی رسالت کی طرف کچھ اشارہ ہوا ہے۔ زیر بحث آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اور بُت پرستوں کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی کا ایک اہم حصّہ بیان ہو رہا ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے۔ ہم نے رشد و ہدایت کا وسیلہ پہلے سے ابراہیمؑ کو دے دیا تھا اور ہم اس کی اہلیت سے آگاہ تھے: (ولقد اٰتینا ابراھیم رشدہ من قبل وکنا بہ عالمین)۔

"رشد" اصل میں مقصد تک راہ پانے کے معنی میں ہے اور یہاں ممکن ہے حقیقتِ توحید کی طرف اشارہ ہو کہ ابراہیمؑ بچپن ہی میں اُس سے آگاہ ہو گئے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس لفظ کے وسیع معنی کے لحاظ سے، ہر قسم کی خیر و صلاح کی طرف اشارہ ہو۔

"کنا بہ عالمین" کا جملہ ان سب نعمات کو حاصل کرنے کے لیے ابراہیمؑ کی صلاحیتوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ درحقیقت خدا کوئی نعمت کسی کو بلا وجہ نہیں دیتا۔ یہ صلاحیتیں اور لیاقتیں ہی ہیں کہ جن کی بناء پر نعماتِ الٰہی حاصل ہوتی ہیں، اگرچہ مقامِ نبوت بھی ایک مقامِ نعمت و عطا ہے۔

* * *

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے ایک اہم کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ابراہیمؑ کا یہ رشد و ہدایت اس وقت ظاہر ہوا کہ جب اُس نے اپنے باپ (یہ ان کے چچا آزر کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ عرب بعض اوقات چچا کو بھی "اب" کہتے ہیں) اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ مورتیاں کیا ہیں کہ جن کے تم گرویدہ ہو اور رات دن ان کا طواف کرتے ہو اور اُن سے دستبردار نہیں ہوتے: (اذ قال لابیہ وقومہ ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون)۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ الفاظ کہہ کر ان بتوں کی کہ جو اُن کی نظروں میں انتہائی عظمت رکھتے تھے، شدت سے تحقیر و تذلیل کی۔

پہلے "ماھذہ" (یہ کیا ہیں!) کہا[1] دوسرے "تماثیل" کی تعبیر استعمال کی کیونکہ "تماثیل" "تمثال" کی جمع ہے اور یہ تصویر یا بے رُوح مجسمہ کے معنی میں ہے (بُت پرستی کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ شروع شروع میں یہ تصاویر اور مجسّمے انبیا اور علماء کی یادگار کے طور پر تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ایسے مقدس سمجھے جانے لگے کہ معبود بن گئے)۔

"انتم لها عاکفون" میں "عکوف" احترام کے ساتھ ملی ہوئی خدمت کے معنی میں ہے کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انہوں نے بتوں کے ساتھ ایسی دل بستگی پیدا کرلی تھی اور ان کے آستانے پر اس طرح سر جھکاتے تھے اور ان کے گرد چکر لگاتے تھے کہ گویا ہمیشہ کے لیے ان کے ملازم اور خدمت گار ہیں۔

ابراہیمؑ کی یہ گفتگو درحقیقت بُت پرستی کے ابطال کے لیے ایک واضح اور روشن استدلال ہے کیونکہ بتوں میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ یہی مجسمہ و تمثال ہی ہے۔ باقی تخیل ہے اور توہم ہے اور خیال۔ کونسا عقلمند انسان خود کو اس بات کی اجازت دے گا کہ وہ ایک چھوٹے سے پتھر اور لکڑی کے لیے اس قدر عظمت، احترام اور قدرت کا قائل ہو جائے۔ آخر وہ انسان کہ جو خود اشرف مخلوقات ہے اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کے سامنے اس طرح سے خضوع و خشوع کیوں کرے اور اپنی مشکلات کا حل اس سے کیوں طلب کرے؟

٭ ٭ ٭

لیکن بُت پرست درحقیقت اِس منہ بولتی اور واضح منطق کا کوئی جواب نہیں رکھتے تھے۔ سوائے اس کے کہ اِس کی ذمہ داری اپنے بڑوں کے سر تھوپ دیں۔ لہٰذا اُنہوں نے کہا: ہم نے اپنے آباؤ اجداد اور بڑوں کو دیکھا ہے کہ وہ ان کی پرستش کرتے ہیں اور ہم اپنے بڑوں کی سُنّت کو پُورا کر رہے ہیں: (قالوا وجدنا اٰباءنا لها عابدین)۔

چونکہ صرف بڑوں کی سُنّت اور روش کسی مشکل کو حل نہیں کرتی اور ہمارے پاس اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ بزرگانِ گزشتہ آئندہ آنے والی نسلوں سے زیادہ عالم اور زیادہ عاقل تھے۔ بلکہ اکثر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے کیونکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ علم و دانش بڑھتی رہتی ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے فوراً انہیں جواب دیا: تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی یقیناً واضح گمراہی میں تھے: (قال لقد کنتم انتم واٰباؤکم فی ضلال مبین)۔

٭ ٭ ٭

یہ تعبیر کہ جس میں بہت سی تاکیدیں موجود ہیں اور بڑی قاطعیت رکھتی ہیں، اس بات کا سبب بنی کہ بت پرست کچھ ہوش میں آئیں اور تحقیق کی جانب مڑیں۔ ابراہیمؑ کی طرف رُخ کرکے کہنے لگے: کیا سچ مچ تو کوئی حق بات لے کر آیا ہے یا مذاق کر رہا ہے: (قالوا اجئتنا بالحق ام انت من اللاعبین)۔

کیونکہ وہ لوگ جنہیں بتوں کی پرستش کی عادت پڑ چکی تھی اور اسے ایک قطعی واقعیت سمجھتے تھے، یہ باور نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص سنجیدگی اور پختگی کے ساتھ بُت پرستی کی مخالفت کرے گا۔ لہٰذا انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے تعجب کے ساتھ یہ سوال کیا۔

لیکن ابراہیمؑ نے صراحت کے ساتھ انہیں جواب دیا: میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سنجیدہ، محکم اور عین واقعیت ہے کہ تمہارا

---

[1] "ما" اِس قسم کے موقعوں پر عموماً غیر عاقل کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور اسم اشارۂ قریب بھی ایسے موقعوں پر ——— ایک قسم کی تحقیر کو ظاہر کرتا ہے، ورنہ دور کا اشارہ مناسب تھا۔

پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے: (قال بل ربکم رب السماوات والارض)۔

وہی خدا کہ جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور خود بھی اس عقیدہ کے گواہوں میں سے ہوں: (الذی فطرھن وانا علیٰ ذالکم من الشاھدین)۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اس دو ٹوک گفتگو سے یہ واضح کیا: کہ وہ ذات ہی پرستش کے لائق ہے کہ جو ان سب کی، زمین کی اور تمام موجودات کی خالق ہے لیکن پتھر اور لکڑی کے ٹکڑے کہ جو خود ایک ناچیز مخلوق ہیں، پرستش کے لائق نہیں ہیں۔ خاص طور پر "وانا علیٰ ذالکم من الشاھدین" کے جملے نے یہ ثابت کیا کہ صرف میں ہی نہیں ہوں کہ جو اس حقیقت پر گواہ ہوں، بلکہ سب فہمیدہ، آگاہ اور صاحبانِ علم — کہ جنہوں نے اندھی تقلید کے رشتوں کو توڑ دیا ہے — اس حقیقت پر گواہ ہیں۔

٭ ٭ ٭

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ یہ بات سو فی صد صحیح اور محکم ہے اور وہ اس عقیدہ پر ہر مقام تک قائم ہیں اور اس کے نتائج و لوازم کو — جو کچھ بھی ہوں انہیں — جان و دل سے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، مزید کہتے ہیں: مجھے خدا کی قسم، جس وقت تم یہاں پر موجود نہیں ہو گے اور یہاں سے کہیں باہر جاؤ گے، تو میں تمہارے بتوں کو نابود کرنے کا منصوبہ بناؤں گا: (وتاللہ لاکیدن اصنامکم بعد ان تولوا مدبرین)۔

"اکیدن" "کید" کے مادہ سے لیا گیا ہے کہ جو پوشیدہ منصوبہ اور مخفیانہ چارہ جوئی کے معنی میں ہے۔ ان کی مراد یہ تھی کہ انہیں صراحت کے ساتھ سمجھا دیں، کہ آخر کار میں اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں نابود اور درہم برہم کر دوں گا۔

لیکن شاید ان کی نظر میں بتوں کی عظمت اور رعب اس قدر تھا کہ انہوں نے اس کو کوئی سنجیدہ بات نہ سمجھا اور کوئی ردّ عمل ظاہر نہ کیا۔ شاید انہوں نے یہ سوچا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی قوم و ملت کے مقدسات کے ساتھ — ایسا کھیل کھیلے جب کہ ان کی حکومت بھی سو فی صد ان کی حامی ہے، وہ کس برتے اور کس طاقت کے بل بوتے پر ایسا کرے گا؟

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جو بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ جملہ اپنے دل میں کہا تھا یا بعض مخصوص افراد سے کہا تھا، کسی لحاظ سے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پر جب کہ یہ بات کامل طور سے ظاہر آیت کے خلاف ہے۔

اس کے علاوہ بعد کی چند آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ بُت پرستوں کو ابراہیمؑ کی یہ بات یاد آ گئی اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سُنا ہے کہ ایک جوان بتوں کے خلاف ایک سازش کی بات کرتا ہے۔

٭ ٭ ٭

بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے ایک دن جب کہ بُت خانہ خالی پڑا تھا اور بُت پرستوں میں سے کوئی وہاں موجود نہیں تھا، اپنے منصوبے کو عملی شکل دے دی۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق بت پرست ہر سال ایک مخصوص دن بُتوں کی عید مناتے تھے۔ طرح طرح کے کھانے بُت خانے میں چڑھا کر، سب کے سب اکٹھے شہر سے باہر چلے جایا کرتے تھے اور شام ڈھلے واپس بُت خانہ میں آتے تھے تاکہ — وہ کھانے کھائیں کہ جو اُن کے عقیدے کے مطابق متبرک ہو گئے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ سے بھی انہوں نے تقاضا کیا کہ اُن کے ساتھ چلیں لیکن انہوں نے بیماری کا عذر کیا اور ان کے ساتھ نہ گئے۔
بہرحال وہ ــ بغیر اس کے کہ اس کام کے خطرات سے ڈرتے یا جو طوفان اِس کام کے بعد کھڑا ہوگا، اس کا کوئی خوف دل میں لاتے ــ مردانہ وار میدان میں کُود پڑے اور بڑی شجاعت سے ان تراشے ہوئے خداؤں سے جنگ کرنے کے لیے چل پڑے کہ جن کے اتنے متعصب اور نادان عقیدت مند تھے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: سوائے ان کے بڑے بُت کے سب کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا: (فجعلھم جذاذا الا کبیرا لھم)۔
مقصد ان کا یہ تھا کہ "شاید بُت پرست لوٹ کر اس کے پاس آئیں اور وہ بھی ساری باتیں اُن سے کہے (لعلھم الیہ یرجعون)[1]

چند اہم نکات

۱۔ بُت پرستی کی مختلف شکلیں: یہ ٹھیک ہے کہ ہم بُت پرستی کے لفظ سے زیادہ تر پتھر اور لکڑی کے بتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن ایک لحاظ سے بت اور بت پرستی وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو غیر خدا کی طرف ہر قسم کی توجہ ــ خواہ وہ کسی بھی شکل و صورت میں ہو ــ پر محیط ہے اور مشہور و معروف حدیث کے مطابق کہ:

كلما شغلك عن الله فهو صنمك

جو چیز بھی انسان کو اپنی طرف مشغول اور خدا سے دُور کرے، وہ اس کا بُت ہے۔

ایک حدیث میں اصبغ بن نباتہ سے کہ جو علی علیہ السلام کے مشہور اصحاب میں سے ہیں، یہ بیان ہوا ہے کہ:

ان عليا مر بقوم يلعبون الشطرنج فقال: ما هذه التماثيل التى انتم لها عاكفون؛ لقد عصيتم الله ورسوله

امیرالمومنین علیہ السلام کچھ لوگوں کے قریب سے گزرے۔ وہ شطرنج کھیل رہے تھے۔
آپ نے فرمایا: یہ مجسمے (اور بت) کہ جن کے ساتھ تم مشغول ہو کیا ہیں؟ تم خدا کے بھی نافرمان ہو اور اس کے رسول کے بھی۔[2]

---

[1] بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ "الیہ" کا مرجع خود حضرت ابراہیمؑ ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد بڑا بُت ہے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور یہ جو کچھ مذکورہ بالا آیت میں بیان ہوا ہے کہ یہ ان کا بڑا تھا، ممکن ہے کہ یہ ظاہری بڑے ہونے کی طرف اشارہ ہو یا بیہودہ بُت پرستوں کی نگاہ میں اس کے زیادہ احترام کی طرف یا دونوں کی طرف اشارہ ہو۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ **بُت پرستوں کی گفتگو اور ابراہیمؑ کا جواب** : یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بُت پرستوں نے حضرت ابراہیمؑ کے جواب میں افراد کی کثرت کا بھی ذکر کیا اور طولِ زمانہ کا بھی۔ وہ کہنے لگے : ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی دین پر پایا ہے۔

انہوں نے بھی دونوں حصّوں کا جواب دیا : تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی، ہمیشہ واضح گمراہی میں رہے ہیں۔

یعنی عاقل انسان کہ جو استقلالِ فکری رکھتا ہو ہرگز ان اوہام کا پابند نہیں ہوتا۔ نہ ہی کسی رسم اور سنّت کے طرفداروں کی کثرت کو اس کی درستی کی دلیل سمجھتا ہے اور نہ ہی اس کے ہمیشہ ہوتے رہنے کو اس کی حقانیت کی دلیل جانتا ہے :

۵۹۔ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○

۶۰۔ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ○

۶۱۔ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ○

۶۲۔ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○

۶۳۔ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْــَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ○

۶۴۔ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

۶۵۔ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاۗءِ يَنْطِقُوْنَ ○

۶۶۔ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْــًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ○

۶۷۔ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۵۹۔ انہوں نے کہا کہ جس نے بھی ہمارے معبودوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔ وہ قطعی طور ظالم و ستمگر ہے (اور اسے سزا ملنی چاہیے)

۶۰۔ (کچھ نے) کہا : ہم نے ایک جوان کو سنا ہے کہ جو بتوں کی (مخالفت) کی بات کرتا تھا، اس کا نام ابراہیم ہے۔

۶۱۔ (بعض نے) کہا : اُسے لوگوں کے سامنے پیش کرو تاکہ وہ گواہی دیں۔

۶۲۔ (جب انہوں نے ابراہیم کو حاضر کیا تو) اُس سے کہا : اے ابراہیم کیا تُو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟

۶۳۔ تو اس نے کہا بلکہ یہ کام ان کے بڑے نے کیا ہوگا۔ انہی سے پُوچھ لو اگر یہ بات کرتے ہوں۔

۶۴۔ وہ اپنے ضمیر کی طرف لوٹے (اور اپنے آپ سے) کہنے لگے کہ حق بات یہ ہے کہ تم خود ہی ظالم ہو۔

۶۵۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا رُخ موڑ لیا (اور اپنے ضمیر کی آواز کو بالکل بھلا دیا اور کہنے لگے) تُو تو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کرسکتے۔

۶۶۔ (ابراہیمؑ نے) کہا : کیا تم خدا کو چھوڑ کر اُس کی پرستش کرتے ہو کہ جو نہ تو تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان (کہ جو تمہیں ان سے نفع کی کوئی اُمید ہو یا کسی نقصان کا خوف ہو)۔

۶۷۔ تُف ہے تم پر بھی اور اس پر بھی جسے خدا کو چھوڑ کر پُوجتے ہو۔ کیا تم سوچتے نہیں ہو (اور کیا تمہارے پاس عقل نہیں ہے)۔

تفسیر

ابراہیمؑ کی دندان شکن دلیل :

آخر وہ عید کا دن ختم ہوگیا اور بُت پرست خوشی مناتے ہوئے شہر کی طرف پلٹے اور سب بُت خانے کی طرف گئے تاکہ بُتوں سے اظہارِ عقیدت بھی کریں اور وہ کھانا بھی کھائیں کہ جو اُن کے گمان کے مطابق بُتوں کے پاس رکھے رہنے سے بابرکت ہوگیا تھا۔ جونہی وہ بُت خانے کے اندر پہنچے تو ایک ایسا منظر دیکھا کہ اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ آباد بُت خانہ کے بجائے بتوں کا ایک ڈھیر تھا ان کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے پر گرے ہوئے تھے۔ وہ تو چیخنے چلّانے لگے : یہ بلا اور مصیبت ہمارے خداؤں کے سر پر کون لایا ہے"۔ (قالوا من فعل ھٰذا بألھتنا)[1]

"یقیناً جو کوئی بھی تھا ، ظالموں میں سے تھا"۔ (انہ لمن الظالمین)۔

اُس نے ہمارے خداؤں پر بھی ظلم کیا ہے ، ہماری قوم اور معاشرے پر بھی اور خود اپنے اُوپر بھی کیونکہ اُس نے اپنے اس عمل سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔

لیکن وہ لوگ جو بُتوں کے بارے میں ابراہیمؑ کی دھمکیوں سے آگاہ تھے اور ان جعلی خداؤں کے بارے میں ان کی اہانت آمیز باتوں کو جانتے تھے ، کہنے لگے : ہم نے سُنا ہے ایک جوان بتوں کے بارے میں باتیں کرتا تھا اور انہیں بُرا بھلا کہتا تھا ، اس کا نام ابراہیم ہے : (قالوا سمعنا فتی یذکرھو یقال لہ ابراھیم)[2]

---

[1] بعض مفسرین لفظ " من " کو یہاں موصولہ سمجھتے ہیں لیکن بعد والی آیت کی طرف توجہ کرنے سے کہ جو سوال کا جواب ہے ، اس طرح نظر آتا ہے کہ " من " یہاں استفہامیہ ہے۔

[2] جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ بُت پرست اس بات کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ وہ یہ کہیں کہ وہ جوان بتوں کو بُرا بھلا کہتا تھا۔ بس اتنا کہا کہ وہ بتوں کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض روایات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اس وقت مکمل طور پر جوان تھے اور احتمال یہ ہے کہ ان کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہیں تھی اور یہ بھی درست ہے کہ جوانمردی کی تمام خصوصیات، شجاعت، شہامت، صراحت اور قاطعیت ان کے وجود میں جمع تھیں لیکن اس طرح سے بات کرنے سے بُت پرستوں کی مراد یقیناً تحقیر کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔ بجائے اس کے کہ یہ کہتے کہ ابراہیمؑ نے یہ کام کیا ہے کہتے ہیں کہ ایک جوان ہے کہ جسے ابراہیم کہتے ہیں، وہ اس طرح کہتا تھا . . . . . یعنی ایک ایسا شخص کہ جو بالکل گمنام اور ان کی نظر میں بے حیثیت ہے۔

اصولاً معمول یہ ہے کہ جب کسی جگہ کوئی جُرم ہو جائے تو اُس شخص کو تلاش کرنے کے لیے کہ جس سے وہ جُرم سرزد ہوا ہو اُن سے دشمنی رکھنے والوں کو تلاش کیا جاتا ہے اور اس ماحول میں ابراہیمؑ کے سوا مسلماً کوئی شخص بتوں کے ساتھ دست وگریبان نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا تمام افکار انہی کی طرف متوجہ ہوگئے اور بعض نے کہا: " اب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو جاؤ اور اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرو تاکہ وہ لوگ کہ جو پہچانتے ہیں اور خبر رکھتے ہیں گواہی دیں": (قالوا فأتوا به علی اعین الناس لعلھم یشھدون)۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد حضرت ابراہیمؑ کی سزا کے منظر کا مشاہدہ ہے نہ کہ ان کے مجرم ہونے کی شہادت۔ لیکن بعد کی آیات پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیادہ تر باز پرس کا پہلو رکھتی ہیں، اس احتمال کی نفی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں لفظ "لعل" (شاید) کی تعبیر بھی دوسرے معنی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی، کیونکہ اگر لوگ سزا کا منظر دیکھنے کے لیے آئیں تو یقیناً اسے دیکھیں گے اور اُس کا مشاہدہ کریں گے۔ ایسے موقع پر شاید کی گنجائش نہیں ہے۔

❖ ❖ ❖

منادی کرنے والوں نے شہر میں ہر طرف یہ منادی کی کہ جو شخص بھی ابراہیمؑ کی بتوں سے دشمنی اور ان کی بدگوئی کے بارے میں آگاہ ہے، حاضر ہو جائے۔ جلد ہی جو آگاہ تھے وہ لوگ بھی اور تمام دوسرے لوگ بھی جمع ہوگئے تاکہ دیکھیں کہ اس ملزم کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ایک عجیب وغریب شور وغلغلہ لوگوں میں پڑا ہوا تھا، چونکہ ان کے عقیدے کے مطابق ایک ایسا جُرم جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا، ایک آشوب طلب جوان نے شہر میں برپا کر دیا تھا۔ اِس کام نے اس علاقے کے لوگوں کی مذہبی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

آخر کار عدالت لگی اور باز پُرس ہوئی۔ زعمائے قوم وہاں جمع ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ خود نمرود اِس عمل کی نگرانی کر رہا تھا۔

پہلا سوال جو اُنہوں نے ابراہیمؑ سے کیا وہ یہ تھا: " اُنھوں نے کہا: اے ابراہیم! کیا تُو نے ہی ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام کیا ہے": (قالوا ءانت فعلت ھذا بألھتنا یا ابراھیم)۔

وہ اِس بات تک کے لیے تیار نہیں تھے کہ یہ کہیں کہ تو نے ہمارے خداؤں کو توڑا ہے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، بلکہ صرف یہ کہا کہ کیا تُو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام کیا ہے؟

❖ ❖ ❖

ابراہیمؑ نے ایسا جواب دیا کہ وہ خود گھر گئے اور ایسے گھرے کہ نکلنا اُن کے بس میں نہ تھا۔ " ابراہیمؑ نے کہا: یہ کام اس بڑے بُت نے کیا ہے، ان سے پوچھو اگر یہ بات کرتے ہوں": (قال بل فعله کبیرھم ھذا فسئلوھم ان کانوا ینطقون)۔

جرائم کی تفتیش کے اصول یہ ہیں، کہ جس کے پاس آثارِ جرم یا آلۂ جرم ملے وہ ملزم ہے (مشہور روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے وہ کلہاڑا بڑے بُت کی گردن میں ڈال دیا تھا)

اصلاً، تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؛ تم اپنے بڑے خدا کو ملزم قرار کیوں نہیں دیتے؛ کیا یہ احتمال نہیں ہے کہ وہ چھوٹے خداؤں پر غضبناک ہو گیا ہو یا اس نے انہیں اپنا آئندہ کا رقیب فرض کرتے ہوئے ان سب کا حساب ایک ہی ساتھ پاک کر دیا ہو؛

چونکہ اس تعبیر کا ظاہر مفسرین کی نظر میں واقعیت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، اور چونکہ ابراہیمؑ پیغمبر ہیں اور معصوم ہیں اور وہ ہرگز جھوٹ نہیں بولتے، لہٰذا انہوں نے اس جملے کی تفسیر میں مختلف مطالب بیان کیے ہیں، جو مطلب ہمیں سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ:

ابراہیمؑ نے قطعی طور پر اس عمل کو بڑے بُت کی طرف منسوب کیا، لیکن تمام قرائن اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ اس بات سے کوئی پختہ اور مستقل قصد نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ اس سے یہ چاہتے تھے کہ بُت پرستوں کے مسلّمہ عقائد کو، جو کہ خرافاتی اور بے بنیاد تھے، ان کے منہ پر دے ماریں اور اُن کا مذاق اڑائیں اور انہیں یہ سمجھائیں کہ یہ بے جان پتھر اور لکڑیاں اس قدر حقیر ہیں کہ ایک جملہ تک بھی منہ سے نہیں نکال سکتیں کہ اپنی عبادت کرنے والوں سے مدد طلب کر لیں؛ چہ جائیکہ وہ یہ چاہیں کہ ان کی مشکلات حل کر دیں۔

اس تعبیر کی نظیر ہمارے روزمرہ کے محاورات میں بہت زیادہ ہے کہ مدِ مقابل کی بات کو باطل کرنے کے لیے، اسی کے مسلّمات کو ' امر یا خبر یا استفہام کی صورت میں اس کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ وہ مغلوب ہو جائے اور یہ بات کسی طرح بھی جھوٹ نہیں ہوتی، " **جھوٹ وہ ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ کوئی قرینہ نہ ہو۔**"

اس روایت میں کہ جو کتاب کافی میں امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، یہ بیان ہوا ہے کہ:

انما قال بل فعله کبیرهم ارادة الاصلاح، ودلالة علی انهم لا یفعلون، ثم قال واللّٰه ما فعلوه وما کذب:

" ابراہیم نے یہ بات اس لیے کہی کہ وہ ان کے افکار کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور انہیں یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ ایسے کام بُتوں سے نہیں ہو سکتے۔"

اس کے بعد امامؑ نے مزید فرمایا:

خدا کی قسم بتوں نے یہ کام نہیں کیا تھا اور ابراہیمؑ نے بھی جھوٹ نہیں بولا۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ ابراہیمؑ نے اس مطلب کو ایک جملۂ شرطیہ کی صورت میں ادا کیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر یہ بت بات کریں تو یہ کام انہوں نے کیا ہے، اس تفسیر کے مضمون کی ایک حدیث بھی وارد ہوئی ہے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ جملۂ شرطیہ (ان کانوا ینطقون) سوال کرنے کے لیے (فاسئلوهم) ایک قید ہے، (بل فعله کبیرهم) کے جملے کے لیے نہیں ہے (غور کیجئے گا)

ایک اور نکتہ کہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیئے یہ ہے کہ عبارت یہ ہے کہ اُن بتوں سے کہ جن کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں،

یہ سوال ہونا چاہیئے کہ یہ مصیبت اُن کے سر پر کس نے ڈالی ہے نہ کہ بڑے بُت سے (سوال) کیونکہ "ھُم" کی ضمیر اور اسی طرح "ان کانوا ینطقون" سب جمع کی صُورت میں ہیں اور یہ پہلی تفسیر کے ساتھ موافق ہے[1]۔

ابراہیم کی باتوں نے بُت پرستوں کو ہلا کر رکھ دیا، ان کے سوئے ہوئے وجدان کو بیدار کیا اور اُس طوفان کی مانند کہ جو آگ کی چنگاریوں کے اُوپر پڑی ہوئی بہت سی راکھ کو ہٹا دیتا ہے اور اس کی چمک کو آشکار کر دیتا ہے، ان کی فطرتِ توحیدی کو تعصب، جہالت اور غرور کے پردوں کے پیچھے سے آشکار وظاہر کر دیا۔

زود گزر لمحے میں وہ موت کی سی ایک گہری نیند سے بیدار ہوگئے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: وہ اپنے وجدان اور فطرت کی طرف پلٹے اور خود اپنے آپ سے کہنے لگے کہ حق بات یہ ہے کہ ظالم تو تم خود ہی ہو: (فرجعوا الی انفسھم فقالوا انکم انتم الظالمون)[2]

تم نے تو خود اپنے اُوپر بھی ظلم و ستم کیا ہے اور اُس معاشرے کے اُوپر بھی کہ جس کے ساتھ تمہارا تعلق ہے اور نعمتوں کے بخشنے والے پروردگار کی ساحت مقدس میں بھی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے ابراہیم پر ظالم ہونے کا اتہام لگایا تھا لیکن اب انہیں یہاں معلوم ہوگیا کہ اصلی اور حقیقی ظالم تو وہ خود ہیں۔

اور واقعاً ابراہیمؑ کا اصل مقصد بتوں کے توڑنے سے یہی تھا۔ مقصد تو بت پرستی کی فکر اور بُت پرستی کی رُوح کو توڑنا تھا۔ ورنہ بتوں کے توڑنے کا تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہٹ دھرم بُت پرست اُن سے زیادہ اور اُن سے بھی بڑے اور بنا لیتے اور ان کی جگہ پر رکھ دیتے۔ جیسا کہ نادان، جاہل اور متعصب اقوام کی تاریخ میں اس مسئلے کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔

ابراہیمؑ اِس حد تک کامیاب ہوئے کہ انہوں نے اپنی تبلیغ کے ایک بہت ہی حساس اور ظریف مرحلہ کو ایک نفسیاتی طوفان پیدا کر کے طے کر لیا اور وہ تھا سوئے ہوئے وجدانوں کو بیدار کرنا۔

لیکن افسوس! کہ جہالت و تعصب اور اندھی تقلید کا زنگ اس سے کہیں زیادہ تھا کہ وہ توحید کے اِس ہیرو کی صیقل بخش پکار سے کُلی طور پر دُور ہو جاتا۔

افسوس کہ یہ روحانی اور مقدس بیداری زیادہ دیر تک نہ رہ سکی اور ان کے آلودہ اور تاریک ضمیر میں، جہالت اور شیطانی قوتوں کی طرف سے اس نورِ توحید کے خلاف قیام عمل میں آگیا اور ہر چیز اپنی پہلی جگہ پر پلٹ آئی۔ قرآن کتنی لطیف تعبیر پیش کر رہا ہے: اس کے بعد وہ اپنے سر کے بل اُلٹے ہوگئے: (ثم نکسوا علٰی رءوسھم)۔

اور اس غرض سے کہ اپنے گونگے اور بے زبان خداؤں کی طرف سے کوئی عذر پیش کریں، انہوں نے کہا: "تُو تو جانتا ہے کہ یہ باتیں نہیں کرتے": (لقد علمت ما ھٰؤلاء ینطقون)۔

---

[1] علاوہ ازیں ظاہر یہ ہے کہ "کبیرھم" کی ضمیر باقی ضمیروں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

[2] بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ (فرجعوا الی انفسھم) سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے اور ایک دوسرے کو ملامت و سرزنش کرنے لگے لیکن جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

یہ تو ہمیشہ چُپ رہتے ہیں اور خاموشی کے رُعب کو نہیں توڑتے ۔

اور اس تراشے ہوئے عذر کے ساتھ اُنہوں نے یہ چاہا کہ بُتوں کی کمزوری، بدحالی اور ذلت کو چھپائیں۔

یہ وہ مقام تھا کہ جہاں ابراہیم جیسے ہیرو کے سامنے منطقی استدلال کے لیے میدان کُھل گیا تا کہ ان پر تابڑ توڑ حملے کریں اور ان کے ذہنوں کو ایسی سرزنش اور ملامت کریں کہ جو منطقی اور بیدار کرنے والی ہو۔ "(ابراہیم نے) پکار کر کہا : کیا تم خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہو کہ جو نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہ ضرر": (قال افتعبدون من دون الله مالا ینفعکم شیئا ولا یضرکم)۔

یہ خیالی خدا کہ جو نہ بات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، نہ شعور اور ادراک رکھتے ہیں، نہ خود اپنا دفاع کر سکتے ہیں، نہ بندوں کو اپنی حمایت کے لیے بلا سکتے ہیں، اصلاً ان سے کونسا کام ہو سکتا ہے اور کس درد کی دوا ہیں ؟!

ایک معبود کی پرستش یا تو اس بناء پر ہے کہ وہ عبودیت کے لائق ہے ۔ تو یہ بات بتوں کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتی یا کسی فائدہ کی اُمید کی وجہ سے ہوتی ہے اور یا ان سے کسی نقصان کے خوف سے ، لیکن بُتوں کے توڑنے کے میرے اقدام نے بتا دیا کہ یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تو کیا اس حال میں تمہارا یہ کام احمقانہ نہیں ہے ؟

* * *

پھر یہ معلم توحید بات کو اس سے بھی بالاتر لے گیا اور سرزنش کے تازیانے ان کی بے درد رُوح پر لگائے اور کہا : "تُف ہے تم پر بھی اور تمہارے ان خداؤں پر بھی کہ جنہیں تم نے خدا کو چھوڑ کر اپنا رکھا ہے": (اف لکم و لما تعبدون من دون الله)۔

"کیا تم کچھ سوچتے نہیں ہو اور تمہارے سر میں عقل نہیں ہے" : (افلا تعقلون)۔

لیکن انہیں بُرا بھلا کہنے اور سرزنش کرنے میں نرمی اور ملائمت کو بھی نہیں چھوڑا کہ کہیں اور زیادہ ہٹ دھرمی نہ کرنے لگیں لے

درحقیقت ابراہیم نے بہت ہی نپے تلے انداز میں اپنا منصوبہ آگے بڑھایا۔ پہلی مرتبہ انہیں توحید کی طرف دعوت دیتے ہوئے انہیں پکار کر کہا : یہ بے رُوح مجسمے کیا ہیں ؟ کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو ؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ تمہارے بڑوں کی سنّت ہے تو تم بھی گمراہ ہو اور وہ بھی گمراہ تھے۔

دوسرے مرحلے میں ایک عملی اقدام کیا تاکہ یہ بات واضح کر دیں کہ یہ بُت اِس قسم کی کوئی قدرت نہیں رکھتے کہ جو شخص ان کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے تو اس کو نابود کر دیں۔ خصوصیت کے ساتھ پہلے سے خبردار کر کے بتوں کی طرف گئے اور انہیں بالکل درہم برہم کر دیا تاکہ یہ بات واضح کریں کہ وہ خیالات و تصورات جو انہوں نے باندھے ہوئے ہیں سب کے سب فضول اور بیہودہ ہیں ۔

تیسرے مرحلے میں اُس تاریخی عدالت میں انہیں بُری طرح پھنسا کے رکھ دیا۔ کبھی ان کی فطرت کو اُبھارا، کبھی ان کی عقل کو جھنجوڑا، کبھی پند و نصیحت کی اور کبھی سرزنش و ملامت۔

خلاصہ یہ کہ اس عظیم خدائی معلّم نے ہر راستہ اختیار کیا اور جو کچھ اس کے بس میں تھا اُسے بروئے کار لایا لیکن تاثیر کے لیے ظرف، قابلیت کا ہونا بھی مسلمہ شرط ہے۔ افسوس یہ اس قوم میں موجود نہیں تھی۔

لے ہم "اف" کے معنی کے بارے میں ج ۶ سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۲۳ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

لیکن بلاشبہ ابراہیمؑ کی باتیں اور کام، توحید کے بارے میں کم از کم استفہامی علامات کی صورت میں ان کے ذہنوں میں باقی رہ گئے اور یہ آئندہ کی وسیع بیداری اور آگاہی کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید بن گئے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے کچھ افراد اگرچہ وہ تعداد میں بہت کم تھے، لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے بہت تھے — اُن پر ایمان لے آئے تھے[1] اور نسبتاً کچھ آمادگی کا سامان دوسروں کے لیے بھی پیدا ہو گیا تھا۔

۶۸۔ قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ○

۶۹۔ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ○

۷۰۔ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ○

ترجمہ

۶۸۔ انہوں نے کہا: اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم کچھ کر سکتے ہو۔

۶۹۔ (آخر کار اُسے آگ میں پھینک دیا لیکن ہم نے) کہا: اے آگ! ابراہیم پر سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا۔

۷۰۔ وہ چاہتے تھے کہ اس منصوبے سے ابراہیم کو نابود کر دیں لیکن ہم نے انہیں سب سے زیادہ خسارے میں ڈال دیا۔

تفسیر

آگ گلزار ہوگئی

اگرچہ ابراہیمؑ کے علمی و منطقی استدلالات کے ذریعے سب کے سب بت پرست مغلوب ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے دل میں اس شکست کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔

لیکن تعصب اور شدید ہٹ دھرمی حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئی۔ لہذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے ابراہیم کے بارے میں بہت ہی سخت اور خطرناک قسم کا ارادہ کر لیا اور وہ ابراہیمؑ کو بدترین صورت میں قتل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پروگرام بنایا کہ انہیں جلا کر راکھ کر دیا جائے۔

عام طور پر طاقت اور منطق کے درمیان معکوسی رابطہ ہوتا ہے، جس قدر انسان میں طاقت اور قدرت زیادہ ہوتی جاتی ہے، اتنی ہی اس کی منطق کمزور ہوتی جاتی ہے۔ سوائے مردانِ حق کے کہ وہ جتنا زیادہ قوی اور طاقتور ہوتے ہیں، اتنا ہی زیادہ متواضع اور منطقی

---

[1] کامل ابن اثیر، جلد اوّل ص۱۰۰۔

تو جلتے ہیں۔

جو لوگ طاقت کی زبان سے بات کرتے ہیں۔ جب وہ منطق کے ذریعے کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں تو فوراً اپنی طاقت و قدرت کا سہارا لے لیتے ہیں۔ ابراہیمؑ کے بارے میں ٹھیک یہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ان لوگوں نے (چیخ کر) کہا: اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم سے کوئی کام ہو سکتا ہے: (قالوا حرقوه وانصروا آلهتكم ان كنتم فاعلين)۔

طاقتور صاحبانِ اقتدار بے خبر عوام کو مشتعل کرنے کے لیے عام طور پر ان کی نفسیاتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ وہ نفسیات کو پہچانتے ہیں اور اپنے کام کرنا خوب جانتے ہیں۔

جیسا کہ انہوں نے اس قصہ میں کیا اور ایسے نعرے لگائے کہ جس سے، اصطلاح کے مطابق۔ ان کی غیرت کو للکارا: یہ تمہارے خدا ہیں، تمہارے مقدسات خطرے میں پڑ گئے ہیں، تمہارے بزرگوں کی سنت کو پاؤں تلے روند ڈالا گیا ہے، تمہاری غیرت و حمیت کہاں چلی گئی؟ تم اس قدر ضعیف اور زبوں حال کیوں ہو گئے ہو؟ اپنے خداؤں کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ ابراہیمؑ کو جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر کچھ کام تم سے ہو سکتا ہے اور بدن میں توانائی اور جان ہے۔

دیکھو! سب لوگ اپنے مقدسات کا دفاع کرتے ہیں، تمہارا تو سب کچھ خطرے میں پڑ گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انہوں نے اس قسم کی بہت سی فضول اور مہمل باتیں کیں اور لوگوں کو ابراہیمؑ کے خلاف بھڑکایا اس طرح سے کہ لکڑیوں کے چند گٹھوں کی بجائے کہ جو کئی افراد کے جلانے کے لیے کافی ہوتے ہیں، لکڑیوں کے ہزارہا گٹھے ایک دوسرے پر رکھ کر لکڑیوں کا ایک پہاڑ بنا دیا اور اس کے بعد آگ کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تاکہ اس عمل کے ذریعہ سے اپنا انتقام بھی اچھی طرح سے لے سکیں اور بتوں کا وہ خیالی رُعب و داب اور عظمت بھی جس کو ابراہیمؑ کے طرزِ عمل سے سخت نقصان پہنچا تھا، کسی حد تک بحال ہو سکے۔

تاریخ والوں نے اس مقام پر بہت سے مطالب تحریر کیے ہیں کہ جن میں سے کوئی بھی بعید نظر نہیں آتا۔

منجملہ ان کے کہتے ہیں کہ لوگ چالیس دن تک لکڑیاں جمع کرنے میں لگے رہے اور ہر طرف سے بہت سی خشک لکڑیاں لا لا کر جمع کرتے رہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ عورتیں تک بھی کہ جن کا کام گھر میں بیٹھ کر چرخا کاتنا تھا، وہ اس کی آمدنی سے لکڑیوں کا گٹھا لے کر اس میں ڈلواتی تھیں اور وہ لوگ کہ جو قریب المرگ ہوتے تھے، اپنے مال میں سے کچھ رقم سے لکڑیاں خریدنے کی وصیت کرتے تھے اور حاجت مند اپنی حاجتوں کے پورے ہونے کے لیے یہ منت مانتے تھے کہ اگر ان کی حاجت پوری ہو گئی، تو اتنی مقدار لکڑیوں کا اضافہ کریں گے۔

یہی وجہ تھی کہ جب اُن لکڑیوں میں مختلف اطراف سے آگ لگائی گئی تو اس کے شعلے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ پرندے اس علاقے سے نہیں گزر سکتے تھے۔

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی آگ کے تو قریب بھی نہیں جایا جا سکتا۔ چہ جائیکہ ابراہیمؑ کو لے جا کر اُس میں پھینکیں مجبوراً منجنیق سے کام لیا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس کے اندر بٹھا کر بڑی تیزی کے ساتھ آگ کے اِس دریا میں پھینک دیا گیا[1]

---

[1] مجمع البیان، تفسیر المیزان، تفسیر فخر رازی اور تفسیر قرطبی زیر بحث آیات کے ذیل میں اور کامل ابن اثیر جلد ۱ ص ۹۸۔

ان روایات میں کہ جو شیعہ اور سُنی کی طرف سے نقل ہوئی ہیں، یہ بیان ہوا ہے کہ:

جس وقت حضرت ابراہیمؑ کو منجنیق کے اوپر بٹھایا گیا اور انہیں آگ میں پھینکا جانے لگا تو آسمان، زمین اور فرشتوں نے فریاد بلند کی اور بارگاہِ خداوندی میں درخواست کی کہ توحید کے اس ہیرو اور حریت پسندوں کے لیڈر کو بچالے۔

یہ بھی منقول ہے کہ اس وقت جبرئیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے اور ان سے کہا:

الك حاجة

کیا تمہاری کوئی حاجت ہے کہ میں تمہاری مدد کروں؟

ابراہیم علیہ السلام نے مختصر سا جواب دیا:

اما اليك فلا

تجھ سے حاجت؟ نہیں! نہیں! (میں تو اسی ذات سے حاجت رکھتا ہوں کہ جو سب سے بے نیاز اور سب پر مہربان ہے)۔

تو اس موقع پر جبرئیل نے کہا:

فاسئل ربك

تو پھر تم اپنی حاجت خدا سے طلب کرو۔

انہوں نے جواب میں کہا:

حسبي من سؤالي علمه بحالي

میرے سوال کرنے کی بجائے یہی کافی ہے کہ وہ میری حالت سے آگاہ ہے۔[1]

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے اس طرح راز و نیاز میں بات کی:

يا احد يا احد يا صمد يا صمد يا من لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفواً احد توكلت على الله.[2]

اے اکیلے اے اکیلے! اے بے نیاز! اے بے نیاز! اے وہ کہ جس نے کسی کو نہیں جنا اور نہ جو جنا گیا اور کوئی جس کا ہم پلہ نہیں! میں اللہ پر ہی بھروسہ رکھتا ہوں۔

یہ دعا مختلف عبارات کے ساتھ دوسری کتابوں میں بھی آئی ہے۔

بہرحال لوگوں کے شور و غل ہا ؤ ہو اور جوش و خروش کے اس عالم میں حضرت ابراہیمؑ آگ کے شعلوں کے اندر پھینک دیئے گئے۔ لوگوں نے خوشی سے اس طرح نعرے لگائے گویا بتوں کو توڑنے والا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابود اور خاکستر ہوگیا۔

لیکن وہ خدا کہ جس کے فرمان کے سامنے تمام چیزیں سرخم کیے ہوئے ہیں۔ جلانے کی صلاحیت اسی نے آگ میں رکھی۔

---

[1] المیزان، ج ۱۴ ص ۳۳۶ بحوالہ روضۃ الکافی

[2] تفسیر فخر رازی زیر بحث آیہ کے ذیل میں

ہے اور ماؤں کے دل میں محبت بھی اسی نے ڈالی ہے۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ یہ خالص بندۂ مومن آگ کے اس دریا میں صحیح و سالم رہے تاکہ اس کے افتخار اور اعزاز کی سندوں میں ایک اور سند کا اضافہ ہو جائے۔[1]

جیسا کہ قرآن اس مقام پر کہتا ہے: ہم نے آگ سے کہا: اے آگ! ابراہیم پر سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا:

(قلنا یا نار کونی بردًا و سلامًا علیٰ ابراھیم)۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں خدا کا فرمان فرمانِ تکوینی تھا۔ وہی فرمان کہ جو وہ جہانِ ہستی میں آفتاب و مہتاب، زمین و آسمان، پانی اور آگ، نباتات اور پرندوں کو دیتا ہے۔

مشہور یہ ہے کہ آگ اس قدر ٹھنڈی ہوگئی کہ ابراہیمؑ کے دانت ٹھنڈک کی شدت سے بجنے لگے اور پھر بعض مفسرین کے قول کے مطابق تو اگر "سلامًا" کی تعبیر ساتھ نہ ہوتی تو آگ اس قدر سرد ہو جاتی کہ ابراہیمؑ کی جان سردی سے خطرے میں پڑ جاتی۔

ایک مشہور روایت میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ نمرود کی آگ خوبصورت گلستان میں تبدیل ہوگئی۔[1]

یہاں تک کہ بعض نے تو کہا ہے کہ جس دن ابراہیمؑ آگ میں رہے، ان کی زندگی کے دنوں میں سب سے بہترین راحت و آرام کا دن تھا۔[2]

بہرحال اس بارے میں کہ آگ نے حضرت ابراہیمؑ کو کیوں نہ جلایا، مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن اجمالی بات یہ ہے کہ بینش توحیدی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کسی سبب سے بھی خدا کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ ایک دن وہ ابراہیمؑ کے ہاتھ میں موجود چھری سے کہتا ہے: نہ کاٹ اور دوسرے دن آگ سے کہتا ہے: نہ جلا اور ایک دن پانی کو جو سبب حیات ہے حکم دیتا ہے کہ فرعون اور فرعونیوں کو غرق کر دے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں نتیجہ پیش کرتے ہوئے مختصر اور چچے تلے الفاظ میں فرمایا گیا ہے: اُنہوں نے یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ ابراہیم کو ایک خطرناک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نابود کر دیں لیکن ہم نے اُنہیں کو سب سے زیادہ گھاٹے میں رہنے والا قرار دے دیا:

(و ارادوا بہ کیدًا فجعلنٰھم الاخسرین)۔

یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ابراہیم کے آگ میں صحیح و سالم رہ جانے سے صورت حال بالکل بدل گئی۔ خوشی اور مسرت کا شور و غل ختم ہوگیا۔ تعجب سے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کچھ لوگ ایک دوسرے کے کان میں رُونما ہونے والی اس عجیب چیز کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ابراہیمؑ اور اس کے خدا کی عظمت کا ورد زبانوں پر جاری ہوگیا۔ نمرود کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا لیکن پھر بھی تعصب اور ہٹ دھرمی حق کو قبول کرنے میں پوری طرح حائل ہوگئی۔ اگرچہ کچھ بیدار دل اس واقعے سے بہرہ ور بھی ہوئے اور ابراہیمؑ کے خدا کے بارے میں ان کے ایمان میں زیادتی اور اضافہ ہوا، مگر یہ لوگ اقلیت میں تھے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان زیرِ بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فخر رازی زیرِ بحث آیہ کے ذیل میں۔

چند اہم نکات :

۱۔ سبب سازی و سبب سوزی : بعض اوقات انسان عالمِ اسباب میں اس قدر غرق ہو جاتا ہے کہ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ یہ آثار و خواص خود انہیں موجودات کے ذاتی ہیں اور اس عظیم مبداء سے کہ جس نے ان موجودات کو یہ مختلف آثار و صفات بخشے ہیں، غافل ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر خدا بندوں کو بیدار کرنے کے لیے "سبب سازی" اور "سبب سوزی" کو بیان کر رہا ہے۔

وہ موجودات کہ جن سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا، وہ عظیم آثار کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ مکڑی کو حکم دیتا ہے کہ وہ چند کمزور تار غارِ ثور کے دہانے پر تن دے اور انہی چند تاروں کی وجہ سے پیغمبرِ اسلامؐ کے تعاقب میں نکلنے والے آپؐ کو نہ پا سکے جبکہ اگر وہ آپؐ کو پا لیتے تو قتل کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی چھوٹی سی چیز سے تاریخ عالم کا رُخ موڑ کے رکھ دیا اور اس کے برعکس بعض اوقات ان اسباب کو کہ جو عالم مادہ میں ضرب المثل ہیں (آگ جلانے میں اور چھری کاٹنے میں) انہیں بیکار کر دیتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کے پاس بھی ذاتی طور پر کچھ نہیں کیونکہ اگر "ربِ جلیل" ان کو منع کر دے اور روک دے تو وہ اپنا کام نہیں کر سکتے، چاہے ابراہیم خلیلؑ حکم بھی دے۔

ان حقائق کی طرف توجہ ــــ کہ جن کے بے شمار نمونے ہم نے اپنی زندگی میں دیکھے ہیں ــــ رُوحِ توحید اور توکل کو مومن کی زندگی میں اِس قدر زندہ اور بیدار کر دیتے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کے بارے میں سوچتا ہی نہیں اور اس کے غیر سے مدد طلب نہیں کرتا۔ "مشکلات کی آگ" کو خاموش کرنے کی صرف اُسی سے دُعا کرتا ہے اور دشمنوں کے مکر کی نابودی بھی اس کی بارگاہ سے طلب کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی طرف نہیں دیکھتا، اور اس کے غیر سے کسی چیز کی تمنا نہیں کرتا۔

۲۔ بہادر نوجوان : بعض تفسیروں میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا تو ان کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی[1] اور بعض نے اس وقت ان کا سن ۲۶ سال کا ذکر کیا ہے[2]

بہرحال وہ جوانی کی عمر میں تھے اور باوجود اس کے کہ ظاہری طور پر ان کا کوئی یار و مددگار نہیں تھا، اپنے زمانے کے اس عظیم طاغوت کے ساتھ پنجہ آزمائی کی کہ جو دوسرے طاغوتوں کا سرپرست تھا۔ آپ تن تنہا جہالت، خرافات اور شرک کے خلاف جنگ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور ماحول کے تمام خیالی مقدسات کا مذاق اُڑایا اور لوگوں کے غصے اور انتقام سے ذرا بھی نہ گھبرائے کیونکہ ان کا دل عشقِ خدا سے معمور تھا اور ان کا اس پاک ذات پر ہی توکل اور بھروسہ تھا۔

ہاں! ایمان ایسی ہی چیز ہے کہ یہ جہاں پیدا ہو جاتا ہے وہاں جرأت و شجاعت پیدا کر دیتا ہے اور جس میں یہ موجود ہو، اُسے شکست نہیں ہو سکتی۔

آج کی طوفانی دُنیا میں مسلمانوں کو عظیم شیطانی قوتوں کے مقابلہ کے لیے جس اہم ترین چیز کی ضرورت ہے وہ یہی ایمان کا عظیم سرمایہ ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

ان المؤمن اشد من زبر الحديد، ان زبر الحديد اذا دخل النار

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] تفسیر قرطبی، جلد ۶ صفحہ ۴۳۰۳۔

تغیر وان المؤمن لو قتل ثم نشر ثم قتل لم یتغیر قلبه

مومن فولاد کے ٹکڑوں سے بھی زیادہ محکم ہوتا ہے کیونکہ فولاد کو جب آگ میں ڈالا جاتا ہے تو اس میں تغیر اور تبدیلی آجاتی ہے لیکن مومن کو اگر قتل بھی کر دیا جائے اور پھر دوبارہ زندہ کیا جائے اور پھر اسے قتل کر دیا جائے، پھر بھی اس کے دل میں تبدیلی نہیں آتی[1]

۳۔ **ابراہیمؑ اور نمرود کے مابین معرکہ :** تاریخوں میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا، نمرود کو یقین ہو گیا تھا کہ ابراہیمؑ مٹھی بھر خاک میں تبدیل ہو گئے ہیں لیکن جب اس نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو زندہ ہیں، تو اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہنے لگا مجھے تو ابراہیم زندہ دکھائی دے رہا ہے۔ شاید مجھے اشتباہ ہو رہا ہے۔ وہ ایک بلند مقام پر چڑھ گیا اور خوب غور سے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ معاملہ تو اسی طرح ہے۔ نمرود نے پکار کر کہا: اے ابراہیم! واقعاً تیرا خدا عظیم ہے اور اس قدر قدرت رکھتا ہے کہ اس نے تیرے اور آگ کے درمیان ایک رکاوٹ پیدا کر دی! ۔۔۔ اب جبکہ یہ بات ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس کی اس قدرت اور عظمت کی وجہ سے اس کے لیے قربانی کروں۔ (اور اس نے چار ہزار قربانیاں اس مقصد کے لیے تیار کیں) لیکن ابراہیم نے اس سے کہا: تجھ سے کسی قسم کی قربانی اور کارِ خیر قبول نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ تو پہلے ایمان لے آئے۔

نمرود نے جواب میں کہا: اس صورت میں تو میری حکومت ختم ہو جائے گی اور میں یہ بات گوارا نہیں کر سکتا۔

بہرحال یہی حادثات اس بات کا سبب بن گئے کہ کچھ آگاہ اور بیدار دل لوگ ابراہیمؑ کے خدا پر ایمان لے آئے یا ان کے ایمان میں اضافہ ہو گیا اور شاید یہی واقعہ اس بات کا سبب بنا کہ نمرود ابراہیمؑ کے مقابلہ میں کسی سخت ردِّ عمل کا اظہار نہ کرے اور صرف ان کو سرزمین بابل سے جلاوطن کرنے پر قناعت کرے[2]

◆ ◆ ◆

۷۱۔ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝

۷۲۔ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝

۷۳۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۤءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۱، ص ۳۷ (مادہ امن)۔

[2] کامل ابن اثیر، جلد اوّل، ص ۹۹

ترجمہ

۷۱۔ اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین (شام) کی طرف نجات دی کہ جسے ہم نے سب اہل جہان کے لیے پُر برکت بنایا۔

۷۲۔ اور ہم نے اُسے اسحاق اور (اس کے بعد) یعقوب بھی بخشا اور ہم نے اُن سب کو مردانِ صالح قرار دیا۔

۷۳۔ اور ہم نے انہیں ایسے امام (اور پیشوا) قرار دیا کہ جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے اور ہم نے انہیں نیک کام انجام دینے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی اور وہ صرف میری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔

تفسیر

بُت پرستوں کی سرزمین سے ابراہیمؑ کی ہجرت:

ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ اور اس خطرناک مرحلہ سے ان کی معجزانہ نجات نے نمرود کے ارکانِ حکومت کو لرزہ براندام کردیا۔ نمرود تو بالکل حواس باختہ ہوگیا کیونکہ اب وہ ابراہیمؑ کو ایک فتنہ کھڑا کرنے والا اور نفاق ڈالنے والا جوان نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ ابراہیمؑ اب ایک خدائی رہبر اور بہادر ہیرو کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ابراہیم اس کے تمام تر طاقت و وسائل کے باوجود اُس کے خلاف جنگ کی ہمت رکھتا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اگر ابراہیمؑ ان حالات میں اس شہر اور اس ملک میں رہا تو اپنی باتوں، قوی منطق اور بے نظیر شجاعت کے ساتھ، مسلمہ طور پر اس جابر، خودسر اور خودغرض حکومت کے لیے ایک خطرے کا مرکز بن سکتا ہے۔ لہٰذا اُس نے فیصلہ کیا کہ ابراہیمؑ کو ہر حالت میں اِس سرزمین سے چلے جانا چاہیئے۔

دوسری طرف ابراہیمؑ حقیقت میں اپنی رسالت کا کام اس سرزمین میں انجام دے چکے تھے۔ وہ حکومت کی بنیادوں پر یکے بعد دیگرے چکنا چور کرنے والی ضربیں لگا چکے تھے۔ اس سرزمین میں ایمان و آگاہی کا بیج بو چکے تھے۔ اب صرف ایک مدت کی ضرورت تھی کہ جس سے یہ بیج آہستہ آہستہ بارآور ہو اور بُت پرستی کی بساط اُلٹ جائے۔

اب ان کے لیے بھی مفید یہی تھا کہ یہاں سے کسی دوسری سرزمین کی طرف چلے جائیں اور اپنی رسالت کے کام کو وہاں بھی عملی شکل دیں۔ لہٰذا انہوں نے یہ ارادہ کرلیا کہ لوط (جو آپؑ کے بھتیجے تھے) اور اپنی بیوی سارہ اور احتمالاً مومنین کے ایک چھوٹے سے گروہ کو ساتھ لے کر اس سرزمین سے شام کی طرف ہجرت کر جائیں۔

جیسا کہ قرآن زیر بحث آیات میں کہتا ہے: ہم نے ابراہیم اور لوط کو ایسی سرزمین کی طرف نجات دی کہ جسے ہم نے سارے جہان والوں کے لیے برکتوں والا بنایا تھا: (ونجینٰہ ولوطًا الی الارض التی بارکنا فیھا للعالمین)۔

اگرچہ قرآن میں اس سرزمین کا نام صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوا ہے لیکن سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت (سبحان الذی اسری بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ) پر توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہی شام کی سرزمین ہے، جو ظاہری اعتبار سے بھی پُر برکت، زرخیز اور سرسبز و شاداب ہے اور معنوی لحاظ سے بھی کیونکہ وہ انبیاءؑ کی پرورش

کا مرکز تھی ۔

ابراہیمؑ نے یہ ہجرت خود اپنے آپ کی تھی یا نمرود کی حکومت نے انہیں جلاوطن کیا یا یہ دونوں ہی صورتیں واقع ہوئیں اس بارے میں تفاسیر و روایات میں مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں، ان کا مجموعی مفہوم یہی ہے کہ ایک طرف تو نمرود اور اس کے ارکان حکومت ابراہیمؑ کو اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے انھیں اس سرزمین سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور دوسری طرف ابراہیمؑ بھی اس سرزمین میں اپنی رسالت کے کام تقریباً مکمل کر چکے تھے اور اب کسی دوسرے علاقے میں جانے کے خواہاں تھے کہ دعوتِ توحید کو وہاں بھی پھیلائیں۔ خصوصاً بابل میں رہنے سے ممکن تھا کہ آپؑ کی جان چلی جاتی اور آپؑ کی عالمی دعوت نامکمل رہ جاتی ۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں یہ بیان ہوا کہ جس وقت نمرود نے یہ ارادہ کیا کہ ابراہیمؑ کو اس سرزمین سے جلاوطن کر دے تو اس نے یہ حکم دیا کہ ابراہیم کی بھیڑیں اور ان کا سارا مال ضبط کر لیا جائے اور وہ اکیلا ہی یہاں سے باہر جائے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اُن سے کہا یہ میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ اگر تم میرا مال لینا چاہتے ہو تو میری اُس عمر کو جو مَیں نے اس سرزمین میں گزاری ہے مجھے واپس دے دو۔ لہٰذا طے یہ پایا کہ حکومت کے قاضیوں میں سے ایک اس بارے میں فیصلہ دے۔ قاضی نے حکم دیا کہ ابراہیم کا مال لے لیا جائے اور جو عمر انہوں نے اس سرزمین میں خرچ کی ہے وہ انہیں واپس کر دی جائے۔

جس وقت نمرود اس واقعہ سے آگاہ ہوا تو اس نے بہادر قاضی کے حقیقی مفہوم کو سمجھ لیا اور حکم دیا کہ ابراہیم کا مال اور اس کی بھیڑیں اُسے واپس کر دی جائیں تاکہ وہ انہیں ساتھ لے جائے اور کہا : مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ یہاں رہ گیا تو وہ تمہارے دین و آئین کو خراب کر دے گا اور تمہارے خداؤں کو نقصان پہنچائے گا : (انه ان بقی فی بلادکم افسد دینکم واضر بالهتکم)۔[1]

بعد والی آیت میں ابراہیمؑ پر خدا کی ایک نہایت اہم نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے صالح اولاد اور ایک پھلنے پھولنے والی اچھی نسل عطا فرمایا گیا ہے : ہم نے اُسے اسحاق (سا بیٹا) عطا کیا اور (اس کے بعد اسحاق کا بیٹا) یعقوب بھی عطا کیا : (و وهبنا له اسحٰق و یعقوب نافلة)۔[2]

اور ہم نے ان سب کو صالح ، شائستہ اور مفید قرار دیا : (وکلًّا جعلنا صالحین)۔

سالہا سال گزر گئے کہ ابراہیم اس فرزند صالح کے انتظار اور خواہش میں ہی زندگی بسر کرتے رہے اور سورہ صافات کی آیہ ۱۰۰ ان کی اس اندرونی خواہش کو بیان کر رہی ہے :

رب هب لی من الصالحین

پروردگارا ! مجھے ایک صالح فرزند مرحمت فرما۔

آخر کار خدا نے ان کی دُعا قبول کر لی۔ پہلے اسمٰعیلؑ اور پھر اسحاقؑ انہیں مرحمت فرمایا کہ جن میں سے ہر ایک، ایک بزرگ پیغمبر اور صاحبِ منزلت تھے۔

---

[1] المیزان زیر بحث آیات کے ذیل میں، بحوالہ روضۃ الکافی

[2] یہاں اسماعیل کا ذکر نہ کرنا جب کہ وہ ابراہیمؑ کے پہلے بیٹے تھے، شاید اس وجہ سے ہو کہ اسحاق سارہ جیسی بانجھ خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے تھے وہ بھی اس سن میں جب معمولاً وضع حمل ممکن نہ تھا۔ لہٰذا یہ ایک عجیب غیر معمولی مسئلہ معلوم ہوتا تھا جبکہ اسماعیلؑ کا اپنی والدہ ہاجرہ سے پیدا ہونا ایسا عجیب نہ تھا۔

"نافلہ" کی تعبیر کہ جو ظاہری طور پر صرف یعقوب کی توصیف ہے، شاید اس بنا پر ہو کہ ابراہیم نے تو صرف ایک صالح فرزند کیلیے دُعا کی تھی، خدا نے ایک صالح پوتے کا بھی اس پر اضافہ کر دیا کیونکہ "نافلہ" دراصل نعمت کے یا اضافی کام کے معنی میں ہے۔

آخری زیر بحث آیت ان عظیم پیغمبروں کے مقام امامت و رہبری اور ان کی کچھ صفات اور اہم پروگراموں کی طرف اجتماعی طور پر اشارہ کر رہی ہے۔

اس آیت میں مجموعی طور پر ان کی چھ صفات شمار کی گئی ہیں۔ ان میں صالح ہونے کی صفت کا اضافہ کر لیا جائے تو سات ہو جاتی ہیں کیونکہ گزشتہ آیت میں یہ صفت بیان ہوئی ہے ـــــ یہ احتمال بھی ہے کہ ان چھ صفات کا مجموعہ کہ جو اس آیت میں ذکر ہوا ہے، ان کے صالح ہونے کی تشریح ہو کہ جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے انہیں امام اور لوگوں کا رہبر قرار دیا (وجعلناھم ائمۃ) یعنی مقام نبوت و رسالت کے بعد ہم نے انہیں مقام امامت بھی عطا کیا ـــ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ امامت انسانی ارتقاء اور سیر تکامل کا آخری مرحلہ ہے کہ جو لوگوں کی مادی و معنوی، ظاہری و باطنی، جسمانی و روحانی رہبری کے معنی میں ہے۔

نبوت و رسالت کا امامت کے ساتھ یہ فرق ہے کہ انبیاء و رسل مقام نبوت و رسالت میں صرف فرمان حق کو حاصل کرتے اور اس کی خبر دیتے اور لوگوں کو اس کی تبلیغ کرتے ہیں، ایسا ابلاغ کہ جس میں بشارت و نذارت موجود ہو۔

لیکن مرحلہ امامت میں وہ ان خدائی پروگراموں کا اجراء کرتے ہیں، چاہے وہ حکومت عادلہ کی تشکیل کے ذریعے ہو یا اس کے بغیر۔ اس لحاظ سے وہ تربیت کرنے والے احکام اور پروگرام جاری کرنے والے، انسانوں کی تربیت کرنے والے اور پاک و پاکیزہ انسانی ماحول کو وجود میں لانے والے ہوتے ہیں۔

درحقیقت مقام امامت تمام خدائی پروگراموں کو عملی صورت دینے کا مقام ہے۔

دوسرے لفظوں میں مقصود و مطلوب تک پہنچانا اور تشریعی و تکوینی ھدایت کرنا ہے۔

امام اِس لحاظ سے ٹھیک آفتاب کی مانند ہے کہ جو اپنی شعاعوں کے ذریعے زندہ موجودات کی پرورش کرتا ہے۔[1]

بعد کے مرحلے میں اس مقام کی فعلیت اور اس کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے، وہ ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کرتے ہیں۔ (یھدون بامرنا)۔

ہدایت صرف راہنمائی اور راستہ دکھانے کے معنی میں نہیں ہے ـــ کیونکہ یہ بات تو نبوت و رسالت میں بھی موجود ہوتی ہے ـــ بلکہ دستگیری کرنے اور منزلِ مقصود تک پہنچانے کے معنی میں ہے (البتہ اُنہی لوگوں کے لیے کہ جو آمادگی اور اہلیت رکھتے ہیں)۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں نعمت اور ان کی خصوصیت یہ تھی کہ: ہم نے انہیں اچھے کام انجام دینے اور (اسی طرح) نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی (واوحینا الیھم فعل الخیرات و اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ)۔

یہ وحی "تشریعی وحی" بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی ہم نے مختلف قسم کے کارہائے خیر اور ادائے نماز اور ادائیگی زکوٰۃ کو ان کے دینی پروگراموں میں داخل کر دیا اور یہ وحی تکوینی بھی ہو سکتی ہے یعنی ہم نے ان امور کو انجام دینے کے لیے انہیں توفیق و توانائی اور معنوی جذبہ عطا فرمایا۔

البتہ ان امور میں سے کوئی بھی چیز جبری اور اضطراری پہلو نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ صرف اہلیتیں ہیں کہ جو خود ان کے اپنے ارادہ اور خواہش

[1] اس سلسلہ میں مزید تشریح جلد اول سورہ بقرہ کی آیہ ۱۲۴ کے ذیل میں مطالعہ کریں۔

کے بغیر ہرگز کسی نتیجہ تک نہیں پہنچتیں۔

"فعل خیرات" کے بعد قیام صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ" کا ذکر، ان دونوں امور کی اہمیت کی وجہ سے ہے کہ جو پہلے تو عام حیثیت سے "واوحینا الیھم فعل الخیرات" کے جملے میں، اور اس کے بعد بطور خاص بیان ہوا ہے۔

آخری حصے میں ان کے مقام "عبودیت" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : وہ صرف ہماری عبادت کرتے تھے (وکانوا لنا عابدین)[1]

ضمنی طور پر "کانوا" کی تعبیر کہ جو اس پروگرام میں پہلے سے مسلسل عمل کرتے رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ مقام نبوت و رسالت تک پہنچنے سے پہلے بھی صالح، موحد اور اہل لوگ تھے اور ان امور پر عمل کرتے رہنے کی بنا پر ہی، خدا نے انہیں نئے انعامات سے نوازا ہے۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ "یھدون بامرنا" کا جملہ درحقیقت باطل کے رہبروں اور پیشواؤں کے مقابلہ میں، حقیقی آئمہ اور پیشواؤں کی شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ باطل کے پیشواؤں کے کام کی بنیاد تو شیطانی ہوا و ہوس پر ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا : قرآن میں دو قسم کے اماموں کا ذکر ہے، ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ : وجعلنا ھم ائمۃ یھدون بامرنا"

یعنی خدا کے حکم سے، نہ کہ لوگوں کے حکم سے، وہ خدا کے حکم کو اپنے حکم پر مقدم سمجھتے ہیں اور اس کے حکم کو اپنے حکم سے برتر قرار دیتے ہیں۔

لیکن دوسری جگہ فرمایا گیا ہے :

وجعلناھم ائمۃ یدعون الی النار

ہم نے انہیں ایسا امام و پیشوا قرار دے دیا ہے کہ جو دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اپنے حکم کو خدا کے حکم سے مقدم شمار کرتے ہیں اور اپنے حکم کو اس کے حکم سے پہلے قرار دیتے ہیں اور اپنی ہوا و ہوس کے مطابق اور کتاب اللہ کے خلاف عمل کرتے ہیں[2]

اور یہ ہے معیار اور کسوٹی امام حق اور امام باطل میں تمیز کی۔

٭ ٭ ٭

---

[1] لفظ "لنا" کو "عابدین" پر مقدم رکھنا حصر کی دلیل ہے اور ان بزرگوں کے خاص مقام توحید کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ صرف خدا کی عبادت کرتے تھے۔

[2] دوسری آیت جو کہ سورۂ قصص کی آیہ ۴۱ ہے فرعون اور اس کے لشکر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ حدیث تفسیر صافی میں کتاب کافی سے نقل ہوئی ہے۔

۷۴۔ وَلُوطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۙ

۷۵۔ وَاَدْخَلْنٰهُ فِىْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۧ

ترجمہ:

۷۴۔ اور لوطؑ (کو یاد کرو) کہ جسے ہم نے حکم اور علم دیا اور اس شہر سے نجات بخشی کہ جہاں کے لوگ قبیح اور گندے کام کرتے تھے کیونکہ وہ بُرے اور فاسق لوگ تھے۔

۷۵۔ اور ہم نے اس کو اپنی رحمت میں داخل کرلیا، بیشک وہ صالحین میں سے تھا۔

تفسیر

بُروں کے علاقوں سے لوطؑ کی نجات:

حضرت لوطؑ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے قریبی رشتہ داروں اور اُن پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے تھے لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کے واقعے کے بعد، ابلاغِ رسالت کے سلسلہ میں ان کی جدوجہد اور کوششوں کے ایک حصّہ کی طرف اور ان کے لیے پروردگار کے انعامات و احسانات کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے: اور لوطؑ کو یاد کرو کہ جسے ہم نے حکم اور علم دیا (ولوطا اٰتیناہ حکمًا و علمًا)[1]

لفظ "حکم" بعض مقامات پر تو فرمانِ نبوّت و رسالت کے معنی میں آیا ہے اور کچھ دوسرے مقامات پر قضاوت اور فیصلہ کرنے کے معنی میں، جب کہ بعض اوقات عقل و خرد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان معانی میں سے یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اگرچہ ان معانی کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔[2]

"علم" سے مراد ہر قسم کا علم و دانش ہے کہ جس کا انسان کی سعادت اور انجام میں گہرا اثر ہوتا ہے۔

لوطؑ بزرگ انبیاءؑ میں سے ہیں، جو ابراہیمؑ کے ہمعصر تھے اور اُنہوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ سرزمین بابل سے فلسطین کی طرف ہجرت کی تھی اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ سے جُدا ہو کر "سدوم" شہر میں آئے کیونکہ اس علاقے کے لوگ گناہ اور بدکاری میں مبتلا تھے۔ خصوصاً جنسی انحرافات اور آلودگیوں میں غرق تھے۔ انہوں نے اس منحرف قوم کی ہدایت کے لیے بہت کوشش کی اور اس راستے میں خونِ جگر کے گھونٹ پیئے، لیکن ان دل کے اندھوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔

---

[1] لفظ "لوط" کا یہاں منصوب ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ فعل مقدر کا مفعول ہے، یہ فعل ممکن ہے کہ "اٰتینا" ہو یا "اذکر" ہو۔

[2] لفظ "حکم" اور "علم" کی تفسیر اور ان دونوں کے درمیان فرق کے بارے میں ہم جلد ۵ صفحہ ۲۷۴ (اردو ترجمہ) پر بھی بحث کر چکے ہیں۔

انجام کار۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ـــــ خدا کے شدید عذاب نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ان کی آبادیاں بالکل تہ وبالا ہوگئیں اور سوائے لوط کے گھر والوں کے ، ان کی بیوی کے علاوہ سب کے سب نابود ہوگئے۔ جیسا کہ اس کی پوری تفصیل ہم سورہ ھود کی آیت ۷۷ کے بعد بیان کرچکے ہیں[1]

لہٰذا زیر بحث آیت کے آخر میں اس کرم فرمائی کی طرف کہ جو اس نے لوطؑ پر کی تھی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ، ہم نے اُسے اس شہر سے کہ جہاں لوگ قبیح کام کرتے تھے رہائی بخشی (ونجیناہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبائث)۔

کیونکہ وہ بُرے لوگ تھے اور وہ فرمانِ حق کی اطاعت سے باہر نکل گئے تھے ، (انھم کانوا قوم سوء فاسقین)۔

اہلِ شہر کی بجائے ، قبیح اور بُرے اعمال کی " قریہ " (شہر اور آبادی) کی طرف نسبت دینا ، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ گناہ اور بدکاری میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے ، کہ گویا ان کی آبادی کے درودیوار سے گناہ اور قبیح و پلید اعمال برس رہے تھے۔

اور " خبائث " کی تعبیر جمع کی صورت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ' لواطت کے انتہائی گندے عمل کے علاوہ ' اور بھی بُرے اور خبیث عمل کیا کرتے تھے کہ جن کی طرف ہم جلد ۵ کے صہ ۳۳۹ (اردو ترجمہ) میں اشارہ کرچکے ہیں۔

اور" قوم سوء " کے بعد " فاسقین " کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو ، کہ وہ خدا کے قوانین کے لحاظ سے بھی فاسق لوگ تھے اور انسانی معیاروں کے لحاظ سے بھی۔ یہاں تک کہ دین و ایمان سے قطع نظر وہ پست ، ' پلید ' آلودہ اور منحرف افراد تھے۔

اس کے بعد حضرت لوطؑ پر کیے گئے آخری انعام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے اُسے اپنی خاص رحمت میں داخل کیا (وادخلناہ فی رحمتنا)۔

کیونکہ وہ صالح اور نیک بندوں میں سے تھا (انہ من الصالحین)۔

خدا کی یہ خاص رحمت بلاوجہ کسی شخص پر نہیں ہوتی ، یہ حضرت لوطؑ کی اہلیت تھی جس نے انہیں اس قسم کی رحمت کا مستحق بنادیا۔ واقعاً اس سے زیادہ مشکل اور کونسا کام ہوگا اور کونسا اصلاحی پروگرام اس سے زیادہ طاقت فرسا ہوگا کہ انسان ایک طویل مدت تک ایسے شہر میں کہ جس میں اس قدر گناہ اور آلودگی ہو ، ٹھہرا رہے اور مسلسل گمراہ اور منحرف لوگوں کو تبلیغ و ہدایت کرتا رہے اور معاملہ یہاں تک پہنچ جائے کہ وہ اس کے مہمانوں تک کے ساتھ بھی مزاحمت کرنے لگیں۔ واقعاً یہ صبر و استقامت خدائی پیغمبروں اور ان کی راہ پر چلنے والوں کے سوا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہم میں سے کون ایسا شخص ہے کہ جو اس قسم کی جانکاہ رُوحانی سختیوں کو برداشت کرسکتا ہو ؟

۷۶۔ وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِن قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۝

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۵ صہ ۳۲۴ کے بعد تک۔

۷۷۔ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

ترجمہ

۷۶۔ اور نوح (کو یاد کرو) جبکہ اس نے (ابراہیم و لوط سے) پہلے اپنے پروردگار کو پکارا، تو ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور اُسے اور اس کے خاندان کو عظیم غم سے نجات دی۔

۷۷۔ اور ہم نے اس کی، اس قوم کے مقابلہ میں کہ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، مدد کی۔ کیونکہ وہ بری قوم تھی لہذا ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

تفسیر

متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں سے نوحؑ کی نجات :

ابراہیمؑ اور لوطؑ کی داستان کے ایک گوشہ کا ذکر کرنے کے بعد، ایک اور عظیم پیغمبر یعنی حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے ایک حصہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے :

اور نوح کو یاد کرو جبکہ اس نے (ابراہیم و لوط سے پہلے) اپنے پروردگار کو پکارا اور بے ایمان منحرف لوگوں کے چنگل سے نجات کے لیے درخواست کی (ونوحا اذ نادیٰ من قبل)۔

حضرت نوحؑ کی یہ ندا ظاہری طور پر ان کی اس نفرین اور بد دعا کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید کی سورہ نوح میں بیان ہوئی ہے، جہاں پر ہے :

رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارًا انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرًا کفارًا

پروردگارا ! اس بے ایمان قوم کے کسی فرد کو باقی نہ رہنے دے کیونکہ اگر یہ باقی رہ گئے تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی آئندہ نسل بھی کافر و فاجر ہی ہوگی۔ (نوح ۲۶-۲۷)

اور یا اس جملہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو سورہ قمر کی آیہ ۱۰ میں ہے :

فدعا ربه انی مغلوب فانتصر

اس نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میں ان کے مقابلہ میں مغلوب ہوں تو میری مدد فرما۔

"نادی" کی تعبیر کہ جو عام طور پر پکارنے کے لیے آتی ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اس بزرگ پیغمبر کو اس قدر پریشان کیا تھا کہ وہ آخرکار چیخ اُٹھا اور واقعاً اگر حضرت نوحؑ کے حالات کا --- کہ جن کا کچھ حصّہ سورہ نوح میں بیان ہوا ہے اور کچھ حصّہ سورہ ھود میں --- اچھی طرح سے مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ فریاد کرنے میں حق بجانب تھے۔[1]

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کی دعا قبول کرلی اور اُسے اور اس کے گھر والوں کو اس عظیم غم سے نجات بخشی:

(فاستجبنا له فنجيناه واهله من الكرب العظيم)۔

درحقیقت لفظ "فاستجبنا" تو ان کی دُعا قبول ہونے کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے اور "فنجیناه واهله من الكرب العظيم" اس کی تشریح و تفصیل شمار ہوتا ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں پر لفظ "اہل" سے کون مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کیونکہ اگر اس سے مراد حضرت نوحؑ کے گھر والے ہی ہوں تو یہ صرف آپ کے بعض بیٹوں کے لیے ہی ہوگا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان کا ایک بیٹا، بُرے لوگوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے اپنی خاندانِ نبوت کی اہلیت کھو بیٹھا تھا۔

ان کی بیوی بھی ان کے مسلک اور طریقہ پر نہیں تھی اور اگر "اہل" سے مراد، ان کے خاص پیروکار اور ان کے صاحب ایمان ساتھی ہوں، تو یہ "اہل" کے مشہور معنی کے برخلاف ہے۔

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پر "اہل" ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں آپ کے مومن عزیز و اقارب بھی شامل ہیں اور خاص اصحاب و انصار بھی۔ کیونکہ ان کے نااہل بیٹے کے بارے میں تو یہ بیان ہوا ہے کہ:

انه ليس من اهلك

وہ تیرے خاندان میں سے نہیں ہے، کیونکہ اس نے مکتب و مذہب تجھ سے جُدا کر لیا ہے۔ (ھود ۴۶)

اس بناء پر وہ لوگ کہ جو حضرت نوحؑ کے ساتھ مکتب و مذہب کا رشتہ رکھتے تھے وہ حقیقت میں آپ کے خاندان سے شمار ہوتے تھے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ لفظ "کرب" لغت میں "اندوہِ شدید" کے معنی میں ہے اور دراصل یہ "کرب" سے لیا گیا ہے کہ جو زمین الٹنے پلٹنے کے معنی میں ہے۔ اندوہِ شدید کیونکہ انسان کے دل کو تہ و بالا کر دیتا ہے اور اس کی "عظیم" کے ساتھ توصیف نوحؑ کے اندوہ کی شدت کی انتہا کو ظاہر کر رہی ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا غم و اندوہ ہوگا کہ صریح آیاتِ قرآنی کے مطابق کہ انہوں نے ۹۵۰ سال دینِ حق کی دعوت دی لیکن مفسرین کے درمیان مشہور قول کے مطابق اس ساری طویل مدت میں صرف اسّی افراد آپ پر ایمان لائے۔[2]

اور باقی لوگوں کا کام، تمسخر کرنے، مذاق اُڑانے، اذیت دینے، اور آزار پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کی، اس قوم کے مقابلہ میں مدد کی کہ جو ہماری آیات کی تکذیب کرتی تھی۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۵، ص ۲۳۴ سے لے کر ۲۸۰ (اردو ترجمہ) تک مراجعہ فرمائیں۔

[2] مجمع البیان، سورہ ھود کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں اور نور الثقلین ج ۲، صفحہ ۳۵۰۔

(ونصرناہ من القوم الذین کذبوا بآیاتنا)[1]

"کیونکہ وہ بُری قوم تھی لہٰذا ہم نے ان سب کو غرق کردیا"، (انھم کانوا قوم سوء فاغرقناھم اجمعین)۔

یہ جملہ ایک بار پھر اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ خدائی عذاب اور سزائیں ہرگز انتقامی پہلو نہیں رکھتیں بلکہ بنیاد یہ ہے کہ حیات اور نعمات زندگی سے استفادہ کرنے کا حق انہی لوگوں کو حاصل ہے کہ جو ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے، اللہ کے راستے پر چل رہے ہوں اور اگر ان سے کسی دن انحرافی راستے میں قدم پڑ بھی جائے، تو وہ اپنی غلطی پر غور کرتے ہوئے واپس لوٹ آئیں لیکن وہ گروہ کہ جو فاسد ہوچکا ہے اور آئندہ بھی ان کی اصلاح کی کوئی اُمید نہیں ہے، تو اُن کا انجام سوائے موت اور نابودی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

ایک نکتہ

اس نکتے کا بیان بھی ضروری ہے کہ ابراہیمؑ اور لوطؑ کی سرگزشت میں بھی ان کی جابر دشمنوں اور مصائب سے نجات کا ذکر ہے، اور اسی طرح "ایوبؑ" اور "یونسؑ" کے قصے میں بھی نوحؑ کی طرح ہی ان کی جابر دشمنوں اور مصیبتوں کے چنگل سے نجات کا ذکر آئے گا۔

گویا پروگرام یہ ہے کہ خدا اس سورۂ انبیاء میں پیغمبروں کی بے دریغ حمایت، اور ان کی مشکلات کے چنگل سے نجات کو بیان کرے تاکہ رسولِ اسلامؐ کے لیے تسلّی اور مومنین کے لیے اُمید کا سبب ہو خصوصاً اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکی ہے اور مسلمان اس وقت شدید پریشانی اور رنج و تکلیف میں تھے، اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی زیادہ واضح اور روشن ہوجاتی ہے۔

۷۸۔ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۙ

۷۹۔ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۖ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝

۸۰۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝

---

[1] عام طور پر "نصر" "علیٰ" کے ذریعہ دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے "اللھم انصرنا علیھم" لیکن یہاں "من" استعمال ہوا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سے مراد ایسی مدد کرنا ہے کہ جو نجات کے ساتھ وابستہ ہو کیونکہ نجات کا مادہ "من" کے ساتھ متعدی ہوجاتا ہے۔

ترجمہ

۷۸۔ اور داؤد و سلیمان (کو یاد کرو) کہ جس وقت وہ ایک کھیت کے بارے میں ـــ کہ جس کو ایک قوم کی بھیڑیں رات کو چر گئی تھیں (اور اسے خراب کر دیا تھا) ـــ فیصلہ کر رہے تھے اور ہم ان کے فیصلے کے گواہ تھے۔

۷۹۔ ہم نے اس کا (صحیح فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا تھا اور ہم نے اُن میں سے ہر ایک کو فیصلہ کی (لیاقت اور) آگاہی دی تھی اور ہم نے داؤد کے لیے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ (خدا کی) تسبیح کرتے تھے اور ہم یہ کام کرنے پر قادر ہیں۔

۸۰۔ اور ہم نے اُسے زرہ بنانے کی تعلیم دی ، تا کہ وہ تمہیں ، تمہاری جنگوں میں محفوظ رکھے۔ کیا (تم خدا کی ان نعمتوں کا) شکر ادا کرتے ہو؟

تفسیر

داؤدؑ اور سلیمانؑ کا فیصلہ :

حضرت موسٰیؑ ، حضرت ہارونؑ ، حضرت ابراہیمؑ ، حضرت لوطؑ ، اور حضرت نوحؑ سے متعلق واقعات کے بیان کے بعد زیر بحث آیات ، داؤد و سلیمان کی زندگی کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ابتدا میں ایک فیصلے کا ذکر ہے کہ جو حضرت داؤدؑ اور سلیمان نے کیا تھا ـــ ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

اور داؤد و سلیمان کو یاد کرو کہ جس وقت وہ ایک کھیت کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے کہ جس کو ایک قوم کی بھیڑیں رات کے وقت چر گئی تھیں (و داؤد و سلیمان اذ یحکمان فی الحرث اذ نفشت فیه غنم القوم[1])۔

اور ہم ان کے فیصلے کے شاہد تھے (وکنا لحکمهم شاهدین)۔

اگرچہ قرآن نے اس فیصلے کا واقعہ کا ملا سربستہ طور پر بیان کیا ہے۔ اور ایک اجمالی اشارہ پر ہی اکتفا کیا ہے ، اور صرف اس کے اخلاقی اور تربیتی نتیجہ پر کہ جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے قناعت کی ہے ، لیکن اسلامی روایات اور مفسرین کے بیانات میں اس سلسلے میں بہت سی بحثیں نظر آتی ہیں۔

کچھ مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ واقعہ اس طرح تھا : کہ بھیڑوں کا ایک ریوڑ رات کے وقت انگوروں کے ایک باغ میں داخل ہو گیا اور انگوروں کی بیلوں اور انگوروں کے گچھوں کو کھا گیا اور انہیں خراب اور ضائع کر دیا۔ باغ کا مالک حضرت داؤد کے پاس شکایت لے کر پہنچا۔

---

[1] " نفشت " " نفش " (بروزن کفش) کے مادہ سے رات کو پراگندہ ہونے کے معنی میں ہے ، اور چونکہ بھیڑوں کا رات کو پراگندہ ہونا ، اور وہ بھی ایک کھیت میں ، طبعی طور پر اس میں چرنے سے ملا ہوا ہوگا ، لہذا بعض نے اُسے رات کو چرنا کہا ہے ، اور " نفش " (بروزن قفس) ان بھیڑوں کے معنی میں ہے کہ جو رات کو پراگندہ اور منتشر ہو جائیں۔

حضرت داؤدؑ نے حکم دیا کہ اس اتنے بڑے نقصان کے بدلے میں تمام بھیڑیں باغ کے مالک کو دے دی جائیں۔ سلیمانؑ جو اس وقت بچے تھے باپ سے کہتے ہیں کہ: اے خدا کے عظیم پیغمبر! آپ اس حکم کو بدل دیں اور منصفانہ فیصلہ کریں! باپ نے کہا کہ وہ کیسے! آپ جواب میں کہتے ہیں کہ: بھیڑیں تو باغ کے مالک کے سپرد کی جائیں تاکہ وہ ان کے دودھ اور اُون سے فائدہ اٹھائے اور باغ کو بھیڑوں کے مالک کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اس کی اصلاح اور درستی کی کوشش کرے۔ جس وقت باغ پہلی حالت میں لوٹ آئے تو وہ اس کے مالک کے سپرد کر دیا جائے اور بھیڑیں بھی اپنے مالک کے پاس لوٹ جائیں گی (اور خدا نے بعد والی آیت کے مطابق سلیمان کے فیصلہ کی تائید کی)۔

یہ مضمون ایک روایت میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے۔[1]

ممکن ہے یہ تصور ہو کہ یہ تفسیر لفظ "حرث" کے ساتھ جو کہ زراعت کے معنی میں ہے مناسبت نہیں رکھتی لیکن ظاہراً "حرث" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں زراعت بھی شامل ہے اور باغ بھی۔ جیسا کہ باغ والوں کی داستان (اصحاب الجنۃ) سورہ قلم آیہ ۱۷ تا ۳۲ سے معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہاں چند اہم سوال باقی رہ جاتے ہیں:

۱۔ ان دونوں فیصلوں کی بنیاد اور معیار کیا تھا؟

۲۔ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے فیصلے ایک دوسرے سے مختلف کیوں تھے؟ کیا وہ اجتہاد کی بنیاد پر فیصلہ کیا کرتے تھے؟

۳۔ کیا یہ مسئلہ، ایک مشورے کی صورت میں تھا یا دونوں نے ایک دوسرے سے الگ، قطعی اور مستقل حیثیت سے فیصلہ دیا تھا؟

پہلے سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ معیار اور بنیاد خسارے اور نقصان کی تلافی کرنا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے غور کیا اور دیکھا کہ انگوروں کے باغ میں جو نقصان ہوا ہے، وہ بھیڑوں کی قیمت کے برابر ہے۔ لہٰذا انہوں نے حکم دے دیا کہ اس نقصان کی تلافی کرنے کے لیے بھیڑیں باغ کے مالک کو دے دی جائیں کیونکہ قصور بھیڑوں کے مالک کا تھا۔

> اس بات کی طرف توجہ رہے کہ بعض اسلامی روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ رات کے وقت بھیڑوں والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ریوڑ کو دوسروں کے کھیتوں میں داخل ہونے سے روکے اور دن کے وقت حفاظت کی ذمہ داری کھیتی کے مالک کی ہے۔[2]

اور حضرت سلیمانؑ کے حکم کا ضابطہ یہ تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ باغ کے مالک کا نقصان بھیڑوں کے ایک سال کے منافع کے برابر ہے۔ اس بنا پر فیصلہ تو دونوں نے حق و انصاف کے مطابق کیا ہے لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا فیصلہ زیادہ گہرائی پر مبنی تھا، کیونکہ اس کے مطابق خسارہ یکشت پورا نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس طرح خسارہ تدریجی طور پر پورا ہوتا اور یہ فیصلہ بھیڑوں والے پر بھی گراں نہ تھا۔ علاوہ ازیں نقصان اور تلافی کے درمیان ایک تناسب تھا، کیونکہ انگور کی جڑیں ختم نہیں ہوئی تھیں، صرف ان کا وقتی منافع ختم ہوا تھا،

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان میں زیر بحث آیہ کے ذیل میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ: "روی عن النبی انه قضی بحفظ المواشی علی اربابها لیلا وقضی بحفظ الحرث علی اربابها نهاراً" یہی مضمون تفسیر صافی میں بھی کتاب کافی سے منقول ہے۔

لہٰذا زیادہ منصفانہ فیصلہ یہ تھا کہ اصل بھیڑیں باغ کے مالک کو نہ دی جائیں، بلکہ اُسے ان کا منافع دیا جائے۔

دوسرے سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ: بے شک انبیاء کا فیصلہ خدائی وحی کی بنیاد پر ہوتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب بھی کسی فیصلے کا موقع ہو، تو ہر خاص فیصلہ کے وقت خاص وحی نازل ہوتی ہے بلکہ وہ ان عمومی ضابطوں کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں جو انہوں نے وحی سے حاصل کیے ہوتے ہیں۔

اس بنا پر اصطلاحی معنی میں اجتہاد نظری یعنی اجتہاد ظنی کی ـــ ان کے بارے میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے، کہ ایک ضابطہ کلی کو عملی شکل دینے میں دو راستے موجود ہوں اور دو پیغمبروں میں سے ہر ایک ان میں سے کسی ایک راستے کو اختیار کرے جبکہ حقیقت میں وہ دونوں کے دونوں صحیح ہوں اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ ہماری اس بحث میں بھی مطلب اسی طرح کا ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے لیکن جیسا کہ قرآن اشارہ کرتا ہے، وہ راہ جو سلیمان نے اختیار کی (وہ اجرائی لحاظ سے) زیادہ مناسب تھی اور " وکلاً اٰتینا حکماً و علماً " (ہم نے ان دونوں میں سے ہر ایک کو حکم و علم دیا تھا) کا جملہ، جو اگلی آیت میں آئے گا دونوں فیصلوں کی درستی پر گواہ ہے۔

تیسرے سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ بعید نہیں ہے کہ یہ بات مشاورت کے طور پر ہی ہو، ایسی مشاورت کہ جو احتمالاً سلیمان کی آزمائش اور امر قضاوت میں ان کی لیاقت کو آزمانے کے لیے صورت پذیر ہوئی ہو، "حکمھما" (ان دونوں کا حکم) کی تعبیر بھی ان کے آخری حکم کے ایک ہونے پر گواہ ہے۔ اگرچہ ابتداء میں دو مختلف تجویزیں ہی تھیں (غور کیجیے گا)۔

ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

لم یحکما انما کانا یتناظران

انہوں نے آخری فیصلہ نہیں دیا تھا وہ تو اس میں اپنی اپنی آراء پیش کر رہے تھے اور مشورہ کر رہے تھے۔[1]

ایک اور روایت سے کہ جو اصول کافی میں امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ماجرا داؤد کے وصی و جانشین کے تقرر کے لیے آزمائش کے طور پر تھا۔[2]

بہر حال بعد والی آیت میں سلیمان کے فیصلے کی اس صورت میں تائید کی گئی ہے: ہم نے یہ فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا تھا" اور ہماری تائید سے اس نے اس جھگڑے کے حل کی بہترین راہ معلوم کر لی (ففھمنٰھا سلیمان)۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت داؤدؑ کا فیصلہ غلط تھا۔ کیونکہ قرآن ساتھ ہی کہتا ہے: ہم نے اُن دونوں میں سے ہر ایک کو آگاہی اور فیصلے کی اہلیت اور علم عطا کیا تھا (وکلاً اٰتینا حکماً و علماً)۔

اس کے بعد ایک اور اعزاز کہ جو خدا نے حضرت داؤدؑ کو دیا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور اسی طرح پرندوں کو بھی (وسخرنا مع داؤد الجبال یسبحن والطیر)۔

---

[1] "من لا یحضرہ الفقیہ"۔

[2] مزید وضاحت کے لیے تفسیر صافی میں زیر بحث آیہ کے ذیل رجوع کریں۔

یہ سب باتیں ہماری قدرت کے سامنے کوئی اہم چیز نہیں ہیں " ہم یہ کام انجام دینے پر قادر تھے (وکنا فاعلین)۔

ایک نکتہ :

اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ پہاڑ اور پرندوں کا داؤد کے ساتھ ہمصدا ہونا کس صورت میں تھا۔ مختلف مفسرین کی بعض آرا ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں :

۱۔ کبھی تو یہ احتمال ظاہر کیا جاتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی آواز بڑی پرکشش تھی کہ جو پہاڑوں میں گونجا کرتی تھی اور پرندوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔

۲۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تسبیح ایک ایسے شعور کی حامل تھی کہ جو ذرات عالم کے باطن میں موجود ہے۔ کیونکہ اس نظریے کے مطابق عالم کے تمام موجودات عقل و شعور رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ جس وقت حضرت داؤد کی مناجات و تسبیح سنتے تھے تو ان کے ساتھ ہمصدا ہو جاتے تھے اور ان کی تسبیح کا غلغلہ بھی ان کی آواز کے ساتھ مل جاتا تھا۔

۳۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہی " تسبیح تکوینی " ہے کہ جو تمام موجوداتِ عالم زبانِ حال سے کرتی ہیں کیونکہ ہر موجود کا ایک نظام ہے ایک ایسا نظام کہ جو بہت ہی دقیق اور حساب شدہ ہے۔ یہ دقیق اور حساب شدہ نظام ایک ایسے خدا کے وجود پر دلالت کرتا ہے کہ جو پاک و منزہ بھی ہے اور صفات کمال کا مالک بھی۔ عالمِ ہستی کے اس حیرت انگیز نظام کی بناء پر ہر گوشہ میں تسبیح اور حمد جاری ہے۔ (تسبیح کا معنی نقائص سے پاک شمار کرنا ہے اور حمد اس کی صفات کمال کی تعریف کرنا ہے[1]۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ تسبیح تکوینی نہ تو پہاڑوں اور پرندوں کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ حضرت داؤدؑ کے ساتھ بلکہ ہمیشہ اور ہر جگہ تمام موجودات اس تسبیح میں مصروف ہیں۔

اس کے جواب میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ٹھیک ہے ! یہ عمومی تسبیح تو ہے، لیکن سب اس کو سنتے تو نہیں ہیں، یہ تو حضرت داؤدؑ کی عظیم روح تھی کہ جو اس حالت میں عالمِ ہستی کے اندر اور باطن کی ہم راز اور ان سے ہم آہنگ ہو جاتی تھی اور وہ اچھی طرح سے محسوس کرتے اور سنتے تھے کہ پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ ہمصدا ہیں اور تسبیح کر رہے ہیں۔

ان تفسیروں میں سے کسی کے لیے بھی ہمارے پاس کوئی قطعی اور دو ٹوک دلیل نہیں ہے۔ آیت کے ظاہر سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤدؑ کے ساتھ ہمصدا ہو جاتے تھے اور خدا کی تسبیح کرتے تھے۔ البتہ ان تینوں تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ان تینوں کو ایک ساتھ بھی لیا جا سکتا ہے۔

◆ ◆ ◆

زیر بحث آخری آیت میں ایک اور نعمت کی طرف کہ خدا نے اس عظیم پیغمبر کو عطا کی تھی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے اسے زرہ بنانے کی تعلیم دی تھی تا کہ تمہاری جنگوں میں تمہاری حفاظت کرے، کیا تم خدا کا اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہو (وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم لتحصنکم من بأسکم فھل انتم شاکرون)۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۶ سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۴۴ کے ذیل میں رجوع کریں۔

"لبوس" جیسا کہ طبرسی مرحوم "مجمع البیان" میں کہتے ہیں، ہر قسم کے دفاعی اور حملوں میں استعمال ہونے والے اسلحہ جیسے زرہ، تلوار اور نیزہ وغیرہ کو کہتے ہیں [1]

لیکن قرآن کی آیت میں جو قرائن ہیں، وہ اس کی نشاندہی کرتے ہیں کہ "لبوس" یہاں پر زرہ کے معنی میں ہے کہ جو جنگوں میں حفاظت کے کام آتی ہے۔

لیکن یہ بات کہ خدا نے حضرت داؤد کے لیے لوہے کو کس طرح سے نرم کیا تھا اور انہیں زرہ سازی کی صنعت کس طرح سکھائی، تو اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ سورہ سبا کی آیہ ۱۰ اور ۱۱ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

۸۱۔ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ○

۸۲۔ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ○

ترجمہ

۸۱۔ اور ہم نے سلیمان کے لیے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا کہ جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف کہ جسے ہم نے بابرکت بنا دیا تھا، چلتی تھی اور ہم ہر چیز سے آگاہ تھے۔

۸۲۔ اور شیاطین کے ایک گروہ کو بھی ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ وہ اس کے لیے (دریاؤں میں) غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی اس کے لیے سرانجام دیتے تھے اور ہم انہیں (بغاوت اور سرکشی کرنے سے) باز رکھتے تھے۔

تفسیر

ہوائیں سلیمان کے زیر فرمان:

ان آیات میں بعض ان نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو خدا نے اپنے ایک اور پیغمبر یعنی سلیمانؑ کو عطا کی تھیں ــــ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تیز اور طوفان خیز ہواؤں کو سلیمان کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھیں کہ جسے ہم نے مبارک

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

قرار دیا تھا: (ولسلیمان الریح عاصفة تجری بامرہ الی الارض التی بارکنا فیھا)۔

اور یہ کوئی عجیب کام نہیں ہے، کیونکہ ہم ہر چیز سے آگاہ تھے اور ہیں (وکنا بکل شیٍء عالمین)۔

ہم عالم ہستی کے اسرار اور اس پر حاکم قوانین اور نظاموں سے بھی آگاہ ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں کس طرح سے زیر فرمان کیا جاسکتا ہے اور اس کام کے نتیجہ اور انجام سے بھی واقف ہیں۔ بہر حال ہر چیز ہمارے علم و قدرت کے سامنے قانع اور تابع فرمان ہے۔

" ولسلیمان ...." کا جملہ " وسخرنا مع داؤد الجبال " کے جملہ پر عطف ہے۔ یعنی ہماری قدرت ایسی ہے کہ ہم کبھی تو پہاڑوں کو اپنے ایک بندے کے لیے مسخر کرتے ہیں تاکہ وہ اس کے ہمراہ تسبیح کریں اور کبھی ہواؤں کو اپنے کسی ایک بندے کے زیر فرمان کر دیتے ہیں تاکہ وہ اسے ہر جگہ پہنچائیں۔

" عاصفہ " کا لفظ تیز ہوا یا طوفان کے معنی میں ہے جبکہ قرآن کی بعض دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائم اور آہستہ آہستہ چلنے والی ہوائیں بھی سلیمانؑ کے حکم کے تابع تھیں، جیساکہ سورہ " صٓ " کی آیہ ۳۶ میں ہے:

فسخرنا له الریح تجری بامرہ رخآءً حیث اصاب

ہم نے ہوا کو اس کے تابع فرمان کر دیا تھا کہ وہ نرمی سے آہستہ آہستہ جہاں وہ چاہتا تھا اُسی طرف کو چلتی تھی۔

البتہ یہاں لفظ " عاصفہ " (تیز و تند ہوا) کا استعمال ممکن ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی اہمیت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ہو یعنی نہ صرف نرم و ملائم ہوائیں ان کے تابع فرمان تھیں بلکہ سخت طوفان اور آندھیاں بھی ان کی اطاعت گزار تھیں، کیونکہ دوسری بات زیادہ عجیب اور تعجب انگیز ہے۔

اور یہ ہوائیں صرف سرزمین مبارک (شام) کی راہ میں ہی ـــ جو کہ سلیمان کا پایۂ تخت تھا ـــ ان کے لیے مسخر نہیں تھیں، بلکہ سورہ صٓ کی آیہ ۳۶ کے مطابق، وہ جس طرف بھی چاہتے تھے وہ اسی طرف چلتی تھیں لہٰذا مبارک سرزمین کے نام کی تصریح زیادہ تر اس بنا پر ہے، کہ وہ حضرت سلیمانؑ کی حکومت کا دارالسلطنت اور پایۂ تخت تھا۔

اَب رہ گئی یہ بات کہ ہوا ان کے اختیار میں کس طرح سے تھی اور کتنی سرعت اور تیزی سے چلتی تھی؟

سلیمان اور ان کے اصحاب کس چیز پر بیٹھ کر آیا جایا کرتے تھے؟

چلتے وقت کونسا عامل انہیں گرنے یا ہوا کے دباؤ اور دوسری مشکلات سے محفوظ رکھتا تھا؟

خلاصہ یہ کہ وہ کونسی پُراسرار قدرت اور طاقت تھی کہ جس نے اس زمانے میں ان کے لیے ایسے تیز رفتار سفر کو ممکن بنا دیا تھا؟[1]

یہ ایسے مسائل ہیں کہ جن کی تفصیلات ہمیں معلوم نہیں۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ ایک عنایت الٰہی اور بخشش خداوندی اور غیر معمولی بات اور معجزہ تھی کہ اس عظیم پیغمبر کے اختیار میں دی گئی تھی اور ہم اُس کی تفصیلات سے آگاہ نہیں ہیں اور کتنے ہی ایسے بہت سے مسائل ہیں کہ جن کو ہم اجمالی طور پر تو جانتے ہیں لیکن ان کی تفصیل نہیں جانتے ہماری معلومات

---

[1] سورۂ سبا کی آیہ ۱۲ " ولسلیمان الریح غدوھا شھر ورواحھا شھر " سے اجمالی طور پر اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صبح کے وقت ایک ماہ کی اور عصر کے وقت ایک ماہ کی مسافت طے کیا کرتے تھے (اُس زمانے کی رفتار کے لحاظ سے)۔

ان باتوں کے مقابلہ میں کہ جو ہمیں معلوم نہیں ہیں، ایک بہت بڑے سمندر کے مقابلے میں ایک قطرہ کی سی ہیں یا ایک عظیم پہاڑ کے مقابلہ میں غبار کے ایک ذرّے کی مانند ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ایک خدا پرست اور موحد انسان کی بصیرت کے لحاظ سے کوئی چیز خدا کی قدرت کے سامنے مشکل اور غیر ممکن نہیں ہے وہ ہر چیز پر قادر اور ہر چیز کا عالم ہے۔

البتہ حضرت سلیمانؑ کی زندگی کے دوسرے حیرت انگیز حصّوں کی مانند ان کی زندگی کے اس حصّے کے بارے میں بھی بہت سے جھوٹے یا مشکوک افسانے لکھے گئے ہیں کہ جو ہمارے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہیں۔ ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ جو قرآن نے یہاں پر بیان کیا ہے۔

اِس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ دورِ حاضر کے مصنفین میں سے بعض کا نظریہ ہے کہ قرآن نے حضرت سلیمانؑ اور ان کی بساط کے ہوا کے ذریعے چلنے کے بارے میں کوئی بات صریحی طور پر بیان نہیں کی ہے بلکہ صرف ہوا کو سلیمانؑ کے لیے مسخر کر دینے کی بات کی ہے اور ممکن ہے کہ یہ زراعت سے مربوط مسائل، نباتات میں زرپاشی و تلقیح، گندم وغیرہ کے خرمنوں کو صاف کرنے اور کشتیوں کے چلانے کے لیے ہوا کی طاقت سے استفادہ کرنے کی طرف اشارہ ہو۔ خاص طور سے جبکہ حضرت سلیمانؑ کی سرزمین (شام) ایک طرف سے تو وہ زرعی زمین تھی اور دوسری طرف سے اس کا ایک اہم حصّہ بحیرۂ روم کے ساحل سے ملتا تھا اور جہازرانی کے لیے کام آسکتا تھا۔[1]

لیکن یہ تفسیر، سورہ "سبا" اور سورہ "صٓ" کی آیات اور بعض روایات کے ساتھ، کہ جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں، چنداں مطابقت نہیں رکھتی۔

* * *

بعد والی آیت حضرت سلیمانؑ کے لیے ایک اور خاص عنایت کو بیان کرتی ہے: ہم نے بعض شیاطین کو اس کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ جو اُس کے لیے سمندر میں غوطے لگاتے تھے (اور جواہرات اور قیمتی چیزیں باہر نکال کر لاتے تھے) اور اس کے لیے ان کے علاوہ اور خدمت بھی انجام دیتے تھے: (ومن الشیاطین من یغوصون له و یعملون عملاً دون ذٰلك)۔

اور ہم انہیں اس کے فرمان سے سرکشی سے روکے رکھتے تھے (وکنا لهم حافظین)۔

اُوپر والی آیت میں جو کچھ "شیاطین" کے حوالے سے بیان ہوا ہے، سورہ سبا کی آیات میں اسے "جن" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے (سبا۔ ۱۲، ۱۳) سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں "تعبیریں" ایک دوسرے کے کوئی منافی نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ "شیاطین" بھی جنوں کے ہی قبیلے سے ہوتے ہیں۔

بہرحال جیسے کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں جن مخلوقات کی ایک ایسی نوع ہے کہ جو عقل و شعور، استعداد اور جوابدہی رکھتی ہے۔ یہ مخلوق ہم انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور اسی وجہ "جن" کے نام سے موسوم ہے اور جیسا کہ سورہ جن کی آیات سے معلوم ہوتا ہے ان کے بھی انسانوں کی طرح دو گروہ ہیں:

۱۔ صالح مومن ۲۔ سرکش کافر۔ اور ہمارے پاس ایسی موجودات کی نفی پر کوئی دلیل نہیں ہے اور چونکہ مخبرِ صادق (قرآن) نے ان کی خبر دی ہے لہٰذا ہم انہیں قبول کرتے ہیں۔

سورہ صٓ اور سورہ سبا کی آیات اور اسی طرح زیرِ بحث آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جنات کا یہ گروہ کہ جو حضرت سلیمانؑ

---

[1] قصص قرآن، ص ۱۸۵۔ اعلام قرآن، ص ۳۸۶۔

کے لیے مسخر تھا سمجھدار، فعال اور ہنرمند افراد پر مشتمل تھا۔

اور "یعملون عملاً دون ذٰلك" (اور اس کے علاوہ ان کے لیے اور کام بھی انجام دیتے تھے) جس چیز کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل سورہ سبا آیت ۱۳ میں آئی ہے۔

یعملون له مایشاء من محاریب و تماثیل وجفان کالجواب و قدور راسیات

سورہ سبا کی یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اس کے لیے "محرابیں" بہت اعلیٰ اور خوبصورت عبادت گاہیں اور ضروریات زندگی کی مختلف چیزیں بشمول دیگیں، بڑی بڑی سینیاں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بنایا کرتے تھے۔

حضرت سلیمانؑ کے متعلق بعض دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین کا ایک سرکش گروہ بھی موجود تھا، کہ جنہیں حضرت سلیمانؑ نے قید کر رکھا تھا:

واٰخرین مقرنین فی الاصفاد[1]

اور شاید: "وکنا لھم حافظین" کا جملہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو کہ ہم نے سلیمان کے اس خدمت گار گروہ کو سرکشی سے روک رکھا تھا۔

آپ اس سلسلے میں مزید تفصیل انشاء اللہ سورہ سبا اور سورہ ص کی تفسیر میں پڑھیں گے۔

ہم پھر یاد دہانی کراتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کی زندگی اور ان کے لشکر کے بارے میں بہت سے جھوٹے یا مشکوک افسانے گھڑے ہوئے ہیں کہ جنہیں ہرگز قرآن کے متن کے ساتھ مخلوط نہیں کرنا چاہیئے تاکہ وہ بہانہ سازوں کے لیے دستاویز نہ بن جائیں۔

* * *

۸۳۔ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

۸۴۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۳۔ اور ایوب (کو یاد کرو) جب کہ اس نے اپنے پروردگار کو پکارا (اور عرض کی) بدحالی اور مشکلات نے میری طرف رُخ کر لیا ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔

۸۴۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جن آلام میں وہ مبتلا تھے انہیں ہم نے برطرف کر دیا (یعنی ان کی بیماری دُور کی اور تندرست کر دیا)

[1] اور دوسروں کو زنجیروں میں جکڑ کے رکھا گیا تھا۔ (ص ۳۸)

اور اس کے گھر والے اسے پلٹا دیئے اور ان ہی جیسے اسے مزید عطا کیے، اپنی رحمت خاص کے طور پر تاکہ یہ عبادت گزاروں کے لیے ایک سبق بن جائے۔

تفسیر

حضرت ایوبؑ کی مشکلات سے نجات :

یہ آیات، خدا کے ایک اور عظیم پیغمبر اور ان کی سبق آموز سرگزشت کے بارے میں ہیں اور وہ "ایوبؑ" ہیں۔ آپؑ وہ دسویں پیغمبر ہیں کہ جن کی زندگی کے ایک گوشہ کی طرف سورہ انبیا میں اشارہ ہوا ہے۔

حضرت ایوبؑ کی داستان دردناک بھی ہے اور باوقار بھی، ان کا صبر و ضبط خصوصاً ناگوار حادثات میں عجیب و غریب تھا، اس طرح سے کہ "صبر ایوبؑ" ایک ضرب المثل بن گیا۔

لیکن زیر بحث آیات میں، خاص طور سے مشکلات سے ان کی نجات اور کامیابی کا ذکر ہے اور کھوئی ہوئی نعمتیں دوبارہ حاصل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تاکہ یہ ہر زمانے میں، تمام مومنین کے لیے کہ جو مشکلات میں گھر جاتے ہیں ایک سبق بن جائے خصوصاً مکہ کے مومنین کے لیے ایک سبق تھا کہ جو ان آیات کے نزول کے وقت دشمن کے تنگ گھیرے میں تھے۔

فرمایا گیا ہے : ایوب کو یاد کرو کہ جس وقت اس نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کیا کہ دکھ، درد اور بیماری نے میری طرف رخ کر لیا ہے اور تو ارحم الراحمین ہے (وایوب اذ نادی ربہ انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین)۔

"ضُر" (بروزن "حُر") ہر قسم کی بیماری اور پریشانی کو کہتے ہیں کہ جو انسان کی روح اور جسم کو عارض ہو اور اسی طرح سے یہ لفظ کسی عضو کا نقص، مال کا تلف ہو جانا، عزیزوں کی موت، حیثیت و مقام کی پامالی اور اسی طرح کی دوسری باتوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم بعد میں بتائیں گے کہ ایوبؑ ان میں سے بہت سی تکالیف اور پریشانیوں میں مبتلا ہوئے تھے۔

ایوب نے بھی دوسرے تمام انبیا کی طرح ان طاقت فرسا مشکلات کے دُور ہونے کے لیے دعا کرتے وقت بارگاہ الٰہی میں انتہائی ادب کو ملحوظ رکھا۔ یہاں تک کہ زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکالی کہ جس سے شکایت کی بُو آتی ہو۔ صرف اتنا کہا : میں کچھ مشکلات میں گرفتار ہو گیا ہوں اور تو ارحم الراحمین ہے، یہاں تک کہ یہ بھی نہیں کہا کہ میری مشکل کو دُور کر دے کیونکہ جانتے ہیں کہ وہ بزرگ و برتر ہے اور بزرگی کے تقاضوں کو جانتا ہے۔

اگلی آیت کہتی ہے : ایوب کی اس دُعا کے بعد ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور اس کے رنج، دُکھ اور پریشانی کو برطرف کر دیا : (فاستجبنا لہ فکشفنا ما بہ من ضر)۔

اور اس کے خاندان والے اسے پلٹا دیئے اور ان کے ساتھ ان ہی جیسے مزید بھی عطا کیے (و آتیناہ اھلہ ومثلھم معھم)۔ تاکہ یہ ہماری طرف سے ان کے لیے رحمتِ خاص ہو اور یہ خدا کی عبادت کرنے والوں کے لیے بھی ایک سبق ہو (رحمۃ من عندنا وذکری للعابدین)۔

تاکہ مسلمان یہ جان لیں کہ مشکلات چاہے جتنی بھی ہوں اور مصیبتیں چاہے جس قدر ہوں، دشمن بھی چاہے جتنے بھی پھیلے ہوئے ہوں اور وہ (دشمن) چاہے جتنی بھی طاقت و قدرت رکھتے ہوں، پھر بھی پروردگار کے تھوڑے سے لطف و کرم سے یہ سب کچھ برطرف ہونے والی چیزیں ہیں، نہ صرف نقصانات کی تلافی ہو جاتی ہے، بلکہ بعض اوقات خدا با استقامت صبر کرنے والوں کی جزا کے عنوان سے، جو کچھ ان کے ہاتھ سے گیا ہوا ہوتا ہے، اتنا ہی اور مزید اس پر اضافہ کر دیتا ہے اور یہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک درس ہے۔ خصوصاً ان مسلمانوں کے لیے جو ان آیات کے نزول کے وقت دشمن کے سخت دباؤ اور بہت زیادہ مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔

چند نکات :

۱۔ حضرت ایوبؑ کی مختصر داستان } ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے: کسی شخص نے آپ سے پوچھا، کہ جو مصیبت ایوبؑ کو دامنگیر ہوئی تھی وہ کس لیے تھی؟

امام صادق علیہ السلام نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے:

ایوبؑ پر جو مصیبت آئی اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھوں نے کوئی کفرانِ نعمت کیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس شکرِ نعمت کی وجہ سے تھی، کیونکہ ابلیس نے اُن پر حسد کیا اور بارگاہِ خدا میں عرض کی کہ اگر وہ تیری نعمتوں کا اتنا شکر ادا کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے اسے بڑی خوشحال زندگی دی ہے اگر تو اس سے دنیا کی مادی نعمات کو چھین لے تو پھر وہ ہرگز تیرا شکر ادا نہیں کرے گا تُو مجھے اس کی دنیا پر مسلط کر دے تو پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ درست ہے۔

خدا نے اس مقصد سے، کہ یہ قصہ راہِ حق کے تمام راہیوں کے لیے ایک سند بن جائے، شیطان کو اس بات کی اجازت دے دی وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا اور ایوب کے مال و اولاد کو یکے بعد دیگرے ختم کرتا چلا گیا، لیکن ان دردناک حادثات نے نہ صرف یہ کہ شکرِ ایوب میں کوئی کمی نہ کی، بلکہ ان کا شکر اور بھی بڑھتا گیا۔ شیطان نے خدا سے درخواست کی کہ اسے انکی زراعت اور بھیڑوں پر مسلط کر دے۔ یہ اجازت بھی اُسے دے دی گئی اور اُس نے ساری زراعت کو آگ لگا دی اور ساری بھیڑوں کو ہلاک کر دیا۔ پھر بھی ایوب کی طرف سے حمدِ پروردگار اور شکر میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

آخر شیطان نے خدا سے یہ درخواست کی کہ وہ ایوب کے بدن پر مسلط ہو جائے اور ان کیلئے شدید بیماری کا سبب بنے اور ایسا بھی ہو گیا۔ اس طرح سے کہ وہ شدتِ بیماری اور زخموں کی وجہ سے چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے بھی مجبور ہو گئے۔

البتہ ان کی عقل و شعور میں کسی قسم کا کوئی خلل پیدا نہ ہوا

خلاصہ یہ کہ تمام نعمتیں یکے بعد دیگرے ایوب سے لی جا رہی تھیں لیکن ان کا شکر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ راہب انہیں دیکھنے کے لیے آئے اور انھوں نے پوچھا:

ہمیں بتا تو سہی! کہ تُو نے کونسا بڑا گناہ کیا ہے کہ ایسی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے؟

(اور اس طرح سے ہر کہ و مہ کی شماتت کا آغاز ہو گیا اور یہ امر ایوب پر گراں گزرا) ایوب نے جواب دیا: مجھے اپنے پروردگار کی عزت کی قسم ہے کہ میں نے کسی غذا کا کوئی ایک لقمہ بھی اس وقت تک نہیں کھایا، جب تک کہ کوئی یتیم و ضعیف میرے دستر خوان پر نہ بیٹھا ہو اور خدا کی کوئی اطاعت سامنے نہیں آئی، مگر یہ کہ میں نے اس میں سے سخت ترین کو اختیار کیا۔

یہ وہ موقع تھا جب ایوب تمام امتحانات سے صبر و شکر کے ساتھ عہدہ برآ ہو چکے تھے، تو زبان مناجات اور دُعا کے لیے کھولی اور خدا سے اپنی مشکلات کا حل انتہائی مؤدبانہ طریقے سے چاہا۔ لہجہ ہر قسم کی شکایت سے خالی تھا۔ وہی دُعا جو مذکورہ بالا آیات میں ابھی گزری ہے

"رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین"

اس موقع پر خدا کی رحمت کے دروازے کھل گئے، مشکلات بڑی تیزی کے ساتھ برطرف ہو گئیں اور نعماتِ الٰہی نے اُن سے بھی کہیں زیادہ کہ جو پہلے ان کے پاس تھیں ان کی طرف رُخ کیا۔[1]

ہاں ہاں! جو مردانِ حق ہوتے ہیں نعمتوں کے دگرگوں ہونے سے ان کے افکار اور طرزِ عمل نہیں بدلتے۔ وہ راحت و آرام میں ہوں یا مصیبت میں آزاد ہوں یا قید میں صحیح سلامت ہوں یا بیمار، طاقت و قدرت کی حالت میں ہوں یا ضعف و کمزوری میں خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں پروردگار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور زندگی کے تغیرات اور انقلابات ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ ان کی رُوح ایک عظیم سمندر کی مانند ہے کہ جس کے آرام و سکون کو کسی قسم کے طوفان درہم برہم نہیں کر سکتے۔

اسی طرح وہ ہرگز تلخ حوادث کی کثرت سے مایوس نہیں ہوتے، وہ ڈٹ جاتے ہیں اور استقامت دکھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خدا کی رحمت کے دروازے کھل جائیں وہ جانتے ہیں کہ سخت حوادث خدائی آزمائشیں ہیں کہ جن کے ذریعے وہ کبھی کبھی اپنے خاص بندوں کو آزماتا ہے تاکہ انہیں اور زیادہ جلا بخشے۔

۲۔ "اٰتیناہ اھلہ ومثلھم معھم" کی تفسیر: مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ خدا نے ان کے بیٹوں کو پھر سے زندگی عطا کر دی تھی اور ان کے علاوہ اور بیٹے بھی انہیں دیئے تھے (بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ خدا نے اُن بیٹوں کو بھی کہ جو اس واقعے میں مر گئے تھے انھیں مرحمت فرمایا اور ان بیٹوں کو بھی زندہ کر دیا جو اس واقعے سے پہلے مر چکے تھے۔[2]

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ خدا نے حضرت ایوبؑ کو نئے بیٹے اور پوتے عنایت کیے کہ جنہوں نے مر جانے والوں کی خالی جگہ کو پُر کر دیا۔

---

[1] تفسیر المیزان، بحوالہ تفسیر قمی۔

[2] نور الثقلین، ج ۳ ص ۴۴۹۔

بعض غیر معتبر روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ایوبؑ کے بدن میں شدید بیماری کے زیر اثر اس طرح بدبو پیدا ہوگئی تھی کہ لوگ ان کے قریب نہیں آسکتے تھے لیکن اہل بیتؑ کی طرف سے بیان کی گئی روایات میں اس بات کی نفی کی گئی ہے اور دلیل عقلی بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اگر پیغمبر میں کوئی نفرت انگیز حالت یا صفت ہوگی، تو یہ بات اس کی رسالت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوسکتی۔ پیغمبر کو تو ایسا ہونا چاہیئے کہ تمام لوگ اس سے میل ملاپ رکھ سکیں اور کلماتِ حق کو اس سے سُن سکیں۔ پیغمبر میں ہمیشہ قوت جذب و کشش ہوتی ہے۔

حضرت ایوبؑ کی داستان کی تفصیل انشاء اللہ سورہ صٓ کی آیہ ۴۱ تا ۴۴ میں بیان ہوگی۔

٭ ٭ ٭

۸۵۔ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِدۡرِيۡسَ وَذَا الۡـكِفۡلِ‌ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيۡنَ ۖ

۸۶۔ وَاَدۡخَلۡنٰهُمۡ فِىۡ رَحۡمَتِنَا‌ؕ اِنَّهُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ‏

ترجمہ

۸۵۔ اور اسمٰعیل، ادریس اور ذا الکفل (کو یاد کرو) کہ وہ سب صابرین میں سے تھے۔

۸۶۔ اور ہم نے انہیں رحمت میں داخل کیا، کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے۔

تفسیر

اسماعیلؑ ادریسؑ اور ذا الکفلؑ:

ایوب کی سبق آموز سرگزشت اور طوفانِ حوادث کے مقابلہ میں ان کے صبر و ضبط کو بیان کرنے کے بعد، زیر بحث آیات میں خدا کے تین دوسرے پیغمبروں کے مقامِ صبر و شکیبائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اسمٰعیل ادریس اور ذاالکفل کو یاد کرو، وہ سب کے سب صابرین میں سے تھے۔ (واسمٰعیل و ادریس و ذاالکفل کل من الصابرین)۔

ان میں سے ہر ایک نے دشمنوں کے مقابلہ میں یا زندگی کی طاقت فرسا مشکلات کے سامنے صبر و استقامت دکھائی ہے اور انہوں نے ان حوادث کے سامنے ہرگز گھٹنے نہیں ٹیکے۔ اُن میں سے ہر ایک استقامت اور پامردی کا ایک نمونہ تھا۔

اس کے بعد اس صبر و استقامت پر ان کے لیے خدا کے عظیم انعام کا ذکر ہے: ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے۔ (وادخلناھم فی رحمتنا انھم من الصالحین)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں کہا کہ ہم نے انہیں اپنی رحمت عطا کی بلکہ یہ ہے کہ ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کیا۔ گویا

وہ اپنے پورے جسم و جان کے ساتھ رحمتِ الٰہی میں غوطہ زن ہوتے، جیسے کہ وہ پہلے مشکلات کے دریا میں غرق تھے۔

ادریسؑ اور ذا الکفلؑ :

ادریسؑ خدا کے بزرگ پیغمبر تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ بہت سے مفسرین کے مطابق وہ حضرت نوحؑ کے والد کے دادا تھے۔ ان کا نام تورات میں اخنوخ اور عربی میں " ادریس " ہے کہ جسے بعض " درس " کے مادہ سے ماخوذ سمجھتے ہیں کیونکہ وہ پہلے شخص تھے کہ جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ وہ مقام نبوت کے علاوہ علمِ نجوم اور علمِ ہیئت پر بھی دسترس رکھتے تھے اور کہتے ہیں کہ وہ پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے لباس سینے کا طریقہ انسانوں کو سکھایا تھا۔

باقی رہے ذوالکفل، تو مشہور یہ ہے کہ وہ انبیاء میں سے تھے[1] اگرچہ بعض کا نظریہ، یہ ہے کہ وہ ایک صالح اور نیک انسان تھے۔ قرآن کی آیات کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ نبی تھے کیونکہ انہیں بزرگ انبیاء کے ساتھ شمار کیا گیا ہے اور زیادہ تر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے تھے۔[2]

اس نام کے ساتھ ان کو موسوم کرنے کی علت کے بارے میں متعدد احتمالات پیش کیے گئے ہیں البتہ اس بات کی طرف توجہ رہے کہ " کفل " (بروزن فکر) حصہ کے معنی میں بھی ہے اور کفالت کے معنی میں بھی آیا ہے ـــــ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے بکثرت عبادات کیں اور اعمال انجام دیئے اس پر اللہ نے اپنی رحمت اور ثواب کا وافر حصہ، انہیں مرحمت فرمایا تھا لہٰذا وہ ذوالکفل کے نام سے موسوم ہوئے (یعنی وافر حصہ والے)

بعض نے کہا ہے کہ چونکہ انہوں نے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ وہ راتیں عبادت میں کھڑے ہو کر گزاریں گے اور دن میں روزہ رکھا کریں گے اور فیصلہ کرتے وقت ہرگز غصے میں نہ آئیں گے اور انہوں نے آخر تک اپنے اس عہد کو پورا کیا لہٰذا ذوالکفل نام ہو گیا۔

بعض یہ نظریہ بھی رکھتے ہیں کہ ذوالکفل حضرت الیاسؑ کا لقب ہے، جیسا کہ اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا لقب ہے، مسیح حضرت عیسیٰؑ کا لقب ہے اور ذاالنون حضرت یونسؑ کا لقب ہے۔[3]

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فی ظلال، جلد ۵ ص۵۵۶۔

[3] تفسیر فخر رازی زیر بحث آیہ کے ذیل میں اور تاریخ کامل میں بھی یہی لکھا ہے کہ ذوالکفل حضرت ایوبؑ کے ایک بیٹے تھے اور ان کا اصل نام "بشر" تھا اور وہ شام میں رہتے تھے۔ کامل ابن اثیر ج ۱ ص ۱۳۶۔

۸۷۔ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ

۸۸۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۷۔ اور ذوالنون (یونس کو بھی یاد کرو) کہ جب وہ غصے میں آکر (اپنی قوم کے درمیان سے) چلا گیا اور اس کا خیال تھا کہ ہم اس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔ (لیکن جب وہ مگرمچھ کے منہ میں چلا گیا) تو وہ اِس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پکارا: خداوندا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو پاک و منزہ ہے، میں ہی قصوروار تھا۔

۸۸۔ ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور اسے رنج سے نجات بخشی اور ہم مومنین کو اسی طرح سے نجات عطا کرتے ہیں۔

تفسیر

یونس کی وحشتناک زنداں سے رہائی:

یہ دونوں آیات عظیم پیغمبر یونسؑ کی سرگزشت کا ایک حصہ بیان کر رہی ہیں، پہلے فرمایا گیا ہے "ذاالنون" کو یاد کرو جبکہ وہ اپنی بُت پرست اور نافرمان قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے (وذاالنون اذ ذھب مغاضبا)۔

"نون" لغت میں بہت بڑی مچھلی یا مگرمچھ یا ایک بہت بڑے دریائی جانور کے معنی میں ہے، اس بنا پر "ذوالنون" کا معنی ہے مچھلی والا (یا مگرمچھ والا)۔ حضرت یونسؑ کو "ذوالنون" کیوں کہا گیا ہے اس سلسلے میں ایک واقعہ ہے جس کی تفصیل ہم انشاء اللہ بیان کریں گے۔

بہر حال اس نے یہ گمان کر لیا تھا کہ ہم اُس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے: (فظن ان لن نقدر علیہ)[1]

ان کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے اپنی نافرمان قوم میں اپنی رسالت کا کام پوری طرح انجام دے دیا ہے اور اس بارے میں انہوں نے کوئی ترک اولیٰ تک بھی نہیں کیا۔ اور اب جبکہ قوم کو اس کی حالت پر چھوڑ کر جا رہے ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ حالانکہ بہتر یہ تھا

---

[1] "نقدر" "قدر" کے مادہ سے سخت گیری اور تنگی دینے کے معنی میں ہے چونکہ انسان سخت گیری کرتے وقت ہر چیز کو "قدر" کے ساتھ محدود سمجھتا ہے نہ کہ کھلا ہوا اور بے حساب۔

کر وہ ان لوگوں میں رہتے ــــ اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے اور خونِ جگر پیتے۔ اس اُمید پر کہ شاید وہ بیدار ہو جائیں اور خدا کی طرف رجوع کرلیں۔

آخر کار اسی ترکِ اَولیٰ کی وجہ سے انہیں سختی کا منہ دیکھنا پڑا، ایک بہت بڑے مگرمچھ نے انہیں نگل لیا" اور انہوں نے گھٹاٹوپ اندھیروں میں پکارا: خداوندا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے" (فنادیٰ فی الظلمات ان لا الٰہ الا انت)۔

"خداوندا! تو پاک اور منزہ ہے، میں ہی ستمگاروں میں سے تھا" (سبحانک انی کنت من الظالمین)۔

میں نے خود اپنے اُوپر بھی ظلم کیا ہے اور اپنی قوم کے اُوپر بھی۔ مجھے چاہیئے تھا کہ میں اِس سے بھی زیادہ شدائد اور سختیوں کو برداشت کرتا اور تمام مصیبتوں کو جھیلتا، شائد وہ راہِ راست پر آجاتے۔ بالآخر ہم نے اس کی دعا قبول کرلی اور غم سے اُسے رہائی بخشی (فاستجبنا له ونجیناه من الغم)۔ اس طرح ہم مومنین کو نجات دیں گے (وکذالك ننجی المؤمنین)۔

ہاں! ہاں! ــ ہم مومنین میں سے جو بھی بارگاہ خداوندی میں اپنی کوتاہی اور تقصیر پر توبہ کرے گا اور اس کی ذاتِ پاک سے مدد اور رحمت طلب کرے گا تو ہم اس کی دعا قبول کرکے اس کے غم و اندوہ برطرف کردیں گے۔

❖ ❖ ❖

چند اہم نکات:

۱۔ یونسؑ کی سرگزشت: انشاءاللہ تفصیل کے ساتھ تو حضرت یونسؑ کی سرگزشت سورۂ صافات میں آئے گی لیکن اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

وہ سالہا سال تک اپنی قوم کے درمیان (عراق کی سرزمین نینوا میں) دعوت و تبلیغ میں مشغول رہے۔ لیکن انہوں نے جتنی کوشش کی، ان کے ارشادات اور ہدایت کا ان کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تو آپ نے اُن سے خفا ہو کر اُس جگہ کو چھوڑ دیا اور دریا کی طرف چلے گئے۔ وہاں کشتی پر سوار ہوگئے۔ راستے میں دریا میں طوفان آگیا۔ اور سب اہلِ کشتی کے غرق ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔

کشتی کے ملاح نے کہا، میرا خیال یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھاگا ہوا غلام موجود ہے کہ جسے دریا میں پھینک دینا چاہیئے۔ (یا اُس نے یہ کہا کہ کشتی زیادہ بوجھل ہے لہٰذا ہم ایک شخص کو قرعہ کے ذریعے دریا میں پھینک دیں) بہرحال انہوں نے چند بار قرعہ ڈالا اور ہر دفعہ حضرت یونسؑ کا نام نکلا۔ یونسؑ سمجھ گئے کہ اس کام میں کوئی راز پوشیدہ ہے اور خود کو حوادث کے سپرد کردیا۔

جس وقت انہیں دریا میں پھینکا گیا تو ایک مگرمچھ نے نگل لیا لیکن خدا نے انہیں معجزانہ طور پر زندہ رکھا۔

آخر کار وہ متوجہ ہوئے کہ ان سے ترکِ اولیٰ ہوگیا ہے۔ لہٰذا بارگاہ خدا کا رُخ کیا اور اپنی تقصیر اور کوتاہی کا اعتراف کیا۔ خدا نے بھی ان کی دُعا کو قبول کرلیا اور اس تنگ و تاریک جگہ سے انہیں نجات دی[۱]

ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ یہ واقعہ سائنسی لحاظ سے ممکن نہیں ہے لیکن بلاشک و شبہ یہ ایک خلافِ معمول واقعہ ہے نہ کہ

---

[۱] تفسیر فخر رازی، مجمع البیان اور نور الثقلین زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

ایک محال عقلی۔ جیسا کہ مُردوں کا زندہ ہو جانا کہ جو نہ صرف خلافِ معمول ہے لیکن محال نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں عام اور مروجہ طریقے سے اس کا انجام پانا ممکن نہیں ہے لیکن پروردگار کی بے پایاں اور لامحدود قدرت کی مدد سے کوئی مشکل نہیں رہتی۔

اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ آپ سورہ صافات کی تفسیر میں پڑھیں گے۔

۲۔ **یہاں ظلمات کے کیا معنی ہیں؟** ممکن ہے کہ یہ تعبیر دریا اور پانی کی گہرائیوں کی تاریکی اور اس بہت بڑی مچھلی کے پیٹ کی تاریکی اور رات کی تاریکی، کی طرف اشارہ ہو اور ایک روایت کہ جو امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے[1]۔

۳۔ **یونسؑ نے کونسا ترکِ اولیٰ کیا تھا؟** بلاشک وشبہ "مغاضبا" کی تعبیر یونس کے بے ایمان قوم پر ناراض ہونے کی طرف اشارہ ہے اور اس قسم کا غصہ اور ناراضی ___ ایسے حالات میں، کہ ایک غمگسار و دلسوز پیغمبر سالہا سال تک گمراہ قوم کو ہدایت کرنے کے لیے مشقت اُٹھاتا رہے لیکن وہ اس کی ہمدردانہ اور خیرخواہانہ دعوت کا ہرگز مثبت جواب نہ دیں ___ کاملاً طبعی اور فطری بات ہے۔

دوسری طرف چونکہ حضرت یونسؑ جانتے تھے کہ عنقریب عذابِ الٰہی انہیں آلے گا۔ اس لیے اس شہر کو چھوڑ دینا کوئی گناہ نہیں تھا لیکن یونسؑ جیسے عظیم پیغمبر کے لیے بہتر یہ تھا کہ پھر بھی آخری لمحے تک ___ وہ لمحہ کہ جس کے بعد عذابِ الٰہی نازل ہو جائے گا ___ انہیں نہ چھوڑتے اسی بناء پر حضرت یونسؑ کا نسبتاً عاجلانہ فیصلہ ترکِ اولیٰ شمار ہوا اور خدا کی طرف سے اس پر مواخذہ کیا گیا۔

یہ وہی چیز ہے کہ جس کی طرف ہم نے داستانِ آدمؑ میں بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ مطلق گناہ نہیں ہے، بلکہ نسبتی گناہ ہے یا دوسرے لفظوں میں "حسنات الابرار سیئات المقربین" کے مصداق ہے۔

مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۳ صفحہ ۹۷ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

۴۔ **کردار ساز سبق:** "کذٰلک ننجی المؤمنین" کا پُرمعنی جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گرفت اور نجات کے سلسلہ میں جو کچھ حضرت یونسؑ پر گزری، یہ کوئی ایک خصوصی فیصلہ نہیں تھا۔ بلکہ سلسلۂ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب کے لیے ایک عمومی پہلو رکھتا ہے۔

بہت سے غم انگیز حوادث اور سخت مشکلات، خود ہمارے گناہوں کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ یہ خوابیدہ رُوحوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک تازیانہ ہوتی ہیں یا نفسِ انسانی کی دھات کو صاف کرنے کے لیے ایک کٹھالی کی مانند ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر انسان ان تین نکات کی طرف توجہ کرے تو نجات یقینی ہے کہ جن کی طرف "یونس" نے توجہ کی تھی:

۱۔ حقیقت توحید کی طرف توجہ اور یہ کہ کوئی معبود اور کوئی سہارا اور پناہ گاہ اللہ کے سوا نہیں ہے۔

۲۔ خدا کو ہر نقص و ظلم سے پاک و منزہ سمجھنا اور اس کی ذاتِ پاک کے بارے میں کسی طرح کی بدگمانی نہ کرنا۔

۳۔ اپنے گناہ کا اعتراف کرنا۔

اس بات کی گواہ وہ حدیث ہے کہ جو تفسیر درالمنثور میں پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

> خدا کے ناموں میں سے ایک نام کہ جس کے ساتھ جو بھی خدا کو پکارے اس کی دُعا قبول ہوگی، اور جس وقت اس کے ذریعے خدا سے کوئی چیز طلب کرے تو خدا اُسے عطا کرے گا،

---

[1] نورالثقلین، ج ۳ ص ۴۳۶۔

وہ " یونسؑ کی دعا ہے ۔

ایک شخص نے عرض کیا : یا رسول اللہؐ ! کیا وہ یونس کے لیے مخصوص تھی یا مسلمان بھی اس میں شامل ہیں ؟ آپؐ نے فرمایا :

یہ یونس کے ساتھ بھی مربوط تھی اور تمام مومنین سے بھی مربوط ہے ، جب کہ وہ خدا کو پکارتے ہیں :
کیا تو نے قرآن میں خدا کی یہ گفتگو نہیں سُنی :
"وكذلك ننجي المؤمنين " یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اس طرح سے دعا کرے خدا نے اس کو قبول کرنے کی ضمانت دے دی ہے[1]

یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سے مراد صرف الفاظ کا پڑھنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت کا نفسِ انسانی میں نقش ہو جانا ہے۔ یعنی ان الفاظ کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا تمام وجود اس کے مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے ۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ خدا کی سزائیں اور عذاب دو قسم کے ہوتے ہیں' ان میں سے ایک تو عذاب استیصال ہے ۔ یعنی آخری عذاب کہ جو ناقابلِ اصلاح لوگوں کی تباہی اور نابودی کے لیے آتا ہے کہ جس میں کوئی دعا فائدہ مند نہیں ہوتی کیونکہ طوفانِ بلا کے اتر جانے کے بعد پھر وہی طرزِ عمل شروع ہو جاتا ہے ۔

دوسری قسم کی سزائیں اور عذاب تنبیہی ہوتے ہیں کہ جو تربیتی پہلو رکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر جونہی سزا کا اثر نمایاں ہونے لگتا ہے اور جس کو تنبیہ کے طور پر یہ سزا دی جا رہی ہے وہ بیدار اور متوجہ ہو جاتا ہے، تو بلافاصلہ عذاب اور سزا ٹل جاتی ہے ۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آفات و بلیات اور ناگوار حوادث کا ایک مقصد بیدار کرنا اور تربیت دینا ہے ۔

حضرت یونسؑ کا واقعہ راہِ حق کے تمام رہبروں کو مختلف حدود میں اس بات کی تنبیہ کر رہا ہے کہ وہ کبھی پیغام رسانی کی اپنی ذمہ داری کو ختم نہ سمجھیں اور اس راستے میں ہر سعی و کوشش کو کم شمار کریں کیونکہ ان کی مسئولیت اور ذمہ داری بڑی سنگین ہے ۔

۸۹۔ وَزَكَرِيَّآ إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝

۹۰۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝

---

[1] تفسیر درالمنثور ، المیزان کی نقل کے مطابق زیر بحث آیت کے ذیل میں المیزان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں یہ روایت تفسیر درالمنثور کے حوالے سے نقل کی گئی ہے ۔

ترجمہ

۸۹۔ اور زکریا (کو یاد کرو) کہ جب اس نے اپنے رب کو پکارا (اور عرض کیا)۔ اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ (اور مجھے ایک آبرومند بیٹا عطا فرما) اور بہترین وارث تو تُو ہی ہے۔

۹۰۔ ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اسے یحیٰی سا بیٹا عطا کیا اور ہم نے اس کے لیے اس کی بیوی میں صلاحیت پیدا کر دی کیونکہ وہ لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے تھے اور (رحمت کے) شوق اور (عذاب کے) خوف کے ساتھ ہمیں پکارتے تھے اور وہ (ادب اور مسؤلیت کے احساس سے) ہمارے حضور گڑگڑایا کرتے تھے۔

تفسیر

زکریا تنہا نہ رہے:

یہ دونوں آیتیں خدا کے دو اور بزرگ پیغمبروں حضرت زکریا اور حضرت یحیٰی کی زندگی کا ایک گوشہ بیان کر رہی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: زکریا کو یاد کرو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا: پروردگارا! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے: (وزکریا اذ نادٰی ربه رب لاتذرنی فردًا وانت خیر الوارثین)۔

زکریا کی عمر کے سالہا سال گزر گئے وہ بہت بوڑھے ہو گئے لیکن ابھی تک ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور دوسری طرف ان کی بیوی بانجھ تھی اور اب بچہ جننے کے قابل نہ تھی۔

انہیں ایک ایسے بیٹے کی تمنا تھی کہ جو ان کے خدائی پروگراموں کو چلائے تاکہ ان کے تبلیغی کام ادھورے نہ رہ جائیں اور ان کے بعد موقع کی تاڑ میں رہنے والے بنی اسرائیل ان کے عبادت خانہ اور اس کے اموال و ہدایا پر قابض نہ ہو جائیں — کیونکہ انہیں تو راہِ خدا میں صرف ہونا چاہیئے —

ایسے وقت میں آپؑ نے خلوصِ دل کے ساتھ، بارگاہِ خداوندی کی طرف رجوع کیا اور ایک صالح بیٹے کے لیے دعا کی آپ نے انتہائی ادب کے ساتھ خدا کو پکارا۔ آپ نے لفظ "رب" سے دعا شروع کی۔ وہی رب کہ جس کا لطف و کرم زندگی کے اولین لمحے سے انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے بعد "لاتذرنی" کی تعبیر آئی ہے۔ یہ لفظ "وذر" (بروزن "مرز") کے مادہ سے، کسی چیز کو معمولی اور کم سمجھ کر بے اعتنائی کی وجہ سے چھوڑنے اور ترک کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس لفظ سے حضرت زکریا نے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اگر میں تنہا رہ گیا تو فراموش ہو جاؤں گا۔ نہ صرف میں بلکہ میرے پروگرام بھی بھلا دیئے جائیں گے اور آخر میں "وانت خیر الوارثین" کے جملہ سے اس حقیقت کو بیان کیا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ دنیا دارِ بقا نہیں ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تُو بہترین وارث ہے لیکن عالمِ اسباب کے لحاظ سے کسی سبب کی تلاش میں ہوں کہ جو میرے ہدف اور مقصد کی طرف رہنمائی کرے۔

خدا نے حقیقتِ عشق سے سرشار اور پُر خلوص یہ دعا قبول کر لی اور ان کی خواہش پوری کر دی۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کی دعا قبول

کرلی اور اسے یحیٰی سا بیٹا عطا فرمایا: (فاستجبنا له ووهبنا له يحيىٰ)۔

اور اس مقصود تک پہنچنے کے لیے، "اس کی بانجھ بیوی کو درست کر دیا اور اس میں بچے کی پیدائش کی صلاحیت پیدا کر دی: (واصلحنا له زوجه)۔

اس کے بعد اس گھرانے کی تین عمدہ صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ نیک کاموں کی انجام دہی میں جلدی کرتے تھے (انهم كانوا يسارعون فى الخيرات)۔

وہ اطاعت سے عشق اور گناہوں سے وحشت کے ساتھ ہر حالت میں ہمیں پکارتے تھے (ويدعوننا رغبا ورهبا)[1]

وہ ہمیشہ ہمارے سامنے (ادب و احترام اور احساس مسئولیت کے ساتھ گڑگڑایا کرتے تھے) (وكانوا لنا خاشعين)۔

ان تینوں صفات کا ذکر ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ انہیں جس وقت کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ کم ظرف اور ضعیف الایمان لوگوں کی طرح ـــــ غفلتوں اور غرور میں گرفتار نہیں ہو جاتے تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی ضرورت مندوں کو فراموش نہیں کرتے تھے اور اچھے کاموں کے کرنے میں جلدی کرتے تھے۔ وہ حالتِ نیاز میں بھی اور بے نیازی میں بھی، فقیری میں بھی اور غنا میں بھی، بیماری میں بھی اور صحت میں بھی ہمیشہ خدا کی طرف متوجہ رہتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ وہ نعمتوں کے اپنی طرف رُخ کرنے کی وجہ سے کبر و غرور میں گرفتار نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ خاشع و خاضع رہتے تھے۔

۹۱۔ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ

۹۱۔ اور یاد کرو اس خاتون کو کہ جس نے اپنی عفت کی حفاظت کی اور ہم نے اس کے اندر اپنی رُوح میں سے پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو ہم نے عالمین کے لیے ایک عظیم نشانی قرار دیا۔

---

[1] "رغباً" رغبت، میلان اور لگاؤ کے معنی میں ہے اور "رهباً" خوف، نفرت اور بیزاری کے معنی میں ہے اور یہ بات کہ یہ اعراب کے لحاظ سے، ان کا محل استقلال کیا ہے، تو متعدد احتمالات ہیں۔ ممکن ہے حال ہو، یا مفعول مطلق ہو، یا ظرفیت کا معنی رکھتا ہو "في حال الرغبة وفي حال الرهبة" اگرچہ تعبیر ان پانچوں احتمالات کا مختلف ہے لیکن یہ فرق آیت کے مفہوم کے جزئیات میں ہے، اس کی اساس اور نتیجہ میں نہیں ہے۔

تفسیر

مریمؑ پاک دامن خاتون :

اس آیت میں حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے حضرت عیسٰیؑ کے مقام، عظمت اور احترام کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

مریمؑ کا ذکر۔ بزرگ انبیاءؑ سے مربوط مباحث کے درمیان۔ یا تو ان کے بیٹے عیسٰیؑ کی وجہ سے ہے یا اس بناء پر کہ مریم کی ولادت بھی کئی جہات سے یحیٰی کی ولادت کے مشابہ تھی کہ جس کی تفصیل ہم نے سورۂ مریم کی آیات کے ذیل میں بیان کی ہے[1]

اور یا اس بناء پر ہے کہ اس بات کو واضح کیا جائے کہ عظمت، عظیم مردوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ ایسی عظیم عورتیں بھی ہو گزری ہیں کہ جن کی تاریخ ان کی عظمت کی نشانی ہے، جو عالم کی عورتوں کے لیے ایک اسوہ اور نمونہ ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے : یاد کرو مریم کو جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی (والتی احصنت فرجها)۔

پھر ہم نے اپنی رُوح میں سے اس میں پھونکا (فنفخنا فيها من روحنا)۔

اور اُسے اور اُس کے بیٹے (عیسٰیؑ) کو ہم نے عالمین کے لیے عظیم نشانی قرار دیا (وجعلناها وابنها اٰية للعالمين)۔

چند اہم نکات :

۱۔ ایک ابہام کی وضاحت : فرج اصل میں لغت کے لحاظ سے فاصلہ اور شگاف کے معنی میں ہے۔ اور کنائے کے طور پر عورت کی اندام نہانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور چونکہ فارسی میں اس کے کنائی معنی کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا بعض اوقات یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ لفظ کہ جو عورت کے اس عضوِ خاص کے لیے بولا ہے، قرآن میں کیسے آیا ہے ؟ لیکن اس کے کنایہ ہونے کی طرف توجہ اس سوال کو حل کر دیتی ہے۔

زیادہ واضح اور روشن تعبیر میں اگر ہم کنائی معنی کو ٹھیک طور سے تعبیر کرنا چاہیں تو " احصنت فرجها " کے جملہ کا متبادل فارسی میں یہ ہے کہ " اپنے دامن کو پاک رکھا " تو کیا فارسی میں یہ تعبیر بُری ہے ؟

بلکہ بعض کے نظریہ کے مطابق عربی لغت میں ایسے الفاظ کہ جو عضوِ خاص کے لیے صراحتاً ہوں، یا جنسی اختلاط میں صراحت رکھتے ہوں، اصلاً موجود ہی نہیں ہیں۔ جو کچھ بھی ہے وہ کنائے کا ہی پہلو رکھتا ہے۔ مثلاً قرآن کی مختلف آیات میں اختلاط کے بارے میں "لمس کرنا" "داخل ہونا" "ڈھانپنا" (غشیان[2]) " یا بیوی کے پاس جانا[3] " کے لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ کہ جو سب کنایہ کا پہلو رکھتے ہیں لیکن بعض اوقات فارسی زبان میں ترجمہ کرنے والے ان کے کنائی معنی کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اس کنائی معانی کے متبادل کی بجائے فارسی

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۷ سورۂ مریم کی ابتدائی آیات کی تفسیر دیکھیے۔

[2] سورہ اعراف - ۱۸۹ -

[3] بقرہ - ۲۲۲ -

کے صریح الفاظ لکھ دیتے ہیں اور یہ بات سوال کا موجب بن جاتی ہے۔

بہرحال اس قسم کے الفاظ کی تفسیر میں کہ جو قرآن میں آتے ہیں، حتمی طور پر ان کے اصلی اور بنیادی معنی کی طرف توجہ کرنا چاہیئے تاکہ اس کے کنایہ ہونے کا پہلو واضح ہو جائے اور ہر قسم کا ابہام ختم ہو جائے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ زیر بحث آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حضرت مریمؑ نے اپنی عفت کی حفاظت کی، لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کے معنی میں یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ انہوں نے کسی مرد سے (چاہے حلال ہو یا حرام) ہر قسم کے میل جول سے خود کو بچائے رکھا[1] جیسا کہ سورۂ مریم کی آیہ ۲۰ میں ہے کہ:

ولم یمسسنی بشر ولم اك بغیًّا

نہ تو کبھی کسی بشر نے مجھے چھوا ہے اور نہ ہی میں کوئی بدکار عورت ہوں[2]

درحقیقت یہ حضرت عیسٰیؑ کی معجزانہ پیدائش اور ان کے معجزہ ہونے کے ذکر کی تمہید ہے۔

۲۔ "روحنا" سے مراد: جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، ایک باعظمت اور بلند حوصلہ روح کی طرف اشارہ ہے اور اصطلاح میں اس قسم کی اضافت "اضافتِ تشریفیہ" کہلاتی ہے، کہ ہم کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے اس کی اضافت خدا کی طرف کر دیتے ہیں، مثلاً: "بیت اللہ" (خدا کا گھر) اور "شہر اللہ" (خدا کا مہینہ)۔

۳۔ ماں بیٹا ایک معجزہ: زیر نظر آیت کہتی ہے: "ہم نے مریم اور اس کے بیٹے کو تمام جہان والوں کے لیے ایک آیت اور نشانی قرار دیا۔ انہیں دو آیتیں یا دو معجزات نہیں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اس بزرگ آیت اور معجزہ میں، مریم کا وجود ان کے بیٹے کے ساتھ اس طرح ملا ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا شمار نہیں کیے جا سکتے تھے۔ بیٹے کا باپ کے بغیر پیدا ہونا اتنا ہی اعجاز آمیز ہے، جتنا کہ کسی عورت کا شوہر کے بغیر حاملہ ہونا۔ علاوہ ازیں حضرت عیسٰیؑ کے معجزات بچپن میں بھی اور بڑے ہو کر بھی ان کی والدہ کی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔

ان تمام امور میں سے ہر ایک، عام طبعی اسباب سے ہٹ کر اور خلافِ معمول تھا۔ یہ سب امور اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں کہ سلسلۂ اسباب کے ماوراء ایک ایسی قدرت بھی موجود ہے جو جب چاہے، ان کی روش کو بدل دے۔ بہرحال مسیحؑ اور ان کی والدہ مریمؑ کی کیفیت پوری انسانی تاریخ میں بے نظیر ہے نہ اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا اور نہ اس کے بعد دیکھا گیا ہے اور شاید لفظ "آیت" کا نکرہ" کی صورت میں کہ جو عظمت کی دلیل ہے، اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی اور تفسیر فی ظلال زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] سورۂ مریم ۲۰۔

۹۲۔ إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ○

۹۳۔ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۖ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ ○

۹۴۔ فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ ○

ترجمہ

۹۲۔ یہ (عظیم پیغمبر کہ جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور ان کے پیروکار) سب ایک ہی اُمت ہیں (اور ایک ہی ھدف اور مقصد کے پیرو ہیں) اور میں تمہارا پروردگار ہوں، پس میری ہی عبادت کرو۔

۹۳۔ (بے علم اور بے خبر پیروکاروں کے ایک گروہ نے) آپس میں اپنے کام میں تفرقہ ڈال دیا ہے (لیکن آخرکار) سب کے سب ہماری طرف پلٹ کر آئیں گے۔

۹۴۔ جو شخص بھی کچھ اعمال صالح بجالائے گا جب کہ وہ باایمان بھی ہو، تو اس کی کوششوں کی ناقدری نہیں ہوگی اور ہم ان کے تمام اعمال لکھ رہے ہیں (تاکہ سب کو بڑی باریک بینی کے ساتھ ان کا بدلہ دیا جائے)

تفسیر

ایک اُمت :

گزشتہ آیات میں خدا کے بعض پیغمبروں کے نام آئے ہیں اور اسی طرح مریم جیسی مثالی خاتون کا نام آیا ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی بیان ہوئے ہیں۔ زیر بحث آیات میں، مجموعی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ عظیم پیغمبر کہ جن کی طرف اشارہ ہوا ہے، سب کے سب ایک ہی اُمت تھے (ان هٰذه امتكم امة واحدة)۔

اُن سب کا پروگرام بھی ایک تھا اور ان کا ھدف و مقصد بھی ایک ہی تھا۔ اگرچہ زمانہ اور ماحول کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف خصوصیات اور ان کا اندازِ کار کچھ مختلف تھا یعنی ان کی تکنیک مختلف تھی۔

لیکن سب کے سب آخرالامر ایک ہی مسلک اور راہ پر گامزن تھے۔ وہ سب کے سب توحید کی راہ میں شرک کے خلاف جدوجہد کرتے تھے اور دنیا کے لوگوں کو یگانگت، حق اور عدالت کی دعوت دیتے تھے۔

پروگرام، اصول اور ھدف و مقصد کی یہ یگانگت اور وحدت اِس بنا پر تھی کہ وہ سب کے سب ایک ہی مبدأ سے فیض حاصل کرتے تھے

جو خدائے واحد و یکتا کا ارادہ تھا۔ لہذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے : میں تم سب کا پروردگار ہوں لہذا تم صرف میری ہی عبادت کرو :
(وانا ربکم فاعبدون)۔

درحقیقت انبیاء کی توحیدِ عقیدتی و عملی کا سرچشمہ وحی ہے۔ اور یہ گفتگو علی علیہ السلام کی اُس بات سے مشابہ ہے کہ جو آپؑ نے اپنے بیٹے امام مجتبیٰؑ کو وصیت کرتے ہوئے فرمائی تھی :

واعلم یا بنی انه لو کان لربك شریك لاتتك رسله ولعرفت افعاله وصفاته۔

اے بیٹا ! جان لے کہ اگر تیرے پروردگار کا کوئی اور بھی شریک ہوتا، تو اُس کے رسول بھی تیری طرف آتے، تو اس کے ملک اور آثارِ قدرت کو بھی دیکھتا اور اس کے افعال و صفات کو بھی پہچانتا[1]

اُمّت جیسا کہ راغب کتاب مفردات میں کہتا ہے، ہر اس گروہ اور جمعیت کے معنی میں ہے کہ جس کی کوئی مشترک جہت اس کے افراد کو آپس میں جوڑے رکھے۔ ایک دین، ایک زمانہ یا ایک معین مکان کا اشتراک چاہے یہ وحدت اختیاری ہو یا غیر اختیاری۔
بعض مفسرین نے " اُمّت واحدة " کو یہاں " دینِ واحد " کے معنی میں لیا ہے لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ تفسیر اُمّت کے لغوی معنی سے مطابقت نہیں رکھتی۔

بعض دوسرے لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس آیت میں " اُمّت " سے مراد، تمام زمانوں اور قرنوں کے تمام انسان ہیں یعنی اے تمام انسانو ! تم سب کے سب ایک ہی اُمّت ہو، تمہارا پروردگار بھی ایک ہے اور تمہارا حقیقی مقصد بھی ایک ہے۔
یہ تفسیر اگرچہ گزشتہ تفسیر کی نسبت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، لیکن اس آیت کے، پہلی آیتوں کے ساتھ تعلق کو مدِنظر رکھتے ہوئے، یہ صحیح نظر نہیں آتی۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ جملہ اُن ہی انبیاء و مرسلین کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے حالات کی تفصیل گزشتہ آیات میں بیان کی گئی ہے۔

٭ ٭ ٭

اگلی آیت میں، لوگوں کی اکثریت کے اس توحیدی بنیاد سے انحراف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : وہ اپنے معاملے میں اختلافات کا شکار ہو گئے : (وتقطعوا امرهم بینهم)۔
معاملہ اس حد کو پہنچ گیا کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو لعن و نفرین کرنے لگا اور اس سے بیزار ہو گیا۔ انہوں نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہتھیار نکال لیے اور بہت زیادہ خونریزی کی اور یہ توحید اور حق کے دینِ واحد سے انحراف کا نتیجہ تھا۔

" تقطعوا " مادہ " قطع " سے ہے۔ یہ ایک باہم ملی ہوئی چیز کو علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں کر دینے کے معنی میں ہے۔ یہ " باب تفعل " سے آیا ہے، کہ جو قبول کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جملے کا مفہوم اس طرح ہوگا : وہ تفرق اور نفاق کے عوامل کے

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔

سامنے جھک گئے اور انہوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اور بے گانگی کو قبول کر کے اپنی فطری اور توحیدی وحدت کو ختم کر دیا اور اس کے نتیجہ میں ہر قسم کی شکست، ناکامی اور بدبختی میں گرفتار ہو گئے۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: لیکن یہ سب کے سب آخر کار ہماری ہی طرف لوٹ کر آئیں گے (کل الینا راجعون)۔

یہ اختلاف جو عارضی ہے ختم ہو جائے گا اور پھر قیامت میں سب کے سب وحدت ہی کی طرف جائیں گے۔ قرآن کی مختلف آیات میں اس مسئلے پر بہت تاکید کی گئی ہے کہ قیامت کی خصوصیات میں سے ایک، اختلافات کا ختم ہو جانا اور وحدت کی طرف چل پڑنا ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۴۸ میں ہے:

الی اللہ مرجعکم جمیعا فینبئکم بما کنتم فیہ تختلفون

تم سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے اور جن چیزوں میں تم اختلاف رکھتے تھے تمہیں وہ ان سے آگاہ کرے گا۔

یہ مضمون قرآن مجید کی متعدد آیات میں نظر آتا ہے۔[1]

اور اس طرح سے انسانوں کی خلقت "وحدت" سے ہی شروع ہوتی ہے اور وحدت کی طرف ہی لوٹ جائے گی۔

آخری زیر بحث آیت میں پروردگار کی پرستش کی راہ میں "اُمتِ واحدہ" کے ساتھ ہم آہنگی کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے: جو کوئی بھی کچھ اعمالِ صالح انجام دے گا، جبکہ وہ ایمان بھی رکھتا ہو، تو اس کی جدوجہد اور کوشش کی ناقدری نہیں کی جائے گی:

(فمن یعمل من الصالحات وھو مؤمن فلا کفران لسعیہ)۔

اور مزید تاکید کے لیے اضافہ کیا گیا ہے: اور ہم اس کے اعمالِ صالح یقیناً لکھیں گے (وانا لہ کاتبون)

اس آیت میں قرآن کی دوسری بہت سی آیات کی طرح ایمان اور عملِ صالح کا انسانوں کی نجات کے لیے دو اساسی اور بنیادی ارکان کے طور پر ذکر ہوا ہے لیکن لفظ "من" کے اضافہ کے ساتھ کہ جو تبعیض کے لیے آتا ہے۔ یہ اس مطلب کو بیان کرتا ہے کہ تمام اعمال کی انجام دہی بھی شرط نہیں ہے بلکہ اگر صاحبانِ ایمان کچھ بھی عملِ صالح بجا لائیں تو بھی وہ اہلِ نجات و سعادت ہیں۔

بہرحال یہ آیت قرآن کی بہت سی دوسری آیات کی طرح، اعمالِ صالح کی قبولیت کی شرط ایمان کو شمار کرتی ہے۔

"لا کفران لسعیہ" کے جملہ کا ذکر، اس قسم کے افراد کی جزا کے بیان کرنے کے لیے، ایک ایسی تعبیر ہے کہ جو انتہائی لطف و محبت اور بزرگواری کے ساتھ ملی ہوئی ہے کیونکہ خدا اس مقام پر اپنے بندوں کی قدردانی کرتے ہوئے ان کی سعی و کوشش کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ یہ تعبیر اس تعبیر کی مانند ہے جو سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۱۹ میں بیان ہوئی ہے:

ومن اراد الاٰخرۃ وسعٰی لھا سعیھا وھو مؤمن فاولئک کان سعیھم مشکورا

جو شخص آخرت کے گھر کی خواہش کرے گا، اور اس کے لیے سعی و کوشش کرے گا۔ جبکہ وہ ایمان بھی رکھتا ہو، تو اس کی کوشش کی قدردانی کی جائے گی۔

---

[1] آل عمران - ۵۵، انعام - ۱۶۴، نحل - ۹۲ اور حج ۶۹ وغیرہ۔

۹۵۔ وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ○

۹۶۔ حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ○

۹۷۔ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۭ یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ○

ترجمہ

۹۵۔ وہ شہر اور آبادیاں کہ جنہیں ہم نے (گناہوں کی پاداش میں) ہلاک کر دیا، ان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ (اس دنیا میں) پلٹ سکیں۔

۹۶۔ یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ تیزی کے ساتھ ہر بلندی سے گزر جائیں گے۔

۹۷۔ اور (قیامت کے بارے میں) حق کا وعدہ (ایفا کے) قریب ہو جائے گا، تو اس وقت کافروں کی آنکھیں دہشت کی وجہ سے حرکت چھوڑ دیں گی، (وہ کہیں گے) وائے ہو ہم پر کہ ہم اس کے بارے میں غفلت میں تھے، ہم تو ظالم تھے۔

تفسیر

کفار قیامت کے آستانے پر:

گزشتہ آیات میں نیکوکار مومنین کے بارے میں گفتگو تھی اور زیر بحث پہلی آیت میں ایسے افراد کی طرف اشارہ ہے کہ جو ان کے نقطۂ مقابل میں واقع ہیں وہ لوگ کہ جو آخری سانس تک گمراہی اور بُرائی پر باقی رہتے ہیں۔

فرمایا گیا ہے: ان بستیوں پر کہ جنہیں ہم نے ان کے گناہوں کے جُرم میں نابود کر دیا ہے، حرام ہے کہ وہ دنیا کی طرف پلٹ کر آئیں، وہ ہرگز واپس نہیں آئیں گے:

(وحرام علیٰ قریۃ اھلکناھا انھم لا یرجعون)[1]

درحقیقت وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو عذاب الٰہی دیکھنے کے بعد یا ہلاکت کے بعد اور عالم برزخ میں جانے کے بعد، غرور و غفلت کے پردوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے سے ہٹا ہوا پائیں گے، تو آرزو کریں گے کہ اے کاش! وہ ان تمام خطاؤں اور گناہوں کی تلافی کرنے کے لیے۔ دوبارہ دنیا کی طرف لوٹ جاتے، لیکن قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ ان کی بازگشت بالکل حرام یعنی ممنوع ہے۔

یہ اسی بات کے مشابہ ہے کہ جو سورۂ مؤمنون کی آیہ ۹۹ میں بیان ہوئی ہے:

حتیٰ اذا جآء احدھم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحاً فیما ترکت کلا۔۔۔

ان کی یہ کیفیت اسی طرح باقی رہے گی، یہاں تک کہ ان کی موت (کا وقت) آن پہنچے گا تو وہ یہ کہیں گے: پروردگارا! ہمیں دنیا کی طرف پلٹا دے تاکہ وہ نیک اعمال کہ جو ہم نے ترک کردیئے ہیں انجام دیں لیکن وہ سوائے منفی جواب کے اور کچھ نہیں سنیں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں دوسرے بیانات بھی ذکر ہوئے ہیں کہ جن میں سے بعض کی طرف نیچے حاشیہ میں اشارہ ہوگا[2]

بہرحال یہ بے خبر لوگ ہمیشہ غفلت اور غرور میں ہی رہیں گے اور ان کی یہ بدبختی اسی طرح باقی رہے گی یہاں تک کہ دنیا ختم ہو جائے گی۔

جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

" یہ بات اس وقت تک ہوتی رہے گی یہاں تک کہ یاجوج و ماجوج پر راہ کھول دی جائے گی اور وہ ساری زمین میں پھیل جائیں اور وہ ہر بلندی سے تیزی کے ساتھ گزر جائیں: (حتیٰ اذا فتحت یأجوج و مأجوج وھم من کل حدب ینسلون)۔

یاجوج و ماجوج کون لوگ تھے، کہاں رہتے تھے اور آخرکار وہ کیا کریں گے اور ان کا کیا انجام ہوگا؟

---

[1] اس تفسیر کے مطابق " حرام " خبر ہے مبتدائے محذوف کی اور " انھم لا یرجعون " کا جملہ اس پر دلیل ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:

حرام علیٰ اھل قریۃ اھلکناھا ان یرجعوا الی الدنیا انھم لا یرجعون

جن اہل قریہ کو ہم نے ہلاک کیا ہے ان پر حرام ہے کہ وہ پلٹ آئیں، وہ نہیں پلٹیں گے۔

[2] بعض نے " حرام " کو یہاں " واجب " کے معنی میں لیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ لغت عرب میں بعض اوقات یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور وہ لفظ " لا " کو زائدہ سمجھتے ہیں۔ ان کے حساب سے آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا:

آخرت میں ان کی بازگشت واجب اور ضروری ہے۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ " حرام " حرام ہی کے معنی میں ہے، لیکن " لا " زائدہ ہے، یعنی ان کی بازگشت اس جہان کی طرف حرام ہے۔

بعض مفسرین نے آیت کو خدا اور آپ کی طرف بازگشت نہ ہونے کے معنی میں لیا ہے (تفسیر مجمع البیان اور فخر رازی زیر بحث آیہ کے ذیل میں)

بعض یہ کہتے ہیں کہ آیت نفی در نفی کے قبیل سے ہے اور یہ اس بات کو بیان کرتی ہے کہ یہ حرام ہے کہ وہ قیامت میں پلٹ کر نہ آئیں یعنی وہ پلٹ کر آئیں گے۔ (تفسیر منہج الصادقین زیر بحث آیہ کے ذیل میں) لیکن جو کچھ ہم نے متن میں بیان کیا ہے وہ سب سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

اس بارے میں ہم نے سورہ کہف کی آیہ ۹۴ کے ذیل میں اور اس کے بعد بحث کی ہے اور اسی طرح اس " سد " کے بارے میں بھی کہ جو " ذوالقرنین " نے ان کے حملوں کو روکنے کے لیے پہاڑوں کے ایک تنگ درہ میں بنائی تھی، تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔

کیا ان دونوں گروہوں کے کھل جانے سے مراد، اس سد کا ٹوٹ جانا، اور ان کا اس راستے سے دنیا کے دوسرے علاقوں میں نفوذ کرنے سے مراد کرۂ زمین میں ہر جانب اور ہر طرف سے نفوذ ہے ؟ زیرِ نظر آیت نے صریح طور پر اس بارے میں کوئی بات نہیں کہی ہے۔ صرف زمین میں پھیل جانے کو عالم کے اختتام کی ایک نشانی اور قیامت کے آنے کی ایک تمہید کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے: اس وقت خدا کا وعدۂ حق نزدیک آپہنچے گا: (واقترب الوعد الحق)۔

اور ایک گھبراہٹ اس طرح کفار کے سارے وجود پر چھا جائے گی کہ ان کی آنکھیں حرکت نہیں کر پائیں گی، اور وہ یہ منظر حیرانی کے ساتھ دیکھیں گے: (فاذا ھی شاخصة ابصار الذین کفروا)۔

اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے سے غفلت اور غرور کے پردے ہٹ جائیں گے اور انہیں پکاریں گے: وائے ہو ہم پر، ہم تو اس منظر سے غفلت میں ہی تھے: (یا ویلنا قد کنا فی غفلة من ھذا)۔

اور چونکہ اپنے اس عذر سے اپنے گناہ نہیں چھپا سکیں گے اور خود کو بری بھی قرار نہ دے سکیں گے، لہٰذا صراحت کے ساتھ کہیں گے: نہیں بلکہ ہم ہی ظالم تھے: (بل کنا ظالمین)۔

اصولی طور پر خدا کے ان تمام پیغمبروں اور آسمانی کتابوں اور ان تمام ہلا دینے والے حوادث اور اسی طرح ایسے عبرت آموز سبقوں کے باوجود ـــ کہ جو زمانہ ان کے سامنے پیش کرتا ہے ـــ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ پھر بھی غفلت میں رہیں، لہٰذا جو کچھ ان سے سرزد ہوا ہے، تقصیر ہے اور خود اپنے اوپر بھی اور دوسروں کے اوپر بھی ظلم ہے۔

چند الفاظ کے لغوی معنی :

" حدب " (بروزن " ادب ") ایسی بلندیوں کے معنی میں ہے کہ جو پستیوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ کبھی انسان کی پشت کے ابھار کو بھی " حدب " کہتے ہیں۔

" ینسلون " " نسول " کے مادہ سے (بروزن " فضول ") تیزی سے نکلنے کے معنی میں ہے۔

یہ جو یاجوج و ماجوج کے بارے میں ہے کہ وہ ہر بلندی سے تیزی کے ساتھ گزریں گے اور نکلیں گے، یہ ان کے کرۂ زمین میں بہت زیادہ نفوذ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

" شاخصة " " شخوص " (بروزن " خلوص ") دراصل گھر سے باہر نکلنے کے معنی میں ہے۔ یا ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف نکل جانے کے معنی میں ہے اور چونکہ تعجب اور حیرانی کے وقت انسان کی آنکھ گویا یہ چاہتی ہے کہ وہ باہر نکل آئے، لہٰذا اس حالت کو بھی " شخوص " کہا جاتا ہے۔ یہ وہ حالت ہے کہ جو قیامت میں گنہگاروں کو لاحق ہوگی۔ وہ ایسے حیران ہوں گے کہ گویا ان کی آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ وہ اپنے حلقے سے باہر نکل آئیں۔

۹۸۔ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝

۹۹۔ لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَاۤءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

۱۰۰۔ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ۝

۱۰۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰۤئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝

۱۰۲۔ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۝

۱۰۳۔ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰۤئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۹۸۔ تم بھی اور جن جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہوں گے، اور تم سب کے سب اس میں جاؤ گے۔

۹۹۔ اگر یہ خدا ہوتے تو ہرگز اس میں نہ جاتے اور وہ سب کے سب ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

۱۰۰۔ وہاں پر وہ دردناک طریقے سے نالہ و فریاد کرتے ہوں گے اور وہاں انہیں کچھ سنائی نہ دے گا۔

۱۰۱۔ لیکن وہ لوگ کہ جن سے ہم نے پہلے سے اچھا وعدہ کیا ہوا ہے، انہیں اس سے دور ہی رکھا جائے گا۔

۱۰۲۔ وہ جہنم کی آگ کی آواز (تک بھی) نہیں سنیں گے اور وہ اسی میں کہ جس میں ان کا دل چاہے گا، ہمیشہ (نعمتوں میں) رہیں گے۔

۱۰۳۔ انہیں وہ عظیم وحشت محزون و مغموم نہیں کرے گی اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے بڑھیں گے (اور یہ کہیں گے کہ) یہی تو وہ دن ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

تفسیر

جہنم کا ایندھن :

گزشتہ آیات میں ظالم مشرکین کے انجام کے بارے میں گفتگو تھی ۔ ان آیات میں رُوئے سخن ان کی طرف کرتے ہوئے ، اُن کی اور ان کے معبودوں کے مستقبل کی اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے : تم بھی اور جن جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو (سب کے سب) جہنم کا ایندھن ہیں (انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم)۔

" حصب " دراصل پھینکنے کے معنی میں ہے ۔خصوصاً ایندھن کے ٹکڑوں کو تنور میں پھینکنے کو " حصب " کہا جاتا ہے ۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ " حطب " (بروزن سبب) کہ جو ایندھن کے معنی میں ہے ، عربوں کی مختلف زبانوں میں مختلف تلفظ رکھتا ہے ۔ بعض قبیلے اسے " حصب " اور بعض دوسرے اس کو " حضب " کہتے ہیں ، اور چونکہ قرآن قبائل اور دلوں کو جوڑنے کیلئے آیا ہے لہذا بعض اوقات ان کے مختلف الفاظ کو بھی استعمال کرتا ہے تاکہ اس طریقے سے دل جمع ہوں ۔ یہ لفظ "حصب" بھی ایسے الفاظ میں سے ہے کہ جو اہلِ یمن کے قبائل لفظ " حطب " کی جگہ تلفظ کرتے ہیں [1]

بہرحال زیر بحث آیت مشرکین سے کہتی ہے کہ جہنم میں آگ جلانے والا ایندھن جس سے اس کے شعلے پیدا ہوں گے ، خود تم اور تمہارے بناوٹی خدا ایندھن کے بے قدر وقیمت ٹکڑوں کی طرح یکے بعد دیگرے جہنم میں پھینکے جاؤ گے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : تم اس میں جاؤ گے (انتم لھا واردون)۔

یہ جملہ یا تو گزشتہ بات کی تاکید کے طور پر ہے یا ایک نئے نکتہ کی طرف اشارہ ہے ، اور وہ یہ ہے کہ پہلے تو بتوں کو آگ میں ڈالیں گے ، پھر تم ان پر وارد ہو گے ، گویا تمہارے خدا اس آگ کے ساتھ کہ جو ان کے وجود سے نکلے گی ، تمہارا استقبال کریں گے [2]

اگر یہ سوال ہو کہ بتوں کو جہنم میں ڈالنے کا کیا فلسفہ ہے ، تو اس کے جواب میں یہ کہنا چاہیئے کہ یہ بھی بُت پرستوں کے لیے ایک قسم کا عذاب اور سزا ہے کیونکہ وہ یہ دیکھیں گے کہ وہ اس آگ میں کہ جس کے شعلے اُن کے بتوں سے نکل رہے ہیں ، جل رہے ہیں ۔

علاوہ ازیں یہ بات ان کے نظریات کی تحقیر و تذلیل ہے ، کہ وہ اس قسم کی بے قدر وقیمت چیزوں کی پناہ لیا کرتے تھے ۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ (مایعبدون) ان معبودوں کے معنی میں ہو کہ جو بے جان پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے بُت تھے (جیسا کہ "ما" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ "ما" عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے) لیکن اگر اس کے مفہوم کو عام سمجھیں اور اس میں وہ شیاطین بھی شامل ہوں کہ جو معبود بنے ہوئے تھے تو پھر ان معبودوں کا جہنم میں آنا بالکل واضح ہے کیونکہ وہ تو خود شریک جُرم ہیں ۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی زیر بحث آیات کے ذیل میں ۔

[2] اس بات پر توجہ رہے کہ پہلی صورت میں " لھا " کی لام " الیٰ " کے معنی میں ہے اور " ھا " کی ضمیر جہنم کی طرف لوٹتی ہے اور دوسری تفسیر میں بھی لام " الیٰ " کے معنی میں ہے لیکن ضمیر بتوں کی طرف لوٹتی ہے ۔

اس کے بعد عمومی نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر یہ بت خدا ہوتے تو ہرگز جہنم کی آگ میں نہ پہنچتے (لو کان ھؤلاء الھة ما وردوھا)۔

لیکن یہ جان لو کہ نہ صرف یہ کہ وہ جہنم میں پہنچیں گے بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے (وکل فیھا خالدون)۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ بت پرست ہمیشہ اپنے خداؤں کے ساتھ ہی رہیں گے۔ وہ خدا کہ جن کی وہ ہمیشہ پرستش کیا کرتے تھے اور انہیں مصیبتوں میں ڈھال سمجھتے تھے اور اپنی مشکلات کا حل ان سے چاہتے تھے۔

ان "گمراہ عبادت کرنے والوں" کی "ان بے قدر و قیمت معبودوں" کے ساتھ دردناک کیفیت کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے فرمایا گیا ہے: وہ دوزخ میں دردناک نالہ و فریاد کریں گے (لھم فیھا زفیر)۔

"زفیر" اصل میں ایسی چیخ و پکار کرنے کے معنی میں ہے کہ جس کے ساتھ سانس کی آواز بھی آرہی ہو۔ بعض نے کہا کہ خچر کی نفرت انگیز آواز کو ابتداء میں "زفیر" اور آخر میں "شہیق" کہتے ہیں۔ بہرحال یہاں ایسے نالہ و فریاد کی طرف اشارہ ہے کہ جو غم و اندوہ کی وجہ سے نکلے۔[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ غم انگیز نالہ و فریاد صرف ان عبادت کرنے والوں کے ساتھ ہی مربوط نہ ہو بلکہ شیاطین کہ جو ان کے معبود تھے وہ بھی اس میں ان کے شریک ہوں۔

بعد کا جملہ ان کی ایک اور دردناک سزا کو بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ: انہیں دوزخ میں کچھ سنائی نہیں دے گا: (وھو فیھا لا یسمعون)۔

یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ کوئی ایسی بات ہرگز نہیں سنیں گے کہ جو ان کے لیے راحت کا باعث بنے۔ بلکہ وہ دوزخیوں کے جانکاہ نالے اور عذاب کے فرشتوں کی جھڑکیاں ہی سنیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں آگ کے تابوتوں میں رکھا جائے گا، اس طرح سے کہ وہ کسی کی آواز کو بالکل نہیں سنیں گے۔ گویا وہ اکیلے ہی عذاب میں ہیں اور یہ بات خود زیادہ عذاب کا سبب ہے کیونکہ اگر انسان کے ساتھ اور افراد بھی زندان میں ہوں تو یہ بات اس کے دل کی تسلی کا باعث ہوگی کیونکہ:

البلیة اذا عمت طابت

بلا و مصیبت جب عام ہو تو وہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔

⁂

اگلی آیت سچے مومنین اور صاحبانِ ایمان مردوں اور عورتوں کے حالات بیان کر رہی ہے تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ سے دونوں کی کیفیت زیادہ واضح ہو جائے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ: وہ لوگ کہ جن سے ہم نے ان کے ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے پہلے سے اچھا وعدہ کر رکھا ہے، وہ اس وحشتناک اور ہولناک آگ سے دور رہیں گے (ان الذین سبقت لھم منا الحسنٰی اولٰئک عنھا مبعدون)۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۵ میں سورہ ہود کی آیہ ۱۰۶ کے ذیل میں رجوع کریں۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے اس جہان میں مومنین سے جتنے وعدے کیے ہیں، ہم انہیں پورا کریں گے اُن میں سے ایک ان کا جہنم کی آگ سے دُور رہنا ہے۔

اگرچہ اس جملے کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ تمام سچے مومنین کے لیے ہوگا لیکن بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰؑ اور مریمؑ جیسے معبودوں کی طرف اشارہ ہے کہ ایک گروہ جن کی عبادت ان کی خواہش اور مرضی کے بغیر کرتا تھا۔ اور چونکہ سابقہ آیات یہ کہتی تھیں کہ تم بھی اور تمہارے معبود بھی دوزخ میں داخل ہوں گے تو اس تعبیر سے ممکن تھا کہ حضرت عیسیٰؑ جیسے افراد بھی شامل سمجھ لیے جاتے، لہٰذا قرآن یہ جملہ فوراً ایک استثناء کے طور پر بیان کرتا ہے کہ ایسے لوگ ہرگز دوزخ میں نہیں جائیں گے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے بارے میں ایک شانِ نزول ذکر کی ہے کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بعض لوگوں نے یہی سوال پیغمبرِ اسلامؐ سے بھی کیا تھا لہٰذا یہ آیت ان کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔

لیکن اِس حالت میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ زیرِ نظر آیت اُس سوال کا جواب بھی ہو اور سب سچے مومنین کے بارے میں ایک عمومی حکم بھی ہو۔

آخری زیرِ بحث آیات میں خدا کی چار عظیم نعمتوں کا ذکر ہے کہ جو ان لوگوں کو میسر ہوں گی:

پہلی یہ کہ وہ آگ کی آواز تک نہیں سنیں گے (لا یسمعون حسیسھا)۔

"حسیس" جیسا کہ اربابِ لغت نے کہا ہے، محسوس آواز کے معنی میں ہے اور خود حرکت یا خود حرکت سے جو آواز پیدا ہو اس کے معنی میں بھی ہے۔ دوزخ کی آگ کہ جو ہمیشہ آتش گیریوں میں بڑھتی ہی جاتی ہے، ایک مخصوص آواز رکھتی ہے۔ یہ آواز دو جہت سے وحشتناک ہے، ایک تو اس لحاظ سے کہ یہ آگ کی آواز ہے، اور دوسرے اس لحاظ سے کہ یہ آگے بڑھنے کی آواز ہے۔

سچے مومنین چونکہ جہنم سے دُور رہیں گے، لہٰذا یہ وحشتناک آوازیں ہرگز ان کے کانوں میں نہیں پڑیں گی۔

دوسری یہ، کہ "وہ جیسی نعمت میں چاہیں گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں مستغرق رہیں گے (وھو فیما اشتھت انفسھم خالدون)۔

یعنی وہاں پر اس جہان کی طرح کی محدودیت نہیں ہے۔ یہاں تو انسان بہت سی نعمتوں کی آرزو کرتا ہے لیکن ان تک نہیں پہنچ پاتا۔ وہاں پر وہ جو بھی مادی و معنوی نعمت چاہے گا، اس کی دسترس میں ہوگی۔ وہ بھی ایک دن یا دو دن نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

تیسری یہ کہ: عظیم وحشت انہیں مغموم نہیں کرے گی (لا یحزنھم الفزع الاکبر)۔

"فزع اکبر" (عظیم اور بڑی دہشت) کو بعض نے روزِ قیامت کی وحشتوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ وہ ہر وحشت سے بڑی ہے اور بعض نے صور کا پھونکا جانا اور اس جہان کے ختم ہونے کی زبردست کیفیت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جیسا کہ سورہ نمل کی آیہ ۸۷ میں ہے:

لیکن چونکہ قیامت کے دن کی وحشت مسلّمہ طور پر اس سے زیادہ اہم ہے، لہٰذا پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

آخر میں ان لوگوں کے لیے آخری نعمت کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ: رحمت کے فرشتے ان کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے، انہیں مبارکباد دیں گے اور یہ بشارت دیں گے کہ یہ وہی دن ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا: (وتتلقٰھم الملٰئکۃ ھٰذا

یومکم الذی کنتم توعدون)۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ امیرالمومنین علی علیہ السلام نے فرمایا :

فبادروا باعمالکم تکونوا مع جیران اللہ فی دارہ، رافق بھم رسلہ ، وازارھم ملائکتہ ، واکرم اسماعھم ان تسمع حسیس نارجھنم ابدًا۔

نیک اعمال کی طرف جلدی کرو، تاکہ تم خدا کے گھر میں اس کے پڑوسی بنو۔ ایسے مقام پر کہ جہاں پیغبروں کو ان کا رفیق قرار دیا ہے اور فرشتوں کو ان کی زیارت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ خدا نے ان لوگوں کی اتنی عزت بڑھائی ہے کہ ان کے کان جہنم کی آگ کی آواز تک نہیں سنیں گے۔[1]

۱۰۴۔ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۚ كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهٗ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ○

ترجمہ

۱۰۴۔ وہ دن کہ جب ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے خطوط کے کاغذوں کو آپس میں لپیٹا جاتا ہے۔ (پھر) جس طرح سے ہم نے خلقت کی ابتدا کی تھی، اسی طرح سے اُسے واپس لوٹائیں گے۔ یہ وہ وعدہ ہے کہ جو ہم نے کیا ہے اور ہم یقینی طور پر اسے انجام دیں گے۔

تفسیر

جب آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا :

گزشتہ بحث کی آخری آیت میں تھا کہ سچے مومنین عظیم وحشت سے غمگین نہیں ہونگے۔ یہاں پر اس بڑی وحشت کے دن کا ایک اور رُخ پیش کیا جا رہا ہے اور درحقیقت اس وحشت کی عظمت کی علت کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

---

[1] نہج البلاغہ ، خطبہ ۱۸۳۔

یہ معاملہ اُس دن حقیقت کی صُورت اختیار کرے گا کہ جب ہم آسمانوں کو اس طرح سے لپیٹ دیں گے کہ جس طرح خطوں کو لپیٹا جاتا ہے
(یوم نطوی السمآء کطی السجل للکتب)۔[1]

گزشتہ زمانے میں خطوط لکھنے کے لیے اور اسی طرح کتابیں لکھنے کے لیے، طومار (لپیٹے ہوئے کاغذ) کی طرح کے اوراق استعمال ہوتے تھے۔ ان طوماروں کو لکھنے سے پہلے لپیٹ دیتے تھے اور لکھنے والا بتدریج آہستہ آہستہ اُسے ایک طرف سے کھینچتا رہتا تھا اور جو مطالب اُسے لکھنا ہوتے تھے اس کے اُوپر لکھا کرتا تھا اور لکھائی ختم ہونے کے بعد پھر انہیں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا جاتا تھا۔ لہذا ان کے خطوط اور کتابیں بھی طومار کی شکل میں ہوتی تھیں اُس طومار کو "سجل" کا نام دیا جاتا تھا کہ جس کو لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

اس آیت میں، دنیا کے اختتام پر، عالم ہستی کے لپیٹ دیئے جانے کی، ایک لطیف تشبیہ ہے۔ اس وقت اوراق کے یہ طومار کھلے ہوئے ہیں اور اس کے تمام نقوش اور خطوط پڑھے جا رہے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر قائم اور برقرار ہے لیکن جب قیامت کا حکم ہو جائے گا تو یہ عظیم طومار اپنے تمام خطوط و نقوش کے ساتھ لپیٹ دیئے جائیں گے۔

البتہ دنیا کے لپیٹے جانے کا معنی اس کا مٹنا اور نابود ہونا نہیں ہے، جیسا کہ بعض نے خیال کر رکھا ہے۔ بلکہ اس کا درہم برہم ہو کر مل جانا اور اکٹھا ہو جانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس جہان کی شکل و صورت تو بگڑ جائے گی، لیکن اس کا مادہ نابود اور ختم نہیں ہوگا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو آیاتِ معاد کی مختلف تعبیرات سے اچھی طرح واضح ہوتی ہے مثلاً انسان کا بوسیدہ ہڈیوں اور قبروں سے اُٹھنا ــــــ

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ: "جس طرح ہم نے اُسے ابتداء میں پیدا کیا ہے (اسی طرح) دوبارہ پلٹائیں گے" یہ کام ہماری عظیم قدرت کے سامنے کوئی مشکل نہیں ہے (کما بدأنا اول خلق نعیدہ)۔

درحقیقت یہ تعبیر اُس تعبیر کے مشابہ ہے کہ جو سُورہ اعراف کی آیہ ۲۹ میں ہے:

کما بدأکم تعودون

جس طرح سے اس نے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا اسی طرح لوٹائے گا۔

اسی طرح:

وھو الذی یبدؤا الخلق ثم یعیدہ و ھو اھون علیہ

اور وہی ذات تو ہے جس نے خلقت کی ابتداء کی، پھر اس کو لوٹائے گا اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے (روم۔ ۲۷)[2]

---

[1] "سجل" (بروزن "سطل") بڑے اور پانی سے بھرے ہوتے ڈول کے معنی میں ہے، اور "سجل" (سین اور جیم کی زیر اور لام کی شد کے ساتھ) اُن پتھروں کے ٹکڑوں کے معنی میں ہے کہ جن کے اُوپر لکھا جاتا تھا، اس کے بعد ان تمام اوراق کو کہ جن پر مطالب لکھتے ہیں کہا گیا ہے (مفردات راغب و قاموس)۔ اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ "کطی السجل للکتب" کے جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں، لیکن سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ "طی" جو کہ مصدر ہے "سجل" کی طرف جو کہ اس کا مفعول ہے، مضاف ہے، اور "للکتب" میں جو لام ہے وہ اضافت کی ہے یا بیان علت کے لیے۔ (غور کیجئے)

[2] (اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ اس بازگشت سے مراد، فنا و نابودی کی طرف بازگشت یا آغازِ آفرینش کی طرح آپس میں لپیٹ دینا ہے، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : یہ وہ وعدہ ہے کہ جو ہم نے کیا ہے اور یقیناً ہم اُسے انجام دیں گے۔ (وعدًا علینا انا کنا فاعلین)[1]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کی پہلی صُورت میں بازگشت سے مراد یہ ہے کہ انسان دوبارہ ننگے پاؤں اور عُریاں — جیسا کہ ابتدائے خلقت میں تھے — پلٹ کر آئیں گے لیکن بلاشک اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ آیت کا مفہوم اسی معنی میں منحصر ہے، بلکہ یہ تو مخلوق کے پہلی صُورت میں لوٹنے کی ایک شکل ہے۔

* * *

۱۰۵۔ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ○

۱۰۶۔ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ ○

ترجمہ

۱۰۵۔ ہم نے ذکر (تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا ہے کہ میرے صالح بندے زمین (کی حکومت) کے وارث ہوں گے۔

۱۰۶۔ اس میں عبادت گزاروں کے لیے ایک روشن ابلاغ ہے۔

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ) البتہ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ خدا کی لامتناہی قدرت کے بارے میں "مشکل اور آسان" کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ سب کچھ ایک جیسا ہے۔ اس بنا پر جو تعبیر مذکورہ بالا آیت میں آئی ہے، حقیقت میں انسانوں کی نظر کے لحاظ سے ہے۔

(اس صفحہ کا حاشیہ)

[1] "وعدًا" "وعدنا" کا مفعول ہے جو کہ مقدر ہے۔

یہ جملہ حقیقت میں چند قسم کی تاکیدیں لیے ہوئے ہے، مثلاً "وعدًا"، "علینا" (ہم پر) پھر "انا" کے ساتھ تاکید اور دوسرے "کنا" میں فعل ماضی کا استعمال اور اسی طرح "فاعلین" کا لفظ۔

تفسیر

زمین کی حکومت صالحین کے لیے ہوگی۔

گزشتہ آیات میں صالح مومنین کے لیے اُخروی جزا کے ایک حصّے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد، زیر بحث آیات میں نہایت عمدگی اور فصاحت سے ان کی ایک واضح دُنیاوی جزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے زمین کی حکومت ۔۔۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے "زبور" میں "ذکر" کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ آخر کار میرے صالح بندے زمین (کی حکومت) کے وارث ہو جائیں گے۔ (ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون)۔

"ارض" سارے کرۂ زمین کو کہا جاتا ہے اور سارا جہان اس میں شامل ہے، مگر یہ کہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو۔ اگرچہ بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد قیامت میں ساری زمین کا وارث ہونا ہے لیکن لفظ "ارض" کا ظاہری معنی جب کہ یہ مطلق طور پر بولا جائے، اس جہان کی زمین ہی ہوتا ہے۔

لفظ "ارث" جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، اس چیز کے معنی میں ہے کہ جو بغیر معاملہ اور خرید و فروخت کے کسی کی طرف منتقل ہو اور کبھی قرآن مجید میں "ارث" ایک صالح قوم کے غیر صالح قوم پر تسلط اور کامیابی، اور ان کے تمام سرمائے و وسائل کو اپنے قبضہ اور اختیار میں لینے کے لیے بولا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیہ ۱۳۷ میں بنی اسرائیل کی فرعونیوں پر کامیابی کے بارے میں بیان ہوا ہے:

واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض و مغاربھا

ہم نے زمین کے مشرق و مغرب کو، اس مستضعف قوم کی میراث میں دے دیا۔

اگرچہ "زبور" اصل میں ہر قسم کی کتاب اور تحریر کے معنی میں ہے۔ قرآن مجید میں تین مواقع میں سے دو موقعوں پر یہ لفظ حضرت داؤدؑ کی زبور کی طرف اشارہ ہے لیکن بعید نہیں کہ تیسرے موقع پر یعنی زیر بحث آیت میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو۔

"زبورِ داؤدؑ" یا "عہد قدیم" کی کتابوں کی تعبیر میں "مزامیر داؤدؑ" اللہ کے نبی حضرت داؤدؑ کی نصیحتوں، دعاؤں اور مناجات کا ایک مجموعہ ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "زبور" سے مراد یہاں گزشتہ انبیاءؑ کی تمام کتب ہیں۔[1]

لیکن مذکورہ دلیل کے پیش نظر ۔۔۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ "زبور" سے مراد "مزامیر داؤدؑ" ہی ہے۔ خاص طور پر جب کہ موجودہ مزامیر میں ایسی عبارتیں ملتی ہیں کہ جو زیر بحث آیت سے بالکل مطابقت رکھتی ہیں۔ انشاء اللہ ان کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

"ذکر" دراصل یاد آوری یا اُس چیز کے معنی میں ہے جو تذکر و یاد آوری کا باعث بنے۔ قرآن کی آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کبھی حضرت موسیٰؑ کی آسمانی کتاب یعنی تورات پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے مثلاً سورہ انبیاء کی آیہ ۴۸:

ولقد اٰتینا موسٰی و ھارون الفرقان وضیاء و ذکراً للمتقین

---

[1] یہ احتمال تفسیر مجمع البیان اور تفسیر فخر رازی نے چند گزشتہ مفسرین سے نقل کیا ہے۔

اور کبھی یہ لفظ قرآن کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ تکویر کی آیہ ۲۷ :

ان هو الا ذکر للعالمین

لہٰذا بعض نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں ذکر سے مراد قرآن ہے اور زبور سے مُراد تمام گزشتہ کتب ہیں اور "من بعد" کا لفظ، تقریباً فارسی کے لفظ " علاوہ بریں" کے ہم معنی ہے[1]۔ اس طرح سے آیت کا معنی یہ ہوگا :

> ہم نے قرآن کے علاوہ، تمام گزشتہ انبیاء کی کتابوں میں بھی لکھ دیا تھا کہ آخر کار تمام رُوئے زمین خدا کے صالح بندوں کے اختیار میں قرار پا جائے گی۔

لیکن آیت میں جو تعبیرات استعمال ہوئی ہیں ان کی طرف توجہ کرتے ہوئے ظاہر یہ ہے کہ زبور سے مراد حضرت داؤدؑ کی کتاب ہی ہے اور " ذکر" تورات کے معنی میں ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زبور تورات کے بعد تھی تو "من بعد" کی تعبیر بھی حقیقی ہی ہوگی اور اس طرح آیت کا معنی یوں ہوگا :

> ہم نے تورات کے بعد، زبور میں یہ لکھ دیا تھا کہ اس زمین کی میراث ہمارے صالح بندوں تک پہنچے گی۔

یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آسمانی کتابوں میں سے صرف اِنہی دو کتابوں کا نام کیوں لیا گیا ہے؟

ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ حضرت داؤدؑ ان بزرگ ترین پیغمبروں میں سے ایک تھے کہ جنہوں نے حق اور عدالت کی حکومت قائم کی اور بنی اسرائیل بھی وہ مستضعف قوم تھے کہ جنہوں نے مستکبرین کے خلاف قیام کیا اور ان کے اقتدار کو ختم کرکے ان کی حکومت اور سرزمین کے وارث ہوگئے۔

ایک اور سوال کہ جو یہاں باقی رہ جاتا ہے، یہ ہے کہ خدا کے صالح بندے (عبادی الصالحون) کون ہیں؟

بندوں کی خدا کی طرف اضافت پر توجہ کرتے ہوئے، ان کے ایمان اور توحید کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے اور لفظ " صالحین" کی طرف توجہ کرنے سے جو کہ ایک وسیع معنیٰ رکھتا ہے، تمام اہلیتیں اور لیاقتیں ذہن میں آجاتی ہیں۔ عمل و تقویٰ کے لحاظ سے اہلیت، علم و آگاہی کے لحاظ سے اہلیت، قدرت و قوت کے لحاظ سے اہلیت اور تدبیر و نظم و ضبط اور اجتماعی شعور کے لحاظ سے اہلیت۔

جس وقت صاحب ایمان بندے اس قسم کی اہلیتیں پالیں، تو خدا بھی کمک اور مدد کرتا ہے تاکہ وہ مستکبرین کو شکست دے سکیں، ان کے آلودہ ہاتھوں کو زمین کی حکومت سے ہٹا سکیں اور ان کی میراثوں کے وارث بن جائیں۔

اس بناء پر صرف " مستضعف" ہونا دشمنوں پر کامیابی اور رُوئے زمین کی حکومت کے لیے کافی نہیں ہوگا بلکہ ایک طرف ایمان ضروری ہے اور دوسری طرف اہلیتوں کا حصول۔ مستضعفین جہان جب تک ان دو اصولوں کو زندہ نہیں کریں گے، رُوئے زمین کی حکومت تک نہیں پہنچ سکتے۔

---

[1] اصطلاحی علمی تعبیر کے مطابق " بعد" کی لفظ یہاں " بعد" رتبی ہے نہ کہ " بعد" زمانی۔ اُردو میں " من بعد" کا متبادل " علاوہ ازیں" یا " اس کے علاوہ" ہے۔

اس لیے بعد والی آیت میں مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: اس بات میں ان لوگوں کے لیے کہ جو خدا کی اخلاص کے ساتھ عبادت کرتے ہیں، ایک واضح اور روشن ابلاغ ہے (ان فی ھذا لبلاغاً لقوم عابدین)۔

بعض مفسرین لفظ "ھذا" کو اُن تمام وعدوں اور وعیدوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جو اس سورہ میں ہیں یا سارے قرآن میں ہیں۔

لیکن آیہ کا ظاہر یہ ہے کہ "ھذا" اسی وعدہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو گزشتہ آیت میں خدا نے اپنے صالح بندوں سے رُوئے زمین کی حکومت کے بارے میں کیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **قیام مہدیؑ کے سلسلہ میں روایات:** بعض روایات میں یہ آیت صراحت کے ساتھ حضرت امام مہدیؑ کے یار و انصار کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ جیسا کہ مجمع البیان میں امام محمّد باقر علیہ السلام سے اسی آیت کے ذیل میں منقول ہے:

ھم اصحاب المھدی فی آخر الزمان:

وہ صالح بندے کہ جن کا خدا نے اس آیت میں وارثانِ زمین کے عنوان سے ذکر کیا ہے وہ آخری زمانے میں مہدی کے اصحاب و انصار ہیں۔

تفسیر قمی میں بھی اس آیت کے ذیل میں ہے:

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون، قال القائم واصحابہ

اس سے مراد کہ زمین کے وارث خدا کے صالح بندے ہوں گے، مہدی قائمؑ اور ان کے اصحاب ہیں۔

بغیر کہے یہ بات واضح ہے کہ یہ روایات اسی ایک عالی اور آشکار مصداق کا بیان ہیں۔ ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ یہ تفاسیر ہرگز آیت کے مفہوم کی عمومیت کو محدود نہیں کرتیں۔

لہٰذا جس زمانے میں بھی اور جس جگہ بھی خدا کے صالح بندے اُٹھ کھڑے ہوں گے تو وہ کامیاب ہوں گے اور آخرکار زمین اور اس کی حکومت کے وارث ہو جائیں گے۔

مندرجہ بالا روایات تو خصوصیت سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی شیعہ سُنی کتب میں حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی بہت زیادہ روایات ہیں جو پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہل بیتؑ سے منقول ہیں: اور سب کی سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آخرکار اس جہان کی حکومت صالحین کے ہاتھ آجائے گی اور خاندانِ پیغمبرؐ سے ایک شخص قیام کرے گا کہ جو زمین کو عدل و داد سے اس طرح سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔

ان میں سے ایک یہ مشہور حدیث ہے جو اکثر منابع اسلامی میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے:

لو لم یبق من الدنیا الا یوم، لطول الله ذلك الیوم حتی یبعث رجلًا (صالحًا) من اھل بیتی یملأ الارض عدلًا وقسطًا کما ملئت ظلمًا وجورًا۔

"اگر دنیا کی عمر میں سے ایک ہی دن باقی رہ جائے، تو بھی خدا اس دن کو اس قدر طولانی کر دے گا کہ میرے خاندان میں سے ایک مرد صالح کو مبعوث کرے گا کہ جو صفحۂ زمین کو اس طرح سے عدل و انصاف سے معمور کر دے گا کہ جس طرح سے وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔"

یہ حدیث انھی الفاظ میں یا تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بہت سی شیعہ اور اہل سنّت کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔[1]

ہم سورہ توبہ کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں کہ بہت سے بزرگ شیعہ سنی علماء متقدمین و متاخرین نے اپنی اپنی کتابوں میں اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قیام مہدی کے سلسلہ کی احادیث حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اور کسی طرح سے بھی قابل انکار نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس بارے میں خصوصیت کے ساتھ کتابیں لکھی ہیں کہ جن کی تفصیل آپ تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد سورہ توبہ کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

۲۔ مزامیر داؤدؑ میں صالحین کی حکومت کی بشارت: قابل توجہ بات یہ ہے کہ کتاب مزامیر داؤد میں کہ جو اس وقت کتب عہدِ قدیم کا حصہ ہے بالکل وہی تعبیر کہ جو مندرجہ بالا آیات میں بیان ہوئی ہے یا اُس سے ملتی جلتی کئی مقام پر دکھائی دیتی ہے۔ یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان تمام تحریفات کے باوجود کہ جو ان کتابوں میں کی گئی ہیں، یہ حصہ اس طرح کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا ہے مثلاً:

۱۔ مزمور ۳۷ جملہ ۹ میں ہے:

"۔۔۔ کیونکہ شریر منقطع ہو جائیں گے لیکن خدا پر توکل کرنے والے زمین کے وارث ہوں گے اور عنقریب شریر نیست و نابود ہو جائیں گے۔ تو اس کی جگہ کے بارے میں جتنا بھی پوچھے گا کچھ معلوم نہ ہوگا۔"

۲۔ اور اسی مزمور میں دوسری جگہ (جملہ ۱۱) میں ہے:

"لیکن انکسار و تواضع سے زمین کے وارث ہو کر بڑی سلامتی پائیں گے۔"

۳۔ اور اسی مزمور ۳۷ کے جملہ ۲۷ میں یہ موضوع ایک اور تعبیر کے ساتھ بھی دکھائی دیتا ہے:

"کیونکہ متبرکانِ خدا زمین کے وارث ہو جائیں گے لیکن اس کے ملعونین منقطع ہو جائیں گے ۔۔۔"

۴۔ اسی مزمور کے جملہ ۲۹ میں ہے:

"صدیقین زمین کے وارث ہو جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔"

۵۔ اور اسی مزمور کے جملہ ۱۸ میں ہے:

---

[1] مزید معلومات کے لیے کتاب "منتخب الاثر" اور "نورالابصار" کی طرف رجوع کریں۔

خدا صالحین کے دلوں کو جانتا ہے اور ان کی میراث ابدی ہوگی [1]

یہاں پر ہم خوب دیکھ رہے ہیں کہ وہی صالحین کا لفظ کہ جو قرآن میں آیا ہے مزامیر داؤد میں بھی نظر آرہا ہے اس کے علاوہ دوسری تعبیریں "صدیقین"، "متوکلین"، "متبرکین" اور "متواضعین" کہ جو اس تعبیر کے ساتھ ملتے جلتے ہیں، وہ بھی دوسرے جملوں میں مذکور ہیں۔

یہ تعبیریں صالحین کی عمومی حکومت کی دلیل ہیں اور قیام مہدی کی احادیث کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتی ہیں۔

۳۔ **صالحین کی حکومت ایک قانونِ آفرینش ہے:** اگرچہ یہ بات ان لوگوں کے لیے کہ جنہوں نے زیادہ تر ظالموں جابروں اور سرکشوں کی حکومتوں کو ہی دیکھا ہے، اس حقیقت کو آسانی کے ساتھ قبول کرنا مشکل ہے کہ یہ سب حکومتیں قوانینِ جہانِ خلقت کے برخلاف ہیں اور جو ان قوانین سے ہم آہنگ ہے وہ صرف صاحب ایمان صالحین کی حکومت ہے۔

لیکن منطقی اور فلسفی تجزیوں کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے۔ لہٰذا "ان الارض یرثها عبادی الصالحون" کا جملہ اس سے پہلے کہ ایک خدائی وعدہ ہو ایک قانونِ تکوینی بھی شمار ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے جہانِ ہستی مختلف نظاموں کا مجموعہ ہے۔ اس پورے عالم میں منظم اور عمومی قوانین کا وجود اس نظام کی یگانگت اور ہم پیوستگی کی دلیل ہے۔

عالمِ آفرینش کی وسعت میں نظم، قانون اور حساب کا مسئلہ، اس عالم کے اساسی ترین مسائل میں سے ایک ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کئی سوطاقتور کمپیوٹر مل کر خلائی سفر کے لیے دقیق حساب کر رہے ہیں اور ان کے حسابات بالکل درست بیٹھتے ہیں اور چاند گاڑی اُسی پہلے سے مقررشدہ جگہ پر چاند میں جا اُترتی ہے حالانکہ چاند اور زمین کا کرہ دونوں بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں تو ہمیں اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے کہ اس بات کا اس طرح ہونا، نظامِ شمسی اور اس کے ستاروں اور چاند کے دقیق نظام کے ماتحت ہونے کا مرہونِ منت ہے کیونکہ اگر وہ ایک سیکنڈ کے سویں حصے کے برابر بھی اپنی منظم رفتار سے منحرف ہو جاتے، تو کچھ معلوم نہیں کہ خلائی مسافر کس مقام پر جا پڑتے۔

اب ہم اس بڑے جہان سے چھوٹے عالم اور اُس سے چھوٹے اور بہت ہی چھوٹے عالم میں آتے ہیں۔ یہاں پر خاص طور سے زندہ موجودات میں ایک نمایاں نظم موجود ہے اور اس میں حرج و مرج کی کوئی گنجائش نہیں ہے مثلاً انسان کے دماغ کے ایک خُلیے کی تنظیم کی خرابی اس بات کے لیے کافی ہے کہ اس کی زندگی کے تمام نظام کو بگاڑ دے۔

اخباروں میں ایک دفعہ یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک نوجوان طالب علم کو ٹریفک کا ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ اس میں وہ شدید دماغی دھچکے کا شکار ہوا تھا اور تقریباً اپنی تمام گزشتہ باتوں کو بھول گیا۔ جبکہ وہ دوسری طرف، ہر طرح صحیح و سالم تھا۔ اخبارات نے لکھا کہ وہ اپنے بھائی اور بہن کو بھی نہیں پہچانتا اور جب اس کی ماں اُسے اپنی آغوش میں لے کر پیار کرتی ہے تو وہ گھبراتا ہے کہ یہ اجنبی عورت میرے ساتھ کیا کر رہی ہے۔ اُسے اس کمرے میں لے جایا گیا کہ جہاں وہ پل کر بڑا ہوا ہے، وہاں وہ اپنے دستی کاموں اور اپنی کھینچی

---

[1] ان جملوں کو عموماً کتب عہد عتیق کے اس فارسی ترجمہ سے نقل کیا گیا ہے کہ جو ۱۸۷۸ء میں کلیسا کی معروف شخصیات کی زیرِ نگرانی شائع ہوا۔ برطانیہ میں ان شخصیات نے دوسرے ممالک کو بھیجنے کے لیے کتب مقدسہ کے ترجمے کیے تھے۔

ہوئی تصویروں کو دیکھتا ہے، لیکن کہتا ہے کہ میں اِس قسم کے کمرے اور تصویروں کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ شاید وہ یہ سوچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کُرّہ سے اس کُرّہ میں اتر آیا ہے کیونکہ تمام چیزیں اس کے لیے نئی ہیں۔

شاید اس کے دماغ کے کروڑوں سیلوں میں سے چند ارتباطی سیل کہ جو گزشتہ کو حال سے ملاتے ہیں بیکار ہو گئے تھے لیکن اسی جزوی تنظیم کے خراب ہونے نے کیا وحشتناک اثر دکھایا۔

تو کیا انسانی معاشرہ "لا نظام" ہرج و مرج، ظلم و ستم، اور ناہنجاری کو انتخاب کرکے، اپنے آپ کو جہانِ آفرینش کے اس عظیم سمندر سے الگ کر سکتا ہے؟ کہ جس میں سب کے سب منظم پروگرام کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

کیا جہان کی وضع عمومی کا مشاہدہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور نہیں کرتا کہ بشریت بھی خواہ مخواہ عالم ہستی کے نظام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے اور منظم اور عادلانہ نظام کو قبول کرے، اپنی اصلی راہ کی طرف پلٹ آئے اور اس نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے؟!

ہم ہر انسان کے بدن کی گوناں گوں اور پیچیدہ مشین کی ساخت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ دل و دماغ سے لے کر آنکھ، کان، زبان یہاں تک کہ بال کی ایک جڑ کو دیکھتے ہیں، یہ سب کے سب قوانین نظم اور ایک حساب کے تابع ہیں، تو اس حالت میں انسانی معاشرہ ضوابط و قوانین اور صحیح عادلانہ نظام کی پیروی کے بغیر کس طرح برقرار رہ سکتا ہے؟

ہم بقائے بشریت کے خواہاں ہیں اور اس کے لیے سعی و کوشش کرتے ہیں۔ البتہ ابھی تک ہمارے معاشرے کی سطح آگاہی اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ موجودہ راہ و روش کو جاری رکھنے کا انجام ہماری فنا اور نابودی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ ادراک اور شعور فکری ہمیں حاصل ہو جائے گا۔

ہم اپنے مفادات کے خواہاں تو ہیں لیکن ابھی تک ہم یہ نہیں جانتے کہ موجودہ حالت کو برقرار رکھنا، ہمارے مفادات کو برباد کر رہا ہے۔ البتہ آہستہ آہستہ جب ہم بیدار ہوں گے اور اسلحہ سازی پر غور کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ عالمی معاشروں کی آدھی فعال ترین فکری اور جسمانی قوتیں اور عالمی سرمائے کا آدھا حصہ اس راستہ میں رائیگاں جا رہا ہے۔ نہ صرف رائیگاں جا رہا ہے بلکہ دوسرے آدھے کو نابود کرنے کے کام میں لایا جا رہا ہے۔

سطح آگاہی بلند ہوگی تو ہم واضح طور پر جان لیں گے کہ ہمیں عالم ہستی کے عمومی نظام کی طرف پلٹنا چاہیئے اور اُس کے ساتھ ہم آواز ہونا چاہیئے۔

اور جس طرح سے کہ ہم واقعی طور پر اس کل کی ایک جز ہیں، عملی طور پر بھی ہمیں ایسا ہی ہونا چاہیئے تاکہ ہم تمام مسائل میں اپنے مقاصد تک پہنچ سکیں۔

نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ جہانِ انسانیت میں نظامِ آفرینش ہی آئندہ زمانے میں ایک صحیح اجتماعی نظام کو قبول کرنے کے لیے ایک روشن دلیل بنے گا اور یہ وہی چیز ہے کہ جو زیر بحث آیت اور "عالم کے مصلح عظیم" (مہدیؑ ارواحنا فداہ) کے قیام سے مربوط احادیث سے معلوم ہوتی ہے۔[1]

---

[1] یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ بحث سال ۱۴۰۲ھ کے ماہ شعبان کی پندرہویں رات۔ جو ولادت باسعادت حضرت مہدی امام زمانہ (ارواحنا لہ الفداہ) کی رات ہے، کو لکھی گئی ہے۔ ہم اس بخش کو ایسے وقت میں لکھ رہے ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائی خوشیاں منا رہے ہیں۔ ایک تو حضرت مہدیؑ کے میلادِ مسعود کی اور دوسری ان نمایاں کامیابیوں کی کہ جو لشکر اسلام کو محاذِ جنگ پر نصیب ہوئی ہیں اور ہم خدا کا ان سعادتوں کے لئے پر شکر ادا کرتے ہیں۔

۱۰۷۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۝

۱۰۸۔ قُلۡ اِنَّمَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ‌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۝

۱۰۹۔ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ اٰذَنۡتُكُمۡ عَلٰى سَوَآءٍ‌ ؕ وَاِنۡ اَدۡرِىۡۤ اَقَرِيۡبٌ اَمۡ بَعِيۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ۝

۱۱۰۔ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَـهۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا تَكۡتُمُوۡنَ ۝

۱۱۱۔ وَاِنۡ اَدۡرِىۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ۝

۱۱۲۔ قٰلَ رَبِّ احۡكُمۡ بِالۡحَـقِّ‌ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحۡمٰنُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ ۝

ترجمہ

۱۰۷۔ اور ہم نے تجھے عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

۱۰۸۔ تم کہہ دو کہ مجھے تو صرف یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا معبود خدائے یگانہ ہے تو کیا (اس حالت میں حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو گے (اور بتوں کو چھوڑ دو گے)۔

۱۰۹۔ اگر (ان تمام باتوں کے باوجود) وہ رُوگردانی کریں تو تم اُن سے یہ کہہ دو کہ میں تم سب کو یکساں طور پر عذابِ الٰہی سے خبردار کرتا ہوں اور میں یہ نہیں جانتا کہ (عذاب خدا کا) یہ وعدہ تمہارے نزدیک ہے یا دُور۔

۱۱۰۔ یقیناً وہ آشکار باتوں کو بھی جانتا ہے اور جسے تم چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہے (اور کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ہے)۔

۱۱۱۔ اور میں یہ نہیں جانتا کہ شاید یہ بات تمہارے لیے آزمائش ہو اور ایک (معین) مدت کے لیے فائدہ اُٹھانے کے لیے ہو۔

۱۱۲۔ اور (پیغمبر نے) کہا: پروردگارا! تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دے (اور ان سرکشوں کو سزا دے) اور ہمارا پروردگار ہی وہ رحمٰن ہے کہ جس سے میں تمہاری ناروا تہمتوں پر مدد طلب کرتا ہوں۔

تفسیر

عالمین کے لیے پیغمبرِ رحمت :

گزشتہ آیات صالح بندوں کو رُوئے زمین کی حکومت کی بشارت دے رہی تھیں، اور اس قسم کی حکومت تمام جہانوں کے لیے باعثِ رحمت ہے، اس لیے پہلی زیرِ بحث آیت میں وجودِ پیغمبرؐ کے رحمتِ عامہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر عالمین کے لیے رحمت بنا کر (وما ارسلناك الا رحمة للعالمين)۔

دُنیا کے سبھی لوگ خواہ وہ مومن ہوں یا کافر تیری رحمت کے ممنون ہیں کیونکہ تو نے ایسے دین و آئین کی ترویج اپنے ذمہ لی ہے جو سب کی نجات کا سبب ہے۔ اب اگر کچھ لوگوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا ہے اور کچھ نے نہیں اُٹھایا، تو یہ بات خود انہیں سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا تیری رحمت کے عمومی ہونے پر کوئی اثر نہیں ہے۔

یہ بالکل اس طرح ہے کہ ایک ساز و سامان سے آراستہ ہسپتال تمام بیماریوں کے علاج کے لیے بنایا جائے جس میں ہر قسم کی دوائیاں اور ماہر طبیب اور ڈاکٹر موجود ہوں اور اس کے دروازے تمام لوگوں کے لیے بلا کسی امتیاز کے کھول دیئے جائیں تو کیا یہ اس معاشرے کے تمام لوگوں کے لیے وسیلۂ رحمت نہیں ہے؟ اب اگر بعض ہٹ دھرم بیمار اس فیضِ عام کو خود سے قبول کرنے سے انکار کر دیں تو اس مرکزِ شفا کے عمومی ہونے پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔

دوسرے لفظوں میں پیغمبر اکرمؐ کے وجود کا تمام جہانوں کے لیے رحمت ہونا تو فاعل کی فاعلیت کے مقتضی ہونے کا پہلو رکھتا ہے لیکن مسلمہ طور پر فعلیت تبھی نتیجہ خیز ہوتی ہے جب قبول کرنے والے میں قبول کرنے کی قابلیت بھی ہو۔

"عالمین" کی تعبیر ایسا وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جس میں تمام ادوار کے تمام انسان شامل ہیں اسی لیے اس آیت کو پیغمبرِ اسلامؐ کی خاتمیت کے لیے بھی اشارہ سمجھا گیا ہے کیونکہ آپؐ کا وجود آئندہ کے تمام انسانوں کے لیے عالم کے اختتام تک رحمت ہے اور رہبر و پیشوا و مقتدا ہے اور ایک لحاظ سے تو یہ رحمت فرشتوں کے لیے بھی ہے۔

اس سلسلے میں ایک عمدہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ جو اس عمومیت کی تائید کرتی ہے، حدیث یہ ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے جبرئیلؑ سے پوچھا :

هل اصابك من هـذه الرحمة شيء

کیا اس رحمت کا کچھ فائدہ تمہیں بھی پہنچا؟

تو جبرئیل نے جواب میں عرض کیا :

اني كنت اخشى عاقبة الامر، فامنت بك، لما اثنى الله علي بقوله عند ذي العرش مكين

میں اپنے انجام سے ڈرتا تھا لیکن ایک آیت کی وجہ سے کہ جو آپ پر قرآن میں نازل ہوئی ہے

میں اپنی حالت سے مطمئن ہوگیا ہوں، کیونکہ خدا نے میری اس جملہ کے ساتھ مدح کی ہے :

ذی قوۃ عند ذی العرش مکین (جبرئیل خدا کے ہاں کہ جو خالق عرش ہے بلند مقام و مرتبہ رکھتا ہے)[1]

بہرحال موجودہ دُنیا کہ جس کے در و دیوار سے فساد ، تباہی اور ظلم و ستم کی بارش ہو رہی ہے، جنگوں کے شعلے ہر جگہ بھڑک رہے ہیں اور ظالم قوتوں کا چنگل مظلوم مستضعفین کے گلے دبا رہا ہے، اس دنیا میں کہ جس میں جہالت ، اخلاقی تباہی ، خیانت ، ظلم و استبداد اور طبقاتی تفاوت نے ہزاروں قسم کی مشکلات اور مصیبتیں پیدا کر دی ہیں ــ ہاں ! ہاں ! ایسے جہان میں پیغمبر اکرمؐ کے "رحمۃ للعالمین" ہونے کا مفہوم ہر دور سے زیادہ آشکار اور واضح ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا رحمت ہوگی کہ آپؐ ایک ایسا پروگرام لے کر آئے ہیں جس پر عمل سے یہ تمام نامرادیاں، بدبختیاں اور سیاہ کاریاں ختم ہوسکتی ہیں۔

ہاں ! ہاں! وہ بھی اور ان کے احکام بھی، آپؐ کا پروگرام اور آپؐ کا اخلاق بھی سب کے سب رحمت ہیں۔ ایسی رحمت کہ جو سب کے لیے ہے اور اس رحمت کی بقا و دوام کا نتیجہ تمام کرۂ زمین پر صاحبانِ ایمان صالحین کی حکومت ہوگا ۔

⁂

اور چونکہ رحمت کا اہم ترین مظہر اور اس کی محکم ترین بنیاد، مسئلہ توحید اور اس کے جلوے ہیں لہٰذا اگلی آیت میں فرمایا گیا :

تم یہ کہہ دو کہ مجھ پر تو یہی وحی ہوئی ہے کہ تمہارا معبود تو ایک ہی معبود ہے (قل انما یوحیٰ الیّ انما الٰھکم اِلٰہ واحد)۔

تو کیا تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ اس بنیادی اصل یعنی توحید کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو اور بتوں کو چھوڑ دو (فھل انتم مسلمون)۔

درحقیقت اس آیت میں تین بنیادی نکات پیش کیے گئے ہیں :

پہلا نکتہ یہ ہے کہ رحمت کی حقیقی بنیاد توحید ہے اور سچ بات یہ ہے کہ ہم جتنا بھی غور و فکر کریں گے اتنا ہی یہ قوی رابطہ واضح تر اور روشن تر ہوتا جائے گا ۔ اعتقاد میں توحید، عمل میں توحید ، صفوں میں توحید ، قانون میں توحید ، غرضیکہ ہر چیز میں توحید ۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ لفظ " انما " کے تقاضے کے مطابق کہ جو حصر پر دلالت کرتا ہے، اسلام کے پیغمبرؐ کی تمام دعوت کا خلاصہ ، اصل توحید ہے۔ گہرا مطالعہ بھی اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اصولِ دین میں بلکہ فروع و احکام تک میں بھی آخر کار توحید ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور اسی بنا پر ــ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے ــ توحید صرف اصولِ دین کی ایک اصل ہی نہیں بلکہ یہ ایک مضبوط دھاگے کی مانند ہے کہ جو تسبیح کے دانوں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں ایک رُوح ہے کہ جو دین کے بدن میں پھونکی گئی ہے ۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ تمام معاشروں اور قوموں کی اصل مشکل مختلف شکلوں میں شرک سے آلودگی ہے۔ کیونکہ "فھل انتم مسلمون" (کیا اس اصل کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہو) کا جملہ یہ بتاتا ہے کہ اصل مشکل شرک اور شرک کے مظاہر سے باہر آنا اور بتوں کو توڑنے کے لیے آستینیں چڑھانا ہے ۔ نہ صرف پتھر اور لکڑی کے بتوں کو، بلکہ ہر قسم کے بتوں کو، خصوصاً انسانی طاغوتوں کو توڑنے کے لیے

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

بعد والی آیت کہتی ہے کہ اگر ان تمام باتوں کے باوجود وہ ہماری دعوت اور پیغام کی طرف توجہ نہ کریں اور رُوگردانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم سب کو یکساں طور پر عذابِ الٰہی کے خطرے سے آگاہ کرتا ہوں (فان تولوا فقل اٰذنتکم علی سواء)۔

" اٰذنت " مادہ " ایذان " سے خبردار کرنے کے معنی میں ہے جس کے ساتھ تہدید موجود ہو اور بعض اوقات یہ لفظ اعلانِ جنگ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی تھی اور وہاں نہ تو جہاد کے لیے زمین ہموار تھی اور نہ ہی حکم جہاد نازل ہوا تھا، لہذا یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ یہ جملہ یہاں پر اعلانِ جنگ کے معنی میں ہو۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اس بات سے یہ چاہتے ہیں کہ اُن سے اعلانِ نفرت و علیٰحدگی کریں۔

" علی سواء " کی تعبیر یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مَیں خدا کی سزا اور عذاب کے خطرے سے تم سب کو یکساں طور پر خبردار کرتا ہوں تاکہ وہ یہ تصور نہ کرلیں کہ اہل مکہ یا قریش اور دوسروں میں کوئی فرق ہے اور خدا کی بارگاہ میں انہیں کوئی بڑائی یا برتری حاصل ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میں اپنی آواز تم سب کے کانوں تک بغیر کسی استثنا کے پہنچا چکا ہوں۔

پھر اسی تہدید کو اور زیادہ آشکار صورت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : مَیں نہیں جانتا کہ عذاب کا وہ وعدہ کہ جو تم سے کیا گیا ہے، قریب ہے یا دُور : (وان ادری اقریب ام بعید ماتوعدون)۔

یہ خیال نہ کرنا کہ یہ وعدہ دُور ہے، شاید نزدیک ہو اور بہت ہی نزدیک ہو۔

یہ عذاب اور سزا کہ جس کی یہاں انہیں تہدید کی گئی ہے، ممکن ہے کہ عذابِ قیامت ہو یا دُنیا کی سزا اور یا یہ دونوں ہی ہوں پہلی صورت میں اس کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی بھی شخص ٹھیک طور پر وقوعِ قیامت کی تاریخ سے آگاہ نہیں ہے حتیٰ کہ خدا کے پیغمبر بھی۔

اور دوسری اور تیسری صورت میں ممکن ہے کہ اس کی جزئیات اور زمانے کے بارے میں اشارہ ہو، کہ میں ان جزئیات سے آگاہ نہیں ہوں کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم اس قسم کے حادثات کے بارے میں ہمیشہ فعلی پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ بعض اوقات ارادی پہلو رکھتا ہے یعنی جب تک ارادہ نہ کریں نہیں جانتے[1]

یہ تصور بھی اپنے ذہنوں میں نہ پھٹکنے دو کہ اگر تمہاری سزا میں کچھ تاخیر ہوجائے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ خدا تمہارے اعمال اور تمہاری باتوں سے آگاہ نہیں ہے۔ نہیں! ایسا نہیں ہے! وہ سب کچھ جانتا ہے " وہ تمہاری آشکار باتوں کو بھی جانتا ہے اور اُن باتوں کو بھی کہ جنہیں تم چھپاتے ہو " (انہ یعلم الجھر من القول ویعلم ما تکتمون)۔

اصولی طور پر پنہاں و آشکار، تمہارے لیے تو مفہوم رکھتا ہے کیونکہ تمہارا علم محدود ہے — لیکن اس ذات کے لیے کہ جس کا علم بے پایاں اور لامتناہی ہے، غیب و شہود ایک ہے اور پوشیدہ اور اعلانیہ یکساں ہے۔

* * *

علاوہ ازیں اگر تم یہ دیکھ رہے ہو کہ خدائی سزا فوری طور پر تمہارے دامن گیر نہیں ہو رہی تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے

---

[1] مزید وضاحت کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے معصوم جانشینوں کے بارے میں " کتاب رہبرانِ بزرگ و مسئولیتہائے بزرگ تر " کا مطالعہ کریں۔

کام سے آگاہ نہیں۔ مجھے کیا معلوم؟ شاید یہ تمہاری آزمائش کے لیے ہو" (وان ادری لعلہ فتنۃ لکم)۔

"اور وہ چاہتا ہے کہ تمہیں اس دُنیا کی لذتوں سے ایک مدت تک بہرہ مند کرے" اور اس کے بعد تم سے ہر چیز لے لے اور جزا دے (ومتاع الی حین)۔

درحقیقت یہاں خدائی سزاؤں کی تاخیر کے دو فلسفے بیان ہوئے ہیں۔

پہلا فلسفہ امتحان و آزمائش ہے۔ خدا ہرگز عذاب میں جلد بازی نہیں کرتا تا کہ مخلوق کی کافی حد تک آزمائش کرلے اور اتمام حجت کر دے

دوسرا فلسفہ یہ ہے کہ کچھ ایسے افراد ہیں کہ جن کی آزمائش تو مکمل ہو چکی ہے اور ان کی سزا کا فیصلہ قطعی ہو چکا ہے لیکن اس غرض سے کہ انہیں سخت سے سخت سزا ہو، اپنی نعمت کو اُن پر وسیع کر دیتا ہے تا کہ وہ پوری طرح نعمت میں غرق ہو جائیں اور ٹھیک اسی حالت میں جب کہ وہ نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں عذاب کے تازیانے اُن پر پڑنے لگیں تا کہ وہ اور بھی زیادہ دردناک اور تکلیف دہ محسوس ہوں اور محروموں اور ستم دیدہ لوگوں کی تکلیفوں کا اچھی طرح احساس کریں۔

⁂

آخری زیر بحث آیت کہ جو سورۂ انبیاء کی بھی آخری آیت ہے، اس سورت کی پہلی آیت کی طرح بے خبر لوگوں کی غفلت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول نقل کیا گیا ہے:

اس سے ان لوگوں کے غرور اور غفلت کے بارے میں آپ کی ناراضگی اور پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پیغمبر نے ان کی تمام رُوگردانیوں اور اعراض کو دیکھنے کے بعد "عرض کیا: میرے پروردگار! اب حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور اس سرکش گروہ کو اپنی عدالت کے قانون کے مطابق سزا دے" (قال رب احکم بالحق)[1]

دوسرے جملے میں رُوئے سخن مخالفین کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"ہم سب کا پروردگار خدائے رحمٰن ہے اور ہم اس کی مقدس بارگاہ میں اُن ناروا تہمتوں پر کہ جو تم اس کی طرف دیتے ہو، اسی سے مدد مانگتے ہیں" (وربنا الرحمٰن المستعان علی ما تصفون)۔

درحقیقت لفظ "ربنا" انہیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ ہم سب کے سب مربوب مخلوق ہیں اور وہ ہم سب کا خالق و پروردگار ہے۔

لفظ "الرحمٰن" کہ جو پروردگار کی رحمت عامہ کی طرف اشارہ ہے، انہیں یہ بات سمجھا رہا ہے کہ تمہارے سارے وجود کو خدا کی رحمت نے گھیر رکھا ہے، تو پھر ایک لمحے کے لیے ان سب نعمتوں اور رحمتوں کے پیدا کرنے والے کے بارے میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟

اور "المستعان علی ما تصفون" کی تعبیر انہیں اس بات پر خبردار کر رہی ہے کہ یہ گمان نہ کر لینا کہ ہم تمہاری جمعیت کی کثرت کے مقابلہ میں تنہا ہیں اور یہ تصور بھی کر لینا کہ تمہاری یہ سب تہمتیں اور جھوٹ اور ناروا نسبتیں چاہے وہ خدا کی ذات پاک کی طرف ہوں یا ہماری طرف ان کا جواب ضرور دیا جائے گا۔ کیونکہ ہم سب کی پناہ گاہ وہی ہے اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ اپنے مومن بندوں کا ہر قسم کے جھوٹ اور تہمتوں کے مقابلہ میں دفاع کرے۔

---

[1] اس میں شک نہیں کہ خدا کا ہر حکم حق کے مطابق ہے لہٰذا "بالحق" یہاں توضیحی پہلو رکھتا ہے۔

اختتام

پروردگارا ! جس طرح تونے اپنے پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے قلیل ساتھیوں کو ان کے کثیر دشمنوں کے مقابلے میں اکیلا نہیں چھوڑا ، ہمیں بھی مشرق و مغرب کے ان دشمنوں کے مقابلے میں تنہا نہ رہنے دے کہ جنہوں نے ہماری تباہی کے لیے ایکا کرلیا ہے۔

خداوندا ! تونے اس پُر برکت سورت میں اپنی خاص رحمت کا ذکر کیا ہے کہ جو تُو نے اپنے پیغمبروں پر سخت اور بحرانی مواقع میں اور زندگی کے طوفانوں کے مقابلہ میں کی ۔

بارِالٰہا ! ہم بھی اس زمانے میں ایسے طوفانوں میں گرفتار ہیں اور اسی رحمت اور کشائش کے منتظر ہیں ۔ آمین یارب العٰلمین

اسی پر ——

سُورۂ انبیاء اختتام پذیر ہوئی —— جمعۃ المبارک

تفسیر نمونہ —— جلد ۱۳

کا ترجمہ —— راقم پرتقصیر کے ہاتھوں

اختتام کو پہنچا

بوقت —— ۱۰ بجے دن

بروز —— منگل

بتاریخ —— ۳۰ راکتوبر ۱۹۸۴

بر مکان —— شیخ پرویز انور

بمقام —— مانچسٹر، محلہ کرسٹل ۸۹ الینڈر روڈ، انگلستان

والحمد للہ اولاً و آخراً ولہ الشکر ابداً وسرمداً
والصلوٰۃ والسلام علیٰ محمد وآلہ الطاہرین

سید صفدر حسین نجفی

ابن

سید غلام سرور نقوی مرحوم



سورۂ حج

مدینہ میں نازل ہوئی

اس کی ۷۸ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ حج کے مضامین اور مطالب

اس سورت کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں حج کے بارے میں کچھ آیات ہیں۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے، جن کے مکی یا مدنی ہونے میں مفسرین اور مورخین قرآن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اس سورت کو ماسوائے چند آیات کے مکی سمجھتے ہیں جبکہ بعض دوسرے اس کے برعکس خیال رکھتے ہیں۔

اگر ہم مکی اور مدنی سورتوں کے مطالب ومفاہیم، دونوں جگہوں کے ماحول مسلمانوں کی ضروریات اور اسی لحاظ سے پیغمبر اکرمؐ کی تعلیمات کو ذہن میں رکھ کر غور کریں تو فوراً واضح ہو جاتا ہے کہ اس سورت کی بعض آیات مدنی سورتوں میں پائی جانے والی آیات سے مشابہ ہیں۔ جیسے حج اور جہاد کے احکامات اور تفصیلات جن کا تعلق مسلمانوں کی مدنی زندگی اور ضروریات سے ہے اور بعض آیات مکی سورتوں میں پائی جانے والی آیات جیسی ہیں۔ مثلاً ابتدائے خلقت اور قیامت کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔

"تاریخ القرآن" کا مولف فہرست ابن ندیم اور نظم الدار، دو تاریخی کتب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ سورۂ حج ماسوائے چند آیات کے مدینہ میں نازل ہوئی اور وہ چند آیات بھی مکہ ومدینہ کے درمیان نازل ہوئیں۔ ترتیب نزولی میں اس سورت کا نمبر ایک سو چھ ہے یہ سورت سورۂ نور کے بعد اور سورۂ منافقین سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

بہر حال مجموعی طور پر اس سورہ کا مدنی ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مطالب اور مضامین کے اعتبار سے اس سورت کی مندرجہ ذیل تقسیم کی جاسکتی ہے۔

۱۔ قیامت کا بیان بہت سی آیات اس مضمون کی حامل ہیں، ان میں قیامت کا منطقی استدلال اور غافل لوگوں کو جوابدہی کی وعید موجود ہے۔ غرضیکہ ابتدائی آیات اس بارے میں ہیں۔

۲۔ شرک اور مشرکین کا بیان آیات کا دوسرا حصہ شرک اور مشرکین کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے سے متعلق ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے حوالے سے انسان کی توجہ خالق کی عظمت کی طرف دلائی گئی ہے۔

۳۔ عذاب الٰہی کا بیان آیات کا ایک حصہ گزشتہ اقوام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدید عذاب اور ان کے عبرتناک انجام کے مطالعے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان اقوام میں سے خاص طور پر قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط، قوم شعیب اور قوم موسیٰ کا انجام یاد دلایا گیا ہے۔

۴۔ حج کا بیان آیات کا چوتھا حصہ حج کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں حج کا تاریخی پس منظر، حضرت ابراہیمؑ سے لے کر طلوع اسلام

تک حج کی تاریخ، مسئلہ قربانی اور طواف کے احکامات واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں۔

۵۔ ظالموں کے خلاف قیام کا بیان آیات کا ایک اور حصہ جابروں اور ظالموں کے خلاف اٹھنے اور دشمنوں کی جارحیت سے پنٹنے کے بارے میں ہے۔

۶۔ فروعِ دین کا بیان آیات کا آخری حصہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق وعظ و نصیحت پر مشتمل ہے، اس میں نماز اور زکوٰۃ کی ترغیب دی گئی ہے، بھلائی کی تلقین، برائی پر تنبیہ اور توکل علی اللہ کی طرف رغبت دلائی گئی ہے

اس سورت کی تلاوت کے فضائل

اسلام کے گرامی قدر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک کجہ حدیث مروی ہے۔

من قرء سورة الحج اعطی من الاجر کحجة حجها وعمرة اعتمرها بعدد من حج واعتمر فیما مضی وفیما بقی۔

جو بھی سورۂ حج کی تلاوت کرے اللہ اسے ان تمام لوگوں کی تعداد کے برابر اجر و ثواب عطا کرے گا جو گذشتہ زمانے میں حج و عمرہ بجا لائے اور جو آئندہ بجا لائیں گے۔[1]

اس میں شک نہیں کہ یہ کثیر ثواب اور عظیم درجہ صرف لفظی تلاوت سے حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ فکر ساز تلاوت سے حاصل ہوگا، ایسی فکر جو عمل پرور ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی اس سورت میں مندرج مبدا، و معاد کے نظریات کو دل کی گہرائیوں سے مانے، اخلاقیات، عبادات کو جان و دل سے اپنائے اور متکبر و ظالم طاقتوں کے خلاف جہاد سے متعلق آیات کو اپنی عملی زندگی کا جزو بنائے۔ اس کا رُوحانی رشتہ تمام گذشتہ و آئندہ مومنین کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ ایسا رشتہ کہ جس سے یہ ان کے اعمال میں شریک ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس کے اعمال میں شریک ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ان کے ثواب میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ ایک حلقہ اتصال بن جاتا ہے جس میں ہر دور کے اہل ایمان شامل ہیں۔ اس تناظر میں مذکور بالا حدیث کا مضمون ہرگز عجیب معلوم نہیں ہوتا۔

---

[1] مجمع البیان سورۂ حج کی تفسیر کے آغاز میں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ○

۲۔ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ اے لوگو! اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرو، اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامت کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے۔

۲۔ جس دن یہ رُونما ہوگا تم دیکھو گے کہ (وحشت وخوف کا یہ عالم ہوگا کہ) شیر خوار بچوں کی ماؤں کو بچوں کا ہوش نہیں رہے گا اور ہر حاملہ عورت کا حمل ساقط ہو جائے گا۔ اور تجھے یوں لگے گا گویا لوگ مدہوش ہوگئے ہیں۔ حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے۔ بلکہ اللہ کے عذاب کی شدت ہی کچھ ایسی ہوگی

تفسیر

قیامت کا وحشت ناک زلزلہ

اس سُورت کا آغاز ایسی دو آیتوں سے ہو رہا ہے، جن میں جھنجھوڑنے اور ہلا کر رکھ دینے والے واقعات کا ذکر ہے ایک قیامت دوسرا "مقدمۂ قیامت" یہ آیتیں انسان کو بے ساختہ اس فانی دُنیا کے اس ہولناک مستقبل کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ جو اس کے انتظار میں ہے۔ وہ مستقبل کہ اگر آج اس کے بارے میں سوچا نہ گیا اور عملی طور پر تیاری نہ کی گئی تو واقعی خوفناک ہوگا۔ اور اگر تیاری کر لی گئی تو پُرکشش اور خوشگوار ہوگا۔

پہلی آیت میں بلا استثناء سب لوگوں سے کہا گیا ہے: اے لوگو! پروردگار کے عذاب سے ڈرو اور پرہیزگاری اختیار کرو، کیونکہ قیامت کا زلزلہ بہت شدید اور اہم واقعہ ہے۔ (یا ایھا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شیء عظیم)۔

"یا ایھا الناس" کا خطاب واضح کر رہا ہے کہ یہاں رنگ، نسل، زبان، مکان، زمان، جغرافیائی حدود اور قوم قبیلہ میں ترجیح اور فرق روا نہیں رکھا گیا۔ مومن، کافر، چھوٹا، بڑا، بوڑھا، جوان، مرد، عورت، ماضی، حال اور مستقبل غرضیکہ کوئی بھی اس خطاب سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

"اتقوا ربکم" یہ جملہ تمام تعمیری پروگراموں اور کاموں پر محیط ہے کیونکہ ربکم کہہ کر توحید کو بیان کر دیا گیا ہے، اور پھر "تقویٰ" کا ذکر ہے، گویا اس میں عقاید اور اعمال دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔

"ان زلزلۃ الساعۃ شیء عظیم"۔ یہ جملہ اجمالاً اس امر واقعہ کا ذکر کر رہا ہے، جو دیگر قرآنی آیات میں جا بجا آیا ہے اس سے مراد قیامت ہے اور جب قیامت آئے گی تو عالم کائنات بُری طرح دگرگوں اور زیر و زبر ہو جائے گا۔ پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے، دریا ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جائیں گے۔ زمین و آسمان درہم برہم ہو جائیں گے اور ایک نیا عالم، نئی زندگی کے ساتھ شروع ہوگا، عالم قیامت میں لوگ شدید دہشت اور سراسیمگی کی حالت میں ہوں گے۔

اس کے بعد والی آیت میں اس کیفیت کے چند نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

۱۔ "یوم ترونھا تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت"

"خوف اور بوکھلاہٹ کا یہ حال ہوگا کہ مائیں اپنے شیر خوار بچوں تک سے غافل ہو جائیں گی"۔

۲۔ "وتضع کل ذات حمل حملھا"

"گھبراہٹ کی وجہ سے ہر حاملہ عورت کا حمل ساقط ہو جائے گا"۔

۳۔ "وتری الناس سکٰری وما ھم بسکٰری"

"لوگ مدہوشی کی سی کیفیت میں دکھائی دیں گے۔ حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے"۔

۴۔ "ولکن عذاب اللہ شدید"

"لیکن اللہ کا عذاب اتنا دلدوز ہوگا کہ ڈر کے مارے لوگوں کو اپنا ہوش نہیں رہے گا۔"

چند اہم نکات

۱۔ دُنیا میں قیامت کے مظاہر یہاں قیامت کے جن مظاہر کا ذکر ہے، جزوی طور پر ایسے مظاہر کبھی کبھی اس دنیا میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ایسے زلزلے اور وحشت ناک حوادث پیدا ہوتے ہیں کہ ماؤں کو اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کا ہوش نہیں رہتا۔ حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جاتے ہیں اور بہت سے لوگ دم بخود ہو کر رہ جاتے ہیں، لیکن سب لوگوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ جبکہ قیامت کا زلزلہ ہمہ گیر ہوگا۔ اور اس کے نتیجے میں سب لوگ ان حالات سے دوچار ہوں گے

۲۔ یہ آیات کس موقع کے بارے میں ہیں ممکن ہے یہ آیات اس عالم کے اختتام کے بارے میں ہوں کہ جو قیامت کی تمہید ہے۔ اس صُورت میں حاملہ عورتوں اور شیرخوار بچّوں کا مفہوم حقیقی ہوگا۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے، کہ یہاں روز قیامت کے زلزلے کی طرف اشارہ ہو "ولٰکن عذاب اللہ شدید" اس کے لیے قرینہ ہے) اس صورت میں مذکورہ بالا آیات کی حیثیت مثال کی سی ہوگی۔ یعنی قیامت کا منظر اس قدر وحشت ناک ہوگا، کہ اگر حاملہ عورتیں موجود ہوں تو ان سب کے حمل ساقط ہو جائیں گے۔ اور ماؤں کے ساتھ شیرخوار بچے ہوں تو انہیں ان کا ہوش نہ رہے۔

۳۔ "مرضعۃ" کے مفہوم کا ایک خاص پہلو ہم جانتے ہیں کہ عربی ادب میں دودھ پلانے والی عورت کو عام طور پر "مرضع" کہتے ہیں[1] لیکن جیسا کہ بعض مفسرین اور کچھ اہل لغت نے لکھا ہے کہ جب یہ لفظ "مرضعۃ" یعنی مؤنث کی صُورت میں استعمال ہوتا ہے تو یہ اس حالت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جب عورت دودھ پلا رہی ہو۔ بہ الفاظ دیگر "مرضع" اس عورت کو کہتے ہیں جو بچّے کو دودھ پلا سکے۔ لیکن "مرضعۃ" کا مفہوم عورت کی اس حالت کے لیے مخصوص ہے کہ جب وہ بچّے کو دودھ پلا رہی ہو۔ لہٰذا زیرِ نظر آیت میں اس لفظ میں ایک خاص نکتہ پنہاں ہے اور وہ یہ کہ قیامت کے زلزلے کی شدت اور وحشت اس قدر ہوگی کہ یہاں تک کہ ماں اگر بچّے کو دودھ پلا رہی ہوگی۔ تو وحشت کے مارے بے اختیار ہو کر پستان بچے کے مُنہ سے نکال لے گی اور اسے بچّے کا ہوش نہیں رہے گا۔

۴۔ "تَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی" کا مفہوم اس کا معنیٰ ہے کہ "تو لوگوں کو دیکھے گا کہ وہ مدہوشی کے عالم میں ہوں گے"۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جو اس جملے کے مخاطب ہیں (اور احتمالاً بہت قوی ایمان والے مومنین بھی کہ جو آنحضرتؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں) اس عظیم وحشت سے مامون ہوں گے۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ تو لوگوں کی یہ حالت دیکھے گا، یعنی خود تیری یہ حالت نہ ہوگی۔

---

[1] کیونکہ تانیث کی علامت اس صورت میں استعمال ہوتی ہے، جب کسی چیز کے مذکر اور مؤنث دونوں موجود ہوں، جبکہ حاملہ ہونے اور دودھ دینے کا مسئلہ صرف عورتوں سے مخصوص ہے اور مردوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا تا رتانیث وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

۵۔ ایک اہم واقعہ

بہت سے مفسرین اور راویانِ حدیث نے زیرِ بحث آیات کے ذیل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت نقل کی ہے۔ اس کا ذکر یہاں مناسب رہے گا۔ روایت یہ ہے کہ اس سورہ کی دو ابتدائی آیات غزوہ بنی المصطلق[1] کی ایک رات نازل ہوئیں۔ جب لوگ میدانِ جنگ کی طرف جا رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو بلایا، وہ رُک گئے۔ سب نے آپ کے گرد حلقہ باندھ لیا، اس وقت آپ نے یہ آیات ان کے سامنے تلاوت کیں۔ لوگوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اس شب مسلمانوں نے بہت گریہ کیا۔ صبح ہوئی تو ان کی یہ حالت تھی کہ انھیں نہ یہ دُنیا بھلی لگتی تھی نہ یہ زندگی، حتیٰ کہ انھوں نے اپنی سواریوں پہ زینیں بھی نہ ڈالیں اور نہ ہی خیمے لگائے۔ ان میں سے کچھ گریہ وزاری کر رہے تھے اور کچھ فکر میں غلطاں تھے۔

ایسے میں رسول اللہؐ نے فرمایا

کیا تم جانتے ہو کہ یہ کونسا دن ہے؟

وہ کہنے لگے

خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔

فرمایا۔

یہ وہ دن ہے جب ہزار میں سے ۹۹۹ افراد جہنم کی طرف روانہ ہوں گے اور صرف ایک شخص جنت کی طرف جائے گا۔

یہ بات مسلمانوں کے لیے بڑی گراں تھی، وہ بہت روئے اور عرض کی:

"یا رسول اللہؐ! پھر کون نجات پائے گا۔"

فرمایا۔

گناہگاروں کی اکثریت کا تعلق تم سے نہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم لوگ کم از کم اہل بہشت کا ایک چوتھائی ہو گے۔

یہ سُنا تو مسلمانوں نے تکبیر بلند کی۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

مجھے توقع ہے کہ تم اہلِ بہشت کا ایک تہائی ہو گے۔

مسلمانوں نے پھر تکبیر بلند کی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا

مجھے امید ہے کہ تم اہلِ بہشت کا دو تہائی ہو گے کیونکہ اہلِ جنت کی ۱۲۰ صفیں ہیں اور ان میں سے ۸۰ صفیں میری امت کی ہیں . . . .[2]

---

[1] یہ جنگ چھٹی ہجری کے ماہِ شعبان میں وقوع پذیر ہوئی۔

[2] مجمع البیان، نور الثقلین اور دیگر تفاسیر (کچھ اختصار کے ساتھ)

۳۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۙ

۴۔ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ○

ترجمہ

۳۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو بغیر کسی علم و دانش کے خدا کے بارے میں مجادلہ کرنے لگتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔

۴۔ اس کے لیے لکھا جا چکا ہے کہ جو شخص بھی اس کی ولایت و سرپرستی میں جاتا ہے وہ اسے یقیناً گمراہ کر دیتا ہے اور جلا ڈالنے والی آگ کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے

تفسیر

شیطان کے پیروکار

گزشتہ آیات میں بتایا گیا تھا کہ جس وقت قیامت کا زلزلہ آئے گا دہشت و اضطراب کے مارے لوگوں کی عمومی حالت کیا ہوگی۔ زیر بحث آیات میں جاہل لوگوں کے ایک گروہ کی حالت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ آنے والے ایسے عظیم حادثے سے غافل ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو کسی علم و دانش کے بغیر خدا کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں۔ (ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم۔

یہ لوگ کبھی توحید، حق تعالیٰ کی یکتائی اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں۔ اور کبھی یہ لوگ مُردوں کی حیاتِ نو اور حشر و نشر کے لیے قدرتِ خدا کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں، جبکہ ان کے پاس اپنی باتوں کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ بہت ہٹ دھرم، متعصب، مکار، اور فریبی مشرکین میں سے تھا۔ اسے ضد تھی کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں یہ کہتا تھا کہ قرآن تو گذشتہ لوگوں کے افسانوں کا مجموعہ ہے جسے خدا کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ حیات بعد از موت کا بھی منکر تھا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں تمام مشرکین کے بارے میں ہے۔ کہ جو توحید اور قدرتِ خدا کے مسئلے میں جھگڑتے تھے۔
اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ شانِ نزول کبھی بھی آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کرتی، ان دونوں اقوال کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے اور اسکے مفہوم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو کورانہ تقلید، تعصب، خرافات یا پیروی نفس کی بناء پر حق کے مقابلے میں نزاع و جدل کرنے لگتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ایسے لوگ کہ جو کسی منطق و دانش کے تابع نہیں وہ سرکش و سرد ود شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔ (ویتبع کل شیطان مرید)
صرف ایک شیطان کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ ہر شیطان کے پیچھے چلنے لگتے ہیں، چاہے وہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے، کیونکہ ان میں سے ہر شیطان کا اپنا منصوبہ، اپنا جال اور مکر و فریب کے لیے اپنا حیلہ ہوتا ہے۔
لفظ "مرید" در اصل "مرد" (بروزن "سرد") کے مادہ سے ایسی بلند زمین کے معنی میں ہے کہ جس میں کوئی گھاس پھونس نہ ہو، اور پتوں سے خالی درخت کو "امرد" کہتے ہیں۔ اسی بناء پر جس نوجوان کی داڑھی کے بال نہ اُگے ہوں اسے بھی "امرد" کہتے ہیں۔
یہاں "مرید" سے مراد وہ شخص ہے جو ہر قسم کی خیر و سعادت اور صلاحیت سے عاری ہو۔ ایسا شخص طبعاً سرکش، ظالم عاصی اور نافرمان ہوگا۔

واضح ہے کہ جس شیطان کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اس کی پیروی سے انسان کا انجام کیا ہوگا، لہٰذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے اس کے لیے یہ بات لکھ دی گئی ہے کہ جو شخص بھی اس کی اطاعت اختیار کرے گا اور اس کی سرپرستی کا طوق اپنی گردن میں ڈالے گا۔ اسے وہ یقیناً گمراہ کر دے گا اور جلا ڈالنے والی آگ کی طرف اس کی راہنمائی کرے گا (کتب علیہ انہ من تولاہ فانہ یضلہ ویھدیہ الی عذاب السعیر)[1]

چند اہم نکات

۱۔ مجادلہ ہر دو حوالے سے

لفظ "مجادلہ" عرف عام میں بے بنیاد اور غیر منطقی بحث و تمحیص کو کہتے ہیں۔ لیکن اصل لغت کے لحاظ سے اس کا یہ مفہوم نہیں ہے، بلکہ لغت کے اعتبار سے ہر قسم کی بحث و گفتگو کے معنی میں ہے۔ یہ بحث حق بھی ہو سکتی ہے ناحق بھی۔ لہٰذا قرآن پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیتا ہے۔

---

[1] "سعیر" "سعر" (بروزن "قعر") کے مادہ سے آگ بھڑک اُٹھنے کے معنی میں ہے یہاں مراد جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ جو ہر آگ سے زیادہ جلانے والی ہے۔

وجادلھم بالتی ھی احسن

اپنے مخالفین کے ساتھ احسن طریقے سے مجادلہ کرو (نحل-۱۲۵)

۲۔ باطل مجادلہ شیطانی طریقہ ہے

بعض بزرگ مفسرین کا نظریہ ہے۔ "یجادل فی اللہ بغیر علم" مشرکین کی بے بنیاد بحث و تکرار کی طرف اشارہ ہے اور "و یتبع کل شیطان مرید" ان غلط کاموں کی طرف اشارہ ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ پہلا جملہ ان کے فاسد اور خرافاتی عقائد کی نشاندہی کرتا ہے اور دوسرا غلط اور ان کے غلط اور انحرافی کاموں کی۔

لیکن ۔ قبل کی اور بعد کی آیات چونکہ بنیادی اعتقادات اور اصول و عقاید کے بارے میں ہیں۔ للہذا بعید نہیں کہ دونوں جملے ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں طرفین ایک ہی موضوع کا نفی و اثبات ہے۔ پہلے جملے میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی علم و دانش کے بغیر صرف تقلید، تعصب اور ہوا پرستی کی بنا پر خدا اور اس کی قدرت کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں، اور دوسرے جملے میں کہا گیا ہے کہ جو شخص علم و دانش کی اتباع نہیں کرتا، فطری امر ہے کہ وہ ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے۔

۳۔ ہر شیطان کی پیروی۔ کیوں؟

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ایسا شخص شیطان کی پیروی کرتا ہے، بلکہ کہتا ہے کہ ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے؟

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمام شیطانوں کا پروگرام اور مقصد ایک ہی ہے۔ البتہ ہر ایک نے ایک خاص راستہ اور جال منتخب کر رکھا ہے، ان کے جال طرح طرح کے اور قسم قسم کے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان انہیں پہچاننے میں کھو کر رہ جاتا ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان اور توکل علی اللہ کی وجہ سے حمایت الٰہی کے زیر سایہ آجاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (حجر-۴۰)

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ظلم و سرکشی کا ہونا اور خیر و برکت سے تہی ہونا لفظ "شیطان" کے مفہوم میں پوشیدہ ہے لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ لفظ "مرید" (یعنی ۔ ہر قسم کے خیر و سعادت سے تہی) کا استعمال تاکید کے طور پر ہے تاکہ اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بالکل واضح ہو جائے۔

۴۔ "کتب علیہ" کا مفہوم

ہم جانتے ہیں کہ یہ تعبیر مقرر کرنے اور لازمی طور پر واقع ہونے کے معنی میں ہے۔ چاہے ایسا عالم تکوین میں ہو یا عالم تشریع میں ہو۔

تاہم یہ توہم نہیں ہونا چاہیئے کہ اس جملے میں جبر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ شیاطین مجبور ہیں کہ اپنے پیروکاروں کو گمراہ کریں اور دارالبوار کی طرف بھیجیں، بلکہ یہ اُس طرزِ عمل کا حتمی نتیجہ ہے، جو انھوں نے برضا و رغبت اختیار کیا ہے۔ مثلاً سردار شیاطین ابلیس نے فرمان الٰہی کی مخالفت اور سرکشی اپنے ارادہ و اختیار سے کی، بلکہ اس نے تو خدا کی ذات پاک پر اعتراض بھی کیا، لہذا ایسے افراد سوائے اس کے کچھ نہیں ہیں کہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسرے کو گمراہ کرنے والے بھی ہیں۔ انسانوں اور جنوں میں سے موجود دوسرے

شیطانوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔

یہ بالکل ایسی بات ہے کہ ہم کہیں کہ جو شخص منشیات کا عادی ہو جاتا ہے۔ بدبختی اور سیاہ انجام اس کی پیشانی پر لکھ دیا جاتا ہے ظاہر ہے یہ بات جبر کی دلیل تو نہیں ہے۔[1]

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ "علیہ" کی ضمیر شیطان کی طرف لوٹتی ہے۔ جبکہ بعض نے کہا کہ یہ شیطان کے پیروکاروں کے بارے میں ہے کہ جن کا ذکر (ومن الناس من یجادل .....) میں کیا گیا ہے۔ لیکن ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ اس ضمیر کا تعلق شیطان سے ہے۔ خصوصاً جبکہ اس کے نزدیک کی ضمیر (من تولاہ۔ کی ضمیر) بھی شیطان کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۵۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِى الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ○

۶۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْىِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○

۷۔ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِى الْقُبُوْرِ ○

ترجمہ

۵۔ اے لوگو! تمھیں قیامت کے آنے میں کوئی شک ہے (تو اس نکتے پر ذرا غور کر لو کہ) ہم نے تمھیں مٹی سے، پھر نطفہ سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر مضغہ (گوشت کے لوتھڑے) سے جو کبھی تو کسی شکل و صورت کا حامل ہوتا ہے اور کبھی نہیں پیدا کیا ہے تاکہ تم جان لو، (کہ ہم ہر چیز پر قادر ہیں) پھر جنین کی صورت میں ایک مدت مقررہ تک رحم مادر میں رکھا

(اور کبھی کسی کو ساقط کر دیا) اسکے بعد بچے کی صورت میں تمھیں پیدا کیا تاکہ پختگی اور بلوغت وکمال تک پہنچ سکو۔ اس دوران میں کئی ایک مرجاتے ہیں اور دوسرے اس قدر عمر پاتے ہیں کہ بڑھاپے کے انتہائی بُرے مرحلے تک جا پہنچتے ہیں اور اپنی تمام تر معلومات اور تجربہ کھو بیٹھتے ہیں اور (دوسری طرف) تو دیکھے گا کہ زمین خشک اور مردہ ہوتی ہے، ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور نوع بہ نوع ہری بھری لہلہاتی کھیتیاں اگاتی ہے۔

۶۔ یہ اس لیے کہ تمھیں پتہ چل جائے کہ اللہ برحق ہے، مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

۷۔ اور یہ کہ قیامت بہر حال آئے گی جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں اور قبروں میں جتنے لوگ ہوں گے اللہ ان کو زندہ کرے گا

تفسیر

نباتات اور انسان کی پیدائش میں قیامت کے دلائل

گذشتہ آیات میں مبداء ومعاد کے بارے میں مخالفین کے شکوک وشبہات سے متعلق گفتگو کی جارہی تھی۔ زیرِ بحث آیتوں میں جسمانی معاد کو ثابت کرنے کے لیے دو بڑی مضبوط عقلی دلیلیں دی گئی ہیں۔ ایک دلیل جنین (اور شکم مادر کے دور) سے متعلق ہے۔ دوسری زمین کی حالت میں تبدیلی یعنی مٹی سے ہریالی اور پھر نباتات میں نمو و بالیدگی سے متعلق ہے) دراصل قرآن مجید کا منشا یہ ہے کہ قیامت کے وہ مناظر جن کا مشاہدہ عام طور پر انسان اس دُنیا میں کرتا رہتا ہے۔ مگر اکثر و بیشتر ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کھول کر پیش کرے تاکہ انسان خوب سمجھ لے کہ موت کے بعد نہ صرف یہ کہ زندگی ناممکن نہیں ہے بلکہ وہ زندگی اس قدر فطری ہے کہ اس کی کئی مثالیں ہر روز اس کے سامنے آتی رہتی ہیں۔

سب سے پہلے تمام انسانوں سے یوں خطاب کیا گیا ہے: "اے لوگو! اگر تمھیں روزِ قیامت زندہ ہونے کے بارے میں شکوک وشبہات ہیں تو اس دنیوی زندگی پر ہی نظر ڈال لو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے نطفہ بنایا، نطفے سے جمے ہوئے خون میں بدلا

جمے ہوئے خون سے چبائے ہوئے گوشت میں ڈھلا جن میں سے بعض کسی شکل و صورت کے حامل ہوتے ہیں اور بعض نہیں۔ (یا ایھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ مخلقۃ وغیر مخلقۃ)[1] یہ سب اس لیے ہے کہ تم پر کھل کر واضح ہو جائے کہ ہم ہر کام کرنے کی طاقت رکھتے ہیں: (لنبین لکم) اور پھر ان جنین میں سے جن کو ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنی خلقت کی مدت مکمل کریں۔ ان کو ماؤں کے رحم میں ایک خاص مدت تک رکھتے ہیں۔ جب کہ دوسروں کو درمیانی مدت ہی میں ساقط کر دیتے ہیں (ونقر فی الارحام ما نشاء الی اجل مسمی) پھر ایک انقلابی دور کا آغاز ہوتا ہے اور ہم تمہیں بچے کی صورت میں پیدا کر دیتے ہیں (ثم نخرجکم طفلا) اس طرح تمہاری زندگی کا محدود اور انحصاری دور شکم مادر میں پورا ہوتا ہے۔ اس کے بعد تم ایک ایسے ماحول میں قدم رکھتے ہو، جو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ وسائل، مواقع اور روشنی رکھتا ہے۔ یہاں تمہاری ترقی وتکامل تک وہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ سرعت کے ساتھ اس کو جاری رکھتے ہو، "مقصد یہ ہے کہ تم جسمانی اور عقلی اعتبار سے کمال تک جا پہنچو" ثم لتبلغوا اشدکم) اس منزل پر تمہاری نادانی، دانائی، کمزوری طاقت اور محتاجی خود اختیاری میں بدل جاتی ہے۔ لیکن یہ کمال منزل آخر نہیں۔ بلکہ مزید مراحل بھی ہوتے ہیں۔ البتہ بعض افراد انتقال کر جاتے ہیں اور بعض مذکورہ کمال کے بعد تنزل کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ دنیوی زندگی کے بدترین دور یعنی انتہائی بڑھاپے میں پہنچ جاتے ہیں۔ (ومنکم من یتوفی ومنکم من یرد الی ارذل العمر) اس مرحلے میں آدمی کی معلومات اور تجربات میں سے کچھ بھی اس کے دماغ میں نہیں رہتا، نسیان اور بھول چوک کے پردے اس کی عقل پر پڑ جاتے ہیں اور واقعی اس کی ایک بچے کی سی کیفیت ہو جاتی ہے (لکیلا یعلم من بعد علم شیئا)

یہ کمزوری، ضعف اور پژمردگی اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی ایک نئے انتقالی مرحلے کے نزدیک پہنچ چکا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پھل بالکل پک جاتا ہے تو درخت سے اس کا رشتہ ٹوٹنے کا وقت یقینی ہوتا ہے۔

یہ عجیب و غریب تغیر و تبدل پروردگار عالمین کے بے پناہ اختیارات کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ مُردوں کو زندہ کرنے کے سمیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہر کام آسان کام ہے

دوسری دلیل روئیدگی اور نباتات کی پیداوار سے متعلق بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ انسان سے یوں مخاطب ہے: "موسم خزاں میں زمین کو تو بنجر اور چٹیل دیکھتا ہے، مگر جونہی ہم اس پر حیات بخش بارش برساتے ہیں، بہار آجاتی ہے، زمین میں حرکت، نمو اور بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے، ہر طرف طرح طرح کے پودے اور گھاس لہلہانے لگتے ہیں۔ (وتری الارض ھامدۃ فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت وربت وانبتت من کل زوج بھیج)[2]

---

[1] مضغہ: "مضغ" سے مشتق ہے، جس کے معنی چبانے کے ہیں۔ یہ لفظ گوشت کی اس تھوڑی سی مقدار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کو انسان ایک ہی لقمہ میں چبا جائے۔

[2] "ھامدۃ" بجھی ہوئی آگ کو "ھامدہ" کہا جاتا ہے اور یہ لفظ زمین کے اس حصے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جس پر گھاس پھونس زرد، خشک اور مردہ ہو گئی ہو۔ (مفردات راغب)

(باقی آئندہ صفحہ پر)

بعد والی دو آیتوں میں پروردگار عالم مذکورہ بالا دو دلیلوں سے مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے، پانچ نکات میں ان کا مقصد بیان کرتا ہے۔

۱۔ انسان اور نباتات کی زندگی کے مختلف مراحل کو اس لیے بیان کیا گیا تاکہ تم سمجھ لو کہ اللہ حق ہے (ذالك بان الله هوالحق) چونکہ وہ خود حق ہے۔ لہٰذا اس کا پیدا کردہ نظام بھی برحق ہے اور قطعاً بے مقصد نہیں ہوسکتا، یہی نکتہ قرآن مجید میں ایک اور جگہ یوں بیان ہوا ہے۔

"وما خلقنا السمٰوٰت والارض وما بينهما باطلا ذالك ظن الذين كفروا"

ہم نے آسمان، زمین اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے، اسے بے کار پیدا نہیں کیا یہ تو کفارہ کا وہم و گمان ہے۔ (ص۔ ۲۷)

چونکہ یہ کائنات بے مقصد نہیں، دوسری طرف زندگی کا اصل مقصد اس کائنات تک محدود نہیں۔ لہٰذا لازمی طور پر معاد اور قیامت کا وجود ہے۔

۲۔ اس عالم حیات و ممات پر حکمران نظام ہم پر یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ: وہی ہے جو مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ (وانه يحي الموتٰى) وہی ہے جو مٹی کے بدن کو زندگی کے لباس سے آراستہ کرتا ہے اور حقیر نطفے کو انسان کامل کا شرف بخشتا ہے۔ مردہ زمینوں میں جان ڈالتا ہے۔ اس دنیا میں اس ذات کی طرف سے مسلسل حیات آفریں پروگرام مشاہدہ کرنے کے بعد بھی کیا قیامت کے بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ کیا جاسکتا ہے [1]

۳۔ پروردگار عالمین ہر چیز پر قادر ہے، کوئی کام بھی اس کے لیے ناممکن نہیں ہے (وانه على كل شيء قدير)۔ کیا وہ ذات جو بے جان مٹی کو نطفے میں تبدیل کرتی ہے۔ پھر اس حقیر نطفے کو مرحلہ وار نمو دیتے ہوئے ہر روز ایک نئی زندگی دیتی ہے، خشک بنجر اور بیابان زمین کو اس طرح ہمہ گیر زندگی دیتی ہے کہ تھوڑی سی مدت میں سرسبز و شاداب کھیتیاں ہر

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

تفسیر فی ظلال کے مطابق موت و حیات کی درمیانی حالت کو "ھامدۃ" کہا جاتا ہے۔ "اھتزت" "ھز" کے مادہ سے شدت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے "ربت" "ربو" بروزن "غلو" زیادتی افزائش اور نمو کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے ربا (یعنی سُود) یہیں سے لیا گیا ہے۔ "بھیج" خوبصورت دلکش اور پرکشش کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

[1] (انه يحي الموتٰى) بعض مفسرین نے اس جملے کو قیامت کے دن انسان کی زندگی کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ (وان الله يبعث من في القبور) اس جملے کا معنی بھی کم و بیش یہی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ پہلا جملہ اصل حیات کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا مُردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت کی طرف لیکن ایک اور تفسیر کے مطابق (وانه يحي الموتٰى) کا جملہ اس دنیا میں خدائی مسلسل حیات آفرینی کی طرف اشارہ ہے اور ہم نے بھی اسی تفسیر کو بنیاد بنایا ہے تاکہ قیامت کے بارے میں دلیل قائم کی جاسکے۔

طرف لہلہاتی نظر آئیں، اس بات پر قادر نہیں ہو سکتی کہ موت کے بعد انسان کو پھر سے زندہ کرے؟

۴۔ یہ بھی سمجھ لو کہ اس جہان کے خاتمے اور دوسرے جہاں کی ابتداء کے لیے ایک وقت مقرر ہے جس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا (وان الساعة اٰتية لاريب فيها)

۵۔ یہ زندگی دنیا کا تمام کاروبار دراصل کسی نتیجے اور انجام کا مقدمہ ہے اور اس نتیجے کے دن اللہ سبحانہ' ان سب کو جو قبروں میں پڑے ہوں گے زندہ کرے گا۔ (وان الله يبعث من فی القبور)۔

مذکورہ بالا پانچ نتائج کہ جن میں سے بعض تمہید ہیں، بعض اصل مضمون بعض امکانی کیفیت لیے ہوئے۔ جبکہ بعض واقع ہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہوئے ایک نقطے پر جا ملتے ہیں۔ وہ یہ کہ قیامت یعنی مُردوں کا حشر نشر نہ صرف یہ کہ امکان پذیر ہے۔ بلکہ واقعی ہوگا۔ وہ لوگ جو حیات بعد ممات میں شک کرتے ہیں وہ شب و روز اس دنیا میں نباتات، حیوانات اور انسان کی زندگی اور موت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ وہ خدائی قدرت پر شک کریں۔ کیا انسان ابتداء میں مٹی سے نہیں بنا؟ تو پھر تعجب کی کیا بات ہے کہ ایک دفعہ مرنے اور مٹی میں دفن ہونے کے بعد پھر اُٹھا لیا جائے۔ کیا ہر سال ہماری آنکھوں کے سامنے اس مٹی سے تر و تازہ کھیتیاں نہیں نکلتیں تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے کہ اگر کئی سالوں بعد مُردہ انسان جاندار ہو کر مٹی سے اُٹھ کھڑا ہو۔

اگر دوسری زندگی کے بارے میں ان کو شک ہے تو ان کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ جو نظام آفرینش اس دنیا میں جاری و ساری ہے وہ اس بات کا غماز ہے کہ زندگیٔ دُنیا کا کوئی مقصد ہے، اگر نہیں تو یہ تمام کا تمام کاروبارِ دنیا بے ہودہ اور عبث ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ یہ چند روزہ زندگی جو سینکڑوں مشکلات، پریشانیوں اور تکالیف سے عبارت ہے قطعاً کسی قسم کی قدر و قیمت اور حیثیت نہیں رکھتی کہ اس حیرت انگیز کائنات کا وجود نصب العین اور مقصد اصل قرار پائے۔ اس بناء پر ماننا پڑے گا کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا جہان ضرور وجود رکھتا ہے۔ جو اس دُنیا کے مقابلے میں کہیں وسیع و عریض دائمی اور ابدی ہے اور اس زندگی کی اصل منزل بننے کے لائق ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ انسانی زندگی سات مراحل پر مشتمل ہے

مذکورہ بالا آیتوں میں حقیقتِ قیامت کی تشریح کے ذیل میں سیرِ تکاملِ انسانی کے سات مراحل گنوائے گئے ہیں:

پہلا مرحلہ جب انسان محض مٹی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے مٹی سے مراد وہ مٹی ہو، جس سے حضرت آدمؑ بنائے گئے تھے۔ یہ امکان بھی ہے کہ اس مٹی سے قطع نظر ہر انسان مٹی سے بنتا ہے۔ کیونکہ نُطفے کے اجزاء انسانی خوراک سے بنتے ہیں اور خوراک مٹی کے اجزاءُ سے مرکب ہوتی ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ انسانی جسم کا ایک اہم حصہ پانی آکسیجن اور کاربن پر مشتمل ہوتا ہے کہ جو مٹی سے نہیں لیا گیا۔ لیکن بدن کے تمام بنیادی اعضاء چونکہ مٹی سے بنتے ہیں۔ لہٰذا یہ تعبیر سو فی صد صحیح ہے کہ انسان مٹی سے ہے۔

دوسرا مرحلہ نُطفے کا ہے۔ بے حس بے جان پاؤں میں روندی جانے والی مٹی نطفے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ نطفہ جس میں نہایت چھوٹے چھوٹے ذی رُوح اجزاء ہوتے ہیں جو صرف خوردبین ہی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ مرد کے نطفے کے اجزاء کو "اسپرم" اور عورت کے

اجزاء کو "ادول" کہتے ہیں۔ یہ جاندار اجزاء اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ ایک مرد کے نطفے میں شاید کئی لاکھ "اسپرم" موجود ہوں۔
زیادہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ پیدائش کے بعد انسان آہستہ آہستہ اور تدریجاً نشوونما پاتا ہے اور یہ نشوونما زیادہ ترکیت کے حساب سے ہوتی ہے۔ جبکہ رحم مادر میں نشوونما تیز تبدیلیوں اور حرکت کے ساتھ کیفیت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔
رحم مادر میں جنین کی کیفیت حیرت انگیز طریقے سے مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے۔ جیسے ایک معمولی سی پن چند ماہ میں ایک ہوائی جہاز کی شکل اختیار کر جائے۔ موجودہ زمانے میں "جنین" پر بڑی تحقیق کی جا چکی ہے۔ ماہرین کو موقع ملا ہے کہ جنین کے مختلف مراحل کا مطالعہ کریں اور خدا کی عجیب و غریب قدرت سے لوگوں کو آگاہ کریں۔
تیسرا مرحلہ علقہ کا ہے۔ یہ نطفے کی تبدیل شدہ صورت ہے۔ جب نطفہ شہوت کے دانے کی طرح ایک جمے ہوئے خون کے ٹکڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسے سائنسی اصطلاح میں "مورولا" کہا جاتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد جنین کے چاروں طرف ایک خلاء سا پیدا ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ جنین کے اطراف کی تقسیم کی ابتدار کا مرحلہ ہے اور اس کیفیت کو "لاسترولا" کہتے ہیں۔
چوتھے مرحلے میں یہی ٹکڑا چبائے ہوئے گوشت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اعضار کی کوئی شکل و صورت واضح ہو۔ اچانک "جنین" کی تیلی سی کھال میں تبدیلی واقع ہوتی ہے، اعضاء بدن ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں اور ہر عضو اپنے مخصوص کام کے لحاظ سے متشکل ہو جاتا ہے۔ بعض جنین جو اس تبدیلی سے قاصر رہتے ہوئے اپنی سابقہ حالت ہی میں باقی رہ جائیں یا ناقص رہ جائیں وہ ساقط ہو کر خارج ہو جاتے ہیں (مخلقۃ و غیر مخلقۃ) ہو سکتا ہے۔ یہ اشارہ مکمل خلقت و غیر مکمل خلقت" کی طرف ایک اشارہ ہو۔
یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا چار مراحل کے ذکر کے بعد قرآن مجید "لنبین لکم" کا جملہ ارشاد فرمایا ہے۔ گویا تھوڑی سی مدت میں یہ عجیب و غریب تبدیلیاں جو ایک معمولی سے قطرے کو مکمل انسان میں ڈھال دیتی ہیں۔ اس حقیقت کی واضح دلیل ہیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اس کے بعد "جنین" کے پانچویں، چھٹے اور ساتویں مراحل کا ذکر ہے جو ولادت کے بعد سے متعلق ہیں یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا[1]
یاد رہے کہ بچے کا ایک زندہ موجود کی صورت میں پیدا ہونا بذاتِ خود ایک زبردست تغیر و تحرک ہے جو جنین ہی کے پے درپے تغیرات میں شمار ہوتا ہے، اسی طرح بچپن، بلوغ اور بڑھاپا بھی "جنین" ہی کے ارتقائی مراحل ہیں۔ مذکورہ بالا آیہ مجیدہ میں "قیامت کو بعث" یعنی اُٹھانا یا زندہ کرنا" سے تعبیر کرنا بھی جنین کے ارتقائی مراحل کی آخری کڑی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔
اس نکتے کی طرف بھی خاص توجہ کرنی چاہیئے کہ جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا اور اس مقدس کتاب نے جنین کے مراحل ایسی علمی و سائنسی گفتگو کی اس وقت نہ کوئی "جنین کو جانتا تھا اور نہ کوئی ایسا علم معرض وجود میں آیا تھا جو اس کی تفصیلات بیان کرے

---

[1] قابل توجہ یہ بات ہے کہ "ثم نخرجکم طفلا" کے جملے میں لفظ "طفلا" مفرد استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ ظاہراً "اطفالاً" چاہیئے تھا۔ اس کی شاید وجہ یہ ہو کہ "طفل" مصدری معنی رکھتا ہے اور اس میں مفرد و جمع یکساں ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ مقصد "جنین" کے بارے میں شبے کہ بچوں کے بارے میں جو اس موقع پر چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور بعد میں انہیں ظہور کرنا ہوتا ہے۔

لہٰذا اپنی جگہ پر یہ خود ایک معجزے سے کم نہیں اور اس حقیقت کا بیّن ثبوت بھی ہے کہ اس کتاب کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے۔

۲۔ معادِ جسمانی

قرآن مجید نے جہاں بھی انسان کی بازگشت کا ذکر کیا ہے۔ بے شک وہاں انسان کی رُوح اور جسم دونوں ہی مراد ہیں۔ جنہوں نے معاد کو صرف روحانی ہونے تک محدود سمجھا اور صرف ارواح کی بقا کے قائل ہیں۔ انھوں نے قرآنی آیتوں کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ حالانکہ بہت سی آیتیں مذکورہ بالا آیتوں کی طرح بڑی مناسبتوں کے ساتھ معادِ جسمانی کو بیان کرتی ہیں ورنہ جنین کے ارتقائی مراحل اور مردہ زمینوں کی شادابی معادِ روحانی سے کسی طرح بھی کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔ خصوصاً زیرِ بحث آیتوں کا آخری جملہ جو اس کاروبارِ ہستی کے انجام کو بیان کرتے ہوئے بڑی صراحت سے واضح کرتا ہے (وان اللہ یبعث من فی القبور) یعنی جو بھی قبروں میں ہوگا۔ اللہ سبحانہٗ اس کو اُٹھائے گا، کیونکہ قبر تو جسم کی جگہ ہے۔ نہ کہ رُوح کا مسکن، اصولی طور پر مشرکین کی ساری حیرت اور تعجب بھی معادِ جسمانی پر تھا، یعنی ان کے پلّے یہ بات نہیں پڑتی تھی کہ مٹی میں خلط ملط ہو جانے والا آدمی دوبارہ کیسے اُٹھ کھڑا ہوگا۔ رُوح کی بقاء کا مسئلہ نہ صرف یہ کہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں تھی بلکہ ان کو منظور بھی تھا (غور فرمایئے)

۳۔ ارذل العمر

"ارذل" "رذل" کے مادہ سے مشتق ہے۔ یعنی گھٹیا اور ناپسندیدہ چیز، "ارذل العمر" یعنی انسان کی عمر کا ناپسندیدہ زمانہ، جبکہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے اپنے کمالات کو اس حد تک کھو بیٹھتا ہے کہ بقول قرآن مجید، اپنی معلومات اور تجربات تک کو بھول جاتا ہے اور بالکل ایک ناخواندہ اور ناسمجھ بچے کی مانند ہو جاتا ہے۔ بچوں کی طرح معمولی معمولی باتوں پر پریشان ہو جاتا ہے پل میں خوش اور پل میں خفا ہو جاتا ہے۔ صبر و تحمل کا دامن بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ بچے سے اس بات کی توقع نہیں کی جاتی جو ایک بوڑھے آدمی سے کی جاتی ہے اور بچوں کے بارے میں امید کی جاتی ہے کہ رُوح اور جسم میں رشد و نمو کے ساتھ ساتھ یہ حالات بدل جائیں گے۔ جبکہ بوڑھے اس امید کے قابل نہیں ہوتے اور یہ کہ بچے کی یہ حالت کسی کمال کے زوال سے نہیں ہوتی جبکہ بوڑھا اپنا تمام مال و متاعِ کمال کھو کر اس حالت کو پہنچا ہے۔ ان جہات کے پیشِ نظر بوڑھوں کی حالت بچوں کی نسبت زیادہ ناگوار اور افسوسناک ہے۔ بعض روایات میں "ارذل العمر" سے سو سال سے زیادہ عمر مراد لی گئی ہے۔[1]

یہ عمومی صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے، لیکن ہو سکتا ہے کوئی شخص سو سال سے پہلے ہی ایسی حالت کو پہنچ جائے اور کوئی سو سال کے بعد بھی نہ پہنچے، ہر لحاظ سے چاک و چوبند رہے، خصوصاً عظیم اور اعلیٰ علماء و افاضل جو عموماً تحصیل و ترویجِ علوم میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں بہت کم دیکھا گیا ہے کہ ان کی یہ کیفیت ہو۔ بہرحال عمر کے اس حصے میں خدا سے پناہ مانگنی چاہیئے۔

ضمنی طور پر عرض ہے کہ ان حقائق سے آگاہی ہمیں غرور اور تکبر سے نکالنے کے لیے کافی ہے کہ ہم پہلے کیا تھے۔ اب کیا ہیں اور آئندہ کیسے ہونے والے ہیں۔

---

[1] نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۶۱

۸۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝

۹۔ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝

۱۰۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

ترجمہ

۸۔ اور کچھ لوگ بغیر کسی علم و دانش کے اور بغیر کسی ہدایت اور واضح کتاب کے خدا کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں۔

۹۔ وہ تکبر اور (احکامات خدا سے) بے اعتنائی کرکے چاہتے ہیں، کہ لوگوں کو خدا کے راستے سے گمراہ کردیں۔ دنیا میں ان کے لیے ذلت و رسوائی ہے اور قیامت میں ہم ان کو بھسم کر دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

۱۰۔ (اور ان میں سے ہر کسی سے کہیں گے) یہ سب کچھ خود تیرا ہی کیا دھرا ہے اور اللہ تو اپنے بندوں پر کبھی زیادتی نہیں کرتا۔

تفسیر

کج بحثی کرنے والوں کے بارے میں

ان آیتوں میں بھی ان لوگوں کی کج بحثی کا تذکرہ ہے جو مبداء و معاد سے متعلق بے سروپا باتیں کرتے ہیں۔

پہلے بیان کیا جارہا ہے، کہ لوگوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو کسی قسم کے علم، ہدایت اور کتاب کے بغیر ہی خدا کے بارے میں کج بحثی کرنے لگتا ہے (ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر)۔

(ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم) کا جملہ پہلے کی چند آیتوں میں گزر چکا ہے۔ یہاں اس کی وہی تعبیر ہے جو وہاں تھی۔ جملے کا تکرار ظاہر کرتا ہے کہ وہاں اس جملے سے اور لوگ مراد تھے اور یہاں کوئی اور۔

تفسیر "المیزان" اور "کبیر" میں مذکورہ بالا دونوں گروہوں میں یہ فرق بیان کیا گیا ہے، کہ پہلے کی آیتوں میں اس جملے سے مُراد گمراہ اور بے خبر عوام الناس ہیں جبکہ اس آیت میں خواص اور سربرآوردہ افراد ہیں (لیضل عن سبیل اللہ) کا جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس گروہ کا کام دوسروں کو راہ راست سے بھٹکانا ہے۔ یہی مذکورہ بالا فرق کا واضح قرینہ ہے۔ جیسے گذشتہ آیتوں میں (ویتبع کل شیطان مرید) کا جملہ جو شیطانوں کی پیروی کے بارے میں تھا، اس معنے کو زیادہ واضح کرتا ہے۔

اس بارے میں کہ "علم" "ھدی" اور "کتاب منیر" میں کیا فرق ہے، مفسرین کے درمیان اس میں بھی اختلاف ہے۔ ہماری نظر میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ "علم" سے عقلی استدلال کی طرف اشارہ ہے۔ "ھدی" سے اللہ سُبحانہٗ کی طرف سے انبیاءؑ، ائمہؑ اور صلحاء کی رہنمائی کی طرف اور "کتاب منیر" سے آسمانی کتابوں کی طرف اشارہ ہے۔ زیادہ آسان الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس جملے میں کتاب، سنت اور دلیل عقلی تینوں مشہور دلائل اور "اجماع" (اس معنیٰ میں کہ علماء کے مطابق دراصل اس سے مراد بھی سُنّت ہی ہے) ساری ادلہ شرعیہ اربعہ بیان کردی گئی ہیں۔

بعض مفسرین کے مطابق "ھدی" سے مُراد وہ معنوی رہنمائی ہے، جو انسان کو ذاتی اصلاح پرہیزگاری اور تہذیبِ نفس کے ذریعے حاصل ہوتی ہے (البتہ یہ مفہوم ہمارے مذکورہ بالا مفہوم کے ہم آہنگ ہے) دراصل علمی بحث و تمحیص اس صورت میں مفید و نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے، جب یہ کتاب، سنت اور دلائل عقلی پر مبنی ہو۔

اس کے بعد ان گمراہی کے رہبروں کی روگردانی کی ایک وجہ ایک مختصر مگر معنی خیز جملے میں بیان کی جارہی ہے۔ وہ تکبر اور خدا کی باتوں اور واضح عقلی دلائل سے بے اعتنائی کرتے ہوئے چاہتے ہیں کہ لوگوں کو راہ خدا سے ہٹائیں۔ (ثانی عطفہ لیضل عن سبیل اللہ)۔

"ثانی" "ثنی" کے مادہ سے پلٹنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور "عطف" پہلو کے معنیٰ میں۔ پہلو لپیٹنا کسی چیز سے پہلوتہی اور بے اعتنائی کا ایک لطیف کنایہ ہے۔

"لیضل" کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اُن لوگوں کی پہلوتہی اور روگردانی کا مقصد ہو، یعنی وہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی خاطر خدائی آیتوں اور ہدایت سے بے اعتنائی کرتے ہیں اور انھیں کچھ نہیں سمجھتے، دوسرا یہ کہ ان کی پہلوتہی کا نتیجہ ہو یعنی ان کی بے اعتنائی کا اثر یہ ہے کہ لوگوں کو راہِ حق سے پھیر دیتے ہیں۔

اس کے بعد دنیا و آخرت میں ان کا انجام بیان کیا گیا ہے، کہ اس دُنیا میں ذلّت و رسوائی اور بدنصیبی ان کا مقدر ہے اور آخرت میں ہم انہیں جلا دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے (لہ فی الدنیا خزی ونذیقہ یوم القیامۃ عذاب الحریق)۔

اوران میں سے ہرایک سے کہا جائے گا: "یہ تیرا ہی کیا دھرا ہے، یہ وہ ہے جو تونے اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجا ہے (ذٰلك بما قدمت يداك)۔ اور اللہ ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا (و انّ الله ليس بظلّام للعبيد)۔ نہ کسی کو بلاوجہ سزا دیتا ہے اور نہ ہی سزا میں بلاوجہ اضافہ کرتا ہے۔ اس کا کام تو صرف عدل وانصاف کرنا ہے۔[1]

یہ آیۂ مجیدہ ان آیتوں میں سے ہے جو جبر کے قائل فرقے کے نظریات کی نفی کرتی ہے اور افعالِ خدا میں عدالت کو ثابت کرتی ہے (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد سورہ آلِ عمران آیت نمبر ۱۸۲ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں)

---

[1] "ظلام" مبالغے کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے "بہت زیادہ ظلم کرنے والا" خدائے تعالیٰ جو مطلقاً ظلم نہیں کرتا، اس لیے یہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بلاوجہ سزا دینا یا سزا میں اضافہ کرنا خدا کے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے ہمیشہ کے لیے بہت زیادہ ظلم کیا جاتا۔

۱۱۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ○

۱۲۔ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ○

۱۳۔ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ○

۱۴۔ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ○

ترجمہ

۱۱۔ بعض لوگ صرف زبانی کلامی اللہ کی پرستش کرتے ہیں (ان کا دلی ایمان بہت ہی کمزور ہے) یہی وجہ ہے کہ جب دنیوی منفعت حاصل کرتے ہیں تو مطمئن ہوجاتے ہیں۔ مگر جونہی آزمائشی مصیبت آتی ہے۔ روگردانی کرتے ہوئے کفر کا رُخ کرتے ہیں۔ اس طرح دُنیا و آخرت کھو بیٹھتے ہیں

اور یہی کھلا ہوا گھاٹا ہے۔

۱۲۔ وہ خدا کو چھوڑ کر اس کو پکارتے ہیں، جو کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتا اور یہی گہری گمراہی ہے۔

۱۳۔ وہ اس کو پکارتے ہیں جس کی طرف سے نفع کی نسبت نقصان کا کہیں زیادہ اندیشہ ہے۔ کیسا ہی بُرا سرپرست اور کیسا بُرا ساتھی ہے۔

۱۴۔ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کیے اللہ ان کو ایسے باغات میں لے جائے گا، جن کے درختوں تلے نہریں بہتی ہیں اور (بے شک) اللہ جس کام کا ارادہ کرتا ہے۔ اسے انجام دیتا ہے۔

تفسیر

کفر کے گڑھے کے کنارے کھڑے لوگ

گزشتہ آیتوں میں دو گروہوں کا تذکرہ ہو رہا تھا ایک گمراہ کرنے والے لیڈروں کا، دوسرا گمراہ ہونے والے پیروکاروں کا لیکن زیر بحث آیتوں میں ایک تیسرے گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ لوگ کمزور ایمان والے ہیں۔

قرآن مجید اس گروہ کی تعریف یوں کر رہا ہے۔ بعض لوگ صرف زبان سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ جب کہ ان کا دل ایمان بالکل سطحی اور کمزور درجے کا ہے۔

(ومن الناس من یعبد اللہ علی حرف) "علی حرف" سے ہو سکتا ہے یہ مراد ہو کہ ان کا ایمان زبانی کلامی ہے اور دل میں صرف ایمان کی ایک معمولی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ یا اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ وہ دائرہ ایمان کے مرکز پر نہیں بلکہ ایک طرف کنارے پر کھڑے ہیں۔ کیونکہ "حرف" کا ایک معنی کسی پہاڑی یا گھاٹی کا کنارہ بھی ہوتا ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ جو کوئی کسی کنارے پر کھڑا ہو، مضبوط نہیں ہوگا۔ بلکہ معمولی سی حرکت سے لڑھک جائے گا۔ اور راستے سے ہٹ کر گر جائے گا۔ یہی حال کمزور ایمان والوں کا ہے کہ کسی معمولی سی چیز کے لیے ایمان برباد کر دیتے ہیں۔

ان کے ایمانی تزلزل کی تشریح قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے کہ "اگر دنیاوی منفعت میسر آ جائے تو مطمئن اور پرسکون ہو جاتے ہیں اور اسے اسلام کی حقانیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر کسی نقصان، کسی نعمت کے چھن جانے یا پریشانی کے ذریعے آزمائش او

امتحان میں مبتلاء ہو جائیں تو شدید بے قراری اور اضطراب کا شکار ہو کر کفر اختیار کر لیتے ہیں۔

(فان اصابہ خیر اطمأن بہ وان اصابتہ فتنۃ انقلب علیٰ وجہہ)[1]۔ گویا انہوں نے دین و ایمان کو مادی مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر قبول کیا تھا کہ اگر ان کا مقصد پورا ہوا تو دین برحق ورنہ باطل و بے بنیاد۔

ابن عباس اور دوسرے متقدمین مفسرین نے اس آیۂ مجیدہ کی شانِ نزول اس طرح بیان فرمائی ہے کہ بعض اوقات بدوؤں کا کوئی گروہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتا اور اس کی دلی مرادیں بر آتیں۔ یعنی ان کے مویشی اچھے بچے دیتے ان کے اولاد نرینہ ہوتی اور ان کی مال و دولت میں اضافہ ہوتا تو وہ خوش ہو کر اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے حلقۂ بگوش عقیدت ہو جاتے، لیکن اگر اس کے برعکس ان کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوتیں، کوئی فرد بیمار پڑ جاتا یا مال مویشی میں کوئی نقصان ہو جاتا تو شیطانی وسوسے ان کے دلوں میں گھر کر لیتے اور کہتے کہ ان تمام مصیبتوں کا ذمہ دار یہ دین ہے، جسے تم نے قبول کیا ہے۔ نتیجۃً وہ اس دین سے پھر جاتے[2]۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید ان کے مادی مفادات کو "خیر" سے تعبیر کرتا ہے اور ان مفادات کے حاصل نہ ہونے کو فتنہ (آزمائش کا ذریعہ) سے "شر" سے نہیں، گویا کہ قرآن مجید یہ تصریح فرما رہا ہے کہ دُنیاوی ناخوشگوار حادثات شر اور برائی نہیں ہیں بلکہ آزمائش و امتحان کا ذریعہ ہیں۔

آیۂ مجیدہ کے آخر میں یہ فرمایا جا رہا ہے "اس طرح سے وہ دُنیا و آخرت دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں" (خسر الدنیا والاٰخرۃ) یہی تو واضح گھاٹا اور نقصان ہے کہ دُنیا و آخرت دونوں ہی برباد ہو جائیں۔ (ذٰلک ھو الخسران المبین)۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورۂ بالا قسم کے لوگ دین کو مادی مفادات کی عینک سے دیکھتے ہیں اور مادی مفادات کے حصول کو دین کی حقانیت کی دلیل خیال کرتے ہیں۔ ایسے لوگ، جو آج کل بھی باافراد موجود ہیں اور ہر زمانے میں رہے ہیں۔ دراصل ایمان کو شرک اور بُت پرستی سے آلودہ کر لیتے ہیں۔ البتہ ان کا بُت بیوی، مال مویشی یا دیگر مفادات ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا ایمان مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیۂ مجیدہ سے منافقین مُراد لیے ہیں۔ ہماری نظر میں اس آیۂ مجیدہ کے ذیل میں وہ منافقین جن کے دل میں ایمان بالکل نہ ہو، شمار نہیں کیے جا سکتے ورنہ یہ مفہوم آیۂ مجیدہ کے ظاہری معنیٰ کے خلاف ہو جائے گا۔ کیونکہ "یعبد اللّٰہ" "اطمان بہ" اور "انقلب علیٰ وجہہ" کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ جن لوگوں کا ذکر اس آیت میں ہو رہا ہے۔ ان کے دل میں کمزور سا ایمان ہے۔ چنانچہ اگر کمزور الایمان والے منافقین مراد لیے جائیں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس کے بعد اس گروہ کے آلودہ ایمان خصوصاً توحید و ایمان باللہ سے روگردانی کے بعد کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہہ رہی ہے " وہ خدا کو چھوڑ کر اس کو پکارتے ہیں جو انھیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔

---

[1] "انقلب علیٰ وجہہ" اگر اس جملے میں "انقلب" سے بازگشت مراد لیں تو اس جملے کا یہ معنیٰ ہو سکتا ہے کہ ایمان کی بالکل مخالف سمت کی طرف مُنہ کر لیتا ہے۔ گویا ہمیشہ ہی سے ایمان سے لاتعلق تھا۔

[2] تفسیر فخر رازی ج ۲۳ ص ۱۳ اور تفسیر قرطبی ج ۶ ص ۴۴۰۹۔

(یدعوا من دون اللہ ما لا یضرہ وما لا ینفعہ) اگر وہ واقعی مفادات مادی کے خواہاں اور نقصان سے گریزاں ہیں اور ان کی نگاہ میں کسی دین کی حقانیت کا یہی معیار ہے تو پھر بتوں کی پرستش کی طرف کیوں مائل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ بُت تو نہ کسی کو کچھ دے سکتے ہیں۔ اور نہ کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ کسی بھی صلاحیت سے عاری بُت انسان کی زندگی کو کسی طور پر متاثر نہیں کر سکتے بے شک یہ بڑی گہری گمراہی ہے“۔

(ذٰلک ھو الضلال البعید) ان کی گمراہی کا فاصلہ "راہِ راست" سے اس قدر زیادہ ہو گیا ہے کہ دوبارہ ہدایت کی امید بہت کم ہو گئی ہے۔

اس کے بعد اس کی بدتر کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے "وہ اس کو پکارتے ہیں، جس سے فائدے کی نسبت نقصان کی امید زیادہ ہے (یدعوا لمن ضرہ اقرب من نفعہ) کیونکہ یہ مصنوعی معبود دنیا میں ان لوگوں کی فکری نہج کو بہت پست کر کے خرافات کی طرف لے جاتے ہیں اور آخرت میں جلانے والی آگ کا تحفہ دیتے ہیں۔ بلکہ سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۹۸ کے مصداق۔

"اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَھَنَّمَ اَنْتُمْ لَھَا وَارِدُوْنَ"

بے شک تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو دوزخ کا ایندھن ہیں اور تم ہی اس میں جانے والے ہو۔

آیۂ مجیدہ کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے "کیا ہی بُرے سرپرست اور مونس ہیں" (لَبِئْسَ الْمَوْلٰی وَلَبِئْسَ الْعَشِیْرُ)۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ گزشتہ آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ بُت نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔ مگر بعد کی آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ ان کا نقصان نفع سے زیادہ قریب ہے تو کیا یہ دونوں آیتیں متضاد ہیں؟ اس کا جواب ہم روز مرہ کی گفتگو میں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو ہر قسم کے خواص سے عاری جانتے ہیں اور پھر اس کی اسی جہت کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے۔ اس کو ضرر و نقصان کا منبع کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص سے راہ و رسم نہ بڑھاؤ، کیونکہ وہ نہ دنیا میں تمہارے کام آسکتا ہے نہ آخرت میں اور پھر اس کی مذموم صفات کو اور بڑھا کر ظاہر کرنے کے لیے یوں کہتے ہیں۔ بلکہ وہ تمہاری بدبختی اور ذلت کا سبب ہے۔ مزید برآں یہ جو ان کی طرف کسی کو نقصان نہ پہنچانے کی نسبت دی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے، کہ وہ اپنے مخالفین کا کچھ بگاڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لیکن جس نقصان کا ذکر ہے وہ ایک فطری اور لازمی نقصان ہے۔ جو ان کی پوجا کرنے والوں کو ہوتا ہے۔

افعل تفضیل کا صیغہ جیسا کہ "اقرب" اس کے بارے میں پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ ضروری نہیں کہ جن دو چیزوں کے درمیان موازنہ اور مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ ان معنوں میں وہ چیز ہو۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زیادہ کمزور طرف زیرِ بحث صفت سے بالکل ہی عاری ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ ترکِ گناہ پر تھوڑی دیر صبر و تحمل کرنا دوزخ کی آگ سے بہتر ہے تو اس سے ہماری مراد ہرگز یہ نہیں ہوتی کہ دوزخ کی آگ میں کوئی اچھائی پائی جاتی ہے۔ جس کے مقابلے میں صبر کرنا زیادہ اچھا ہے۔ بلکہ یہاں یہ معنی ہے کہ دوزخ کی آگ ہر طرح کی اچھائی سے عاری ہے۔

اس آیۂ مجیدہ کی مندرجہ بالا تفسیر جناب شیخ طُوسی نے "تبیان" اور جناب طبرسی نے "مجمع البیان" میں بیان فرمائی ہے۔ البتہ بعض مفسرین مثلاً جناب فخرالدین نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ زیرِ بحث دونوں آیتوں میں الگ الگ بُت مراد لیے گئے ہیں۔ پہلی آیت میں پتھر، لکڑی اور دیگر جمادات کے بے جان اور بے حس بتوں کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں انسان نما طاغوتی بتوں کا ذکر ہے اوّل الذکر بُت کسی قسم کا نقصان یا فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ جب کہ موخر الذکر "ائمہ ضالّ" ہونے کے ناتے نقصان تو پہنچا سکتے ہیں، مگر فائدہ نہیں اور اگر بالفرض کوئی چھوٹی موٹی خوبی ان میں ہو بھی تو نقصان کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ انہوں نے اپنے خیال کے ثبوت کے طور پر (لبئس المولیٰ ولبئس العشیر" کا جملہ پیش کیا ہے)، لہٰذا کوئی تضاد باقی نہیں رہتا[1]

قرآن مجید کا اسلوب بیان یہ ہے کہ اچھے اور بُرے کا موازنہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ نتیجہ نکالنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ لہٰذا زیرِ بحث آخری آیت میں ارشاد ہو رہا ہے: "وہ لوگ جو ایمان لائے، جنہوں نے نیک کام کیے۔ اللہ ان کو ایسے باغات سے نوازتا ہے، جن کے تلے نہریں بہتی ہیں (انّ اللہ یدخل الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت جنّٰت تجری من تحتھا الانھٰر) ان کا طرزِ عمل نہایت واضح، ان کے نظریات و افکار اور عملی خطوط متعین ہیں۔ ان کا سرپرست خود اللہ ہے اور ان کے ہمدم و مونس انبیاءؑ، شہداء، صالحین اور فرشتے ہیں "بے شک اللہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے" (انّ اللہ یفعل ما یرید) اتنی اعلیٰ اور بڑھیا جزا اور بدلہ دینا اس کے لیے اتنا ہی آسان ہے۔ جتنا ضدی اور ہٹ دھرم مشرکین اور ان کے گمراہ سربراہوں کو عبرتناک سزائیں دینا۔

مندرجہ بالا موازنے میں وہ لوگ جو صرف زبانی کلامی ایمان لاتے ہیں۔ دراصل دین کے ایک کنارے پر کھڑے ہیں اور معمولی سے وہم اور وسوسے روگرداں ہو جاتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کا کوئی نیک عمل بھی نہیں۔ لیکن صالحین اور مومنین دائرہ اسلام کے مرکز میں واقع ہیں اور کڑی سے کڑی آزمائش بھی ان کو متزلزل نہیں کر سکتی، ان کے ایمانی درخت کی مضبوط جڑیں ہیں اور ان کے اعمال صالح اس کے میٹھے پھلوں کی طرح شاخوں پر عیاں ہیں۔ زیرِ بحث آیتوں کے مفہوم کا ایک رُخ یہ ہے اور دوسرا یہ کہ گمراہ گروہ کے معبود کسی قسم کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے، بلکہ مہلک و ضرر رساں ہیں۔ جبکہ مومنین کا سرپرست صاحبِ قدرت ہے اور ان کے لیے طرح طرح کا دور قسم قسم کی نعمتیں مہیا کرتا ہے۔

[1] البتہ "المیزان" کے فاضل مؤلف نے "یدعوا" سے یقول مراد لیا ہے جو آیت کے ظاہری معنی سے بعید ہے

۱۵۔ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ○

۱۶۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يُّرِيْدُ○

۱۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئِيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ○

ترجمہ

۱۵۔ جس شخص کو یہ گمان ہے کہ اللہ دُنیا و آخرت میں اپنے پیغمبر کی مدد نہیں کریگا (وہ اسی وجہ سے پیچ و تاب کھا رہا ہے، پس جو کر سکتا ہے کر لے) وہ اپنے گھر کی چھت سے رسی باندھ کر اس سے لٹک جائے اور خود کشی کر لے (اور موت کے گڑھے تک جا پہنچے) اور دیکھ لے کہ آیا یہ کام اس کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر سکتا ہے؟

۱۶۔ اسی طرح ہم نے قرآن کو واضح آیتوں کی صورت میں اُتارا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

۱۷۔ صاحبانِ ایمان اور یہودیوں، صابئین، عیسائیوں، مجوسیوں اور مشرکوں کے درمیان

اللہ روزِ قیامت فیصلہ چکا دے گا، حق کو باطل سے جدا کرکے دکھائے گا، اللہ ہر چیز پر گواہ ہے (اور ہر چیز سے آگاہ ہے)

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کی شانِ نزول بعض مفسرین نے یوں بیان کی ہے: "بنی اسد" اور بنی غطفان کہ جن کے ساتھ رسول اللہؐ کا ایک معاہدہ تھا۔ ان کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں خدا، محمدؐ کی مدد بند نہ کر دے۔ اس صورت میں ہم اپنے حلیف یہودیوں سے کٹ جائیں گے۔ اور ان سے کھانے پینے کی اشیاء نہیں لے سکیں گے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو تنبیہ کی گئی اور ان کی شدید مذمت کی گئی۔

بعض دوسرے مفسرین نے شانِ نزول کے ضمن میں یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کا گروہ جو کفار پر شدتِ غضب کی بنا پر کسی اقدام کے لیے بے قرار اور بے تاب تھا۔ یہ کہتا تھا کہ پیغمبرِ اکرمؐ کی مدد کے سلسلے میں اللہ کا وعدہ کیوں پورا نہیں ہو رہا؟ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی اور ان کی جلد بازی پر ان کی سرزنش کی گئی۔[1]

تفسیر

قیامت ــــ تمام اختلافات کے خاتمے کا دن

گذشتہ آیتوں میں کمزور ایمان والے لوگوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ زیرِ بحث آیتوں میں بھی ایک اور رُخ سے انہی کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے۔ جو شخص اس وہم میں مبتلا ہے کہ اللہ دُنیا و آخرت میں اپنے پیغمبرؐ کی مدد نہیں کرے گا اور غیظ و غضب میں پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اس سے جو بن پڑے کر گزرے چاہے اپنے گھر کی چھت سے رسہ باندھ کر اس سے لٹک جائے۔ اپنی زندگی کا خاتمہ کرے اور موت کی وادی میں جا پہنچے اور دیکھ لے، کیا اس طرح اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے (من کان یظن ان لن ینصرہ اللہ فی الدنیا والاخرۃ فلیمدد بسبب الی السماء ثم لیقطع فلینظر ھل یذھبن کیدہ ما یغیظ) اس تفسیر کو عظیم مفسرین نے ایک قابلِ توجہ احتمال کے طور پر پیش کیا ہے۔[2]

اس تفسیر کے مطابق "لن ینصرہ اللہ" کی ضمیر پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف پلٹتی ہے۔ اور "سماء" سے مراد گھر کی چھت ہے

---

[1] ابوالفتوح رازی اور فخرالدین رازی کی تفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔

[2] تفاسیر مجمع البیان، تبیان، فخرالدین رازی، ابوالفتوح، صافی، قرطبی اور المیزان ملاحظہ فرمائیں۔

(کیونکہ "سماء" کا لفظ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اُوپر کی طرف ہو) "لیقطع" دم گھٹنے، سانس بند ہونے اور موت کی حالت تک پہنچ جانے کے معنی میں ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور احتمالات بھی ہیں، مگر ان سب کا ذکر ضروری نہیں۔ صرف دو قابلِ ملاحظہ ہیں۔

۱۔ (سماء) سے مراد آسمان ہے۔ وہ لوگ جن کا یہ خیال ہے کہ اللہ اپنے پیغمبر کی مدد نہیں کرے گا۔ وہ آسمان کی طرف جائیں۔ یعنی آسمان پر چڑھ جائیں۔ اس میں ایک رسی لٹکائیں اور اس کا پھندا بناکر زمین و آسمان کے درمیان پھانسی پالیں تاکہ ان کا دم گھٹ جائے (یا لٹک کر خود رسی کو کاٹ لیں تاکہ دھڑام زمین پر آرہیں) پھر دیکھو ان کو کچھ سکون میسر آتا ہے؟

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ مذکورہ ضمیر پیغمبر اکرمؐ کی بجائے خود ان اشخاص کی طرف پلٹتی ہے۔ یعنی ان کی طرف جو اس بدگمانی کا شکار ہیں اس طرح زیر بحث آیت کا معنٰی یہ ہوگا کہ "وہ افراد جن کا یہ خیال ہے کہ خدا ان کی مدد نہیں کرتا اور ان کے ایمان کی وجہ سے ان کی روزی بند ہو جاتی ہے۔ جو کچھ ان سے ہو سکتا ہے کریں۔ آسمان کی طرف چلے آئیں اور اپنے آپ کو ایک رسّی سے لٹکائیں پھر اسی رسی کو کاٹ کر گریں تو کیا یوں ان کا غصہ ٹھنڈا ہوگا" قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تمام مفسرین نے کم حوصلہ، زود رنج اور کمزور ایمان والے اشخاص کے بارے میں نفسیاتی لحاظ سے روشنی ڈالی ہے کہ جس وقت ان کی حالت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کو آگے راہ نہ ملے تو وہ گھبرا کر جنونی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ کبھی دیواروں پر مکّے برساتے ہیں، تو کبھی یہ چاہتے ہیں کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں، آخر کار اپنے قہر و غضب کو ختم کرنے کے لیے خودکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں جبکہ ان میں سے کوئی بھی حرکت ان کی مشکل حل نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اگر وہ صبر و تحمل سے کام لیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں، خود اعتمادی پیدا کریں اور مسائل کا مقابلہ استقامت سے کریں تو مسائل کا حل یقیناً ممکن ہے اس کے بعد کی آیت گزشتہ تمام آیتوں کا مفہوم سمیٹتے ہوئے بیان کرتی ہے، اس طرح ہم نے قرآن کو کھلی نشانیوں کی صورت میں نازل کیا ہے (وکذٰلک انزلناہ اٰیات بینات) معاد اور قیامت کے وجود کے ضمن میں دلائل دیتے ہوئے۔ انسان کا تخلیقی دور، نباتات کی نمو، بالیدگی اور مردہ زمینوں کی سرسبزی و شادابی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بتوں کی نااہلی کے دلائل ہیں اور آخر میں ان لوگوں کے بارے میں بیان ہے، جو دین کو مادی مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد آیت آخر میں بیان کرتی ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود صرف واضح اور کھلی نشانیاں ہی کافی نہیں ہیں۔ بلکہ قبولِ حق کے لیے ذہنی آمادگی کی بھی ضرورت ہے۔

"اور اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے (وان اللہ یھدی من یرید)

ہم نے اکثر کہا ہے کہ اللہ کا ارادہ اور خواہش بغیر کسی وجہ کے نہیں ہوا کرتی۔ وہ حکیم و مدبر ہے اور اس کے تمام اقدامات کسی خاص قانون کے تحت ہوتے ہیں۔ جو شخص اس کی راہ میں جہاد کے لیے اُٹھ کھڑا ہو اور دل سے ہدایت کا خواہاں ہو تو وہ اس کی واضح راہنمائی کرتا ہے۔ [1]

زیر بحث آخری آیت چھ مختلف مذاہب کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جن میں ایک مسلمان اور مومن ہیں: صاحبانِ ایمان اور یہودی

---

[1] "ان اللہ یھدی من یرید" اس جملے کے بارے میں مشہور یہی ہے کہ اس میں مبتداء محذوف ہے اور دراصل یہ جملہ یوں ہے۔ "الامر ان اللہ یھدی من یرید" دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان (الف پر زبر اور زیر دونوں) کے معنی میں ہو اور درمیان میں کوئی لفظ محذوف نہ ہو۔

صابئیوں، عیسائیوں مجوسیوں اور مشرکوں کے درمیان، قیامت کے دن، اللہ فیصلہ فرمائے گا اور حق کو باطل سے الگ کرکے دکھائے گا۔
(اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالصَّابِئِیْنَ وَالنَّصٰرٰی وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا اِنَّ اللّٰہَ یَفْصِلُ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ")۔

قیامت کے جتنے نام آئے ہیں ان میں "یوم الفصل" یعنی حق کو باطل سے الگ کرنے کا دن" یوم البروز" چھپے ہوئے حقائق سے آشکار ہو جانے کا دن اور اختلافات مکمل طور پر ختم ہو جانے کا دن بھی ہیں۔ ضرور بالضرور اس دن اللہ تمام اختلافات کو مٹا دے گا۔ کیونکہ وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے (اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ)۔

چند اہم نکات

۱۔ **آیتوں کا ایک دوسرے سے تعلق** اس آیۂ مجیدہ کا تعلق پچھلی آیت سے اس طرح ہے کہ پچھلی آیۂ میں ہدایت چاہنے والوں کی ہدایت کا ذکر تھا، چونکہ ہر دل ہدایت پسند نہیں ہوا کرتا اور تعصب ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید ہدایت حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ یہ دھڑے بندیاں اور اختلافات قیامت تک باقی رہیں گے۔ صرف اس دن تمام چھپے ہوئے حقائق واضح ہوں گے اور اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ علاوہ بریں پہلی آیتوں میں تین قسم کے لوگوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ ایک وہ جو بلاکسی دلیل و ثبوت کے خدا اور قیامت پر بحث کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں اور تیسرے کمزور ایمان والے جو ہوا کے رخ پر اڑنے والے ہیں۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں صاحبانِ ایمان کے مقابلے میں آنے والے گروہوں میں سے بعض نمونے کے طور پر بیان کئے گئے ہیں اس سے قطع نظر گذشتہ آیتوں میں قیامت کے اغراض و مقاصد کے بارے میں گفتگو تھی۔ جبکہ یہ آیۂ کہتی ہے کہ قیامت کا ایک مقصد اختلافات کو مکمل ختم کرکے یگانگت کو معرضِ وجود میں لانا ہے۔

۲۔ **مجوسی کون ہیں؟** سارے قرآن مجید میں صرف اس آیۂ میں لفظ "مجوس" آیا ہے۔ اس لحاظ سے کہ مجوسیوں کو مشرکین کے مقابلے میں آسمانی ادیان کے پیروؤں کی صف میں شامل کیا گیا ہے۔ قرین قیاس ہے کہ مجوسی بھی کسی نبی کی اُمت اور کسی دین کے پیرو تھے۔ البتہ آج کل زرتشت کی تاریخ میں مجوسیوں کا کوئی ذکر نہیں اور مورخین نے زرتشت کو حضرت عیسیٰ کے گیارہ یا چھ سات صدیاں پہلے لکھا ہے (اعلام القرآن ص۵۵) اس حیران کن اختلاف سے صاف ظاہر ہے کہ زرتشتی تاریخ کس قدر مبہم ہے مشہور یہ ہے۔ کہ زرتشت "اوستا" نامی کتاب رکھتا تھا۔ جو ایران پر سکندر اعظم کے قبضے کے وقت ناپید ہوگئی اور ساسانی بادشاہوں کے زمانے میں دوبارہ لکھی گئی[۱] زرتشتیوں کے نظریات کے بارے میں بھی خاص معلومات نہیں ملتیں البتہ ان کا دو مبدا (خیر و شر یا نور و ظلمت) کا عقیدہ مشہور ہے، بھلائی اور نور کے خدا کو "اھورا مزدا" اور برائی اور ظلمت کے خدا کو "اھریمن" کہتے ہیں۔ ہوا، پانی، مٹی اور آگ چار عناصر کا احترام کرتے ہیں۔ آگ سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں بھی ہوں، چھوٹا موٹا آتشدان ضرور بنا لیتے ہیں۔ اس لیے ان کو آتش پرست

---

[۱] تفسیر المیزان ج ۱۴، ص ۳۹۲

بھی کہتے ہیں

بعض لفظ "مجوس" کو جو اس مذہب کے علماء اور پیشواؤں کے لیے بولا جاتا ہے "مغ" سے مشتق سمجھتے ہیں اور لفظ "موبد" جو آج کل ان کے علماء کے لیے مستعمل ہے، دراصل "مغوذ" سے ہی ہے۔ اسلامی روایات میں انہیں کسی نبیؐ کی اُمت قرار دیا گیا ہے۔ بعد میں یہ لوگ بھٹک کر شرک آمیز نظریات اپنا بیٹھے۔ ایک روایت ہے کہ مکّہ کے بعض مشرکین نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ جزیہ لیکر انھیں بُت پرستی کی اجازت دے دیں۔ آپؐ نے فرمایا میں اہلِ کتاب کے علاوہ کسی سے جزیہ نہیں لیتا، انھوں نے اعتراض کیا کہ آپ تو "ھجر" کے باسی مجوسیوں سے بھی جزیہ لیتے ہیں۔ تب آپؐ نے فرمایا

"اِنَّ المجوس کان لھم نبی فقتلوہ وکتاب احرقوہ"

مجوسی ایک نبی کی اُمت تھے جسے انھوں نے قتل کر دیا اور ایک کتاب رکھتے تھے جسے انھوں نے جلا ڈالا۔[1]

"اصبغ بن نباتہ" سے ایک اور روایت ہے کہ حضرت امیرؑ نے ایک دفعہ بر سرِ منبر فرمایا۔

"سلونی قبل ان تفقدونی"

"اپنے درمیان مجھے نہ پانے سے پہلے پہلے مجھ سے جو چاہو پوچھ لو"

مشہور زمانہ منافق اشعث بن قیس کھڑا ہوا اور پوچھا۔

یا امیرالمومنین! مجوسیوں سے جزیہ کس طرح لیا جا سکتا ہے، جبکہ نہ وہ کسی نبی کی اُمت ہیں، نہ کسی کتاب کے پیرو؟

آپؑ نے فرمایا

قد انزل اللہ الیھم کتابًا وبعث الیھم نبیًّا۔

"اللہ نے ان پر ایک کتاب نازل کی تھی اور ایک نبی ان کی طرف بھیجا تھا"[2]

امام سجاد، علی بن الحسین علیہما السلام نے پیغمبرِ اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"سنوا بھم سنۃ اھل الکتاب۔ یعنی المجوس۔

"مجوسیوں سے اہلِ کتاب کا سا برتاؤ کیا کرو"[3]

یاد رہے کہ مجوسی کی جمع مجوس ہے۔

۲۔ صابئین کون ہیں؟

مذکورہ بالا آیت سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صابئین بھی کسی آسمانی دین کے پیرو تھے خصوصاً جب کہ ان کا ذکر یہود و نصاریٰ کے درمیان کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین انھیں حضرت یحییٰ بن زکریاؑ جنہیں عیسائی یحییٰ تعمید دہندہ کہتے ہیں کے پیرو سمجھتے ہیں۔ دوسرے مفسرین کے مطابق صابئین وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے نظریات کو مخلوط کر کے ایک نیا مذہب بنا لیا ہے۔ لہٰذا یہ لوگ دونوں کے درمیان واسطہ سمجھے جاتے ہیں۔

"صائبین بہتے پانی سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زیادہ تر آبادیاں بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے

---

[1] [2] [3] وسائل الشیعہ جلد ۱۱ ابواب جہاد العدو باب ۴۹ صفحہ ۹۶

واقع ہیں۔ بعض مفسرین نے ان پر ستارہ پرست ہونے کا الزام بھی لگایا ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا آیۂ مجیدہ اس پر دلالت نہیں کرتی۔ کیونکہ ان کا ذکر مشرکین کی صف میں نہیں کیا گیا (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۶۲ کی تشریح سے رجوع کیجیے)۔

۴۔ توحید سے انحراف کرنے والے گروہوں کی ترتیب

مذکورہ بالا آیت میں تحریف شدہ پانچ مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے ان کی ترتیب غالباً توحید سے درجۂ انحراف کے مطابق ہے۔ مسلمانوں کے بعد سب سے پہلے یہودیوں کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ توحید سے ان کا انحراف کچھ کم درجے کا ہے۔ اس کے بعد صابئین کا ذکر ہے جو عقاید کے اعتبار سے یہودیوں اور نصاریٰ کے درمیان ہیں اس لیے دوسرے نمبر پر ہیں تیسرے نمبر پر تثلیث کے قائل نصاریٰ کا ذکر ہے، ان کے بعد سارے عالم کو خیر و شر کے دو حصوں میں تقسیم کرنے والے اور ہر شعبے کے لیے دو مبدا کے قائل مجوسی ہیں۔ آخر میں بت پرست اور مشرکین جو توحید کے بالکل برعکس ہیں، کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۸۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۟

ترجمہ

۱۸۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین میں رہنے والے سب ہی اللہ کیلیے سجدہ کرتے ہیں، اسی طرح سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چلنے والے جاندار اور بہت سے انسان اسی کے لیے سربسجود ہیں، جب کہ بہت سے لوگ انکار کرتے ہیں اور ان کے لیے عذاب کا فرمان حتمی ہے اور جس کو اللہ رسوا کرے اسے کون باعزت بنا سکتا ہے۔ بے شک اللہ جس کام کو چاہتا ہے اور (صحیح سمجھتا ہے) انجام دیتا ہے۔

تفسیر

عالم کی تمام موجودات اس کی بارگاہ میں سربسجود ہیں

گزشتہ آیتیں مبداء و معاد کے بارے میں تھیں۔ زیر بحث آیت اسی مضمون کی تکمیل کرتے ہوئے مسئلہ توحید اور خدا شناسی کو پیش کرتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرکے کہا جارہا ہے: کیا تو نہیں دیکھتا کہ آسمانوں پر رہنے والے اور وہ جو روئے زمین پر ہیں۔ سب کے سب اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہیں۔ اور سورج چاند ستارے پہاڑ، درخت اور چلنے پھرنے والے

جانور بھی (الم تر ان اللہ یسجد لہ من فی السماوات ومن فی الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب)۔

اور بہت سے لوگ بھی سجدہ کرتے ہیں۔ جبکہ دوسرے بہت سے انکار کرتے ہیں اور مستوجب عذاب ٹھہرتے ہیں۔" (و کثیر من الناس وکثیر حق علیہ العذاب)۔ اس کے بعد کہا جارہا ہے۔

"یہ لوگ خدا کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور جو خدا کے حضور بے وقعت ہو، اس کی کوئی توقیر نہیں کرتا اور وہ سعادت و ثواب سے بہرہ ور نہیں ہوتا (ومن یھن اللہ فمالہ من مکرم)۔ بے شک خدا جس کام کو قرین مصلحت سمجھتا ہے انجام دیتا ہے" صاحبان ایمان کو عزت و احترام اور منکرین کو ذلیل و خوار کرتا ہے (ان اللہ یفعل ما یشاء)

چند نکات

۱۔ یہ سب چیزیں سجدہ کس طرح کرتی ہیں: قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں تمام موجودات کے سجدہ کرنے، تسبیح و تقدیس کرنے، حمد بیان کرنے اور نماز پڑھنے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ واضح کیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا چار عبادتیں صرف انسانوں ہی سے مخصوص نہیں، بلکہ جمادات تک اس میں شریک ہیں۔ اگرچہ سورہ رعد (جلد ۵) اور سورہ اسرار (جلد ۶) میں علی الترتیب آیت نمبر ۱۵ اور ۴۴ کی تشریح کرتے ہوئے ہم نے اسی موضوع پر کسی قدر بحث کی ہے لیکن یہاں بھی اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر کچھ اشارے کرنا چاہتے ہیں۔ زیر بحث آیت میں جس سجدے کا ذکر ہے اس کی دو قسمیں ہیں یعنی عالم موجودات کی تمام چیزیں یا سجدۂ تکوینی کرتی ہیں یا سجدۂ تشریعی فطرت اور عالم اسباب کے قوانین کے تحت ہر ایک شے کا بغیر کسی شرک کے کمال خضوع و خشوع کے ساتھ تسلیم حق رہتے ہوئے اپنے کام میں سجدۂ تکوینی ہے۔ کائنات کا ایک ذرہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حتیٰ کہ بڑے بڑے نافرمانوں نمرود اور فرعون کے دماغوں کے خلیے اور ان کے جسموں کے تمام ذرات بھی یہ سجدہ کرتے رہے ہیں۔

محققین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ کائنات کے تمام ذرات ایک قسم کا ادراک و شعور رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے زبان حال سے اللہ کی حمد و تسبیح بجا لاتے ہیں۔ اور یہی ان کا سجدہ اور نماز ہے (اسی مفہوم کو ہم نے سورۂ اسرا کی آیہ نمبر ۴۴ کی تشریح کے ذیل میں بیان کیا ہے) اور اگر ذرات کا شعور تسلیم نہ کیا جائے تو ذرات کا عالم ہستی کے خاص نظام کے تحت محو کار رہنا کسی طور قابل انکار نہیں ہے۔ البتہ سجدۂ تشریعی، ذوالعقول کی طرف سے معرفت و شعور کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہونے کو کہتے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان بھی اسی کائنات میں سے ہے اور جب مذکورہ بالا آیت میں تمام کائنات کے سجدے کا ذکر ہوا تو انسان بھی اس میں آگیا، پھر انسان کا ذکر الگ سے کیوں کیا گیا؟

تھوڑی سی توجہ کرنے سے جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس آیت میں لفظ "سجدہ" تشریعی و تکوینی" دونوں قسم کے سجدوں کو دامن میں لیئے ہوئے ہے۔ چنانچہ سورج، چاند ستارے، پہاڑ درخت اور جانوروں کے لیے تکوینی، لیکن انسان کے لیے تشریعی مراد لیا گیا ہے، جسے بہت سے لوگ بجا لاتے ہیں۔ جب کہ بعض لوگ روگردانی بھی کرتے ہیں۔ اور کثیر

حق علیہ العذاب" کا مصداق بنتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک لفظ کا جامع اور وسیع مفہوم میں استعمال، اس کے کئی ایک مصادیق کے ہوتے ہوئے بھی کسی خلل کا سبب نہیں ہوتا۔ یہ اصول تو انھوں نے بھی مانا ہے جو کسی مشترک لفظ کا متعدد معانی میں استعمال صحیح نہیں سمجھتے چہ جائیکہ جو صحیح سمجھتے ہوں۔ (غور کیجیے گا)

۲۔ کیا فرشتوں کا سجدہ "تشریعی" ہے؟ بے شک (یسجد لہ من فی السماوات ...) کے جملے میں فرشتے بھی شامل ہیں۔ لیکن ان کا سجدہ کونسا ہے "تکوینی" یا "تشریعی"؟ اگر فرشتوں کی عقل و شعور اور صاحب ارادہ ہونے کو مدنظر رکھا جائے تو ان کا سجدہ "تشریعی" نظر آتا ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے ساتھ با خضوع وخشوع بطور عبادت انجام پاتا ہے۔ سورہ تحریم آیۃ ۶ میں ارشاد ہوتا ہے۔

لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون

اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے، بجالاتے ہیں۔

۳۔ چند سوالات اور ان کے جوابات "من فی الارض" کے جملے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں انسان بھی شامل ہیں۔ لیکن اس کے بعد "کثیر من الناس" کیوں آیا ہے۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ "کثیر من الناس" کا جملہ "من فی الارض" کے جملے کی وضاحت کے لیے آیا ہے۔ یعنی زمین پر رہنے والے دو گروہ ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکنے والا مومنین کا گروہ، دوسرا باغی کافروں کا گروہ۔ بعض مفسرین نے ایک اور خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ یہ کہ "من فی الارض" کا جملہ جو عمومی حیثیت رکھتا ہے "سجود تکوینی" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس میں تمام انسان حتیٰ کہ کافروں کے وجود کا ایک ایک جز بھی شامل ہے۔ جب کہ "کثیر من الناس" کا جملہ صرف "سجود تشریعی" کی طرف اشارہ ہے، جس کے لحاظ سے ان کا عمل مختلف ہے۔

ایک احتمال اور بھی ہے کہ "من فی الارض" دراصل زمین پر رہنے والے فرشتوں کے لیے آیا ہے، جس طرح "من فی السماء" آسمان پر رہنے والے فرشتوں کے لیے ہے اور "کثیر من الناس" زمین پر بسنے والے انسانوں کے لیے آیا ہے۔

(ii) زیر بحث آیت میں آسمان و زمین پر بسنے والوں کا ذکر ہے۔ خود آسمان و زمین کا کیوں نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "نجوم" کے ذکر سے خود آسمان کا ذکر کر دیا گیا ہے اور "جبال" جو زمین کا ایک اہم حصہ ہیں، کے ذکر سے زمین کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

(iii) آخری سوال یہ ہے کہ آیت کے شروع میں "الم تر" (کیا تو دیکھتا نہیں) کیوں فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ موجودات عالم کا تکوینی سجدہ آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں "رؤیت" "علم" کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی بہت ہی واضح حقائق کو مشاہدے کے ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً: کیا آپ دیکھتے نہیں کہ فلاں شخص زیادہ حاسد اور بخیل ہے یا فلاں شخص عالم اور عادل ہے۔ حالانکہ حسد، بخل، علم اور عدل ایسی صفات نہیں ہیں کہ جو دیکھی جا سکیں دراصل یہاں ان الفاظ سے مراد علم الیقین کا ادراک ہے۔

۱۹۔ هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِیۡ رَبِّهِمۡ ۫ فَالَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَهُمۡ ثِیَابٌ مِّنۡ نَّارٍ ؕ یُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِهِمُ الۡحَمِیۡمُ ۚ

۲۰۔ یُصۡهَرُ بِهٖ مَا فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ وَالۡجُلُوۡدُ ؕ

۲۱۔ وَلَهُمۡ مَّقَامِعُ مِنۡ حَدِیۡدٍ

۲۲۔ كُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا مِنۡ غَمٍّ اُعِیۡدُوۡا فِیۡهَا وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ؑ

۲۳۔ اِنَّ اللّٰهَ یُدۡخِلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ یُحَلَّوۡنَ فِیۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّلُؤۡلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمۡ فِیۡهَا حَرِیۡرٌ

۲۴۔ وَهُدُوۡۤا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الۡقَوۡلِ ۖۚ وَهُدُوۡۤا اِلٰی صِرَاطِ الۡحَمِیۡدِ

ترجمہ

۱۹۔ یہ دو مخالف گروہ ہیں۔ جنہوں نے اپنے پروردگار کے بارے میں آپس میں جھگڑا کیا۔ پس جو منکر رہے۔ ان کے لیے آگ کے کپڑے تیار کیے جائیں گے اور ان کے سروں پر کھولتا ہوا مائع انڈیلا جائے گا۔

۲۰۔ جو ان کے جسموں کے اندر اور باہر کے حصوں کو پگھلا کے رکھ دے گا۔

۲۱۔ ان کے لیے آہنی گرز ہیں۔

۲۲۔ جب وہ دوزخ کی عقوبتوں سے نکلنا چاہیں گے۔ انہیں اس میں پھر لوٹا دیا جائے گا کہ جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو

۲۳۔ ایمان لانے اور اعمالِ صالح کرنے والوں کو اللہ فردوس بریں کے باغات میں بھیج دے گا۔ جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا، اور وہاں انھیں ریشمی پوشاک عطا کی جائے گی۔

۲۴۔ اور انھیں پاکیزہ باتوں کی ہدایت دی جائے گی اور ان کی راہنمائی اللہ کے اس راستے کی طرف کی جائے گی جو قابل ستائش ہے۔

شانِ نزول

شیعہ اور سُنی مفسرین میں سے بعض نے مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کی شان نزول یوں نقل کی ہے۔

جنگِ بدر میں مُسلمانوں کی طرف سے جناب امیر حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب میدان کارزار میں نکلے اور ولید بن عتبہ، عتبہ بن ربیع اور شیبہ بن ربیعہ کو قتل کیا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی اور مجاہدین کا یہ واقعہ بیان کیا۔ ابوذر غفاری قسم کھایا کرتے تھے کہ یہ آیت ان جو مردوں کی شان میں نازل ہوئی ہے

لیکن متعدد بار اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ کسی آیت کا کسی ذات کے ساتھ مخصوص ہونا اس کے عمومی مفہوم پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

---

[1] طبری نے مجمع البیان، فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر، آلوسی نے روح المعانی، سیوطی نے اسباب النزول اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

تفسیر

دو مد مقابل گروہ

گزشتہ آیتوں میں مومنین سے ایک گروہ اور کفار کے مختلف گروہوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ مومنین اور غیر مومنین اپنے پروردگار کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہیں۔

ھذان خصمان اختصموا فی ربھم۔[1]

کفار کے پانچ گروہ ایک طرف اور مومنین کا ایک گروہ دوسری طرف اگر بغور سوچیں تو معلوم ہوگا کہ تمام ادیان میں اختلاف کی بنیاد پروردگار عالم کی ذات و صفات پر ہی ہے نتیجۃً اختلافات نبوت اور معاد و قیامت تک بڑھ جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم یہاں لفظ "دین" کو مقدر مانیں اور کہیں کہ ان کا جھگڑا اپنے پروردگار کے دین کے بارے میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام تر اختلاف کی جڑ اور بنیاد توحید میں اختلاف ہے اور اصل میں تمام مسخ شدہ اور تحریف شدہ باطل ادیان کسی نہ کسی طرح کے "شرک" میں مبتلا ہیں، جس کے آثار ان کے تمام تر عقائد سے ظاہر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد کی آیت میں کفار کے لیے چھ قسم کی سزاؤں کا ذکر ہے۔ وہ کفار جو جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ حق کا انکار کرتے ہیں سب سے پہلے ان کے کپڑوں اور لباس کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ان کے کپڑے آگ سے تیار کیے جائیں گے۔ (فالذین کفروا قطعت لھم ثیاب من النار)۔ ہوسکتا ہے اس سے مراد یہ ہو کہ واقعی آگ کے ٹکڑے الگ کرکے لباس کی طرح سیئے جائیں گے یا اس سے یہ مراد ہو کہ آگ ان کو چاروں طرف سے لباس کی طرح گھیرے گی۔

اس کے بعد "حمیم" کا ذکر ہے۔ یعنی دوزخ کا کھولتا ہوا مائع ان کے سروں پر انڈیلا جائے گا۔

(یصب من فوق رؤوسھم الحمیم)۔[2]

یہ حمیم ان کے بدن کے ظاہر و باطن کو اس طرح متاثر کرے گا کہ یہ ان کے اندر کو بھی پگھلا دے گا اور باہر کو بھی۔

(یصھر بہ ما فی بطونھم والجلود)۔[3]

تیسرا یہ کہ جلانے والے آہنی تازیانے یا گرز ان کے لیے تیار ہیں۔

---

[1] خصمان میں تثنیہ ہے مگر اختصموا جو خصمان کا فعل ہے۔ جمع ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ مخالف دو اشخاص نہیں بلکہ دو گروہ ہیں۔ مزید براں کہ یہ دو مخالف گروہ صرف دو ہستوں میں نہیں ہیں۔ بلکہ چند معنوں میں ہیں۔ ہر گروہ باقیوں سے پیکار کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔

[2] "حمیم" یعنی گرم اور جلا دینے والا پانی۔

[3] یصھر "صھر" (بروزن قہر) کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی چربی پگھلانے کے ہیں البتہ "صاھر" بروزن "فاخر" داماد کے معنی میں ہے۔

ولھم مقامع من حدید ۔ ¹

چوتھی سزا ان کی یہ ہوگی، کہ جب کبھی وہ تکالیف سے تنگ آکر دوزخ سے نکلنے کی کوشش کریں گے، فوراً ان کو وہیں لوٹا دیا جائے گا اور یوں مخاطب کیا جائے گا کہ جلا دینے والا عذاب چکھو (کلما ارادوا ان یخرجوا منھا من غم اعیدوا فیھا و ذوقوا عذاب الحریق)۔

اس کے بعد والی آیت میں موازنہ کرتے ہوئے صالحین اور مومنین کی خوشحالی کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ دونوں گروہوں کی کیفیت کی تشخیص میں آسانی ہو سکے، مومنین کی جزا کے بھی پانچ درجات بیان کیے گئے ہیں۔

(i) پہلے ارشاد ہوا ہے "اللہ صاحبان ایمان اور اعمال صالح کرنے والوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا، جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہیں (ان اللہ یدخل الذین امنوا وعملوا الصالحات جنٰت تجری من تحتھا الانھار) گویا کفار کو آگ میں جلائے جانے کے مقابلے میں مومنین نہروں والے باغوں میں آرام و سکون میں ہوں گے۔

(ii) مومنین کے لباس اور زیب و زینت کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے کہ سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے بڑے ہوں گے اور ریشمی پوشاکیں زیب تن کیے ہوں گے (یحلون فیھا من اساور من ذھب ولؤلؤا ولباسھم فیھا حریر ²)۔

(iii) اس طرح مومنین جنت میں بہترین لباس زیب تن کیے ہوئے ہوں گے اور ان کے ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن ہوں گے۔ جس سے اس دنیا میں ممانعت تھی، کیونکہ دنیا میں ایسے لباس اور آرائش غرور و غفلت کا باعث بنتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر عوام کی محرومیت کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن جنت میں تو یہ مسائل ہی نہیں۔ لہٰذا پابندیاں اٹھا دی جائیں گی اور دنیا میں ممانعت کی تلافی کر دی جائے گی۔

البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اُس جہاں کی ماہیت و کیفیت اس دنیا سے بالکل الگ ہے، لہٰذا جس کیفیت کو ہم نے مروجہ الفاظ سے بیان کیا ہے اور دنیوی الفاظ استعمال کر کے جو معانی ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں وہاں اس سے کہیں ارفع و اعلےٰ حقائق و مصادیق موجود ہوں گے۔

(iv)(v) مومن کی چوتھی اور پانچویں جزا اور نعمتیں خالصتاً معنوی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے، انہیں پاکیزہ باتوں کی طرف رہنمائی کی جائے گی (وھدوا الی الطیب من القول)۔ یعنی ایسی روح پرور اور نشاط آفرین جو صاف ستھرے الفاظ اور پُر مغز معنی پر مشتمل ہو اور روح کو مدارج کمال کی طرف بڑھائے اور انسان کو فرحت بخشے اور اس کی روحانی نشوونما کا باعث ہو۔ اور لائق حمد و ثنا اللہ کی راہ کی طرف ان کی ہدایت کی جائے گی۔ (وھدوا الی صراط الحمید) ³ یعنی خدا

---

¹ "مقامع" "مقمع" بروزن منبر کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے آہنی گرز اور کوڑا، جو کسی کو روکنے یا سزا دینے کے لیے مارا جاتا ہے۔

² "اساور" "اسورہ" (بروزن مشورہ) کی جمع ہے اور یہ بھی "سوار" (بروزن "کتاب") کی جمع ہے۔ اس کا معنی دست بند یا کنگن کے ہیں۔ "سوار" فارسی کے لفظ "دستور" سے عربی زبان میں منتقل ہوا ہے اور عربی میں اس کی یہ صورت ہو گئی ہے۔

³ لفظ "حمید" "محمود" کے معنی میں اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو قابل ستائش ہو۔ یہاں اللہ مراد ہے۔ اس بنا پر "صراط الحمید" یعنی وہ راہ جو اللہ تعالیٰ کے قرب اور خوشنودی کے مقام کو جاتی ہو۔ البتہ آلوسی نے "روح المعانی" میں بیان کیا ہے کہ یہاں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شناسی کی راہ، قرب پروردگار عالم کی راہ اور عشق و عرفاں کی راہ۔ بے شک اللہ مومنین کو ان مفاہیم کی طرف ہدایت کرکے روحانی لذت کے آخری درجہ تک لے جاتا ہے۔

ایک مشہور مفسر علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ "طیب من القول" سے مراد توحید اور اخلاص ہے اور "صراط الحمید" سے مراد ولایت اور اللہ کے مقرر کردہ رہبروں کی قیادت کو قبول کرنا ہے، ہماری نظر میں یہ حدیث زیر بحث آیت کا بہترین مصداق ہے۔

مذکورہ بالا آیتوں کی شانِ نزول اور مختلف تفاسیر و تعبیرات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ یہ تکلیف دہ اور اذیت ناک شدید عذاب کفار کے اس گروہ کے لیے ہے۔ جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، کفار کے ان سرغنوں اور سرداروں میں سے کچھ ان لوگوں کی طرح ہیں جو میدان بدر میں جناب امیرؑ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہ بن حارث کے مقابلے میں نکلے تھے۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) یہاں حمید صراط کی صفت بیانیہ ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ قابلِ تعریف راستے کی طرف راہنمائی کی جائے گی۔ لیکن ہماری نظر میں پہلا مطلب زیادہ صحیح ہے۔

۲۵۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَ الۡبَادِ ؕ وَ مَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡہُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۵﴾

ترجمہ

۲۵۔ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مومنین کو اللہ کی راہ اور اس مسجد حرام سے روکتے ہیں، جس کو ہم نے مقامی لوگوں اور دوسروں کے لیے یکساں قرار دیا ہے۔

(دردناک عذاب کے مستحق ہیں) اور وہ جو اس سرزمین پر حق سے روگرداں ہو جائے اور ظلم کرے، اسے ہم اذیت ناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے

تفسیر

خدا کے گھر سے روکنے والے

گزشتہ آیتوں میں مطلق طور پر کفار کے بارے میں بات ہو رہی تھی ——————

جبکہ اس آیت میں ان میں سے ایک خاص گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ جو نافرمانیوں اور سنگین گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے علی الخصوص مسجد حرام اور حج کے عظیم الشان اجتماعات کے سلسلے میں رکاوٹیں ڈالتے تھے۔ لہٰذا ارشاد ہوتا ہے، جو لوگ کافر ہو گئے اور وہ راہِ حق سے دوسروں کو روکتے ہیں (اِنَّ الَّذین کفروا و یصدون عن سبیل اللّٰہ) اس طرح وہ مومنین کو توحید کے مرکز مسجد حرام سے روکتے ہیں۔

وہ مرکز جسے ہم نے ہر ایک کے لیے یکساں قرار دیا ہے، چاہے وہیں کا باسی ہو یا کسی اور جگہ سے آیا ہو۔ (والمسجد الحرام الّذی جعلناہ للناس سواء ن العاکف فیہ والباد) چنانچہ جو بھی اس جگہ حق سے روگرداں ہوگا اور ظلم و ستم سے اپنے ہاتھ آلودہ کرے گا، ہم اسے اذیت ناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ (ومن یرد فیہ بالحاد

بظلم نذقہ من عذاب الیم)۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار کا یہ گروہ انکارِ حق کے علاوہ تین بڑے گناہوں کا مرتکب ہوا ہے۔

i راہِ خدا، ایمان اور اللہ کی اطاعت میں رکاوٹ ڈالنا۔

ii زائرین کو اور عبادت کرنے والوں کو حرمِ خدا تک نہ پہنچنے دینا اور حرمِ خدا پر اپنا حق فائق قرار دینا۔

iii اس مقدس سرزمین پر ظلم و الحاد اور گناہ کا بازار گرم کرنا۔ چنانچہ دردناک عذاب کے مستحق اس گروہ کو اللہ سزا دے گا۔

چند اہم نکات

۱۔ دو مختلف صیغے اس آیت میں مذکورہ گروہ کے بارے میں کفر کا ذکر ماضی کے صیغے کے ساتھ ہے۔ جبکہ "راہِ حق میں رکاوٹ بننے" کا ذکر مضارع کے صیغے کے ساتھ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا کفر قدیمی ہے۔ مگر لوگوں کو راہِ حق سے ہٹانے کی ان کی کوششیں مسلسل اور دائمی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں "کفر" کا تعلق چونکہ عقائد کے ساتھ ہے اور یہ ایک ثابت شئے ہے۔ لہٰذا فعل ماضی کے ساتھ آیا ہے جبکہ "صد عن سبیل اللّٰہ" عملی کیفیت ہے۔ لہٰذا فعل مضارع کے ساتھ آیا ہے۔

۲۔ (صد عن سبیل اللّٰہ) کیا ہے؟ اس سے مراد ایمان اور اعمال صالح کی راہ میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ ڈالنا ہے۔ چاہے صرف نشر و اشاعت اور پراپیگنڈے کی حد تک ہو یا عملی اقدامات کی صورت میں ہو۔ اس میں سب شامل ہیں

۳۔ اس منبعِ فیض میں تمام لوگ برابر کے شریک ہیں "سواء العاکف فیہ والباد" اس جملے کے مفہوم کے بارے میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس مرکزِ توحید میں استحقاقِ عبادت سب کو یکساں طور پر حاصل ہے اور مناسکِ حج یا دیگر عبادات کی بجا آوری کے لحاظ سے کسی کے خانہ خدا کے نزدیک کسی کے معاملے میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ البتہ بعض نے اس مفہوم کی محدود عبادات سے بڑھا کر تمام حقوق تک بیان کی ہیں۔ یعنی مکہ اور اس کے گرد و نواح میں رہن سہن کا بھی سب کو یکساں طور پر حق ہے۔ اسی بنا پر بعض فقہا کا فتویٰ ہے کہ مکہ میں گھروں کی خرید و فروخت اور کرایہ داری حرام ہے۔ اور انہوں نے استدلال کے طور پر اسی آیت کو پیش کیا ہے

بعض روایات میں بھی حرمِ خدا کے زائرین کو مکہ کے مکانات میں قیام سے روکنے سے منع کیا گیا۔ البتہ بعض میں ممانعت حرمت کے اعتبار سے ہے اور بعض میں کراہت کے لحاظ سے۔

نہج البلاغہ کے خطوط میں خط نمبر ۶۷ میں جناب امیر علیہ السلام اپنے دور کے مکہ کے گورنر جناب قثم بن عباس کو خط تحریر فرمایا ہے وہ یوں ہے۔

ومر اھل مکۃ ان لا یاخذوا من ساکن اجرا، فان اللّٰہ سبحانہ یقول "سواء العاکف فیہ والباد" فالعاکف المقیم بہ، والبادی

الذی یحج الیہ من غیر اھلہ

"اہل مکہ کو حکم دو کہ جو لوگ شہر میں سکونت اختیار کریں، ان سے کوئی کرایہ نہ لیا جائے، کیونکہ اللہ فرماتا ہے کہ مقامی اور مسافر حقوق رکھتے ہیں۔" اور "عاکف" سے مراد مقامی لوگ ہیں اور "بادی" مختلف علاقوں سے حج کے لیے آنے والے کو کہتے ہیں۔

امام صادقؑ سے بھی اسی طرح کی ایک روایت ہے۔

کانت مکۃ لیست علی شیء منھا باب، وکان اول من علق علی بابہ المصراعین، معاویۃ بن ابی سفیان ولیس ینبغی لاحد ان یمنع الحاج شیئًا من الدور ومنازلھا۔

صدر اسلام میں مکہ میں گھروں کے دروازے نہیں ہوتے تھے۔ پہلا شخص جس نے اپنے گھر کا دروازہ لگایا، معاویہ تھا اور مناسب نہیں کہ کوئی شخص حاجیوں کو مکہ کے گھروں میں داخل ہونے سے روکے۔

اس طرح کی بعض اور روایتوں سے یہ مفہوم ملتا ہے کہ خانۂ خدا کے زائرین کا یہ حق ہے کہ مناسک حج کے اختتام تک گھروں کے صحنوں سے استفادہ کریں۔

البتہ یہ حکم بعد والی بحث سے متعلق ہے کہ آیۂ مجیدہ میں "مسجد الحرام" سے مراد، صرف حدود مسجد ہے یا مکہ کا تمام شہر۔ اگر صرف مسجد حرام مراد ہو تو پھر یہ حکم مکہ کے مکانات پر نافذ نہیں ہوگا۔ اور اگر ہم مکہ کے سارے شہر کو آیت کے مفہوم میں شامل سمجھیں تو مکانات کی خرید و فروخت یا کرایہ لینے دینے کا سوال پیدا ہوگا۔ لیکن ہماری نظر میں چونکہ فقہی منابع اور تفسیر کے لحاظ سے یہ مطلب پوری طرح ثابت نہیں لہٰذا تمام شہر کے مکانات پر حرمت کا حکم لگانا مشکل ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ اہل مکہ کو چاہیئے کہ بیت اللہ کے زائرین کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کریں اور گھروں کے معاملے میں اپنی سہولت نہ جتائیں۔ نہج البلاغہ کے خط اور دیگر روایات کا بھی ظاہراً اس مفہوم کی طرف اشارہ ہے اور شیعہ و سنی فقہا کے نزدیک حرمت والا قول زیادہ معتبر نہیں ہے۔ مزید وضاحت کے لیے جواہر الاسلام ج ۲۰ ص ۴۸ سے رجوع کریں۔

البتہ یہ مفہوم بھی مسلم ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ بیت اللہ کے متولی یا منتظم ہونے کا بہانہ بنا کر زائرین کے لیے کوئی چھوٹی سی بھی رکاوٹ پیدا کرے یا اسلام کے اس مرکز کو اپنے پراپیگنڈے کے لیے استعمال کرے۔

۴۔ اس آیت میں مسجد حرام سے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ مسجد حرام سے مراد حدود مسجد ہی ہیں، جبکہ بعض نے اس سے مراد مکے کا پورا شہر لیا ہے اور ثبوت کے طور پر سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت جو پیغمبر اکرمؐ کی معراج کے بارے میں نازل ہوئی ہے کو پیش کیا ہے۔

تفسیر کنز العرفان ج ۱ ص ۳۳۶ کے مطابق آیۂ معراج میں یہ تصریح موجود ہے کہ معراج کی ابتدا مسجد حرام سے ہوئی۔ جب کہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ جناب خدیجۃ الکبریٰ کے گھر یا شعب ابی طالب یا جناب ام ہانی کے گھر سے ہوئی اس بنا پر مسجد حرام سے شہر مکہ مراد ہے۔

لیکن ہماری نظر میں چونکہ آیت میں "مسجد حرام" کا لفظ صریحاً موجود ہے۔ لہٰذا آیت کی موجودگی میں تاریخ کو معتبر نہیں سمجھا جا سکتا اور

پاس کوئی دلیل نہیں کہ جس کی بنا پر ظاہراً آیت کا مفہوم بدلا جاسکے اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ معراج کی ابتدا خود مسجد حرام ہی سے ہوئی ہے۔ البتہ مذکورہ بالا چند روایات سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ زیر بحث حکم مکہ کے تمام مکانات پنا مذہب ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہراً یہ حکم استحبابی ہے اور کسی بھی مستحب حکم کے دائرے کو مختلف مناسبتوں کی بنا پر وسعت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں (غور کیجیے گا)

۵۔ ظلم کے ساتھ "الحاد" کا کیا مفہوم ہے

لغت میں "الحاد" حد اعتدال سے ادھر اُدھر ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اسی لحاظ سے قبر کو لحد کہا جاتا ہے کہ وہ قبر کھودنے کی جگہ سے ایک طرف کو ہٹ کر نیچے گڑھے کی صورت میں کھودی جاتی ہے۔ لہٰذا آیت میں "الحاد" کا مفہوم یہ ہے کہ کفار ظلم کے ذریعے میانہ روی سے تجاوز کرتے ہیں اور اس مقدس سرزمین پر نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ البتہ بعض مفسرین نے یہاں ظلم کو صرف "شرک" سے تعبیر کیا ہے۔ بعض نے شرک کے ساتھ حرام کو حلال کرنے کو بھی شامل کر لیا ہے، جبکہ بعض نے ہر فعل حرام کو "ظلم" میں شامل کیا ہے، حتیٰ کہ بدکلامی گالی گلوچ اور ماتحتوں کی برائی کرنے تک کو بھی "ظلم" کے وسیع مفہوم کے ذیل میں سمجھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس مقدس و محترم مقام پر چھوٹے سے چھوٹے گناہ کی سزا اور عذاب بھی بہت سخت ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک صحابی نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں آپ سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا۔

كل ظلم يظلم الرجل نفسه بمكة من سرقة أو ظلم احد او شيء من الظلم فاني اراه الحاداً ولذلك كان ينهى ان يسكن الحرم۔

ہر ظلم جو مکہ میں کوئی شخص اپنے اوپر کرے، چاہے چوری ہو یا کسی سے زیادتی ہو یا تشدد ہو، میں ان سب کو "الحاد" سمجھتا ہوں

اسی وجہ سے امام لوگوں کو مکہ میں زیادہ دیر تک قیام سے منع فرمایا کرتے تھے۔

"کیونکہ اس جگہ پر گناہ کی سزا زیادہ اور سخت ہے"[1]

کئی اور روایات بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں اور یہی مفہوم مطلق طور پر ظاہر آیت کے بھی ہم آہنگ ہے۔ اسی بنا پر بعض فقہا نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص حرم خدا میں ایسا گناہ کر بیٹھے، جس کی حد متعین ہے، اس پر حد کے علاوہ تعزیر بھی جاری کی جائے اور اس فتویٰ کی دلیل انھوں نے اس آیہ مجیدہ کے اس جملے کو قرار دیا ہے " نذقه من عذاب اليم "[2]

اس گفتگو کے مطابق جن مفسرین نے ظلم سے مراد صرف ذخیرہ اندوزی یا حدود حرم میں بغیر احرام باندھے داخلے کی ممانعت لیا ہے۔ ان کی مراد آیہ مجیدہ کا واضح مصداق بیان کرنا ہے ورنہ آیت کے وسیع تر مفہوم کو محدود کرنے کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۴۸۳

[2] کنز العرفان جلد ۱ ص ۳۲۵

۲۶۔ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْئًا وَّطَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝

۲۷۔ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۝

۲۸۔ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ۝

ترجمہ

۲۶۔ یاد کیجئے جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ تجویز کی (تاکہ وہ اس پر عمارت بنائیں ، ہم نے اس سے کہا) کسی چیز کو بھی میرا شریک نہ بنانا ، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام، رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے (بتوں اور دوسری آلودگیوں سے) سے پاک کرو۔

۲۷۔ لوگوں کو حج کی دعوت عام دو تاکہ دور دراز سے پیدل اور کمزور سواریوں پر سوار

ہو کر (خانہ خدا کی طرف) چلے آئیں۔

۲۸۔ تاکہ (اس حیات بخش پروگرام) میں اپنے مفادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اوران مخصوص ایام میں، چوپایوں کی صورت میں انھیں جو روزی دی ہے (قربانی کرتے ہوئے) اس پر اللہ کا نام لیں۔ پس قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ، اور تنگدست و محتاج کو بھی کھلاؤ۔

تفسیر

حج کے لیے دعوتِ عام

گذشتہ آیت جس میں مسجد الحرام اور خانہ خدا کے زائرین کے بارے میں بحث کی گئی ہے کی نسبت سے زیر بحث آیت میں پہلے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی تعمیر کی مختصر تاریخ بیان کی جارہی ہے، پھر حج کے وجوب اس کے فلسفے اور اس عظیم عبادت کے بعض احکام کا بیان ہے، دوسرے لفظوں میں اس آیت کے مختلف گوشوں کو واضح کرنے کے لیے گزشتہ آیت مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ آیت کے شروع میں، خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے: اس لمحے کو یاد کیجیے، جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ کو نمایاں کیا۔ تاکہ وہ اسی جگہ پر نئے سرے سے عمارت کھڑی کریں۔ (واذ بوّأنا لابراھیم مکان البیت)۔

"بوأ" "بواء" کے مادہ سے ہے، یعنی کسی عمارت کے برابر کسی جگہ کا مساوی یا مسطح ہونا۔ بعد ازاں یہ لفظ کسی جگہ کا کسی عمارت کی تعمیر کے لیے تیار کرنے کے لیے بولا جانے لگا۔ مفسرین کی روایات کے مطابق اس آیت میں "بوأ" سے یہ مراد ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو خانہ کعبہ کی وہ بنیادیں یا دیواریں دکھلا دیں جو حضرت آدمؑ نے تعمیر کی تھیں اور طوفانِ حضرت نوحؑ کے سبب گر گئی تھیں، ان بوسیدہ دیواروں کو کیسے دکھایا؟ اس کے جواب میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ تیز آندھی چلی، جس سے مٹی ایک طرف کو ہٹ گئی اور بنیادیں ظاہر ہو گئیں یا یہ کہ بادل کا ٹکڑا نمودار ہوا اس نے عین اسی جگہ سایہ کیا جہاں دیواریں تھیں۔ یا کسی اور طریقے سے وہ جگہ معین کی تو انھوں نے اپنے نورِ نظر اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر نئی عمارت کھڑی کر دی۔[1]

---

[1] خانہ کعبہ کی تعمیر کے بارے میں ہم اس تفسیر کی پہلی اور دوسری جلد علی الترتیب سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۲۷ اور سورۂ آل عمران آیت ۹۶ کے ذیل میں تفصیلاً بیان کر چکے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جب عمارت بن گئی تو ہم ابراہیم سے یوں گویا ہوئے کہ اس گھر کو توحید کا محور قرار دو کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہراؤ اور میرا گھر طواف کرنے والوں، قیام و رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو" (ان لا تشرك بی شیئا وطھر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود)[1]

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم مامور تھے کہ خانہ کعبہ اور اس کے گرد و نواح کو ظاہری و باطنی گندگی اور آلودگی سے محفوظ رکھیں بتوں اور شرک کے دوسرے مظاہر سے اس کو خالی رکھیں تاکہ اللہ کے بندے اس پاک مکان میں اللہ کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہ کرسکیں۔ اور ایسے منزہ ماحول میں طواف، نماز جو اس سرزمین کی اہم ترین عبادت ہے۔ بجالایا کریں۔

زیر بحث آیت میں ارکان نماز میں سے تین اہم ارکان قیام رکوع اور سجود کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ باقی افعال ان ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ البتہ مفسرین میں سے بعض نے "قائمین" سے مراد مکہ کے باسی لیے ہیں۔ لیکن چونکہ "قائمین" کا لفظ "طائفین" اور "رکع السجود" کے درمیان آیا ہے، اس لیے ہماری نظر میں یہاں "قائمین" سے مراد نماز میں "رکن قیام" کے ادا کرنے والے ہیں اور اسی مطلب کو اکثر شیعہ اور سُنی مفسرین نے بیان کیا ہے[2]

ضمناً یہ بھی واضح ہو جائے کہ "الرکع السجود" کے درمیان واؤ عاطفہ کیوں نہیں ہے۔ اگرچہ یہ دونوں اسما وصفت ہیں۔ (رکع جمع راکع یعنی رکوع کرنے والا اور سجود جمع ساجد یعنی سجدہ کرنے والا) یہ اس لیے ہے کہ عبادت کے دونوں انداز یکے بعد دیگرے اور ایک دوسرے سے متصل ہیں۔

خانہ کعبہ کے عبادت گزاروں کی عبادت کے لیے تیار ہو جانے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا جاتا ہے کہ "لوگوں کو حج کی دعوت عام دیجیئے تاکہ لوگ پیدل اور کمزور سواریوں پر دور دراز سے بیت اللہ کی طرف عازم حج ہوں" (واذن فی الناس بالحج یأتوك رجالا و علی کل ضامر یأتین من کل فج عمیق) اذن، اذان کے مادہ یعنی اعلان اور بلاوے کے معنی میں ہے۔ "رجال" جمع "راجل" یعنی پیدل چلنے والا کے معنے میں ہے، "ضامر" یعنی لاغر اور کمزور جانور۔ "فج" پہاڑی درے کو کہتے ہیں۔ اور کھلی سڑک کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "عمیق" کا یہاں مفہوم ہے "دور" علی بن ابراہیم والی روایت میں ہے کہ اس حکم کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ و تعالیٰ میں عرض کیا کہ بار الہا میری آواز تمام لوگوں تک نہیں پہنچتی تو فوراً ارشاد ہوا۔

"علیك الاذان وعلی البلاغ"

"تم اعلان کرو لوگوں تک پہنچا میں دوں گا"

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اس جگہ پر تشریف لائے، جسے مقام ابراہیم کہتے ہیں۔ کان میں انگلی ٹھونس مشرق و مغرب کی طرف رُخ کیا اور پکار کر کہا۔

---

[1] بعض مفسرین کے قول اس آیت میں ان الفاظ سے پہلے "اوحینا" کا لفظ مقدر ہے۔

[2] تفسیر المیزان، تفسیر فی ظلال القرآن، تفسیر البیان، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر کبیر از فخر الدین رازی؛ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ایھا الناس کتب علیکم الحج الی البیت العتیق فاجیبوا ربکم

لوگو! خانہ کعبہ کا حج تم پر فرض کر دیا گیا ہے، اپنے پروردگار کا بلاوا قبول کرو۔

چنانچہ اللہ نے ان کی آواز سب کے کانوں تک پہنچادی۔ حتیٰ کہ صلبِ پدر اور رحمِ مادر میں موجود افراد نے بھی سُن لیا اور جواب میں (لبیک اللّٰھم لبیک ...) بھی کہا۔ اس دن سے لے کر قیامت تک جتنے لوگ مراسم حج میں شریک ہُوتے ہیں یا ہوں گے۔ وہی ہیں جنہوں نے اس دن حضرت ابراہیمؑ کی آواز کا جواب دیا تھا۔ [1]

آیۂ مجیدہ میں سواری سے حج پر جانے والوں سے قبل پیدل جانے والوں کا ذکر ہے۔ یہ اس لیے کہ اوّل الذکر کا رتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ ہے، کیوں کہ وہ زیادہ تکلیف اُٹھاتے ہیں، چنانچہ پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے کہ پیدل حج پر جانے والے کے لیے ہر قدم پر سات سو نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے، جبکہ سوار کے لیے صرف ستر نیکیوں کا۔ [2]

یہ بھی ممکن ہے کہ خانۂ خدا کی زیارت کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ کہا گیا ہو کہ جو وسیلہ بھی میسر ہو حج کے لیے نکل پڑنا چاہیئے۔ اور ہمیشہ سواری کے انتظار میں نہیں رہنا چاہیئے

ضامر (یعنی کمزور جانور) یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ قاری یہ جان لے کہ سفرِ حج اس قدر کٹھن ہے کہ چلچلاتے صحراؤں اور بے آب و گیاہ بیابانوں سے گزرتے ہُوئے جانور کمزور پڑ جاتے ہیں، لہٰذا ان دشوار گذار راستوں کو طے کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیئے۔ اس لفظ سے ایک اور اشارہ بھی ملتا ہے۔ وہ یہ کہ ایسے جانور منتخب کیے جائیں جن کے جسم مشقت کی برابر مشق سے کمزور پڑ گئے ہوں۔ البتہ اعضاء اور پٹھے مضبوط ہوں، کیونکہ موٹے تازے جانور ایسے سفر میں کام نہیں آتے اور یہ اشارہ بھی ہے کہ نازونعمت سے پلے جانور تو کیا، یہ سفر ایسے انسانوں کا بھی کام نہیں۔

"من کل فج عمیق" کا مفہوم یہ ہے کہ نہ صرف لوگ مکہ کے گردونواح اور قرب و جوار سے حج کے لیے آئیں گے۔ بلکہ دور دراز سے بھی آئیں گے، اس جملے میں لفظ "کل" احاطہ کے معنیٰ میں نہیں بلکہ کثرت کے معنیٰ میں ہے۔

مشہور مفسر ابوالفتوح رازی اس آیہ کی تفسیر کرتے ہوئے "ابوالقاسم بشر بن محمد نامی ایک شخص سے ایک عجیب واقعہ نقل کرتا ہے، بقول اس کے:

ایک دفعہ میں نے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہُوئے ایک ضعیف آدمی کو دیکھا، جس کے چہرے پر لمبے سفر کی تھکن اور بے آرامی صاف پڑھی جاسکتی تھی اور حصار کے سہارے بڑے کرب کے ساتھ طواف کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور پوچھا بڑے میاں، کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کہنے لگا "اتنی دُور سے آیا ہوں کہ سفر ہی میں پانچ سال بیت گئے اور رنج و تعب سفر سے مضمحل اور بوڑھا ہو گیا ہوں" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہُوئے کہا، بے شک آپ نے حق تعالیٰ کی سچی محبت اور پُرخلوص اطاعت میں بڑی زحمت

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۴۸۸ کے مطابق تفسیر علی بن ابراہیم کا خلاصہ، آلوسی نے رُوح المعانی میں اور رازی نے تفسیر کبیر میں بھی اس مضمون کو کم و بیش تحریر کیا ہے۔

[2] تفسیر رُوح المعانی، مجمع البیان اور تفسیر کبیر از فخر الدین رازی۔

گوارا کی! یہ سن کر وہ فرطِ مسرت سے مسکرایا۔ اور اس نے یہ اشعار پڑھے۔

زر من هويت وان شطت بک الدار وحال من دونه حجب و استار

لا يمنعنك بعد من زيارته ان المحب لمن يهواه زوار!

اپنے محبوب سے ملنے ضرور جائیو! اگرچہ تیرے گھر سے کتنا ہی دُور کیوں نہ ہو اور راستے میں کیسی ہی رکاوٹیں، اور مزاحمتیں تیرا راستہ کیوں نہ روکیں۔ فاصلے کی طوالت اس سے ملنے میں ہرگز حائل نہ ہونے دیجیو، کیونکہ عاشق کو بہر حال محبوب کی زیارت کے لیے جانا ہی چاہیئے۔

بے شک خانہ خدا میں انتہائی کشش اور جاذبیت ہے، جس کے سبب سے ایمان سے سرشار دل دور و نزدیک سے اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ ہر نسل ہر قبیلے کے لوگ چھوٹے ہوں یا بڑے "لبیک" کہتے ہوئے دیوانہ وار اس کی طرف آتے ہیں تاکہ اللہ کی ذات پاک کے جلوے اس مقدس سرزمین پر دل کی آنکھوں سے دیکھیں اور اس کی ہمہ گیر رحمت کو روح کی گہرائیوں میں محسوس کریں۔ [1]

بعد والی آیت میں ایک مختصر مگر معنی خیز جملے میں حج کے فلسفے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے، لوگ اس سرزمین مقدس پر آئیں "تاکہ اپنے مفاد کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں" (ليشهدوا منافع لهم) مفسرین قرآن نے لفظ "منافع" کے ذیل میں بہت کچھ ذکر کیا ہے، البتہ بالکل واضح ہے کہ اس لفظ کو غیر مشروط و لامحدود طور پر استعمال کیا گیا ہے، یعنی مادی، معنوی، انفرادی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، اخلاقی اور تعلیمی مفاد سب ہی اس میں شامل ہیں۔

بے شک مسلمانوں کو دُنیا کے ہر ایک علاقے سے اور ہر قسم کے لوگوں کو یہاں آنا چاہیئے اور اپنے مفاد کا ناظر اور شاہد بننا چاہیئے۔ یعنی اپنے اپنے وطن میں جو کچھ سنتے رہے ہیں، یہاں آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیں۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۴۸۷ پر کافی کے حوالے سے امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ربیع بن خثیم نے امام سے اس لفظ کی تفسیر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

"یہ لفظ دُنیا و آخرت کے جملہ "مفاد" اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔"

انشاء اللہ آیت کے نکات کے ذیل میں ہم اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: حجاج آئیں اور قربانی کریں، روزی کے سلسلے میں دیئے جانے والے جانوروں کو مخصوص ایام میں اللہ کا نام لے کر ذبح کریں۔ (و يذكروا اسم الله فی ايام معلومات على ما رزقهم من بهيمة الانعام)

---

[1] فاضل دانشور شعرانی مرحوم کہتے ہیں۔

اگر گذشتہ زمانے کے ذرائع آمد و رفت اور راستوں کو ذہن میں رکھ کر اس وقت کے اندلس، مراکش یا چین و بخارا سے آنے والوں کا تصور کریں جو خشکی کے یا سمندری راستوں سے مکہ آتے تھے، خصوصاً راستوں کا رہزنوں سے غیر محفوظ ہونا پیشِ نظر ہے تو واقعی یہ بڑا عظیم کام نظر آتا ہے کئی دفعہ ان عاشقانِ خدا کا زادِ راہ لوٹ لیا جاتا اور ان کو بے سر و سامانی کے عالم میں سفر جاری رکھنے کے لیے مدتوں کہیں قیام کرنے اور محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔

مناسکِ حج میں وہ امور یا اعمال مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے اللہ سے تعلق پیدا ہو اور اس طرح اس عبادت کی عظمت کی عکاسی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں قربانی کرتے ہوئے صرف اللہ کا نام لینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو شرائط ذبح میں سے ہے یہ اس لیے ہے، تاکہ قربانی کرنے والے کی پوری توجہ اللہ اور اس کے قبول کرنے پر ہے اور قربانی کے گوشت یا دیگر دنیوی مفاد اس کے ذیل میں رہیں، دراصل جانوروں کی قربانی انسانوں کے ذہن میں راہ خدا میں قربان ہونے کے لیے آمادگی کا ایک ذریعہ ہے، جس طرح واقعاتِ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیل میں آیا ہے کہ انھوں نے یہ عمل بجا لا کر گویا یہ اعلان فرمایا کہ ہم اللہ کی راہ میں ہر قربانی دے سکتے ہیں، حتٰی کہ جان تک بھی قربان کرسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید نے بُت پرستوں کے مشرکانہ طریقہ کار کی نفی بھی کردی جو قربانی کرتے وقت بتوں کے نام پکارتے تھے اور اس طرح توحیدی مناسک کو شرک سے آلودہ کرلیتے تھے چنانچہ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے، قربانی کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور غریب لوگوں کو بھی کھلاؤ۔ (فکلوا منها واطعموا البائس الفقیر)۔

اس آیت کی تفسیر یوں بھی کی جاسکتی ہے "ایام معلومات" میں اللہ کا نام لینے سے مراد اللہ کی بے حد حساب نعمتوں کی وجہ سے علی الخصوص جانور جو انسان کی خوراک بھی ہیں، کی وجہ سے مخصوص ایام میں، اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کی جائے۔ [1]

چند اہم نکات

۱۔ ایام معلومات زیر بحث آیت میں حکم ہو رہا ہے "ایام معلومات" میں یعنی مخصوص دنوں میں، اللہ کو یاد کرو۔ سورۂ بقرہ آیہ ۲۰۳ میں بھی یہ حکم یوں آیا ہے)

"واذکروا الله فی ایام معدودات"

اللہ کو معدود دنوں میں یاد کرو

کیا "ایام معلومات" اور "ایام معدودات" ایک ہی ہیں یا جدا جدا، اس مسئلے میں اختلاف پایا جاتا ہے، روایات بھی مختلف وارد ہوئی ہیں۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "ایام معلومات" سے مراد ماہ ذوالحجہ کے پہلے دس دن ہیں اور "ایام معدودات" سے گیارہ بارہ اور تیرہ ماہ ذوالحجہ "ایام التشریق" مراد ہیں یعنی نورانی اور دلوں کی روشنی بخشنے والے دن۔

بعض مفسرین چند روایات کی بنیاد پر دونوں ہی سے "ایام التشریق" مراد لیتے ہیں۔ "ایام التشریق" کے مصداق میں بھی اختلاف ہے کبھی اس سے ماہ ذوالحجہ کی گیارہ بارہ اور تیرہ تاریخ مراد لی جاتی ہے اور کبھی دسویں کے دن یعنی عید قربان کے دن کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے۔

فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیه۔

---

[1] اول الذکر تفسیر کے مطابق، قربانی کرتے وقت اللہ کا نام لینا "علی" بمعنی استعلاء ہے اور ان مخصوص دنوں میں تسبیح و تقدیس کا معنی کیا جائے وہاں "علی" بمعنی "برائے" ہے۔ اس فرق کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

یعنی جو شخص مناسک حج کے دو دنوں میں جلدی کرے اس پر کوئی گناہ نہیں۔

یہ سورۂ بقرہ کی آیت ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایام التشریق تین دن سے زیادہ نہیں ہیں۔ کیونکہ "یومین" کے قرینے سے یہ قیاس واضح ہے کہ اگر حاجی ذرا جلدی سے کام لیتے ہوئے ایک دن کم کرے تو دو دن بن جاتے ہیں۔ البتہ اگر ہم اس نکتے پر غور کریں کہ زیر بحث آیت میں "ایام معلومات" کے بعد قربانی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ قربانی عام طور پر دسویں تاریخ کو کی جاتی ہے، تو اس سے یہ بات قرین تصدیق ہو جاتی ہے کہ "ایام معلومات" سے مراد ماہ ذوالحجہ کے پہلے دس دن ہیں جو قربانی کے دن یعنی دسویں تاریخ کو ختم ہو جاتے ہیں، لہٰذا جو تفسیر "ایام معلومات" اور "ایام معدودات" کو الگ الگ کرتی ہے۔ وہ صحیح معلوم ہوتی ہے، لیکن دونوں آیتوں میں جو مشترک مطلب بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ذہن میں یہی آتا ہے کہ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ یعنی مخصوص دنوں میں ذکر خدا کرنا اور اسی کی طرف متوجہ رہنا جو دسویں سے شروع ہو کر تیرہویں تک جاری رہتا ہے۔ البتہ اللہ کے نام کے تذکرے کا ایک مرحلہ قربانی بھی ہے۔[1]

۲۔ منیٰ میں ذکر خدا متعدد روایات کے مطابق اس ذکر سے مراد وہ تکبیریں ہیں جو عید قربان کے دن نماز ظہر کے بعد سے برابر پندرہ نمازوں تک پڑھنا مستحب ہیں، یعنی تیرھویں ذوالحجہ کی نماز فجر تک۔ بحار الانوار ج ۹۹، ص ۲۸۶ پر امام موسیٰ کاظم کے حوالے سے وہ تکبیریں یہ ہیں:۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد اللہ اکبر علیٰ ما ھدانا واللہ اکبر علیٰ ما رزقنا من بھیمۃ الانعام۔

اسی کتاب میں ص ۲۸۷ پر درج بعض دوسری روایات کے ذریعے تصریح ہوتی ہے کہ پندرہ نمازوں کے بعد پڑھنا اس شخص کے لیے ہے جو میدان منیٰ میں ہو، باقی حضرات کے لیے دس نمازوں تک پڑھنا کافی ہے، یعنی بارھویں ذوالحجہ کی نماز فجر تک۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے تکبیرات والی روایات اس حقیقت کی دوسرا گواہ ہیں کہ زیر بحث آیت میں جس "ذکر" کا تذکرہ ہوا ہے وہ قربانی کرتے ہوئے ذکر سے مخصوص نہیں، بلکہ مجموعی ذکر مراد ہے۔ اگرچہ اس میں وقت ذبح ذکر بھی شامل ہے۔ (قابل غور)

۳۔ حج کا فلسفہ اور اس کے مضمرات حج کے عظیم الشان مراسم دوسری عبادات کی طرح فیوض و برکات کا سرچشمہ ہیں اور انفرادی اور اسلامی معاشرے کے بہت سے اجتماعی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر مناسک حج صحیح طریقے سے ادا کیے جائیں۔ ہر ایک رکن ٹھیک اسلامی تقاضے کے مطابق ادا ہو تو ہر سال مسلمانوں کا یہ مہتم بالشان اجتماع اسلامی معاشروں میں نئے انقلاب کی داغ بیل ڈال سکتا ہے، حج کے عظیم الشان مناسک کے چار پہلو ہیں۔ جن میں ہر ایک دوسرے سے زیادہ بنیادی گہرا اور مفید کمائی دیتا ہے۔

۱۔ حج کا اخلاقی پہلو حج کا اہم ترین فلسفہ اخلاقی ہے، یعنی حج انسان میں زبردست اخلاقی انقلاب پیدا کرتا ہے۔ احرام کی پابندی انسان کو مکمل طور پر مادی تعیش، ظاہری امتیازات مختلف لباس اور رنگ روپ و زیب و زینت سے بے نیاز

---

[1] "ویذکروا اسم اللہ" کی تفسیر کے ذیل میں جو اختلاف تھا ایک قربانی کے وقت نام خدا لینا دوسرا مطلقاً خدا کا ذکر کرنا ختم جاتا ہے اور یہ پہلا قول دوسرے کا مصداق بن جاتا ہے اور دوسرا ایک وسیع و عمومی مفہوم بن جاتا ہے۔

کردیتی ہے۔ مختلف مادی لذات سے پرہیز انسان کو ضبط نفس، اصلاح اور شخصیت سازی کی طرف مائل کرتا ہے۔ مادی دنیا سے نکال کر فضائے روحانیت و صدق وصفا کی سیر کراتا ہے اور وہ لوگ جو عام حالات میں مزعومہ امتیازات، مراتب اور فخر و ناز کے سنگین بوجھ تلے دبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اچانک اپنے آپ کو ہلکا پھلکا اور آسودہ خاطر محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اس کے بعد حج کے دیگر مناسک انسان کے روحانی تعلقات بڑھا دیتے ہیں، انسان کا اللہ کے ساتھ تعلق لحہ بہ لحہ مستحکم تر کر دیتے ہیں اور اسے اس کے نزدیک تر لے جاتے ہیں۔ انسان کو آلودہ اور تاریک ماضی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر چکا چوند مستقبل کی پُر نور بلندیوں پر لا کھڑا کرتے ہیں۔

قابل توجہ یہ ہے کہ مناسک حج علی الخصوص قدم قدم پر بت شکن ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ کے نظریات، کردار اور راہ خدا میں قربانیوں کو حجاج کے اذہان پر نقش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مکہ معظمہ عموماً اور خانہ کعبہ، مسجد حرام اور مطاف وغیرہ خصوصاً رسول کرم اور صدر اسلام کے مسلمانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ جس سے اخلاقی انقلاب حجاج کے اذہان پر زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر حاجی سرزمین مکہ اور مسجد الحرام میں گویا حضرت رسول اکرمؐ، حضرت امیرالمومنینؑ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے، ان کی رجز خوانی اور قتال کرتے ہوئے تلواروں کی جھنکار سنتا ہے۔ بے شک تمام مناسک حج اس طرح سے آپس میں مسلسل اور منظم ہیں کہ مائل ذہن کے دلوں کو مکمل طور پر اخلاقی لحاظ سے اس طرح منقلب کرتے ہیں۔ کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ واقعی حاجی کی کتاب زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بحار الانوار کی جلد نمبر ۹۶ صفحہ نمبر ۶ پر روایت درج ہے اور کس قدر حسین حقیقت ہے۔

یخرج من ذنوبه کهیئته یوم ولدته امه!

حاجی حج کے بعد اپنے گناہوں سے یوں بری ہو جاتا ہے، گویا وہ نو مولود معصوم بچہ ہے۔

واقعی حج انسان کے لیے تولد ثانی ہے، ایسی پیدائش تو جو ایک نئی زندگی لیے ہوئے ہو۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مذکورہ بالا فیوض و برکات اور وہ جو بعد میں ذکر ہوں گے، ان افراد کے لیے نہیں ہیں جو مناسک حج کے ظواہر تک محدود رہتے ہیں اور اس کے گوہر نایاب کو گنوا بیٹھتے ہیں اور نہ ہی ان لوگوں کے لیے جو حج کو سیاحت اور تفریح یا مادی وسائل کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں، ان کے حصے میں وہی کچھ آتا ہے جو کچھ وہ چاہتے ہیں۔

۱۱۔ حج کا سیاسی پہلو

ایک عظیم فقیہ کے بقول باوجود اس کے کہ مناسک حج خالص اور عمیق ترین عبادات کا مجموعہ ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے سیاسی مقاصد کے حصول اور پیش رفت کا مؤثر ذریعہ بھی ہیں۔ اللہ کی طرف توجہ کے لحاظ سے عبادت اور مخلوق خدا کے حقوق کے تحفظ کے لحاظ سے سیاست مناسک حج میں یہ دونوں پہلو آپس میں اس طرح سے مربوط و منسلک ہیں، گویا ایک کپڑے کا تانا بانا ہوں، حج مسلمانوں کی منتشر صفوں کو منظم کرنے کا مسلمانوں میں نسلی امتیاز، علاقائی عصبیت اور قومی تفاخر کے خاتمے کا بہترین عامل ہونے کے ساتھ ساتھ دشمنوں سے مقابلے کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔ حج اظہار خیال پر سخت استبدادی نظام اور گھٹن خوف اور دباؤ کے خاتمے کا بھی بڑا موثر ذریعہ ہے، مسلمان ممالک کے صحیح حالات ایک دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بھی ہے۔ غرضیکہ حج استحصال طاقتوں کی چیرہ دستیوں سے آزادی اور استعماری زنجیروں کو توڑنے کا بہترین عامل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباس جیسے ڈکٹیٹروں کے زمانے میں عوام کے بعض طبقات کے میل جول پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی تاکہ آزادی کی تحریکوں کو کچلا جاسکے۔ اس وقت ان کے ملاپ، سیاسی روابط اور صلاح مشورے کا واحد ذریعہ حج تھا۔ نہج البلاغہ "کلمات قصار" نمبر۲۵۲ میں جناب امیرؑ نے حج کو

الحج تقویة للدین

"مناسک حج، دین مقدس اسلام کی تقویت و استحکام کا سبب ہیں"۔ قرار دیا ہے۔

ایک غیر مسلم سیاستدان نے یونہی نہیں کہا:

"افسوس کہ مسلمانوں نے حج کے فلسفے کو نہ سمجھا، لیکن ان کے دشمن سمجھ گئے۔"

روایات میں حج کو ضعیف اور کمزور مسلمانوں کا جہاد قرار دیا گیا ہے۔ ایسا جہاد کہ ساری دنیا کے ضعیف، کمزور اور عورتیں ایک جگہ جمع ہو کر امت مسلمہ کی عظمت و سطوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ خانہ خدا کے چاروں طرف نماز کی صفیں باندھ کر ایک آواز ہو کر جب نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں تو دشمنوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

۳۔ حج کا ثقافتی پہلو حج کے دنوں کو مختلف علاقوں کے لیے ثقافتی افکار و اعمال کے تبادلے کا بہترین موقع قرار دیا جاسکتا ہے، خصوصاً اس لحاظ سے کہ حج کا عظیم الشان اجتماع دنیا بھر کے مسلمانوں کے مختلف طبقات کا حقیقی اجتماع ہے کیونکہ خانۂ خدا کی زیارت کے لیے آنے والے افراد کے انتخاب میں کوئی انسان ساختہ طریقہ کارفرما نہیں ہے۔ بلکہ صرف حکم خدا کے تحت مختلف علاقوں، خاندانوں، زبانوں اور ملکوں کے لوگ ایک جگہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں ہے کہ حج رسول اللہ کے فرمودات اور آثار کے دنیائے اسلام میں نشر و اشاعت کا بہترین ذریعہ ہے۔ وسائل الشیعہ ج ۸ صفحہ ۹ پر ایک روایت ہے کہ امام صادقؑ کے خاص صحابی جو بہت صاحب علم بھی تھے اور جن کا نام ہشام بن حاکم ہے، نے ایک دن امامؑ سے حج کے فلسفے کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

ان الله خلق الخلق .... وامرهم بما يكون من امر الطاعة في الدين و مصلحتهم من امر دنياهم فجعل فيه الاجتماع من الشرق والغرب وليتعارفوا ولينزع كل قوم من التجارات من بلد الى بلد .... ولتعرف آثار رسول الله (ص) وتعرف اخباره ويذكر ولا ينسى۔

اللہ نے بندوں کو پیدا کیا .... آپ نے ان کے دینی اور دنیوی مفاد میں احکام جاری فرمائے۔ منجملہ ان احکام کے مشرق و مغرب کے لوگوں پر مشتمل ایک اجتماع (مناسک حج) کا بھی حکم دیا تاکہ لوگ ایک دوسرے سے شناسا ہوں، تجارتی سازو سامان ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کیا جاسکے نیز اس طرح آپ کی تعلیمات کی بھی اشاعت ہو، لوگ ان تعلیمات کو اپنے دلوں میں جگہ دیں اور انہیں کبھی فراموش نہ کریں۔

یہی وجہ ہے کہ جابروں اور آمروں کے عہد حکومت میں جبکہ احکامات قرآن و سنت کی نشر و اشاعت کی اجازت نہیں ہوا کرتی تھی۔ مسلمان عوام حج کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آئمہ طاہرینؑ اور بزرگ علماء کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے مسائل کا حل حاصل کیے

کرتے تھے۔

نیز حج کے اجتماع کو مسلمانوں کے عظیم ثقافتی سیمینار میں بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ عالم اسلام کے تمام علماء جو مکہ میں موجود ہوں ایک دوسرے کے سامنے اپنے خیالات تجربات اور تجاویز پیش کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی بڑی بدنصیبی یہ کہ مسلمانوں کی جغرافیائی سرحدیں ان کو ثقافتی طور پر محدود کر دیتی ہیں اور ہر ملک کے مسلمان صرف اپنے ہی بارے میں سوچ بچار کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں وسیع تر اسلامی معاشرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تقریباً ناپید ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں حج بے شک اس بدنصیبی کی تاریک رات میں خوش نصیبی کا مہر درخشاں ہے، مذکورہ بالا روایت کے اگلے حصے میں امام صادقؑ نے کیا عمدہ بات فرمائی ہے

ولو کان کل قوم انما یتکلمون علی بلادھم وما فیھا ھلکوا، وخربت البلاد، وسقطت الجلب والارباح وعمیت الاخبار۔

اگر ہر قوم اپنے ہی ملک اور شہر کی بات کرے اور صرف اپنے مسائل پر سوچ بچار کرے تو سب کے سب برباد ہو جائیں گے ان کے ملک تباہ و برباد ہوں گے۔ ان کے مفادات تباہ ہوں گے اور حقائق پس پردہ چلے جائیں گے۔

۱۷۔ حج کا اقتصادی پہلو

حقیقت، لوگوں کے خیال کے بالکل برعکس ہے یعنی یہ کہ حج کے اجتماع کو اسلامی ممالک کی اقتصادی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کرنا نہ صرف حج کی روح کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ روایات کی روشنی میں فلسفۂ حج کا ایک پہلو یہ بھی ہے

اگر تمام مسلمان اس کثیر اجتماع میں اسلامی ممالک کی مشترکہ تجارتی منڈی کی بنیاد رکھیں، ایک دوسرے کی ضرورت کو پورا کریں، نہ منافع دشمنوں کی جیب میں جائے اور نہ اقتصادیات کو دشمنوں کا طفیلی بنائیں تو یہ دنیا پرستی نہیں ہے۔ بلکہ عین خدا پرستی ہے اور اس کی راہ میں جہاد ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا روایت میں امام صادقؑ، فلسفۂ حج کے ضمن میں ہشامؒ سے کھول کر بیان فرمارہے ہیں کہ حج کے مقاصد میں سے ایک مقصد مسلمانوں کی باہمی تجارت کو فروغ دینا اور اقتصادی روابط کو آسان بنانا ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۸۔

لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم

کی تفسیر کے ذیل میں امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں تبتغوا فضلاً سے مراد کسب معاش ہے، فرمایا

فاذا احل الرجل من احرامہ وقضی فلیشتر ولیبع فی الموسم۔

جب حاجی احرام اتار دے، مناسک حج کا وقت ختم ہو جائے تو خرید و فروخت کرے [1]

(یہ کام نہ صرف یہ کہ گناہ نہیں ہے، بلکہ ثواب کا بھی حامل ہے)۔

امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے بھی اس طرح کی ایک روایت مروی ہے، جس کے آخر میں آپ فرماتے ہیں۔

لیشھدوا منافع لھم

---

[1] تفسیر عیاشی بمطابق المیزان ج ۲ صفحہ ۔

تا کہ اپنا نفع حاصل کریں۔

لفظ "منافع" بہت بلیغ اشارہ کر رہا ہے اور مادی و معنوی مفادات پر محیط ہے۔[1]

مختصر یہ کہ اگر یہ عبادت صحیح اور مکمل طور پر بجالائی جائے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے، خانہ خدا کے زائرین مقدس سرزمین میں قیام کے دوران حج کے ثمرات حاصل کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہوں اور پوری طرح سرگرم بھی رہیں اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے سیاسی ثقافتی اور اقتصادی مسائل پر باہمی صلاح مشورے کریں تو مناسک حج ہر مسئلے کا حل پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور شاید اس نکتے کو امام صادقؑ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

لا یزال الدین قائما ما قامت الکعبة

یعنی جب تک کعبہ رہے گا دین رہے گا۔[2]

جناب امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔

اللہ اللہ فی بیت ربکم لا تخلوہ ما بقیتم فانہ ان ترک لم تناظروا۔

خدارا اپنے رب کے گھر کے بارے میں اس کے احکامات کی تعمیل کرو اور اسے ہرگز خالی نہ چھوڑنا ورنہ اللہ کی طرف سے بالکل مہلت نہ دی جائے گی۔[3]

۴۔ اس زمانے میں قربانی کے گوشت سے متعلق ذمہ داریاں

زیر بحث آیت سے پوری طرح واضح ہو رہا ہے، کہ قربانی کے معنوی اور روحانی پہلوؤں اور حصول تقرب بارگاہِ الٰہی کے علاوہ اور مقاصد بھی ہیں، وہ یہ کہ اس گوشت کا مناسب صرف کیا جائے قربانی دینے والا خود بھی کھائے، مساکین و فقرا و مستحقین تک بھی پہنچائے، اسراف فضول خرچی کی بھی اسلام میں بڑی واضح ممانعت ہے یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت اور فہم عامہ سے یہ بات ثابت ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کی قطعاً اجازت نہیں ہے کہ قربانی کے کثیر گوشت کو "منیٰ" میں اُدھر پھینک کر فضا کو مکدر بنائیں یا "منیٰ" میں دفن کر دیں، مناسکِ حج میں قربانی کا واجب ہونا صرف ان دو کاموں کے لیے "ناقابلِ فہم" ہے۔ اگر ضرورت مند افراد وہاں موجود نہیں ہیں تو ضروری ہے کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں جہاں بھی ضرورت مند ہوں اس گوشت کو ان تک پہنچایا جائے۔ (قابل غور ہے)

مگر افسوس آج مسلمان قربانی دینے کے حکم کی تعمیل تو کرتے ہیں مگر گوشت کی تقسیم کو بھلائے ہوئے ہیں۔ ہر سال لاکھوں جانوروں کا گوشت جو ضرورت مندوں کی کثیر تعداد کی ایک طویل مدت تک ضرورت پوری کر سکتا ہے اس مقدس سرزمین پر بہت ناپسندیدہ، اور

---

[1] بحار الانوار ج ۹۹ ص ۳۲

[2] وسائل الشیعہ ج ۸ ص ۱۴

[3] نہج البلاغہ، جناب امیرؑ کے خطوط، وصیت نمبر ۴۷

مکروہ حالت میں تلف ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے بہت سے علماء، دانش مندوں اور مفکروں نے سعودی حکومت سے اس ضمن میں بارہا گفت گو کی ہے یہاں تک کہ رضا کارانہ طور پر گوشت کے حمل ونقل کے اخراجات برداشت کرنے کی پیش کش بھی کر چکے ہیں۔ مگر ایک طرف وہابی علماء کا جمود اور بے حسی اور دوسری طرف سعودی حکومت کے کارپردازوں کی لاپرواہی اور بے اعتنائی اس کار خیر کی راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہے۔

اسراف وفضول خرچی کی حرمت اور کفران نعمت جو ایک مسلمہ مسئلہ ہے سے قطع نظر عید قربان کے دن منیٰ میں قربانگاہ کی کیفیت وماحول اس قدر مکدر وغیر مطلوب ہوتا ہے کہ کمزور ایمان کے مسلمان اس رکن کے وجوب کے بارے میں ہی شک کرنے لگتے ہیں۔ مزید برآں دشمنوں کو مخالفت کے لیے ایک مؤثر حربہ ہاتھ لگتا ہے۔ وہ اس کیفیت کو وہاں کے علماء اور منتظمین کی کوتاہ فکری سمجھنے کی بجائے اسلام میں میں میخ نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔ لہٰذا دنیا کے تمام تر مسلمان ممالک کے عوام پر لازم ہے کہ عظمت اسلام کے تحفظ اور مناسک حج کی صحیح تصویر کو نمایاں کرنے کے لیے سعودی حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ ذلت آمیز ماحول کو ختم کرکے احکامات اسلام کا نفاذ کریں۔ البتہ بعض روایات جن کے مطابق قربانی کا گوشت منیٰ یا حرم مکہ سے باہر لے جانا ممنوع ہے، ان کا تعلق اس زمانے اور حالات سے ہے، جب اس گوشت کے ضرورت مند اس علاقے میں موجود ہوتے تھے اور گوشت کی مقدار انہی کے لیے کافی تھی، چنانچہ معتبر ذرائع سے حاصل ہونے والی یہ روایت اس مسئلے پر یوں روشنی ڈالتی ہے۔ امام صادقؑ کے ایک صحابی نے قربانی کے گوشت کو منیٰ سے باہر لے جانے کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا۔

كنا نقول لا يخرج منها بشیء لحاجة الناس اليه، فاما اليوم فقد كثر الناس فلا بأس باخراجه

کبھی ہم کہا کرتے تھے کہ اس میں سے کچھ بھی باہر نہ لے جائیں، کیونکہ لوگ ضرورت مند تھے۔ اب جبکہ حجاج کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے۔ قربانی کے گوشت کی مقدار بھی بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا اسے باہر لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔[1]

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۰ ص ۱۵۱ ابواب الذبح باب ۴۲ حدیث نمبر ۵

۲۹۔ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝

۳۰۔ ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝

ترجمہ

۲۹۔ اس کے بعد اپنی میل کچیل کو دُور کریں۔ منتیں اتاریں اور قابل احترام خانہ کعبہ کا طواف کریں۔

۳۰۔ حج کے مناسک یہی ہیں اور جو اللہ کے قوانین کا احترام کرے اللہ کے ہاں اس کی بہتر جزاء ہے اور تمہارے لیے چوپائے حلال کئے گئے ہیں۔ سوائے ان کے جو تمھیں بتا دیئے گئے ہیں۔ گندگی (یعنی بتوں) سے اجتناب کرو اور باطل و بیہودہ باتوں سے بچو۔

تفسیر

مناسک حج کا ایک اور اہم حصّہ

مناسکِ حج کے متعلق مندرجہ بالا بحث کے بعد زیرِ نظر آیت میں انہی کے ایک اور حصّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے۔ اس کے بعد اپنی گندگی اور فالتو اجزاء کو اپنے آپ سے دور کریں (ثُمَّ لیقضوا تفثهم) اور اپنی نذریں پوری کریں۔ (ولیوفوا نذورهم) اور مرورِ زمانہ کی دست بُرد سے محفوظ گھر کا طواف کریں۔ (و لیطوفوا بالبیت العتیق)۔

اکثر اہلِ زبان اور مشہور مفسرین کے بقول "تفث" کا مطلب میل کچیل کثافت اور غیر ضروری اعضاء بدن جیسے ناخن، اور غیر ضروری بال ہیں، بعض کے مطابق اصل میں ناخن کے نیچے میل کچیل اور اس قسم کی چیزوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے[1]

کئی دوسرے ماہرینِ لسانیات کے مطابق یہ لفظ سرے سے عربی زبان میں موجود ہی نہیں ہے۔ لیکن "مفرداتِ راغب" کے مطابق ایک صحرائی عرب نے اپنے اس ساتھی سے جو میل کچیل اور گندگی سے اٹا ہوا تھا کہا

"ما اتفثك وادرنك"

"تو کس قدر گندا اور غلیظ ہے"۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان میں یہ لفظ موجود ہے۔

روایات میں بھی بارہا اس جملے کا مفہوم ناخن کاٹنا، بدن صاف کرنا اور احرام اتارنا بیان کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ جملہ "تقصیر" کے عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو مناسک حج میں سے ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں "سر منڈوانے" کے لیے بھی یہ جملہ استعمال کیا گیا ہے اور وہ بھی "تقصیر" کا حصّہ ہے

کنز العرفان میں اسی آیت کی تفسیر میں ابن عباس سے ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ اس جملے سے مراد تمام مناسکِ حج کو انجام دینا ہے[2] لیکن اس قول کی کوئی دلیل ہماری نظر میں نہیں ہے۔

ایک لائقِ توجہ روایت ہے کہ امام صادقؑ نے "ثُمَّ لیقضوا تفثهم" کی تفسیر اپنے زمانے کے امام سے ملاقات کرنے سے کی ہے اور جب راوی نے وضاحت چاہی اور عرض کیا کہ لوگ تو اس سے مراد ناخن کاٹنا اور غلاظت کو دُور کرنا لیتے ہیں۔ تو آپؑ نے فرمایا۔ "قرآن مجید ظاہر و باطن رکھتا ہے" یعنی امام سے ملاقات کا تعلق

---

[1] کنز العرفان، تفسیر مجمع البیان اور دوسری تفاسیر، نیز قاموس اللغۃ اور مفرداتِ راغب۔

[2] کنز العرفان ج ۱ ص ۳۲۲

آیت کے باطنی معنی میں سے ہے۔[1]

ہو سکتا ہے اس حدیث میں یہ نکتہ پنہاں ہو کہ خانۂ خدا کا زائر مناسک حج ادا کرنے کے بعد جس طرح گندگی اور غلاظت کو اپنے بدن سے دور کرتا ہے۔ اسی طرح اپنے زمانے کے امام سے ملاقات کے بعد روحانی غلاظتوں سے پاک ہو جاتا ہے علی الخصوص جن ادوار میں ظالم اور جابر بادشاہ عام حالات میں مسلمانوں کو ائمہ اطہار سے ملاقات کی اجازت نہیں دیتے تھے مناسک حج اس سعادت کا بہترین موقع ہوا کرتا تھا۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث حضرت امام باقرؑ سے مروی ہے۔ آپؑ نے فرمایا

تمام الحج لقاء الامام

حج کی تکمیل اپنے امام سے ملاقات پر ہوتی ہے۔[2]

حقیقت بھی یہی ہے کہ مناسک حج اور ملاقات امامؑ دونوں ہی ذریعہ تطہیر ہیں۔ ایک ظاہری غلاظت و کثافت کی کی تطہیر کا اور دوسرا باطنی جہالت و اخلاقی انحطاط کی تطہیر کا۔

رہ گیا نذریں اتارنے کا مسئلہ تو اس سے مراد ہے کہ صدر اسلام میں بعض مسلمان منت مان لیتے تھے کہ اگر انہیں حج کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو مناسک حج کے علاوہ امور خیر صدقات اور قربانی بجا لائیں گے۔ بسا اوقات اپنی مراد پانے کے بعد منت اتارنا بھول جاتے تھے۔ اس لیے قرآن مجید میں منت اتارنے کی تاکید آئی ہے۔[3]

خانہ کعبہ کو "بیت العتیق" کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "عتیق" لفظ "عتق" سے مشتق ہے اور اس کا معنی قید و بند سے آزاد ہونا ہے۔ احتمال یہ ہے کہ چونکہ خانۂ کعبہ "انسان کی قید و بند سے ماوراء ہے اور کسی زمانے میں بھی اللہ کے علاوہ کسی کی ملکیت نہیں رہا۔ حتیٰ کہ ابرہہ جیسے جابروں اور سرکشوں کے تسلط اور غلبے سے بھی آزاد ہی رہا۔ اس لیے اسے "بیت العتیق" کہا گیا ہے۔

عتیق کا ایک اور معنی بیش بہا اور قابل قدر بھی ہے۔ یہ معنی بھی خانہ کعبہ کے لیے بالکل درست ہے۔ "عتیق" کا ایک اور مطلب "قدیم بھی ہے۔ جیسے مفردات راغب میں ہے۔

العتیق المتقدم فی الزمان او المکان او الرتبۃ

عتیق، وہ چیز ہے جو زمان و مکان اور رتبے کے لحاظ سے اولیٰ ہو"

اوّلیت کا معنی بھی خانہ کعبہ پر بھی عین منطبق ہوتا ہے۔ کیونکہ سورہ آل عمران آیۃ ۹۶ میں ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۴۹۲

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۰ ص ۲۵۵ ابواب المزار باب نمبر ۲ حدیث نمبر ۱۲

[3] بعض مفسرین نے "نذر" سے خود مناسک حج مراد لیا ہے۔ لیکن مزاج قرآن کے مطابق لفظ "نذر" "منت" ہی کے لیے آیا ہے۔ اس لیے اس کا "مناسک حج" کا معنی ظاہر آیت کے خلاف ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ

دنیا میں سب سے پہلا مبارک اور ہدایت کنندۂ توحید وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے۔

بہرحال کوئی حرج نہیں، اگر یہ لفظ اپنے تمام معانی کے ساتھ خانہ کعبہ کی تمام خصوصیات کی وجہ سے اس کے لیے استعمال کیا جائے۔ اگرچہ مفسرین میں سے ہر ایک نے ان میں سے بعض معانی کی طرف اشارہ کیا ہے یا مختلف روایات میں سے ہر ایک روایت میں کسی ایک معنیٰ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آیت کے آخری حصے میں "طواف" کا ذکر کیا گیا ہے۔ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ اس سے مراد کون سا طواف ہے (چونکہ منیٰ میں قربانی کے بعد حجاج کرام دو طواف بجا لاتے ہیں، پہلے کو "طواف زیارت" اور دوسرے کو "طوافِ نساء" کہا جاتا ہے بعض فقہاء اور مفسرین کا خیال ہے کہ چونکہ آیت میں لفظ طواف بلا قید اور غیر مشروط ہے۔ لہٰذا اس کا مفہوم عام ہے۔ یعنی اس لفظ سے سبھی طواف مراد لیئے جا سکتے ہیں۔ طواف زیارت، طواف نساء، حتیٰ کہ طواف عمرہ بھی اس میں شامل ہے۔[۱]

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف طوافِ زیارت ہے جو کہ احرام کھولنے کے بعد واجب ہوتا ہے۔[۲]

اس ضمن میں جو روایات آئمہ اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کے مطابق اس سے مراد "طواف نساء" ہے۔ چنانچہ امام صادقؑ فرماتے ہیں۔

وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَھُمْ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ میں طواف سے مراد طواف نساء ہے۔

امام رضاؑ سے بھی یہی معنیٰ مروی ہیں[۳]

یہ وہی طواف ہے جسے اہل سنت "طواف وداع" کہتے ہیں۔

بہرحال مندرجہ بالا احادیث کے پیشِ نظر آخری تفسیر زیادہ قوی دکھائی دیتی ہے۔ علی الخصوص اس کا امکان ہے کہ جملہ "لْیَقْضُوْا تَفَثَھُمْ" کے جملے سے بدن کو غلاظت سے پاک کرنے کے بعد پاکیزگی کی تکمیل کے لیے معطر کرنا بھی مراد ہو۔ یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ حج کے سلسلے میں معطر صرف اس وقت ہوا جا سکتا ہے۔ جب حاجی طواف و سعیِ زیارت سے فارغ ہو چکا ہو لہٰذا اس صورت میں "طواف نساء" کے سوا اور کوئی طواف حاجی کے ذمے نہیں ہوتا۔ (غور کیجیے گا۔

گذشتہ آیتوں کی بحثوں کو سمیٹتے ہوئے بعد والی آیت میں کہا جا رہا ہے۔ مناسک حج کی تفصیلات یہی ہیں۔

(ذٰلِکَ)[۴]

اس کے بعد مذکورہ فرائض اور ذمہ داریوں کی تاکیدِ مزید کے طور پر بیان کیا جا رہا ہے۔ "جو شخص اللہ کے لائحہ عمل کا احترام

---

[۱] کنز العرفان ج ۱ ص ۲۷۱

[۲] تفسیر مجمع البیان میں یہ نظریہ مفسرین کا نام لیے بغیر درج کیا گیا ہے۔

[۳] وسائل الشیعہ ج ۹ ص ۳۹ ابواب الطواف باب نمبر ۲

[۴] اس لفظ کے تحت ایک پورا جملہ محذوف ہے وہ یہ ہے۔ کذالک امر الحج والمناسک۔

کرے اور اس کو اہم جانے اس کے لیے اللہ کے ہاں بہتر جزا موجود ہے (ومن یعظم حرمات اللہ فھو خیر لہ عند ربہ)۔

واضح سی بات کہ "حرمات" سے مراد مناسک حج ہیں۔ ہو سکتا ہے، خصوصی طور پر خانہ کعبہ اور عمومی طور پر حرم مکہ کا احترام و تکریم بھی اس میں شامل ہو۔ لہٰذا خاص طور پر تمام اوامر و نواہی کو اس میں شامل کر لینا ظاہر آیت کے خلاف ہے "حرمات" جمع ہے "حرمت" کی اور لفظ "حرمت" اس چیز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس کا احترام ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے اور اس کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیئے۔

اس کے بعد احکام احرام کی مناسبت سے چوپاؤں کے حلال ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوپاتے (بھیڑ بکری، گائے بھینس اور اونٹ وغیرہ) تمہارے لیے حلال ہیں۔ سوائے اُن کے جو بعد ازاں بتائے جائیں گے۔ اور ان کی ممانعت کا حکم دیا جائے گا۔ (واحلت لکم الانعام الا ما یتلیٰ علیکم)۔ اس آیت کا آخری حصہ (الا ما یتلیٰ علیکم) حالت احرام میں شکار کی حرمت کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ آیت ۹۵ میں فرمایا گیا ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا لا تقتلوا الصید وانتم حرم

"اے صاحبانِ ایمان! حالتِ احرام میں شکار نہ کرو"

سورۂ مائدہ، سورۂ حج کے بعد نازل ہوئی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حرمت، زیر بحث آیت کے اس جملے کی طرف اشارہ ہو جو بتوں کے لیے کی جانے والی قربانیوں کی حرمت کے بارے میں آیا ہے۔ کیونکہ یہ مسلم ہے کہ جانور کا حلال ہونا، صرف اس صورت میں ہے کہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے نہ کہ بتوں یا کسی اور کا۔

آیت کے آخر میں، مناسکِ حج کے ذیل میں اور زمانۂ جاہلیت کے طور طریقوں کے خلاف دو مزید حکم دیئے جا رہے ہیں بتوں کی غلاظت و گندگی سے اجتناب کرو" (فاجتنبوا الرجس من الاوثان)۔

اوثان جمع وثن (بروزن کفن) ہے، اس سے مراد وہ پتھر ہیں۔ جو معبود کے طور پر رکھے جاتے تھے یہاں لفظ "اوثان" "رجس" کی وضاحت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جو اس سے پہلے ہے یعنی آیت کا جملہ کچھ یوں ہے۔ گندگی اور غلاظت سے اجتناب کرو۔ بعد میں کہا جاتا ہے گویا کہ پلیدگی وہی بت ہیں۔ توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے بت پرست، قربانی کرنے کے بعد، قربانی کا خون بتوں کے سروں اور چہروں پر مل دیتے تھے۔ اس طرح بڑی کریہہ المنظر کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، ممکن ہے، زیر بحث آیت میں اسی طرف اشارہ ہو۔

"اور بے ہودہ گفتگو سے اجتناب کرو" (واجتنبوا قول الزور)۔

نکتہ

"قول الزور" کیا ہے؟

بعض مفسرین کے مطابق "قول الزور" سے مراد قبل از اسلام حج کے دوران مشرکین کا تلبیہ ہے انہوں نے توحید کے آئینہ دار "تلبیہ" کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ تلبیہ مشرکانہ روشوں میں سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وہ اس طرح تلبیہ کہتے تھے۔

لبیک لا شریک لک الا شریکا ھو لک، تملکہ وما ملک

"ہم نے تیری دعوت کو قبول کیا اور ہم تیری بارگاہ میں آحاضر ہوئے۔ اے وہ خدا جس کا سوائے اس مخصوص شریک کے کوئی شریک نہیں تو بھی اس کا ہے اور اس کی ہر شئے کا مالک بھی تو ہی ہے۔"

یہ جملہ بلاشک شبہ خرافات سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے اور قول الزور کا صحیح مصداق ہے، جس کا مطلب، جھوٹ، باطل اور نامناسب کلام ہوتا ہے۔

اس صورت میں اگر کہا جائے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے حج کے طور طریقے سے متعلق ہے تو یہ آیت کے کلی مفہوم سے مانع نہیں ہے اور ہر قسم اور ہر طرح کے بُت سے پرہیز اور ہر لغو اور بے ہودہ بات سے اجتناب کا حکم اس میں شامل رہتا ہے۔ بعض روایات میں "اوثان" سے شطرنج (جو جوئے کی ایک قسم ہے) مراد لیا گیا ہے اور قول الزور سے غنار اور جھوٹی گواہی مراد ہے۔ دراصل یہ سب ایک کل کے مختلف اجزاء ہیں۔ اور زیر بحث آیت ان سب پر محیط ہے۔ نہ یہ کہ کسی ایک معنیٰ میں منحصر ہے۔

اسلام کے قابل احترام پیغمبر سے ایک روایت مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ نے موعظہ کے دوران فرمایا۔

"ایھا الناس عدلت شھادۃ الزور بالشرک باللہ"

اے لوگو! جھوٹی گواہی دینا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینے کے مترادف ہے

پھر آپ نے یہی آیت "فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور" کی تلاوت فرمائی۔

یہ حدیث بھی زیر بحث آیت کی وسعت پر دلالت کرتی ہے۔

۳۱۔ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ○

۳۲۔ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ○

۳۳۔ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ○

ترجمہ

۳۱۔ (مناسک حج بجالاؤ) اس طرح کہ صرف اللہ ہی کے لیے خالص رہو۔ کسی کو اس کا شریک قرار نہ دو اور جو اللہ سے شرک کرے گا، گویا کہ آسمان سے گرتے ہوئے پرندے اُسے (فضا میں) اُچک لیتے ہیں یا آندھی کے جھکڑ اسے دور دراز اڑا لے جاتے ہیں

۳۲ (مناسک حج اسی طرح ہیں) اور جو شعائر اللہ کا احترام کرے تو یہ عمل تقوائے دل کی علامت ہے۔

۳۳۔ ایک خاص وقت (ان کے ذبح ہونے کے دن) تک قربانی کے جانوروں

میں تمہارے لیے فائدے ہیں ۔ پھر محترم اور قدیمی خانہ کعبہ ان کی جگہ ہے (عمرۂ مفردہ کی صورت میں قربانی کی جگہ خود مکّہ ہے ، جب کہ حج کی صورت میں منیٰ ہے جو مکّہ کے نواح میں واقع ہے۔)

تفسیر

شعائراللہ کی تعظیم علامتِ تقویٰ ہے

گذشتہ آیت کے آخر میں توحید اور مطلقاً بتوں اور ہر قسم کی بت پرستی سے اجتناب کی تاکید پر بحث ہو رہی تھی۔ یہ آیت بھی اسی نکتے کے ذیل میں بیان کر رہی ہے۔ مناسک حج اور تلبیہ خالصتاً للہ ادا کرو اور کسی طرح بھی اس میں شرک کا گزر نہ ہو (حنفاء للہ غیر مشرکین بہ)[1]

" حنفاء" "حنیف" کی جمع ہے۔ جس سے مراد وہ شخص ہے ، جو گمراہی اور افراط و تفریط سے ہٹ کر راہ راست اور میانہ روی کی طرف میلان رکھتا ہو۔ بالفاظ دیگر غلط راستے سے ہٹ کر صراط مستقیم" پر قدم رکھے۔ کیونکہ "حنف" (بروزن "صدف") جھکاؤ اور میلان کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ اہر قسم کی گمراہی سے منہ موڑ کر دوسری جانب جھکنے ہی کا نتیجہ "صراطِ مستقیم" پر گامزن ہوتا ہے)

اس طرح سے یہ آیت اخلاص اور ارادۂ قربتِ خدا کو حج اور دیگر عبادات میں اصل محرک کے طور پر پیش کر رہی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ عبادت کی رُوح اخلاص ہے اور اخلاص یہ ہے کہ کسی قسم کا شرک اور غیر قدرتی عنصر اس میں کار فرما نہ ہو۔ امام باقر علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے کہ آپ سے "حنیف" کی تشریح کے لیے سوال کیا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا

هی الفطرة التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله قال

فطرهم الله علی المعرفة

حنیف اُس فطرت کا نام ہے ، جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ، اللہ کی پیدا کردہ فطرت میں کبھی تغیّر و تبدل نہیں ہوا کرتا۔ اُس کے بعد فرمایا اللہ تعالےٰ نے توحید کو انسانی سرشت میں قرار دیا ہے۔[2]

زیرِ بحث آیت کی جو تفسیر مندرجہ بالا روایت میں آئی ہے وہ "خلوص" کی حقیقی بنیاد کی طرف اشارہ ہے۔ فطرت توحید

---

[1] "حنفآء" اور "غیر مشرکین" دونوں حال ہیں اور گذشتہ آیت کے افعال "فاجتنبوا" اور "اجتنبوا" سے متعلق ہیں۔

[2] تفسیر صافی بحوالہ توحید صدوق۔

قصد قربت اور تحرک کا منبع ہے۔

اس کے بعد مشرکین، ان کے زوال، بدبختی اور تباہی کی حقیقت کی تصویر کشی کی گئی ہے:

جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دے، اس کی مثال آسمان سے اس گرنے والے کی سی ہے جس پر مردار خوار پرندے جھپٹتے ہیں (اس کے جسم کا ایک ایک جزو کسی نہ کسی مردار خوار پرندے کی چونچ میں ہوتا ہے) اور یا دا گران کی گرفت سے بچ نکلے تو) آندھیاں اس کے جسم کے اعضاء چاروں طرف بکھیر دیتی ہیں (ومن یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفه الطیر او تھوی به الریح فی مکان سحیق)۔[1]

دراصل اس آیت میں آسمان کو توحید کے لیے کنایے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور شرک کو آسمان سے گرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ فطری حقیقت ہے کہ آسمان پر سورج اور چاند روشنی پھیلاتے ہیں۔ اور ستارے چمکتے ہیں خوشا بحال وہ جو اس آسمان پر اگر شمس و قمر کی طرح نمایاں نہیں ہوسکتا تو کم از کم ستاروں کی طرح تو چمکتا ہے۔ مگر انسان جب اس رفعت سے گرتا ہے تو دو انجاموں میں سے ایک اس کا مقدر بن جاتا ہے یا یہ کہ زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی مردار خوار بڑے بڑے پرندوں کا تر نوالہ بن جاتا ہے، یعنی اطمینان بخش مرکز سے ہٹ جانے کے بعد خواہشات نفسانی کے اضطراب و گرداب میں پھنس جاتا ہے اور ہر خواہش نفسانی گویا اس کی زندگی کے ایک ایک گوشے کو اچک لیتی ہے اور اسے ختم کر دیتی ہے اور اگر اس مرحلے سے صحیح سلامت نکل جائے تو تیز و تند آندھیاں اور جھکڑ اسے آ لیتے ہیں۔ زمین پر ادھر اُدھر اُسے اس طرح پٹختے ہیں کہ اُس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں منتشر ہو جاتا ہے۔ یہ آندھیاں اور جھکڑ دراصل شیطان کی طرف اشارہ ہے جو تاک لگائے بیٹھا ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ جو شخص بلندی سے پستی کی طرف جاتا ہے، وہ قوت فیصلہ اور قوت ارادی سے محروم ہو جاتا ہے اور لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی تیزی کی وجہ سے وہ پستی و عدم کی طرف بڑھتا جاتا ہے، حتّٰی کہ بالکل معدوم و محو ہو جاتا ہے۔

واقعی جو شخص آسمانِ توحید کے مرکز کو کھو دے، وہ اپنی تقدیر کی لگام تھامنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں جتنا آگے بڑھتا ہے اس کے تنزل اور زوال میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حتّٰی کہ تمام انسانی جوہر سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

واقعی "شرک" کے لیے اس سے زیادہ واضح اور منہ بولتی مثال نہیں دی جاسکتی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ موجودہ دور میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ جہاں کشش ثقل نہ ہو وہاں انسان کا کوئی وزن نہیں ہوتا اسی لیے خلاباز ایسی فضا میں بے وزنی کی مشق کرتے ہیں، جہاں کشش ثقل ختم کردی جاتی ہے۔ وہاں انسان پر جو اضطراب

---

[1] تخطفه "خطف" (بروزن "عطف") کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی جھپٹ کر پکڑنا ہے۔

"سحیق" دور دراز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے "سحوق" کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جو بہت اونچا ہو اور اس کی شاخیں دُور دُور تک پھیلی ہوں۔

بے قراری کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے، بے وزنی ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بے شک جو شخص فراز ایمان سے نشیب شرک کی طرف لڑھکتا ہے۔ دراصل اپنے مستقر اور مسکن کو کھو دینے کی وجہ سے اپنے اندر ایک بے وزنی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس کے بعد شدید اضطراب اس پر طاری ہو جاتا ہے۔

بعد والی آیت میں مناسک حج اور شعائر اللہ کی تعظیم کی بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا جارہا ہے: بات یونہی ہے، جیسے بیان کر دیا گیا ہے (ذٰلک)۔

جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے، انھیں برتر جانے اور دین مقدس اسلام کی نشانیوں اور اس کی اطاعت کی علامتوں کا احترام کرے، خود اس کے متقی ہونے کا ثبوت ہے (ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب)۔

"شعائر" "شعیرۃ" کی جمع ہے جس کا معنی علامت اور نشانی ہے۔ لہٰذا "شعائر اللہ" کا مطلب اللہ کی نشانیاں ہوا۔ جس میں دین مبین کا مجموعی پروگرام اس کے چیدہ چیدہ مبانی واصول وارکان ہیں کہ جو پہلی ہی نظر میں نمایاں نظر آنے لگتے ہیں اسی میں سے "مناسک حج" بھی ہیں، جو انسان کو خدا تعالیٰ کی یاد دلاتے ہیں۔ اگرچہ مناسک حج بلاشبہ ان شعائر میں سے ایک ہیں، جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ علی الخصوص قربانی کا مسئلہ جو اس سورۃ کی آیت ۳۶ میں پوری وضاحت کے ساتھ انہی شعائر سے ایک جزو کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

لیکن واضح رہے کہ اس میں تمام اسلامی شعائر کا مفہوم پوری شدومد سے موجود ہے اور کسی طور بھی انہیں صرف مناسک حج یا قربانی کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ قربانی کے بارے میں شعائر اللہ کا ذکر لفظ "من" کے ساتھ کیا گیا ہے جو اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ قربانی ان تمام "شعائر" میں سے ایک ہے، جن کو شعائر اللہ کہا جاتا ہے اور یہاں لفظ "من" کو "من تبعیضی" کہتے ہیں۔ اس طرح سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۸ میں صفا و مروہ کے بارے میں ہے۔

"إِنَّ الصفا والمروة من شعائر الله"

بے شک صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ تمام ارکان مقامات اور اشیاء جن کا تعلق دین کے کسی نہ کسی پروگرام سے ہے اور انسان کو اللہ کی یاد دلاتی ہیں اور دین کی عظمت وحشمت کا مظہر ہیں وہ سب کی سب شعائر اللہ ہیں اور ان کی تعظیم وتکریم بذات خود تقوٰی و پرہیز گاری کی علامت ہے۔

ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان کی تعظیم وتکریم سے مراد یوں نہیں کہ جیسے بعض ظاہر بین مفسرین نے قربانی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی بڑائی کا مفہوم اس کا جسمانی طور پر بڑا ہونا ہے۔ بلکہ تعظیم کی حقیقت یہ ہے کہ شعائر اللہ کی حقیقت، مقام اور کیفیت کے بارے میں اپنے افکار واذہان کو اونچا کریں اور اسی مناسبت سے ان کا شایان شان احترام کریں۔ اس عمل کا دل میں پائے جانے والے تقوٰی و پرہیز گاری سے گہرا تعلق ہے اور درحقیقت "تعظیم" قصد

ارادہ، کا جزو ہے۔ یوں تو منافق بھی ظاہری اعمال سے "تعظیم" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر ان کے اعمال کا سرچشمہ "دلی تعظیم" اور تقویٰ وپرہیزگاری نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کی قطعی کوئی قدر وقیمت نہیں۔ حقیقی تعظیم ان افراد ہی کی طرف سے ہے جو صاحبانِ تقویٰ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ پرہیزگاری اور احکاماتِ خداوندی کے سلسلے میں جوابدہی کا احساس باطنی امور ہیں اور ان کا مرکز انسان کا دل اور رُوح ہیں، جہاں سے یہ سارے جسم کی طرف سرایت کرتے ہیں۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ "شعائر اللہ" کی تعظیم واحترام تقوٰے کی ایک علامت ہے۔[1]

تفسیر قرطبی ج ، ص۴۴۴۹ میں رسولِ اکرمؐ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ آپ نے اپنے سینۂ اطہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

"التقوٰی ھٰھنا"

"تقویٰ کی حقیقت یہاں ہے"

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس طرح کے عقیدے کا حامل ہے کہ قربانی کے ارادے سے لے جائے جانے والے اونٹ یا دوسرے جانور کو اپنے وطن سے میقات اور وہاں سے مکّہ لائے تو اثنائے سفر میں ذاتی استعمال میں نہیں لانا چاہیئے۔ یعنی نہ اس پر سواری کرنی چاہیئے نہ اس کا دودھ ذاتی طور پر استعمال کرنا چاہیئے۔ وہ مجموعی طور پر اپنے لیے اس کا استعمال ممنوع سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید اس فضول اور لایعنی ذہنیت کی نفی کرتا ہے اور یوں کہتا ہے" ایک مقررہ وقت تک (یعنی ان کے ذبح ہونے تک) قربانی کے جانوروں سے تم فائدے حاصل کرسکتے ہو (لکم فیھا منافع الٰی اجل مسمّی)

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے مکّہ جاتے ہوئے ایک شخص کو دیکھا جو بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا۔ جبکہ ایک اونٹ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا

"ارکبھا"

"اس اونٹ پر سوار ہوجا"۔

اس نے عرض کیا۔

---

[1] عربی زبان کی گرائمر کے قواعد کی رُو سے شرطیہ جملوں میں "شرط" اور "جزا" کے درمیان کوئی تعلق ضرور ہونا چاہیئے اور دونوں کا موضوع بھی ایک ہونا ضروری ہے۔ مذکورہ آیت میں "جزا" محذوف ہے اور دراصل یُوں ہے۔

ومن یعظم شعائر اللہ فان تعظیمھا من تقوی القلوب۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جزاء کلی طور پر محذوف ہو۔ چونکہ "فانھا من تقوی" علت ہے۔ اور اپنے معلول کی جانشین ہے اور پورا جملہ یوں ہے۔

ومن یعظم شعائر اللہ فھو خیرٌ لہٗ فان تعظیمھا من تقوی القلوب۔

"یارسول اللہ انہا ھدی"

"یارسول اللہ یہ قربانی کا اُونٹ ہے"

آپ نے قدرے غصے سے فرمایا۔

ارکبھا ویلک

افسوس ہے تیرے حال پر میں کہہ رہا ہوں سوار ہو جا۔ [1]

اسی طرح کی متعدد روایات اہل بیتؑ کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ان روایات میں سے ایک ابو بصیر امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں آپ نے فرمایا۔

ان احتاج الی ظہرھا رکبھا، من غیر ان یعنف علیھا وان کان لھا لبن حلبھا حلبًا لا ینھکھا۔

اگر حاجی کو قربانی کے جانور کو بطور سواری استعمال کرنے کی ضرورت پڑے تو سوار ہو جائے۔ مگر اس پر تشدد نہ کرے۔ اگر قربانی کا جانور دودھ دینے والا ہو تو بے شک دودھ دوہ لے۔ مگر اس پر زیادتی نہ کرے۔ [2]

مذکورہ بالا روایات دو انتہائی نظریات کے درمیان "معتدل" طریقے کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔ ایک طرف اس طرح کے لوگ تھے کہ قربانی کے جانوروں کا سرے سے کسی قسم کا احترام ہی ملحوظ نہ رکھتے تھے اور کبھی تو وقت و مقام قربانی سے پہلے ہی ذبح کر کے کھا لیتے تھے۔ جس کی طرف سورۂ مائدہ آیت ۲ میں یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

لا تحلوا شعائر اللہ ولا الشھر الحرام ولا الھدی ولا القلائد

شعائر اللہ ماہِ حرمت اور قربانی کو من مانے طریقے سے اپنے استعمال میں نہ لاؤ۔

دوسری طرف بعض لوگ اس طرح کرتے کہ جس جانور کو قربانی کے لیے چنتے نہ اس کے دودھ سے فائدہ اُٹھاتے اور نہ ہی اس پر سواری کرتے۔ اگرچہ مکے آتے ہوئے ان کو طویل راستوں میں اس کی سخت ضرورت بھی ہوتی، مذکورہ آیت نے ان کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔

مندرجہ بالا تفسیر پر صرف یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ زیر بحث آیت سے پہلے کی آیت میں قربانی کے جانور کا کوئی ذکر ہی نہیں آپ نے ضمیر ان کی طرف کیسے لوٹا دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے پہلی آیت میں "شعائر اللہ" کا ذکر تو واضح ہے اور مسلمہ طور پر قربانی، شعائر اللہ میں سے ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اور بعد میں بھی کیا جائے گا۔ لہٰذا شعائر اللہ کے ضمن میں ضمیر قربانی کے جانور کی طرف لوٹائی گئی ہے۔ [3]

---

[1] تفسیر کبیر فخر الدین رازی ج ۲۳ صفحہ ۳۳

[2] تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۴۹

[3] مذکورہ بالا اس آیت کی واضح تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بعض مفسرین نے دو اور خیالات کا بھی اظہار کیا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بہرحال آیت کے آخری حصّے میں قربانی کے آخری مقام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے۔
اس کا مقام وہ قدیم اور محترم گھر خانہ کعبہ ہے (ثم محلها الی البیت العتیق)۔
اس طرح جب تک قربانی کا جانور قربان گاہ تک نہ پہنچ جائے۔ اس سے ذاتی کام لیا جاسکتا ہے اور قربان گاہ تک پہنچنے کے بعد اُس کی قربانی کے فرض کو ادا کرنا چاہیئے۔ فقہاء نے اسلامی اسناد کی بنیاد پر کہا ہے کہ اگر قربانی حج سے متعلق ہے۔ تو اس کی قربان گاہ میدانِ منٰی ہے، اگر عمرہ مفردہ سے متعلق ہے تو مکۃ المکرمہ ہے۔ البتہ زیر بحث آیت مناسک حج پر گفتگو کر رہی ہے لہٰذا "بیت العتیق" (خانہ کعبہ) کو وسیع تر معنیٰ یعنی مکۃ مکرمہ اور اس کے گرد ونواح (میدان منٰی) کے معنیٰ میں بھی سمجھنا چاہیئے۔ (قابلِ غور ہے)

(ا) "فیھا" کی ضمیر تمام مناسک کی طرف پلٹتی ہے۔ اس بناء پر آیت کا مفہوم یوں ہوگا۔ (ایک مقررہ وقت تک (ایام حج یا دنیا کے ختم ہونے تک) مناسک حج میں تمھارا مفاد ہے۔
حج کا آخری رُکن جس کو بجالانے کے بعد حاجی احرام کھول کر "مُحِل" ہوجاتا ہے، خانہ کعبہ کے قریب طوافِ زیارت یا طوافِ نسا کا بجالانا ہے۔ اس بناء پر زیر بحث آیت (لیشھدوا منافع لھم) کے مشابہ ہے، جس کی تفسیر گزر چکی ہے۔
(ب) "فیھا" کی ضمیر تمام شعائر اللہ اور اسلام کے نمایاں ارکان اعمال کی طرف پلٹتی ہے۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یوں ہوگا:
شعائر اللہ اور تمام اسلامی احکام میں رہتی دنیا تک تمھارے لیے بہت فائدے ہیں۔ اس کے بعد تمھاری اخروی جزا خانہ کعبہ کے خالق کے ذمہ ہے۔
لیکن جس تفسیر کو ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح اور روایات سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

۳۴- وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ۝

۳۵- الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝

ترجمہ

۳۴- ہر ایک امت کے لیے ہم نے ایک قربان گاہ مقرر کی ہے تاکہ وہ روزی کے طور پر دیئے جانے والے چوپایوں پر (ان کی قربانی کرتے ہوئے) خدا کا نام لیں اور تمہارا خدا معبودِ یکتا ہے۔ اس کے حضور سرِ تسلیم خم کرو اور منکسر و بُردبار لوگوں کو خوشخبری سنا دو۔

۳۵- یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دل خوفِ الٰہی سے معمور ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں جو مصیبتیں پہنچتی ہیں اُن پر صابر اور مضبوط رہتے ہیں اور یہ لوگ نماز قائم کرنے والے

ہیں اور انھیں جو روزی دی گئی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

تفسیر

بُردبار لوگوں کے لئے بشارت

گذشتہ آیتوں کے حوالے سے منجملہ قربانی کے مضمون سے شاید یہ سوال پیدا ہو کہ اسلامی شریعت میں یہ کیسی عبادت ہے کہ خداوند قدوس کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لیے جانوروں کی قربانی دی جائے۔ آیا خدا کو قربانی کی ضرورت ہے؟ آیا یہ حکم دوسرے ادیان میں بھی آیا ہے یا صرف یہ مشرکین کا طریقہ کار تھا؟ انھیں سوالات کی وضاحت کے ذیل میں قرآن مجید زیر بحث پہلی آیت میں فرمارہا ہے۔ قربانی اور خدا کے لیے جانور ذبح کرنے کا حکم صرف تمہیں ہی نہیں دیا گیا۔ بلکہ "ہم نے ہر اُمت کے لیے ایک قربان گاہ قرار دی ہے تاکہ وہ روزی کے طور پر دیئے جانے والے جانوروں کو قربان کرتے ہُوئے ان پر اللہ کا نام لیں" (ولکل اُمة جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ علیٰ ما رزقھم من بھیمة الانعام)۔

راغب اپنی "مفردات" میں کہتے ہیں کہ

"نسك" کے معنی عبادت کے ہیں "ناسك" معنی "عابد" ہے۔ لہٰذا "مناسک حج" یعنی وہ مقامات یا اقامت گاہیں جہاں یہ عبادت بجالائی جاتی ہے یا پھر خود انہی اعمال کے معنیٰ میں ہے۔

لیکن مجمع البیان، میں جناب طبرسی اور روح الجنان، میں جناب "ابوالفتوح رازی" کے بقول "منسك" بروزن منصب ہے اور ایک احتمال کے مطابق عبادات میں سے علی الخصوص "قربانی" کے معنیٰ میں ہے۔ [1]

اس بنا پر اگرچہ "منسك" ایک عام مفہوم رکھتا ہے، جس میں منجملہ عبادات کے "مناسکِ حج" بھی شامل ہیں۔

اور زیر بحث آیت (لیذکروا اسم اللہ علیٰ ما رزقھم من بھیمة الانعام "تاکہ اس پر اللہ کا نام لیں کے قرینے سے بالخصوص "قربانی" کے معنیٰ میں ہے۔

بہر حال، ہمیشہ سے قربانی کے متعلق سوالات اُٹھائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن زیادہ تر سوالات کی وجہ فضول اور بے ہودہ رسمیں ہیں، جو اس عبادت کے ساتھ نتھی کردی گئی ہیں۔ مثلاً ایک خاص رسم کے تحت مشرکین کا بتوں کے لیے

---

[1] اسی بناء پر کہا جاتا ہے "نسکت الشاة" یعنی میں نے بھیڑ ذبح کی۔

قربانی کرنا، مگر اس کے برعکس اللہ کے نام پر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قربانی کرنا جو دراصل کسی کا راہِ خدا میں جان نثاری اور اپنی قربانی دینے کی آمادگی کے جذبے کا مظہر ہے اور جانور کی قربانی کے بعد اس کے گوشت سے غرباء، مساکین اور محتاجوں کی خوراک کے لیے استفادہ کرنا وغیرہ صریحاً منطقی اور قابلِ فہم ہے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں مذکور ہے۔ تمہارا خدا معبودِ یکتا و یگانہ ہے (اور اس کا پروگرام بھی ایک ہی ہے) (فالٰهكم اله واحد)۔

"جب حقیقت یہی ہے تو اس کے حضور سرِ تسلیم خم کردو" (فله اسلموا) اور احکامات خدا کے سامنے جھک جانے والوں کو خوشخبری سنا دو" (وبشر المخبتين) [1]

بعد والی آیت میں "مخبتین" (انکساری کرنے والوں اور بردبار لوگوں) کی صفات کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے دو حصے روحانی ہیں اور دو مادی۔

① پہلے فرمایا جارہا ہے" وہ لوگ ایسے ہیں کہ جونہی اللہ کا نام ان کے سامنے لیا جائے۔ توان کے دل خوفِ الٰہی سے معمور ہوجاتے ہیں (الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم)۔ یہ خوف صرف اللہ کے غیظ و غضب کی وجہ ہی سے نہیں اور نہ ہی اس کی رحمت بے پایاں میں کسی قسم کے شک و شبہ کی وجہ سے ہے۔ بلکہ یہ خوف ان ذمہ داریوں اور فرائض کی وجہ سے ہے جو ان کے کندھوں پر ہیں اور انہیں یہ ڈر ہے کہ کہیں ان ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ ہو جائے مزید برآں یہ خوف اللہ کی بے انتہا عظمت و جلالت کی وجہ سے ہے جس کا ان کو ادراک ہے۔ کیونکہ انسان ہیبت و جلالت سے خائف ہوتا ہے۔ [2]

② زندگی میں پیش آنے والے مصائب و آلام پر نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں (والصابرين على ما اصابهم)۔

حالات کیسے ہی سنگین کیوں نہ ہوں اور ان مشکل حالات کی وجہ سے ان کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے یہ لوگ گھبرا کر گھٹنے نہیں ٹیک دیتے اور نہ ہی ان کے اطمینان اور سکون میں فرق پڑتا ہے اور نہ وہ اپنے موقف سے دست بردار ہوتے ہیں اور نہ رحمتِ خدا سے مایوس ہوتے ہیں اور نہ ہی کبھی کسی لفظ کے ذریعے کفرانِ نعمت کرتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ ہر حال میں یہ استقامت و پامردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوئے منزل رواں دواں رہتے ہیں اور کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

③ اور ④ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (والمقيمي

---

[1] "مخبتین" "اخبات" کے مادہ سے ہے "خبت" (بروزن "ثبت") سے لیا گیا ہے۔ جو ہموار اور وسیع و عریض زمین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس پر انسان آرام سے چل پھر سکتا ہے۔ بعد ازاں یہ مادہ اطمینان اور انکساری کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ اس زمین پر چلنے والا مطمئن اور اس کے پاؤں تلے زمین منکسر و متواضع ہوتی ہے۔

[2] خدا خوفی کے علل و اسباب کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۴ میں سورہ انفال کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں ہم شرح و بسط کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

الصلٰوۃ ومما رزقناھم ینفقون)۔

یعنی ایک طرف اللہ کے ساتھ ان کا گہرا ربط ہے اور دوسری طرف ان کی جڑیں خلق خدا میں دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ " اخبات" عجز و انکساری اور تسلیم کہ جو مومنین کی خاص صفات میں سے ہیں۔ صرف باطنی پہلو نہیں رکھتیں، بلکہ اس کے آثار ظاہر و آشکار ہونے چاہئیں۔

۳۶۔ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

۳۷۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ○

۳۸۔ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ○

ترجمہ

۳۶۔ اور موٹے تازے اونٹوں کو ہم نے تمھارے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔ ان میں تمھارے لیے خیر و برکت ہے جب وہ قربانی کے لیے قطار میں کھڑے کیے جائیں، اور ان کی صف بندی کر کے (قربانی کرتے وقت) اللہ کا نام

لو اور جب ان کے دست و بازو (کٹ کر) گر پڑیں تو خود بھی ان کا گوشت کھاؤ اور قناعت پسند غریبوں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ اس طرح سے ہم نے انھیں تمھارا تابع کر دیا ہے تاکہ تم شکر بجا لاؤ۔

۳۷۔ اللہ کے پاس ہرگز ان کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، اس کے پاس تو صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس طرح اللہ نے انہیں تمھارے تابع کر دیا ہے تاکہ جیسے اس نے تمھیں ہدایت کی ہے۔ اس طرح اس کی کبریائی بیان کرو اور نیکوکاروں کو بشارت دے دو۔

۳۸۔ یقیناً اللہ اہلِ ایمان کا دفاع کرتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے اور بددیانت کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر

قربانی کیوں کی جاتی ہے؟

زیر بحث آیتوں میں ایک دفعہ پھر مناسک حج، شعائر اللہ اور قربانی کے مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے۔ پہلی آیت میں ارشاد ہو رہا ہے۔ موٹے تازے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائر اللہ میں قرار دیا ہے۔ (والبدن جعلنٰها لكم من شعائر الله)۔

ایک طرف اونٹ تم سے متعلق ہیں۔ اور دوسری طرف وہ اللہ کی نشانیوں میں سے قرار دیے گئے ہیں۔ کیونکہ حج کی قربانی۔ اس باشکوہ عبادت کا ایک نمایاں حصہ ہے۔ جس کے فلسفے کے بارے میں ہم تفصیلات کر چکے ہیں۔

"بُدن" بروزن قُدس" ہے اور یہ "بدنہ" (بروزن هجلہ) کی جمع ہے۔ اس کا معنیٰ موٹا تازہ اور زیادہ گوشت والا اونٹ ہے، چونکہ اس طرح کے جانور قربانی کرنے اور فقراء و مساکین اور ضرورت مندوں کو کھلانے کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ لہٰذا خصوصی طور پر ایسے جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ احکام

قربانی کے مطابق قربانی کے جانور کا موٹا تازہ ہونا ضروری شرائط میں سے نہیں۔ بس اتنا دیکھا جاتا ہے کہ کمزور اور لاغر نہ ہو۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: اس قسم کے جانوروں میں تمہارے لیے خیر و برکت ہے (لکم فیھا خیر)۔

یعنی ایک طرف تم ان کے گوشت سے بھی خود استفادہ کرتے ہو اور دوں کو بھی دیتے ہو اور دوسری طرف ایثار، قربانی اور عبادت بجالا کر روحانی نتائج سے بہرہ مند ہوتے ہو اور اس کی بارگاہ میں رسائی پاتے ہو۔

اس کے بعد قربانی کرنے کی کیفیت کے بارے میں ایک مختصر سا جملہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ جب تم قطار میں کھڑے جانوروں کی قربانی کرنے لگو تو اللہ کا نام لو (فاذکروا اسم اللہ علیھا صواف)۔

بے شک اونٹ کو نحر کرتے وقت یا دوسرے چوپایوں کو ذبح کرتے وقت جس طرح سے بھی اللہ کا نام لے لیا جائے صحیح ہے اور آیت بھی ظاہری طور پر یونہی کہہ رہی ہے، لیکن بعض روایات میں ابن عباس سے اس موقع کے لیے ایک خاص ذکر نقل کیا گیا جو دراصل ایک اکمل ذات کی تعریف ہے۔ وہ ذکر یہ ہے (اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر، اللّٰھم منک ولک)۔[1]

امام صادقؑ سے بہت رسا اور عمدہ جملے نقل ہوئے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا

جب تم قربانی کرنے لگو اسے قبلہ رو لٹا دیا کھڑا کرو اور ذبح یا نحر کرتے وقت یہ پڑھو: وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا مسلما وما انا من المشرکین ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا من المسلمین۔ اللّٰھم منک ولک بسم اللہ وباللہ واللہ اکبر، اللّٰھم تقبل منی۔[2]

لفظ "صواف" "صافہ" کی جمع ہے اور اس کا معنیٰ قطار میں کھڑے ہونے کے ہیں۔ روایات میں ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قربانی کرتے وقت اونٹ کے اگلے دونوں پاؤں ٹخنے سے لے کر گھٹنے تک باندھ دیئے جائیں۔ مگر وہ کھڑا رہے۔ تاکہ نحر کرتے ہوئے وہ نہ ہلے اور نہ بھاگے۔ طبعی طور پر جب خون کی کافی مقدار خارج ہو جاتی ہے تو اگلے پاؤں ضعف کی وجہ سے کمزور پڑ جاتے ہیں اور اونٹ زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ لہٰذا آیت میں اسی کیفیت کا بیان آیا ہے کہ جس وقت اس کا پہلو ساکن ہو جائے۔ (اس کی جان نکل جائے) تو اس کا گوشت خود بھی کھاؤ، قناعت پیشہ اور غریبوں اور مقروض محتاجوں کو بھی کھلاؤ (فاذا وجبت جنوبھا

---

[1] اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں تفسیر مجمع البیان اور روح المعانی "تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۰ ص ۱۳۸ ابواب الذبح باب ۳۷۔

فکلوا منها واطعموا القانع والمعتر)۔

"قانع" اور "معتر" میں فرق ہے۔ "قانع" اس شخص کو کہتے ہیں جسے جو کچھ بھی دیا جائے اسی پر قناعت کرتے ہوئے راضی ہو جائے اور کسی قسم کا اعتراض نہ کرے اور نہ اظہارِ ناراضگی کرے جبکہ "معتر" ایک تو سوال کرتا ہے۔ دوسرے لبا اوقات جو کچھ ملے اسے ناکافی جانتے ہوئے تقاضائے مزید کرتا ہے۔ اور جز بز ہوتا ہے۔ "قانع" "قناعت" کے مادہ سے اور "معتر" "عر" (بروزن "شر" اور بروزن "حر") مادہ سے در اصل میں ایک بیماری جسے "جرب" کہتے ہیں کے معنی میں ہے (یہ خارش کی طرح کی ایک جلدی بیماری ہے) اس کے علاوہ اس سائل کو جو سوال کرنے کے بعد اس پر اصرار کرتا ہے اور کبھی تو کچھ نہ ملنے پر اظہارِ ناراضگی و خفگی بھی کرتا ہے "معتر" کہا جاتا ہے۔ "قانع" کو "معتر" پر ترجیح اس لیے دی گئی ہے کہ محروم طبقے میں سے سفید پوش عفیف النفس اور خود دار افراد توجہ کے زیادہ مستحق ہیں۔

ایک اور قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے "کلوا منها" اس میں سے کھاؤ کہہ کر آیت نے ظاہراً حاجی پر واجب کر دیا ہے کہ اپنی قربانی کا گوشت خود بھی ضرور کھائے۔ شاید یہ حکم اُن کے اور غریبوں اور محتاجوں میں مساوات کے لیے ہے۔

آیت کا اختتام ان الفاظ پر کیا جا رہا ہے۔ اس طرح سے ہم نے ان جانوروں کو تمہارے تابع کر دیا ہے تاکہ تم شکر گذار بندے بن جاؤ۔ (کذلک سخرناها لکم لعلکم تشکرون)۔

سچ مچ یہ عجیب ہی تو ہے کہ عظیم الجثہ اور قوی ہیکل جانور اپنی تمام تر قوتِ جسمانی کے باوجود ایک کمزور جسم والے انسان کے آگے گویا بے بس کھڑا ہو جاتا ہے۔ تاکہ وہ اس کے پاؤں جکڑے اور نحر کرے (نحر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گردن اور اگلی دو ٹانگوں کے ملاپ پر جو گڑھا سا ہوتا ہے اس میں چھری گھونپ دی جاتی ہے۔ اور جانور تھوڑی ہی دیر میں جان دے دیتا ہے)۔

کبھی یہ ہوتا ہے کہ ان جانوروں کے مطیع ہونے کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ ان پر سے مطیع و فرمانبردار رہنے کا حکم اٹھا لیتا ہے۔ بس اچانک وہی جانور جو ایک بچے کے پیچھے بھی نہایت فرمانبردار بن کر عام طور پر چلا کرتا ہے۔ غضب ناک اور خطرناک آفت کا روپ دھار لیتا ہے، اور کئی طاقت ور افراد مل کر بھی اس پر قابو نہیں پا سکتے۔

بعد والی آیت در اصل ان سوالات کا واضح جواب ہے کہ آخر اللہ کو قربانی کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ قربانی کا فلسفہ کیا ہے، کیا قربانی اس کے لیے کسی طرح سے فائدہ رساں ہے؟ جواباً فرمایا جا رہا ہے۔ قربان شدہ جانوروں گوشت اور خون ہرگز خدا تک نہیں پہنچتا (لن ینال الله لحومها ولا دماؤها)۔ اصولی طور پر خدا کو گوشت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو جسم نہیں ہے اور نہ ہی ضرورت مند ہے وہ اکمل اور لامتناہی ذات ہے۔ بلکہ وہ چیز جو اللہ تک پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمالِ نیک اور تمہارا تقویٰ ہے (ولکن یناله التقویٰ منکم)۔

بالفاظ دیگر قربانی سے مقصد یہ ہے کہ تم مدارج تقویٰ طے کر کے ایک انسان کامل بن جاؤ اور دن بدن اللہ کے قریب ہوتے جاؤ، کیونکہ عبادات انسان کے لیے تربیتی کلاسیں ہیں۔ قربانی انسان کو جاں نثاری، خود گذشت اور راہ خدا میں شہادت کا درس دیتی ہے۔ مزید برآں محتاجوں اور ضرورت مندوں کی مدد کا سلیقہ سکھاتی ہے۔

یہ جملہ کہ قربان شدہ جانوروں کا خون تک نہیں پہنچتا، کس مفہوم میں ہے، حالانکہ خون سے ظاہراً کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس جملے سے زمانۂ جاہلیت کی بے ہودہ اور فرسودہ رسُوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اُس وقت ایک رسم یہ تھی کہ قربانی کا خون بتوں کے سروں پر ملتے تھے۔ اور کبھی تو کعبہ کے در و دیوار پر بھی چھڑک دیتے تھے۔ بعض بے خبر مُسلمان بھی چاہتے تھے۔ کہ ان رسومات پر عمل کیا جائے۔ لہٰذا اس آیت سے اِن کو منع کر دیا گیا [1]

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض علاقوں میں ابھی تک یہ بیہودہ رسومات باقی ہیں۔ چنانچہ جب کبھی مکان کی تعمیر کے سلسلے میں قربانی کرتے ہیں تو جانوروں کا خون بنیادوں، دیواروں یا چھتوں پر چھڑک دیتے ہیں یہاں تک کہ بعض مساجد کی تعمیر کے دوران بھی یہ قبیح عمل دہرایا جاتا ہے۔ جو مسجد کی نجاست کا سبب بنتا ہے روشن فکر مسلمانوں کو اس کے خلاف مہم چلانی چاہیئے۔

اس کے بعد ایک مرتبہ پھر جانوروں کے مطیع کیے جانے کی نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ "اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے چوپایوں کو مطیع بنا دیا ہے تاکہ تم اپنی ہدایت کیے جانے پر اللہ کی بڑائی بیان کرو" (كذٰلك سخرنا ها لكم لتكبروا الله على ما هداكم)۔

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و رفعت سے شناسائی پیدا کرو، جس نے تمہارے لیے فطری اور قانونی دونوں طریقوں سے ہدایت کی ہے۔ ایک طرف طریقۂ حج اور سلیقۂ اطاعت و بندگی تمھیں سکھایا اور دوسری طرف قوی ہیکل اور طاقتور جانوروں کو تمہارا مطیع و فرمانبردار بنایا تاکہ اللہ کی اطاعت کرنے، قربانی کرنے، ضرورتمندوں کی ضرورت کو پورا کرنے اور معیشت کا معیار بھی بلند کرنے میں ان سے استفادہ کرو۔ چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے "نیکو کاروں کو خوشخبری سنا دو" (وبشر المحسنين)۔

وہ لوگ جو ان نعمتوں کو اللہ کی اطاعت میں صرف کرتے ہیں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بطریق احسن انجام دیتے ہیں اور علی الخصوص اپنا مال و متاع راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں، یہ نیک لوگ نہ صرف دوسروں سے نیکی کرتے ہیں۔ بلکہ اس طرح اپنی بھی بہترین خدمت انجام دیتے ہیں۔

مشرکین کی بعض بیہودہ حرکات کہ جن کا اس سے پہلی آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے کے متعلق یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ مشرکین ہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے مُسلمانوں سے بھڑ جائیں۔ چنانچہ پروردگار

---

[1] کنز العرفان ج ۱ ص ۳۱۴۔

عالمین کو مومنین کو دلاسا دیتا ہے اور اپنی مدد کے وعدے سے ان کو حوصلہ بندھاتے ہوئے فرماتا ہے: "اللہ صاحبان ایمان کا دفاع کرتا ہے" (ان اللہ یدافع عن الذین امنوا)۔

اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین یہودی، نصاریٰ اور سیکڑوں چھوٹے چھوٹے قبیلے اور خاندان باہم متحد ہو کر اپنے زعم باطل میں مومنین کو دبا کر نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے۔ مگر اللہ نے قیامت تک کے لیے بقائے اسلام اور سلامتی مومنین کا وعدہ فرمایا۔ مشرکین کے خلاف مومنین کے دفاع کا وعدہ دورِ پیغمبر اکرمؐ سے ہی مخصوص نہیں تھا بلکہ یہ تمام ادوار و اعصار پر یکساں جاری و ساری ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ہم "الذین امنوا" کا مصداق بنیں، پھر خدائی دفاع لازمی امر ہے اور کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔ بے شک اللہ مومنین کی حمایت اور دفاع کرتا ہے۔

آیت کے آخری جملے میں مشرکین اور اس کے ہم ذہنیت لوگوں کا اللہ کے ہاں مقام اس طرح بتایا گیا ہے: اللہ کسی بددیانت ناشکرے کو پسند نہیں کرتا (ان اللہ لا یحب کل خوان کفور)۔

وہی کہ جو اللہ کا شریک بناتے ہیں یہاں تک کہ "لبیک" کہتے ہوئے واضح طور پر بتوں کا نام پکارتے ہیں، اور یوں اپنی بددیانتی پر مہر تصدیق ثبت کر لیتے ہیں۔ اس طرح قربانی کرتے ہوئے اللہ کا نام چھوڑ کر بتوں کا نام لیتے ہوئے کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان حالات میں کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بددیانت اور کفرانِ نعمت کرنے والے کو پسند کرے۔

۳۹۔ اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُۨ ﴿ۙ﴾

۴۰۔ الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ بِغَیۡرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ وَ لَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ لَّہُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذۡکَرُ فِیۡہَا اسۡمُ اللّٰہِ کَثِیۡرًا ؕ وَ لَیَنۡصُرَنَّ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿﴾

۴۱۔ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ ﴿﴾

ترجمہ

۳۹۔ ان لوگوں کو جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے، جن پر جنگ ٹھونسی گئی ہے، کیونکہ وہ ظلم وستم کا نشانہ بنے ہیں اور اللہ سبحانہٗ وتعالےٰ ان کی مدد ونصرت پر قادر ہے۔

۴۰۔ وہ لوگ ناحق اپنے گھروں سے نکال باہر کیے گئے ہیں، ان کا قصور سوائے

اس کے اور کیا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے اور اگر اللہ بعض کے ذریعے بعض کو مغلوب نہ کرے تو دیر، گرجے، عبادت خانے اور مساجد کہ جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔ ویران کر دیئے جاتے اور اللہ ان لوگوں کی جو اس کی مدد کرتے ہیں (اور اس کے دین کی حمایت کرتے ہیں) مدد کرتا ہے۔ اللہ طاقت ور اور ناقابلِ شکست ہے۔

۴۱۔ (خدا کے یار و مددگار) وہ لوگ ایسے ہیں کہ جنہیں جب زمین پر صاحب اقتدار بنایا گیا تو انہوں نے نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، نیکی کا حکم دیا اور بدی سے روکا اور ہر چیز کا انجام اختتام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

تفسیر

جہاد کا پہلا حکم

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب مسلمان مکہ میں تھے تو اکثر مشرکینِ مکہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے تھے۔ بڑی تکالیف اور اذیتیں اٹھاتے تھے اور جب کبھی مار پیٹ کے بعد رنجیدہ خاطر ہو کر بارگاہ رسول میں آتے اور مظالم کے خلاف شکایت کرتے (اور جہاد کی اجازت مانگتے) تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے۔ صبر کرو، ابھی مجھے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا یہاں تک کہ مسلمانوں نے مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کی تو مذکورہ بالا آیت نمبر ۳۹ جو جہاد کی اجازت لیے ہوئے ہے نازل ہوئی۔[1]

چنانچہ جہاد کے بارے میں نازل ہونے والی پہلی آیت ہے۔

اگرچہ اس کے حکم جہاد کے لیے پہلی آیت ہونے کے بارے میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اسے پہلی آیت گردانتے ہیں اور بعض سورہ بقرہ کی آیت

---

[1] تفسیر مجمع البیان اور تفسیر کبیر از فخر الدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ ....." (بقرہ ۱۹۰)

کو پہلی آیت قرار دیتے ہیں۔ جب کہ بعض مفسرین سورۃ توبہ کی آیت

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ ...." (توبہ۔۱۱۱)

کو اس سلسلے کی پہلی آیت سمجھتے ہیں[1]

لیکن "اذن جہاد" کے موضوع کی مناسبت سے اس آیت کا لب ولہجہ زیادہ قرین حقیقت معلوم ہوتا ہے کیونکہ لفظ "اذن" کا قرینہ صراحت کے ساتھ اجازت دے رہا ہے۔ جبکہ یہ قرینہ مذکور بالا باقی دو آیتوں میں نہیں ہے، با الفاظ دیگر اس آیت کی تعبیر اس خاص موضوع کے بارے میں ہے۔

بہرحال اگر گذشتہ آخری آیت جس میں مومن کے دفاع اور حمایت کا وعدہ کیا گیا ہے، کو ذہن میں رکھا جائے تو زیر بحث آیت کا اس سے تعلق خاصہ واضح معلوم ہوتا ہے۔ زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا جارہا ہے: اللہ نے ان لوگوں کو جن پر جنگ ٹھونسی گئی۔ جہاد کی اجازت دی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے (اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا)۔

اس کے بعد قادر و طاقتور خدا کی طرف سے کامیابی کے وعدے کے ساتھ اذن جہاد کی تکمیل کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے: اللہ ان کی مدد و نصرت پر قادر ہے (وان اللّٰہ علٰی نصرھم لقدیر)۔

ہوسکتا ہے اس جملے سے جو خدائی طاقت و قوت کے ساتھ نصرت الٰہی کی ضمانت دے رہا ہے، اس طرف اشارہ ہو کہ خدائی مدد اس وقت میسر ہوگی جب تم خود دفاع کیلئے تیار ہو جاؤ گے تاکہ یہ گمان نہ ہو جائے کہ گھر بیٹھے اللہ مدد کرے گا یہ الفاظ دیگر عالم اسباب میں سے جو بھی میسر ہے اسے کام میں لایا جائے اور تمہاری قوت ختم ہو جائے تو مایوس ہونے کی بجائے اللہ قادر کی نصرت کے منتظر رہو، ہی وہ کیفیت ہے جسے پیغمبر اکرمؐ نے تمام غزوات و سرایا میں عملی طور پر اپنایا اور کامیاب ہوئے

اس کے بعد ان مظلوموں کی حالت زار کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے اور جہاد سے متعلق اسلامی نکتۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے: وہی لوگ جو ناحق اپنے گھر بار چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ (الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق)۔

ان کا قصور سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے (الا ان یقولوا ربنا اللّٰہ)۔

کھلی سی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی توحید و یگانگت کا اقرار گناہ نہیں، بلکہ مایہ ناز ہے۔ یہ کوئی ایسا عمل نہیں جس کی بنیاد پر مشرکین کو یہ حق مل جائے کہ وہ انہیں ان کے گھروں اور علاقوں سے نکال باہر کریں اور مکے سے مدینے کی طرف ہجرت پر مجبور کردیں۔ آیت نے اس مفہوم کے بیان میں جو تعبیر استعمال کی ہے وہ ایسے مواقع پر مدمقابل کو محکوم و مغلوب کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بعض اوقات ہم خدمت و نعمت پر ناشکری کرنے والے شخص کے لیے یوں کہتے ہیں (ہمارا گناہ صرف یہ تھا کہ ہم نے تیری خدمت کی) مخاطب کی بے خبری کے اظہار کے لیے یہ لطیف کنایہ ہے جس نے خدمت

---

[1] المیزان ج ۱۴ ص ۴۱۹

کے بدلے ایسا رویہ اختیار کیا جو کسی جرم کے جواب میں روا رکھا جاتا ہے۔[1]

اس کے بعد حکم جہاد کے فلسفے اور مصلحت کی وضاحت کرتے ہوئے اس طرح ارشاد ہوتا ہے: اگر اللہ مومنین کا دفاع نہ کرے اور جہاد کی اجازت دے کر بعض کو بعض کے ذریعے مغلوب نہ کرے تو دیر، گرجے یہود و نصاریٰ کے عبادت خانے اور مساجد کہ جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے، ویران ہو جائیں (ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرًا)۔

بے شک اگر صاحبان ایمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، ظالموں، جابروں اور بے ایمان دنیا پرستوں کی تباہ کن کارستانیوں کے مقابلے میں خاموش تماشائی بنے رہیں اور انہیں کھل کھیلنے کی کھلی چھٹی دیتے رہیں۔ تو یقیناً وہ معابد اور عبادت گاہوں کا نام و نشان تک نہ چھوڑیں، کیونکہ معابد و عبادت گاہیں، بیداری کی درس گاہیں ہیں، محراب عبادت میدان جنگ ہے اور مسجد سرکشوں کے خلاف مورچہ ہے۔ دراصل ہر قسم کی خدا پرستی کی دعوت ان کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہے، کیونکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ خدا کی طرح خود ان کی پرستش کی جائے، چنانچہ اگر انہیں موقع ملے تو خدا پرستی کے تمام مراکز کو مسمار کر دیں۔ جہاد کا حکم دینے اور جنگ جہاد کی اجازت دینے کا یہ ایک مقصد بیان کیا گیا ہے۔

"صوامع" "بیع" صلوات اور مساجد میں فرق سے متعلق مفسرین میں اختلاف ہے، لیکن جو بات زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ صوامع "صومعہ" کی جمع ہے، یہ اس جگہ کو کہتے ہیں جو عام طور پر شہروں کے باہر لوگوں کے شور و غل سے دور تارک الدنیا زاہدوں اور عبادت گذاروں کے لیے بنائی جاتی ہے۔ فارسی میں اسے "دیر" کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ "صومعہ" اس عمارت کو کہتے ہیں، جس کا اوپر کا حصہ ایک دوسرے سے ملحق ہوتا ہے، ظاہراً اس سے چوکور گلدستوں کی طرف اشارہ ہے جو راہب لوگ اپنے دیروں کو سجانے کے لیے بناتے ہیں۔

"بیع" "بیعۃ" کی جمع ہے، اس سے مراد عیسائیوں کی عبادت گاہ یعنی گرجا ہے۔ صلوات "صلوٰۃ" کی جمع ہے۔ یہ لفظ یہودیوں کی عبادت گاہوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اسے "صلوتا" کا معرب سمجھتے ہیں۔ جو عبرانی زبان میں نماز خانہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ "مساجد" "مسجد" کی جمع ہے۔ جو مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے۔ اس بنا پر اگرچہ صوامع اور "بیع" دونوں ہی عیسائی عبادت گاہوں سے متعلق ہیں مگر ان میں ایک اجتماعی عبادت گاہ ہے اور دوسری تارکین دنیا کی نیز "بیع" کو عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کی عبادت گاہوں کے لیے لفظ مشترک سمجھا جاتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی ذکر ہو جائے کہ جملہ "يذكر وا اسم الله فيها كثيرًا" (کثرت سے ذکر خدا کیا جاتا ہے) مساجد کی تعریف میں آیا ہے، کیونکہ جملہ مذاہب کے تقابلی جائزے کے مطابق مسلمان ہر روز پانچ مرتبہ سال بھر عبادت کرتے رہتے ہیں اور یوں مسلمانوں کے عبادتی مراکز سب سے زیادہ بارونق رہتے ہیں، جبکہ بہت سے دوسرے مذاہب کے

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں استثناء، استثناء منقطع ہے۔ البتہ کنائی معنی میں اور اوعائی موضوع کی نسبت سے۔ (قابل غور ہے)

عبادتی مراکز ہفتے میں ایک بار یا سال بھر میں چند مخصوص ایام میں استعمال میں آتے ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر خدائی مدد کے وعدے کا اعادہ کیا جا رہا ہے: یقیناً اللہ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کی مدد کرتے ہیں اس کے دین اور عبادت گاہوں کا دفاع کرتے ہیں۔ (ولینصرن اللہ من ینصرہ)

اس میں شک و شبہ نہیں کہ خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ قادر اور ناقابل شکست ہے (انّ اللہ لقوی عزیز)۔

یہ اس لیے فرمایا کہ توحید کے متوالے اور پاسدار کہیں یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ وہ رزم حق و باطل اور طاقتور دشمنوں کے زغے میں اکیلے اور بے سہارا ہیں۔ اسی وعدے کے پرتو میں اکثر مسلمان مجاہدوں نے باوجود اس کے کہ تعداد اور آلات حرب و ضرب کے لحاظ سے کفار کے مقابلہ میں کہیں کم تھے، زبردست اور شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کامیابیوں کی وجہ فیض نصرت الٰہی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ زیر بحث آخری آیت اللہ کے یاوران و ناصرین کی تفصیل بیان کر رہی ہے، جن سے گذشتہ آیت میں مدد کا وعدہ کیا گیا تھا۔

ان کی یوں تعریف کی گئی ہے: وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب زمین پر ہم ان کو صاحب اقتدار بناتے ہیں، وہ نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں (الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر)۔

وہ کامیابی کے بعد سرکشوں، متکبروں اور ظالموں کی طرح کبھی داد عیش نہیں دیتے، نہ لہو و لعب میں زندگی ضائع کرتے ہیں اور نہ نشۂ اقتدار سے بدمست ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ کامیابیوں، کامرانیوں اور احسن توفیق خاص کو اپنی اور معاشرے کی اصلاح و تعمیر و ترقی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں وہ حکومت حاصل ہونے کے بعد خدا کے خلاف ایک اور طاغوتی طاقت بن کر نہیں اُبھرتے بلکہ خداوند عزوجل اور اس کی مخلوق کے ساتھ ان کے روابط اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ جو اللہ سے گہرے روابط کی علامت ہے، زکوٰۃ دیتے ہیں۔ جو حقوق بشر و خدمت خلق کی نشانی ہے، بھلائی کی ترغیب دے کر اور برائی کی حوصلہ شکنی کر کے صاف ستھرا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں، یہی چار صفات ان کے تعارف کے لیے کافی ہیں۔ انہی کے زیر سایہ باقی عبادات اعمال صالح اور اچھے معاشرے کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں اور فلاحی کام پروان چڑھتے ہیں۔ [۱]

یاد رہے "مکنا" "تمکین" کے مادہ سے ہے۔ جس کا مطلب وسائل و ذرائع کی فراہمی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ آلات ہوں یا کافی علم و آگاہی یا جسمانی و فکری توانائی "معروف" اچھے اور پسندیدہ امور کے معنی میں ہے اور "منکر" قبیح و ناپسندیدہ اور باطل کے معنیٰ میں کیونکہ اوّل الذکر ہر عقل سلیم رکھنے والے شخص کے لیے جانا پہچانا ہے اور موخرالذکر اجنبی و بیگانہ یا بالفاظ دیگر اوّل الذکر فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہے۔ جبکہ موخرالذکر خلاف فطرت آیت کے آخر میں ارشاد ہو

---

[۱] امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت اور ان سے متعلق بقیہ مسائل اور اس سلسلے میں اٹھنے والے جملہ سوالات کے جوابات تفصیل کے ساتھ سورہ آل عمران آیہ ۱۰۴ کی تفسیر کے ذیل ج ۲ میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

رہا ہے، تمام کاموں کا انجام و اختتام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ (وللہ عاقبۃ الامور)۔

جس طرح ہر کام، ہر کامیابی اور تسلط کی ابتداء و منتہا اللہ کی طرف سے ہے۔ اسی طرح اس کے اختتام و انجام و نتیجہ کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہے۔ کیونکہ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

چند اہم نکات

۱۔ حکم جہاد کا فلسفہ اگرچہ گزشتہ صفحوں میں ہم نے اس مسئلہ پر خاصی بحث کی ہے[1] لیکن اس لحاظ سے کہ زیر بحث آیت ان پہلی آیات میں سے ہے جن میں مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے اور ان آیتوں کا مضمون لو مفہوم اس حکم کے فلسفے اور مصلحت پر روشنی ڈالتا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند نکات اگرچہ اعادہ کے طور پر ہی کیوں نہ ہوں بیان کیے جائیں۔ ان آیات میں جہاد کے فلسفے کے دو اہم اجزاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

(i) ظالم اور جابر کے خلاف مظلوم کا جہاد: بلاشک و شبہ یہ مظلوم کا پیدائشی، فطری اور عقلی حق ہے کہ ظلم کے سنگ گراں کے نیچے پسنے کی بجائے ظالم کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو، چیخ و پکار کرے، ہتھیار اُٹھائے، اس کو اس کے اصلی مقام تک پہنچائے اور اپنے حقوق کی جانب اُٹھنے والے اس کے ہاتھوں کو قطع کر دے۔

(ii) طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد: طاغوتی طاقتیں دلوں سے نام خدا کو نکالنے اور خدا کے ذکر و عبادت کے مراکز کو ویران اور برباد کر دینا چاہتی ہیں۔ کیونکہ یہی عبادت گاہیں شعور و بیداری کے مراکز ہیں۔ لازم ہے کہ ان طاقتوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا جائے تاکہ وہ نام خدا کو محو نہ کر سکیں اور لوگوں کی سوچ پر پہرے بٹھا کر ان کو اپنا زر خرید غلام نہ بنا لیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ معابد و مساجد کو برباد کرنے کا صرف یہی طریقہ نہیں ہے کہ ان کی عمارات کو مسمار کر دیا جائے۔ بلکہ بالواسطہ ذرائع بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں اور منفی سرگرمیوں اور غلط پراپیگنڈے کے ذریعے سے بھی عوام کو مساجد و معابد سے بدظن کیا جا سکتا ہے تاکہ وہ خود ہی مساجد و معابد کا رُخ نہ کریں اور بارونق مساجد ویرانوں میں بدل جائیں۔

بعض لوگ یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ اسلام نے دلیل و منطق کی بجائے مسلح جنگ کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنے کا طریقہ کیوں اختیار کیا ہے؟ اس کا جواب ہم گذشتہ سطور میں دے چکے ہیں۔ کیا وہ ظالم درندے جو صرف "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه" کہنے کے جرم میں لوگوں کو بے گھر اور دربدر کر دیتے ہیں، ان کے سیاہ و سفید کے مالک بن جاتے ہیں ان پر ہر طرح کا ظلم روا رکھنے کے لیے کسی قانون کی پاسداری نہیں کرتے، کیا ایسے بے منطق وحشیوں کا مقابلہ طاقت کی زبان کے علاوہ، کسی اور طرح سے ممکن ہے؟ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ اسرائیل کے ساتھ میز پر بیٹھ کر مذاکرات سے مسائل کا حل کیوں نہیں کرتے؟ جواباً عرض ہے، وہی اسرائیل جو غاصب و جابر ہے، جس نے تمام بین الاقوامی قوانین، عالمی اداروں کی تمام قراردادیں اور تنبیہیں اور ہر قوم مذہب اور ملت کے مسلمہ انسانی حقوق کو پامال کر دیا ہے، آیا وہ مذاکرات میں دلیل و منطق کی زبان سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے؟ وہ اسرائیل جس نے ہزاروں بچوں اور بوڑھوں

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۱۹۳ کی تفسیر کے ذیل میں ج ۱ میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

عورتوں، مردوں اور ہسپتالوں پر بمباری کرکے، ان کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا، کیا اس پر مذاکرات کا کچھ اثر ہو سکتا ہے؟ اسی طرح کے اور لوگ جو عوام الناس کی بیداری اور شعور کے مراکز مساجد اور دیگر عبادت گاہوں، جن کو وہ اپنے غیر قانونی مفاد کے حصول میں سدرہ سمجھتے ہیں۔ کو جیسے تیسے تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کیا اس قابل ہیں کہ ان کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کیا جائے؟

بہرحال نظریاتی مسائل سے قطع نظر اگر آج دنیا کے مختلف معاشروں کی حقیقی کیفیت پر غور کریں اور ان پر ماضی قریب بعید میں گزرنے والے واقعات پر نظر کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ بعض حالات میں طاقت اور آلات حرب و ضرب کا سہارا لینا ناگزیر ہو جاتا ہے، اس لیے نہیں کہ دلیل و منطق میں کسی قسم کا جھول ہے، بلکہ ظالموں اور جابروں کو دلیل اور صحیح منطق کی طرف مائل کرنے کے لیے، یقیناً جہاں کام دلیل و برہان سے بنتا ہو وہاں منطق مقدم ہے۔

۲۔ اللہ نے کن لوگوں سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے؟ یہ نظریہ غلط ہے کہ مذکورہ بالا آیت یا دوسری آیتوں میں اللہ نے مومنین کے دفاع، مدد اور کامیابی کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ قوانین اور ضابطۂ آفرینش و فطرت کے خلاف ہے۔ یہ وعدہ صرف ان لوگوں سے کیا گیا ہے، جو مقدور بھر قوت و طاقت اور تمام تر وسائل کے ساتھ میدان میں آئیں۔ آیت میں بھی یہی فرمایا گیا ہے۔

"لولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض"

خدا جابر و ظالم طاقتوں کو (سوائے استثنائی اور معجزاتی حالات کے مبنی طاقتوں مثلاً صاعقہ اور زلزلہ" سے ختم نہیں کرتا بلکہ) خالص اور سچے مومنین کے ذریعے دور کرتا ہے۔

ان سچے مومنین کی مدد اور حمایت کی جاتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ کہیں اللہ کے وعدے نہ صرف یہ مسلمانوں کی سستی، کاہلی اور عدم احساس ذمہ داری کا موجب بن جائیں، بلکہ حرکت، فعالیت اور حصول مقصد کے لیے تشویق و ترغیب کا سبب بھی بنیں، البتہ اس صورت میں حتمی کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مومنین کا یہ طبقہ کامیابی سے پہلے ہی اللہ سے متمسک نہیں ہوتا، بلکہ کامیابی کے بعد بھی اس آیۃ " الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموا الصلٰوۃ" کا مصداق بنتے ہوئے اللہ سے اپنا رابطہ مستحکم کر لیتا ہے اور دشمن پر کامیابی کو حق، انصاف اور شرافت کی ترویج کا ذریعہ بناتا ہے۔

بعض روایات میں عمومی طور پر حضرات آل محمدؐ اور امام مہدیؑ کے انصار کو مندرجہ بالا آیت کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً امام باقرؑ نے اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا۔

یہ آیت اوّل سے آخر آلِ محمدؐ اور حضرت مہدیؑ کے انصار اور جاں نثاروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

یملکھم اللہ مشارق الارض ومغاربھا، ویظھر الدین، ویمیت اللہ بہ وباصحابہ البدع والباطل کما امات الشقاۃ الحق، حتی لایری این الظلم، ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔

اللہ زمین کے مشرق ومغرب کو ان کی حکمرانی میں دے دے گا۔ اپنے دین کو غالب قرار دے گا، امام مہدی اور آپ کے اصحاب کے ذریعے بدعت اور باطل کو اسی طرح ملیامیٹ کر دے گا جس طرح غاصبوں نے حق کو کیا تھا اور دُور دور تک کہیں ظلم کا نام ونشان تک نہ ملے گا۔ (کیونکہ) وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کریں گے۔[1]

اس سلسلے میں اور احادیث بھی روایت کی گئی ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ایسی روایات ہمیشہ آیت کے اعلیٰ اور نمایاں مصادیق کا ذکر کرتی ہیں، آیت کے عام مفہوم پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اس بنا پر اس آیت کا وسیع تر مفہوم تمام صاحبان ایمان مجاہدوں اور مومنین کو دامن میں لیے ہوئے ہے۔

۳۔ "محسنین" "مخبتین" اور اللہ کے انصار

مندرجہ آیات اور ان سے پہلے کی آیات کہتی ہیں کہ "محسنین" کو خوشخبری سنا دو اور بعد ازاں ان کا تعارف صاحبان ایمان اور کفران نعمت نہ کرنے والوں کی حیثیت سے کرواتی ہیں اور کبھی مخبتین (عجز وانکساری کرنے والے) کے طور پر اُن کا ذکر کیا ہے اور انہیں ذکر خدا کے موقع پر خوف خدا سے لرزاں اور مصائب وشدائد کے مواقع پر صبر وتحمل کے پیکر بننے والے، نماز قائم کرنے والے اور اپنے خداداد وسائل ونعمات میں بندگان خدا کو شریک کرنے والے، کہہ کر پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں "اللہ کے انصار" کا یوں تعارف کرایا جاتا ہے کہ وہ غالب آنے کے بعد گھمنڈ، غرور اور تکبر کی بجائے تواضع وعاجزی کی روش اختیار کرتے ہوئے نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہیں۔ اگر ان آیتوں کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مندرجہ بالا خصوصیات کے حامل سچے اور خالص مومن وہ ہیں جو ایک طرف نظریات، اعتقادات اور احساس کی ذمہ داری کے اعتبار سے بہت مضبوط اور دوسری طرف میدان عمل میں خالق ومخلوق دونوں کے تمام حقوق پوری طرح ادا کرتے ہیں، بدخواہیوں اور برائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور ہر قسم کی مشکلات ومصائب کا مقابلہ بڑی پامردی اور استقامت سے کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۰۶ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم۔

۴۲۔ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۝

۴۳۔ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۝

۴۴۔ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝

۴۵۔ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝

ترجمہ

۴۲۔ اور اگر وہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) ان سے پہلے نوح کی قوم، عاد اور ثمود نے بھی (اپنے نبیوں کو) جھٹلایا ہے۔

۴۳۔ اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم نے بھی۔

۴۴۔ اور مدین کے عوام (شعیب کی قوم) نے اور (فرعون کے پیروؤں نے) موسیٰ کو جھٹلایا۔ میں نے انہیں مہلت دی، مگر پھر میں نے ان کو پکڑ لیا، تو نے دیکھا کس طرح میں نے ان کے عمل کو مسترد کر دیا (اور ان کو کیسا جواب دیا)

۴۵۔ کتنے ہی شہر اور بستیاں ان کے (رہنے والوں کے) ظلم و ستم کی وجہ سے ہم نے تباہ و برباد کردیں۔ اس طرح سے کہ ان کی چھتیں اُن پر گرادیں (پہلے چھتیں گرائی گئیں، پھر دیواریں چھتوں پر آگریں) کتنے ہی لبالب کنوئیں لاوارث ہوگئے اور کتنے پختہ فلک بوس محل بھی۔

تفسیر

لاوارث کنوئیں اور فلک بوس محل

گذشتہ آیتوں میں مومنین کے لیے اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے پیدا کردہ، پیچیدہ، گھمبیر اور طاقت فرسا مسائل کا ذکر تھا۔ یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ توحید پرستی کے جرم میں طاغوتیوں نے مومنین کو کس طرح اور کیسی کیسی اذیتیں اور تکالیف پہنچائیں۔ انہیں آوارہ وطن اور در بدر کیا اور ان مظالم سے نمٹنے کے لیے مومنین کو جہاد کی اجازت دی گئی۔ زیر بحث آیت ایک طرف پیغمبر اسلامؐ اور مومنین کی دل جوئی کرتی ہے اور دوسری طرف کفار کے منحوس اور بُرے انجام کی وضاحت کرتی ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا جا رہا ہے: اگر تمہیں جھٹلایا گیا ہے تو پریشان نہ ہو۔ کیونکہ ان سے پہلے نوح کی قوم، عاد اور ثمود بھی اپنے نبیوں کو جھٹلا چکی ہیں۔ (وان یکذبوك فقد کذبت قبلهم قوم نوح وعاد وثمود) اور اسی طرح، ابراہیم و لوط کی قوموں نے بھی ان دو عظیم پیغمبروں کو جھٹلایا (وقوم ابراهیم وقوم لوط)۔ اور مدین کے باسی بھی شعیب کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور فرعون اور اس کے پیروں کاروں نے موسیٰ کو جھٹلایا۔ (واصحاب مدین وکذب موسٰی) یعنی جس طرح ماضی میں شدید مخالفین کی رکاوٹیں اور تکذیبیں ان عظیم پیغمبروں کی دعوت توحید حق و عدالت کی راہ میں کمزوری کا باعث نہ بن سکیں، اسی طرح بلا شک و شبہ تیری پاک اور با استقامت رُوح پر بھی اثر نہ کرسکیں گی۔ لیکن اندھے دلوں والے یہ کفار کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی ناپاک تخریب کاری اور سیاہ کاریاں ہمیشہ جاری رکھ سکیں گے۔ "ماضی میں پہلے تو ان کو مہلت دی گئی تاکہ ان کی آزمائش مکمل ہو جائے ان پر حجت تمام ہو جائے اور وہ پُر تعیش زندگی میں مگن رہیں۔ پھر قانون مکافات کے تحت ان کو دھر لیا (فاملیت للکافرین ثم اخذتهم)۔ دیکھا! کتنی حقارت سے میں نے ان کی بداعمالیوں کو یکسر مسترد کر دیا اور کتنی وضاحت سے ان کی بداعمالیوں کی قباحت و شناعت کو طشت از بام کیا (فکیف

کان نکیر)۔[1]

ان کو دی گئی نعمتیں چھین لیں اور اذیت، زحمت اور بدنصیبی ان کا مقدر بنا دی۔ زندگی سے کر موت دے دی۔ زیرِ بحث آخری آیت کے پچھلے جملے میں اللہ کی سزا سے اجمالی کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کتنی ہی بستیاں اور آبادیاں ایسی ہیں جن (کے باسیوں) کو ہم نے ہلاک کر ڈالا۔ کیونکہ وہ ظالم اور ستم گر تھے۔ (فکاین من قریة اھلکنا ھا وھی ظالمة)۔ ان کی چھتیں نیچے آگریں۔ (فھی خاویة علیٰ عروشھا) یعنی شدید عذاب اس قدر سخت تھا کہ صحیح و سالم مکانات کی یک دم چھتیں بیٹھ گئیں اور ان پر دیواریں آرہیں۔ اور کتنے پُر از آب کنویں لاوارث ہو گئے پانی زمین میں جذب ہو گیا اور وہ بے کار ہو گئے۔ نہ کوئی ان سے پانی نکالنے والا رہا اور نہ کوئی پیاس بجھانے والا بچا۔ (وبئر معطلة)

کتنی پختہ سر بفلک پُر شکوہ عمارتیں زمین بوس ہو گئیں اور ان میں رہنے والے ملکِ عدم کے راہی ہو گئے (وقصر مشید)۔[2]

اس طرح سے ان کے پُر تعیش محلات و مساکن لاوارث ہو گئے۔ اور ان کی زمین کی سرسبزی و شادابی کے ضامن ذرائع آبپاشی بھی ختم ہو کر رہ گئے۔

ایک نکتہ

اہلِ بیت اطہارؑ کے ذریعے سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں ایک توجہ طلب نکتہ بیان کیا گیا ہے، کہ "بئر معطلة" سے مراد وہ علما اور دانشور ہیں جو معاشرے میں تنہا رہ گئے ہوں اور جن کے علوم و دانش سے کوئی کسبِ فیض نہ کرتا ہو۔ امام موسیٰ کاظمؑ سے (وبئر معطلة وقصر مشید) سے متعلق روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"البئر المعطلة الامام الصامت، والقصر المشید الامام الناطق"

"وہ کنواں جس سے استفادہ کرنے والا کوئی نہ ہو، اس امام و رہبر کی طرح ہے جو خاموش اور عالمِ سکوت میں ہو۔ جبکہ "قصر مشید" سے مراد وہ امام و رہبر ہے جو منصبِ رہبری پر عملاً فائز ہو۔"

---

[1] "نکیر" کا لغوی معنی انکار کرنا ہے اور یہاں سزا دینے اور عذاب و عقاب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[2] "مشید" "شید" (بروزن "بید") کے مادہ سے ہے۔ اس کے دو معنی ہیں۔ (۱) بلند و بالا (۲) سیمنٹ اور چونا پہلے معنی کے مطابق، سربفلک اور فلک بوس محلات مراد ہے اور دوسرے معنی کے مطابق، پختہ پکے اور موسمی تغیر و تبدل سے محفوظ مراد ہے۔ چونکہ اس زمانے میں اکثر اور عام لوگوں کے مکانات کچے اور مٹی کے بنے ہوتے تھے جو فطری عوامل کے سامنے کمزور ہوتے تھے۔ مگر وڈیروں اور سرمایہ دار اور حاکموں کے محلات چونے یا اس قسم کے پختہ مواد سے بنائے جاتے تھے۔

اس طرح کی ایک روایت امام صادقؑ سے بھی نقل کی گئی ہے۔[1]

یہ روایات دراصل تشبیہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (جیسا کہ حضرت مہدیؑ اور آپ کی عالمگیر عادل حکومت کو روایات میں "ماء معین" (یعنی آب جاری) کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب رہبر اور امام مسند حکومت پر فائز ہو تو وہ ایک عالیشان سر بفلک اور مضبوط محل کی مانند ہے۔ جو قریب و بعید سے ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور سب کے لیے ایک مرکز و پناہ گاہ کا کام دیتا ہے۔ مگر جب اسے مسند اقتدار سے ہٹا کر نا قابل اور نا اہل افراد کو اس کی جگہ پر بٹھا دیا جائے تو وہ اس متروک کنویں کی طرح ہو جائے گا جس سے نہ کوئی پیاس بجھائے اور نہ زمین اس سے سیراب ہو)۔

"بئر معطلة" اور "قصر مشید" کے محاورے کو ایک عرب شاعر نے بھی بڑے دلکش انداز میں نظم کیا ہے:

بئر معطلة وقصر مشرف ــــ مثل لآل محمد مستطرف

فالقصر مجدهم الذی لا یرتقی ــــ والبئر علمهم الذی لا ینزف

متروک کنواں اور بلند محل آلِ محمدؐ کے حالات کے لیے بڑی عمدہ مثال ہے "قصر" ان کی رفعت بلندی اور وقار کی مثال ہے کہ جہاں تک کسی کی رسائی نہیں اور کنواں، ان کے علم کا مظہر ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔[2]

---

[1] تفسیر برہان ج ۳ صفحہ ۹۷
[2] تفسیر برہان ج ۳ صفحہ ۹۷

۴۶۔ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ○

۴۷۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○

۴۸۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ○

ترجمہ

۴۶۔ کیا وہ زمین پر چلتے پھرتے نہیں کہ ان کے دل ادراک حقیقت کر سکتے اور کان صدائے حق سننے والے ہوتے۔ کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ سینے کے اندر دل اندھے ہو جاتے ہیں۔

۴۷۔ اور وہ تجھ سے عذاب میں تعجیل کا تقاضا کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا اور تیرے رب کے ہاں ایک دن تمہارے حساب کے ہزار سال کے برابر ہے۔

۴۸۔ کتنی بستیاں اور آبادیاں ایسی ہیں، جن کو میں نے مہلت دی۔ جب کہ وہ ظالم تھے۔ (لیکن انھوں نے اپنی اصلاح کے لیے اس مہلت سے فائدہ نہیں اُٹھایا) پس میں نے ان کو دھر لیا اور سب کی بازگشت میری ہی طرف ہے۔

تفسیر

سیر وسیاحت اور دلوں کی بیداری

گذشتہ آیتوں میں ان بداعمال اور روسیاہ ظالموں کے بارے میں گفتگو کی جارہی تھی، جن کو اللہ نے کیفرِ کردار تک پہنچایا اور ان کے شہروں کو برباد کردیا۔ زیرِ بحث پہلی آیت میں اسی مضمون کی تاکید مزید کے طور پر ارشاد ہوتا ہے۔ آیا وہ زمین میں سیر وسیاحت نہیں کرتے ان کے دل حقیقت شناس ہوجائیں یا ان کے کان صدائے حق سن لیں۔ (افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا او اٰذان یسمعون بھا)۔

بے شک ظالموں کے محلات اور دُنیا پرستوں کے ٹھکانے اور مساکن جن کا اقتدار کبھی بہت بلند تھا اس خاموشی کے باوجود ہزار ہزار باتیں کہہ رہے ہیں اور ہر بات میں ہزار ہزار نکتے پوشیدہ ہیں۔ یہ ویران اور اجڑی ہوئی بستیاں، گویا ان اقوام کی سوانح کردار ورفتار، شرمناک طرزِ زندگی اور عبرت ناک انجام پر منہ بولتی کتابیں ہیں۔

یہ کھنڈرات اور ان سے نظر آنے والے آثار انسان کے دل ودماغ پر ایسے اثرات مرتب کرتے ہیں کہ بعض اوقات ان میں سے کسی ایک جگہ کا مشاہدہ کثیر مطالعے سے زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے اور تاریخ کے دھرائے جانے کے تناظر میں، جو انسانی زندگی کی بنیاد ہے، ان کھنڈرات کا مشاہدہ انسان کے مستقبل کو مجسم شکل میں اس کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ واقعی سابقہ اقوام کا مطالعہ اور ان کے آثار کا مشاہدہ کان کو شنوا اور آنکھ کو بینا کر دیتا ہے۔

اسی لیے قرآن مجید کی متعدد آیات میں سیاحت کی ترغیب دی گئی ہے۔ لیکن الٰہی اور اخلاقی سیاحت جس کی غرض وغایت عبرت حاصل کرنا اور سبق سیکھنا ہو، سیاح کی آنکھوں سے گویا اس کا دل جھانک رہا ہو جو مدائن کے ایوانوں اور فراعنہ کے محلوں کو نگاہِ عبرت سے دیکھ رہا ہو کبھی دجلہ کے ساتھ ساتھ مدائن کی وادیوں میں پہنچے اور کبھی مدائن میں اپنے آنسوؤں سے ایک نیا دجلہ بہا دے۔

ظالم بادشاہوں کے محلات کے کھنڈروں میں ٹوٹے ہوئے برجوں سے نصیحت حاصل کرے اور دل کے کانوں سے وہاں کی خاک کے ہر ذرے سے سنائی دیتا ہوا یہ نغمہ دل نشیں سنے ۔

گامی دو سہ بر، ما نہ
اشکی دو سہ بفشان

یعنی دو تین قدم چلو اور دو تین آنسو بہاؤ۔[1]

اس کے بعد قرآن مجید اس حقیقت کو کہ اکثر لوگ ظاہراً صحیح و سالم آنکھیں یا کان رکھتے ہیں۔ مگر دل کے اندھے اور بہرے ہوتے ہیں۔ زیادہ واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔ کیونکہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ بلکہ سینوں کے اندر دل اندھے ہو جاتے ہیں (فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور)۔

حقیقت یہ ہے کہ ظاہری آنکھوں سے محروم جو عرفِ عام میں اندھے کہلاتے ہیں۔ بعض اوقات بہت روشن دل اور باخبر ہوتے ہیں۔ حقیقی اندھے تو وہ لوگ ہیں کہ جن کے دل کی آنکھ اندھی ہو گئی ہو اور وہ صحیح ادراک نہ کر سکتے ہوں۔ اسی لیے حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا۔

شر العمی عمی القلب
بدترین اندھاپن دل کا اندھاپن ہے

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

اعمی العمی عمی القلب
سب سے شدید اندھاپن دل کا اندھاپن ہے[2]

عوالی اللئالی میں ایک اور روایت درج ہے۔
حضرت پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں۔

اذا اراد الله بعبد خیراً فتح عین قلبه فیشاهد بها ما کان

---

[1] ادوار ماضی اور سابقہ لوگوں کے آثار کے متعلق سیر و سیاحت کے آداب کے بارے میں سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۳۷ کی تفسیر کے ذیل تک ہم اس تفسیر کی جلد نمبر ۲ میں سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔

[2] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۰۵

غائبًا عنه۔

جب اللہ کسی بندے کی بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے دل کی آنکھیں روشن کر دیتا ہے تاکہ وہ اس ذریعے سے پوشیدہ حقائق کا مشاہدہ کر سکے ہیں۔ ؎۱

یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ادراک حقائق کی نسبت سینے کے اندر دل سے کیوں دی گئی ہے۔ حالانکہ دل کا کام صرف خون کو گردش دینا ہے۔ اس کا جواب ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر کے ذیل میں پہلی جلد میں دے چکے ہیں البتہ یہاں خلاصہ پیش خدمت ہے

دل کو عقل کے معنیٰ میں بھی لیا گیا ہے اور سینہ انسان کی ذات اور سرشت کے معنیٰ میں ہے، اس کے علاوہ جذبات اور میلانات کا مظہر بھی دل ہی ہے۔

جب کبھی جذباتی ادراک کی کوئی برق رو جو شدید تحریک کا سبب ہوا کرتی ہے۔ انسانی رُوح میں ظاہر ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس سے متاثر ہونے والا عضو بدن بھی 'دل' ہی ہے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ خون بڑی تیزی سے بدن کے ہر عضو میں پہنچتا ہے اور جسم کو ایک تازہ نشاط اور نئی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے رُوح کے ظواہر کی نسبت "دل" کی طرف دی جاتی ہے۔ (قابل غور ہے)

زیر بحث آیت میں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ انسان کے مجموعی ادراکات کی نسبت دل (عقل) اور کانوں کی طرف دی گئی ہے گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ادراکِ حقیقت کے صرف دو راستے ہیں۔

۱۔ اندرونی

۲۔ بیرونی

یعنی یا تو انسان اپنے اندر سے جوشش و ولولہ لے کر اس کا تجربہ کرے اور اس طرح حقائق تک پہنچے یا بیرونی عوامل، مثلاً انبیاءؑ، اوصیاءؑ، اولیاءؑ اور ناصحین و ناقدین کی حقیقت آفریں باتوں سے حق کو پالے یا دونوں طریقوں سے حق تک پہنچے۔ ؎۲

دوسری زیر نظر آیت میں بے ایمان، جاہل، بے خبر اور دل کے اندھوں کا ایک اور چہرہ دکھایا گیا ہے کہ وہ جلد عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ "اگر تم سچے ہو تو پھر خدا کا عذاب کیوں ہمیں آ نہیں لیتا"

(ویستعجلونك بالعذاب)۔

"ان سے کہہ دیجئے کہ جلدی نہ کریں اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ (ولن یخلف الله وعده) کیونکہ جلدی اور عجلت تو اُسے ہوا کرتی ہے۔ جسے یہ ڈر ہو کہ کہیں موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے اور اس کے وسائل و اختیارات ختم نہ ہو جائیں۔ جبکہ اللہ جو ازل سے ابد

؎۲ تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۰۲

؎۱ تفسیر المیزان زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں ج ۱۴ ص ۴۲۲

تک ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھتا ہے کسی کام میں جلدی کیوں کرے گا۔ وہ ہمیشہ اپنے وعدوں کو بروقت پورا کرتا ہے، اس کے نزدیک ایک لمحہ، دن یا ایک سال سب برابر ہیں" کیونکہ تیرے پروردگار کے ہاں ایک دن تمھارے حساب سے ہزار سال کے برابر ہے"

(وان یوماً عند ربک کالف سنة مما تعدون)

چنانچہ وہ سنجیدگی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کریں یا بطور تضحیک و استہزاء ایسا کہیں کہ "کیوں عذاب خدا ہم پر نازل نہیں ہوتا"

انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی طرف سے آنے والا عذاب ان کی گھات میں ہے جلدی یا بدیر ضرور ان کو آئے گا۔ یہ مہلت جو انھیں دی گئی ہے اس کا مقصد ان کو بیداری شعور اور تجدید نظر کا موقع فراہم کرتا ہے۔

اور جب عذاب نازل ہو گیا تو معافی اور توبہ کے تمام دروازے ان پر بند کر دیئے جائیں۔ شعور اور نجات کا کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا۔

" ان یوماً عند .... مما تعدون" کے جملے کی مندرجہ بالا تفسیر کے علاوہ اور مفاہیم بھی مفسرین نے پیش کیے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تمھیں ہزار سال کا عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔ مگر اللہ کو نہ کسی تیاری کی ضرورت ہے نہ وقت کی احتیاج، بلکہ وہ کسی کام (عذاب) کو ایک دن (بلکہ اس سے کم) میں بھی انجام دے سکتا ہے۔

ایک اور مفہوم یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آخرت کا ایک دن دنیا کے ہزار سال کے برابر ہے (اسی لحاظ سے وہاں کی جزا اور سزا کی طوالت بھی زیادہ ہے) اسی سلسلے کی ایک روایت نقل کی گئی ہے

ان الفقراء یدخلون الجنة قبل الاغنیاء نصف یوم ای خمسة مائة عام۔

"غریب لوگ امیر کبیر لوگوں کے مقابلہ میں آدھا دن یعنی پانچ سو سال قبل جنت میں داخل ہوں گے"۔ [۱]

آخری آیت میں گذشتہ آیتوں میں بیان شدہ بنیادی نقطہ اعادةً بیان کیا جا رہا ہے اور اسی طرح ہٹ دھرم کفار کو تنبیہ کی جا رہی ہے۔

"ایسی کتنی بستیاں اور آبادیاں ہیں، جنہیں ہم نے مہلت دی، حالانکہ وہ ظالم تھے (مہلت اس لیے دی گئی تاکہ وہ خواب غفلت سے جاگ اٹھیں۔ مگر جب ایسا نہ ہوا تو پھر ہم نے انھیں ڈھیل دی تاکہ پر تعیش زندگی میں مگن ہو جائیں) پھر اچانک ان کی سزا یعنی شدید عذاب نے انھیں آلیا (وکاین من قریة املیت لها وهی ظالمة ثم اخذتها) تو بھی تمہاری

---

[۱] تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

طرح عذاب میں تاخیر پر شکایت کرتے تھے اور مذاق اڑایا کرتے تھے اور اس تاخیر عذاب کو پیغمبروں کے جھوٹا ہونے کی دلیل بنا لیا کرتے تھے۔ لیکن آخرکار عذاب میں مبتلا ہوئے اور آہ و بکاء کرنے لگے مگر اس آہ و بکار کی شنوائی نہ ہو سکی۔ بے شک یہ سب میری طرف ہی لوٹیں گے۔ تمام راہیں اللہ ہی پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ اور تمام ذخائر و وسائل اور یہ تمام دولت و ثروت یہاں باقی رہ جائے گی اور وہی ان سب کا مالک ہے۔ (و الی المصیر)۔

۴۹۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ

۵۰۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○

۵۱۔ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ○

ترجمہ

۴۹۔ کہہ دیجئے! اے لوگو! میں تمہارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔

۵۰۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے بھلائی کے کام کیے ان کے لیے معافی اور اچھا رزق ہے۔

۵۱۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری نشانیوں کے بارے میں (مٹانے کی) کوشش کی، اور یہ سمجھے کہ وہ ہم پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ وہ اہل جہنم ہیں۔

تفسیر

رزقِ کریم

گذشتہ آیتوں میں کفار کی طرف سے عذاب میں تعجیل کے مطالبے کا ذکر تھا اور یہ مسئلہ صرف ذات پروردگار عالم اور اُس کی حکمت آفریں مشیت سے متعلق ہے۔ یہاں تک کہ انبیاء کو بھی اس میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ زیرِ بحث پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے، کہہ دیجئے۔ اے لوگو! میں تمہارے لیے صرف ایک کھُلم کھُلا ڈرانیوالا

ہوں" (قل یا ایها الناس انما انا لکم نذیر مبین) البتہ سرکشی اور نافرمانی کی سزا کے طور پر جلد یا بدیر کوئی عذاب تم پر نازل ہو تو اس کا تعلق مجھ سے نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اکرمؐ ڈرانے والے بھی ہیں اور خوشخبری دینے والے بھی مگر اس آیت مبارکہ میں خوشخبری کا ذکر نہ کرنے اور صرف ڈرانے کی بات کرنے کی وجہ مخصوص تطریے کے مخاطب ہیں۔ چونکہ وہ بے ایمان اور ہٹ دھرم قسم کے افراد تھے۔ جو خدائی عذاب وعقاب کا بھی مذاق اڑایا کرتے تھے۔ البتہ بعد والی دو آیتوں میں بشارت اور ڈراوا، دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ اللہ کی رحمت واسعہ اس کے عذاب پر سبقت رکھتی ہے۔ لہٰذا پہلے بشارت کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے بھلے کام کیے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی اور اعلیٰ رزق وروزی ان کے لیے مخصوص ہے (فالذین امنوا وعملوا الصٰلحات لهم مغفرة ورزق کریم) یعنی پہلے اللہ کی معافی، بخشش اور عفو ودرگزر کی جاری نہر میں غوطہ زن ہو کر کثافت وغلاظت کے بوجھ سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ پاک باطن بن جاتے ہیں، پھر اس کے لطف وکرم کی طرح طرح کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اس لحاظ سے کہ "کریم" سے مراد ہر قابل قدر اور اعلیٰ چیز ہوا کرتی ہے" رزق کریم" ایک وسیع مفہوم پر دلالت کرتا ہے جو تمام مادی اور معنوی گرانقدر نعمتوں پر محیط ہے۔

بے شک اللہ اپنے اس کریم مہمان خانے میں طرح طرح کی کریم نعمتوں کے ساتھ اپنے مومن، صالح اور کریم بندوں پر فیوض وبرکات کی بارش کرے گا۔

راغب اپنی مشہور کتاب "مفردات" میں لکھتا ہے کہ لفظ "کرم" عام طور پر بہت نیک، بھلے، اچھے اور قابل قدر امور کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کم درجے کی نیکی اور اچھائی کے لیے نہیں۔ بعض مفسرین نے "رزق کریم" سے غیر منقطع، مسلسل، بے نقص، روزی کے معنی مراد لیے ہیں اور بعض نے مناسب اور حسب حال کا مفہوم لیا ہے۔ اصل میں یہ سب مفاہیم مندرجہ مذکور مفہوم میں شامل ہیں۔

اس کے بعد دوبارہ فرمایا گیا ہے: لیکن وہ لوگ جو اللہ کی نشانیوں کو مٹانے اور تخریبی کارروائیوں میں سرگرم ہیں اور اپنے زعم باطل میں اللہ کے ارادوں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دوزخی ہیں (والذین سعوا فی اٰیاتنا معاجزین اولٰئک اصحاب الجحیم) [1]

---

[1] "سَعَوْا" "سعی" کے مادہ سے دوڑنے کے معنی میں ہے اور یہاں آیات الٰہی کو مٹانے کے لیے کوشش کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "معاجزین" "عجز" کے مادہ سے ہے۔ یہاں ان لوگوں کے ارادوں کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قوت وسطوت پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے "معاجزین" کو پیغمبر اور مومن کے ساتھ منسوب سمجھا ہے۔ ان کے خیال میں کسی شخص کے بارے میں یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کو عاجز کرنا چاہتا ہو۔ حالانکہ یہی تعبیر دوسری قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں آئی ہے (سورۂ جن۔ ۱۲ اور توبہ ۲، ۳)، اور مراد یہ ہے کہ کسی کا عمل اس کے چہرے سے ظاہر ہو۔

"جَحِیْمٌ" جَحَمَ (بروزن شَرَمَ) کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنیٰ آگ کا شدت سے بھڑکنا اور غیظ وغضب کی شدت ہے۔ لہٰذا جَحِیْم وہ جگہ ہوئی جہاں آگ، غیظ اور غضب شدت سے بھڑکتے ہیں۔ یعنی دوزخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۵۲۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۙ

۵۳۔ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۙ

۵۴۔ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

ترجمہ

۵۲۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا۔ جب بھی وہ کوئی آرزو کرتا (اور اپنے الٰہی اہداف کی تکمیل کے لیے کوئی منصوبہ بناتا) تو شیطان ضرور اس میں وسوسے پیدا کر دیتا، پھر خدا انہیں مٹا دیتا اور اپنی نشانیوں کو استحکام بخشتا اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

۵۳۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اللہ شیطانی وسوسوں کو ان لوگوں کے لیے آزمائش قرار دے، جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو سنگ دِل ہیں اور ظالم حق سے دور شدید بغض وعناد میں بھرے ہُوئے ہیں۔

۵۴۔ اور علاوہ بر ایں مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ جنہیں اللہ نے علم دیا ہے جان لیں، کہ تیرے پروردگار کی طرف سے یہ حق ہے۔ چنانچہ ایمان لے آئیں، دل سے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں اور اللہ صاحبانِ ایمان کو راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

انبیاءؑ کے خلاف شیطانی وسوسے

گذشتہ آیتوں میں کفار اور مشرکین کی طرف سے دینِ خدا کی تضحیک اور استہزاء اور اسے مٹانے کی سرگرمیوں کا ذکر تھا زیرِ بحث آیتوں میں لوگوں کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ دین دشمن وسیہ کاریاں کوئی نئی بات نہیں، بلکہ ہمیشہ سے طاغوتی اور شیطانی شکوک وشبہات انبیاء کے مقابلے میں پھیلائے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ "تجھ سے پہلے ہم نے جب کبھی بھی کوئی رسول اور نبی بھیجا اور اس نے خدائی مقاصد کی توسیع وترقی کا جو منصوبہ بھی بنایا۔ ضرور شیطان نے اس میں شکوک وشبہات پیدا کیئے" (وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ ولا نبیٍّ الا اذا تمنّٰی القی الشیطان فی امنیته) لیکن اللہ شیطان کے ان وسوسوں کے ہجوم میں اپنے پیغمبر کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ بلکہ "اللہ شیطان کے شکوک وشبہات کو زائل کردیتا اور اپنی نشانیوں کو استحکام بخشتا ہے (فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثمّ یحکم اللہ ایاته) اور یہ کام اللہ کے لیے آسان ہے، کیونکہ وہ "علیم وحکیم ہے"، تمام منفی ریشہ دوانیوں سے پُوری طرح باخبر ہے۔ اور ان کو ناکام بنانے کے طریقوں سے اچھی طرح واقف ہے (واللہ علیم حکیم) البتہ دین دشمن طاقتوں کی سیاہ کاریاں اور طاغوتی کارستانیاں ہمیشہ مومنین، باخبر افراد اور کفار کے لیے امتحان کا سبب بنتی ہیں، چنانچہ بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے "یہ تمام امور بیماردل اور سنگ دِل افراد کی آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ (لیجعل ما یلقی الشیطان فتنة للّذین فی قلوبهم مرض والقاسیة قلوبهم) اور ظالم وناانصاف لوگ حق سے

بہت دُور ہیں اور ان کے دل بغض و عداوت سے بھرے پڑے ہیں (وان الظّٰلمین لفی شقاق بعید) علاوہ برایں ان کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ آگاہ اور باخبر لوگ حق و باطل میں تمیز کریں، خدائی ضابطوں اور شیطانی شکوک میں امتیاز کریں اور دونوں کا موازنہ کر کے سمجھ جائیں کہ خدائی قانون ہی دینِ حق ہے اور تیرے رب کی طرف سے ہے، چنانچہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل پوری طرح اللہ کی بارگاہ میں جھک جائیں (ولیعلم الّذین اوتوا العلم انہ الحق من ربّک فیؤمنوا بہ فتخبت لہ قلوبھم)۔ بے شک اللہ ان آگاہ اور حق طلب مومنین کو ان خطرناک راہوں میں اکیلا نہیں چھوڑتا، بلکہ اللہ صاحبانِ ایمان کو راہِ راست کی ہدایت کرتا ہے (وانّ اللہ لھاد الّذین اٰمنوا الٰی صراط مستقیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ **شیطانی شکوک و شبہات کیا ہیں؟** مندرجہ بالا تفسیر کے علاوہ ان آیتوں کے بارے میں اور خیالات کا بھی اظہار کیا گیا ہے اگرچہ مذکورہ بالا تفسیر بعض محقق مفسرین کے نظریات سے ہم آہنگ ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک "تمنّی" اور "امنیہ" کے معنی تلاوت یا قرارت کے ہیں اور بعض عرب شعراء نے بھی ان الفاظ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس بنا پر زیرِ بحث پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ماضی میں جب انبیائے اللہ کے احکامات لوگوں کو سناتے تھے تو شیاطین (خصوصاً شیاطین نما انسان) ان کی گفتگو میں شکوک و شبہات پیدا کر دیتے اور عوام کو گمراہ کرنے کے لیے اور پیغمبروں کی ہدایت کو غیر مؤثر بنانے کے لیے ان کی تقریر کے دوران ہی باطل نظریات کا پرچار کرنے لگتے ــ لیکن اللہ اپنی قدرت کاملہ سے ان باطل افکار کے اثرات کو زائل کر دیتا اور اپنے احکامات کو پختگی بخشتا۔" یہ مفہوم۔

"ثمّ یحکم اللہ اٰیاتہ"

کے جملے سے مطابقت رکھتا ہے اور بعد میں آنے والے "غرانیق" کے فسانے سے ملتا جلتا ہے (اگرچہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے) لیکن زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ "تمنّی" اور "امنیۃ" تلاوت کے معنی میں شاذ ہی استعمال ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ خود قرآن الحکیم میں کہیں بھی اس معنی میں استعمال نہیں ہوئے۔ "تمنّی" کا اصل مادہ "منی" (بروزن مشی) ہے اور یہ دراصل تقدیر اور فرض کے معنی میں ہے۔ انسان اور حیوان کے نطفہ کو اسی لیے "منی" کہا جاتا ہے کہ اس سے بچے کی شکل و صورت معین ہوتی ہے۔ "منیہ" موت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ موت انسان کے لیے مقدر ہوتی ہے۔ آرزوؤں کو بھی تمنّی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے ذہن میں ان کی تصویر بنا لیتا ہے اور انھیں اپنا مقدر سمجھنے لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس لفظ کی بنیاد ہر جگہ تقدیر، فرض اور تصویر ہی ہے۔ یوں تو تلاوت اور قرارت کو بھی اس معنے سے مرتبط کیا جا سکتا ہے کہ تلاوت الفاظ کی تقدیر و تصویر ہی تو ہے۔ مگر یہ ربط بہت دور کا ہے اور عربی زبان میں ایسے ربط کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ البتہ انبیاء مرسلین کے منصوبوں اور پروگراموں والا معنیٰ جو ہم نے پیش کیا ہے وہ اس لفظ کے بنیادی اور اصلی معنیٰ

کے بہت قریب ہے۔

اسی ذیل میں ایک تیسرا احتمال یہ بھی پیش کیا ہے کہ اس سے مراد وہ شیطانی وسوسے ہیں۔ جو بہت ہی کم وقفے کے لیے انبیاءؑ سے پاک اور نورانی افکار میں ڈالے جاتے تھے مگر مقام عصمت کی وجہ سے اللہ کی غیبی قوت اور مدد کے ذریعے ان وسوسوں کو بہت جلد زائل کر دیا جاتا تھا اور ان کو بدستور راہ راست پر قائم رکھا جاتا تھا۔ یہ مفہوم بھی بعد کی آیتوں سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ بعد والی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ شیطانی شکوک اور وسوسے صاحبان علم، مومنین اور کافروں کے لیے آزمائش کا ذریعہ تھے چنانچہ اس مفہوم کا تعلق انبیاء کی قلبی اور فکری کیفیت سے ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ بہت جلد شیطانی وسوسوں کو سمجھ لیتے تھے اور ان سے دُور رہتے تھے۔

بہرحال اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے، جس میں انبیاءؑ کی کارکردگی اور منصوبوں کے مدمقابل شیطانی سازشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جن کے ذریعے وہ انبیاء کے فلاحی اور تعمیری منصوبوں کو ہمیشہ سبوتاژ کرنے کے درپے رہتے تھے مگر اللہ ان کو ناکام بنادیا کرتا تھا۔

۲۔ "غرانیق" کا من گھڑت فسانہ

بعض کتب اہل سنت میں اس موقع پر ابن عباس سے ایک عجیب روایت نقل کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہؐ سورۂ نجم کی تلاوت میں مصروف تھے، جب آپ اس آیۂ مجیدہ

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّـٰتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ۝

جس میں مشرکین کے بتوں کے نام لیے گئے ہیں، پر پہنچے تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ جملے جاری کرا دیئے

"تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى"۔

یہ دلکش بلند پایہ پرندے ہیں جن سے شفاعت کی امید باقی ہے۔[1]

یہ سننا تھا کہ مشرکین مکہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "آج پہلا موقع ہے کہ محمدؐ نے ہمارے خداؤں کے ناموں کو اچھائی کے ساتھ لیا ہے"۔

اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے سجدہ کیا اور مشرکین نے بھی سجدہ کیا، جبرائیلؑ نازل ہوئے اور اطلاع دی کہ موخر الذکر دو جملے میں آپ کے پاس نہیں لایا تھا۔ بلکہ وسوسہ شیطانی تھے اور اس وقت (وما أرسلنا من قبلك من نبي ....) والی آیت نازل ہوئی اور اس طرح رسول اللہؐ اور مومنین کو تنبیہ کی گئی ہے۔[2]

بعض اسلام دشمنوں نے پیغمبر اکرمؐ کے مشن کو نقصان پہنچانے کے لیے اس روایت کو اپنے لیے بڑی عمدہ

---

[1] "غرانیق" "غرنوق" (بروزن "مزدور") کی جمع ہے۔ یہ سفید یا سیاہ رنگ کا ایک آبی پرندہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ لفظ اور معنے میں بھی آیا ہے۔ (قاموس اللغۃ)

[2] تفسیر المیزان زیربحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں یہ حدیث اہل سُنت کے حفاظ حدیث سے نقل کی گئی ہے۔ ان میں ابن حجر بھی شامل ہیں۔

دستاویز بنالیا ہے۔ انہوں نے اس معاملہ کو بڑی شد و مد سے نقل کیا ہے اور اس پر بہت حاشیے چڑھائے ہیں۔ جب ایسے بہت سے قرائن موجود ہیں، جن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ ایک من گھڑت حدیث ہے۔

(ا) مثلاً بقول محققین اس حدیث کے راوی ضعیف اور غیر ثقہ ہیں اور ابن عباس سے اس کا روایت ہونا ثابت نہیں ہے۔ بقول محمد ابن اسحاق یہ قصہ زندیقوں اور ملحدوں کے بہت سے گھڑے ہوئے قصوں میں سے ایک ہے۔ اس نے یہ بات اپنی ایک کتاب میں لکھی ہے۔[1]

(اا) سورۂ نجم کی ابتدائی آیتوں میں صریحاً ان خرافات کی نفی کی گئی ہے۔ اس سورۃ کی تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"وما ینطق عن الھوٰی اِن ھو الا وحی یوحیٰ"

"رسول اللہ ہوائے نفس سے کلام نہیں کرتے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وحی ہوا کرتی ہے"

اس آیت کی موجودگی میں مذکورہ فسانہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔

(ااا) سورۂ نجم کے نزول کے دوران اور اس کے بعد حضرت پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کے سجدہ کرنے کے بارے میں مختلف کتابوں میں متعدد روایات نقل کی گئی ہیں۔ مگر کسی میں غرانیق والا افسانہ موجود نہیں ہے، جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ یہ 'فسانہ' بعد میں بڑھایا گیا ہے۔[2]

(IV) ان بتوں کے نام والی آیت کے بعد آنے والی آیتیں سب کی سب بتوں کی شدید مذمت کر رہی ہیں اور ان کی پستی و ضلالت کو واضح کرتے ہوئے کہتیں ہیں کہ یہ تمہارے من گھڑت اوہام و تصورات ہیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اِن ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و اٰباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس ولقد جاءھم من ربھم الھدیٰ۔

مذمت کے ان شدید الفاظ کے بعد کس طرح تصور کیا جاسکتا ہے کہ پہلے کی کسی آیت میں بتوں کی تعریف و توصیف کی گئی ہو۔ مزید براں قرآن مجید کے بارے میں صریحاً کہا گیا ہے کہ یہ ہر قسم کی تحریف و تغیر سے منزہ ہے۔ سورۂ حجر آیت ۹ اس طرح ہے۔

اِنا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔

(V) پیغمبر اکرمؐ نے زندگی بھر بتوں کے خلاف مسلسل و پیہم جہاد فرمایا اور کبھی لحہ بھر کے لیے بھی ان سے سمجھوتہ نہیں فرمایا۔ ابتدائی سن مبارک سے لے کر آخری دنوں تک بتوں اور بت پرستی کی طرف معمولی سا جھکاؤ اور میلان بھی نہیں دکھایا۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر الدین رازی ج نمبر ۲۳ صفحہ ۵۰۔

[2] تفسیر کبیر فخر الدین رازی ج نمبر ۲۳ صفحہ ۵۰۔

جا سکتا۔ یہاں تک کہ سخت ترین حالات میں بھی آپ کے رویے میں ذرا سی لچک بھی پیدا نہ ہوئی تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ یہ الفاظ آپ کی زبان مبارک پر آگئے ہوں۔

(vi) وہ لوگ جو مسلمان نہیں اور آپ کو منصوص من اللہ نہیں مانتے۔ وہ بھی آپ کو ایک مدبر مفکر اور دانشور ضرور سمجھتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی حکیمانہ تدبیروں سے شاندار کامیابیاں حاصل کریں تو اس کردار کی حامل شخصیت جو زندگی بھر لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللہ کا نعرہ بلند کرے۔ کسی قسم کی مصالحت اور سمجھوتے کے بغیر شرک و بت پرستی کے خلاف جہاد مسلسل جاری رکھے۔ کیا ممکن ہے کہ یکایک اپنے مقصد کو چھوڑ کر بتوں کی تعریف کرنے لگ جائے؟

مندرجہ بالا مفصل بحث یہ واضح کر رہی ہے کہ "غرانیق" کا قصہ عیار دشمنوں اور بے خبر مخالفوں کا خودساختہ ہے، جنہوں نے قرآن مجید اور پیغمبر اکرمؐ کی حیثیت کو داغدار کرنے کے لیے بے بنیاد اور گمراہ کن روایات گھڑی ہیں۔ شیعہ و سنی سے بالاتر ہو کر اسلام کے تمام محققین نے اس روایت کی پوری شدومد کے ساتھ نفی کی ہے۔ [1]

البتہ بعض مفسرین نے اس قصے کی توجیہ کی ہے۔ لیکن توجیہ کی وقعت تو تب ہے، جب اصل حدیث صحیح ثابت ہو جاتی بہرحال انہوں نے توجیہ یوں کی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ قرآن مجید کی تلاوت ٹھہر ٹھہر کر کیا کرتے تھے اور آیات کے درمیان چند لمحوں کا وقفہ کیا کرتے تھے تاکہ آیات سامعین کے ذہن نشین ہو جائیں۔ سورۂ نجم کی تلاوت کے دوران میں بھی جب آپؐ نے (اَفَرَاَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی ..... الۡاُخۡرٰی) والی آیت تلاوت کرنے کے بعد وقفہ فرمایا تو شیطان صفت ہٹ دھرم مشرکین نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (تلك الغرانيق ..... لترتجی) کا جملہ اسی خاص لحن کے ساتھ کہہ دیا تاکہ پیغمبر اکرمؐ کا تمسخر اڑے اور لوگوں میں شکوک پیدا ہوں۔ [2]

مگر بعد والی آیتوں نے مسئلے کو واضح کرتے ہوئے اس کا دندان شکن جواب دے دیا اور بت پرستی کی شدید مذمت کی۔ اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض افراد نے "غرانیق" والی داستان متعصب مشرک بت پرستوں کی ہٹ دھرمی کے باوجود ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے پیغمبر اکرمؐ کے جھکاؤ اور میلان کے طور پر بیان کی ہے۔ ایسا کرنے میں وہ فاش غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان کا یہ کہنا خود اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے۔ کہ انہیں جاہل بت پرستوں کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کے دو ٹوک رویے کا ادراک نہیں ہے اور ان تاریخی حقائق سے یا تو بے خبر ہیں یا تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ جن کے مطابق مشرک، پیغمبر اسلامؐ کو منہ مانگے دام دینے کے لیے تیار تھے۔ بشرطیکہ آپ اپنے موقف سے دستبردار ہو جائیں۔ مگر آپ نے ان کی ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا اور اپنے موقف سے سرمو اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر الدین رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر فی ظلال، تفسیر صافی، تفسیر روح المعانی، تفسیر المیزان اور دوسری تفاسیر (اسی آیت کے ذیل میں)

[2] تفسیر قرطبی ج ۷، صفحہ ۴۴۷۔ تفسیر مجمع البیان میں مرحوم طبرسی نے بھی اسی طرح اس کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ "رسول" اور "نبی" میں فرق

اس مسئلے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے، ہماری نظر میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ رسولؑ ان انبیاءؑ کو کہتے ہیں جو اپنے دین کی تبلیغ و ترویج اور لوگوں کو اس کی دعوت دینے پر مامور تھے، جیسا کہ ان کی سوانح حیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں انتھک کوشش کرتے تھے۔ معمولی سی فروگذاشت بھی نہیں کرتے تھے اور ہر طرح کی سختی اور تکلیف خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔

البتہ نبیؑ جیسا کہ خود اس لفظ سے ہی ظاہر ہے کہ اس شخصیت کو کہا جاتا ہے جو وحی الٰہی کی خبر دے۔ اگرچہ وہ وسیع سطح پر تبلیغ پر مامور نہیں ہوتا۔ دراصل وہ ایک ڈاکٹر کی مانند ہوتا ہے، جس کو تلاش کرکے اس سے لوگ اپنی بیماری کا علاج کراتے ہیں مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف پیغمبروں کے ماحول و حالات میں خاصا فرق تھا اور ہر ایک کے فرائض و ذمہ داریاں جدا جدا تھیں۔ [1]

---

[1] سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۱۳ کی تفسیر کے ذیل میں اسی سلسلے میں بحث ہو چکی ہے۔

۵۵۔ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ○

۵۶۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○

۵۷۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ ع

۵۸۔ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ○

۵۹۔ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۵۵۔ کفار ہمیشہ قرآن کے بارے میں شک میں مبتلاء رہیں گے، یہاں تک کہ اچانک قیامت آجائے یا یوم عقیم (وہ دن جب وہ کسی تلافی کے قابل نہ ہوں گے) کا عذاب ان کو آلے۔

۵۶۔ اس دن صرف اللہ کی حکمرانی ہوگی۔ وہ ان کا فیصلہ کرے گا۔

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انھوں نے اچھے عمل کیے ہیں۔ وہ بہشت کے نعمتوں سے معمور باغوں میں ہوں گے۔

۵۷۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے ان کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے۔

۵۸۔ اور جن لوگوں نے راہ خدا میں ہجرت کی پھر قتل ہوئے یا فوت ہو گئے اللہ انھیں بڑا عمدہ رزق دے گا اور اللہ ہی بہترین روزی دینے والا ہے۔

۵۹۔ اللہ انھیں ایسے مقام پر لے جائے گا کہ وہ خوش ہو جائیں گے اور اللہ صاحب علم و حلم ہے۔

تفسیر

رزقِ حسن

گذشتہ آیتیں، اللہ کی نشانیوں کو محو کرنے کے لیے مخالفین کی سرگرمیوں کے بارے میں تھیں۔ زیر بحث آیتوں میں انہی متعصب اور ضدی لوگوں کی ان مذموم کوششوں کے جاری رہنے کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے "کفار ہمیشہ قرآن مجید اور تیرے توحیدی دین کے بارے میں روزِ قیامت تک شکوک میں مبتلا رہیں گے۔ حتیٰ کہ قیامت اچانک آجائے گی۔ یا یوم عقیم کہ جس دن وہ کسی قسم کی تلافی کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں گے کا عذاب ان کو آئے گا۔ (ولا یزال الذین کفروا فی مریۃ منہ حتی تأتیھم الساعۃ بغتۃ او یأتیھم عذاب یوم عقیم)۔

واضح ہے کہ کافرین سے مراد تمام کفار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں کے بہت سے تبلیغ کے دوران پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لے آئے تھے اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے تھے۔ یہاں کافرین سے مراد ان کے ضدی اور متعصب سردار اور ہٹ دھرم کینہ پرور لوگ جو آخر تک ایمان نہ لائے اور تخریبی کارروائیوں میں مصروف رہے۔

لفظ "مریۃ" جس کا معنی شک، تردد اور تذبذب ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کفار قرآن اور اسلام کو یقین کی حد تک غلط نہیں سمجھتے تھے اگرچہ زبان سے ایسا ہی کہتے تھے، وہ اسلام کے خلاف یقین کی منزل سے گر کر کم از کم شک کی سطح پر آ گئے تھے مگر تعصب اور کینہ انھیں حقیقت کو پانے کے لیے مزید مطالعے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لفظ "ساعۃ" کے متعلق اگرچہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا مطلب "موت" اور "لمحاتِ مرگ" ہے، مگر بعد کی آیتیں بتلاتی ہیں کہ اس سے مراد قیامت کا آنا ہے۔ علی الخصوص "بغتۃ"، یعنی اچانک اور "ناگہانی" کے قرینے سے "یوم عقیم" کے عذاب سے مراد قیامت کی سزا ہے۔ اس کو "بانجھ" اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے بعد ان کو کوئی ایسا دن میسر نہ آئے گا کہ اپنے گناہوں کا کفارہ۔ یا کوتاہیوں کا ازالہ کر سکیں اور اپنی حالت وکیفیت میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکیں۔ اس کے بعد قیامت کے دن اللہ کی ہر جہت حاکمیت اعلیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس دن صرف اور صرف اللہ ہی کی حکمرانی ہوگی۔ (الملک یومئذ للہ) یہ بات صرف قیامت کے دن سے ہی مخصوص نہیں ہے، کیونکہ اللہ تو ہمیشہ ہر جہت اور مطلق حاکم ہے۔ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ البتہ دنیا میں چونکہ دوسرے حکام اور فرمانروا بھی ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی حکومت محدود اور کمزور ہوتی ہے اور اس کی صورت صرف ظاہری ہوتی ہے

البتہ یہی بات ہو سکتی ہے، اس امر کا باعث بنے کہ کہا جائے کہ اللہ کے علاوہ اور بھی حاکم و مالک موجود ہیں۔ لیکن روز قیامت جبکہ دنیاوی تمام حاکموں اور بادشاہوں کی لباط لپیٹ دی جائے گی، تب یہ حقیقت ہر زمانے سے زیادہ واضح ہو گی کہ حاکم و مالک صرف اور صرف اللہ ہی ہے۔

بالفاظِ دیگر حاکمیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی حاکمیت جو خالق کو مخلوق پر حاصل ہے۔ دوسری اعتباری اور قرار دی گئی حاکمیت جو لوگوں کے درمیان ایک نظام قائم رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ دنیا میں یہ دونوں قسم کی حاکمیتیں موجود ہیں مگر آخرت میں اعتباری اور قرار دی گئی حکومتیں سب کی سب ختم کر دی جائیں گی۔ اور صرف خلاق عالم کی حاکمیت باقی رہ جائے گی بہر حال حقیقی مالک وہی ہے، چنانچہ حقیقی حاکم و فرمانروا بھی وہی ہوگا، لہٰذا وہ کافر و مومن تمام انسانوں کا فیصلہ کرے گا اس کا نتیجہ وہی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اس کے بعد کیا گیا ہے، یعنی: جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے۔ بہشت میں طرح طرح کی نعمتوں والے باغوں میں رہیں گے۔ ایسے باغات جہاں ہر وہ نعمت اور ہر خیر و برکت موجود ہوگی۔ جس کا وہ تصور کریں گے (فالذین اٰمنوا وعملوا الصالحات فی جنّٰت نعیم) البتہ جو منکر تھے اور جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا وہ ذلت آمیز عذاب میں مبتلا رہیں گے (والذین کفروا وکذبوا باٰیاتنا فاولٰئک لھم عذاب مھین)[1] واقعی کیا منہ بولتی اور زندہ تصویر پیش کی گئی ہے یہ عذاب ان لوگوں کو رسوا اور پست کرے گا جو مغرور اور متکبر تھے۔ جو اپنے آپ کو باقی مخلوق خدا سے برتر سمجھتے تھے۔ خود کو بڑے اور دوسروں کو پست اور چھوٹا سمجھتے تھے۔

---

[1] المیزان، ج ۱۴ ص ۴۳۳۔

قرآن مجید کی مختلف آیات میں عذاب کی مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں" الیم" "عظیم" اور "مھین" ان میں سے ہر قسم، گناہ کی اس قسم کے ساتھ مطابقت و مناسبت رکھتی ہے جو مغرور اور متکبر لوگ کرتے رہے ہوں گے۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ مومنین اور کفار دونوں کے ساتھ دو دو چیزوں کی نسبت دی گئی ہے۔ مومنین کے لیے، ایمان، اور عمل صالح، اور کفار کے لیے، کفر اور تکذیب، در اصل یہ ہر گروہ کی اندرونی اعتقاد اور ظاہری آثار کی عکاسی ہے۔ کیونکہ انسان کے اعمال و کردار کا سرچشمہ اس کے نظریات ہیں۔

گذشتہ چند آیتوں میں اللہ اور اس کے دین کے لیے اپنے گھر بار چھوڑنے والے مہاجرین کا ذکر تھا۔ زیر بحث آیت میں ان کو ایک ممتاز طبقے کے طور پر پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اور اس کے بعد جام شہادت نوش کیا یا ویسے ہی چل بسے۔ اللہ ان کو عمدہ روزی اور مخصوص نعمتوں سے نوازے گا۔ کیونکہ وہ بہترین روزی دینے والا ہے (والذین ھاجروا فی سبیل اللہ ثم قتلوا او ماتوا لیرزقنھم اللہ رزقا حسنا وان اللہ لھو خیر الرازقین)۔

بعض مفسرین نے "رزق حسن" سے مراد وہ نعمتیں لی ہیں، جن پر اگر انسان کی نظر پڑے تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے اور اس میں ایسا کھو جاتا ہے کہ کسی دوسری چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا اور ایسی روزی صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔

بعض علماء نے اس آیت کی شان نزول یہ بیان کی ہے۔

> جب مسلمانوں نے مدینے کی طرف ہجرت کی، وہاں کچھ مسلمان تو طبعی موت سے دنیا سے اٹھ گئے اور بعض نے جام شہادت نوش کیا۔ اس موقع پر مسلمانوں کا ایک گروپ یہ تاثر دینے لگا کہ تمام درجات اور فضیلتیں صرف ان ہی سے مخصوص ہیں جو شہید ہوئے ہیں اور ویسے فوت ہونے والوں کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور دونوں کو نعمتوں کا مستحق بتایا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ اصل اہمیت راہ خدا میں جان دینا ہے۔ چاہے میدان کارزار میں جام شہادت نوش کرتے ہوئے دے یا اطاعت خدا میں فوت ہو جائے۔ اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے مرنے والا بھی شہداء کے ثواب کا حامل ہوتا ہے۔

ان المقتول فی سبیل اللہ والمیت فی سبیل اللہ شھید۔[1]

آخری آیت میں عمدہ روزی کا ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے : اللہ انھیں ایسے مقام پر لے جائے گا۔ کہ وہ خوش ہو جائیں گے۔ (لیدخلنھم مدخلا یرضونہ)۔

یعنی اگر اس دنیا میں وہ اپنے گھر بار سے بڑی پریشانی اور دکھ کے عالم میں نکلنے پر مجبور کر دیئے گئے، تو اللہ ان کو دوسرے جہان میں ایسی رہائش گاہ اور مسکن دے گا۔ جو ہر لحاظ سے ان کے لیے لذت انگیز اور نشاط د

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۷، صفحہ ۴۴۷۸

انبساط بخش ہوگا۔ اور یوں ان کی جاں نثاری اور قربانی کی تلافی بہ طریقِ احسن کرے گا۔ آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ ان کے اعمال و کردار سے پوری طرح باخبر ہے۔ نیز علیم و بردبار ہے اور سزاو جزا میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔ تاکہ اس امتحان گاہ میں مومنین کی تربیت بھی ہو۔ اور مکمل امتحان بھی۔ (وان اللہ لعلیم حلیم)۔

۶۰۔ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ○

۶۱۔ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ○

۶۲۔ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ○

ترجمہ

۶۰۔ بات یہی ہے اور جو شخص اپنے اوپر کی گئی زیادتی کے برابر سزا دے اور پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ اور اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

۶۱۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں بدلتا ہے۔ اور اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

۶۲۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی برحق ہے اور اس کے علاوہ وہ جسے بھی پکارتے ہیں باطل ہے اور اللہ بلند مقام اور بڑا ہے۔

شان نزول

بعض روایات کے مطابق محرم کا مہینہ ختم ہو رہا تھا اور صرف ایک دو راتیں باقی تھیں کہ مشرکین نے باہم صلاح مشورہ کیا کہ محمد کے اصحاب اور ساتھی اس مہینے میں جنگ نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ اسے حرام سمجھتے ہیں۔ لہٰذا آؤ ان پر حملہ کر کے انھیں ختم کردیں۔ چنانچہ انھوں نے حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے پہلے اپیل کی کہ اس مقدس مہینے میں جنگ نہ کی جائے۔ مگر جب کفار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تو مسلمانوں نے ڈٹ کر دفاع کیا اور اللہ نے ان کو فتح دی۔ اس کے بعد زیر بحث پہلی آیت نازل ہوئی۔ [1]

کامران کون ہے؟

گذشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں اور اللہ کی طرف سے قیامت میں انھیں عظیم جزا کا ذکر تھا۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کہ اللہ کی طرف سے لطف و کرم اور کامیابیاں صرف آخرت کے لیے ہیں۔ زیر بحث پہلی آیت میں اسی دنیا میں اس کی طرف سے انعام اور مسلمانوں کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: یہ بات یہی ہے اور جو شخص اپنے اوپر کی ہوئی زیادتی کے برابر بدلہ لے اور پھر اس پر مزید زیادتی کی جائے تو اللہ اس کی مدد کرے گا (ذٰلک ومن عاقب بمثل ما عوقب بہ ثم بغی علیہ لینصرنہ اللہ)۔ یہ اس حق کی طرف اشارہ ہے کہ ظلم و ستم کے مقابلے میں ہر ایک شخص دفاع کا فطری حق رکھتا ہے اور ہر شخص اقدام کا مجاز ہے۔ مگر "مثل" کی قید سے یہ تاکید کر دی گئی ہے کہ "حد" سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔ "ثم بغی علیہ" اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا دفاع کرتے ہوئے دشمنوں کے نرغے میں آجائے تو اس کی مدد خود اللہ کرے گا۔ یعنی یہ واضح کیا جارہا ہے کہ جو شخص سرے سے ظلم کے مقابلے میں خاموش بیٹھا رہے، تختۂ مشق ظلم بنا رہے۔ اپنے دفاع کے لیے کوئی موثر اقدام نہ اٹھائے تو ہرگز اللہ کی مدد کا مستحق قرار نہیں پائے گا۔ چنانچہ اللہ نے اپنی مدد کا وعدہ صرف ان لوگوں سے مخصوص کر رکھا ہے جو اپنی تمام توانائیوں کو ظالموں اور جابروں کے مقابلے میں بروئے کار لائیں اور اپنا بھرپور دفاع کریں۔ لیکن پھر بھی ظلم سے نجات حاصل نہ کر سکیں۔ نیز چونکہ ضروری ہے کہ قصاص، سزا اور عفو و درگزر ساتھ ساتھ ہوں تاکہ اپنے جرم پر نادم ہونے والے اور سر تسلیم خم کر لینے والے سائے تلے پرسکون بیٹھ سکیں۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ بہت معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے (ان اللہ لعفو غفور)۔

یہ آیت قصاص کی دوسری آیتوں کے مشابہ ہے جو ایک طرف مقتول کے وارث کو بدلہ لینے کی اجازت دیتی ہے۔ تو دوسری طرف معاف کر دینے کو بہتر شمار کرتی ہے (البتہ انہیں جو معافی کے لائق ہوں)

---

[1] مجمع البیان، اور در منثور زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

چونکہ نصرت و مدد کا وعدہ صرف اس صورت میں موثر اور حوصلہ افزا ہوگا جب مدد کرنے والا کوئی قادر و توانا ہو چنانچہ بعد والی آیت میں وسیع عالم ہستی میں پروردگار عالم کی طاقت و اقتدار کا ایک رُخ پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: یہ اس لیے ہے کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں بدلتا ہے دہمیشہ ان میں کمی بیشی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح لاکھوں سالوں سے یہ باقاعدہ نظام چل رہا ہے) (ذٰلک بان اللہ یولج الیل فی النھار ویولج النھار فی الیل)۔

"یولج" اور "ایلاج" "ولوج" کے مادہ سے ہے۔ جو "دخول" کے معنی میں ہے۔ یہ اس حیثیت کی تعبیر ہے کہ سال کے مختلف حصّوں میں رات دن میں تدریجی کمی بیشی کا نظام با قاعدہ تغیر و تبدل کے ساتھ قائم رہتا ہے اور ایک میں کمی اور دوسرے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے طلوع و غروب آفتاب کی طرف اشارہ ہو۔ زمین کی مدوّر شکل اور ہوا کے غلاف کی وجہ سے کبھی طلوع و غروب کی اچانک یا فوری تبدیلی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ہوا کے غلاف کے اوپر کے حصّے پر سورج کی پہلی شعائیں پڑنے سے طلوعِ فجر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ پھر تدریجاً نیچے کے حصّے روشن ہوتے ہیں اور زمین کی سطح منور ہوتی ہے۔ گویا تدریجاً دن رات میں داخل ہوتا ہے اور افواجِ نور تاریکی کے لشکر پر غالب آجاتی ہیں۔ اس کے برعکس غروب آفتاب کے موقع پر سورج کی شعائیں پہلے سطح زمین سے اوپر فضا میں اٹھتی ہیں جس سے معمولی سی تاریکی ہوجاتی ہے اور تدریجاً ہوا کے غلاف کے اوپر کی سطح تک چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ سورج کی آخری کرنیں ہوا کے غلاف کے آخری کناروں سے بھی ہٹ جاتی ہیں اور یوں اندھیرا ہر جگہ کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو طلوع و غروب اچانک اور فوری تبدیلی سے رونما ہوتے رات دن میں اور دن رات میں اچانک بدل جاتا اور جسمانی اور روحانی لحاظ سے انسان کے لیے نقصان دہ ہوتا۔ اجتماعی طور پر بھی یہ ناگہانی تبدیلی کئی مشکلات کا سبب بنتی۔ بہر حال اگر یہ کہا جائے کہ زیر بحث آیت مذکورہ بالا دونوں امور کی طرف اشارہ کرتی ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے (وان اللہ سمیع بصیر)۔

مومنین کی امداد کے تقاضے سنتا ہے۔ ان کی کیفیت اور کارکردگی سے باخبر ہے اور ضرورت پڑنے پر اس کا فضل و کرم ان کے شامل حال ہوجاتا ہے۔ اسی طرح وہ دشمن کی کارستانیوں اور ناپاک عزائم سے بھی مطلع ہے۔ زیر بحث آخری آیت دراصل پہلی آیت کے دعوے کی دلیل ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ حق ہے اور اس کو چھوڑ کر وہ جسے بھی پکارتے ہیں باطل ہے اور اللہ بلند مقام اور بڑا ہے (ذٰلک بان اللہ ھو الحق وان ما یدعون من دونہ ھو الباطل وان اللہ ھو العلی الکبیر)۔ اگر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ حق کی افواج کامران ہوتی ہیں۔ باطل قوتیں پیچھے ہٹتی ہیں اور منہ کی کھاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم کفار کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ مومنین کی مدد کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار باطل ہیں اور مومنین برحق۔ وہ نظامِ عالم ہستی کے برخلاف ہیں۔ چنانچہ ان کا انجام فنا اور بربادی ہے اور مومنین کائنات کے قوانین سے ہم آہنگ ہیں۔ اصول یہ ہے کہ اللہ سبحانہ' حق ہے اور اس کا غیر باطل چنانچہ وہ تمام لوگ، بلکہ ہر وہ موجود جو اللہ سے مربوط ہوگا۔ وہ برحق ہے۔ اسی طرح جو اس سے منقطع ہیں وہ اپنے درجۂ انقطاع کی نسبت

سے درجہ باطل پر ہیں۔ [1]

"علی" "علو" کے مادہ سے بلندی اور رفعت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز اس ذات کو "علی" کہتے ہیں جو صاحب قدرت و سلوت ہو اور اس کے ارادے کے سامنے کھڑا ہونے کی کسی میں ہمت نہ ہو۔

"کبیر" بھی پروردگار عالم کی عظمت علم و قدرت کی طرف اشارہ ہے۔ ان صفات کا حامل مالک، اپنے بندوں کی مدد پر پوری طرح قادر ہے اور دشمنوں کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے بندوں کو اس کے وعدے پر مطمئن رہنا چاہیئے۔

---

[1] تفسیر "المیزان" میں ہے کہ حق کا اطلاق اللہ پر اور باطل اس کے غیر پر یا اس وجہ سے ہے کہ وہ "حق" جو کسی طرح سے بھی باطل کے ساتھ مخلوط نہیں اللہ ہی ہے یا اس وجہ سے ہے کہ وہ "حق" جو اپنی ذات میں "قائم" اور خود مختار ہے، وہ اللہ ہی ہے اور دوسرے اس کے ساتھ رابطے کی وجہ سے برحق کہلاتے ہیں۔

۶۳۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ۚ

۶۴۔ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۠

۶۵۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَیُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۚ

۶۶۔ وَهُوَ الَّذِیْۤ اَحْیَاكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۚ

ترجمہ

۶۳۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے بارش برسائی اور زمین (اس کی وجہ سے) سرسبز و شاداب ہوگئی اور اللہ لطیف و خبیر ہے۔

۶۴۔ آسمانوں اور زمین کا سب کچھ اسی کا ہے اور اللہ بے نیاز ہے۔ اور ہر ستائش کے لائق ہے۔

۶۵۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ زمین میں جو کچھ ہے۔ اللہ نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور اسی کے حکم سے سمندروں میں کشتیاں اور بحری جہاز چلتے ہیں۔ وہ آسمان (اجرام فلکی اور آسمانی پتھروں) کو روکے ہوئے ہے تاکہ اس کی اجازت کے بغیر زمین پر نہ گر پڑے اور اللہ بندوں پر بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

۶۶۔ وہ وہی ہے، جس نے تمہیں زندگی دی پھر موت دے گا۔ پھر زندہ کرے گا۔ مگر یہ انسان کفرانِ نعمت کرنے والا اور ناشکرا ہے۔

تفسیر

کائنات میں اللہ کی نشانیاں

گذشتہ آیتوں میں اللہ کی لامتناہی طاقت اور اس کی حقانیت مطلقہ کا ذکر تھا۔ زیر بحث آیتوں میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس کی طاقت اور اختیار کی مختلف علامتوں کا ذکر کیا جارہا ہے، ارشاد ہوتا ہے، کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا۔ اور اس سے خشک اور مردہ زمین کو سرسبز و شاداب کیا۔ (الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء فتصبح الارض مخضرۃ) یعنی وہ زمین جس سے زندگی کے آثار معدوم ہو گئے تھے، چٹیل سیاہ، اور کریہہ المنظر ہو گئی تھی۔ وہ بارش کے حیات بخش قطروں سے زرخیز ہو گئی۔ اس میں زندگی عود کر آئی اور لہلہانے لگی۔ بے شک اتنی آسانی سے زندگی کو وجود میں لانے والا اللہ لطیف و خبیر ہے۔ (ان اللہ لطیف خبیر)۔

"لطیف" "لطف" کے مادہ سے نہایت عمدہ اور باریک کام کو کہتے ہیں۔ اللہ کی خاص رحمتوں کو بھی "لطف" اس کی عمدگی اور باریکی کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

"خبیر" اسے کہتے ہیں جو گہرے اور باریک مسائل سے آگاہ ہو۔

اللہ کا "لطیف" ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ منوں مٹی میں دبے ہوئے ننھے ننھے نباتاتی بیجوں کی نشو ونما کرے قانونِ کشش ثقل کے برعکس ان کو گہری تاریک مٹی سے نہایت باریک بینی اور لطف سے اوپر مٹی کی سطح کی طرف بھیجے۔ اور سورج کی گرم اور روشن شعاعوں، ہوا کے جھونکوں کے سامنے پھیلائے اور یوں آخر کار ایک بار آور سرسبز پودے، یا تنومند درخت بنا دیے۔

اگر اللہ بارش نہ برساتا اور بیج کے ارد گرد کی مٹی نرم اور ملائم نہ ہو جاتی تو وہ ہرگز نشو ونما نہ پاتا، مگر اس نے بارش کے ذریعے سخت زمین کو نرم و لطیف بنایا تاکہ کمزور اور نازک بیج کی پرورش کی تمام ضروریات مہیا ہو سکیں اور وہ مٹی کی تہوں میں بیج کی ضروریات سے لے کر شگوفے کی صورت میں زمین سے نکلنے تک ہر مرحلے سے مکمل باخبر ہے۔ اللہ کے "لطیف" ہونے کا یہ تقاضا ہے کہ بارش برسائے۔ مگر "خبیر" ہونے کا تقاضا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق ایسا کرے۔ یعنی اگر بارش زیادہ برسے تو سیلاب کا عذاب بن جائے اور اگر کم برسے تو خشک سالی کا وبال۔ یہی اس کے لطیف و خبیر ہونے کا مفہوم ہے۔ سورہ مومنون کی آیت ۱۸ میں ہے۔

"وانزلنا من السماء ماء بقدر فاسکناه فی الارض"۔

ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے مطابق پانی نازل کیا پھر اسے (حسب مصلحت) زمین میں ٹھہرائے رکھا۔

اسی کا بھی یہی مفہوم ہے۔[1]

اپنی بے پایاں طاقت اور اختیار کی دوسری علامت بیان کرتے ہوئے اللہ ارشاد فرماتا ہے:

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اسی کا تو ہے (لہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض) سب کا خالق و مالک وہی ہے۔ اسی وجہ سے سب پر مکمل اختیار رکھتا ہے۔ اس کائنات میں وہی اکیلا، بے نیاز و تونگر ہے۔ اور ہر طرح کی تعریف و ستائش کا مستحق بھی ٹھہرتا ہے۔ (وان اللّٰہ لھو الغنی الحمید)۔

"غنی" اور "حمید" کی دو صفات بہت مربوط طریقے سے استعمال کی گئی ہیں۔ کیونکہ۔

(ا) بہت سے لوگ متمول اور مالدار ہیں، مگر کنجوس، استحصالی ذہن کے مالک، دولت کو اپنے تک محدود رکھنے والے اور متکبر اور اپنی عیش و عشرت میں مست ہیں۔ چنانچہ کسی کا غنی ہونا گویا مذکورہ بالا اوصاف سے متصف ہونا بھی ہے مگر اللہ غنی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے بندوں کے لیے صاحب لطف و عنایت، فیاض، فیض رساں اور سخی و جواد بھی ہے، جو اسے حمد و ستائش کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

(ب) امیر لوگوں کی دولت و ثروت ظاہری ہے۔ اگر وہ ساتھ ساتھ سخی بھی ہوں تو بھی وہ اپنا مال و دولت تو کسی کو نہیں دیتے

---

[1] اسی تفسیر کی جلد نمبر ۳ میں سورۂ انعام آیت نمبر ۱۰۳ کی تفسیر کے ذیل میں اللہ کے "لطیف" ہونے کے بارے میں بڑی قابل توجہ بحث کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کیونکہ یہ درحقیقت تمام ثروت اور مال اللہ کا دیا ہوا ہے اور چونکہ اصلی اور ذاتی طور پر صاحب ثروت و دولت صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔ لہٰذا حمد و ثنا کا مستحق بھی دراصل وہی ہے۔

(ج) امیر اور دولت مند لوگ اگر کوئی کام کرتے ہیں تو اس کی منفعت عام طور پر انہی کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ صرف اللہ ہی ہے کہ جو بے حساب دیتا ہے اور کسی قسم کا نفع خود اسے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا جود و سخا اس کے بندوں کے لیے ہے۔
اسی سبب سے وہی سب سے زیادہ تعریف اور حمد و ثنا کے لائق ہے۔

اس کے بعد اپنی لامتناہی طاقت سے کائنات کو انسان کے لیے مسخر کرنے کے بارے میں ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا اللہ نے زمین کی ہر ایک چیز تمہارے زیر تسلط قرار دی ہے اور تمام قدرتی وسائل طرح طرح کی نعمتیں اور چیزیں، سب کی سب تمہارے اختیار میں دے دی گئی ہیں۔ تاکہ جس طرح چاہو ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ (الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض)۔ اس طرح اللہ کے حکم سے سمندروں میں چلنے والے اور پانی کا سینہ چیر کر سوئے منزل بڑھنے والے جہاز بھی زیر تسلط قرار دیئے گئے ہیں۔ (والفلک التی تجری فی البحر بامرہ)
علاوہ ازیں "اللہ آسمان کو اس کی جگہ پر روکے ہوئے ہے اور اس کی بلا اجازت زمین پر نہیں گر سکتا۔"
(ویمسک السماء ان تقع علی الارض الا باذنہ) ایک طرف قوت دافعہ و جاذبہ مدار کے باقاعدہ متوازن نظام کے تحت CENTRIPETAL اور CENTRIFUGAL FORCES اجرام فلکی کو اپنے اپنے مدار پر رہنے اور ایک دوسرے سے نہ ٹکرانے کا پابند کر رکھا ہے۔ دوسری طرف زمین کے گرد ہوا کا اس طرح غلاف لپیٹ رکھا ہے تاکہ فضا میں منتشر پتھر زمین سے ٹکرا نہ سکیں اور اہل زمین کے لیے تکلیف اور پریشانی کا سبب نہ بنیں۔

بے شک اپنے بندوں پر یہ اس کی رحمت، لطف اور کرم ہے کہ یوں زمین کو ہر قسم کے خطرات سے خالی امن کا گہوارہ بنا دیا تاکہ وہ انسان کے لیے پرسکون اور آسائشوں کا مرکز بنی رہے۔ نہ پتھر اس سے ٹکرائیں اور نہ کوئی آسمانی کرہ۔ چنانچہ آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ بے شک اللہ بندوں پر بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ (ان اللہ بالناس لرؤف رحیم)۔

زیر بحث آخری آیت میں اللہ کے بے پایاں اختیار کے حوالے سے زمین پر اہم ترین مسئلے یعنی "موت و حیات" کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وہ وہی ہے، جس نے تمہیں زندگی دی (تم بے جان مٹی تھے، تم میں حیات کی روح پھونکی) (وھو الذی احیاکم)۔ پھر زمانہ حیات کے بعد تمہیں موت دیتا ہے۔ (اور جس مٹی سے تم اٹھے تھے واپس اسی میں چلے جاؤ گے)، (ثم یمیتکم) پھر روز قیامت ایک نئی زندگی ملے گی (مردہ مٹی سے نکلو گے اور حساب اور جزا و سزا کے لیے آؤ گے) (ثم یحییکم) زمین و آسمان میں اللہ نے یہ تمام نعمتیں انسان کے لیے مخصوص کی ہیں، لیکن اس کے باوجود انسان بہت ناشکرا ہے۔ واضح اور کھلی نشانیاں کے باوجود اللہ کے وجود کا انکاری ہے۔ (ان الانسان لکفور)۔

چند اہم نکات

۱۔ پروردگار عالم کی خاص صفات

مندرجہ بالا آیتوں اور اس سے پہلے کی دو آیتوں میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ اللہ کی چودہ مختلف صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر آیت کے آخر میں دو صفات کا ذکر ہے۔

(i) علیم و حلیم (ii) عفو و غفور (iii) سمیع و بصیر (iv) علی و کبیر
(v) لطیف و خبیر (vi) غنی و حمید (vii) رؤف و رحیم

ان میں ایک صفت دوسری کی تکمیل کرتی ہے۔ عفو، غفران کے ساتھ، سمیع بصیر ہونے کے ساتھ رفعت و بلندی بڑائی کے ساتھ، لطیف ہونا مکمل اطلاع اور آگاہی کے ساتھ ساتھ بے نیازی قابل ستائش ہونے کے ساتھ اور رؤف ہونا رحیم ہونے کے ساتھ۔ یہ سب صفات ایک دوسری سے ہم آہنگ اور مربوط ہیں۔ علاوہ ازیں ہر صفت اسی مفہوم سے متعلق ہے، جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں۔ لہٰذا اعادہ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

۲۔ ان آیتوں کا ایک استدلالی پہلو

جس طرح مندرجہ بالا آیتیں اللہ کی قدرت کی نشان دہی کرتی ہیں، اور اپنے باایمان بندوں کے لیے اللہ کی مدد پر دلالت کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ کی ذاتِ اقدس کی حقانیت پر بھی دال ہیں۔ نیز توحید، معاد اور قیامت کا بھی ثبوت ہیں۔ بارش کے اثر سے مردہ زمینوں کا سرسبز و شاداب ہو جانا، اسی طرح انسان کی پہلی حیات و موت کا تذکرہ اس کی قدرت کا بین ثبوت ہے کہ وہ انسان کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے، قرآن مجید کی اور بہت سی آیتیں انہی امور کے ذریعے مسئلہ معاد و قیامت پر استدلال کرتی ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بیان ہو جائے کہ "ان الانسان لکفور" میں لفظ "کفور" مبالغہ کا صیغہ ہے اور انسان کی بڑھتی ہوئی ہٹ دھرمی اور کفر و ضلالت پر دلالت کرتا ہے، یعنی انسان اس قدر ناشکرا اور کفرانِ نعمت کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان تمام آیات عظمت کا مشاہدہ کرنے کے باوجود راہِ انکار اختیار کرتا ہے۔ یا یہ اس قسم کے افراد کے ناشکرے ہونے کی طرف اشارہ ہے، جو سرتاپا اس کی نعمتوں سے سرشار ہونے کے باوجود نہ اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ اس کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ کائنات کا انسان کیلئے مسخر ہونا

ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ کائنات کے انسان کے لیے مسخر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات انسان کی خدمت گزار ہے۔ اور اس کے مفاد کے لیے ہے (سورۂ نحل کی آیت نمبر ۲ تا نمبر ۱۲ کی تفسیر کے ذیل میں اسی تفسیر کی جلد نمبر ۶ اور جلد نمبر ۵ میں سورۂ رعد آیت نمبر ۲ کی تفسیر کے ذیل میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے)۔

دُنیا کی بے شمار نشانیوں اور نعمتوں میں سے سمندر میں چلنے والے جہاز کا خاص طور سے اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ ماضی

میں اور موجودہ زمانے میں انسانوں کے روابط اور میل جول اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حمل کا بہترین ذریعہ یہی بحری جہاز اور کشتیاں ہیں۔ ان کے علاوہ حمل و نقل کا کوئی اور ذریعہ زیادہ رواج نہیں پا سکا۔ یہ بات یقینی ہے کہ اگر ایک دن سمندر میں چلنے والے تمام کے تمام جہاز روک دیئے جائیں تو انسانی زندگی معطل ہو کر رہ جائے۔ کیونکہ انسانی ضرورت کی تمام اجناس کی نقل و حرکت بری راستے سے نہیں ہو سکتی اور نہ ہی بری راستے اتنے مفید سمجھے جاتے ہیں۔ خصوصاً آج ہمارے دور میں جبکہ صنعت و حرفت کی شہ رگ تیل ہے۔ اور تیل کی نقل و حرکت کے لیے اہم ترین ذریعہ یہی بحری جہاز ہیں۔ اس طرح بحری جہازوں کی اہمیت کتنے گنا بڑھ جاتی ہے۔ جتنا تیل ایک بڑے تیل بردار جہاز کے ذریعے لے جایا سکتا ہے۔ اتنا تیل دس ہزار ٹرک بھی نہیں لے جا سکتے اور پائپ لائنوں کے ذریعے بھی ایک محدود علاقوں میں ہی منتقل کی جا سکتی ہے۔

۶۷۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝

۶۸۔ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

۶۹۔ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

۷۰۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

ترجمہ

۶۷۔ ہر اُمت کے لیے ہم نے ایک عبادت مقرر کی ہے تاکہ وہ (اللہ کے حضور) عبادت کریں۔ پس انھیں تیرے ساتھ اس سلسلے میں ہرگز جھگڑنا نہیں چاہیئے۔ تو اپنے پالنے کی طرف دعوت دے۔ کیونکہ تو یقیناً ہدایتِ مستقیم پر ہے (سیدھا اور صحیح راستہ یہی ہے، جس پر تو گامزن ہے)

۶۸۔ پھر بھی وہ تیرے ساتھ جھگڑنے لگیں، تو کہہ دے کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

۶۹۔ روزِ قیامت اللہ تمہارے اختلافات کا فیصلہ کر دے گا۔

۷۰۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ زمین و آسمان کا سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔ یہ سب کچھ (اللہ کے لا متناہی علم کی کتاب میں لکھا ہوا ہے اور خدا کے لیے یہ آسان سی بات ہے

تفسیر

ہر اُمت کے لیے ایک عبادت مقرر ہے

ہماری گذشتہ بحثیں مشرکین کے بارے میں تھیں۔ مشرکین مکہ علی الخصوص اور دوسرے اسلام مخالف عناصر علی العموم پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ جھگڑتے رہتے تھے اور پرانے احکامات کی تنسیخ اور نئی شریعت کے نفاذ کو اسلام کی کمزوری خیال کرتے تھے۔ حالانکہ یہ تبدیلیاں کسی کمزوری کی دلیل نہ تھیں، بلکہ ارتقاء و تکامل ادیان کے پروگرام کا ایک حصّہ تھیں، چنانچہ زیر بحث پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے ا ہم نے ہر ایک اُمت کے لیے ایک عبادت مخصوص کردی ہے۔ تاکہ وہ اسی طرح اپنے رب کی عبادت کرے۔ (لكل امة جعلنا منسكا هم ناسكوه)[1]

"مناسك" "منسك" کی جمع ہے۔ اور جیساکہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ "منسك" کا مطلب "عبادت" ہے۔ ہو سکتا ہے، یہاں پر یہ لفظ، مختلف دینی ضابطوں کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ اس بنا پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ سابقہ امتیں اپنے لیے ایک مخصوص شریعت رکھتی تھیں، جو مخصوص حالات مختلف زمان و مکان اور دیگر جہات کے لحاظ سے ان کے لیے مکمل "ضابطۂ حیات" تھیں۔ مگر ان مخصوص حالات کے بدل جانے کی صورت میں ضروری تھا کہ وہ ضابطہ بھی بدلا جائے اور نئے احکام اس کی جگہ لے لیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اس وجہ سے ان کو آپ کے خلاف نہیں اُٹھ کھڑا ہونا چاہیئے۔ (فلا ينازعنك في الامر) آپ اپنے پالنے والے کی طرف دعوت دیجیے، کیونکہ سیدھا راستہ یہی ہے، جس پر آپ گامزن ہیں۔

(وادع الى ربك انك لعلى هدى مستقيم) یعنی ان کے بے سروپا اعتراضات اور لغو باتیں آپ کو ذرہ بھر بھی متاثر نہ کر پائیں، کیونکہ آپ تو اللہ کی طرف بلا رہے ہیں اور آپ راہ راست پر ہیں "ھدیٰ"[1]

---

[1] بعض مفسرین کے نزدیک یہ آیت مشرکین کے اس سوال کا جواب ہے کہ تم ذبح کرکے گوشت کھا لیتے ہو۔ جبکہ مردہ کا نہیں کھاتے ہو۔ یعنی اپنے مارے ہوئے کو کھاتے ہو مگر خدا کے مارے ہوئے کو نہیں؟ مگر یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ زیر بحث آیت میں ہر طرح کے مفہوم کی گنجائش ہے نہ کہ صرف مسئلہ ذبح کی۔ مزید برآں، مردہ کا گوشت کھانا کسی شریعت میں بھی جائز نہیں تھا۔ اس کے بارے میں قرآن مجید کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہر ایک اُمت کا ذبح کے بارے میں الگ طریقہ تھا۔

کی صفت "مستقیم" بیان کی گئی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ تاکید و تشدید کا اظہار ہو یا یہ بیان مقصود ہو کہ کسی منزل کی طرف کئی راستے راہنمائی کر سکتے ہیں۔ نزدیک، دور، ٹیڑھا اور سیدھا، لیکن اللہ کی طرف سے جو راستہ مقرر ہوگا وہ نزدیک ترین اور سیدھا ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مخالفت جاری رکھیں اور آپ کی ہدایت سے اثر قبول نہ کریں تو ان سے کہہ دیں کہ اللہ ان کی حرکات سے زیادہ مطلع ہے۔

(وان جادلوک فقل الله اعلم بما تعملون) "اللہ تمہارے اختلاف کا فیصلہ فرمائے گا۔ (فردائے قیامت، جو اللہ کی طرف بازگشت کا دن ہے اور اتحاد و یکانگت کا دن ہے اور تمام اختلافات مٹ جانے کا دن ہے۔ تم سب پر حقائق واضح کردے گا)۔ (الله یحکم بینکم یوم القیامة فیما کنتم فیه تختلفون) [1]

چونکہ قیامت کے دن بندوں کے جملہ اختلافات کو ختم کرنا اور ان کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جو ذات یہ مرحلہ طے کرے وہ لازمی طور پر بے پناہ علم کی حامل ہو۔ لہٰذا ارشاد ہوتا ہے: کیا آپ کو علم نہیں، کہ زمین و آسمان میں ہر چیز سے اللہ واقف ہے" (الم تعلم ان الله یعلم ما فی السماء والارض)۔ بے شک یہ سب علوم و اشیاء ایک کتاب میں موجود ہیں۔ (ان ذالک فی کتاب)

اللہ علیم و حکیم کے لامتناہی علم کی ڈائری اور کتاب عالم ہست و بود اور کائنات اثر و مؤثر کی کتاب ہے جس میں سے کچھ نا پید نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ اس میں تغیر و تبدل اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کے گلے سے نکلی ہوئی کمزور آواز بھی جو ہزاروں سال پہلے اس کائنات میں وجود میں آئی تھی، فنا نہیں ہوگی، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی فضا میں موجود رہے گی۔ یہ بہت جامع اور مفصل کتاب ہے جس میں ہر ایک چیز لکھی ہوئی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ سب کچھ لوح محفوظ یعنی "علم الٰہی کی تحقیق" میں درج ہے اور تمام موجودات اپنی تمام تر تفاصیل کے ساتھ اس کے نزدیک حاضر ہیں اس لیے آیت کے آخری جملے میں ارشاد ہوتا ہے: اللہ کے لیے سب کچھ بہت آسان ہے، کیونکہ تمام موجودات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے سامنے ہیں۔ (ان ذٰلک علی الله یسیر)۔

---

[1] ممکن ہے اس آیت کے مخاطب رسول اسلام اور مخالفین اسلام دونوں ہوں، اس بنا پر (الله یحکم بینکم .....) کا جملہ قول پیغمبر اکرمؐ ہوگا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ آیت کے مخاطب مسلمان اور کفار ہوں، اس صورت میں یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے ایک مستقل بیان ہوگی۔

۷۱۔ وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَا لَيْسَ لَهُم بِهِ عِلْمٌ ۗ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ ۝

۷۲۔ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِ الَّذِينَ كَفَرُوا الْمُنكَرَ ۖ يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ۗ قُلْ أَفَأُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكُمُ ۗ النَّارُ وَعَدَهَا اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝

۷۳۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ۚ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ۝

۷۴۔ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

ترجمہ

۷۱۔ اور اللہ کو چھوڑ کر وہ ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، جن کی عبادت

کے لیے اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی اور نہ ہی ان کو، اپنے خود ساختہ معبودوں کے بارے میں کوئی معلومات ہیں اور گناہگاروں کے لیے کوئی مددگار اور رہبر نہیں۔

۷۲۔ اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو تو کفار کے چہروں پر انکار کے تیور ملاحظہ کرتا ہے (ایسا معلوم ہوتا ہے) کہ وہ جلد ہی ان پر مکوں سے حملہ شروع کر دیں جو ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھتے ہیں۔ ان سے کہہ دے کہ کیا تمھیں اس سے بھی بدتر چیز کی خبر دوں، یعنی بھسم کر دینے والی (جہنم کی) آگ جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ کر رکھا ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

۷۳۔ اے لوگو! ایک مثال غور سے سنو! اللہ کو چھوڑ کر تم جنہیں پکارتے ہو وہ سب مل کر بھی ایک مکھی پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ مکھی اگر کچھ لے لے تو واپس نہیں لے سکتے، طالب و مطلوب (عابد و معبود) دونوں ہی بڑے کمزور ہیں۔

۷۴۔ جس طرح پہچاننے کا حق تھا انہوں نے اللہ کو ہرگز نہیں پہچانا، بیشک اللہ طاقت ور اور ناقابلِ شکست ہے۔

تفسیر

مکھی سے بھی کمزور معبود

گذشتہ آیتوں میں شرک اور توحید سے متعلق گفتگو کے لحاظ سے زیر بحث آیت میں دوبارہ مشرکین اور ان کی غلط کاریوں کا ذکر کیا جارہا ہے۔ چونکہ شرک اور بُت پرستی کے بطلان کا واضح ثبوت یہ ہے کہ عقلی اور نقلی کوئی دلیل اس قبیح عمل کا جواز مہیا نہیں کرتی۔ لہٰذا پہلی آیت میں فرمایا جارہا ہے: اللہ کو چھوڑ کر جن کی وہ پرستش کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی (ویعبدون من دون اللہ مالم ینزل بہ سلطانا)۔

دراصل یہ آیت بُت پرستوں کے اس عقیدے کو باطل کررہی ہے، جس کے تحت وہ کہا کرتے تھے کہ بُت اللہ کی بارگاہ میں ہمارے شفیع ہیں اور ہم اس کی اجازت سے ہی ان کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے وہ ایسوں کی عبادت کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں انہیں کچھ معلومات نہیں ہیں۔ (وما لیس لھم بہ علم)۔ یعنی اپنے اس فعل سے متعلق وہ نہ تنزل من اللہ کوئی دلیل رکھتے ہیں اور نہ ہی فہم عامہ سے کوئی جواز پیش کرسکتے ہیں۔

واضح سی بات ہے کہ جس شخص کے پاس اپنے عقیدے اور اعمال کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہو۔ وہ بڑی حماقت کا مرتکب ہوا ہے۔ اس نے اپنے آپ پر بھی زیادتی کی اور دوسروں پر بھی اور جب وہ گرفتارِ عذاب وعقاب الٰہی ہوگا تو کوئی بھی اس کی حمایت ودفاع کی جرأت نہیں کرسکے گا۔ اس حقیقت کو آیت کا آخری حصہ واضح کررہا ہے:
ستمگروں کا کوئی یار و مددگار نہیں (وما للظالمین من نصیر)۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں "نصیر" کا مطلب دلیل و برہان لیا ہے، کیونکہ دلیل و منطق ہی حقیقی مددگار چیزیں ہیں۔[1]

یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "نصیر" سے مراد رہبر و راہنما ہے اور اب تک کی بحث کا نتیجہ بھی یہی ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ ان باطل عقیدہ رکھنے والوں کے پاس نہ خدا کی طرف سے کوئی دلیل ہے اور نہ ہی عقل و منطق کی برہان کہ جس تک وہ خود پہنچے ہوں اور نہ کوئی ایسا رہبر و رہنما انہیں میسر ہے جو زندگی کے پُرپیچ راستوں میں ان کی راہبری کرسکے وہ بڑے ظالم ہیں کہ حق کے مطیع نہ ہوئے۔ مندرجہ بالا تین مختلف مفاہیم ایک دوسرے سے منافی نہیں ہیں۔ اگرچہ پہلا مفہوم زیادہ واضح دکھائی دیتا ہے۔
اس کے بعد اللہ کے احکامات سننے کے بعد بت پرستوں کے شدید منفی ردعمل، ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی

---

[1] تفسیر المیزان اور کبیر زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"جب ہمارے واضح احکامات (جن کی عقلی و منطقی صحت بڑی واضح ہے) جن سے فائدہ اُٹھانا عقل سلیم رکھنے والے ہر فرد کے لیے آسان ہے، ان کے سامنے بیان کیے جاتے ہیں، تو تُو کفار کے چہروں پر انکار و تنفر کے آثار ملاحظہ کرتا ہے (واذا تتلی علیھم ایاتنا تعرف فی وجوہ الذین کفروا المنکر)[1]

حقیقت یہ ہے کہ جب یہ صاف ستھرے اور منطقی احکامات بیان کیے جاتے ہیں۔ تو انہیں اپنے جاہلانہ اور باطل عقائد متضاد نظر آتے ہیں، چونکہ وہ سچائی اور صداقت کو قبول نہیں کرتے، اس لیے غیر اختیاری طور پر نفرت و ناپسندیدگی کے آثار ان کے چہروں سے عیاں ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک ہی بس نہیں بلکہ، تعصب، ہٹ دھرمی اور ضد کی شدت کی وجہ سے ہو سکتا ہے وہ جلد ہی احکامات کو غور سے سننے والوں سے ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی پر اُتر آئیں (یکادون یسطون بالذین یتلون علیھم ایاتنا)۔

"یسطون" "سطوت" کے مادہ سے ہے اور آستینیں چڑھا کر ہاتھ اُٹھا کر مدِ مقابل پر حملہ آور ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بقول راغب کے جب گھوڑا پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو کر اگلے پاؤں اُٹھاتا ہے، اسے 'سطوت' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مندرجہ بالا مفہوم بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر کسی معاملے میں انسان عقل و منطق سے غور کرے تو اپنے مخالف کی دلیل سے نہ چہرے کے تاثرات میں تغیر و تبدل کی ضرورت ہے اور نہ ہی مکّہ لہرانے کی بلکہ دلیل کا جواب دلیل سے دیا جاتا ہے۔ کفار کا غلط ردِ عمل ہی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ کسی دلیل و منطق کو سننے پر تیار نہیں۔ بلکہ جہالت ہٹ دھرمی اور طاقت و تشدد کے قائل ہیں۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ "یکادون یسطون" فعل مضارع ہے اور کفار کی مذکورہ بالا کیفیت کے استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی اگر وہ مارپیٹ کا موقع پاتے تو ضرور مارتے اور اگر موقع نہ پاتے تو مارپیٹ کے لیے تیار ضرور رہتے۔ ہماری زبان میں وہ اکثر دانت پیستے ہی رہتے ہوں گے کہ وہ مارپیٹ پر قادر نہیں ہیں۔ ایسے احمقوں کے مقابلے میں رسول اکرمؐ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے کہہ دے کہ اس سے بھی بدتر چیز کی تم کو خبر دوں! جہنم کی بھسم کر دینے والی آگ اس سے کہیں تکلیف دہ ہے (قل افانبئکم بشر من ذلکم النار)[2] یعنی اگر اللہ کی واضح اور کھلی ہوئی آیتیں تمھیں بُری معلوم ہوتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ تمھارے منفی اور اٹکل پچو نظریات کے برعکس

---

[1] "منکر" مصدر میمی ہے۔ "انکار اور ناپسندیدہ افعال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ ایک قلبی کیفیت ہے یہاں اس کے آثار مراد ہیں۔ جو چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں۔

[2] اس جملے میں "النار" مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اس کی تقدیر ہے ھی النار (وہ آگ ہے) بعض مفسرین کے خیال میں خود "النار" مبتداء ہے اور جملہ (وعدھا اللہ۔۔۔) اس کی خبر لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ نیز اسی جملے میں "وَعَدَ" کے دو مفعول ہیں۔ پہلا الذین کفروا اور دوسرا ھا کا مقدم ہونا شاید مخصوص ہونے کو واضح کرنے کے لیے ہے۔

ہیں تو کہیں زیادہ بُری چیز کی تم کو خبر دے دوں اور وہ یہ کہ اللہ کی طرف سے تیار کیا ہوا اذیت ناک عذاب اور سزا ہے۔ جو ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کا آخری ٹھکانا ہے۔ "بھسم کر دینے والی وہی آگ، جس کا اللہ نے کفار سے وعدہ کر رکھا ہے" (وعدھا اللہ الذین کفروا)۔ اور یہ آگ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے (وبئس المصیر)

حقیقت یہ ہے کہ ان بدخو اور تند مزاج مخالفین کہ جن کے دلوں میں ہمیشہ تعصب اور ہٹ دھرمی کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں، کا بدلہ جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ ہمیشہ اللہ کی طرف سے دی جانے والی سزا گناہ کے تناسب سے ہوا کرتی ہے۔

اس کے بعد بتوں اور خود ساختہ معبودوں کی کیفیت، کمزوری اور ناتوانی کا دلچسپ اور حسب حال خاکہ بیان کیا گیا ہے اور مشرکین کے نظریات کو بڑے واضح انداز میں باطل ثابت کیا گیا ہے

عوام الناس سے خطاب کیا جا رہا ہے۔ اے لوگو! بیان کی جانے والی ایک مثال توجہ سے سنو۔ (اس پر غور و خوض کرو۔)

(یا ایھا الناس ضرب مثل فاستمعوا لہ) اللہ کو چھوڑ کر جن کو بطور خدا پکارتے ہو وہ تو مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ چاہے وہ سب کے سب مل کر اس کے لیے اجتماعی کوشش کریں۔ (ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابًا ولو اجتمعوا لہ)، تمام بت اور دیگر معبود، سب دانشور صاحبان فکر و نظر اور بنی نوع انسان کے تمام کے تمام صنعت کار اور موجد اگر مل کر بھی کوشش کریں تو ایک مکھی تک پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایسے میں وہ کس بنا پر ان نااہل چیزوں کو اس پروردگار عالم کا ہم پلہ قرار دے سکتے ہیں۔ جو زمین و آسمان پر ہزار ہا ذی رُوح موجودات، دریاؤں، ریگستانوں، جنگلوں، زیر زمین اور زیر آب خزانوں کا بنانے والا اور پیدا کرنے والا ہے وہ اللہ جو زندگی کو مختلف شکلوں اور طرح طرح کی صورتوں میں پیش کرنے والا ہے، جس کی قدرت کاملہ کے حیرت انگیز اور عجیب و غریب مظاہر انسان کو اس کی تحسین و آفرین اور حمد و ستائش کرنے پر بے اختیار مجبور کرتے ہیں۔ یہ کمزور و نااہل معبُود کہاں اور وہ قادر حکیم مطلق کہاں۔

تاکید مزید کے طور پر اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ بناوٹی معبُود مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ خالق و معبُود حقیقی کی پیدا کی ہوئی ایک مکھی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ ایک مکھی ان سے کچھ چھین لے تو یہ واپس تک لینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (وان یسلبھم الذباب شیئًا لا یستنقذوہ منہ)۔

ایسا کمزور اور بے بس موجود جو ایک مکھی کے مقابلے میں شکست کھا جائے، کیا یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ہم اسے اپنی تقدیر کا مالک اور حلّال مشکلات سمجھ سکیں؟ بلاشک و شبہ ایسے معبودان کی عبادت کرنے والے اور خود یہ معبُود دونوں ہی ضعیف و بے بس ہیں۔ (ضعف الطالب والمطلوب)۔

روایات میں ہے کہ بت پرست قریش ان بتوں پر جو انہوں نے خانہ کعبہ کے گرد و نواح میں جمع کر رکھے تھے، شہد مشک عنبر اور زعفران چھڑکتے اور طواف کرتے ہوئے۔

لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک، الا شریک ھو لک تملکہ وما

ملائکہ، کا غلط کرتے ۔ یہ خرافات توحید پرستوں کی لبیک کی واضح تحریف اور ان کے شرک کی واضح دلیل تھی جو ان پست و حقیر چیزوں کو خالق کون و مکان کا شریک سمجھتے تھے، لیکن ان بتوں پر مکھیاں بھنبھناتیں اور شہد و زعفران اور مشک و عنبر اُڑا لے جاتیں اور یہ بُت مکھیوں کو روک نہ سکتے تھے۔ قرآن مجید اس منظر کو بتوں کی بے بسی اور مشرکین کی کمزور منطق کے بیان کے لیے بطور ایک مثال ذکر کرتا ہے۔ گویا کہ چیلنج کر رہا ہے کہ اچھی طرح سوچ سمجھ لو کہ وہ چیزیں جن کو تم اپنے معبود اور مشکل کشا سمجھتے ہو کس طرح ہماری پیدا کردہ ایک مکھی کے سامنے بے بس ہیں اور اس حقیر مخلوق کے مقابلے میں بھی اپنا دفاع نہیں کر رہے۔ یہ کس قدر پست و حقیر معبود ہیں۔ "طالب و مطلوب" سے وہی مراد ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یعنی "طالب" بتوں کو پوجنے والے اور "مطلوب" خود بت، دونوں ہی کمزور و بے بس ہیں۔

بعض مفسرین نے "طالب" سے مکھی مراد لی ہے اور "مطلوب" سے بُت کیونکہ مکھیاں بتوں پر لگی ہوئی خوراک کھانے ان پر بیٹھتی ہیں۔

بعض دیگر مفسرین نے "طالب" سے بت مراد لیے ہیں اور "مطلوب" سے مکھی، کیونکہ بالفرض بُت مکھی جیسی حقیر شے بھی پیدا کرنا چاہیں تو بھی نہ کر سکیں گے، لیکن پہلا مفہوم زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا مثال دینے کے بعد قرآن مجید نتیجۃً یہ کہہ رہا ہے: جس طرح اللہ کو پہچاننے کا حق تھا انہوں نے نہیں پہچانا (ما قدروا اللہ حق قدرہ) اللہ کی معرفت کے بارے میں وہ اس قدر پیچھے ہیں کہ اس باعظمت و جلالت خدا کو اتنا پست کر دیا کہ اتنی بے وقعت چیزوں کو اس کا شریک گردانا۔ اللہ کی اگر تھوڑی سی بھی معرفت رکھتے تو اس بے حیثیت جوڑ پر شرمندہ ہوتے۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ اپنی طاقت و سطوت کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: اور اللہ طاقتور اور صاحب سطوت ہے (ان اللہ لقوی عزیز)۔ اور ہرگز ان جھوٹے اور بے بس خداؤں کی طرح نہیں ہے جو ایک حقیر سا جانور پیدا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے اور نہ مکھی سے مقابلے کی تاب رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے اور اس پورے عالم میں ایک وجود بھی ایسا نہیں جو اس کے سامنے ٹھہر سکے۔

چند اہم نکات

۱۔ بتوں کی ناتوانی کی ایک واضح مثال

اگرچہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیتوں میں "مثال کے بارے میں گفتگو ضرور ہے۔ مگر خود مثال کو بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ قرآن مجید کے دیگر مطالب کا ذکر کیا گیا ہے یا یہاں "مثال" صرف بمعنیٰ ثبوت یا اصل مطلب یا ایک حیرت انگیز چیز کے معنی میں استعمال کی گئی ہے نہ کہ اپنے معمول کے معنیٰ میں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے ان آیتوں میں "مثال" کے تحت جس چیز کو پیش کیا ہے اور جس پر غور و خوض کی عمومی دعوت دی ہے وہ "مکھی" ہی تو ہے، جسے کمزور مخلوق مگر خوراک چھیننے والی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ مثال مشرکین عرب کے مقابلے میں پیش کی گئی ہے۔ مگر آیت مجیدہ کے عمومی خطاب (یا ایھا الناس) کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لکڑی اور پتھروں کے بتوں تک

ہی محدود نہیں بلکہ ان تمام معبودوں کے مقابلے میں ہے۔ جن کی اللہ کے علاوہ کسی طور پر بھی پرستش کی جاتی ہے، نمرود، فرعون، بت جھوٹی شخصیتیں اور طاقتیں وغیرہ سبھی اس میں شامل ہیں۔ یہ سب کے سب اگر اکٹھے ہو جائیں اور اپنے تمام وسائل و ذرائع، علوم اور ٹیکنالوجی بروئے کار لائیں اور نابغۂ روزگار سائنسدانوں کی بھرپور صلاحیتوں سے استفادہ کریں۔ لیکن پھر بھی ایک مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے اور یہاں تک کہ اگر مکھی ان کے دسترخوان سے کھانے کا ایک ذرہ اُٹھا کر لے جائے تو اس سے واپس لینے کی اہلیت نہیں رکھتے

۲- ایک سوال کا جواب

ہو سکتا ہے اس مقام پر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ آج کا انسان اپنے علم اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ایسی ایسی ایجادیں کر چکا ہے جو مکھی کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور اعلیٰ ہیں۔ مثلاً تیز رفتار ذرائع آمد و رفت، خلانوردی کے ذرائع، آواز سے زیادہ تیز رفتار راکٹ اور سیارچے جو پلک جھپکنے میں زمین کے مدار سے نکل جاتے ہیں، اسی طرح کمپیوٹر اور روبوٹ جو ریاضی کے پیچیدہ سوال ایک لحظے میں حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ تو کیا مذکورہ بالا مثال ہمارے اس ترقی یافتہ انسان کے لیے بھی صادق آتی ہے؟

جواباً ہم عرض کریں گے کہ بیشک ان محیر العقول وسائل اور اشیاء کی ایجاد آج کے انسان کی غیر معمولی ترقی کی روشن دلیل ہے مگر یہ سب کچھ ایک زندہ اور باارادہ مخلوق کی خلقت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

اگر ہم فزیالوجی اور بیالوجی کی ان کتب کا بغور مطالعہ کریں، جن میں مکھی جیسے چھوٹے سے کیڑے مکوڑے کی جسمانی ساخت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہے، تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ ایک مکھی کے دماغ کی ساخت اعصاب کا جال اور نظام ہاضمہ آج کے باآسائش ہوائی جہاز کی ساخت سے کہیں پیچیدہ اور اعلیٰ ہے اور کسی لحاظ سے بھی اس سے موازنہ کے لائق نہیں دراصل زندگی، از زندہ موجودات کی حرکات و احساسات اور نشو و نما علی الخصوص ان کی پیدائش ابھی تک بڑے بڑے سائنسدانوں اور دانش وروں کے لیے لاینحل مسائل و معمات کی طرح ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی خلقت کے لیے کن باریکیوں اور تکنیک کی ضرورت ہوگی، کسی کو خبر نہیں ہے۔

علوم طبیعات کے ماہرین کے بقول بعض حشرات کی آنکھیں بہت چھوٹی ہیں۔ جو مزید کئی سو چھوٹی آنکھوں سے مرکب ہیں۔ یعنی وہ ایک آنکھ جس کو بڑی مشکل سے دیکھا جا سکتا ہے اور شاید وہ بھی سوئی کی نوک کے حجم کے برابر ہے۔ کئی سو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرکب کو آنکھ کہتے ہیں۔ بہرحال فرض کریں اگر انسان بے جان مواد سے ایک زندہ چیز بنا لے۔ مگر کس میں یہ صلاحیت ہے کہ کئی سو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو باہم مربوط کر کے اس کے دماغ تک اس طرح لے جائے کہ وہ کچھ شاہدات دماغ کو منتقل کر سکے تو کیا وہ چیز کسی موقع پر اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار کر سکتی ہے؟ اور کیا تمام قابل انسان مل کر بھی مذکورہ بالا حقیر سی مگر پیچیدہ اور پُراسرار شے بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ اگر انسان مذکورہ بالا فرض کو حقیقت بھی کر دکھائے تو کیا اسے "خلقت" کا نام دیا سکتا ہے یا اسے صرف "ASSEMBLING" یعنی پرزوں کو جوڑنے کا نام دیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح صرف پرزوں کو جوڑ کر گاڑی تیار کرنے والے اس کے جوڑنے والے تو کہلا سکتے ہیں مگر موجد نہیں کہلائے جا سکتے۔

۷۵۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝

۷۶۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

۷۷۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

۷۸۔ وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝

ترجمہ

۷۵۔ اللہ فرشتوں میں سے پیغامبر منتخب کرتا ہے اور اسی طرح انسانوں میں

ہے بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

۷۶۔ جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، وہ جانتا ہے اور تمام امور کی بازگشت اللہ کی طرف ہے۔

۷۷۔ اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ بجا لاؤ اور اپنے پالنے والی کی عبادت کرو اور نیک کام کرو تاکہ نجات پا جاؤ۔

۷۸۔ اور راہ خدا میں ایسا جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہارا انتخاب کیا ہے اور دین میں تم پر مشقت طلب بوجھ نہیں ڈالتا۔ یہ وہی تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے، اس نے پہلی کتب اور اس کتاب میں تمہارا نام "مسلمان" رکھا ہے تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔ لہٰذا نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کے ساتھ وابستہ رہو، کیونکہ وہی تمہارا مولا اور سرپرست ہے اور وہ کیسا اچھا مولا اور کتنا عمدہ مددگار ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین کے بقول، ولید بن مغیرہ، جو مشرکین کا دماغ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اور اس جیسے بعض دیگر مشرکین، پیغمبر اسلام کے مبعوث برسالت ہونے کے بعد حیرت سے کہا کرتے تھے۔

"ءانزل علیہ الذکر من بیننا"

"کیا ہم سب کو چھوڑ کر ہم میں سے محمد جیسے یتیم و مفلوک الحال پر وحی نازل ہوئی ہے"

اس تعجب کا جواب بن کر زیر بحث پہلی آیت نازل ہوئی (اور انہیں بتایا گیا کہ انبیاء اور فرشتوں کا رسالت کے لیے انتخاب لیاقت و قابلیت اور معنوی معیار کی بنا پر ہوا کرتا ہے)[1]

---

[1] تفسیر قرطبی، ابوالفتوح رازی، فخرالدین رازی اور روح المعانی زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

تفسیر

پانچ اہم اور تعمیری احکام

گذشتہ آیات توحید، شرک اور مشرکین کے خیالی اور خود ساختہ معبودوں کے بارے میں تھیں اور اس لحاظ سے کہ بعض لوگوں نے فرشتوں اور بعض انبیاء کو بھی معبود بنا لیا تھا۔ زیر بحث پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے آنے والے تمام پیغمبر اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بندے تھے۔ "اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول انتخاب کرتا ہے" (اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلاً ومن الناس)۔

فرشتوں میں سے رسولوں کی مثال جبرائیل امین کی ہے اور انسانوں میں سے تمام رسول اس کی مثال ہیں۔ ملائکہ کے سلسلے میں "من" کا لفظ جیسے "من تبعیضی" کہتے ہیں۔ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ تمام فرشتے انسان کی طرف اس کے رسول بن کر نہیں آئے، بلکہ ان میں سے چند ایک کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے سورۂ فاطر کی پہلی آیت

"جاعل الملائکۃ رسلاً"

"اللہ نے فرشتوں کو رسول بنایا"

اس آیت کی نفی نہیں کرتی، کیونکہ وہاں جنس ملائکہ مراد ہے نہ کہ افراد جنس۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ (ان اللہ سمیع بصیر)۔

یعنی اللہ اپنے رسولوں کی کارکردگی سے بے خبر نہیں بلکہ لمحہ لمحہ سے مطلع ہے وہاں کی بات چیت سنتا اور ان کے افعال و اعمال ملاحظہ کرتا ہے۔ اس کے بعد تبلیغ و ترویج رسالت کے سلسلے میں رسول کی ذمہ داریوں اور اللہ کی طرف سے ان کی نگرانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔: اللہ اُسے بھی جانتا ہے جو اُن کے سامنے ہے اور اُسے بھی جو اُن کے پیچھے ہے (یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم)۔ یعنی اللہ ان کے ماضی اور مستقبل اور ان کے آثار سے پوری طرح آگاہ ہے۔ "اور تمام کاموں کی انتہا اور بازگشت اللہ کی طرف ہے" اور سب اس کے سامنے ہی جواب دہ ہیں۔ (والی اللہ ترجع الامور) تا کہ وہ لوگ اچھی طرح جان لیں کہ فرشتے اور پیغمبر بھی بندے ہیں۔ اللہ کے مطیع، فرمانبردار اور اس کی بارگاہ میں جواب دہ ہیں، ان کے پاس جو کچھ ہے، ان کا اپنا نہیں، بلکہ سب کچھ خدا کا دیا ہوا ہے، اور وہ ہرگز اللہ کے مقابلے میں معبود یا لائق پرستش نہیں ہیں۔ اس بناء پر (یعلم ما بین ایدیھم .....) کا جملہ دراصل انبیاء کی شرعی ذمہ داریوں کے بارے میں بارگاہِ پروردگار میں جوابدہی اور انکے افعال و کردار پر اللہ کی طرف سے کڑی نگرانی کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح سورۂ جن کی آیت نمبر ۲۷ اور ۲۸ میں بھی کہا گیا ہے۔

فلا یظھر علیٰ غیبہ احداً الا من ارتضیٰ من رسول فانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصداً لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربھم واحاط بما لدیھم ۔

اللہ کسی کو اپنے اسرارِ غیب نہیں بتاتا، سوائے چنے ہوئے پیغمبروں کے جن سے وہ راضی ہے اور ان پر ایسے نگران مقرر کرتا ہے جو ان کے آگے پیچھے رہتے ہیں۔ تاکہ پتہ چلے کہ وہ اپنے پروردگار کے احکامات پہنچاتے ہیں یا نہیں اور ان کی ہر ایک شے سے اللہ پوری طرح باخبر ہے۔ [1]

ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہو جائے کہ "ما بین ایدیھم" سے مراد مستقبل اور "ما خلفھم" سے مراد انبیاؑ سے قبل کے واقعات ہیں۔

اس کے بعد سورۂ حج کی آخری دو آیات میں مومنین کے دنیوی و اُخروی، ہمہ جہتی مفاد کے ضامن بنیادی اور مجموعی احکامات بیان کرتے ہوئے اُن سے خطاب کیا جا رہا ہے اور یوں سورہ حج کا "حسنِ اختتام" ہوتا ہے۔ سب سے پہلے چار اہم احکامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اے ایمان والو! رکوع کرو۔ سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور اچھے کام کرو تاکہ کامیاب رہو۔ (یاایھا الذین امنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ربکم وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون)۔

ارکانِ نماز میں سے صرف رکوع و سجود کا ذکر ان کی اشد اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد عمومی طور پر عبودیت کا جو بلا قید حکم ہے۔ اس سے مراد اللہ کی ہر قسم کی عبادت و بندگی ہے۔ "ربکم" کہہ کر اللہ کی عبادت کے لیے اہلیت ثابت کی گئی ہے اور اس کے غیر کی نا اہلیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ عالم کائنات میں صرف وہی اکیلا مالک اور پالنے والا ہے "فعل الخیرات" کا حکم بھی مطلق ہے اور کسی قسم کی قید و شرط کے بغیر ہے چنانچہ اس سے ہر نیک کام مراد ہے۔ اس سلسلے میں ابن عباس کی روایت کہ اس سے مراد صلہ رحمی اور "مکارم الاخلاق" ہے۔ دراصل اس کے وسیع مفہوم کا ایک تعبیری مصداق ہے۔

اس کے بعد لفظ 'جہاد' وسیع معانی میں استعمال کرتے ہوئے پانچواں حکم دیا جاتا ہے۔ "راہِ خدا میں اس قدر جہاد کرو کہ جہاد کا حق ادا ہو جائے (وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ)" اکثر مفسرین نے اس جگہ جہاد سے مسلح جنگ مراد نہیں لیا۔ بلکہ جیسا کہ اس لفظ کے لغوی معنیٰ ہیں۔ راہ خدا میں مجموعی جدوجہد، کوشش اور نیک کام نیز سرکش اور احکامِ الٰہی کی باغی ہوا و ہوس کو قابو میں رکھنا، یعنی جہادِ اکبر اور ظالم و جابر دشمن کا میدان کارزار میں مقابلہ کرنا یعنی 'جہادِ اصغر' مراد لیا ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان میں زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں جناب علامہ طباطبائیؒ "لیعلم ما بین ایدیھم ..." کو مسئلہ عصمت اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہماری نظر میں یہ بعید ہے۔

"مجمع البیان" میں مرحوم جناب طبرسی بہت سے مفسرین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ " حق جہاد" سے مراد خلوص نیت اور اعمال کو صرف اور صرف اللہ کے لیے انجام دینا ہے۔

بیشک "حق جہادہ" بھی عمومی اور وسیع معنے رکھتا ہے، جس میں مقدار، تعداد، کیفیت، حیثیت اور زمان و مکان سب شامل ہیں، مگر چونکہ اخلاص کی منزل جہاد بالنفس کے سلسلے میں مشکل ترین مراحل میں سے ہے، للذا اس کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ انسان کے دل اور اعمال میں شیطانی خیالات و افکار کا عمل دخل بہت لطیف اور خفیہ انداز سے ہوتا ہے اور اللہ کے خاص بندوں کے سوا اس سے شاید ہی کوئی بچ نکلتا ہے۔

دراصل قرآن مجید نے ان پانچ احکامات کے ذیل میں آسان ترین مرحلے سے شروع کرکے مشکل ترین اور اعلیٰ ترین منزل تک راہنمائی کی ہے۔ سب سے پہلے رکوع کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اس سے برتر فعل سجدے کی بات ہے۔ پھر مجموعی عبادت اور آخر میں تمام اچھے اور نیک اعمال و کردار کا ذکر ہے، جس میں عبادات و غیر عبادات سب شامل ہیں۔ اس کے بعد انفرادی، اجتماعی، ظاہری باطنی، قولی اور فعلی جدوجہد، کوشش، تگ و دو اور اخلاق و خلوص نیت کی بات کی گئی ہے۔

یہ ایک جامع آئین ہے کہ جس کے نتیجے میں سو فی صد کامیابی و کامرانی ہے۔ ممکن ہے، اس مقام پر یہ خیال پیدا ہو کہ کمزور بندوں کو کس طرح ان بھاری اور سنگین ذمہ داریوں اور احکامات کا حامل قرار دیا گیا ہے، جبکہ ان میں سے ہر ایک ذمہ داری دوسری سے زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ اس کے بعد میں آنے والے جملوں میں مختلف پیرائے میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ بالا ذمہ داریاں بارگاہِ احدیت میں مومنین کے مقام و منزلت اور عظمت و شخصیت کی علامت ہیں اور اللہ کی طرف سے مومن پر خاص لطف و کرم کا مظہر ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے۔ "اس نے تمھارا انتخاب کر لیا ہے (ھو اجتباکم)" یعنی اگر تم اللہ کے منتخب کیے ہوئے نہ ہوتے تو یہ سنگین ذمہ داریاں تمھارے کندھوں پر نہ ڈالی جاتیں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے، اس نے ان کڑی ذمہ داریوں کی انجام دہی کو تمھارے لیے باعث زحمت و مشقت قرار نہیں دیا۔ (وما جعل علیکم فی الدین من حرج) یعنی اگر عقل سلیم سے سوچو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ذمہ داریاں کڑی اور سخت نہیں ہیں۔ بلکہ تمھاری فطرت سے ہم آہنگ اور تمھارے مزاج اور طبیعت سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اصولی طور پر چونکہ تمھارے ارتقاء و تکامل کا ذریعہ ہیں۔ ان میں سے ہر ذمہ داری ایک واضح فلسفہ اور کثیر منفعت کی حامل ہے اور یہ منفعت تمھارے لیے ہی ہے۔ اس بنا پر ان کی انجام دہی تمھارے لیے قطعاً شاق اور تلخ نہیں ہے، بلکہ نہایت شیریں اور خوشگوار ہے۔ تیسری بات یہ بیان کی جا رہی ہے کہ یہ پروگرام تمھارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔

(ملۃ ابیکم ابراھیم) حضرت ابراہیم کو "باپ" کہنے کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔

(i) عرب اور اس وقت کے مسلمان زیادہ تر حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں سے تھے۔

(ii) اس وقت کے تمام لوگ حضرت ابراہیم کو اپنا بزرگ اور روحانی باپ سمجھتے تھے۔ اس طرح تقریباً سبھی ان کا احترام کرتے تھے۔ اگرچہ ان کا صاف ستھرا مقدس دین طرح طرح کی خرافات سے آلودہ کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد اسی سلسلہ میں ایک اور ارشاد ہوتا ہے، سابقہ کتب آسمانی اور اس وقت کی آسمانی کتاب (قرآن حکیم)

میں اس نے تمھارا نام "مسلمان" رکھا ہے (ھو سماکم المسلمین من قبل و فی ھذا) اور مسلمان وہ ہے جو تمام احکامات خداوندِ قدوس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو اپنے لیے ایک بڑا اعزاز تصور کرے۔

"ھو سماکم ...." میں ضمیر "ھو" کے مرجع پر شدید اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کے خیال میں "ھو" کا مرجع "اللہ" ہے۔ یعنی خود اللہ نے سابقہ کتب اور قرآن مجید میں مسلمانوں کو اس قابلِ فخر نام سے موسوم کیا۔ بعض دوسرے مفسرین کے خیال میں "ھو" کا مرجع حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ کیونکہ سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۲۸ میں مذکور ہے کہ تعمیر خانہ کعبہ کے اختتام پر حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ اقدس الٰہی میں چند دعائیں کی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ دعا تھی۔

" ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا اُمۃ مسلمۃ لک"

بارِالٰہا! ہم دونوں (مجھے اور میرے بیٹے) کو اپنا مطیع رکھ اور ہماری نسل سے ایک اُمت "مسلمہ" جو تیری مطیع و فرمانبردار ہو، پیدا کر دے۔

لیکن ہماری نظر میں پہلا نظریہ زیادہ صحیح ہے اور آیت کے مضمون سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ سابقہ کتب اور قرآن مجید میں مُسلمانوں کا نام رکھنے کی نسبت حضرت ابراہیمؑ کی طرف دینا مناسب نہیں، بلکہ یہ نسبت اللہ ہی کی طرف مناسب ہے۔[1]

پانچواں اور آخری شوق آفریں نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا تعارف تمام امتوں کے لیے ایک نمونہ اور علامت کے طور پر کرایا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: مقصد یہ تھا کہ پیغمبر تمہارے گواہ ہیں اور تم تمام لوگوں کے گواہ ہو۔ (لیکون الرسول شهيدًا عليكم وتكونوا شهداء على الناس)۔

"شہید" "شہود" کے مادہ سے ہے اور اس کا مطلب وہ آگاہی و باخبری ہے، جو چشم دید ہو، اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا تمام مسلمانوں پر گواہ ہونا، تمام اعمال کو اسے باخبر ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ مفہوم ان تمام آیات و روایات جن میں رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں "عرضِ اعمال" کا ذکر ہے، کے عین مطابق ہے، ان روایات کے مطابق ہفتہ بھر میں ایک دن تمام امت کے تمام اعمال آپ کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اور آپ کی رُوحِ مطہر ان سے باخبر ہوتی ہے۔ اس بنا پر آپ اُمّت کے گواہ ہیں۔

یہ بات کہ امت کس طرح تمام لوگوں کی گواہ بنی؟ بعض روایات کے مطابق اس سے مراد امت کے معصوم افراد یعنی ائمہ اطہار ہیں جو لوگوں کے اعمال کے گواہ ہیں۔ امام علی الرضا علیہ السلام سے ایک روایت ہے۔

" نحن حجج الله فی خلقه ونحن شهداء الله واعلامه فی بريته"

---

[1] سورۂ مائدہ آیت نمبر ۳ میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کا نام اسلام رکھا ہے۔

واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا

متعدد آیات میں رسول اکرمؐ کو "اوّل المسلمین" فرمایا گیا ہے، جن میں سورۂ انعام آیت نمبر ۱۶۳ اور سورۂ زمر آیت نمبر ۱۲ بھی شامل ہیں۔

"اللہ کی مخلوق اور بندوں میں ہم اس کے نمائندے گواہ اور نشانیاں ہیں۔" ۱؎

دراصل لتکونوا کے ذریعے اگرچہ ظاہراً ساری اُمّت سے خطاب کیا جارہا ہے۔ مگر درحقیقت امت کے سیّد وسردار اور بزرگ مراد ہیں۔ جزو کی بنا پر کل سے خطاب کی ہمارے سامنے بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ چند افراد سے خطاب کے بجائے سب سے خطاب کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ آیت نمبر ۲۰ میں ارشاد ہوتا ہے

"اللہ نے تمہیں بادشاہ اور فرمانروا بنایا۔"

یہ خطاب بنی اسرائیل کو دی گئی نعمتوں کے شمار کے ذیل میں تمام اُمّت سے کیا جارہا ہے۔ حالانکہ اس منصب کے حامل تو معدودے چند افراد تھے۔

"شہود" ایک اور معنی بھی رکھتا ہے اور وہ ہے "عملی شہادت" یعنی اپنے کردار سے کسی بات کی گواہی دینا، یعنی موازنہ اور مقابلہ یعنی، کسی عمل و کردار کو دوسرے کے عمل و کردار سے موازنہ کرنا بالفاظ دیگر ایک شخص کے اعمال و کردار کا دوسروں کے لیے نمونہ ہونا۔ اس معنی میں تمام سچے مسلمان شامل ہوسکتے ہیں یعنی وہ بہترین دین پر عمل پیرا ہوکر تمام لوگوں کے لیے شرافت اور کردار کی رفعت کا ایک پیمانہ بن جائیں۔ حضرت رسول اکرم سے ایک روایت ہے۔

اللہ نے مسلمانوں کو چند فضیلتیں عطا کی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ گذشتہ ادوار، جبکہ ہر امت کے لیے نمونہ ان کا پیغمبر ہوتا تھا، کی بجائے اللہ نے میری ساری اُمّت کو مخلوق کے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔ فرماتا ہے۔

لیکون الرسول شہیداً علیکم وتکونوا شہداء علی الناس) ۲؎

یعنی جس طرح ہر نبی اپنی امت کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونہ ہوتا ہے، تم ساری دُنیا کے لیے ایک مثالی کردار اور نمونہ ہو۔ یہ مفہوم، ایک تو پہلے بیان شدہ مفہوم کے منافی نہیں اور مزید برآں ہوسکتا ہے یہ مفہوم بھی ہو کہ یوں تو تمام اُمّت ہی گواہ ہے مگر آئمہ اطہار ممتاز اور نمایاں گواہ اور نمونہ ہیں۔ ۳؎

آیت کے آخر میں مذکورہ پانچ ذمہ داریوں کو تاکیداً تین جملوں میں زیادہ مختصر پیرائے میں فرمایا جارہا ہے، اب اگر یوں ہے اور تم اعزازات اور امتیازات کے حامل ہو تو نماز ادا کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور پروردگار عالم کی بے پایاں عنایات کے پرتو میں آئین اسلام سے متمسک رہو (فاقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ واعتصموا باللہ)۔ کیونکہ تمہارا سرپرست اور مددگار وہی ہے "(ھو مولاکم)۔ اور کتنا اچھا سرپرست اور کیسا عمدہ اور باصلاحیت مددگار ہے (فنعم المولیٰ ونعم النصیر)۔ دراصل یہ جملہ "واعتصموا باللہ ھو مولاکم" کی دلیل ہے

۱؎ نور الثقلین جلد نمبر ۳ ص ۵۲۰ کے مطابق کتاب "کمال الدین اور اسی طرح کی دوسری روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔

۲؎ تفسیر برہان جلد نمبر ۳ ص ۱۰۲

۳؎ اسی تفسیر کی پہلی جلد میں سُورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۴۳ اور سورۃ النساء کی آیت نمبر ۴۱ کی تفسیر کے ذیل میں ہم اس مضمون سے متعلق سیر حاصل بحث کرچکے ہیں۔

یعنی اگر تمہیں کہا گیا ہے کہ صرف الطاف وعنایات پروردگار سے وابستہ رہنا بلاوجہ نہیں۔ کیونکہ وہ سب سے اعلیٰ، اچھا، اور مناسب یاور و ناصر ہے۔

بارالٰہا! ہمیں یہ توفیق عطا فرما کہ صرف تجھی سے وابستہ اپنے اور خالق ومخلوق سے رشتے کی وجہ سے لوگوں کے لیے نمونہ ومعیار بنیں اور تیری عظیم کتاب کی جامع اور "نمونہ تفسیر" مکمل کریں۔
خدایا! جس طرح سابقہ کتب اور اس قرآن حکیم میں تونے ہمیں "مسلمان" کہہ کر پکارا ہے۔ یہ توفیق دے کہ سراپا تیرے حکم کے بندے بن جائیں۔
پروردگارا! وہ دشمن جو آج ہر طرف سے قرآن واسلام پر حملہ آور ہو رہا ہے، ہمیں اس پر غلبہ عطا فرما کہ تو ہی بہترین مولا اور مددگار ہے۔ (فنعم المولی ونعم النصیر)۔

سورۂ حج کی تفسیر اختتام کو پہنچی



ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۷)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا ہے
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الفاضل)
مہتمم / پرنسپل
امامیہ قرأت کالج
اندرون موچی دروازہ - لاہور

اشاریہ

تفسیر نمونہ ——— جلد ۷

ترتیب و تزئین ------ سیّد شکیل حسین موسوی
------ سیّد محمد حسین زیدی البا ھروی

مضامین:

اُصول وعقائد

(توحید)

اسمائے باری تعالیٰ

جہنّم

اخلاقیات

اخلاقِ رذیلہ

اُصول وعقائد

(توحید)

اسمائے باری تعالیٰ

عدل

نبوت

امامت

قیامت

جنت

اقوامِ سابقہ

یاجوج ماجوج

بنی اسرائیل

قومِ نوحؑ

صائبین

عیسائی

قومِ عاد

قومِ لُوطؑ

مجوسی

شخصیات

حضرت آدم علیہ السلام

ابوالقاسم بشیر بن محمد

ابوبصیر

ابی بن خلف

حضرت ادریس علیہ السلام

حضرت اسحٰق علیہ السلام

حضرت اسماعیل علیہ السلام

الانسان (ایک مخلوق، ایک موجود)

حضرت الیاس علیہ السلام

حضرت اُمّ سلمہؓ

حضرت ایوب علیہ السلام

حضرت بلالؓ

پرہیزگار

تملیخا

حضرت جابرؓ ابن عبداللہ انصاری

جادوگر

حضرت جبرئیلؑ

حضرت جعفر ابن ابی طالبؑ

حضرت امام جعفر صادقؑ

حضرت خضر علیہ السلام

حضرت داؤد علیہ السلام

دقیانوس

٭

ذوالقرنین یا کوروش

ذوالکفل

ذوالنون

ربیع بن خثیم

زکریا

سامری

حضرت سلمانؓ

حضرت سلیمان علیہ السّلام

سمیہؓ

حضرت شعیب علیہ السّلام

شیطانؑ

عاص بن وائل

عبداللہ ابنِ ربیعہ

حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ

حضرت علیؑ ابنِ ابیطالبؑ

حضرت علیؑ ابنِ الحسینؑ (امامِ چہارم)

حضرت علیؑ ابنِ موسیٰؑ (امامِ ہشتم)

علی ابنِ اسباط (راوی)

حضرت عمارؓ ابنِ یاسرؓ

حضرت امام محمد باقرؑ (امام پنجم)

حضرت مریم علیہا السلام

مشرکین و بُت پرست

حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت امام موسیٰ کاظم (امامِ ہفتم)

مومن

نضر بن حارث

ہشامؒ بن حکم

حضرت یحیٰی علیہ السلام

حضرت یعقوب علیہ السلام

یوشع بن لاوی

حضرت یوشعؑ بن نون

عُلماء و دانشور

کتبِ آسمانی

انجیل

تورات

زبور

قرآنِ حکیم

کُتبِ تفسیر و تاریخ و سیر

لغاتِ قرآن

(ا)

متفرق موضوعات

اصحابِ کہف والرقیم

اللہ اور مسجد الحرام کی راہ سے روکنے والے

اللہ نے کن لوگوں سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے

اُمت کی رہبری

انبیاء کے خلاف شیطانی وسوسے

انبیاء کے علاوہ دوسروں پر بھی وحی ہوتی ہے

اندرونی اور بیرونی اندھاپن

انسان جلد باز مخلوق ہے

داستان خضرؑ موسیٰؑ

داؤدؑ و سلیمانؑ کا فیصلہ

دشمن سے مدارات

دلیلِ تمانع

دولت دُنیا کا غرور

دُنیا میں قیامت کے مناظر

ذکرِ رحمت

رحمت اور یاد آوری کا سُورہ

رزقِ حسن

رُسول اور نبی میں فرق

سورۂ انبیاء کی فضیلت و مضامین

سورۂ حج کے فضائل و مضامین

سورۂ طٰہٰ کے فضائل و مضامین

سورۂ کہف

سورۂ مریمؑ کے فضائل و مضامین

سیر و سیاحت اور دلوں کی بیماری

شرک

شعائر اللہ کی تعظیم علامتِ تقویٰ ہے

شیطان کے پیروکار

شیطان کی فریب کاری۔

طبقاتی تفاوت

طرح طرح کے بہانے

ظالم

ظلم

ظلم اور ہضم میں فرق

ظلم کے ساتھ الحاد کا مفہوم

عالم کی پیروی کرنے کی التجا

موجودہ دور کی ایجادات

من و سلویٰ

موسیٰ بھی مقابلہ پر آ گئے

موسیٰ پر اللہ کی مہربانیاں

موسیٰ کی دعائیں۔ اللہ تعالیٰ کی عطا

موسیٰؑ کی عظیم کامیابیاں

مؤمن

مؤمنین کے دلوں میں علیؑ کی محبت

نامۂ عمل

نبوت و رسالت کا امامت سے فرق

(تمام شد اشاریہ جلد ہفتم، تفسیر نمونہ)

اجازت نامہ

منجانب انصاریان پبلیکیشنز (قم) ایران

جناب آقای امین دام عزۃ العالی

باسلام و تحیات و خوشحالی از اینکه با کارهای خوب شما بیشتر اطلاع پیدا کردیم. از خداوند تبارک و تعالی، توفیق و سعادت و سلامتی برای جنابعالی و دیگر دوستان آن مرکز محترم، مسئلت می نمایم. چاپ کتابهای خوب انتشارات مصباح القرآن که لطف فرمودید، انشاء اللہ در آیندہ کہ مشکلاتمان حل شد اقدام می کنیم. دعای خیر شما لازم است.

در مورد کتابهای انتشارات انصاریان هر کدام را که موسسه شما می خواهد در پاکستان به چاپ و توزیع آن اقدام کند، بلامانع است (چاپ شده یا چاپ نشده) و اگر فایلهای بعضی از آنها که موجود است، بخواهید تا آنها را نیز تقدیم می نماییم. فقط سفارش حقیر این است که بعضی از این کتابها، تصحیح و ویرایش و نظر ثانی لازم دارد و اگر این کارها انجام شود ثوابی مضاعف خواهد داشت و بعد نمونه هایی از کارهای انجام شدہ را برای ما بفرستید. برای چاپ کتابهای مصباح القرآن هر وقت لازم شد درخواست فایلهای آنها را از شما خواهیم نمود

باتشکر و ملتمس دعا

انتشارات انصاریان